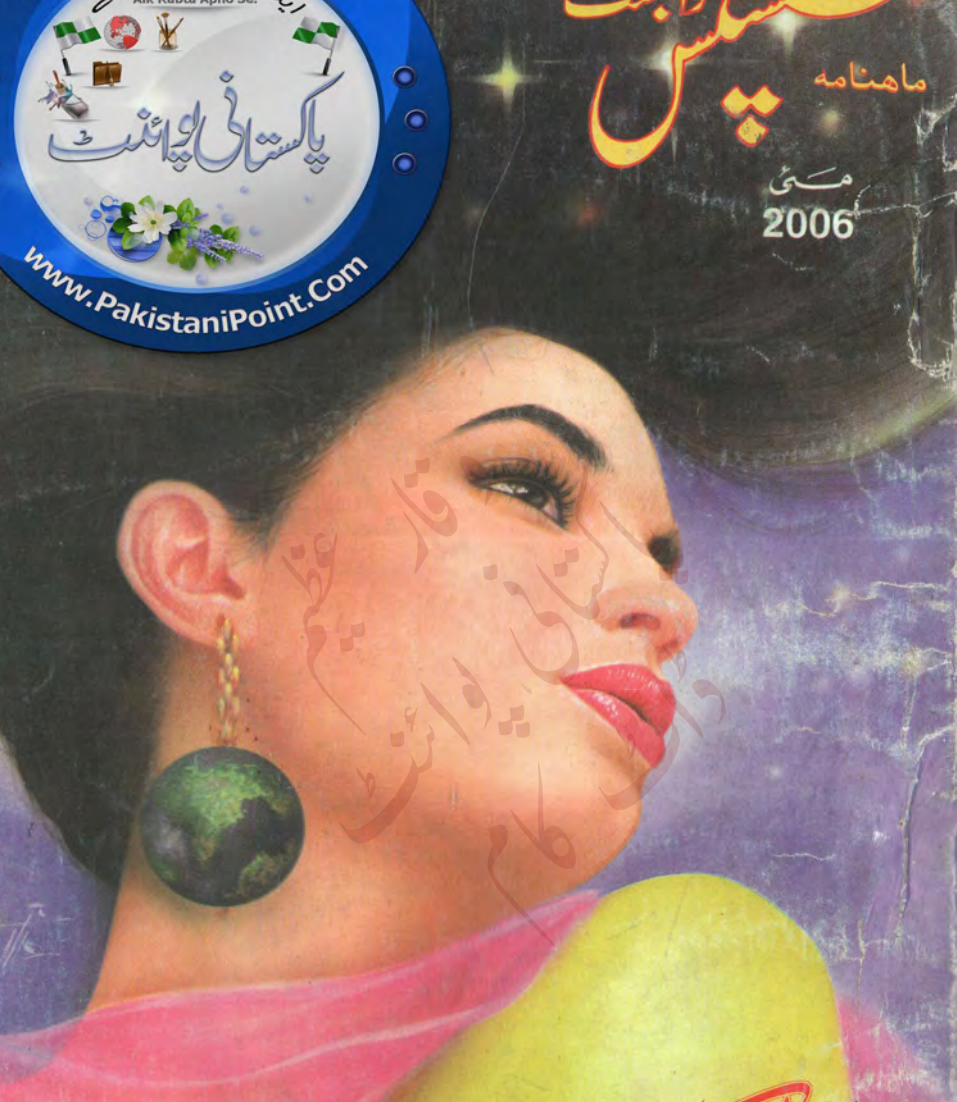

ماهنامه
سسپنس
مئی
2006
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com
ماہنامہ
دلکش
کراچی
تمام تر رنگینوں کے ہمراہ جلوہ گر ہو چکا ہے • تازہ شمارہ طلب فرمائیں

سسپنس ڈائجسٹ

مدیراعلیٰ: معراج رسول
مدیر: جعفر رضا

11 — **انشائیہ** — جون ایلیا
ابتدائے آدمیت سے آج تک کے نفع نقصان کا میزانیہ ایک خاک نشین کی خود سے خوش کلامیاں

12 — **آپ کے خط** — مدیراعلیٰ
سسپنس کی مجلسِ مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور مشورے جو انجمن آرائی ہیں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں

18 — **درمیاں والے** — محی الدین نواب
ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے ایسے واقعات جو بیناؤں کی رہنمائی کیلئے کتابوں میں محفوظ کردیئے گئے ہیں

61 — **پرانا درخت** — شکیل صدیقی
ایک بے مصرف ٹیلے اور اس پر لگے درخت کے سود مند ہونے کا دلچسپ اور معنی خیز ماجرا

66 — **دیوتا** — فرہاد علی تیمور
ایک فسوں کار کی خود نوشت ایک عالم جس کے خون کا پیاسا تھا، سسپنس کا مقبول عام سلسلہ جو 352 ماہ سے جاری ہے

105 — **عشق کا پیغمبر** — امر جلیل/رفعت رضا
ہر شے کو معاوضے کے ترازو میں تولنے والوں کا دل گداز و جگر پاش قصہ سندھی ادب سے انتخاب

111 — **انتقام** — ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کبھی کبھار آئینہ بن کر اس طرح سامنے آجاتا ہے کہ اس میں اپنی صورت بھی مکروہ دکھائی دیتی ہے

122 — **ایک بٹا دو** — مرزا امجد بیگ
اس احمق کا قصہ دلچسپ جو اپنی سادگی کے باعث عذاب در عذاب میں گرفتار ہوا وکیل کی ڈائری سے انتخاب

155 — **جہاں دیدہ** — محمود احمد مودی
مصیبت کو ٹال دینا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ ایسا بندوبست بھی ضروری ہے کہ وہ دوبارہ نہ آسکے اسی کی عکاس ایک مغربی کہانی

جلد35 • شمارہ05 • مئی 2006 • زرِسالانہ 450 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 35 روپے • سعودی عرب 12 ریال یا مساوی
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی 74200 • فون: 5895313 (021) فیکس 5802551 (021) E-mail:jasoosi@attglobal.net

MEMBER APNS

CPNE

161
چیونٹی
بے مثل تن و توش کے حامل ہاتھی کو کوئی حقیری چیونٹی بھی شکست فاش دے چار کرسکتی ہے ایک خوبصورت حکایت
طاہر جاوید مغل

171
خطرناک
اس عورت کا قصہ جو ٹیلی فون کو خطرناک سمجھتی تھی اور کچھ غلط بھی نہیں سمجھتی تھی غیر متوقع انجام کی کہانی
ایس ایم شجاع رضوی

175
محفل شعر و سخن
مشہور و معروف شاعروں کے اشعار سے منتخب آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ، آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ
قارئین

180
موت کے سوداگر
منشیات استعمال کر کے خودکشی کرنے والوں کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ زندگی ایک بار گنوانے کے بعد دوبارہ نہیں ملتی، سسپنس کا ایک تعمیری سلسلہ
اقلیم علیم

222
انتظار قیامت کا
جو انتظار کی کیفیت سے گزرتے ہیں وہی اس کے کرب سے واقف ہو سکتے ہیں، ش صغیر ادیب کا برطانیہ سے خصوصی تحفہ
ش صغیر ادیب

247
حضرت موسیٰ علیہ السلام
حضرت موسیٰ اور فرعون کے جادوگروں کے مابین مقابلے کی ایمان افروز روداد، قارون کی امارت کی حقیقت
ضیاء تسنیم بلگرامی

265
اپاہج
ہاتھ پیر کے مضبوط مگر اپاہج شخص کی زندگی کا قصہ عبرت، وہ کوئی نسل نہیں چاہتا تھا ہندی سے انتخاب
محمد ابراہیم جمالی

270
اناڑی
تلخ حقائق کو شیریں انداز میں پیش کرنے والے ہر دلعزیز احمد اقبال کے قلم کا تازہ شاہکار
احمد اقبال

317
اسماء الحسنیٰ
دین اسلام کی روشنی میں مسائل کا حل، سائلین کے سوال اور ایس ایم قادری کے جواب
ایس ایم قادری

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مشہور ڈائجسٹوں میں چھپنے والے اپنے وقت کے مقبول ترین مکمل سلسلے کتابی شکل میں

طالوت
ایک آتش زادے کی داستان جو دنیا کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا تھا

3 حصے (مکمل) ★ مکمل سیٹ -/180 روپے

چارلس سوبھراج کی سرگزشت
بدنام ترین مجرم چارلس سوبھراج کے جرائم کی سنسنی خیز تفصیل

قیمت -/50 روپے ★ ڈاک خرچ -/23 روپے

سونا گھاٹ کا پجاری
ایک ایسے پجاری کی داستان جو صدیوں پہلے مر گیا تھا لیکن پھر بھی اس کی پراسرار طاقتوں کی حکومت تھی

قیمت -/40 روپے ★ ڈاک خرچ -/23 روپے

گمراہ
ایک نوجوان کی اثرانگیز سرگزشت جو آزاد ہوتے ہوئے بھی قید تھا

8 حصے (مکمل) ★ مکمل سیٹ -/480 روپے ★ ڈاک خرچ -/40 روپے

سبز قدم
مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ سے وابستہ زن، زر، زمین کے مقدمات کی سچی کہانیاں

قیمت -/60 روپے ★ ڈاک خرچ -/23 روپے

چھلاوہ
اردو زبان کی بیسٹ سیلر سرگزشت

دولت مند، آزاد خیال، پروقار، خوبصورت اور خطرناک صبیحہ بانو جنھیں لوگ جانتے ہیں مگر نہیں جانتے!

قیمت -/300 روپے ★ ڈاک خرچ -/30 روپے

صدیوں کا بیٹا
اس انسان کی کہانی جو صدیوں سے زندہ ہے اور شاید آج بھی کہیں موجود ہو

5 حصے (مکمل) ★ مکمل سیٹ -/300 روپے ★ ڈاک خرچ -/35 روپے

اسیر ہوس
ملک صفدر حیات ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی ڈائری سے جرائم کے سچے واقعات

قیمت -/60 روپے ★ ڈاک خرچ -/23 روپے

ہمزاد
ایک پراسرار شخص کی کہانی جس کے لئے کوئی بھی کام ناممکن نہیں تھا

قیمت -/60 روپے ★ ڈاک خرچ -/23 روپے

مجاہد
آزمائش کی کڑی دھوپ میں ایک پاکستانی جانباز کا سفر

11 حصے (مکمل) ★ مکمل سیٹ -/660 روپے ★ ڈاک خرچ -/70 روپے

ماورائی لوگ
روحانی صلاحیتوں کے حامل لوگوں کے سچے واقعات

قیمت -/75 روپے ★ ڈاک خرچ -/25 روپے

نک ویلوٹ کی چوریاں
ایک ایسا چور بے قیمت چیزیں گراں قدر معاوضے پر چراتا تھا

2 حصے (مکمل) ★ مکمل سیٹ -/120 روپے ★ ڈاک خرچ -/25 روپے

اقابلا
تاریک براعظم کے پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حیرت انگیز داستان

2 حصے (مکمل) ★ مکمل سیٹ -/120 روپے ★ ڈاک خرچ -/25 روپے

فرعون
مشرق کی سب سے پراسرار زمین مصر کا طلسم کدہ، ریاض عالم کی ہوشربا سرگزشت

2 حصے (مکمل) ★ مکمل سیٹ -/120 روپے ★ ڈاک خرچ -/25 روپے

شیطان صفت
مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ سے وابستہ زن، زر، زمین کے مقدمات کی سچی کہانیاں

قیمت -/60 روپے ★ ڈاک خرچ -/23 روپے

غلام روحیں
زندگی کے نشیب و فراز، گناہ و ثواب، وقت و حالات کے بھنور میں جنم لینے والی ایک بصیرت افروز کہانی

قیمت -/40 روپے ★ ڈاک خرچ -/23 روپے

مفرور
ایک کیمیاگر کی داستان شوق جو مقصد کی تلاش میں دربدر پھرتا رہا

6 حصے (مکمل) ★ مکمل سیٹ -/360 روپے ★ ڈاک خرچ -/33 روپے

دست انتقام
ملک صفدر حیات ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی ڈائری سے جرائم کے سچے واقعات

قیمت -/60 روپے ★ ڈاک خرچ -/23 روپے

جال
ایک ایسے انسان کی کہانی جسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے

قیمت -/60 روپے ★ ڈاک خرچ -/23 روپے

شکاری
ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی جس کے شب و روز موت کی بستی میں گزر رہے تھے

20 حصے (مکمل) ★ مکمل سیٹ -/1200 روپے ★ ڈاک خرچ -/100 روپے

کشتۂ سیاست
ایک کنوارے سیاست دان کی سرگزشت

قیمت -/70 روپے ★ ڈاک خرچ -/23 روپے

شاطر
ایک ایسے نوجوان کی داستان جس نے تاریک گلیوں میں جنم لیا اور بے رحم معاشرے کی ٹھوکروں پر اڑتا ہوا عالیشان محلوں تک پہنچ گیا

2 حصے (مکمل) ★ مکمل سیٹ -/120 روپے ★ ڈاک خرچ -/25 روپے

انکا
ایک ایسی ناقابل فراموش داستان جس میں حسن کی رعنائیاں بھی ہیں اور عشق کی کرم فرمائیاں بھی

2 حصے (مکمل) ★ مکمل سیٹ -/120 روپے ★ ڈاک خرچ -/25 روپے

مارکو پولو
ایک عظیم سیاح کے سفر کے شب و روز، جس میں ہر موڑ پر نئی کہانیاں اس کی منتظر تھیں

قیمت -/150 روپے ★ ڈاک خرچ -/30 روپے

کتابیات پبلی کیشنز فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551

kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کے لئے: C - 63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ (اختر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

پوسٹ بکس نمبر 23 کراچی 74200

انشائیہ

گراں قدر

جون ایلیا

انسان نے ہزاروں سال کے اس طویل سفر میں آخر کیا پایا جس میں وہ نامعلوم تاریخ کے تاریک غاروں سے نکل کر تاروں کی تابناک دنیا تک جا پہنچا ہے۔ مانا جاتا ہے کہ حجری دحشیت سے جوہری مدنیت تک انسانیت کی پیش رفت زمین کے زمانوں کی سب سے زیادہ عظیم الشان سرگزشت ہے اور ابھی تو انسانی علم کی دودھ بڑھائی ہوئی ہے، ابھی تو وہ گھٹنوں کے بل چل رہا ہے، ابھی تو اسے اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہونا ہے۔ پھر بھی اس بچے نے کتنی چیزیں الٹ پلٹ کر ڈالی ہیں اور وجود کے صحن میں کیا کچھ لابکھیرا ہے، کیا کچھ توڑا ہے اور کیا کچھ جوڑا ہے اور اس طرح کیا کچھ پایا ہے اور کیا کچھ بنایا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نظام شمسی کی عجیب تر آیتیں اس کرۂ ارض کے سینے پر لکھی گئی ہیں اور یہ کہ یہ سب سے زیادہ ماجرا ناک کرہ ہے، ایک راست قامت جانور کتنا جوہردار نکلا ہے جس کے بل پر اس زمین نے آسمان سر پر اٹھایا ہے۔

یہ سب کچھ ہوا ہے پر یہ سب کچھ کس لیے ہوا ہے؟ انسان نے ہزاروں سال کے اس سفر میں کیا پایا؟ چاند تمہاری مٹھی میں آ گیا ہے اور آیندہ تم سورج کو اپنی بغل میں دبالو گے۔ پر اس سے تمہارا مقصد آخر کیا ہوگا؟ اکتشاف، ایجاد اور تسخیر، دانش کا سب سے بیش قیمت وظیفہ ہیں۔ مگر کیا انسانوں کا یہ شاندار انہماک اپنے شرمناک جرائم کو بھلانے کی کوشش تو نہیں؟ قرن ہا قرن اور ہزار ہا ہزار سال کے اس بادیہ نشین نے اپنے گرد پُر ہجوم شاہراہوں اور پرشکوہ شہروں کی ایک بھیڑ لگا رکھی ہے۔ پر سوچنا یہ ہے کہ اس بھیڑ میں اس نے کہیں اپنے آپ کو تو نہیں کھو دیا؟

وہ دانش تاریخ کے یوم القیام میں اپنا کیا جواز پیش کرے گی جس نے اس زمین پر زندگی کو کچھ اور بھی مشکل، کچھ اور بھی ناسازگار بنادیا ہے۔ اس تہذیب کو تباہ کن اسلحے کے بجائے اپنے وجود کے جواز میں کوئی معقول دلیل پیش کرنی تھی اور یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ وہ دلیل ابھی تک پیش نہیں کی جاسکی۔ کیا اس عہد کا انسان نیزہ بردار وحشیوں کی نسبت سے زیادہ مطمئن اور زیادہ مسرور ہے۔ کاش یہ دعویٰ کیا جاسکتا کہ ہر آنے والی نسل گزشتہ نسل سے اور ہر آنے والی صدی گزشتہ صدی سے زیادہ سعید اور خوش بخت ثابت ہوئی ہے۔

اس تہذیب کے بطن میں وہ عفونت آخر کس نے انڈیل دی ہے جس نے اس کے سانسوں کو زہرناک بنا ڈالا ہے؟ یہ حقیقت بہ شدت معرض اظہار میں آنی چاہیے کہ تہذیب کے اس بے مہر اور سنگخور ارتقا کی فضا زندگی کے لیے ناسازگار ثابت ہوچکی ہے۔ ارتقا ایک اصطلاح ہے اور انسانی سکون وسعادت کو بہرحال اصطلاحوں سے زیادہ قیمتی قرار پانا چاہیے۔

آپ کے خط

قارئین کرام

السلام علیکم!

ماہ مئی 2006ء کا سسپنس پیش خدمت ہے۔ ماہ اپریل کے دوران عید میلادالنبیؐ کے پُرمسرت اور پُربہار موقع پر کراچی میں ہونے والا بم دھماکا سب ہی کا موضوع گفتگو ہے اور کیوں نہ ہو کہ اسلام دشمن عناصر ایک بار پھر تمام رکاوٹوں کو توڑ کر مسلمانوں پر ایک اور کاری وار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ کئی قیمتی جانیں گئیں تقریباً ایک سو بے گناہ افراد کے زخمی ہونے کی خبر ہے۔ بلاشک وشبہ یہ ایک ایسی کارروائی تھی جس کی حمایت کوئی بھی ذی شعور انسان کر ہی نہیں سکتا......اور کوئی مسلمان تو اس گھناؤنی حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتا کہ جتنی حرمت دین اسلام میں انسانی جان کی بیان کی گئی ہے وہ کسی اور میں نہیں ہے۔ ہم بھی اس سانحے پر غم زدہ ہیں اور دعا گو ہیں کہ خداوند قدوس اس سانحے میں جان ہارنے والوں کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اسی کے ساتھ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس حملے کے اصلی ذمے داران جلد بے نقاب ہوں گے اور انہیں اس مکروہ فعل کی قرار واقعی سزا بھی دی جائے گی۔ اس گفتگو کے بعد آیئے حسب معمول رخ کریں اپنی محفل کا اور دیکھیں کہ وہاں کون کون موجود ہے۔

مسز ناصر کا تبصرہ تلہ گنگ سے ”اپریل کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل دیکھ کر یوں لگا جیسے خاتون نہایت اشتیاق اور تیزی سے غٹرغوں کی آواز سن کر سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اوپر پہنچی ہیں کہ شاید کوئی جوابی نامہ و پیام آیا ہو......لیکن......میرا خیال ہے سوائے وعلیکم السلام کے مزید کوئی خبر نہیں ہے۔ نواب صاحب نے ”ہائے لہو ہائے پانی“ میں اپنے مخصوص لب و لہجے کا استعمال قدرے کم کیا ہے۔ اعتدال پسندی اچھی بات ہے۔ شہنشاہوں کے ہاں محبتیں بہت کم یاب ہوتی ہیں۔ پر وہ محبت ہی کیا جو غرض مند ہو! ”موت کے سوداگر“ میری فیورٹ سیریل ہے ڈیمی پھنسنے تو نہیں لگا لیکن بنکاک سے نکلنے میں کچھ جلدی کر بیٹھا ہے۔ سہل ہوتا اگر جلال کے پاسپورٹس کا انتظار کر لیتا۔ بہرحال اب کچھ اور ایکشن ہوں گے......یہی رائٹر کا کمال ہوتا ہے کہ جہاں اسٹوری سلو ہونے لگے وہیں سے پھر ٹرن اوور ہو جائے۔ بائی داوے ویرا اور سلطان شاہ کے حوالے سے لگ رہا ہے جیسے سیریل اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ شگفتہ پروین نے ”فیصلے اور فاصلے“ بڑی اچھی کہانی لکھی۔ تمام کرداروں کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے۔ بوجھل لمحوں کو آسودہ کر دینے والی محبتوں کا امتحاں کڑے لمحوں میں ہی ہوا کرتا ہے اور بروقت‘ صحیح فیصلہ‘ محبتوں میں بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ افسوس کہ آصف کے ہاتھ سے لمحے پھسل گئے۔ اور خوش نصیبی علی رضا کی صورت‘ انعام کے طور پر مہرین کو مل گئی۔ شکریہ شگفتہ! آپ نے اچھی کہانی پڑھنے کو دی۔ ہم مسکرا دیے تھے ملک صاحب کو ریڈ فائل ڈھونڈتے پا کر احتیاط اور مروت۔ پھر کسی خاتون کی ایسی خود اعتمادی۔ ملک صاحب بھی ڈاج کھا گئے......لطف آیا اس کہانی کو پڑھ کر بھی۔ باقی کہانیوں میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے ازدواجی تلخیوں سے شروع کر کے ثیز وفرینیا پر کہانی ختم کی۔ آغاز اکثریت کی تصویر تھا تو انجام اقلیت کی۔ کاشف زبیر کی ”سودمند غلطی“ واقعی اسم بامسمیٰ تھی محسن کے لیے۔ مگر مائرہ نے محسن کا انتخاب کر کے نری زیاں سے بھرپور غلطی کی تھی بھلا ہمارے معاشرے میں اک مرد کب‘ دل کہیں تو جاں کہیں‘ کے ساتھ زندگی گزارتا ہے! اُف۔ صغیر ادیب نے بھی روایتی گھرانے کی جھلک خوب دکھائی۔ حیران ہوں کہ شیخ صاحب جیسے لوگوں کے ضمیر کبھی جاگتے کیوں نہیں۔ منظر امام نے محبت کو قدیم وجدید ادوار اور مختلف اخلاقی اقدار میں‘ جس منظرنامے کے ساتھ پیش کیا بلاشبہ اسے زوال نہیں۔ تاہم مماثلت کے بارے میں کھل کر لکھنا قاری کو سمجھانے والی بات تھی۔ میرا خیال ہے سمجھنے کی حد تک بات قاری پر چھوڑ دینا چاہیے۔ کہانی کے تھیم کو غیر ضروری پھیلاؤ میں بھی الجھایا گیا ہے۔ اس سے کہانی اپنے وزن سے بہت ہلکی لگی۔“

شیخ خالد ندیم کی واپسی ملتان سے ”اپریل کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ملا اور ساتھ ایک دلکش نوید۔ ”دلکش“ کی تھی۔ انکل میری دعا ہے آپ کا یہ ڈائجسٹ بھی ڈائجسٹوں کی دنیا میں نمایاں نام حاصل کرے اور سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت کی طرح کامیاب وکامران ہو“ آمین“۔ کافی عرصے بعد خط لکھ رہا ہوں لیکن شاید آپ کو یاد ہو کہ میں آپ کا ایک پرانا قاری ہوں پرانے سے شاید کچھ زیادہ ہی پرانا نہ سمجھ لیں لیکن سمجھتے رہیں کیونکہ اب مجھے اس کی کوئی فکر نہیں۔ سرورق کے بعد اشتہاروں سے ہوتے ہوئے بریک موت کے سوداگر پر لگی کہانیوں میں‘ میں سب سے پہلے موت کے سوداگر پڑھتا ہوں اور یقین کریں موت کے سوداگر ایسی کہانی ہے جو سسپنس کے ماتھے کا جھومر ہے اور سسپنس ڈائجسٹ کے ساتھ اپنی شان بڑھاتی ہے۔ موت کے سوداگر جیسی عظیم کہانی لکھنے پر اقلیم علیم مبارک باد کے حقدار ہیں۔ یہ کہانی لکھ کر وہ یقیناً ملک وقوم کی خدمت کر رہے ہیں اس کا اجر اللہ انہیں دے گا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کی ایڈمنسٹریشن میں جلال، اول خان اور ڈیمی جیسے محب وطن اور بے لوث افسر پیدا کر دے جو پاکستان کے دشمنوں اور ان کی پاکستان کے خلاف سازشوں کا خاتمہ اپنے جذبۂ ایمانی سے کریں۔ ”آمین!“ کہانیوں میں دیوتا اچھی جا رہی ہے۔ کرداروں کی افراط سے انصاف محی الدین نواب صاحب کا خاصّہ ہے اور وہ کہانی میں دوبارہ دلچسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ سونیا کی واپسی ہو چکی ہے اور وہ اب جمائلہ کو بھی سیون بلڈرز سے آزاد کرانا چاہتی ہے۔ اب آخر میں آتے ہیں پہلی کہانی کی طرف۔ ایک رات کی ملکہ کا انجام ہائے لہو ہائے پانی میں افسردہ کر گیا۔ کہانی میں نواب صاحب کا مخصوص اسٹائل جھلکتا رہا اور تاریخی کہانی کے لحاظ سے کچھ عجیب سا لگا۔ بہرحال تاریخی کہانی ایک تاریخی کہانی ہے اور تاریخ میں رنگینی کے ساتھ سنگینی بھی ہوتی ہے۔ درباری امرا اور وزرا کی سازشوں اور سوتیلوں کی دغابازیوں سے نبرد آزما ہمایوں بالآخر تخت کا وارث پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ نواب صاحب سے گزارش ہے کہ وہ بادشاہ اکبر کے بارے میں بھی لکھیں کہ وہ کن حالات سے گزر کر تخت تک پہنچا۔“

محمد ہمایوں تنولی کی حوصلہ افزائی اسلام آباد سے۔ ”سب سے پہلے تو مبارکباد قبول فرمایئے آپ نے پانچواں ستون ماہنامہ دلکش کی صورت میں ہمارے سامنے لاکھڑا کیا ہے پہلے تو یہ عمارت چار ستونوں پر کھڑی تھی۔ ہمارے اسلام میں بھی پانچ ستون ہیں اور سسپنس والوں نے بھی ماشاءاللہ پانچ ستون کی ایک عمارت کھڑی کر دی۔ اللہ کرے یہ عمارت پانچ ستون والی قائم ودائم رہے لیکن ان کا سرغنہ یعنی سرتاج تو سسپنس ڈائجسٹ ہی ہے۔ پانچ کی جگہ

مشترک ہے۔ پانچ انگلیاں ایک ہاتھ کی یا ایک پیر کی۔ دین کے پانچ ستون۔ پنجتن پاک بھی پانچ ہی ہیں۔ پنجاب کے دریا بھی پانچ ہی ہیں۔ اگر کشمیر پاکستان کو مل جاتا تو پاکستان کے صوبے بھی پانچ ہوتے۔ راجن کو مار کر ڈپٹی صاحب بنکاک میں پھنس گئے ہیں۔ اسے کہتے ہیں دوسری قوم پر اعتماد کرنے والا آدمی نقصان میں رہتا ہے۔ ڈان نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہم امریکیوں کو اپنا دوست بنا کر ڈالر کما رہے ہیں مگر ڈپٹی کو اپنے پاسپورٹ جاذفان کے حوالے نہیں کرنے چاہیے تھے۔ خیر جو رائٹر کی مرضی۔ فیصلے اور فاصلے شگفتہ پروین صاحب کی اچھی کاوش تھی۔ اس سے پہلے آخری صفحات پر محی الدین نواب اور طاہر جاوید مغل صاحب قابض رہا کرتے تھے۔ حیرت ہے کہ اس دفعہ انہوں نے ریکارڈ توڑ دیا۔ دیوتا حسبِ معمول ناگا پربت کراس کر رہی ہے۔ سچ بتاؤں میں نے دیوتا کی وجہ سے سسپنس کا دیدار شروع کیا تھا۔ معزز ڈاکو پڑھ کر پاکستان بھی یاد آتا ہے کہ آزادی کے بعد ہم لوگ سوچتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں یا کہ نہیں ایک طرح سے تو آزاد ہیں۔ آپ پاکستان میں جو جرم بھی کریں قانون آپ کے ساتھ ہے۔ اگر آپ کے ہاتھ میں مال ہے تو باہر کے ممالک میں آپ نہ تو گند پھیلا سکتے ہیں۔ نہ ہی جگہ جگہ گندگی پھیلا سکتے ہیں۔ پاکستان میں جہاں لکھا ہو کوڑا پھینکنا منع ہے وہاں پر کوڑے کے انبار لگے ہوں گے جہاں لکھا ہو گاڑی کھڑی کرنا منع ہے۔ دنیا جہان کی گاڑیاں وہیں کھڑی ہوں گی۔ جہاں لکھا ہوگا ہارن بجانا منع ہے۔ تمام لوگ وہاں ہارن بجانا اپنا فرض سمجھیں گے۔ اس سے بڑھ کر اور آزادی کیا ہوگی۔“

بشریٰ افضل کی دستک بہاولپور سے ”ٹھیک 23 تاریخ کو سہ پہر 4 بجے ہاکر سسپنس ہمارے دولت کدے پر دے کر گیا۔ ٹائٹل گرل کے انداز و اطوار، چمک، رنگ اور کانوں میں A.T.V کا ٹائٹل اور اوپر سے صنف نازک کی مسکراہٹ کہ کبوتر میرا کوئی پیغام لایا ہو۔ ٹائٹل نے کافی اٹریکٹ کیا۔ واہ ہمارا دلکش بھی ٹائٹل کی زینت بنا اچھا لگا۔ اپنی محفل کی طرف دوڑ لگائی اور انکل کی باتیں سنیں۔ ”قندیل رضوان اسی لیے آپ کو پہلی نشست میں بٹھانے کا اعزاز دیا گیا صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ طاہر الدین بیگ صاحب پھر ہم نے اپنا کہا پورا کر دکھایا۔ تمام بھوتوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ غزالہ شاہ Thanks کہ ہمارے تبصرے آپ کو پسند آتے ہیں، قندیل رضوان فوراً اپنے الفاظ واپس لیں اچھے بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔ رخسانہ کنول بھتیجے کی مبارکباد قبول کریں اور ہاں سعدیہ ہما شیخ آپ نے جھوٹ کیوں بولا جب کہ بہاولپور میں کوئی بھی سعدیہ ہما شیخ ایڈووکیٹ نہیں ہے یا آپ نے نام تبدیل کر کے لوگوں کو بنایا ہے۔ بہرحال تصدیق ہو جائے گی کہ آپ کہاں تک صحیح ہیں۔ میرا خیال ہے کہ محض بہاولپور کا نام ہی use کر رہی ہیں ورنہ اپنے شہر سے ہی لکھ رہی ہیں۔ جیا بلوچ آپ کی بات سے سو فی صد متفق ہیں لیکن یہ لوگ عمل کریں تب نا! ماہنامہ دلکش کا بے چینی سے انتظار ہے۔ رخسانہ امجد خوش آمدید اب آتی رہا کریں۔ تمکین فاطمہ بھی ہماری طرف سے دوبارہ شادی کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ واقعی باپ بیٹی کا (ملاپ) پسند آیا دراصل اپنا خون خود بولتا ہے۔ جبکہ بیٹی ہو بہو ماں کی تصویر بھی ہو۔ ذو رخی نے بہت بڑی قربانی دی (ایک محبت دو افسانے) نے بھی دل کے تاروں کو جھنجھنا کر رکھ دیا۔ محبت ہو تو ایسی۔ شیخ صاحب نے (محتاط رہنے والے) بننے کی بڑی کوشش کی مگر ناکام ہی رہے۔ حمیدہ بیگم جیسی بیوی ملی جو ان کے نخرے اٹھاتی رہی اور محنت کرتی رہی۔ روزی کو (آدھی لڑکی) کے روپ میں دیکھا۔ اس کا ذہن مرد کی محبت کو قبول نہ کر سکا۔ بچپن میں جو بات بچوں کے ذہن میں بیٹھ جائے اور وہ بھلا نہ پائیں تو یہی انجام ہوتا ہے۔ مسز اسمتھ نے طریقہ کار سمجھنے کے لیے (ٹی وی) فرید کو دیا۔ اب مسز اسمتھ اس سے خوب فائدہ اٹھائے گی۔ (نرگس کے پھول) منفرد تحریر لگی تھوڑا سا سسپنس بھی تھا اچھی کہانی تھی۔ (سودمند غلطی) مائرہ خاصی ہوشیار عورت تھی بیٹے کے دل میں سوتیلے باپ کی محبت پیدا نہ کر سکی جبکہ محسن علی بیوی اور بچوں کی محبت کا عادی تھا۔ اس لیے واپس آنے کو ترجیح دی۔ (نقب زن) میں کرس نے اپنی بہن کا بدلہ بڑے انوکھے انداز میں لیا (فیصلے اور فاصلے) آصف نے وقت گزرنے کے بعد فیصلہ کیا تو کیا کیا۔ ایک طویل کہانی سسپنس سے بھرپور محبت سے گندھی رشتوں پر مشتمل کہانی تھی ان کا میل قسمت میں نہیں تھا تو کیسے ان کا ملاپ ہوتا؟“

طارق خادم کا نامہ راولپنڈی سے ”اس ماہ کا سسپنس پچیس تاریخ کو لیا۔ سرورق کی حسینہ اور اس کی چوڑیاں اور پیلا دوپٹا کیا خوب جوڑ ہے اور اس پر حسینہ کا مسکرانا......واہ کیا بات ہے۔ باقی سب کہانیاں اچھی ہیں خاص کر ملک صفدر حیات کی معزز ڈاکو اور ضیا تسنیم بلگرامی کی حضرت موسیٰ کے حالات و واقعات نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ سسپنس میں خط لکھنے والوں کو میرا سلام کہ مجھے بھی اس محفل میں تھوڑی سی جگہ دے دیں۔ آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت دیں کہ خدا آپ کی اس ادبی خدمت کو مزید ترقی اور وسعت عطا کرے۔ آمین“

قرۃ العین عائشہ فاروقی کی آمد ملتان سے ”اس ماہ کا سرورق خاص نہیں تھا۔ لگتا ہے ذاکر صاحب کو سفید کبوتر بہت پسند ہیں۔ اور یہ قندیل رضوان کو کس خوشی میں آپ نے سسپنس کے گیٹ پر بٹھایا ہوا تھا۔ اس طرح تو نئے آنے والے بھاگ جائیں گے۔ (ذکر) رضوان صاحب، لگتا ہے خواتین نے پینسل ہیلوں سے آپ کے جذبات کافی دفعہ مجروح کیے ہیں ویری اسٹرینج۔ بلیک کیٹ! آپ کا خیال نیک ہے، کسی دن آپ سے مل کر یقیناً خوشی ہوگی اور اگر آپ ہوسٹلائز ہیں تب تو ڈبل خوشی ہوگی۔ اب آپ بھی سوچیں اور میں بھی (کہ کیسے ملا جائے) محمد نعمان الحق، آپ کے خیالات تعریف کے قابل ہیں۔ خالد اور محمد اشرف، اپنے نامی گرامی لیڈر کے لیے دعائے خیر کیا کریں، بے چارے کہیں زیادہ دلبرداشتہ نہ ہو گئے ہوں۔ آدھی لڑکی میں روزی کے انجام پر دکھ ہوا۔ بے چاری نے کچھ غلط تو نہیں سوچا تھا۔ شگفتہ پروین کی فیصلے اور فاصلے بھی اچھی لگی۔“

تسنیم اختر عادل کا نامہ بستی عطر بھکر سے ”ایک بار خطوط کی خوبصورت محفل میں حاضری دے رہے ہیں۔ اپریل کے سسپنس کی خوبصورتی سرورق پر بنا ہوا حسینہ کا دلکش اور معصوم چہرہ اس کے چہرے پر نسوانیت کا وقار اور اس کے عارض کی لالہ کاری، اس کے کاکل کی تابداری، اس کے گلنار اور احمریں لب، اس کی آنکھوں کی سحر کاری، روشنی کے سیلاب اور نغمات کی برسات جیسی اس کی مسکراہٹ لعل بدخشاں اور تابندہ موتیوں جیسے اس کے دانت۔ شرار برق گراتی اس کی زمزمہ ریز اور غزل خواں آنکھیں۔ نیلا لباس، ہاتھوں میں پیلا دوپٹہ، ہاتھوں میں سرخ اور ہری چوڑیاں اسے قیامت، خوبصورتی اور محبت کا ایک لازوال مجسمہ بنائے ہوئے تھے۔ دوپٹا ہاتھ میں لیکن سیدھی مانگ نکالے مشرق اور مغرب کا امتزاج نظر آ رہی تھی۔ اگر یہ دوپٹا ہاتھوں کی بجائے سر پر ہوتا تو دلکشی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے خطوط کی محفل میں پہنچے تو کرسی صدارت پر قندیل رضوان ملک کا راج تھا۔ ان کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی خطوط میں لڑکیوں کا لہجہ کڑوا تھا آخر کیوں۔ جیا بلوچ کو انسان نظر نہیں آتے بلکہ بھوت بہت نظر آتے ہیں۔ کیا خواب میں بھی بھوت نظر آتے ہیں۔ غزالہ شاہ اپنی ہی صنف کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی تھیں۔ واہ رے سبحان اللہ۔ بلیک کیٹ اور پرنس آف سسپنس کیا آپ کے نام ایسے ہی برے ہیں کہ اصل نام لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ رخسانہ امجد پہلی دفعہ اور اتنا مختصر تبصرہ۔ انکل صوبیدار محمد اقبال کا خط پیار اور محبت سے لبریز تھا کتنی

خوبصورت اور پیاری باتیں کرتے ہیں۔ سیدہ تمکین فاطمہ شادی کے جھمیلوں کی وجہ سے غیر حاضر تھیں یا میاں نے پابندی لگا دی ہے۔ اشعار میں کرن صدیقی کا شعر بہت اچھا تھا۔ اس کے بعد اپنے فیورٹ محمود احمد مودی کی کہانی ملاپ پڑھی جو ایک خوبصورت کہانی تھی۔ مودی صاحب کوئی قسط وار کہانی لے کر حاضر ہوں تو بڑا مزہ آئے گا۔ اس کے بعد معز زڈا کو ملک صفدر حیات کی کہانی سے دو دو ہاتھ کیے۔ بڑا مزہ آیا۔''

محمد رمضان رحمانی کی رائے سندھنائی کبیر والا سے ''میرا سابقہ خط ماشاء اللہ آپ کی عزیز اور ہماری دشمن دل و جان یعنی ردی کی ٹوکری ہڑپ کر گئی جس کا بہت افسوس ہوا۔ بہرحال ایک مرتبہ پھر یہ خط لکھ رہا ہوں، امید واثق تو یہی ہے کہ یہ خط ضرور شامل کریں گے اور میرے اشعار بھی۔ اس مرتبہ سسپنس کچھ دیر سے ملا یعنی 25 مارچ کو ملا سب سے پہلے اپنا خط اور شعر تلاش کیا جو ماشاء اللہ ندارد تھے۔ پھر ٹائٹل پر نگاہ گئی تو یوں محسوس ہوا کہ ایک حسینہ مشرق و مغرب اپنے ساجن کے انتظار میں کھڑی سامنے بیٹھے کبوتر کو دیکھ رہی ہے کہ آیا وہ اس کے ساجن کا خط لایا ہے یا کہ نہیں۔ اس حسینہ کے مشرق و مغرب کا چہرہ امید و یاس کا پیکر بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ تصویر مصور کے دل کا آئینہ ہوتی ہے۔ کیا ذاکر انکل کے دل میں بھی کوئی چبھن ہے؟ جو یوں نکال رہے ہیں اگر ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعا ہے وہ ذاکر انکل کی دلی خواہش پوری کرے۔ (آمین) ٹائٹل کے بعد جون ایلیا مرحوم کی حقیقتِ حال پڑھی جو در حقیقت، حقیقت ہے۔ اس کے بعد اپنے پسندیدہ سلسلے یعنی تاریخ جو آج کل ہمارے محبوب مصنف محی الدین نواب صاحب لکھ رہے ہیں کو پڑھا۔ دیوتا اور موت کے سوداگر پڑھے۔ کبھی دیوتا آگے ہوتا ہے تو کبھی موت کے سوداگر۔ ان دونوں سلسلوں کی بات ہی کچھ اور ہے پھر ضیا تسنیم بلگرامی صاحبہ کو پڑھا۔ میرا سسپنس ڈائجسٹ کو پسند کرنے اور مسلسل 20 سال سے پڑھنے کی وجہ یہی چاروں سلسلے ہیں۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

غزالہ شاہ کی تشریف آوری ڈیرہ اسماعیل خان سے ''اپریل کا شمارہ اپنی روایتی آن بان سے ملا سرورق دیکھ کر دل خوش ہوا۔ ذاکر انکل دل خوش کر دیا لیکن ساتھ ہی صنف کرخت کے لیے دعا نکلی۔ یا اللہ کہیں حسن جہاں سوز کو دیکھ کر بے چارے بے ہوش نہ ہو جائیں۔ ارے رے یہ کیا کرسی صدارت پر قندیل رضوان ملک۔ بلے بھئی بلے...... مبارکاں! کچھ تو دل نامراد کی مراد بر آئی۔ میرے خیال میں دال میں کچھ کالا ہے ورنہ صدارت اور ملک صاحب ناممکن۔ یہ انکل کے ساتھ کیا چکر چلایا ہے کہ انکل کرسی دینے پر رضامند ہو گئے ورنہ ہم خود سوچنے پر مجبور ہوں گے خیر ہم بھی بگڑے پنگلوں کو ٹھیک کرنا خوب جانتے ہیں۔ رخسانہ کنول جی پھوپی بن جانے کی خیر سے مٹھائی کب کھلا رہی ہیں اور میری طرف سے بہت بہت مبارک۔ یہ بات ٹھیک کہی کہ اپنی محفل میں اپنا راج آپ کے منہ میں گھی شکر۔ اگر ہماری لکھنے کی یہی روٹین رہی تو وہ دن زیادہ دور نہیں جب ان دل جلوں کو جو دل کے پھپھولے ہی پھوڑتے رہتے ہیں محفل سے آؤٹ کر دیں گے۔ مائی ڈیئر فرینڈ بشریٰ افضل ویلکم! آپ کا تبصرہ بہت شاندار تھا صنف کرخت کو ایسی ہی لفظوں کی بھگو بھگو کر مارتی رہا کرو تا کہ پتا تو چلے کہ ہم بھی کچھ پاور رکھتے ہیں۔ بہت شاندار انشاء اللہ ہماری کمانڈ آپ کو حاصل رہا کرے گی اور باقاعدگی سے شرکت کیا کرو۔ غیر حاضری پر جرمانہ لگ جائے گا۔ اپنی وے صوبیدار محمد اقبال صاحب یہ آپ ماضی کی یاد میں کیوں اتنا کھو جاتے ہیں مجھے تو آپ مظلوم کہیں سے نہیں لگتے کیا بیگم سے اتنا ڈرتے ہیں کہ محفلِ خطوطاں میں ذکرِ خیر کے بغیر گزارہ نہیں۔ بہرحال صوبیدار صاحب اب اتنا بھی کیا ڈرنا خالہ، ساحر اور محمد اشرف واہ دل خوش کر دیا واقعی آپ کے نامی گرامی لیڈروں نے ہار مان لی ہے۔ وہ تھے ہی نہیں تو بلیک لسٹ میں کیسے ہوتے۔ محمد فراز کاٹھیا۔ یہ کاٹھیا کا کیا مطلب ہے ذرا لالٹین سے روشنی ڈالیں ابھی تو آپ کو اور بھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ یہ آنکھوں کی اداسی تو کچھ بھی نہیں آئندہ آپ کا خط رشوت دے کر بھی شامل نہیں ہوگا نوٹ کر لیں۔ کاجل مکرجی آپ کے بیٹے کی بیماری کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا اللہ پر بھروسا رکھیں انشاء اللہ' اللہ پاک اسے صحتِ کاملہ عطا کرے گا۔ ہماری دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں۔ کہانیوں میں موت کے سوداگر اف اللہ کیا شاندار اسٹوری ہے ایک ہی نشست میں ختم کر کے اٹھی۔ ہائے لہو ہائے پانی نواب صاحب نے زبردست لکھی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ محمود احمد مودی صاحب آپ کی کہانیاں میں بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ دیوتا اچھی رہی۔ سات سمندر پار سے صغیر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ قارئین کے لیے اپنا قیمتی وقت نکال کر توشئہ خاص چھپواتے ہیں۔ سودمند غلطی کاشف زبیر صاحب کی بہت اچھی رہی کہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ پردیس والوں کو وطن چھوڑ کیا کیا مشکلات پیش آئی ہیں۔ یہ واقعی ایک رہنما تحریر تھی۔ شگفتہ پروین فیصلے اور فاصلے زبردست کاوش تھی۔ بہت اچھی پڑھ کر واقعی بہت متاثر ہوئی ہوں۔ ملک صفدر حیات معز زڈا کو شاندار رہی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی آدمی لڑکی نے بھی متاثر کیا۔ ٹی وی اور منظر امام کی ایک محبت دو افسانے بھی اچھی کاوش تھیں۔''

عبدالغفار ساغر کے فرمودات بہاولپور سے ''اپریل کا شمارہ بھی اس بار کچھ اپنی اور کچھ اچھے دوست کی وجہ سے کچھ تاخیر سے موصول ہوا۔ خیر سرورق پر نگاہ پڑی۔ لال ہری چوڑیاں پہنے دوشیزہ نظر آئی۔ کہانیوں کی فہرست کھنگالی اور دیکھا کہ کن کن صاحبان نے ماہنامے میں شرکت فرمائی ہے۔ سبھی رائٹرز اچھے تھے تو تحریریں بھی ضرور اچھی ہوں گی۔ خوب مزہ آئے گا پڑھنے کا اس کے بعد خطوط پر آئے اور لازمی بات ہے کہ سب سے پہلے اپنا خط ڈھونڈا جب نظر پڑی تو خوشی ہوئی کہ آپ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی خوب کرتے ہیں شکریہ۔ اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ نواب صاحب کی ہائے لہو ہائے پانی پڑھی۔ نواب صاحب کے قلم کی طاقت کا جواب نہیں۔ ملاپ اچھی تحریر تھی۔ دیوتا بھی اچھی جا رہی ہے اب آگے دیکھتے ہیں کہ جمائلہ بی بی کیا کچھ کرتی ہیں اور سونیا صاحبہ الپا کی بات مان کر جلد ہی چلی جاتی ہیں یا ابھی بلڈرز کی مزید کچھ عرصہ میزبانی میں رہتی ہیں۔ ایک محبت دو افسانے پڑھی واقعی سچی محبت لازوال و بے مثال ہے۔ سلیم انور صاحب کو پڑھ کر سبق ملا کہ برے کام کا انجام بھی برا ہی ہوتا ہے۔ نرگس کے پھول پڑھی آج کل ہر انسان (تقریباً) اپنی کسی نہ کسی خوبی پر مغرور ہے اور پھر سیر کو سوا سیر ہی ملتا ہے۔ ملک صاحب کو پڑھا اور ان کی ذہانت کو داد دی کہ وہ کس طرح مجرم کی شہ رگ تک جا پہنچتے ہیں اور بٹ صاحب کا اندازِ تحریر سونے پر سہاگا۔ ادیب صاحب کی تحریر کا عنوان واقعی تحریر کے مطابق پرفیکٹ رکھا۔ خدا ایسے سُتّا طاربنے والوں سے خود ہی پوچھے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر نے دل کچھ بوجھل سا کر دیا حالات انسان کو کچھ سے کچھ بنا ڈالتے ہیں۔ دنیا تماشا بناتی ہے اور پھر خود ہی اس سے لطف اندوز بھی ہوتی ہے۔ محفلِ شعر و سخن پر آئے۔ اوّل انعام یافتہ شعر پسند آیا۔ موت کے سوداگر بھی اچھی جا رہی ہے۔ کاشف زبیر صاحب نے بھی اچھا لکھا واقعی انسان مجبوری میں کچھ اور ہوتا ہے اور بعد میں کچھ اور ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات سے واقعی ایمان تازہ ہوا۔ اپریل کا ماہنامہ بالکل مکمل لگا۔ مرزا ظفر بیگ صاحب کی تحریر کچھ مختصر تھی مگر اچھی تھی۔ آخری کہانی بھی بہت اچھی تھی۔ شگفتہ پروین صاحبہ نے زبردست لکھا۔ محبت ہر دور میں ایثار اور قربانی مانگتی آئی ہے۔ محبت کرنے والے ہر دور میں ہر امتحان میں سرخرو ہوتے آئے ہیں۔

مسز زاہدہ نواز نے کراچی سے فون کر کے تبصرہ کیا۔ ”جب سے دیوتا کا آغاز ہوا ہے تب سے میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ کہانی میں کچھ وقفہ بھی رہا تاہم دوبارہ رابطہ بحال ہو چکا ہے۔ تاریخی کہانی بہت اچھی چل رہی ہے۔ مختصر کہانیوں میں محمود احمد مودی کی ملاپ، منظر امام کی ایک محبت دو افسانے زیادہ پسند آئیں۔ ملک صاحب کی ڈائری سے انتخاب خصوصی طور پر کشش کرتا ہے۔ دیگر میں متاطر ہنے والے، آدھی لڑکی اور نقب زن اچھی لگیں۔ محبت اور قربانی کے موضوع پر شگفتہ پروین کی فیصلے اور فاصلے بہت اچھی کہانی تھی۔ پذیرائی ہوئی تو آئندہ بھی شرکت کرتی رہوں گی۔“

زین العابدین جتوئی کا تبصرہ سندھ سے ”نئے سال کا چوتھا شمارہ ہاتھ میں آیا تو احساس ہوا کہ وقت کتنی تیزی سے اپنی مسافتیں طے کر رہا ہے۔ ہر آنے والا لمحہ گزرنے والے لمحے کو دھکیل دھکیل کر گزرے ہوئے وقت کا انبار کھڑا کیے دے رہا ہے۔ ماہ اپریل کا ٹائٹل دیکھا۔ ایک پیلی حسینہ پیلے ہی دوپٹے کا کونا سنبھالے حیرت واستعجاب میں ڈوبی ہوئی ہے۔ سائیڈ میں مینار پر موجود ایک کبوتری اپنے عاشق نامراد کو اپنے پاس بلا رہی ہے۔ فہرست میں جھانکا اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کا نام نہ دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ اپنی محفل میں اس امید کے ساتھ جھانکا کہ انکل اس مرتبہ تو ہماری سسپنس سے محبت کی لاج رکھ لیں گے مگر یہ کیا ہمارا خط تو رہا ایک طرف ہمارا نام تک شامل نہ تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنے محبوب ترین رائٹر اقلیم صاحب کی شاہکار موت کے سوداگر کا مطالعہ کیا۔ ڈینی اب ہر طرف سے مشکلات میں گھر گیا ہے۔ چاذفان نے بھی ڈینی کو پیٹھ دکھلا دی۔ مرزا ظفر بیگ کی ٹی وی تو ہمارے سر پر سے گزر گئی کچھ سمجھ نہ آیا۔ ملک صفدر حیات کی مفرور ڈاکو یا معزز ڈاکو (جانے درست نام کیا ہے) پڑھی۔ بے پناہ سسپنس کی حامل اس کہانی کا ہمیں تو آخر تک انجام پتا نہ چلا سکا۔ نقب زن میں جیک کے ساتھ اچھا ہوا یچ۔ کہا کسی کا خون ناحق کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔“

خوشی ایمان کا تبصرہ...... چکلالہ راولپنڈی سے ”سسپنس کے قارئین میں تو ایک لمبے عرصے سے شامل ہوں۔ میں نے ابو جان سے یہ شوق ورثے میں پایا ہے لیکن محفل میں حاضری آج پہلی دفعہ دے رہی ہوں۔ ٹائٹل کی حسینہ کو غالباً وہ مل گیا ہے جس کا اسے انتظار تھا لیکن اس قدر ٹیکنی کلر دوشیزہ دیکھ کر اس بچارے کے ذوقِ سلیم پر جو قیامت ٹوٹے گی اس کا اندازہ کر کے ہم صنفِ کرخت سے بے اختیار گہری ہمدردی محسوس کر رہے ہیں۔ اسکائی کلر کی شرٹ۔ ساتھ پیلا دوپٹا، لال، ہری اور سفید چوڑیاں، ریڈلپ اسٹک، ٹیکنی کلر غالباً اسی کو کہتے ہیں۔ ذاکر انکل نے یہ ستم ہم خوش ذوق خواتین پر ڈھایا ہے یا بھوتوں کی شامت آئی ہے۔ خیر...... سالوں کی۔ اشتہارات سے گزرتے ہوئے فہرست تک پہنچ گئے۔ توقع کے عین مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان موجود تھی۔ جون ایلیا کی حقیقت حال جاننے کی خواہش خاصی بے ضرری ہے لیکن ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہتے ہیں، وہ جنہیں جاننے کی ضرورت ہے وہ حقیقت سے ڈرتے ہیں کیونکہ حقیقت انہیں ان کے فانی ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ محفل میں راج بلیک اینڈ وائٹ لوگ کر رہے تھے، کیونکہ ہمارے قومی شاعر کا کہنا ہے۔ ”وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں ہر رنگ“ اور بحیثیت قوم ہم صنفِ کرخت کو پھر بلیک اینڈ وائٹ ماننے پر مجبور ہیں۔ ویسے حضرت تاریخ کے مطالعے سے ہر دور میں آپ کا ہرجائی پن اور ہماری وفا ثابت شدہ ہے۔ چاہے بادشاہ ہو یا فقیر سب مرد ایک سے ہوتے ہیں اور خواتین محبت کی خاطر جان دینے والی۔ محمد فراز صاحب کیا ہتھیار ڈال رہے ہیں! ہمت کریں کہ کم از کم یہ تو کہہ سکیں، مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا۔ لو جی یہ بھی خوب ہوا۔ خواتین و حضرات ایک ضروری اعلان سنیے۔ بلال اعوان نے انسان ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے۔ بلال بھائی۔ کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس۔ محمد نعمان الحق کی نصیحت قابلِ غور ہے۔ اور اسی لیے سب سے اچھا خط آپ کا ہی ہے۔ مبارکاں...... کاجل بی بی کے بیٹے کے لیے بہت بہت دعائیں۔ اللہ کرے وہ جلد صحت یاب ہو جائے...... آمین۔ تاریخ کے ایک اداس دور سے باہر نکلے تو اپنی موسٹ فیورٹ ”دیوتا“ پر آرکے۔ اس دفعہ تو کہانی ون سائیڈڈ ہی رہی۔ فرہاد علی تیمور جیسا شہزور بھی چونک گیا۔ جمائکہ چیز ہی ایسی ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ اسلام کا واقعہ اچھے انداز سے آگے بڑھ رہا ہے۔ قبطی قوم پر جن عذابوں کی خبر قرآن پاک میں دی گئی ہے۔ کیا وہ اس جادوگروں والے واقعے سے پہلے نہیں تھے۔ میرا یہی خیال تھا لیکن یہاں ان کا ذکر نہیں ہوا اس کا مطلب ہے وہ بعد کے واقعات ہیں۔ آخری صفحات پر شگفتہ پروین جلوہ افروز تھیں۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ مہرین کو آصف سے تو گلہ تھا محبت میں شرط لگانے کا لیکن خود اس نے کیا کیا؟ وہ بھی تو مشروط محبت چاہتی تھی ناں! ڈیلفائن کا کریکٹر کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیا ایک ملازمہ مالک سے جیلس ہو رہی تھی۔ مہرین تو ہوٹل کی مالک تھی۔ ڈیلفائن کا اس کے ساتھ چکر...... اونہوں۔ سمجھ سے باہر ہے، ارسلان شراب پینے کی وجہ سے اس کے دل سے اتر گیا تھا تو کیا علی رضا کی حرکت اس نے بھلا دی۔ یوں لگا جیسے اس کی نانی خود اس کی شادی علی رضا سے ہی کروانا چاہ رہی تھی۔ بہرحال اوورآل ایک اچھی کہانی تھی...... دوسروں کی خوشیوں کی خاطر اپنی خوشیاں قربان کرنے کی۔ محمود انکل نے غالباً ”ملاپ“ ڈورتھی کے ایثار کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے لکھی تھی۔ اچھی کہانی تھی۔ ایک محبت دو افسانے بھی عورت کے ایثار اور محبت پر لکھی گئی تھی۔ ایک تاریخی حقیقت کے ساتھ منسلک یہ کہانی بھی اچھی تھی۔ نقب زن مزے کی لگی۔ اپنے ہاتھ بچا کر انتہائی خوبصورت طریقے سے انتقام لیا گیا۔ کرس کی پلاننگ زبردست تھی۔ ضروری نہیں مجرم محض ثبوت نہ ہونے کے باعث ہر جگہ سے باعزت بری ہو جائے۔ بعض دفعہ سزا مل ہی جاتی ہے۔ ”آدھی لڑکی“ ڈاکٹر ساجد امجد کی خوبصورت کہانیوں میں سے ایک تھی، اسی لیے کہتے ہیں کہ آپ کے آس پاس لاکھوں ایک جیسے تجربے ہی کیوں نہ بکھرے ہوں۔ اپنے ذاتی تجربے کا حق ہمیشہ محفوظ رکھیں۔ یہ آپ کو زندگی کے کسی موڑ پر، عمر کی کسی منزل پر ادھورا نہیں ہونے دے گا۔ اس ماہ کے شمارے میں ایک خاص کمی تھی اور وہ تھی ٹوٹوں کی پلیز یہ ٹوٹے نہ کاٹا کریں۔ کھول کر دیکھا تو کہیں بھی کوئی چھوٹی موٹی مسکراہٹ نظر نہ آئی حالانکہ وہ تو ہمارے سسپنس کی جان ہے۔“

ریحانہ سعید کی باتیں کھری سانگھڑ سے ”حسبِ توقع 23 تاریخ گزار کے 24 کو رسالہ ہاتھوں میں آیا تو ہم کچھ دیر حیران وپریشان کبوتری کو دیکھتے رہے کہ یہ اپنے ماہی سجن کے انتظار میں اتنی بے قرار کیوں ہے تو یہ سوال اپنے دل سے پوچھا تو پتا چلا کہ اچھا اس لیے...... ٹائٹل گرل کو حسینہ تو نہیں کہہ سکتی کیوں کہ یہ دیکھنے میں ہی 30 سے اوپر کی لگتی ہے۔ گلابی گال، لال ہونٹ لال ہری چوڑیاں پیلا دوپٹا کچھ خاص تاثر قائم نہیں کر سکا۔ صرف بھوری آنکھیں پیاری اور پلکیں ہی اچھی لگی۔ اشتہار اور فہرست پر ایک نظر ڈالی اور پھر انشائیہ پڑھا۔ جون ایلیا نے کہہ دیا کہ ہر آدمی کو رائے رکھنے دو اس لیے میں بھی اپنی رائے اپنے پاس رکھتی ہوں۔ آپ کے خط میں سب سے پہلے قندیل رضوان ملک میری طرف سے مبارک آپ کا تبصرہ میری سمجھ میں تو آ گیا مگر میں اسے اچھا اس لیے نہیں کہوں گی کہ آپ نے دوسروں کی باتیں دوبارہ لکھی ہیں۔ رخسانہ کنول پھوپی بننے پر مبارک ہو کیا آپ کو بلیاں پالنے کا بہت شوق ہے جو کالی بلی کا سن کر اتنی خوشی ہوئی ہے؟ سید طاہر رضا سب سے پہلے تو آپ اس بار اپنا نام پڑھ کر ہی کافی جل گئے ہوں گے کیونکہ آپ کو اس بار انکل نے صنفِ نازک کا

نام سونپ دیا ہے دوسری بات آپ صنف نازک سے زیادہ فری ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اپنے ننھے منے سوال کے ذریعے...... تیسری بات آپ حد سے آگے بڑھ گئے اور مجھے تو حیرت ہے آپ کے الفاظ انکل نے رسالے میں کیسے چھاپ لیے۔ کیا عورتوں سے اس لہجے میں بات کی جاتی ہے؟ کیا تمہارے گھر میں ماں بہن نہیں ہے جو دوسری عورت کی شرم و حیا پر انگلی اٹھانے چلے۔ انکل جی پلیز میرے الفاظ سنسر مت کرنا۔ بشریٰ افضل شعر نہ شامل ہونے کا مسئلہ میرے ساتھ بھی بہت ہوتا ہے۔ صوبیدار محمد اقبال کا خط اور خطوط پہ تبصرہ اچھا لگا۔ انکل باقاعدہ تبصرہ کرتے رہیے مردوں میں آپ کا ہی خط کچھ اچھا ہوتا ہے ورنہ تو آج کل لڑکیاں بھی خط ایسے لکھتی ہیں کہ اللہ حافظ...... ڈاکٹر صبا نواز بھٹی اور ڈاکٹر سید عطا المصطفیٰ بخاری آپ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ کم سے کم اس سے ہمارے شہر سے خط شامل ہونے کی تعداد ہی بڑھ جاتی ہے سو جلدی آئیں کیونکہ لو انٹری کا بورڈ سائڈ پر کھڑا کیا ہوا ہے۔ کہانیوں میں دیوتا پہلے پڑھی لیکن گرمی ہونے کے باوجود اپنی جگہ جم گئی ہے۔ موت کے سوداگر اس بار بہار کی کلی کی طرح خوشبو دے رہی تھی ماضی میں جھانکا تو محی الدین نواب اور ضیا تسنیم بلگرامی، ملک صفدر حیات کے آگے پیچھے تھے اور کافی اسپیڈ سے بھاگ رہے تھے۔ چھوٹی کہانیوں میں ''ملاپ''، ''ایک محبت دو افسانے'' اور ''نرگس کے پھول'' اچھی کہانیاں تھی۔ محفل شعر و سخن میں تیسرا شعر اچھا لگا باقی شعر بھی اچھے تھے۔''

جیا بلوچ کی خیریت اوکاڑہ سے ''امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ خوبصورت آنکھوں والی حسینہ ٹائٹل پر سجی تھی لگتا تھا سجن پردیسی کو چٹھی بھیجی ہے لیکن وہ پھر بھی نہیں آیا اس لیے رو رہی ہے سے زکام ہو گیا ہے بہر حال ٹائٹل خوبصورت تھا۔ انکل مجھے آپ سے ایک شکایت ہے آپ نے میرا نام جیا کے بجائے حنا چھاپ دیا ہے۔ میرا نام ج + ی + ا = جیا ہے۔ سید تمکین فاطمہ کو شادی کی اور رخسانہ کنول کو بھتیجے کی مبارک ہو، کاجل مکرجی خدا آپ کے بیٹے کو صحت دے۔ سید طاہر رضا کوے کھا کر آئے لگتے تھے۔ محمد فراز کاٹھیا آپ کے خطوں میں کوئی کام کی بات ہو تو انکل شائع کریں۔ کہانیاں ابھی پوری نہیں پڑھی ہیں۔ ہائے لہو ہائے پانی بہت ہی اچھی لگی۔ دیوتا بھی زبردست رہی موت کے سوداگر میں بہت ہی Suspense تھا۔ اب پتا نہیں امر کی پہنچ گئے ہیں ہوٹل یا جاؤ فان غداری کر رہا ہے۔ ملک صفدر حیات اس بار متاثر نہیں کر سکے۔ محتاط رہنے والے، سود مند غلطی، نرگس کے پھول اور ایک محبت دو افسانے بہت پسند آئیں۔''

محمد ظفر اللہ ضیا کی حاضری کمالیہ سے ''اپریل کا سسپنس اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ سرورق کی حسینہ کے ہاتھوں میں پیلے رنگ کا رومال دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ جیسے حسینہ اپنے محبوب کو بسنت ساتھ منانے کی خوشخبری دینا چاہتی تھی۔ مگر پھر حکومت کی طرف سے لگائی جانے والی پابندی کا سن کر آنکھیں نم ناک ہو گئیں کہ سارے خواب ادھورے رہ گئے۔ ویسے ذاکر صاحب نے اس بار ٹائٹل میں مغلیہ دور کی کچھ تعمیراتی جھلک بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے کبوتر بھی ایک جگہ تشریف فرما ہے۔ جون ایلیا کا انشائیہ ''حقیقتِ حال'' واقعی حقیقت حال کی ترجمانی کر رہا ہے۔ کرسی صدارت پر قندیل رضوان ملک کو تشریف فرما دیکھ کر احساس ہوا کہ انسان کو صبر کا پھل آخر مل ہی جاتا ہے۔ قندیل صاحب دوبارہ خط نہ چھپنے پر صبر کرتے رہے اور پھر کرسی صدارت پر بٹھا دیے گئے۔ جیا بلوچ کی یہ تجویز قابلِ تعریف ہے اور ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ جو لوگ اور جو ممالک ہمارے عقیدے اور مذہب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہم کیوں ان کی مصنوعات استعمال کرتے ہیں، ہمیں ذہنی اذیت دینے والے ان لوگوں کی مصنوعات کا بائیکاٹ کر کے اپنی حُبّ الوطنی اور اسلام سے محبت کے جذبے کو فروغ دینا چاہیے۔ بلیک کیٹ BZU کی طالبہ ہیں مگر نام سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی فلمی دنیا کی اداکارہ ہوں۔ بلیک کیٹ صاحبہ کو چاہیے کہ اپنے نام میں کچھ تبدیلی کر لیں۔ ایسا نہ ہو کہ کاتب کی معمولی سی غلطی سے وہ ''بلیک کیٹ'' سے ''بلیک مارکیٹ'' بن جائیں۔ ویسے بھی بلیوں کا یونیورسٹیوں میں کیا کام...... بلیاں تو قصابوں کی دکانوں کے باہر ہوتی ہیں کہ شاید چھیچھڑے مل جائیں۔ بشریٰ افضل یونس روغانی سے الجھتی نظر آئیں۔ کاجل مکرجی کے خط سے معلوم ہوا کہ ان کا ڈھائی سالہ بیٹا بیمار ہے۔ اللہ رب العزت سے دلی دعا ہے کہ ان کے بیٹے کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ بچے تو گھر کی رونق اور آنکھوں کا نور ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ اگلے خط میں اپنے بچے کی صحت یابی سے متعلق ضرور آگاہ فرمائیں گی۔ صوبیدار محمد اقبال صاحب اپنی عمر اور تجربے کے لحاظ سے بہت منکسر المزاج ثابت ہو رہے ہیں۔ جس پر وہ بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ورنہ ہمارے کچھ جوشیلے بہن بھائی تو ان کی عمر کا لحاظ کیے بغیر اوٹ پٹانگ باتیں لکھنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ہاں ان کے خطوط سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ماہنامہ سسپنس تین نسلوں کا میگزین ہے۔ دادا، بیٹا اور پوتا...... کیونکہ وہ اپنے خطوط میں بعض کو بیٹا یا بیٹی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور بعض کو پوتا، پوتی بھی کہہ دیتے ہیں۔ فراز کاٹھیا کو ایم بی اے میں ایڈمیشن لینے پر مبارک باد۔ کہانیوں میں محمود احمد مودی کی ''ملاپ'' متاثر کن تحریر تھی کہ کیسے بعض لوگ اپنی ذات کے بجائے دوسروں کو ترجیح دے کر قربانی کے جذبات کی انوکھی مثال پیش کر دیتے ہیں۔ مرزا ظفر بیگ کا ئی...... وی تو دنیا کا کوئی عجوبہ ہی تھا جو پیش آنے والے واقعے کی پیشگی خبر نشر کر دیتا تھا مگر کہانی کا انجام سر سے گزر گیا کہ مسز اسمتھ نے اس سے کیا خاص کام لینا تھا۔ سلیم انور کی تحریر ''نقب زن'' دیومالائی کہانی لگتی تھی۔ زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ محفلِ شعر و سخن گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہی ہے کبھی تو آپ اسلامی، تاریخی، اور سبق آموز اشعار پر انعامات دینے لگتے ہیں اور کبھی افسانوی اشعار کو انعام کا مستحق قرار دے کر ہمیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔''

نعمان ارشد عدی کا شکوہ چکلالہ سے ''سرورق بہتر تھا ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ذاکر انکل نے شاید ہی کبھی حسینہ کو دوپٹا سر پر پہنایا ہو اس کے بعد بے تابی سے خطوط کی محفل میں چھلانگ لگائی لیکن یہ کیا؟ اتنا اچھا تبصرہ کرنے کے باوجود بھی میرا خط شائع نہ ہوا اب عہد کر لیا ہے کہ اس خط کے بعد کبھی خط نہ لکھوں گا۔ پانچ روپے کا لفافہ ضائع کرنے کی بجائے کسی فقیر کو دے کر نیکی کر لوں گا اور نہ خط شائع ہونے کی ٹینشن نہ انتظار۔ آپ کو مبارک ہو ماہنامہ دلکش کی ویسے اب تو وہ محاورہ صادق آتا ہے ''پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں'' یعنی پانچ ڈائجسٹ۔ کیا بات ہے ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ دوسروں کے خطوط کو سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے اور میرے کو کوّے کے۔ بہر حال تبصرہ حاضر ہے ''ہائے لہو ہائے پانی میں اختری کے انجام پر افسوس ہوا اور کامران مرزا کی حرکت پر دکھ۔'' ''دیوتا میں فرہاد اور سونیا کا جمائلہ سے خوف زدہ ہونا ذرا پسند نہیں آیا۔ وردان کا انجام بہت عبرت ناک ہوا'' ''ایک محبت دو افسانے'' نے دلگرفتہ کر دیا بہت اثر پذیر کہانی تھی کافی دیر گم صم رہ گئے ہم۔ ملاپ اچھی کہانی تھی سوسن کی غلط فہمی دور ہو گئی ہمیں خوشی ہوئی۔ ''آدھی لڑکی'' میں روزی کے انجام پر دل مسوس کر رہ گئے۔ بے چاری کو ملوا ہی دیتے کوئی محبوب۔ محفل شعر و سخن میرے شعر کے بغیر سونی سونی سی لگ رہی تھی بہر حال اچھے اشعار تھے۔ حلوے کے لالچ میں ''موت کے سوداگر'' میں ویرا کا اسلام قبول کرنا پسند آیا پلیز ان کی جلد شادی کروا دیں لیکن کہانی کو ''آتش فشاں کی طرح ختم

نہ کر دیا۔ آخر میں بے پناہ تجسس رکھا گیا ہے یہ نہ ہو کہ وہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا والی بات ہو جائے۔ "سود مند غلطی" محسن علی سے سود مند غلطی ہوئی اور وہ
فائدے میں رہ گیا جبکہ فائدہ خسارے میں...... حضرت موسیٰ علیہ السلام پڑھ کر دلی مسرت ہوئی پلیز اگلی دفعہ غیر حاضری نہ ہو "ٹی وی" پڑھ کر حالانکہ یہ دیکھنے
کی چیز ہوتی ہے بس مسکرا کر رہ گئے۔"

شبنم اینڈ لیاقت کی مشترکہ شرکت دودہ بھلوال سے "ماہ اپریل 2006 کا رسالہ 26 تاریخ کو ملا۔ سرورق اچھا ہے۔ ذاکر انکل کو مبارک باد۔
اشتہارات کے بعد محفل میں پہنچے۔ قندیل رضوان انعام کے حقدار پائے۔ قندیل صاحب مبارک ہو۔ باقی دوستوں کے خطوط پسند آئے۔ کاجل نگر جی اللہ
آپ کے بیٹے سمیر کو صحت عطا فرمائے۔ محمد انعام الحق صاحب ہمیں واقعی اخلاق سے گری ہوئی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ امید ہے سب دوست آپ کے
مشورے پر عمل کریں گے۔ اب کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے دیوتا پڑھی۔ سب کردار ایکشن میں نظر آئے۔ وردان مقام اجل کو پہنچ گیا۔ موت
کے سوداگر پڑھی...... جہاں ڈیلی اور برنارڈ کے درمیان ٹھن گئی ہے۔ اب دیکھیں ڈیلی کیسے بچتا ہے۔ جناب نواب محی الدین کی کہانی ہائے لہو ہائے پانی
پڑھی۔ یہ مغلیہ دور کی اچھی کاوش ہے۔ کامران مرزا نے واقعی اخلاقی سی گری ہوئی حرکت کی۔ اختری کا انجام اداس کر گیا۔ اس کے بعد شگفتہ پروین کی فیصلے
اور فاصلے پڑھی۔ اس کہانی کی مجھے سمجھ نہیں آسکی۔ ملک منظور حیات کی معزز ڈاکو پڑھی اس سے ملتی جلتی کہانی پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ چوہدری غفار کی طرح
ہمارے ہاں بھی کچھ عاقبت نا اندیش لوگ موجود ہیں۔ سود مند غلطی کاشف زبیر کی اچھی کاوش ہے۔ نرگس کے پھول میں کاجل ور ماجیسی عورتیں زندگی کے ہر
شعبے میں کامیاب رہتی ہیں۔ نقب زن میں جیک حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی نذر ہو گیا۔ کرس نے جیک سے اچھا انتقام لیا۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ
ہیں۔ محفلِ شعر و سخن میں پہلا شعر انعام یافتہ پسند آیا۔"

اسما حسین کا نامہ لاہور سے "ٹائٹل کی خاتون تو کافی دلکش دکھائی دیں اور سونے پر سہاگا کہ ان کا نام بھی ساتھ ہی لکھا ہوا تھا۔ بعد میں دلکش رسالے
کے متعلق پڑھ کر سوچا چلو اس کی مبارک باد دیتی چلوں۔ کچھ عرصہ خط نہیں لکھ سکی مگر اپریل کے رسالے نے پھر سے قلم اٹھانے پر آمادہ کیا۔ ہائے لہو ہائے پانی
میں اختری کے نصیب پر واقعی افسوس ہوا۔ بادشاہوں کے حالات حقیقی دنیا میں کس قدر عجیب سے ہوتے ہیں ورنہ بچپن کی کہانیاں تو ہمیشہ ہنسی خوشی رہنے لگے
سے آگے نہیں بڑھتیں۔ ملاپ اور ایک محبت دو افسانے اچھی لگیں۔ دیوتا میں جمائلہ نے فرہاد کو بھی تنکوں کی طرح اڑ جانے پر مجبور کر دیا۔ مگر اس بار کا اینڈ کوئی
زیادہ سسپنس نہیں رکھتا تھا۔ بہر حال ابوالہول کے مجسمے کی تکرار خوب رہی، کیا واقعی جمائلہ اس کے مجسمے کے بغیر بیکار ہے؟ نرگس کے پھول نے کچھ زیادہ متاثر
نہیں کیا۔ ہاں نقب زن اور معزز ڈاکو کا قصہ خوب رہا۔ ش صغیر ادیب نے شیخ صاحب کو باکمال مسلمان دکھایا کہ غش کھا گئے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کیا
سائیکولوجسٹ ہیں؟ بہر حال ان کا آدھی لڑکی کا تجزیہ شاندار تھا۔ کاشف زبیر کی سود مند غلطی سے ہوشیار ہی رہیے تو بھلا ورنہ یہ غلطی نقصان دہ بھی ثابت
ہو سکتی ہے۔ حضرت موسیٰ کا واقعہ تو نہایت عمدگی سے رواں دواں ہے۔ شگفتہ پروین نے سائپرس کی سیر کے ساتھ ساتھ وہاں کی روایات کو بھی بخوبی ہم تک
پہنچایا۔ اس ماہ کا رسالہ شاید مجھے اس لیے بھی زیادہ پسند آیا کہ رائٹرز نے سیری سالگرہ کے موقع پر تحفتہً زیادہ اچھی کہانیاں تحریر کیں۔"

حفظہ غزل کی روداد راولپنڈی سے "اس ماہ کا سسپنس اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ملا۔ جی ہاں رعنائیاں ہی کہیں گے کہ سرورق کی حسینہ کی
مسکراہٹ دل لے گئی اور رنگوں کا امتزاج کچھ ایسا خوبصورت کہ سرورق پر بہار ہی بہار نظر آرہی تھی۔ حسینہ سے آگے بڑھی تو ایک اور حسینہ ہمیں کیئر سے رنگ
گورا کرنے کے بارے میں بتانے لگی پھر ہم نے French لگی ڈبل روٹی سے لطف اندوز ہو کر جام شیریں سے پیاس بجھائی۔ سپر ایشیا سے پیچھا چھڑا کر
آگے بڑھی تو صافون صابن لینا پڑا پھر سوڈا وائٹ کی حسینہ سے ملاقات کرتی ہوئی فہرست پر نظر ڈالی تو نواب انکل کا نام پھر ستارے کی طرح جگمگا رہا تھا پھر
اپنی محفل میں پہنچے تو وہاں کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ قندیل رضوان کا شکریہ کہ انہوں نے شعر پسند کیا۔ رخسانہ کنول کو پھوپھو بننے پر بہت بہت مبارک ہو
اور شکریہ بھی کہ میری غیر موجودگی میں انہوں نے روحانی صاحب کا روغن خوب اتارا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے نواب انکل کی "ہائے
لہو ہائے پانی پڑھی" انہوں نے تاریخی واقعات جس طرح بیان کیے بے حد خوبصورت انداز ہے۔ اس کے بعد اپنی پسندیدہ کہانی موت کے سوداگر کی طرف
بڑھی تو دیرا کے مسلمان ہونے کی خبر ملی، بھئی واہ سلطان شاہ نے تو معرکہ مار لیا لیکن اب اسے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے کیونکہ اب یہ اس کا امتحان ہے کہ وہ نو مسلم دیرا
کو اکیلا چھوڑ دیتا ہے یا اسے سہارا دیتا ہے۔ ویسے غزالہ اور ڈیلی کو اسے سمجھانا چاہیے۔ دیوتا ہمیشہ کی طرح بڑے خوبصورت انداز سے آگے بڑھ رہی ہے،
چھوٹی کہانیوں میں سلیم انور کی نقب زن میں کرس نے بہت انوکھے انداز میں اپنی بہن کا بدلہ لیا۔ ش صغیر ادیب کی کہانی بھی خوبصورت اندازِ بیان لیے ہوئی
تھی۔ حضرت موسیٰ کے واقعات بہت ہی پیارے انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ جس کے لیے ضیا تسنیم بلگرامی مبارک باد کی مستحق ہیں۔ آخری صفحات کی
کہانی بھی بہت خوبصورت تھی، ایثار اور محبت کا ایک نیا روپ سامنے آیا۔ اشعار میں جویریہ سلیم، ایم کے بھولی، سعید احمد شاہ اور گڑیا جی کے اشعار بہت پسند
آئے۔"

عرشیہ بٹ کی چہلیں گوجرانوالہ سے "سرورق پر موجود لڑکی کو اگر "حسینہ" کا لقب دے دیا جائے تو پھر اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے
ملانے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ پھر اشتہاروں سے بچتے بچاتے بہ مشکل تمام فہرست تک پہنچے۔ فہرست کو ہم نے کچھ ایسی قاتل نگاہوں سے گھورا کہ وہ
ہمیں فوراً ہی انشائیہ تک لے گئی۔ دل میں چونکہ ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس لیے فوراً سے پہلے محفل ہوٹنگ میں پہنچے ہائے...... ! اللہ آپ کا بھلا کرے خطوط میں
ہمارا نام ندارد اور بلیک لسٹ کی نذر، گہری سانس خارج کرتے ہوئے باقی بہن، بھائیوں کی تحریر میں ملاحظہ فرمائیں۔ سب سے پہلے تو قندیل ملک کو صدارت
کی کرسی پر بڑی شان و شوکت سے براجمان ہونے پر مبارکباد وصول کرنی چاہیے لیکن جیسے جیسے ان کا خط پڑھتے گئے دل گردے دہلتے گئے۔

اور اب اجازت تاہم اس سے قبل ان قارئین کا ذکر جن کے نامے اس محفل کی رونق نہ بن سکے۔ فرید احمد خان، سکھر۔ رانا ارشاد طاہر، شہر سلطان۔ ایم
سرور انجم، دہاڑی۔ عادل شمسی، جمبرہ فیصل آباد۔ جرل اعوان، خیر باڑی ہزارہ۔ قندیل رضوان ملک، تلہ گنگ، ساجد عباس اعوان، حافظ آباد۔ فرہاد
علی، بہاولپور۔ راجا ثاقب نواز، رتی ہٹی ساہیوال۔ ریاض بٹ، حسن ابدال۔ طاہر الدین بیگ، میرپور خاص۔ مدد علی، لاڑکانہ۔ یونس علی رونمانی، پشاور۔ مسز
لیہا اظہر، ساہیوال۔ محمد اشفاق خان، ظفر سعید، سانگھڑ۔ نذر حسین آصف، فیصل آباد۔ نجمہ بخاری، اٹک۔ مس قمر مغل، راولپنڈی۔ ارشد علی ولہ، جھنگ۔ حوالدار
نصر حیات، راولپنڈی۔ نوشی، جمبرہ، فیصل آباد۔ محمد سلمان، بہاولنگر۔ آغا عدی عبداللہ، نامعلوم۔ ہما اکبر نواز چوہان، ڈیرہ اسماعیل خان۔

ماضی کا آئینہ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے وہ واقعات جن میں درس عبرت بھی ہے اور لذتِ فسانہ بھی

محی الدین نواب

درمیان والے

بابر اپنے بیٹے ہمایوں پر نثار ہوا، ہمایوں اپنے بھائیوں کے ہاتھوں در بدر ہوا، اس کے بھائی اس کی جان کے دشمن تھے اور اس کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف عمل ..... یہ ہمایوں پر برا وقت تھا، تقدیر اس سے روٹھی ہوئی تھی جسے منانے کی کوئی صورت بہ ظاہر اسے نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک کے بعد دوسری مصیبت ..... انہی مصائب و آلام کے دوران اسے ایک بیٹے کی ولادت کی خوش خبری ملی مگر اس دل شکن حقیقت کے ساتھ کہ وہ نومولود اس کے دشمن بھائیوں کے قبضے میں تھا۔ اکبر کی دنیا میں آمد اور اپنے باپ تک پہنچنے کی کہانی۔ اس کے کچھ کرداروں سے سب ہی واقف ہیں۔ مگر کچھ کردار ایسے بھی تھے جنہوں نے پردہ اخفا میں اپنے فرائض انجام دیے انہیں گو زیادہ شہرت نہیں ملی مگر تاریخ کے اوراق پر ان کا ذکر موجود رہا۔ محی الدین نواب نے ایسے ہی کرداروں سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا اور اپنی محنت شاقہ اور عرق ریزی سے یہ جواہر پارے نکال کر پیش کیے۔ مخلاتی سازشوں اور اقتدار کی غلام گردشوں میں چکراتی کہانیاں، سینہ بہ سینہ کنیزوں سے غلاموں اور ان کے ذریعے تاریخ نویسوں تک پہنچنے والی یہ عبرت ناک داستانیں آج بھی کہیں دھرائی جارہی ہیں۔

رانده درگاہ کسی کو کہا جا سکتا ہے تو وہ ہمایوں تھا۔ مقدر کی بارگاہ سے بار بار ٹھکرایا جا رہا تھا۔ ایسی بے بسی، بے کسی اور لاچاری سے جگہ جگہ بھٹک رہا تھا کہ بعض اوقات ہوش سے بیگانہ ہو جاتا تھا۔ تکالیف اور صدمات سے ٹوٹ کر چور چور ہو کر کبھی نیم مردہ سا ہو جاتا تھا۔ کبھی اپنی ذات کو بھول کر صرف اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا اور توبہ کرتا رہتا۔ اپنی جانی انجانی غلطیوں کی معافیاں مانگتا رہتا تھا۔

دیکھا جائے تو وہ گناہ گار نہیں تھا۔ اس نے کبھی جان بوجھ کر کوئی غلطی نہیں کی۔ کبھی انجانے میں کوئی خطا سرزد ہو جاتی اور بعد میں خبر ہوتی تو وہ اس کی بھرپور تلافی کرتا تھا۔ کوشش کرتا تھا، کبھی کسی وقت کی نماز قضا نہ ہو۔ اس کے دل میں خوفِ خدا تھا۔ محلات کی شہزادیاں ہوں یا کنیزیں.... جو بھی پسند آتی تھیں، اُن سے نکاح ضرور پڑھایا اور جسے شریکِ حیات بنایا، اس سے بھرپور محبت کی، اس کی ہر ضرورت پوری کی۔ اختری کے ساتھ ایک رات گزارنے کے بعد اس پر توجہ نہ دے سکا۔ لیکن اپنی والدہ سے یہ کہہ چکا تھا کہ اس کا پورا خیال رکھا جائے۔ اسے زیادہ سے زیادہ عزت دی جائے اور مرتبہ بلند کیا جائے۔

یوں بھی ان دنوں اس کی کوئی دوسری بیوی نہیں تھی۔ ایک بیگہ بیگم تھی، جسے غلطیوں کی سزا دی گئی تھی اور اس سے علیحدگی اختیار کر لی گئی تھی۔ چونکہ اختری واحد شریکِ حیات رہی۔ اس لیے اسے ملکہ معظمہ کا درجہ حاصل تھا۔

لیکن وہ بدنصیب تھی۔ حالات نے اسے دربدر کر دیا تھا۔ تقدیر حمیدہ بانو کو ہمایوں کی زندگی میں لے آئی تھی۔ اختری کی اہمیت اس لیے تھی کہ وہ ایک بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ ابھی ہمایوں کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ اس بیچاری پر کیا گزر چکی ہے؟ ادھر حمیدہ بانو نے ایک بیٹے (اکبر) کو جنم دیا تھا۔ ان حالات میں اختری کی اہمیت اس لیے کم ہو گئی کہ اس بیچاری کا کوئی خاندانی پس منظر نہیں تھا۔ حمیدہ بانو اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے حسب و نسب کے پیشِ نظر اسی کے بیٹے اکبر کو فوقیت حاصل ہو گئی۔

بدترین حالات نے ماہم بیگم اور اختری کو اس سے چھین لیا تھا۔ وہ اپنی ماں کی خیریت معلوم کر سکتا تھا اور نہ ہی اپنے بچے کی ماں بننے والی اختری کی کوئی خبر لے سکتا تھا۔ جب حالات کی جلتی ہوئی دھوپ میں ایک ٹھنڈی میٹھی خوشخبری ملی کہ حمیدہ بانو کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا ہے تو اس خبر نے اس کی تکالیف کو بدبختی کے احساسات کو کم کر دیا۔ اس کے اندر ایک نیا حوصلہ پیدا ہوا کہ وہ اس ولی عہد کے لیے اپنے باپ فردوس مکانی (بابر) کی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ حاصل کرے گا۔

وہ اتنی بڑی خوشخبری ماں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اختری زچگی سے فارغ ہو گئی ہے یا نہیں؟ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے یا نہیں؟

وہ امرکوٹ جا کر اپنے بیٹے اکبر کو دیکھنے کے لیے بیتاب تھا۔ لیکن اس کے خلاف سازشوں کا سلسلہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔ جیسل میر کے راجا نے اسے پیغام بھیجا تھا۔ ''بادشاہ ہمایوں کا سواگتم۔ ہم آپ کے سیوک ہیں۔ اس راجواڑے کو اپنا سمجھ کر اوش پدھاریں۔ ہم آپ کی سیوا کے لیے حاضر ہیں۔''

راجا کی دھرم پتنی رانی سمترا نے کہا۔ ''ہمایوں کی مہمان نوازی آسان نہیں ہو گی۔ اس کے ساتھ ہزاروں سپاہی ہوتے ہیں۔ ان سب کو کھلانے پلانے کے لیے ہر روز سیکڑوں من اناج درکار ہو گا۔''

راجا نے کہا۔ ''اری بھاگوان! تم چنتا کیوں کرتی ہو؟ میں کچھ سوچ سمجھ کر ہی ہمایوں کو یہاں آنے کا نیوتا دے رہا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''یہ بھی تو سوچیں کہ وہ صرف اناج کے بھوکے نہیں ہوں گے۔ عورتوں کے بھوکے ہوں گے۔ پتا نہیں کتنی مدت سے اپنا وطن چھوڑ کر، اپنا گھر چھوڑ کر نکلے ہوئے ہیں۔ یہاں آتے ہی ہماری رعایا کی بہو بیٹیوں پر پل پڑیں گے۔ جب واپس جائیں گے تو پتا چلا گے کہ ہمارے راج کی سیکڑوں کنواریاں مائیں بننے والی ہیں۔''

''تم بڑی دور کی سوچتی ہو اور بڑی دور کی بولتی ہو۔ میں تو ہمیشہ نزدیک کی بات سوچتا ہوں۔ آج کے بعد کل اور کل کے بعد پرسوں نہیں ہونے دیتا۔ اگر ہمایوں کا لشکر آج یہاں پہنچے گا تو میں ایسی چال چل رہا ہوں کہ وہ کل کسی کام کا نہیں رہے گا۔''

رانی نے حیرانی سے پوچھا۔ ''آپ ایسا کیا جادو کرنے والے ہیں؟''

''تم راج پاٹ کے ہتھکنڈوں کو نہیں سمجھتی ہو۔ ہمایوں شیر خان سوری سے ہار کر منہ چھپا کر ادھر آ رہا ہے۔ شیر خان سے میری بات ہو گئی ہے۔ اگر میں ہمایوں کے پورے لشکر کو اپنی زمین پر بلاؤں گا تو اسی رات شیر خان سوری کی فوج اسے چاروں طرف سے گھیر لے گی۔ اس بار ہمایوں کو بھاگنے کا موقع نہیں ملے گا۔ شیر خان اسے قید کر لے گا یا جان سے مار دے گا۔ یہ اس کا اپنا معاملہ ہے لیکن میرے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ شیر خان سوری نے وعدہ کیا ہے کہ

میرے راج کے آس پاس کی جو زمینیں ہیں۔ وہ مجھے دے دی جائیں گی اور وہ میری چھوٹی سی فوج کے لیے پچاس بندوقیں بھی دے گا۔ اس کے سپاہی ہمارے سپاہیوں کو بندوقیں چلانا سکھائیں گے۔''

رانی نے کہا۔ ''میں نے ہمایوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ دیوتا سمان ہے۔ غریبوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس نے ایک غریب سقے کو اپنے تخت پر بٹھایا تھا۔ اپنا تاج پہنایا تھا اور اسے بہت ساری دولت بھی دی تھی۔ آپ اس کے برے وقت میں اس کے کام آئیں گے تو وہ بھی آپ کو مالا مال کر دے گا۔''

''وہ کیا مالا مال کرے گا؟ اس کا تو راج پاٹ چھن گیا ہے۔ تمام خزانوں پر شیر خان نے قبضہ جما لیا ہے۔ وہ بالکل کنگال ہو گیا ہے۔ اس کے پاس تو اپنے رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم مجھے نہ سمجھاؤ' میں عورت کی عقل سے نہیں' اپنی بدھی سے کام کرتا ہوں۔''

اس نے اپنے سالے سے کہا۔ ''میں ہمایوں کے نام ایک چٹھی لکھ رہا ہوں۔ تم ہرکارے بن کر اس کے پاس جاؤ اور یہ اسے دے دو۔''

رانی سمترا نے بڑی رازداری سے اپنے بھائی کو کمرے میں بلایا۔ پھر کہا۔ ''میں نے تمہارے جیجا جی سے چھپا کر ایک چٹھی لکھی ہے۔ تم اسے بھی بادشاہ ہمایوں تک پہنچا دو۔''

وہ دونوں چٹھیاں لے کر اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا ہمایوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پہلے راجا کا خط پیش کیا۔ ہمایوں نے اسے پڑھ کر کہا۔ ''تم ایک گھڑی آرام کرو۔ ہم ابھی جواب لکھ کر دیں گے۔''

اس نے کہا۔ ''جواب لکھنے سے پہلے اسے بھی پڑھ لیں۔''

اس نے وہ دوسری چٹھی پیش کی۔ ہمایوں نے پوچھا۔ ''یہ کس نے لکھی ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں دراصل چٹھیاں لانے والا ہرکارہ نہیں ہوں۔ راجا کا سالا اور رانی سمترا کا بھائی ہوں۔ یہ میری بہن نے آپ کے نام لکھی ہے۔''

ہمایوں اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ اس نے لکھا تھا۔

''بھائی ہمایوں...! میں آپ کو دیوتا سمان بھائی مان کر یہ لکھ رہی ہوں۔ میرے پتی دیو آپ کے شبھ چنتک (خیر خواہ) نہیں ہیں۔ انہوں نے شیر خان سوری سے معاملہ کر لیا ہے کہ جب آپ اپنے لشکر کے ساتھ یہاں آئیں گے تو شیر خان اچانک ہی رات کے اندھیرے میں حملہ کرے گا۔ میرے پتی آپ سے دشمنی کر رہے ہیں لیکن مجھے بہن مان کر میرے پتی کی اس غلطی کو معاف کر دیں۔ ایک بہن کے اس پیار کو سمجھیں کہ میں اپنے پتی سے چھپ کر یہ چٹھی لکھ رہی ہوں۔ آپ کی بھلائی چاہتی ہوں۔ اس لیے اِدھر آنے کا کشٹ نہ کریں۔ کوئی ایسا جواب لکھ بھیجیں کہ مجھ پر الزام نہ آئے اور میرے پتی بھی مجھ سے ناراض نہ ہوں... آپ کی شبھ چنتک بہن۔ رانی سمترا.....''

ہمایوں نے اس خط کو چومتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنی بہن کے پیار کو اور اس کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔ اس نے وقت سے پہلے ہمیں خطرے سے آگاہ کیا ہے۔''

اس نے ایک خط میں اسی طرح عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے بہن کو سلام پیش کیا اور کہا۔ ''ہمارے حالات سازگار ہوئے تو ہم ضرور اپنی بہن کے پیار کا یہ قرض چکائیں گے۔''

اس نے دوسری چٹھی راجا کے نام لکھی۔ ''آپ نے نیوتا دیا ہے۔ ہمیں آپ کی زمینوں پر آ کر بہت خوشی ہوگی لیکن ہم موجودہ حالات میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہیں۔ فی الحال اپنے چھوٹے لشکر کے ساتھ آپ کی طرف نہیں آسکیں گے۔ ہمارا بھائی ہندال اپنے لشکرِ جرار کے ساتھ یہاں آنے والا ہے۔ ہم دونوں بھائی شیر خان سوری سے جنگ لڑنے کے لیے اپنی فوجی قوت بڑھا رہے ہیں۔ فتح حاصل کرنے کے بعد آپ سے ضرور ملیں گے۔ فی الوقت معذرت خواہ ہیں۔''

اس نے اس جھوٹے اور فریبی راجا کو یہ جھوٹ لکھ دیا کہ ہندال لشکرِ جرار کے ساتھ آ رہا ہے۔ وہ دونوں بھائی مل کر شیر خان سوری کو شکست دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہ تحریر پڑھ کر وہ یقیناً مرعوب ہو جاتا اور یہ خبر شیر خان تک بھی پہنچتی کہ ہمایوں بالکل ہی کمزور نہیں ہے۔ اسے سندھ کے اس دور دراز علاقے میں آ کر ہمایوں سے مقابلہ کرنا بہت مہنگا پڑے گا۔

اس کے اس خط نے واقعی اپنا کام دکھایا۔ جیسل میر کے راجا نے شیر خان سوری کو لکھ بھیجا۔

''جہاں پناہ کی جے ہو... ہم نے بادشاہ ہمایوں کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ اپنی فوجی طاقت بڑھاتا جا رہا ہے۔ اس کا بھائی ہندال اپنے بھاری لشکر کے ساتھ اس کے پاس آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے' اس کے دوسرے بھائی بھی اپنے اپنے لشکر لے کر اس سے آملیں۔ ابھی آپ اِدھر آنے کا کشٹ نہ کریں۔''

شیر خان سوری نے کامران مرزا سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اس کے لیے آگرے تک پہنچنے کا راستہ آسان کرے گا تو وہ

کے بدلے میں لاہور کو کامران مرزا کے حوالے کر دے گا اپنے لشکر کے ساتھ کبھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔

پھر کامران مرزا نے یہی کیا تھا۔ ہمایوں کو دھوکے سے بلوایا تھا۔ اس طرح شیر خان سوری نے بڑی آسانی آگرے اور دہلی پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس قدر کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد وہ اپنی زبان سے پھر گیا۔ اس نے کامران مرزا سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ پورے ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ لاہور چھوڑ کر کابل چلے جائے۔ وہ اس طرف کبھی نہیں آئے گا۔

کامران مرزا اور عسکری مرزا نے شیر خان سے دوستی کرنے کے لیے اپنے بھائی ہمایوں سے دشمنی کی تھی۔ اب شیر خان کی وعدہ خلافی پر وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ ان کا تادم خم نہیں تھا کہ اس کا مقابلہ کرتے۔ لہٰذا چپ چاپ چھوڑ کر کابل چلے گئے۔ ہندوستان پر نہ تو وہ خود حکومت کر سکے تھے اور نہ ہی ہمایوں کو کرنے دی تھی۔

اب شیر خان سوری نے جیسل میر کے راجا کا خط پڑھ کر کہا۔ ''جو جھوٹے اور فریبی ہوتے ہیں ہم ان سے دوستی کرتے ہیں اور نہ ہی کیا ہوا وعدہ پورا کرتے ہیں۔ کامران مرزا اور عسکری مرزا جب اپنے بھائی کے نہ ہوئے تو وہ ہمارے کیا ہوتے؟ انہوں نے ایک ہی باپ کی اولاد ہو کر ایک دوسرے سے بدترین دشمنی کی۔ ایسے لوگ اپنے باپ کے بھی نہیں ہوتے۔ اس لیے ہم نے انہیں بھی ہندوستان سے بھگا دیا۔''

اب راجا کا خط پڑھ کر شیر خان سوری کو یہ یقین ہو گیا کہ کامران مرزا اور عسکری مرزا اس سے دھوکا کھانے کے بعد اب اپنے بھائی ہمایوں سے متحد ہو گئے ہوں گے۔ ان کی طاقت بہت بڑھ گئی ہو گی۔ لہٰذا دہلی اور لاہور کا تخت چھوڑ کر انہیں بڑھنا چاہیے۔ جب وہ تمام بھائی متحد ہو کر ادھر آئیں گے تو دیکھا جائے گا۔

امرکوٹ کا راجا رانا پرشاد مل، حمیدہ بانو بیگم اور ہمایوں کا مہمان تھا۔ وہ اپنا دکھڑا سناتے ہوئے بولا۔ ''قریبی علاقے کی جانی بیگ نے میرا کچھ علاقہ چھین لیا ہے۔ آپ مہربانی کر کے میری جاگیر مجھے واپس دلائیں۔''

اس کی دوسری شکایت یہ تھی کہ دوسرے علاقے کے شاہ حسین نے کچھ عرصہ پہلے اس کے باپ کو قتل کیا تھا۔ وہ شاہ حسین کے مقابل کمزور ہے۔ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ نہیں لیتا۔

ہمایوں نے ان دونوں پر باری باری لشکر کشی کی۔ جانی بیگ کو اس کے اپنے علاقے سے بھی بھاگ جانے پر مجبور کر دیا اور شاہ حسین کو گرفتار کر لیا گیا۔

ہمایوں نے کہا۔ ''تم نے ہمارے معزز مہمان کے باپ کو قتل کیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم نے ایک ہندو کو قتل کیا تھا۔ تم مسلم ہو اور الحمدللہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ تمہیں سزائے موت نہیں دے سکتے۔''

شاہ حسین نے کہا۔ ''آپ انصاف پسند بادشاہ ہیں۔ دل میں خوف خدا رکھتے ہیں۔ خدارا ہمیں سزا نہ دیں۔''

''ہم خدا کے خوف سے انصاف کا تقاضا بھی پورا کرنا چاہتے ہیں۔ ہندو ہو یا مسلمان۔ انصاف سب کے لیے برابر ہونا چاہیے۔ یہ بتاؤ، تم نے اسے قتل کیوں کیا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''زمین کے ایک ٹکڑے کے لیے جھگڑا ہوا تھا۔ اس نے تلوار سونت لی تو ہم بھی مقابلے پر آ گئے۔ میں تلوار کا دھنی ہوں۔ مقابلہ شروع ہوتے ہی میں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

ہمایوں نے نیام سے تلوار نکالتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے بھی تلوار سونت لی ہے۔ چلو، ہمیں بھی اپنی تلوار کے جوہر دکھاؤ۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''آپ بادشاہ ہیں۔ میں آپ سے کیسے لڑ سکتا ہوں؟''

''راجا رانا پرشاد مل کا باپ بھی ایک راجا تھا۔ تم نے اس سے مقابلہ کیا۔ لہٰذا باتیں نہ بناؤ۔''

اس کے حکم کے مطابق شاہ حسین کو تلوار دی گئی۔ ہمایوں نے کہا۔ ''یہاں ہمارا سپہ سالار اور دوسرے تمام سپاہی سن رہے ہیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں، اگر تم نے ہمیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تو یہ تمہیں سزا نہیں دیں گے، بلکہ رہا کر دیں گے۔''

یہ سنتے ہی شاہ حسین نے اس پر حملہ کیا۔ ہمایوں نے اس کے حملے کو روکا۔ پھر دونوں میں تلوار بازی کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ لوہے سے لوہا ٹکرا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہی شاہ حسین کو تلوار کا زخم لگا تو وہ بوکھلا گیا۔ ہمایوں نے کہا۔ ''تم تو تلوار کے دھنی ہو۔ بدحواس کیوں ہو گئے؟''

اس نے جوش میں آ کر جوابی حملہ کیا اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ جوش میں آنے والے ہوش میں نہیں رہتے۔

ہمایوں نے پینترا بدل کر دوسرا زخم لگایا تو وہ لڑکھڑا گیا۔ ہمایوں کی تلوار تیسری اور آخری بار اس کے جسم کو کاٹتی چلی گئی۔ وہ زمین پر گرا تو پھر اٹھ نہ سکا۔ تڑپ تڑپ کر وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔

س کا میزبان رانا پرشادل وہاں موجود تھا۔ اس نے
وڑ کر کہا۔ ”دھنواد.. اب ہمارے پتاجی کی آتما کو شانتی
ا۔“
ہمایوں نے کہا۔ ”ہمیں افسوس ہے، ہم نے آپ کے پتا
ے خون کا بدلہ نہیں لیا ہے۔ وہ تلوار بازی کے مقابلے میں
ے گئے تھے۔ اگر وہ بھاری پڑتے تو یہ اسی دن مارا جاتا۔“
وہ حیران ہو کر بولا۔ ”حضور! میں سمجھا نہیں... آپ نے
ے موت کی سزا دی ہے۔ پھر یہ کیوں کہتے ہیں کہ پتاجی
ون کا بدلہ نہیں لیا ہے؟“
”آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ قانون کے مطابق تلوار کے
بلے میں دو میں سے کوئی ایک مارا جاتا ہے اور جو بچ جاتا
سے سزائے موت نہیں دی جاتی۔ انصاف کا تقاضا پورا
تھا۔ اس لیے ہم نے اس تلوار کے دھنی کو مقابلے پر مجبور
یہ حکم دیا کہ مقابلے میں ہم مارے جائیں تو اسے سزا نہ
جائے بلکہ رہا کر دیا جائے۔ ہم مارے جا سکتے تھے لیکن
تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا۔“
رانا پرشادل نے حیرانی سے پوچھا۔ ”آپ نے اتنا بڑا
مول کیوں لیا؟“
”آپ ہمارے معزز میزبان ہیں۔ آپ نے ایک
ش کی تو ہمارا فرض تھا کہ اسے پورا کرتے، سو پورا کر
“
پھر اس انصاف پسند بادشاہ نے اپنے ایک ملازم سے
۔ ”ہمارے لیے پانی رکھو۔ ہم نماز سے پہلے غسل کریں
۔“
ایسے وقت ایک قاصد نے آکر یہ خبر سنائی کہ کامران
انے ماہم بیگم، گلبدن بیگم، گلنار آغاچہ اور نارگل آغاچہ کو
کر دیا تھا۔ وہ چاروں دلدار بیگم کے پاس آگئی
ں۔ وہاں بڑے آرام سے تھیں لیکن ماہم بیگم اچانک بیمار
ہو گئیں اور دو دنوں کی بیماری کے بعد وفات پا گئیں۔
اپنی والدہ محترمہ کی وفات کی خبر سن کر ہمایوں صدمے
ے نڈھال ہو گیا۔ راجا رانا پرشادل اور دوسرے امرا اس
دکھ میں برابر کے شریک تھے۔ وہ اس قدر غم زدہ تھا کہ
صد باقی خبریں نہ سنا سکا۔ الٹے قدموں وہاں سے چلا
یا۔ یوں بھی وہ اختری کے بارے میں کوئی صحیح خبر سنا نہیں
تا تھا۔ جتنی بیگمات کامران مرزا کی قید میں تکالیف اٹھا چکی
یں وہ سب اختری سے بدظن تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ
ری کامران مرزا اور گل رخ بیگم کے زیرِ اثر آ گئی ہے۔ ان
ے اشاروں پر چلتی ہے۔ اس لیے اسے بڑی عزت سے رکھا

گیا ہے۔
ان بیگمات میں سے کوئی اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتی تھی۔ کسی نے یہ بھی معلوم کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ اس نے ہمایوں کے بیٹے کو جنم دیا ہے یا نہیں...؟ چونکہ وہ بدظن ہو گئی تھیں اس لیے یہ تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں تھیں کہ جو پیدا ہوا ہوگا وہ ہمایوں کا ہی بیٹا ہوگا۔

جلال الدین اکبر کی پیدائش کے پینتیس دنوں کے بعد ہمایوں نے امرکوٹ پہنچ کر بیٹے کو دیکھا۔ پھر اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر چومتے ہوئے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے۔ ہماری مرحومہ آکم مادر کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔ افسوس کہ وہ ایک پوتے کو گود میں کھلانے کی حسرت لیے اس دنیا سے چلی گئیں۔“

پھر اس نے حمیدہ بانو سے کہا۔ ”تم نے ہم ماں بیٹے کی ایک دیرینہ خواہش پوری کی ہے۔ ہماری نظروں میں تمہارا مرتبہ ہمیشہ بلند رہے گا۔ تم تمام بیگمات سے افضل اور برتر رہا کرو گی۔“

وہ بیٹے کو اسی طرح ہاتھوں میں اٹھائے حرم سے باہر امرا کے درمیان آ گیا۔ تمام حاضرین بچے کے لیے مبارک سلامت کہنے لگے۔

ہمایوں نے کہا۔ ”ہم آپ تمام حضرات کے سامنے اعلان کرتے ہیں کہ قسمت نے ساتھ دیا اور ہندوستان پر تیموری خاندان نے پھر سے غلبہ حاصل کیا تو ہمارا یہ لختِ جگر جلال الدین اکبر تخت و تاج کا جانشین ہوگا۔“

تمام حاضرین ہاتھ اٹھا کر ہمایوں اور اکبر کی سلامتی کے لیے اور کھوئے ہوئے وقار کی بحالی کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔ ہمایوں نے بیٹے کو حمیدہ بانو کی گود میں پہنچایا۔ پھر واپس آکر ان امرا کے درمیان بیٹھ گیا۔ وہاں مستقبل کے بارے میں بحث ہونے لگی کہ آئندہ کیا ہونا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے؟

سوتیلے بھائیوں میں صرف ہندال اس کے ساتھ تھا۔ اس کے پاس کوئی بہت بڑا لشکر نہیں تھا۔ سپاہیوں کے پاس تیر، تلوار اور نیزے تھے لیکن بندوقیں کم تھیں۔ ایک امیر نے کہا۔ ”ہندوستان کا رخ کرنے سے پہلے فوجی قوت بڑھانی بہت ضروری ہے۔“

دوسرے امیر نے ہمایوں سے کہا۔ ”حضرت جہاں بانی! .....آپ کو ایران جا کر فوجی مدد اور اسلحہ حاصل کرنا چاہیے۔“

ایران کے بادشاہ طہماسپ صفوی کے بابر مرحوم سے دیرینہ تعلقات تھے۔ یہ توقع تھی کہ وہاں سے یقیناً فوجی امداد حاصل ہو سکے گی۔

ہمایوں حرم میں آیا تو حمیدہ بانو نے کہا۔ ''آپ ہمیں بھی ساتھ لے چلیں۔ شاہ ایران کی ہمشیرہ شہزادی سلطانہ ہماری بچپن کی سہیلی ہے۔ ہر سال جشن نوروز مناتے وقت ہمیں نہیں بھولتی۔ ہمارے لیے کوئی نہ کوئی قیمتی تحفہ ضرور بھیجتی ہے۔ ہم اسے آپ کی روداد سنائیں گے تو وہ ہمارے لیے اپنے طور پر ضرور کچھ کرے گی۔''

وہ سفر کی تیاری کرنے لگے۔ اب مسئلہ شیر خوار اکبر کا تھا۔ ایران تک ایک طویل اور دشوار گزار سفر تھا۔ اس ننھے سے بچے کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں تھا۔ وہ امرکوٹ سے بھکر آئے۔ دلدار بیگم نے کہا۔ ''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم اپنے پوتے کو سنبھالیں گے۔ اسے یہاں سے قندھار لے جائیں گے۔ وہاں ہمارا ہندال ہے۔ اس کی پھوپھی گلبدن ہے۔ سب ہی اس کی دیکھ بھال کریں گے۔ تم بے فکر ہو کر ایران کی طرف روانہ ہو جاؤ۔''

پھر اکبر کو دودھ پلانے کی بات نکلی۔ یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اس کی دایہ کون ہوگی؟ قنوج کی جنگ کے وقت شمس الدین خان نے بڑی ہی شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ اپنی جانثاری کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ ہمایوں اس سے متاثر ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی ماہم انگہ اکبر کی دایہ کے فرائض انجام دے۔ لیکن یہ فرائض انجام دینے کے لیے اور بھی ایسی کئی خواتین تھیں' جو مرتبے میں ماہم انگہ سے بلند تھیں۔ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دلدار بیگم نے فیصلہ کیا کہ اکبر کو پہلے چچی انگہ دودھ پلائے گی۔ پھر بچے کو فخر النساء زوجہ ندیم کو کہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کے بعد بھی دوسری چند دائیوں نے اکبر کو اپنا اپنا دودھ پلایا۔ آخر مستقل طور پر دودھ پلانے کا اعزاز ماہم انگہ کو ہی حاصل ہوا۔

☆☆☆

گل رخ بیگم پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ اختری اپنی خوابگاہ میں لہولہان پڑی ہوئی ہے۔ وہ معمولی خادمہ اس کے لیے بہت اہم تھی۔ آیندہ اس کے ذریعے بہت بڑی بازی جیتنے والی تھی۔ ہمایوں کے خلاف جتنی سازشیں اور عداوتیں ہو رہی تھیں' اُن کا توڑ یہی تھا کہ جب کبھی کامران مرزا اس کی گرفت میں آتا تو ایسے وقت ہمایوں کے سامنے اختری اور اس کے بیٹے کو پیش کر کے معافی کا راستہ ہموار کیا جا سکتا تھا۔

گل رخ بیگم غصے سے بڑبڑاتی ہوئی ایک راہداری سے گزرتی ہوئی اس خوابگاہ میں آئی تو فرش پر اختری کو لہولہان دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ دور تک پھیلا ہوا لہو کہہ رہا تھا کہ حمل ساقط ہو چکا ہے۔ ہمایوں کے جس بیٹے کو مہرہ بنایا جانے والا تھا۔ وہ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر چکا ہے۔

اختری نے زہریلی گولیاں کھا کر خودکشی کی تھی۔ زہر اس قدر زوداثر تھا کہ فرش پر گرتے ہی اس کا دم نکل گیا تھا۔ اگر وہ کچھ دیر زندہ رہتی تو شاید بچہ اس کے وجود سے نکل آتا۔

گل رخ بیگم نے حکم دیا۔ ''فوراً دائیوں کو بلاؤ۔''

دو بوڑھی اور تجربہ کار دائیوں کو پیش کیا گیا۔ گل رخ بیگم نے کہا۔ ''دیکھو! بچہ پیٹ میں زندہ ہے یا نہیں؟ جلدی کچھ کرو۔ اگر وہ زندہ نکلا تو ہم تمہیں مالا مال کر دیں گے۔''

بچہ پیٹ میں مکمل تھا۔ دس بارہ دنوں میں زچگی ہونے والی تھی۔ دائیوں نے اپنے آزمودہ حربوں سے اسے نکالا تو اس کے زندہ رہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زود اثر زہر نے اسے گوشت کا لوتھڑا بنا دیا تھا۔

ایک دائی نے کہا۔ ''بیٹا ہوا تھا۔ مگر افسوس...''

گل رخ بیگم نے غصے سے تلملا کر اختری کے منہ پر ایک ٹھوکر ماری۔ ''کمینی...! بدذات نے مرتے مرتے ہمارے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔ کتے کی بچی! مر چکی ہے۔ ہم اسے اور کیسے ماریں؟''

پھر اس نے دائیوں کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے....''

وہ دونوں سر جھکائے وہاں سے بھاگتی چلی گئیں۔ اس نے اپنے بیٹے کامران مرزا کو وہاں بلایا۔ پھر غصے سے ٹہلنے لگی۔ پاؤں پٹخ پٹخ کر اختری کو گالیاں دینے لگی۔ غصے کی آگ اس قدر بھڑکی ہوئی تھی کہ آتش فشاں بنی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' اس مرنے والی کے ساتھ کیسا سلوک کرے؟ وہ ایک اردابیگنی سے چابک لے کر اس کی لاش پر برسانے لگی۔ ہر چابک پر اسے گالیاں دیتی جا رہی تھی۔

کامران مرزا نے آ کر ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر حیرانی اور پریشانی سے اختری کی لاش کو دیکھنے لگا۔ کچھ بتانے سے پہلے ہی بہت کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''اوہ خدایا! یہ کیسے ہو گیا؟''

گل رخ بیگم نے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ ''اس نے خودکشی کی ہے۔ اپنے ساتھ بچے کو بھی مار ڈالا ہے۔''

کامران مرزا نے ناگواری سے کہا۔ ''آہ کم مادر! اگر آپ اس پر ظلم نہ کرتیں تو یہ کبھی اپنی جان نہ دیتی۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''ہمیں الزام نہ دو۔ ایسے کم ظرف اور چھوٹے لوگوں کو پاؤں کی جوتی بنا کر رکھو' تب ہی یہ سیدھے رہتے ہیں۔ ہم نے اپنے باپ' دادا پردادا سے جو

سیکھا ہے، وہی کیا ہے۔''

''بعض حالات میں ظلم اور تشدد سے نقصان پہنچتا ہے اور وہ ہمیں پہنچ چکا ہے۔ برادر بادشاہ اور ان کی والدہ نے اختری کو سر پر بٹھایا تھا۔ آپ اسے پاؤں کی جوتی بنا رہی تھیں۔ اس نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ آئندہ بھی اسے پاؤں تلے روندا جائے گا۔ جب ماں کے ساتھ ایسا کیا جائے گا تو پھر پتا نہیں بیٹے کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا؟ اس مرنے والی نے بہت کچھ سوچا ہوگا۔ تب ہی جان دی ہے۔''

''کیا تم ہمیں الزام دینے سے باز نہیں آسکتے؟''

''چلیں۔ ہم الزام نہیں دیں گے۔ آپ بھی غصہ تھوک دیں اور یہ سوچیں' اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''کرنا کیا ہے؟ اس کی لاش قلعے سے باہر پھکوا دو۔ چیل' کوے اور گدھ اسے نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ ہم فصیل پر کھڑے ہو کر دیکھیں گے۔ تب ہی ہمارا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا۔''

''آپ پھر غصے سے بول رہی ہیں۔ عقل سے یہ نہیں سوچ رہی ہیں کہ اس کی موت کی خبر ہمایوں تک بھی پہنچے گی تو ہماری یہ بات کبھی نہیں مانی جائے گی کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ یہی سمجھا جائے گا کہ ہم نے اُس کے ہونے والے جانشین کو ختم کر دیا ہے۔''

گل رخ بیگم نے قائل ہو کر کہا۔ ''ہاں۔ یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس ذلیل خادمہ نے خودکشی کر کے ہمیں مجرم بنا دیا ہے۔ ہم ہمایوں کی نظر میں اس کے ہونے والے... جانشین کے قاتل بن چکے ہیں۔''

قلعے کے اندر ایک پورا لشکر موجود تھا۔ شاہی محل میں پہرا دینے والے سپاہیوں کی ایک محدود تعداد تھی۔ حرم میں صرف مسلح اُردابیگیاں' خواجہ سرا اور کنیزیں تھیں۔ گل رخ بیگم نے کہا۔ ''ابھی صرف دو دائیوں کو معلوم ہے کہ یہ مر چکی ہے۔ اردابیگیاں اور خواجہ سرا ہمارے وفادار ہیں۔ وہ کبھی ہمایوں کے سامنے زبان نہیں کھولیں گے۔''

کامران مرزا نے اردابیگیوں سے کہا۔ ''ان دو دائیوں کو حرم سے باہر نہ جانے دیا جائے۔ کنیزوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ اختری نے خودکشی کی ہے۔ آئندہ ہمیں کیا کرنا ہے' یہ ہم ذرا سکون سے سوچیں گے۔''

اس نے غصے سے اختری کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے ماں سے کہا۔ ''آپ اپنی خوابگاہ میں چلیں۔ ہم وہاں باتیں کریں گے۔''

پھر اردابیگیوں سے بولا۔ ''باہر رات کی تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ اس لاش کو کپڑے میں لپیٹ کر فصیل پر جاؤ اور پیچھے والی کھائی میں پھینک دو۔ یہاں کے قالین کی اچھی طرح صفائی کراؤ۔ خون کا ایک چھینٹا بھی نظر نہیں آنا چاہیے۔''

وہ حکم دے کر ماں کے ساتھ وہاں سے چلتا ہوا اس کی خوابگاہ میں آیا۔ پھر بولا۔ ''ہمیں بار بار یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ برادر بادشاہ بہت ہی خوش بخت ہے۔ اگر اسے ایک طرف سے نقصان ہوتا ہے تو فوراً ہی دوسری طرف سے سنبھلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ تو آپ نے پہلے ہی سن لیا تھا کہ اس نے حمیدہ بانو سے نکاح پڑھوایا ہے۔''

''یہ ہم نے گیارہ ماہ پہلے سنا تھا۔''

''اب ایک بری خبر سنیں۔ ہمارے مخبر نے اطلاع دی ہے کہ حمیدہ بانو نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔''

گل رخ بیگم نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا واقعی..؟''

''یہ پکی خبر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اب آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ اختری اور اس کے ہونے والے بچے کی موت سے برادر بادشاہ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا۔''

گل رخ بیگم نے کہا۔ ''پھر بھی اختری کا یہ بیٹا زندہ رہتا تو ہمایوں کو خوشی ہوتی کہ اس کے دو بیٹے ہیں۔ وہ اپنے اِس بیٹے کی سلامتی اور واپسی کی خاطر تمہاری غلطیوں کو معاف کر دیتا۔ اب کیا ہوگا؟ یہ سوچ سوچ کر پریشانی بڑھ رہی ہے۔ خون خشک ہو رہا ہے۔''

''آپ زیادہ فکرمند نہ ہوں۔ برادر بادشاہ اپنے بدترین حالات سے گزر رہا ہے۔ ایسے آثار نہیں ہیں کہ اسے کہیں سے کوئی بہت بڑی فوجی مدد ملے گی تو وہ ہم چڑھ دوڑے گا۔ آپ جانتی ہیں' ہماری اور عسکری مرزا کی لشکری قوت کتنی ہے؟ وہ ہمارے سامنے ابھی دم نہیں مار سکے گا۔''

''اللہ کرے اسے موت آئے۔ نہ وہ شکست کھاتا ہے' نہ فتح حاصل کرتا ہے۔ ابھی نہ تو اِدھر کا ہے' نہ اُدھر کا۔ مگر اس کی خوش بختی ایک ننگی تلوار کی طرح ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے۔''

وہ اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پھر ایک جگہ رک کر بولا۔ ''ایک تدبیر سوجھ رہی ہے۔''

گل رخ بیگم نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''اگر ہم ابھی سے یہاں ایک نوزائیدہ بچے کی پرورش کریں اور آئندہ بھی اسے ہمایوں کا بیٹا کہہ کر اس کے سامنے پیش کریں تو کیسا رہے گا؟''

ماں نے خوش ہو کر کہا۔ ''بڑی اچھی تدبیر ہے۔ ایسے وقت ہم بیان دیں گے کہ اختری زچگی کے بعد وفات پا گئی تھی۔ ماہم بیگم بھی اس دنیا میں نہیں رہی ہے۔ ہم جس کسی

بچے کو ہمایوں کا بیٹا بنا کر پیش کریں گے تو اعتراض کرنے والی کوئی ہستی نہیں رہے گی۔''

وہ بولا۔ ''برادر بادشاہ اگرچہ شک وشبے میں مبتلا رہے گا۔ پھر بھی نجومیوں کی پیشگوئی اسے سمجھاتی رہے گی کہ وہ بیٹا اسی کا ہے۔''

گل رخ بیگم نے کہا۔ ''شک وشبے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اختری کی خاص خدمت گار روحی صبا ہماری نمک خوار ہے۔ ہم نے لاہور میں ہمایوں سے جھوٹ بولا تھا' اسے فریب دیا تھا کہ اختری پاک دامن ہے۔ اس سلسلے میں صبا روحی نے ہمارے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی۔ بلکہ ہمارا ساتھ دیا تھا۔ آئندہ بھی وہ ہمارا ہی ساتھ دے گی۔''

روحی صبا کو طلب کیا گیا۔ وہ فوراً ہی حاضر ہو کر سر جھکا کر بولا۔ ''آپ کی یہ نمک خوار' خدمت گار حاضر ہے۔''

گل رخ بیگم نے کہا۔ ''تجھے یہ سن کر صدمہ پہنچے گا کہ اختری کا حمل ساقط ہو گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ جانبر نہ ہو سکی.... وفات پا چکی ہے۔''

روحی صبا کے دل و دماغ کو ایسا دھچکا لگا کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ گل رخ بیگم نے کہا۔ ''ہمیں بھی اس کی موت کا بے حد افسوس ہے۔ تُو ہمارے منصوبوں کو اچھی طرح جانتی ہے۔ ہم اس کے بیٹے کو کبھی نہ کبھی ہمایوں بادشاہ کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔''

وہ بولا۔ ''آپ نے ہمیشہ مجھے بھروسے کے قابل سمجھا ہے۔ اپنے رازوں میں شریک کیا ہے اور میں نے کبھی آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔''

کامران مرزا نے کہا۔ ''ہمیں یقین ہے' آئندہ بھی تم ہماری رازدار بن کر رہو گی۔ فی الحال اختری کی موت کو چھپایا جا رہا ہے۔ ہم جلد از جلد ایک ایسا نوزائیدہ بچہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جو شاہی خاندان کا لگتا ہو۔ اگر فردوس مکانی (بابر) اور برادر بادشاہ سے کچھ مشابہت رکھتا ہو تو یہ اور بھی اچھی بات ہو گی۔ بہرحال یہ ہمارا معاملہ ہے۔ ہم اس سے نمٹ لیں گے۔ تمہارا ایمان یہ ہو گا کہ اختری نے ایک بیٹے کو جنم دینے کے بعد وفات پائی تھی۔''

روحی صبا کے دل سے ایک آہ نکلی۔ ''آہ....! بیچاری بیٹا پیدا کرنے کی حسرت میں مر گئی۔ اس کی جگہ ایک نقلی بیٹا پیش کیا جائے گا۔ یا اللہ! ان شاہی محلوں میں کیسی کیسی سازشیں ہوتی رہتی ہیں؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''میں حکم کی بندی ہوں۔ آپ جو حکم دیں گے' وہی کروں گی۔ میری ایک التجا

ماہنامہ دلکش کراچی

مئی کے شمارے کی ایک جھلک

خواب کی تعبیر..... بلقیس کنول
بے اعتبار..... قیصرہ حیات
اجالوں کا سفر..... عطیہ عمر
محبت کی تتلی..... صائمہ اکرم

موہنی صورت دلکش انداز اور پیاری آواز کی حامل
"عظمیٰ الکریم"
کا خصوصی انٹرویو

تین تہلکہ خیز سلسلے
* انگارے * تو جیون کی ہری کلی
* نہ جانا شہر دل سے

بنت شگوفہ کا شگفتہ شگفتہ
طنزیہ و مزاحیہ کالم

مستقل عنوانات

خوشبو کا در کھلا، قانونی راہ نمائی، آرائش و زیبائش
اپنے نام سے خود کو پہنچائیے، دارالصحت

یہ سب اور بہت کچھ دلکش کی صورت پیش کیا جا رہا ہے

تازہ شمارہ تمام اچھے بک اسٹالز پر دستیاب ہے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C PHASE II EXTENSION,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
KARACHI 75500
PHONES: (92) (21) 5802552,
5804200 FAX: 5802551,
E-MAIL: jasoosi@attglobal.net

ہے۔مرحومہ اختری کے لیے ایک آخری خواہش ہے۔"

گل رخ بیگم نے کہا۔"تمہاری یہ آخری خواہش پوری کی جائے گی۔بولو کیا چاہتی ہو؟"

"میں چند گھڑی مرحومہ کے پاس بیٹھ کر ماتم کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ بولی۔"اسقاطِ حمل کے باعث وہ لہو لہان ہوگئی ہے۔اس کی صفائی کی جارہی ہے۔غسل کے بعد جب کفن پہنا دیا جائے گا تو تم وہاں جاکر ماتم کرسکو گی۔"

قلعے کی پچھلی فصیل کی طرف جو سپاہی پہرا دے رہے تھے۔انہیں حکم دیا گیا کہ وہاں سے چلے جائیں۔محل کی بیگمات اور کنیزیں ہوا خوری کے لیے آرہی ہیں۔

پچھلی فصیل فوراً ہی خالی ہوگئی۔کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی آمدورفت پر پابندی لگا دی گئی۔صرف روحی صبا کو خصوصی اجازت حاصل تھی۔اس نے ایک اُردا بیگنی سے پوچھا۔"اختری کی موت کو فی الحال چھپایا جارہا ہے۔پھر اس کی تدفین کیسے ہوگی؟"

وہاں چار اردا بیگیاں ننگی تلواریں لیے کھڑی تھیں۔ان میں سے ایک نے کہا۔"اختری کی تدفین نہیں ہوگی۔اسے یہاں سے پیچھے گہری کھائی میں پھینک دیا جائے گا۔"

روحی صبا یہ سنتے ہی لرز گیا۔اپنے دل کو یوں پکڑ لیا جیسے مٹھی میں بھینچ کر سارا خون نچوڑ کر مرجانا چاہتا ہو۔وہ دل ہی دل میں اس سے اتنی محبت کرتا رہا تھا' جیسے عبادت کرتا رہا ہو۔یوں شدت سے چاہنے والے اپنی محبوبہ پر جان دے دیتے ہیں۔لیکن اسے مرد سے عورت بنا دیا گیا تھا۔وہ عورتوں کی طرح ماتم کرسکتا تھا۔مگر مردانگی کے جوہر دکھانا بھول چکا تھا۔

یوں بھی حالات ایسے تھے کہ اس کی جگہ کوئی شہزور ہوتا تو وہ بھی حاکم کے حکم کے سامنے دم نہ مارتا۔اگر لڑنا' مرنا اور تلوار کے جوہر دکھانا مردانگی ہے تو وہاں کھڑی ہوئی چار اُردا بیگیاں اس سے زیادہ مردانگی رکھتی تھیں۔انہیں تلوار چلانے میں مہارت حاصل تھی۔اگر وہ کسی بات پر ذرا بھی احتجاج کرتا تو ان میں سے کوئی بھی ایک ہی وار میں اس کی گردن اڑا دیتی۔

چند اردا بیگنیاں کفن میں لپٹی ہوئی لاش اٹھا کر لے آئیں۔پھر اسے فرش پر رکھ دیا گیا۔ایک نے روحی صبا سے کہا۔"ہمیں حکم ہے' گھڑیالی جیسے ہی گھنٹا بجائے اسے اٹھا کر پیچھے کھائی میں پھینک دیا جائے۔اس سے پہلے تو جتنا ماتم کرنا چاہتی ہے۔کرلے۔"

وہ سب ذرا دور جاکر اِدھر اُدھر کھڑی ہوگئیں۔روحی صبا لاش کے قریب دو زانو ہوکر فرش پر سر پٹختے ہوئے بولا۔"ہائے بدبخت! یہ تیرا کیا انجام ہورہا ہے؟ کوئی شاہ ہو...یا گدا ہو۔سب ہی کو قبر کا آخری گھر ملتا ہے۔تُو جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھتی ہوئی آئی۔آخر تجھے کیا ملا...؟ نہ محل رہا' نہ جھونپڑی رہی۔تجھے تو انسان کا آخری گھر بھی نہیں ملے گا۔"

وہ سینہ پیٹنے لگا۔ہائے ہائے کرنے لگا۔دل ہی دل میں کہنے لگا۔"ہائے.....! تیرے پیچھے تو کوئی رونے والا بھی نہیں ہے۔میں رو رہی ہوں۔مگر تیری کون لگتی ہوں؟ میں تو ان لمحات میں رو رہا ہوں۔تیرا نامراد عاشق ہوں۔تجھے دور ہی دور سے دیکھتا رہا۔چاہتا رہا۔کبھی حرفِ مدعا زبان پر نہ لا سکا۔تو ایک روشن جگمگاتے ہوئے آفتاب کی آغوش میں تھی۔وہاں نور ہی نور تھا اور میں ایک ایسا بے نور چراغ ہوں۔جس کی لو بجھادی گئی ہے۔"

وہ سر پٹختا ہوا لاش کے ذرا اور قریب ہوا۔پھر دھیمی سرگوشی میں بولا۔"میری مردانگی کو باہر سے قتل کیا گیا ہے۔لیکن میں ایک مرد ہوں۔آج میرے اندر کی مردانگی زندہ ہوگئی ہے۔میں کچھ کروں گا......تیرے لیے ضرور کچھ کروں گا۔

آہ....مگر میں کیا کرسکتا ہوں؟ میرے پاس طاقت ہوتی تو ان لشکر والوں سے ٹکرا جاتا۔اگر دولت ہوتی تو اپنا ایک لشکر تیار کرلیتا۔بس میرے پاس ایک عقل ہے۔اسی عقل سے کچھ کام لوں گا۔ایک چیونٹی بہت کمزور ہوتی ہے۔کسی کو مار نہیں سکتی۔لیکن جب تلملا جاتی ہے تو اسے کاٹ لیتی ہے۔میں آج تیری میت کے سامنے قسم کھاتا ہوں۔تیرے دشمنوں کو ایسے وقت کاٹوں گا کہ انہیں فرار ہونے کا اور ایک بعد دوسری سانس لینے کا موقع نہیں ملے گا۔

آہ....! ظالموں نے مجھے ناکارہ بنادیا۔نہ ادھر کا رہنے دیا۔ نہ اُدھر کا۔نہ مرد نہ عورت....میں درمیان والا ہوں...."

جو درمیان میں ہو'وہ کیا ہوتا ہے؟

دو دشمنوں کے درمیان تلوار ہوتا ہے اور دوستوں کے درمیان گلاب کا پھول.....

مرد اور عورت کے درمیان ہو تو دیوار۔یہ دیوار دونوں کو منہ کالا کرنے سے روکتی ہے۔

یہ درمیان والے شاہی محلوں کی بیگمات اور شہزادیوں کی عزت آبرو کے محافظ ہوا کرتے تھے۔جب سے یہ وجود میں

آ ئے ہیں، تب سے ان پر کبھی کسی غیر مرد کا سایہ نہیں پڑا۔ لیکن ان درمیان والوں کی اپنی زندگی کیا تھی؟

یہ تاریخ کی ان تاریکیوں سے گزرتے ہوئے آئے تھے۔ جب انسان کی تاریخ ابتدائے تہذیب سے لکھی جارہی ہے تو تہذیب کے بدن میں پھوڑا بننے اور بنانے والوں کی تاریخ بھی ضرور بیان کی جانی چاہیے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انسان ازل سے ہوس پرست ہے۔ جب وہ غاروں میں رہتا تھا اور اسے زندگی کی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ اپنے لیے اناج اگانا بھی نہیں جانتا تھا۔ تب وہ پتھروں کے ہتھیاروں سے جانور کو شکار کرکے ان کا گوشت کھاتا تھا۔ جب پیٹ کی آگ بجھتی تو بدن کی آگ سلگنے لگتی تھی۔ اس نفسانی آگ کو بجھانا بھی لازمی ہوتا تھا اور ہوتا آرہا ہے۔

پیٹ کی بھوک اور بدن کی بھوک ہمیشہ پیچھے پڑی رہتی ہے۔ تہذیب نے، مذہب نے، قانون نے اور سخت سے سخت سزا نے نفسانی خواہشات پر پہرے بٹھائے۔ دینی قوانین کے مطابق نفسِ آمارہ پر قابو پانا سکھایا۔ لیکن بدن سے بدن کی خواہش میں ایسی شورش اور مستی بھری ہوتی ہے کہ انسان تمام حدود کو پھلانگ کر عیاشی کی نت نئی راہیں نکالتا رہتا ہے۔

ایسی ہی ایک راہ یہ نکل آئی کہ عورت سے عورت کی اور مرد سے مرد کی آگ بجھائی جانے لگی۔ یہ حقیقت نیشنل جیوگرافک کی ویڈیوز میں محفوظ ہے کہ آج اکیسویں صدی میں یورپ اور امریکا کی کئی عدالتوں نے عورت سے عورت کی اور مرد سے مرد کی شادی جائز قرار دے دی ہے۔

کئی گرجا گھروں میں باقاعدہ ان کی شادیوں کے مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔ انسانی تاریخ کے دورِ جاہلیت سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا۔ امیر کبیر لوگ نوعمر خوبصورت لڑکوں کو خریدتے تھے۔ جو شہزور ہوتے تھے۔ وہ ان چھوکروں کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔ کبھی کبھی قدرتی طور پر ایسے بچے بھی پیدا ہوتے تھے جو نہ لڑکے ہوتے تھے، نہ لڑکی۔ یہ درمیانی مخلوق کبھی کبھی کہیں کہیں دیکھنے میں آتی تھی۔ جہاں پیدا ہوتے تھے، وہاں انہیں فوراً ہی خرید لیا جاتا تھا یا ان کے ماں باپ سے جبراً چھین لیا جاتا تھا۔

تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے ملک خطا کے بادشاہ نے سوچا کہ قدرت کے خلاف ایسی درمیانی مخلوق بنائی جاسکتی ہے۔ اس بادشاہ کو جو حسین لڑکے پسند آتے تھے۔ وہ حکم دیتا کہ انہیں جوہرِ مردانگی سے محروم کردیا جائے۔

حکیموں کو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ بڑی حکمت، بڑے آرام

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مُقدس آیات و احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مُطابق بے حُرمتی سے محفوظ رکھیں۔

اور مجرب دواؤں سے ان کو ایسے مرحلے پر پہنچادیں، جہاں وہ ایسی اذیت برداشت کرسکیں۔

پھر اس سلسلے نے دوسری صورت اختیار کی۔ بادشاہ اور حکومت کے معتوبین سے بطورِ سزا ان کی مردانگی سلب کرالی جاتی۔ انہیں سزا دینے کے لیے بڑی بے رحمی کے ساتھ ایسا کیا جاتا تھا۔ کتنے ہی اذیت برداشت نہ کرنے کی صورت میں مر جاتے تھے جو سخت جان ہوتے تھے۔ وہ زندہ رہتے تھے۔ انہیں محل کی دربانی کرنے اور جھاڑو دینے پر مامور کیا جاتا تھا۔

بادشاہ کی حرم میں بیگمات اور کنیزوں کا میلا لگا رہتا تھا۔ بادشاہ ان سب کو باقاعدہ وقت نہیں دے سکتا تھا۔ کئی کئی ماہ بعد کسی سے رجوع کرتا تھا۔ اس طرح وہ بے راہ روی کا شکار ہوجاتی تھیں۔ اکثر پہرے دار سپاہیوں کے ساتھ پکڑی جاتی تھیں تو شامت آجاتی تھی۔ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔

ان حالات میں یہ بات سجھائی دی کہ جو درمیان والے ہیں، وہی صحیح طور پر پہرے داری کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ تب سے انہیں وزرا، امرا سلاطین کے اور رؤسا کی محل سراؤں میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ وہ بیگمات اور کنیزوں کی نگرانی بھی کرتے تھے اور ان کی خدمت بھی کرتے رہتے تھے۔

عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف ایسی ایسی باتیں اگلتی تھیں کہ ان نامرد غلاموں کو بڑی عجیب وغریب معلومات حاصل ہوتی رہتی تھیں۔ پھر بیگمات بھی ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کرتی رہتی تھیں اور ان غلاموں کو اپنا خاص جاسوس اور رازدار بنایا کرتی تھیں۔ یہ بیگمات اپنے اپنے بادشاہ سے، اپنے وزیر سے اور اپنے دربان کے امیر سے ان کی تعریفیں کرتی تھیں۔ انہیں وفادار، خدمت گزار اور قابل اعتماد کہتی تھیں۔ اس طرح ان غلاموں کو وزرا، سلاطین اور امرا کی توجہ اور اعتماد بھی حاصل ہونے لگا تھا۔

بیگمات انہیں انعام و اکرام سے نوازا کرتی تھیں۔ پھران کے شوہر حضرات بھی کسی نہ کسی بات پر خوش ہوکر انہیں مالا مال کردیتے تھے۔ یہ غلام جو بعد میں چل کر خواجہ سرا کہلائے ابتدائی دور میں رفتہ رفتہ ترقی کرنے لگے۔ انہیں حرم سرا میں رہ کر بیگمات کے ذریعے حکومت کے کئی راز معلوم ہوتے رہتے تھے۔ وہ ان رازوں کے حوالے سے انجان بن کر بادشاہوں اور وزرا کو ایسے مشورے دیتے تھے کہ وہ دنگ رہ جاتے تھے۔

مثلاً انہوں نے مشورہ دیا کہ اپنے حرم کے چند غلاموں کو دشمن بادشاہوں کی حرم سراؤں میں بھیجا جائے۔ وہاں وہ جاسوسی کریں گے اور اندر کی خبریں یہاں پہنچائیں گے۔ یہ اتنا عمدہ اور کارآمد مشورہ تھا کہ اس پر فوراً عمل کیا گیا۔ ان غلاموں کو مشیر کے عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ان میں سے کسی کو میر عرض کا عہدہ دیا گیا۔ یہ عہدیدار وہ ہوتا ہے' جو بادشاہ کے سامنے لوگوں کی عرضی پیش کرتا ہے۔ دربار کے اعلیٰ عہدے داروں کو اور ارکین سلطنت کو بھی انہیں کے توسط سے بادشاہ تک پہنچنا پڑتا تھا۔

یوں بادشاہ کا مکرم ہونے کے باعث ان کی عزت اور عظمت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ دربار کے سب ہی چھوٹے بڑے ان کے محتاج ہوگئے۔ انہیں خوش کرنے کے لیے بڑے بڑے نذرانے پیش کرنے لگے۔ جب لوگوں نے ان غلاموں کو اتنا عروج حاصل کرتے اور دولت کماتے دیکھا تو وہ اپنے بیٹوں کو بھی درمیانی مخلوق بنا کر وزیروں' امیروں اور سلاطین کے محلوں میں بھیجنے لگے۔

ان درمیان والوں کی نسل قدرتی طور پر نہیں بڑھ سکتی تھی۔ لیکن اس کی حکمت عملی سے بڑھنے لگی۔ غلاموں کی منڈی میں پہلے حسین عورتوں اور مردوں کو غلام بنا کر فروخت کیا جاتا تھا۔ پھر اس منڈی میں خواجہ سرا غلاموں کی مانگ زیادہ بڑھ گئی۔ وہ اچھے داموں فروخت ہونے لگے۔

یہ بدلتے ہوئے وقت اور دور کے مطابق ایسے ابھرتے رہے کہ شاہی لشکروں میں بھی اپنے لیے اعلیٰ عہدہ حاصل کرنے لگے۔ ہندوستان میں سلطان علاؤالدین کے عہد میں ملک کافور ایک خواجہ سرا تھا۔ اس نے جو اقتدار اور مرتبہ حاصل کیا۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بیجوڑے تلوار نہیں چلا سکتے۔ لیکن ملک کافور نے چار مرتبہ دکن کے علاقوں کو فتح کیا تھا۔ راجا رام دیو کو قیدی بنا کر دہلی لے آیا تھا۔ دوار کا کے راجاؤں کو بھی اسی نے شکست دی۔ وارانگل کے راجا کو بھی اس نے مطیع و فرمانبردار بننے پر مجبور کردیا۔

ہندوستان میں تیرہویں عیسوی صدی کو خواجہ سراؤں کے حوالے سے ایک قابل فخر صدی کہا جاسکتا ہے۔

روحی صبا تلوار چلانا نہیں جانتا تھا۔ اس نے سپہ گری کا ہنر نہیں سیکھا تھا۔ اس دور میں یہ ہنر سیکھنے اور نیام میں تلوار رکھ کر گھومنے سے رعب و دبدبہ طاری ہوتا تھا۔ اچھی تنخواہ ملتی تھی۔ سپاہی سے سپہ سالار کے عہدے تک ترقی ہوتی تھی۔ نام بھی ملتا تھا اور مرتبہ بھی بلند ہوتا تھا۔

سخت مزاج رکھنے والی سنگدل عورتیں بھی سپہ گری کی تربیت حاصل کرتی تھیں۔ روحی صبا عورت نہیں تھا۔ نہ ہی قدرتی طور پر تیسری مخلوق تھا۔ پھر بھی اس نے تلوار کبھی نہیں اٹھائی۔ اسے علوم حاصل کرنے اور زبانیں سیکھنے کا شوق تھا۔ پیدائشی طور پر ہندوستانی تھا۔ اس لیے ہندی مادری زبان تھی۔ حکمرانوں کی زبان فارسی تھی۔ اس لیے اس نے یہ زبان بھی اچھی طرح سیکھی لیکن بارہ برس کی عمر میں ہی یہ تعلیمی سلسلہ ختم ہوگیا۔

بادشاہِ وقت کے وزیر نے ایک بار اسے دیکھا تو فوراً ہی اپنا منظورِ نظر بنا لیا۔ اس کے غریب والدین کو جھولی بھر کر دولت دی اور اسے اپنے حرم میں داخل کرلیا۔

ان دنوں اس کا نام مصباح احمد تھا۔ وہ ایسی زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن حاکمِ حاکم مرگِ مفاجات.. اس پر ذرا سختیاں کی گئیں تو وہ جبر کے آگے صبر کرنے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ وزیر کا منظورِ نظر تھا۔ اس لیے اسے حرم سرا میں جانے کی اجازت تھی۔ یہ خیال تھا کہ نوخیز لڑکا ہے۔ وہاں کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا۔

ابتدا میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ حرم میں درجنوں خوبصورت کنیزیں تھیں۔ جس سے وزیر موصوف کا دل بھر جاتا تھا۔ اسے اچھی خاصی رقم دے کر وہاں سے رخصت کردیا جاتا تھا۔ پھر اس کی جگہ کوئی نئی طرح دار حسینہ آجاتی تھی۔ جب وہ چودہ برس کا ہوا تو اس حرم میں زلیخا آئی۔ نہایت ہی حسین و جمیل' دھان پان سی لڑکی تھی۔ وزیر اس پر ہزار جان سے عاشق ہوگیا تھا۔ لیکن زلیخا نے حرم میں آتے ہی مصباح احمد کو دیکھا تو اس پر بُری طرح مرمٹی۔

تقدیر کے تماشے عجیب ہوتے ہیں۔ وزیر جس شب زلیخا کو اپنی خوابگاہ میں طلب کرنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی بادشاہ نے اسے طلب کیا۔ ایک گمبھیر مسئلہ درپیش تھا۔ یہ

اطلاع مل رہی تھی کہ بابر ہندوستان آ گیا ہے اور فتوحات حاصل کرتا ہوا دہلی کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

بادشاہ نے دربار خاص میں ہنگامی اجلاس طلب کیا تھا۔ وہاں لشکر کا سپہ سالار اور میر تحوک بھی تھے۔ لشکر کے انتظامات سنبھالنے والوں کو میر تحوک کہا جاتا تھا۔ نجومیوں کو بھی بلا کر یہ معلوم کیا جا رہا تھا کہ آئندہ حالات کیا ہوں گے؟

سپہ سالار نے کہا۔ ''بہتر ہے' ہم انہیں دہلی تک پہنچنے کا موقع نہ دیں۔ اس کے لشکر کو پانی پت کے میدان میں ہی روک کر مقابلہ کریں۔''

وزیر نے کہا۔ ''مقابلہ کرنے سے پہلے بابر کی فوجی قوت کا اندازہ کیا جائے۔ اس کے پاس بھاری بھرکم توپیں ہیں۔ ہمارے پاس جو بندوقیں ہیں۔ وہ ایک دو بار چلنے کے بعد ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ ایران' ترکستان' تاجکستان اور افغانستان وغیرہ میں بندوقیں ڈھالنے کا کام ہوتا ہے۔ بابر کے لشکر میں کئی اقسام کی بندوقیں ہیں۔ ہمارے سپاہی تیروں' تلواروں اور نیزوں سے کب تک مقابلہ کر سکیں گے؟''

سپہ سالار نے کہا۔ ''ہم ہتھیاروں کے معاملے میں کمزور ہیں۔ لیکن چالاکیوں سے اور حکمتِ عملی سے بابر کو پسپا کیا جا سکے گا۔''

نجومیوں نے کہا۔ ''جنگ ہو گی۔ بابر کا لشکر بھاری پڑے گا۔ پھر بھی وہ آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ ہمارا علم پوری وضاحت سے تمام باتیں نہیں بتاتا ہے۔ اتنا معلوم ہے کہ وہ کسی وجہ سے واپس چلا جائے گا۔ یہاں بادشاہ سلامت کی حکومت قائم رہے گی۔''

ہندوستان پر حکومت کرنے والے بادشاہوں' راجاؤں اور مہاراجاؤں پر ظہیر الدین بابر کی دہشت طاری تھی۔ اس اجلاس میں تدبیریں سوچی جا رہی تھیں۔ ایسا کیا جائے کہ بابر پانی پت سے آگے نہ بڑھے۔ واپس چلا جائے؟ بادشاہ کو فکر لاحق تھی۔ جب تک وہ مطمئن نہ ہوتا تب تک اجلاس ختم نہ ہوتا اور رات تھی کہ گزرتی جا رہی تھی۔

وزیر بھی بابر کی بڑھتی ہوئی قوت سے پریشان اور خوفزدہ تھا۔ دوسری طرف وہ نئی چنچل حسینہ زلیخا بھی یاد آ رہی تھی۔ اس نے مصباح احمد کو حکم دیا تھا کہ جب تک وہ واپس نہ آئے' تب تک وہ زلیخا کی خاطر مدارات کرے اور اس کا دل بہلاتا رہے۔

مصباح احمد اس کا دل کیا بہلاتا؟ وہی اسے بہلانے پھسلانے لگی۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

وہ اس کے مضبوط بازوؤں کو چوم کر چوڑے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کتنے ہی خوبرو مرد دیکھے ہیں۔ مگر تم جیسا نہیں دیکھا۔''

وہ بولا۔ ''میں جوان مرد نہیں ہوں۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا خواجہ سرا ہو؟''

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔ میں ابھی چودہ برس کا ہوں۔ مجھے جوان مرد تو نہیں کہا جائے گا۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''میری آنکھوں سے دیکھو! میرے دل سے پوچھو.... تم تو اتنے بھرپور ہو کہ مجھ جیسی ادھوری کو... بھرپور بنا سکتے ہو۔''

اس نے مصباح احمد کے دونوں ہاتھوں کو اپنے بدن پر رکھ کر کہا۔ ''مجھے اچھی طرح دیکھو! کیا میں تمہاری ضرورت نہیں ہوں؟''

اس کے لرزتے اور بہکتے ہوئے ہاتھ کہنے لگے۔ ''ہاں۔ ضرورت ہے.... جب تالی بجانا ضروری ہو تو دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے ٹکرانا ہی پڑتا ہے۔''

مصباح احمد نے کبھی عزم کیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ علوم حاصل کرے گا۔ ہندوستان سے باہر ہر ملک کی درسگاہوں میں جائے گا اور عالم فاضل بنے گا۔ پھر اس کی زندگی میں ایک چاہنے والی آئے گی اور وہ ایک بھرپور مرد کی طرح اس کے ساتھ زندگی گزارے گا۔ لیکن ایک زر پرست نے اسے غریب ماں باپ سے خرید کر زندگی کا رخ ہی بدل دیا تھا۔

خزانہ لٹانے والے کسی کو بھی خرید سکتے ہیں۔ وزیر نے اسے اپنی دولت سے خریدا تھا۔ زلیخا نے حسن و شباب کا خزانہ لٹاتے ہوئے اسے خرید لیا۔ اس حسینہ کی بے باکی نے اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ ایک مرد ہے اور آئندہ اسے مردوں کی طرح زندگی گزارنی چاہیے۔ یہ بات اس کے دل و دماغ میں سمائی مگر ذرا دیر سے سمائی۔

دروازے پر دستک سن کر دونوں ہی چونک گئے۔ فوراً ہی دروازہ نہ کھول سکے۔ اپنا حلیہ درست کرنے میں کچھ دیر لگی۔ جب اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو اس کھلے ہوئے دروازے پر زلیخا کا خریدار کھڑا ہوا ان دونوں کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے اردابیگیاں ننگی تلواریں لیے کھڑی تھیں۔ دو خواجہ سرا بھی تھے۔ ان سب کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ بند کمرے کا کھیل تماشا باہر والوں کی سمجھ میں آ گیا ہے۔

آقا نے ایک ہاتھ سے مصباح احمد کا گلا دبوچتے ہوئے

ہری مرچیں

ایک نوجوان عورت ایک چھوٹی سی دکان کی ٹیلی فون ڈائریکٹری بہت دیر سے دیکھ رہی تھی۔ ایک صاحب اس کے پیچھے ڈائریکٹری خالی ہونے کے منتظر تھے‘ عورت بے نیازی سے ڈائریکٹری الٹتی پلٹتی رہی۔ ان صاحب سے صبر نہ ہوسکا‘ وہ عورت سے مخاطب ہوئے۔ ”بی بی! مجھے افسرِ اطلاعات بننے کا شوق نہیں۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ایک منٹ کے لیے ڈائریکٹری مجھے دے دیجیے۔ میں اپنا نمبر دیکھ کے آپ کو فوراً واپس کردوں گا۔“ عورت نے ڈائریکٹری اس کے حوالے کردی۔ ”برائے مہربانی ذرا جلدی کیجیے گا۔ ایک آنے والے مہمان کے لیے کوئی خوب صورت سا نام تلاش کررہی ہوں۔“

دو شرابی گفتگو کررہے تھے ”یار میرا خیال ہے دنیا کی سب سے خشک جگہ کناس ہے۔ وہاں شراب پر سخت پابندی ہے۔ ہزار کوششوں کے باوجود کہیں سے ایک قطرہ شراب بھی نہیں ملتی۔ ہاں اگر سانپ کاٹ لے تو علاج کے لیے جتنی چاہو شراب لے لو لیکن مشکل یہ ہے کہ پورے شہر میں صرف ایک سانپ ہے۔ میں وہاں پہنچا تو مجھے بارہ گھنٹے تک قطار میں کھڑے رہنا پڑا۔ بارہ گھنٹے بعد جب میری باری آئی تو وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس نے مجھے کاٹنے سے انکار کردیا۔“

پوچھا۔ ”تُو نے دروازہ کھولنے میں دیر کیوں کی؟“

پھر وہ دوسرے ہاتھ سے زلیخا کا گلا دبوچتے ہوئے بولا۔ ”تُو بول..... کیا ہورہا تھا؟“

یہ کہہ کر اس نے زلیخا کو ایک دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے گئی۔ وزیر نے اُردابیگنیوں کو حکم دیا۔ ”ابھی اس کا معائنہ کرو۔ انہوں نے دروازے کو اندر سے بند کرنے کی جرات کیسے کی؟“

دو اُردابیگنیوں نے زلیخا کو فرش پر پٹخ دیا۔ وہ چیخنے چلانے لگی۔ ”مجھے جتنی قیمت میں خریدا گیا ہے۔ میں اس کی دُگنی قیمت ادا کردوں گی۔ مصباح کی بھی قیمت ادا کروں گی۔ اس پر میرا دل آگیا ہے۔ میں اسے یہاں سے خرید کر لے جاؤں گی۔“

ایک اُردابیگنی نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے وزیر سے کہا۔ ”آقا! یہ دونوں بدکار ہیں۔“

وہ تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ لیکن تصدیق ہوتے ہی غصے سے اور زیادہ بھڑک گیا۔ ایک اُردابیگنی سے چابک لے کر مصباح احمد پر برسانے لگا۔ ”کتے! کمینے! تو نے ہمارے برتن میں کھانے کی جرأت کی۔ ہم تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

ایک اُردابیگنی نے اپنی تلوار پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آقا! یہ تلوار حاضر ہے۔“

اس نے ہانپتے ہوئے‘ گھورتے ہوئے مصباح احمد کو دیکھا پھر انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”نہیں۔ یہ تلوار کے ایک ہی وار سے مر جائے گا۔ ہم اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتے ہیں۔ اس زنخے نے ہمارے حرم میں مردانگی دکھائی ہے۔ ہم اس کی مردانگی کو ہمیشہ کے لیے نابود کردیں گے۔“

پھر اس نے چابک برساتے ہوئے‘ گرجتے ہوئے کہا ”اسے یہاں سے لے جاؤ اور قصاب کے حوالے کردو۔ اس سے کہو کہ اسے خواجہ سرا بنانا ہے۔ لیکن زندہ بھی رکھنا ہے۔“

اردابیگیاں مصباح احمد کو پکڑ کر وہاں سے لے گئیں۔

وہ وزیر اپنی توہین پر تلملا رہا تھا۔ اس کے کھانے کو جھوٹا کیا گیا تھا۔ وہ زلیخا پر چابک برساتے ہوئے‘ اسے گالیاں دینے لگا۔ کہنے لگا۔ ”تو کیا سمجھتی ہے‘ ہم تجھے آسانی سے چھوڑ دیں گے؟ روز صبح شام تجھ پر چابک برساتے رہیں گے۔ تیری جوانی کو‘ تیرے بدن کی خوبصورتی کو لہولہان کرتے رہیں گے۔ تو تڑپ تڑپ کر موت مانگتی رہے گی۔ مگر ہم تجھے مرنے نہیں دیں گے۔ تو بدکار ہے..... فاحشہ ہے.....“

وہ روتے ہوئے‘ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔ ”اور تُو کیا ہے.....؟ ہم کریں تو بدکاری اور تُو کرے تو فاتح کہلائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے.....؟ مجھے خریدنے والے تُو نے بڑی خریداریاں کی ہیں۔ بڑی بدکاریاں کی ہیں۔ آج ایک نیکی کرلے۔ میرے مصباح کو میرے نام کردے اور مجھے یہاں سے جانے دے۔ تیری یہ نیکی ہزار نیکیوں کے برابر ہوگی۔ کبھی زندگی میں اچھا کام نہیں کیا ہے تو بس ایک بار اچھا کام کرلے۔ خدا تجھ سے راضی رہے گا۔“

اس کا ہاتھ نہیں رک رہا تھا۔ ہر چابک پر لباس پھٹ رہا تھا۔ گورے اور چکنے بدن پر لہو کی لکیریں پڑتی رہی تھیں۔ کہیں کہیں سے کھال ادھڑتی جارہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہم جمعے کی نماز میں وعظ اور نصیحتیں سنتے رہتے ہیں۔ وہ نصیحتیں

ہمارے لیے نہیں.... تم جیسوں کے لیے ہوتی ہیں۔ تم عورتوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ جس کی امانت ہو اسی کے پاس جاؤ۔ مگر تُو نے امانت میں خیانت کی ہے۔ اب اپنا اور اپنے یار کا انجام دیکھے گی۔''

وہ مار کھاتے کھاتے بیہوش ہو گئی۔ اس نے غصے سے چابک کو ایک طرف پھینکا۔ پھر اسے ٹھوکر مار کر وہاں سے جاتے ہوئے حکم دیا۔ ''دروازہ باہر سے بند رکھو۔ اسے کبھی یہاں سے جھانکنے کی بھی اجازت نہ دو۔''

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ ادھر مصباح احمد پر قیامت گزر گئی تھی۔ وہ بیہوش ہو گیا تھا۔ اسے ایسی اذیتوں سے گزارا گیا تھا کہ بیہوشی کے دوران وہ مر بھی سکتا تھا۔ ایک رات اور ایک دن کے بعد آنکھیں کھولیں تو وہ ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ نہ خود کو پہچان رہا تھا' نہ اپنے آس پاس کی دنیا کو سمجھ رہا تھا۔ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے...؟

اسے کچھ پلایا گیا۔ کسی مشروب کے ذریعے خوراک دی گئی۔ اس کے بعد پھر آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ خود سے غافل ہوتا چلا گیا۔ کئی دن اور کئی راتوں تک زندگی اور موت کے درمیان رہا۔ جب ذرا ہوش میں آنے لگا تو پتا چلا کہ اسے درمیان والا بنا دیا گیا ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اپنی تقدیر کا ماتم کرنے لگا۔ ایسی اذیتوں سے گزرنے والے اکثر لوگ مر جاتے ہیں۔ وہ سخت جان تھا۔ بچ گیا تھا۔ لیکن زندگی کسی کام کی نہیں رہی تھی۔

جب وہ ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو اسے غسل کرایا گیا۔ نئے کپڑے پہنائے گئے۔ پھر حرم سرا میں زلیخا کے اسی کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ ظالم وہاں ایک شاہی طرز کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مصباح کو حقارت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اب بتا.... موت تجھے کیسی لگی؟ تیرے بہت قریب سے ہو کر گزری۔ لیکن ہم نے تجھے مرنے نہیں دیا۔ آئندہ بھی تو اسی طرح جیتا رہے گا اور مرتا رہے گا۔''

پھر اسے نے حکم دیا۔ ''زلیخا کو حاضر کیا جائے۔''

دو اُردبیگیاں اسے دو طرف سے پکڑ کر وہاں لے آئیں۔ مصباح احمد اسے دیکھتے ہی پہچان نہ سکا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ مختصر سا لباس پہنایا گیا تھا تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ اس کے خوبصورت بدن کی کھال ادھیڑ ڈالی گئی ہے۔ چہرہ بھی ایسا لگ رہا تھا' جیسے اچھی طرح نوچا کھسوٹا گیا ہو۔ وہ کمزوری کے باعث ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ آقا نے بڑے فخر سے پوچھا۔ ''کیا تو اپنی معشوق کو پہچان رہا ہے؟''

اردابیگیاں اسے چھوڑ کر ذرا دور ہو گئیں۔ اس پر ایسے مظالم ڈھائے گئے تھے۔ ایسی درندگی کا مظاہرہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنے بل پر کھڑی رہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اِدھر اُدھر ڈگمگاتے ہوئے گرنے والی تھی۔ مصباح نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں تھام لیا۔ آقا نے کہا۔ ''واہ رے لیلیٰ مجنوں...! رسی جل گئی۔ مگر بل نہیں گئے۔ اب بھی ایک دوسرے کے طلب گار ہو۔ ہم یہی دیکھنا چاہتے ہیں' تمہارے جیسے طلبگار اب ایک دوسرے کے لیے کیا کر پائیں گے؟''

مصباح احمد نے زلیخا کو فرش پر بٹھایا پھر گھٹنے ٹیک کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''آپ ہمیں جتنی سزا دیں گے' اتنی ہی آپ کو کم لگے گی۔ خدا کے لیے اس غریب کو معاف کر دیں۔ اس کی جتنی سزا باقی رہ گئی ہے۔ وہ مجھے دیں۔''

وہ بولا۔ ''واہ کیا عشق ہے؟ مرتے مرتے بڑی مشکل سے بچا ہے۔ اب اپنے ساتھ معشوق کے حصے کی بھی سزا پانا چاہتا ہے۔ تُو تو عشق کے معاملے میں مجنوں کے بھی کان کاٹ رہا ہے۔''

پھر وہ اپنے تخت پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہم ایک شرط پر تم دونوں کو معاف کریں گے۔ تمہیں رہائی ملے گی۔ اس کے بعد اسے لے کر کہیں بھی جا سکو گے۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''حضور کا اقبال بلند ہو۔ میں آپ کی ہر شرط مان لوں گا۔ آپ جان پر کھیلنے کو کہیں گے۔ میں ابھی اپنی جان سے گزر جاؤں گا۔''

''ہم اتنی بڑی قربانی نہیں چاہتے۔ بس ایک معمولی سی شرط ہے۔ بس اسے پورا کر دے۔ تُو نے اسی حرم سرا میں' اسی خوابگاہ کی چھت کے نیچے اپنی مردانگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ آج یہ دوبارہ کھیل دکھا دے۔ تجھے معاف کر دیا جائے گا۔''

مصباح کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے جھجکتے ہوئے زلیخا کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ فرش پر ٹیکے سر جھکائے فرش پر بیٹھی ہوئی۔ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ تڑپ کر بولا۔ ''میرے آقا! آپ میری زندگی کے مالک و مختار ہیں۔ جو کچھ چھینا تھا' آپ نے چھین لیا۔ یہ خوب سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی یہ شرط کبھی پوری نہیں کر سکوں گا۔''

زلیخا لرزتے ہوئے ہاتھ سے اس کے ہاتھ کو پکڑ بولی۔ ''میرے مصباح! تُو نے میرے لیے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ میری زندگی رہی تو میں تجھے پیار کی دولت سے مالا مال

لردوں گی۔ ابھی کوئی شرم نہ کر... اس کی شرط پوری کر دے۔ میں جس حال میں ہوں۔ راضی ہوں۔''

وزیر قہقہہ لگاتے ہوئے اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ یہ راضی ہے۔ ایک پرانی کہاوت ہے' میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟ ہم کچھ بھی نہیں کریں گے۔ بس تماشا دیکھیں گے اور تم دونوں کو رہا کر دیں گے۔''

مصباح احمد نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا تھا۔ اندر سے صدمات ہلچل مچا رہے تھے۔ وہ زلیخا سے کہنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کی خاطر کتنے بڑے عذاب سے گزر چکا ہے؟ اب ساری عمر ایک نہتے سپاہی کی طرح عشرت کدوں سے گزرتا رہے گا اور اپنی نامرادی پر آنسو بہاتا رہے گا۔

زلیخا نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ لرزتے ہوئے کہا۔ ''تُو چپ کیوں ہے؟ رہائی کی یہی شرط ہے تو اسے پورا کر دے۔ جب میں عورت ہو کر نہیں شرماتی تو تُو کیوں شرما رہا ہے؟''

اچانک ہی اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولا۔ ''میں۔ میں نہ رہا..... نہ ادھر کا رہا۔ نہ ادھر کا رہا..... یہ ہمارے آقا ہیں۔ ہمارے جسم و جان کے مالک ہیں۔ انہوں نے مجھے خواجہ سرا بنا دیا ہے۔''

وہ پہلے ہی لرز رہی تھی۔ صدمے کی شدت سے اور لرز گئی۔ اس سے لپٹ کر روتے ہوئے بولی۔ ''ہائے مصباح! .... یہ کیا ہو گیا؟ میں نے تجھے اپنی طرف مائل کیا۔ اپنے بدن کی سوغات پیش کی۔ اپنا دیوانہ بنایا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تجھے اتنی بڑی قیمت چکانی پڑے گی؟''

اسے مصباح پر اتنا پیار آ رہا تھا۔ اس کی چاہت میں ایسی شدت پیدا ہو رہی تھی' جی چاہتا تھا کہ ابھی اس کے قدموں میں جان دے دے۔ مگر جان دینے سے محبوب کو رہائی ملنے والی نہیں تھی۔

وہ اس سے الگ ہو کر سجدے میں گرتے ہوئے اس ظالم سے بولی۔ ''تجھے خدا رسول کا واسطہ دیتی ہوں۔ میری جان لے لے۔ اس غریب پر بہت ظلم ہوا ہے۔ اب تو اسے معاف کر دے۔''

وہ اپنے آرام دہ تخت پر آ کر بیٹھ گیا۔ سوچتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ''ایک اور کام ہے۔ وہ کرے گا تو تیرے ساتھ اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو بھی رہائی مل جائے گی۔''

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''حضور! جو کام بولیں گے' وہ کروں گا۔ اپنی جان دے کر بھی کروں گا۔ آپ حکم کریں...''

اس نے کہا۔ ''بابر بادشاہ کا خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ ہمارے چند جاسوس اس کے حالات اور اس کی کمزوریاں معلوم کرنے کے لیے یہاں سے جا چکے ہیں اور کچھ جانے والے ہیں۔ یہ خبر ملی ہے کہ بابر کے ساتھ اس کی بیگمات اور کنیزیں بھی ہیں۔ اگر تو ہمارے جاسوسوں کے قافلے کے ساتھ جائے گا اور اس کے حرم تک رسائی حاصل کر لے گا تو سمجھ لے بہت بڑا کارنامہ انجام دے گا۔ تجھے حرم میں رہ کر اندر کی بہت سی اہم خبریں ملتی رہیں گی اور تُو وہ تمام خبریں ہمیں پہنچاتا رہے گا۔''

وہ بولا۔ ''حضور! یہ کام کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آپ اس غریب کو رہا کر دیں۔ میں ابھی جانے کو تیار ہوں۔''

''کیا تو ہمیں نادان بچہ سمجھتا ہے؟ اسے رہائی ملے گی تو پھر تُو ہمارا کام کیوں کرے گا؟ یہ یہاں قید میں رہے گی۔ ہمارا وعدہ ہے' اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے گا۔ علاج بھی ہوتا رہے گا اور زخموں کی مرہم پٹی بھی ہوتی رہے گی۔ جب تو واپس آئے گا تو تجھے یہاں پہلے والی زلیخا ملے گی۔''

زلیخا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''حضور! ہمیں تنہائی میں کچھ باتیں کرنے کا موقع دیں۔ میں اسے راضی کروں گی۔ یہ میری خاطر آپ کا مخبر بن کر جہاں کہیں گے' وہاں جائے گا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''تُو تھوڑی دیر کے لیے اس کے ساتھ تنہائی چاہتی ہے۔ اب تو یہ دن رات خلوت میں رہ کر بھی تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

وہ قہقہہ لگاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اردا بیگنیاں اور خواجہ سرا بھی چلے گئے۔ تنہائی ملتے ہی زلیخا نے اس کے قدموں کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''رہائی کا اس سے بہتر موقع اور نہیں ملے گا۔ تجھے فوراً ہی جاسوسوں کے قافلے کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔''

''یہ آقا جھوٹا اور مکار ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں' کام ہو جانے کے بعد یہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گا۔ تجھے رہائی نہیں دے گا۔''

''تو میری فکر نہ کر..... میں کسی دم کی مہمان ہوں۔ تو نہیں جانتا' مجھے اندر سے ایسی چوٹیں پہنچائی گئی ہیں کہ میں زیادہ جی نہیں سکوں گی۔ تجھے اس یقین کے ساتھ یہاں سے جانا ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔''

وہ تڑپ کر بولا۔ ''زلیخا! ایسی باتیں نہ کر۔ میں تیرے بغیر جی نہیں سکوں گا۔''

''اور میں تیرے بغیر مر کر بھی چین نہیں پاسکوں گی۔ تیرے لیے دوسرا جنم لوں گی۔''

''یہ کیسی باتیں کررہی ہے؟ دوسرا جنم لینے والا آواگون کا عقیدہ ہندوؤں کا ہے۔ وہ کہتے ہیں' انسان مرنے کے بعد دوسرا تیسرا جنم لیتا ہے اور سات جنم تک اس دنیا میں آتا رہتا ہے۔ مگر ہم اسے نہیں مانتے۔''

''میں مانتی ہوں۔ آج تجھے بتادوں کہ میں مسلمان نہیں ....ہندو ہوں۔''

اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔''یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟''

''سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے فروخت کرنے والے تاجر نے جب یہ دیکھا کہ یہاں کا وزیر ایک مسلمان حسین وجمیل کنیز کو خریدنا چاہتا ہے تو اس نے مجھے مسلمان کہہ کر فروخت کر دیا۔ مجھے سمجھا دیا کہ آئندہ میں اس حرم میں مسلمان بن کر نہیں رہوں گی تو بے موت ماری جاؤں گی۔ وہ تاجر تو اپنے دام کھرے کر کے جاچکا ہے۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تو ہندو ہے یا مسلمان....بس تو میری جان ہے...میری زندگی ہے۔''

وہ بولی۔''مجھے دل وجان سے چاہتا ہے تو مجھ پر بھروسا کر۔ میں اپنے عقیدے کے مطابق تیرے لیے دوسرا جنم لوں گی۔ تیرے پاس ضرور آؤں گی۔''

''یہ محض بہلانے والی باتیں ہیں۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ اگر پیار کرتا ہے تو مجھ پر بھروسا کر۔ جب تیری زندگی میں دوسری بار آؤں گی تو تجھے یقین آجائے گا کہ میں سچ بول رہی تھی اور وہ سچ تیرے سامنے آچکا ہے۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔''مجھے تو ہر حال میں مہم کے لیے جانا ہوگا۔ کامیابی ہوگی تو یہاں تیری خاطر ضرور واپس آؤں گا۔''

وہ بڑی کمزوری سے اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔''نہیں۔ تو کبھی یہاں نہیں آئے گا۔ میں تجھے اپنی قسم دیتی ہوں۔ تو وہاں بابر بادشاہ کے حرم میں جگہ بنائے گا۔ اس کا وفادار بن کر رہے گا۔ اور اگر وہاں جگہ نہ ملی تو کہیں فرار ہو جائے گا۔ مگر ان ظالموں کے ہاتھ کبھی نہیں آئے گا۔ مجھ سے وعدہ کر....میں آرام سے مردں گی تو دوسرا جنم لے کر تیرے پاس ضرور آؤں گی۔ تجھے ابھی قسم کھانی ہوگی کہ یہاں سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آئے گا۔''

وہ ضد کرنے لگی۔ کہنے لگی۔''اگر تو نے میری بات نہیں مانی تو میں ابھی تیرے سامنے جان دے دوں گی۔''

اس نے مجبور ہو کر کہا۔''اچھی بات ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔''نہیں۔ پہلے اپنے خدا اور رسول کی قسم کھا۔ پھر میری قسم کھا۔ تب مجھے یقین ہوگا۔''

اس نے اس کے کہنے پر قسم کھا کر کہا۔''میں یہاں سے جانے کے بعد کبھی واپس نہیں آؤں گا۔ اگر آواگون کا عقیدہ درست ہے تو تیرا انتظار کرتا رہوں گا۔''

وہ آگے کو جھک کر اس سے لپٹ گئی۔ فرطِ جذبات سے الوداعی آنسو بہانے لگی۔

بابر کے متعلق تمام مؤرخین کی متفقہ رائے ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی میں کبھی بدفعلی کا مرتکب نہیں ہوا۔ ایک ہی بری عادت تھی کہ وہ شراب پیتا تھا۔ بعد میں اس نے شراب پینے سے بھی توبہ کر لی تھی۔ بڑے بڑے مٹکوں میں جتنی شراب رکھی گئی تھی۔ ان تمام مٹکوں کو توڑ ڈالا گیا تھا۔ مشرقی اور شمالی ممالک کے تاجر تقریباً پچاس اونٹوں پر شراب کے مٹکے لاد کر لا رہے تھے۔ ان سب کو بہا دیا گیا۔ حرم میں تین بیگمات اور محدود تعداد میں کنیزیں تھیں۔ وہ کسی بھی کنیز کو خلوت میں بلانے سے پہلے اس سے نکاح پڑھا لیا کرتا تھا۔

اس نے تزکِ بابری میں خود لکھا ہے کہ ایک بار ایک حسین لڑکے پر دل آگیا تھا۔ لیکن وہ خود اتنا شرمیلا تھا کہ اس نے کبھی اس لڑکے سے براہِ راست گفتگو نہیں کی۔ اس کی شرافت اور اعلیٰ ظرفی اسے اس کی طرف مائل ہونے سے روکتی رہی تھی۔

بابر نے اپنی تزک میں اس حسین لڑکے کا نام نہیں لکھا۔ اس کا ذکر صرف اتنا ہی ہے کہ جب بھی سامنا ہوتا تھا تو وہ اس لڑکے سے کترا جاتا تھا۔ مؤرخ حضرات کو ہر بات تاریخ کے صفحات سے نہیں ملتی۔ کسی خاص دور کے حالات اور واقعات کو پیشِ نظر رکھ کر عقلی دلائل سے اور واقعات کے سیاق وسباق سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو بات پس پردہ رہ گئی ہے۔ وہ دراصل کیا ہوگی؟

اس حسین لڑکے کی بات بھی پسِ پردہ رہ گئی تھی۔ حالات وواقعات کا تانا بانا بنتے ہوئے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ حسین لڑکا مصباح احمد تھا۔ بابر نے حرم کے داروغہ کو حکم دیا تھا کہ وہ مصباح احمد کو جانچے' پرکھے پھر اسے خواجہ سرا کی حیثیت سے حرم میں داخل کرے۔

داروغہ نے اسے اپنے دفتر میں جا کر کہا۔''جھوٹ اور

فریب کی سزا موت ہے۔ اگر دشمن ہو یا دشمنوں کا ساتھ دے رہے ہو تو سچ بولو۔ اس طرح تم سزا سے بچ سکو گے۔''

مصباح احمد نے کہا۔ ''میں دہلی سے آیا ہوں۔ میرا نام مصباح احمد ہے۔ لیکن اب اس نام کے قابل نہیں رہا ہوں۔ مجھے جبراً خواجہ سرا بنا دیا گیا ہے۔''

داروغہ نے پوچھا۔ ''تم پر کس نے جبر کیا ہے؟''

وہ جواباً اپنی پوری روداد سنانے لگا۔ داروغہ بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا اور اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ تمام روداد سننے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''تم ہمارے خلاف جاسوسی کرنے آئے ہو؟ اگر نہیں کرو گے' یہاں کی خبریں وہاں نہیں پہنچاؤ گے تو اپنی محبوبہ کو کیسے رہائی دلا سکو گے؟''

''جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکی ہے۔ اندر سے اس قدر زخم خوردہ ہے کہ زیادہ دن نہیں جی سکے گی۔ اس نے مجھے قسم دی ہے' میں یہاں آنے کے بعد وہاں واپس نہ جاؤں۔ اسے تو یوں بھی مرنا ہے۔ لہٰذا میرے روانہ ہوتے ہی وہ موت کو گلے لگا لے گی۔''

یہ کہتے کہتے وہ سر جھکا کر رونے لگا۔ کہنے لگا۔ ''اس سے بچھڑے ہوئے آج پانچواں دن ہے۔ وہ اب تک یہ دنیا چھوڑ چکی ہوگی۔ آپ مجھے حرم میں نہ رکھیں۔ کوئی ملازمت نہ دیں۔ کہیں قید خانے میں ڈال دیں۔ میں نے زلیخا کی قسم کھائی ہے۔ واپس نہیں جاؤں گا۔ یہیں مر جاؤں گا۔''

داروغہ نے کہا۔ ''فکر نہ کرو۔ تمہیں یہاں پناہ ملے گی۔ تم جاسوسوں کے قافلے میں رہے ہو۔ ان سب کو چہروں سے پہچانتے ہو۔ کیا ان کی نشاندہی کرو گے؟''

''بے شک کروں گا۔ میں چاہتا ہوں' وہ مخبری کرنے اور سازشیں کرنے میں ناکام رہیں۔ ہمارے حضرت بادشاہ (بابر) دشمنوں پر غالب آجائیں اور دہلی تک فتح حاصل کرتے چلے جائیں۔''

پھر اس نے دہلی سے آنے والے ایک ایک جاسوس کی نشاندہی کی۔ وہ جہاں جہاں چھپے ہوئے تھے۔ ان سب کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ داروغہ نے مصباح احمد سے کہا۔ ''تمہیں حرم میں داخل کرنے سے پہلے تربیت دی جائے گی۔ یہاں کے طور طریقے سکھائے جائیں گے۔ تمہیں عورتوں کی طرح بولنا ہوگا۔ محل کی بیگمات اور کنیزوں کو تمہاری رفتار اور گفتار سے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تم ان کے جیسے ہو۔ کبھی بھول کر بھی کوئی مردانہ خصلت جھلکے گی تو وہ اجنبیت محسوس کریں گی۔''

اسے ایک ماہ تک تربیت دی گئی۔ پھر حرم میں داخل کر دیا گیا۔ ماہ و سال گزرنے لگے۔ بابر نے فتوحات حاصل کرتے ہوئے آگرہ اور دہلی تک اپنی سلطنت قائم کر لی۔ مصباح کا نام روحی صبا رکھ دیا گیا تھا۔ وہ اکثر زلیخا کو یاد کرتا تھا اور سوچتا تھا۔ ''ہم مسلمان اس بات کو نہیں مانتے کہ انسان مرنے کے بعد دوسری بار اس دنیا میں جنم لیتا ہے۔ مگر میرا دل کہتا ہے' ایک بار ایسا ہو جائے زلیخا پھر سے جنم لے کر میرے سامنے چلی آئے۔''

وہ تقریباً چھ برس تک سوچتا رہا۔ اس کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اچانک ہی وہ ایک دن نگاہوں کے سامنے چلی آئی۔ وہ اختری تھی۔ اسے ایک خادمہ کی حیثیت سے حرم سرا میں داخل کیا گیا تھا۔ ہو بہو زلیخا جیسی تو نہیں تھی۔ لیکن بڑی حد تک اس سے مشابہت رکھتی تھی۔

روحی صبا (مصباح احمد) کا دل دھڑک دھڑک کر کہتا تھا۔ ''یہ میری زلیخا ہے۔ اس نے برسوں بعد میری خاطر جنم لیا ہے۔ ایک خادمہ بن کر اس حرم میں آئی ہے۔ مجھے بھول گئی ہے۔ مگر اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔''

وہ اپنے دل کو تسلیاں دیتا تھا۔ ''اچھا ہوا کہ مجھے بھول گئی ہے۔ اگر پہچان بھی لیتی اور پھر سے میرے عشق میں مبتلا ہو جاتی تو اسے ایک خواجہ سرا سے کیا ملتا؟ صرف نامرادی....''

کئی بار دل میں یہ بات آئی کہ اس سے اپنی چاہت کا اظہار کرے۔ یا اسے اپنے اور زلیخا کے عشق کی روداد سنائے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ ماضی کے اوراق کھولنے سے مردانہ خصلت جھلکنے لگتی اور وہاں اس بات کی سختی سے منادی تھی۔

اس کی چاہت اور لگن ایسی تھی کہ وہ رفتہ رفتہ اختری کا خاص خدمت گار بن گیا تھا۔ یہ دیکھ دیکھ کر صدمہ پہنچتا تھا کہ اختری بھی زلیخا کی طرح بدنصیب ہے۔ وہ اپنے مصباح احمد کی دیوانی تھی اور اختری بادشاہ ہمایوں کی..... وہ مصباح کو نہ پا سکی اور اختری ایک رات کے بعد ہمایوں کے لیے ترستی رہی۔

زلیخا نے جس بے بسی سے دشمنوں کے چنگل میں رہ کر موت کو گلے لگایا تھا۔ اسی طرح اختری بھی دشمنوں کے درمیان بے یار و مددگار موت کی آغوش میں جا چکی تھی۔

وہ فصیل کے پختہ فرش پر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اُردا بیگنیوں نے اس کی آنکھوں کے سامنے اختری کی لاش کو اٹھا کر فصیل کی بلندی سے پیچھے گہری کھائی میں پھینک دیا تھا۔ اس کے دل سے ایک آہ نکلی۔ ''آہ.... یہ کیسی بے بسی ہے؟ میرے سامنے میری محبت کو دوسری بار موت کے گھاٹ

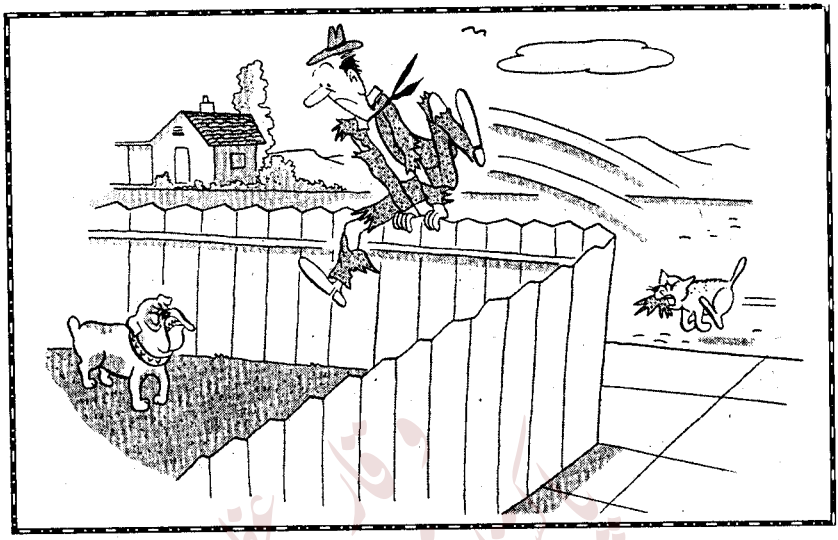

اتار دیا گیا ہے۔''

بعد میں اردابیگنیوں کے ذریعہ اسے معلوم ہوا کہ اختری کا اسقاط حمل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس نے زہریلی گولیاں کھا کر جان دی تھی۔

''ہائے.....! ہم درمیان والے نہ تو عورت ہوتے ہیں کہ اپنے ناز نخروں سے بادشاہوں کے دل جیت لیں اور اپنی بات منوالیں۔ نہ مرد ہوتے ہیں۔ اپنی محبت کے دشمنوں سے انتقام لینے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے۔''

ایک اردا بیگنی نے اپنی ننگی تلوار کو اس کے شانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''چل اٹھ یہاں سے۔ حرم میں جا۔ اب یہاں مسلح پہریدار آنے والے ہیں۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسری اردا بیگنی نے کہا۔ ''اور خبردار! اب ماتم نہ کرنا۔ اختری کی موت کو راز میں رکھا گیا ہے۔ تیرے آنسو بہانے کی بات باہر تک جائے گی تو راز فاش ہو جائے گا۔ تیرا سر قلم کر دیا جائے گا۔ اب جا یہاں سے.....''

وہ سر جھکا کر وہاں سے جاتے ہوئے دل ہی دل میں کہنے لگا۔ ''یا اللہ تعالیٰ! تو بڑا کارساز ہے۔ میں نے زلیخا کے دشمنوں سے انتقام لیا تھا۔ حضرت بادشاہ بابر کو خود پر مسلط کر دیا تھا۔ مجھے پھر کوئی ایسا موقع دے میرے مالک! میں بادشاہ ہمایوں کو ان لوگوں پر مسلط کر دوں۔ میں درمیان والا نہ اپنے کام آسکتا ہوں۔ نہ اپنوں کے کام آسکتا ہوں۔ بس ایک تیرا ہی آسرا ہے میرے پروردگار.....!''

☆☆☆

ہمایوں نے ایران کے شاہ طہماسپ صفوی کے نام ایک طویل خط لکھا۔ اپنے بھائیوں کی سازشوں اور دشمنیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ تفصیلات بیان کیں کہ کس طرح شیر خان سوری ان سوتیلے بھائیوں کی دشمنی سے فائدہ اٹھا کر ہمایوں پر غالب آتا رہا۔ اب یہ ہمایوں راندۂ درگاہ ہو کر شاہ طہماسپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔

اس نے یہ خط ایک قاصد کے ذریعے روانہ کیا۔ پھر حمیدہ بانو، گلنار آغاچہ اور نارگل آغاچہ کے ہمراہ ایران کی طرف روانہ ہو گیا۔ شاہ طہماسپ صفوی بہت ہی ذہین اور مضبوط قوت ارادی رکھنے والا مطلق العنان حکمران تھا۔ شہنشاہ بابر سے اس کے گہرے تعلقات رہے تھے۔

ہمایوں کا خط پڑھتے ہی ذہن میں یہ بات آئی کہ دوست کا بیٹا اپنے سوتیلوں سے ڈسا ہوا ہے۔ یقیناً اسلحہ اور فوجی امداد چاہے گا۔

ادھر کامران مرزا کے خاص آدمی پہلے ہی ایران پہنچ کر شاہ کے بھائی شہزادہ بہرام کو ہمایوں کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔ شاہ کے امراء بھی ہمایوں کے آمد پر خوش نہیں تھے۔ لیکن شاہ نے اپنے بھائی شہزادہ بہرام کو حکم دیا۔ ''ایک لشکر لے کر

ہمایوں کے استقبال کے لیے جاؤ اور اسے نہایت عزت و احترام سے ہمارے پاس لے آؤ۔''

پھر امیر شہر کو حکم دیا۔'' بابر کا بیٹا آرہا ہے۔ پورے شہر کو دلہن کی طرح سجاؤ۔ شادیانے بجاؤ۔ وہ جہاں سے گزرتا ہوا آئے۔ وہاں اس پر پھولوں کی بارش ہوتی رہے۔''

شاہ کی ہمشیرہ شہزادی سلطانہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اس کی بچپن کی سہیلی حمیدہ بانو آرہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ حرم میں جشن منانے کے انتظامات کرنے لگی۔ شاہ نے امراء اور دربار کے اراکین کو حکم دیا کہ وہ ہمایوں کے استقبال کے لیے دربارِ خاص میں موجود رہیں۔

ہمایوں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا اتنی گرم جوشی سے استقبال کیا جائے گا۔ وہ ایران کی سرحد پر پہنچا تو شہزادہ بہرام پہلے ہی اپنے لشکر کے ساتھ وہاں استقبال کے لیے موجود تھا۔ جب ان کے ساتھ منزلیں طے کرتا ہوا شہر میں پہنچا تو وہ اور حمیدہ بانو وہاں کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ جہاں سے گزر رہے تھے۔ ان پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔

جب حمیدہ بانو حرم میں پہنچی تو شہزادی سلطانہ دوڑ کر آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ دونوں سہیلیاں گلے مل کر رونے لگیں اور ہنسنے بھی لگیں۔ محل کے دروازے پر شاہ طہماسب صفوی نے خود آگے بڑھ کر ہمایوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے گلے لگایا۔ پھر تمام امراء سے اس کا تعارف کرایا۔ مہمان خانے میں اس کی رہائش کے پُرتکلف انتظامات کیے گئے تھے۔

شاہ نے اس کے ساتھ مہمان خانے میں آکر کہا۔'' تم ایک طویل سفر کے تھکے ہوئے ہو۔ دو گھڑی آرام کرو۔''

ہمایوں نے کہا۔'' آپ نے جیسی والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ اسے دیکھ کر ہماری ساری تھکن دور ہو گئی ہے۔ اگرچہ ہم آپ کے مرحوم دوست کے بیٹے اور آپ کے مہمان ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ایک سوالی ہیں۔ کسی تمہید کے بغیر یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ فردوس مکانی کی سلطنت کھو کر نہایت ہی شرمسار ہیں۔ خدا گواہ ہے' ہم سے جان بوجھ کر کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ سوتیلے بھائیوں کی سازشوں نے ہماری کمر توڑ دی ہے۔ ہمیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ جہاں ہمارا اپنا کوئی نہیں ہے۔ اوپر خدا ہے' نیچے آپ کا آسرا ہے۔ ہم آپ سے اسلحہ اور فوجی مدد حاصل کرنے آئے ہیں۔''

شاہ نے کہا۔'' خدا بڑا کارساز ہے۔ ہم تو اس کے عاجز بندے ہیں۔ وہ چاہے گا تو تمہاری مشکل آسان ہو جائے گی۔''

پھر اس نے ہمایوں کے شانے کو تھپک کر کہا۔'' جاؤ! غسل کرو اور آرام سے سو جاؤ۔ رات کو دسترخوان پر ملاقات ہوگی۔''

شاہ اسے مہمان خانے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ دوسری طرف حرم میں حمیدہ بانو نے بھی کسی تمہید کے بغیر شہزادی سلطانہ سے کہا۔'' ہمارے مجازی خدا بادشاہ ہمایوں کی حالت قابلِ رحم ہے۔ سوتیلے بھائیوں کی عداوت نے انہیں خانماں برباد کر دیا ہے۔ فردوس مکانی (بابر) کی قائم کردہ سلطنت ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اب اس سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں اسلحہ اور فوجی امداد کی ضرورت ہے۔ شاہ برادر تمہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں' تم ان سے ہماری سفارش کرو۔ وہ تمہاری خوشی کے لیے ہمارے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں۔''

شہزادی سلطانہ نے کہا۔'' ہم حکمرانی اور اس کی حکمت عملی کو بالکل نہیں سمجھتے۔ شاہ برادر بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ تمہارے معاملات میں انہیں کیا کرنا چاہیے؟ ویسے ہم بھرپور سفارش کریں گے۔ تمہارے ہمایوں بادشاہ کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیں گے۔''

دربارِ خاص میں شاہ طہماسب اپنے امراء اور ارکینِ دربار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ یہی موضوع زیرِ بحث تھا کہ بادشاہ ہمایوں شکست خوردہ آیا ہے۔ فوجی امداد کا طالب ہے۔ شہزادہ بہرام اپنے شاہ برادر کے سامنے ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا تھا۔

اس نے کہا۔'' ہمایوں ایک نااہل حکمران ہے۔ وہ ملک گیری اور حکمرانی کے بھید کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ایک جنگجو کی مستقل مزاجی سے جنگ لڑنا بھی نہیں جانتا۔ فوجی امداد دی جائے گی تو وہ پھر شکست کھائے گا۔ اس کے ساتھ ہمارے ہزاروں فوجی مارے جائیں گے۔ سیکڑوں' ہزاروں کی تعداد میں دیا ہوا اسلحہ بھی برباد ہوگا۔''

شاہ نے کہا۔'' ہمایوں شیر دل بابر کا بیٹا ہے۔ اس نے دشمنوں سے نہیں۔ اپنے بھائیوں کی کمینگی سے مات کھائی ہے۔ اگر ہم اس کی طرح نرم دل ہوتے۔ تمہارے ساتھ محبت اور مروت سے پیش آتے تو تم بھی ہمارے سر پر ناچنے لگتے۔ باغی بن کر ہمارے خلاف سازشیں کرتے اور ایک علیحدہ حکومت قائم کرنے کے لیے اس ملک کے ٹکڑے کر دیتے۔ ہم نے تمہیں اس قدر پابندیوں میں رکھا ہے کہ تم

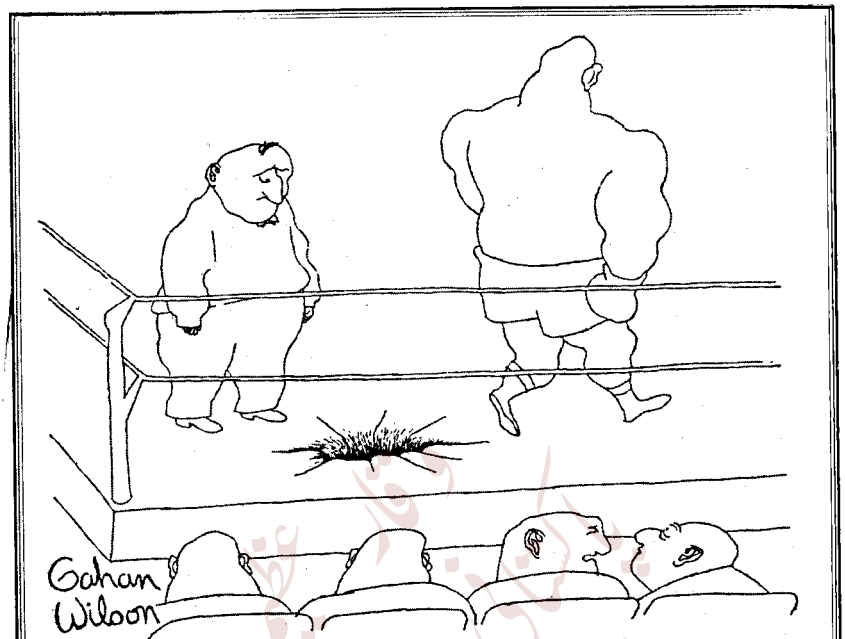

''میرے خیال میں مقابلے کا فیصلہ ہو چکا ہے''۔

ہمارے حکم کے بغیر پانی بھی نہیں پی سکتے۔ ہمارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہو۔ ہم تمہیں پیچھے کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ کیونکہ سوتیلے بھائی اکثر پیچھے سے حملہ کرتے ہیں۔''

شہزادہ بہرام چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔ جواباً کچھ نہ کہہ سکا۔ ایک امیر نے اٹھ کر دست بستہ عرض کیا۔ ''آپ حکومت کی خارجہ اور داخلہ حکمتِ عملیوں کو بہتر سمجھتے ہیں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کی طاقت بھی اتنی ہی بڑی ہوگی۔ ہمایوں جتنی مستحکم حکومت قائم کرے گا اتنا ہی ہمارے ملک کے لیے خطرہ بنتا رہے گا۔''

شاہ نے کہا۔ ''ہمیں ہمایوں میں اپنے مرحوم دوست بابر کی صورت اور سیرت دکھائی دیتی ہے۔ ہم نے برسوں پہلے بابر کو تحفے کے طور پر دو کنیزیں دی تھیں۔ وہ دونوں ہمایوں کے ساتھ یہاں آئی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ بابر نے ہمارے دیے ہوئے تحفوں کی اتنی قدر کی کہ کبھی انہیں کنیز بنا کر نہیں رکھا۔ ان دونوں کو شاہی بیگمات کا درجہ حاصل رہا ہے۔ بابر کی موت کے بعد اب ہمایوں ان کنیزوں کو ماں کا درجہ دیتا رہا ہے۔ جس کی فطرت میں اس قدر کی اعلیٰ ظرفی ہو۔ وہ اپنے محسن کے احسانات کو کبھی نہیں بھلاتا۔ ہم یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ ہندوستان میں دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد کبھی ہمارے لیے خطرہ بنے گا۔''

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''اور یہ خطرہ کیا ہوتا ہے؟ ہم جیسے بادشاہوں کو ہوشیار اور مستعد رکھنے کے لیے ایک تازیانہ ہوتا ہے۔ آس پاس کے ممالک فوجی اعتبار سے مستحکم ہوں تو ہم بھی ہمہ وقت بیدار اور مستحکم رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اگر آس پاس کے دشمنوں سے خوف آتا ہو تو اپنی زبانیں کاٹ کر پھینک دو۔ کیونکہ یہ بھی بتیس دانتوں کے درمیان رہتی ہے۔ یہ بتیس دشمن ایک زبان کو کسی وقت بھی کچل سکتے ہیں۔ مگر کچل نہیں پاتے.... ہمیں زبان کی طرح کبھی شیریں بن کر اور کبھی تلخ بن کر رہنا آتا ہے۔''

ایک اور امیر نے اٹھ کر دست بستہ عرض کیا۔ ''یہ بندہ مذہبی حوالے سے کچھ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہے۔ ہمایوں کا تعلق ہمارے مسلک سے نہیں ہے۔ اسے بہت بڑی فوجی امداد دینا اور اپنے ہزاروں سپاہیوں کو داؤ پر لگانا کیا

مناسب ہوگا؟''

شاہ نے کہا۔ ''ہمارا مسلک' ہمارا عقیدہ کہتا ہے۔ اگر پھیل سکتے ہو تو انسانوں کے دلوں میں کائنات کی طرح پھیلو۔ خاندانِ تیموریہ کی پوری تاریخ پر نظر ڈالو۔ شیر دل بادشاہ بابر نے اس ماں کا دودھ پیا' جس کا تعلق ہمارے مسلک سے تھا۔ ہمایوں کی والدہ ماہم بیگم بھی ہم میں سے تھیں۔ ہمایوں نے حالات سے مجبور ہو کر اپنے بیٹے اکبر کو ایک معزز دائی ماہم اَنگہ کے حوالے کیا ہے۔ اکبر اس کا دودھ پی رہا ہے اور ہمارے فرقے سے دودھ کی جو نہر نسل در نسل بہہ رہی ہے۔ اس سے مغل خاندان کی تاریخ کبھی انکار نہیں کر سکے گی۔ تم فوجی امداد پر اعتراض کر رہے ہو۔ یہاں دودھ کی آبیاری سے نسلیں پھل پھول رہی ہیں۔ وہ نہ کبھی دودھ کا قرض چکا سکیں گے اور نہ ہی کبھی کم ظرفی کا ثبوت دیں گے۔ یہ ہمیں پورا یقین ہے.....''

شاہ طہماسپ ایسا مدبر اور معاملہ فہم بادشاہ تھا کہ اس کے آگے کوئی بول نہیں پاتا تھا۔ سب کی زبانیں بند ہو جاتی تھیں۔ رات کو ہمایوں کے لیے جو عشائیہ دیا گیا۔ اس میں تمام امراء اور اراکین دربار شریک ہوئے۔ دور تک بچھے ہوئے دستر خوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنے گئے تھے۔ شاہ اور ہمایوں ایک دستر خوان پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ شہزادہ بہرام ہاتھ باندھے کھڑا ہوا تھا۔

شاہ نے اسے حکم دیا۔ ''آفتابہ اور سیلابچی لے کر آگے بڑھو اور مہمان کے ہاتھ دھلاؤ۔''

شہزادہ بہرام نے حکم کی تعمیل کی۔ ہمایوں کے سامنے سیلابچی رکھ کر آفتابہ کے پانی سے اس کے ہاتھ دھلانے لگا۔ شاہ نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو...! بھائیوں کو اس طرح رکھا جاتا ہے۔''

ہمایوں نے ہاتھ دھوتے ہوئے اس سوتیلے بھائی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ توہین کے احساس سے سرخ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ شاہ کے آگے دم نہیں مار سکتا تھا۔ کھانے کے دوران شاہ نے ہمایوں سے کہا۔ ''ہم تمہیں پچیس ہزار سپاہی اور پچاس ہزار بندوقیں دیں گے۔ مگر ہماری ایک شرط ہے۔''

ہمایوں نے کہا۔ ''ہمیں آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ آپ حکم دیں۔''

''ہم تمہارے باپ کی جگہ ہیں۔ حکم نہیں دیں گے [illegible] اچھی نصیحت کریں گے اور وہ یہ کہ جب یہاں سے [illegible] کے ساتھ یہاں سے نکلو تو فی الوقت دشمنوں کو [illegible] سے پہلے بھائیوں کی سرکوبی کرو۔ انہیں کچل ڈالو۔ جب آستین کے سانپ مر جائیں گے۔ گھر کا کوئی بھیدی ہی نہیں رہے گا تو بابر کا بیٹا بڑے سے بڑے شہزور دشمنوں پر غلبہ حاصل کرتا چلا جائے گا۔''

ہمایوں نے شاہ کو احسان مندی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خدا ہمیں توفیق دے۔ ہم آپ کی نصیحت پر حرف بہ حرف عمل کریں گے۔''

شاہ نے نیام سے تلوار نکالی۔ پھر اس تلوار کو بکرے کی بھنی ہوئی بھاری بھرکم ران میں پیوست کر کے وہاں سے اٹھایا۔ اسے ایک ہاتھ سے پکڑ کر دانتوں سے نوچ نوچ کر چباتے ہوئے کہا۔ ''جو قریب ہیں' پہلے انہیں چبانا شروع کرو۔ دور والے تمہارے چبانے کا انداز دیکھ کر دور بھاگتے چلے جائیں گے۔''

☆☆☆

بدبختی اور خوش بختی دونوں ہی ہمایوں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ حالات اسے گراتے تھے۔ مگر وہ سنبھلنے میں دیر نہیں کرتا تھا۔ ایک چھوٹا سا گھر تباہ ہو جائے اور در بدر ہونا پڑے تو آدمی سنبھل نہیں پاتا۔ ہمایوں کا وسیع و عریض محل ہی نہیں' ہندوستان کی پوری سلطنت لٹ گئی تھی۔ اس سے چھین لی گئی تھی۔ اسے بے گھر بے در کر دیا گیا تھا۔ وہ صحرا میں بھٹک رہا تھا۔ قسمت کا دھنی تھا۔ لٰہذا خوش بختی اسے ایران لے گئی تھی۔ جہاں وہ پھر سے ایک فوجی قوت حاصل کر رہا تھا۔

اگر اسے خوش بختی کہا جائے تو بدبختی یہ تھی کہ اپنا بیٹا ...اپنا لختِ جگر اکبر بچھڑ گیا تھا۔ فردوس مکانی بابر کے انتقال کے وقت سے یہ خواہش پنپ رہی تھی کہ ایک' بیٹا ایک وارث ہونا چاہیے۔ ماہم بیگم نے ایک پوتے کو گود میں کھلانے کے لیے کتنی ہی کوششیں کر ڈالیں۔ ہمایوں کی کتنی ہی شادیاں کرائیں۔ لیکن بیٹیاں پیدا ہوتی رہیں۔ کوئی جیتی رہی.... کوئی مرتی رہی۔ کسی بھی بہو سے پوتا نہ ہوا۔ آخر اختری سے یہ امید بندھی۔ نجومیوں نے پورے یقین سے پیشگوئی کی کہ بیٹا ہو گا...اور یقیناً ایسا ہی ہوا۔

ہونے کو تو بہت کچھ ہوتا ہے۔ مالی بیج بوتا ہے' درخت اگاتا ہے۔ لیکن پھل کھانا اس کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ وہ پھل دوسروں کی جھولی میں چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ اختری اپنے ہونے والے بیٹے کے ساتھ ہاتھ سے بے ہاتھ ہو گئی تھی ماہم بیگم اور ہمایوں سے جدا ہو کر سوتیلے بھائی کے شکنجے میں چلی گئی تھی۔ وہ بیٹا جو دنیا میں آ ہی رہا تھا۔ وہ آتے آتے نابود ہو گیا تھا۔

ایک نئی فوجی قوت حاصل کرنے والے اس خوش بخت

بادشاہ کی بدبختی یہ تھی کہ حمیدہ بانو کے بطن سے ہونے والا دوسرا بیٹا اکبر بھی اس سے بچھڑ گیا تھا۔ بظاہر تو یہی بات تھی کہ اس شیر خوار بچے کو طویل سفر کی صعوبتوں میں ساتھ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس لیے اسے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھنے والی دائی ماہم انگہ کی گود میں دے دیا گیا تھا۔ اکبر اس کا دودھ پی رہا تھا۔ ہمایوں کا سوتیلا بھائی دلدار بیگم کا بیٹا ہندال قندھار کا حکمران تھا۔ اکبر وہاں پوری طرح محفوظ تھا۔ لیکن اپنی چیز اپنے ہی ہاتھ میں ہو تو اپنی رہتی ہے۔ بچھڑنے کے بعد اختری سے ہونے والے بیٹے کا کیا انجام ہوا تھا.....؟

اب حمیدہ بانو سے ہونے والے بیٹے کی جدائی کیا گل کھلانے والی تھی.....؟

کیا گل سے گلستان ہونا تھا...؟ یا بدبختی کوئی اور ہی رنگ دکھانے والی تھی؟

بظاہر تو ایسے آثار نہیں تھے کہ اچانک ہی زلزلہ آجاتا زمین پھٹ جاتی یا آسمان ٹوٹ پڑتا۔ بدبختی کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ آنے سے پہلے کبھی آثار پیدا نہیں کرتی۔ کوئی اشارہ نہیں دیتی۔ بس اچانک ہی چھاپا مار دیتی ہے۔

عسکری مرزا اچانک ہی اپنے لشکر کے ساتھ چڑھ دوڑا۔ ہندال ایسے حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے جم کر مقابلہ کیا۔ اس کے سپاہی زرہ بکتر کے ساتھ تیار نہیں تھے۔ یکا یک افتاد آپڑی تو ہتھیار اٹھا کر مقابلے پر آگئے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اپنا بچاؤ کر رہے تھے۔ اس طرح بھی جنگ نہیں لڑی جاتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے قدم اکھڑنے لگے۔ ہندال کو کابل کی طرف واپس آنا نصیب نہیں ہوا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے دوسری طرف فرار ہو گیا۔

عسکری مرزا ایک فاتح کی شان سے محل میں داخل ہوا۔ کنیزوں نے' خواجہ سرا اور ارد ابیگنیوں نے اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ وہ ان کے درمیان سے گزرتا ہوا بیگمات کے پاس آیا۔ دلدار بیگم نے سینہ تان کر کہا۔ ''عسکری.....! تم سوتیلے پن سے باز نہیں آئے۔ کوئی دوسری بات کرنے سے پہلے یہ بتاؤ' ہمارا بیٹا کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟''

عسکری نے کہا۔ ''آپ کا بیٹا ہمایوں کی طرح بزدل اور بھگوڑا ہے۔ آپ سب کو ہمارے رحم کرم پر چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔''

پھر اس نے دلدار بیگم کی بیٹی اور ہندال کی بہن گلبدن بیگم کو دیکھ کر کہا۔ ''آئندہ آپ سب یہاں قیدی کی حیثیت سے رہیں گی۔ حرم سے باہر کبھی تفریح کے لیے باغ میں بھی نہیں جائیں گی۔''

پھر اس نے پوچھا۔ ''یہاں اور کتنی بیگمات ہیں؟ ان سب کو حاضر کیا جائے۔''

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ ماہم انگہ کو پیش کیا گیا۔ گیارہ ماہ کا اکبر اس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ عسکری نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

دلدار بیگم نے کہا۔ ''تمہیں یاد ہوگا' قنوج کی جنگ کے موقع پر شمس الدین خان نے ہمایوں کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور اس جنگ میں اپنی جانثاری کے خوب جوہر دکھائے تھے۔ یہ اسی کی زوجہ ماہم انگہ ہیں۔''

''اور یہ بچہ.....؟''

''یہ ہمارے ہمایوں کا بیٹا جلال الدین اکبر ہے۔ ماہم انگہ کا دودھ پیتا ہے۔''

عسکری نے ایک دم سے چونک کر بچے کو دیکھا۔ پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر سر اٹھا کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو کمال ہو گیا۔ ہم آئے تھے آگ لینے کے لیے ہمیں پیغمبری مل رہی ہے..... آئے تھے قندھار فتح کرنے کے لیے اور برادر بادشاہ کا جانشین مل رہا ہے۔ آج تو ہمیں اپنی خوش بختی کا خوب جشن منانا چاہیے۔''

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ماہم انگہ کے پاس آیا۔ وہ اکبر کو سینے سے بھینچتی ہوئی دوسری طرف پلٹ گئی۔ یہ سمجھ گئی تھی کہ وہ بچے کو چھیننے کے لیے آیا ہے۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہم سوتیلے ہیں تو کیا ہوا؟ ایک ہی باپ کا لہو ہیں۔ یہ ہمارے برادر بادشاہ کا راج دلارا ہے۔ ہمیں بھی جان سے پیارا ہے۔ اسے ہمارے ہاتھوں میں دو۔ ہم سینے سے لگائیں گے۔''

ماہم انگہ نے پریشان ہو کر دلدار بیگم کی طرف دیکھا۔ عسکری مرزا قاتح بن کر آیا تھا۔ اس کے سامنے انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ دلدار بیگم نے کہا۔ ''بے شک یہ تمہارا حق بنتا ہے کہ اپنے بھتیجے کو سینے سے لگا کر پیار کرو۔ مگر تم سے استدعا ہے کہ یہ بچہ ہمارے پاس ہمایوں کی امانت ہے' وعدہ کرو اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہم کوئی آگ تو نہیں ہیں کہ اسے آنچ لگ جائے گی؟ صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم چار سوتیلوں کے بیچ میں یہ کیا چیز آئی ہے؟ اور اگر آ ہی گئی ہے تو ماں باپ کے پاس کیوں نہیں ہے؟ یہاں کیوں پڑی ہے؟''

دلدار بیگم نے کہا۔ ''اس لیے کہ یہ ماہم انگہ کا دودھ پیتا ہے۔ ہمایوں اپنی بیگم حمیدہ بانو کے ساتھ بے سروسامانی کی حالت میں ہے اور اپنی فوجی قوت بڑھانے کی فکر میں ہے۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''آپ حقیقت کیوں چھپا رہی ہیں؟ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ وہ فوجی امداد حاصل کرنے کے لیے ایران گیا ہے؟''

پھر اس نے ماہم انگہ کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ''لاؤ..... بچہ ہمیں دو۔''

اس نے بڑے ہی تحکمانہ انداز میں کہا تھا۔ بادشاہ ایک ہی بار حکم دیتا ہے اور اس پر عمل کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ ماہم انگہ نے اکبر کو اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلیوں پر رکھ دیا۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''واہ کیا بات ہے۔ دیکھنے میں بڑا زبردست ہے۔ ابھی سے شاہانہ تیور دکھائی دے رہے ہیں۔ مگر نصیب تو اپنے باپ سے لے کر آیا ہے۔ اُس کے پاؤں تلے زمین نہیں ہے۔ وہ مارا مارا پھر رہا ہے اور اسے بھی ماں باپ کا سایہ نصیب نہیں ہے۔ یہ بھی ہاتھ سے بے ہاتھ ہو کر ایک تایا کی گود میں پہنچا ہوا ہے۔ اب ہمارے ہاتھوں میں آیا ہے۔ خدا جانے اس کے بعد کہاں جائے گا؟''

پھر اس نے دلدار بیگم سے کہا۔ ''کیا ہی اچھا ہوتا' برادر بادشاہ اپنے بچے کو ہاتھوں میں اٹھا کر شاہ ایران کے پاس لے جاتے۔ اس کے قدموں میں اسے رکھ کر بھیک مانگتے۔ اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تمہارے بچے سلامت رہیں۔ اپنے بچوں کے طفیل ہمیں اسلحہ اور سپاہیوں کی بھیک دے دو.....''

وہ بچے کو ہاتھوں پر اچھالتے ہوئے بولا۔ ''مگر نہیں ملے گی۔ خیرات نہیں ملے گی۔ شاہ ایران اتنا نادان نہیں ہے کہ اپنا قیمتی اسلحہ اور ہزاروں سپاہی لڑنے مرنے کے لیے اس کے حوالے کر دے گا۔''

دلدار بیگم نے کہا۔ ''ہمایوں کو اس کے حال پر رہنے دو۔ بچے کو یوں نہ اچھالو۔ ہماری سانسیں رک رہی ہیں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''آپ کا دم نہیں نکلنا چاہیے۔ ہم اسے نہیں اچھالیں گے۔''

اس نے اکبر کو سینے سے لگایا پھر کہا۔ ''یہ بھتیجا اسی طرح اپنے چچا کے سینے سے لگا رہے گا۔ برادر بادشاہ کی واپسی تک امانت کے طور پر ہمارے پاس رہے گا۔''

ماہم انگہ' دلدار بیگم اور گلبدن بیگم نے اسے پریشان ہو کر دیکھا۔ گلبدن بیگم نے کہا۔ ''برادر! ہم خواتین بچے کی اچھی طرح نگرانی کر سکتی ہیں۔ خدارا! اسے ہمارے پاس رہنے دیں۔''

عسکری مرزا نے کہا۔ ''ہمارے حرم میں بھی خواتین ہیں۔ وہاں بھی اس کی نگرانی ہو سکتی ہے۔ ہاں۔ یہ اس خاتون کا دودھ پیتا ہے۔ اس لیے دودھ پلانے والی ہمارے ساتھ جائے گی۔''

دلدار بیگم نے کہا۔ ''بیٹے! ایسا ظلم نہ کرو۔ اکبر کو لے جانا چاہتے ہو۔ تو پھر ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔ قیدی بنا کر رکھو۔ مگر ہمایوں کی امانت سے دور نہ کرو۔''

عسکری مرزا نے منہ پھیر کر اردابیگیوں سے کہا۔ ''تمام بیگمات کو ایک کمرے میں لے جا کر بند کر دو۔''

پھر اس نے خواجہ سراؤں سے کہا۔ ''باہر جا کر پردے کا انتظام کرو۔ پھر ماہم انگہ کو اکبر کے ساتھ پالکی میں بٹھاؤ۔ ہمیں ابھی یہاں سے روانہ ہونا ہے۔''

اس نے اکبر کو ماہم انگہ کی گود میں دیتے ہوئے حکم دیا۔ ''ہمارے پیچھے آؤ.....''

وہ پلٹ کر فاتحانہ انداز میں سینہ تان کر جانے لگا۔ ماہم انگہ نے بڑی بے بسی سے دلدار بیگم اور گلبدن بیگم کو دیکھا۔ پھر اکبر کو سینے سے لگائے سر جھکائے اس فاتح کے پیچھے جانے لگی۔

ادھر اختری نے اپنی جان پر کھیل کر کامران مرزا کے لیے مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ وہ اس آسرے پر تھا کہ اختری ایک بیٹے کو جنم دے گی تو ہمایوں اسے اپنا سمجھ کر کامران کے دباؤ میں آ جائے گا۔ بیٹے کی خاطر اس کی عداوتوں اور سازشوں کو بھول کر اسے معاف کر دے گا۔ لیکن اختری کی موت نے اس منصوبے کو خاک میں ملا دیا تھا۔

اب اس نے سوچا تھا کہ ایک ایسے بچے کو حاصل کرے گا جو شاہی خاندان کا لگتا ہو۔ پھر اسے ہمایوں کا بیٹا بنا کر اس کے سامنے پیش کرے گا اور یہ بیان دے گا کہ اختری اس کے وارث کو جنم دینے کے کچھ دیر بعد اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔

گل رخ بیگم نے کہا۔ ''ہمارے خاندان میں کسی بیگم یا شہزادی کی گود میں شیر خوار بچہ نہیں ہے۔ ایسا بچہ کہیں باہر سے لانا ہو گا۔''

کامران مرزا نے کہا۔ ''بڑی مشکل ہے۔ باہر سے لانے کے غیروں کو رازدار بنانا ہو گا۔''

وہ جلد از جلد ایک شیر خوار بچہ حاصل کرنے کی تدابیر سوچ رہے تھے۔ ایسے ہی وقت عسکری مرزا نے اطلاع بھیجی کہ وہ قندھار فتح کر چکا ہے اور ہندال کو بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس سے بھی بڑی خوش خبری یہ تھی کہ برادر بادشاہ کا بیٹا جلال الدین اکبر اس کے قبضے میں آ گیا ہے۔ وہ اسے یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے آیا ہے۔

یہ سنتے ہی ماں بیٹا خوشی سے اچھل پڑے۔ وہ ہمایوں کے لیے ایک نقلی بچہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ادھر اصلی بیٹا

ہاتھ آ گیا تھا۔ کامران مرزا نے خوش ہو کر ماں سے
کہا۔ ''آ کم مادر! عسکری مرزا نے تو کمال کر دیا ہے۔ ہماری
بدنصیبی کو خوش نصیبی میں بدل دیا ہے۔ ہم اپنے بھائی کو سونے
میں تول دیں گے۔ آپ آج ہی عسکری کے پاس جائیں اور
اور بادشاہ کے بیٹے کو یہاں لے آئیں۔''
ہمایوں کا بیٹا ان سب کے لیے طلسمی چراغ تھا۔ اسے
حاصل کرنے کے لیے وہ فوراً ہی اپنے دوسرے بیٹے عسکری
کی طرف دوڑ پڑی۔
وہاں پہنچ کر اس نے اکبر کو دیکھا۔ پھر اسے ہاتھوں میں
لے کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت تو ہمیں دو
جہاں کی دولت مل رہی ہے۔ اب ہم خدا سے کچھ نہیں چاہیں
گے۔ تم یہ بتاؤ' جب قندھار کو فتح کر لیا ہے تو پھر وہ علاقہ چھوڑ
کر یہاں کیوں آ گئے ہو؟''
اس نے کہا۔ ''آ کم مادر! ہمارے پاس اتنا ہی لشکر ہے
کہ ہندال کو زیر کر سکتے ہیں اور ہم نے ایسا کیا ہے۔ شاہ
ایران سے توقع نہیں ہے کہ وہ ہمایوں کو فوجی امداد دینے کی
غلطی کرے گا۔ فرض کریں' اس نے یہ غلطی کی اور اسے فوجی
امداد مل گئی تو وہ سب سے پہلے اپنے بیٹے کے لیے سیدھا
قندھار آئے گا۔ پھر ہم اس کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکیں
گے۔''
''پھر تو تم نے اچھا ہی کیا کہ اکبر کو لے کر یہاں چلے
آئے۔ لیکن قندھار کے لیے افسوس ہو رہا ہے۔ تم جیتا ہوا
علاقہ چھوڑ آئے ہو۔''
''ہمیں فیصلہ کرنا تھا کہ کس کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس
علاقے کی یا ہمایوں زادے کی...؟''
''بے شک تم نے درست فیصلہ کیا ہے۔ خدا نہ کرے
کبھی ہمیں ہمایوں کے سامنے جھکنا پڑا تو اس کا یہ بیٹا ہمارے
بہت کام آئے گا۔ پھر یہ کہ تم دونوں بھائیوں کی لشکری قوت
زیادہ ہو گی۔ یہاں تم ہمایوں کا مقابلہ کر سکو گے۔''
گل رخ بیگم کی گود میں اکبر رونے لگا۔ عسکری مرزا نے

حسن وہ! جو چھپائے نہ چھپے!
میرے نسوانی حسن کا راز
بلوسم
بریسٹ یونانی کریم
قدرتی جڑی بوٹیوں پر برسہا برس کے تجربات اور تحقیق کے
بعد ایک نئی ایجاد، بلوسم بریسٹ یونانی کریم جو
بریسٹ کے نشوونما کو سخت کر کے ابھارتی ہے۔
قیمت =/150
بریسٹ کے چھوٹے پن میں اضافہ کر کے پروقار شخصیت کا مالک بناتی ہے لٹکی ہوئی نسوانی بدصورتی کو دوبالا کرتی ہے
قیمت =/105
چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔
یونانی کریم
گلیسی
برسہا برس کے تجربے اور تحقیق کے بعد قیمتی جڑی بوٹیوں کے
اجزاء اور عرقیات سے تیار کردہ۔ بدنما داغ دھبوں، مہاسوں کو بھی
صاف کر کے چہرے کی رنگت نکھارتی ہے۔

اسٹاکسٹ:
لوہا اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
صدر میڈیکل اسٹور ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
علم جنرل اسٹور لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
ابراہیم سن لیاقت مارکیٹ ملیر کراچی
وقاص میڈیکل اسٹور الآصف اسکوائر این 22 کراچی
نوری اسٹار جنرل اسٹور مدینہ چوک ریشم بازار حیدر آباد
علی دواخانہ وکٹوریہ روڈ سکھر
ماما میڈیکل گجن پور روڈ لاڑکانہ
ایس ایس لنکرز لاہور 635769
المدینہ دواخانہ مدینہ مارکیٹ سی ایم ایچ روڈ راولہ کوٹ
وقاص میڈیسن کمپنی میاں میڈیسن مارکیٹ لوہاری لاہور
گڈ لک ہومیو اسٹور ریلوے روڈ سیالکوٹ
پاکستان جنرل اسٹور کچہری بازار گول چوک گودھا
عظیم ہوبی سینٹر مدینہ مارکیٹ ستیانہ روڈ فیصل آباد
قدیمی چنیوٹی دواخانہ کچہری بازار سرگودھا
شہباز جنرل اسٹور مدینہ مارکیٹ ستیانہ روڈ فیصل آباد
جرمن ہومیو اسٹور اردو بازار گوجرانوالہ
علی ہومیو اسٹور سرکلر گجرات
محمد علی دواخانہ 2278463 اسلام آباد
المراد ہومیو فرنیچر بازار نزد ڈنگی ساہیوال
B.D.H انٹرنیشنل بوہڑ بازار راولپنڈی 5772354
ہمدرد دواخانہ مین بازار جہلم
المدینہ جنرل اسٹور ایم ایچ روڈ راولاکوٹ
ابن سینا اسٹور گھنٹہ گھر بازار ڈیرہ غازی خان
شالی دواخانہ اندرون فرید گیٹ شاہی بازار بہاولپور۔
طاہر شاپنگ سینٹر ریل بازار اوکاڑہ
ذیشان ہومیو اسٹور چنیوٹ بازار فیصل آباد
خالد دواخانہ صراف بازار ایبٹ آباد
رمضان پنساری فوارہ چوک چیچہ وطنی
سلیم پنساری گوجرانوالہ روڈ حافظ آباد
یو پی پنسارا اسٹور ہری کشن روڈ۔ کوئٹہ
نوید صحت دواخانہ 89 صدر پشاور
انعام کیمسٹ شمعی روڈ مردان
سعید فینسی اسٹور اندرون ٹنگ گیٹ کوہاٹ
پاک ہومیو سائیں سہیلی روڈ ہری پور
ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور
مفت طبی مشورے کے لئے فون 0333-5203553 دیں

ڈسٹری بیوٹر: مطب: بادشاہ دی ہٹی D-389 بوہڑ بازار راولپنڈی۔ 7112222 7116666 بادشاہ دی ہٹی ڈھوک کھبہ راولپنڈی ___ 5502903
مقیم الدین برادرز کچی گلی نمبر 1 ڈینسو ہال کراچی۔ فون: 2433682 ریاض محمود 69 نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور۔ فون: 7666264
باب الاشفاء دواخانہ اندرون بخاری مارکیٹ گھنٹہ گھر ملتان۔ 061-4576350 کراچی میں ہوم ڈیلوری کے لئے فون نمبر 0300-9226018
گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی پارسل منگوانے کے لئے
حکیم اینڈ سنز۔ پوسٹ بکس 2159، کراچی۔ 74600 پاکستان۔

کہا۔ ''شائد اس کے دودھ کا وقت ہو گیا ہے۔''

اس نے حکم کیا۔ ''ماہم انگہ کو حاضر کیا جائے۔''

گل رخ بیگم نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''اکبر کی دایہ ہے۔ اسے دودھ پلاتی ہے۔ یہ اس سے بہت مانوس ہے۔ اس لیے ہم اسے بھی یہاں لے آئے ہیں۔''

ماہم انگہ نے آ کر سلام کیا تو گل رخ بیگم اسے دیکھتے ہی بولی۔ ''یہ آپ ہیں....؟''

پھر اس نے بیٹے سے کہا۔ ''یہ تو شمس الدین خان کی زوجہ ہیں۔ دہلی میں شاہی محل میں ہمارے ساتھ رہ چکی ہیں۔ بہت اچھی خاتون ہیں۔ تم نے بہت اچھا کیا جو انہیں یہاں لے آئے۔''

اکبر ماہم انگہ کو دیکھتے ہی اس کے پاس جانے کے لیے مچلنے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے گود میں لے لیا۔ گل رخ بیگم نے کہا۔ ''یہ بھوکا ہے۔ اسے لے جائیں۔ دودھ پلانے کے بعد اپنا ضروری سامان رکھ لیں۔ اکبر کو یہاں محل میں نہیں۔ قلعے میں رکھا جائے گا۔''

ماہم انگہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ پھر دودھ پلاتے ہوئے اس کا سر سہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرے بچے! میں تمہیں دودھ پلانے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میں نے تمہاری خاطر اپنے بیٹے کو دائی کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کے حصے کا دودھ تمہیں پلا رہی ہوں۔ مگر تم بھی تو باپ کا نصیب لے کر آئے ہو۔ گھر سے بے گھر اور ہاتھ سے بے ہاتھ ہوتے جا رہے ہو۔ اب تمہیں کامران مرزا کے حوالے کیا جائے گا۔ نجانے یہ لوگ کیسی سازشیں کر رہے ہیں؟ اب تمہارا کیا ہونے والا ہے؟''

وہ دل ہی دل دعائیں مانگنے لگی کہ بادشاہ ہمایوں کو کسی بھی طرح ایران سے فوجی امداد حاصل ہو جائے اور وہ بیٹے کو حاصل کرنے کے لیے سیدھا یہاں چلا آئے۔

وہ نہیں جانتی تھی' ہمایوں کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ اس کی راہوں میں کانٹے بچھائے جاتے تھے۔ کیا وہ کانٹے چنتا ہوا ایران تک پہنچا ہو گا؟ بخت اس سے ناراض ہے۔ کیا اس کی یاوری کرے گا؟

اکبر دودھ پیتے پیتے سو گیا۔ ایسے وقت ایک اردابیگنی نے آ کر کہا۔ ''خواجہ سرا روحی صبا حاضری کی اجازت چاہتی ہے۔''

ماہم انگہ نے اکبر کو بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔ ''اجازت ہے۔''

اس نے باہر جا کر روحی صبا کو اندر بھیج دیا۔ وہ ماہم انگہ کو سلام کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا نام روحی صبا ہے۔ میں ملکہ معظمہ (گل رخ بیگم) کی خاص خادمہ ہوں۔ ان کے دونوں صاحبزادوں کی بھی معتمدِ خاص ہوں۔ مجھے آپ کی خدمت کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ آپ قلعے میں جا کر رہیں گی تو میں دروازے کے باہر پہریدار کے طور پر موجود رہا کروں گی۔ آپ کا کوئی بھی کام صرف میں ہی کیا کروں گی۔''

''یہ اچھی بات ہے کہ تم ان کی معتمدِ خاص ہو۔ میں تمہارا نام یاد رکھوں گی اور ضرورت کے وقت تمہیں طلب کروں گی۔''

''میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔''

ماہم انگہ نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہاں کے خواجہ سرا کو غیر ضروری گفتگو کرنے کی اجازت ہے تو کہو.... کیا کہنا چاہتی ہو؟''

روحی صبا نے کہا۔ ''ایک سوال ہے' آپ موجودہ حالات میں کس کی وفادار رہیں گی؟ کابل کے بادشاہ بخت آور کامران مرزا کی.... یا ان کے برادر بادشاہ ہمایوں کی.....؟''

ماہم انگہ نے اکبر کو دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں اس بچے کو جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔ میرے والد محترم فردوس مکانی بابر کے وفادار تھے۔ میرے مجازی خدا شمس الدین خان بادشاہ ہمایوں کے جانثار محافظ ہیں۔ وفاداری میری گھٹی میں پڑی ہے۔ یہ سلسلہ یہاں تک آ پہنچا ہے کہ میں بادشاہ ہمایوں کے بیٹے کو دودھ پلا رہی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''خدا شہزادہ اکبر کو اپنے حفظ امان میں رکھے۔ یہاں ان کا کوئی سگا نہیں ہے۔ سب سوتیلے ہیں۔ اوپر اللہ ہے اور نیچے آپ... خدانہ کرے' ان پر کوئی آنچ آئے۔ اگر آئے گی تو کیا کریں گی؟''

ماہم انگہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر بڑے عزم اور حوصلے سے کہا۔ ''میری آخری سانسوں تک یہی کوشش ہو گی کہ اس پر کبھی کوئی آنچ نہ آئے۔ مگر اس بچے پر جان نچھاور کرنے کے بعد کیا ہو گا یہ میں نہیں جانتی۔ صرف خدا جانتا ہے۔''

وہ بولا۔ ''خدا آپ کو سلامت رکھے اور شہزادہ اکبر آپ کی آغوش میں دشمنوں سے محفوظ رہیں۔ آپ نے اختری کا

...نا ہوگا۔ وہ بادشاہ سلامت کی منکوحہ تھیں۔ نجومیوں کی ...ی کے مطابق ان کے بیٹے کو جنم دینے والی تھیں۔"

"ہاں۔ بہت کچھ سنا ہے۔ گلبدن بیگم نے بتایا تھا کہ کامران مرزا نے ان سب کو قیدی بنا کر رکھا تھا۔ لیکن اختری کو مہمان خاص بنایا ہوا تھا۔"

روحی صبا نے کہا۔ "ان بیگمات کو اختری کے سلسلے میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ میں چاہتی ہوں، یہ تمام غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔"

اس نے محتاط نظروں سے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے لباس میں سے کاغذات کا ایک پلندا نکالتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمام حقائق تفصیل سے لکھے ہیں۔ میری گذارش ہے، آپ انہیں ضرور پڑھیں اور پڑھنے کے بعد جلا دیں۔ اگر یہ ملکہ معظمہ (گل رخ بیگم) اور ان کے صاحبزادوں کے ہاتھ لگیں گے تو وہ میری کھال کھنچوا دیں گے۔ میں بہت بڑا خطرہ مول لے کر آپ پر اعتماد کر کے یہاں سے جا رہی ہوں۔ آپ کی بے اعتمادی میری موت کا سبب بنے گی۔"

وہ سلام کرتا ہوا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ ماہم انگہ نے اسے اندر سے بند کیا۔ پھر اکبر کے پاس آ کر بستر کے سرے پر بیٹھ گئی۔ اس پلندے کو کھول کر پڑھنے لگی۔

روحی صبا نے اختری کی پوری روداد لکھی تھی کہ وہ کس طرح حرم میں آئی تھی اور ہمایوں بادشاہ کو دل ہی دل میں چاہتی تھی۔ ایک جوتشی نے کہا تھا کہ وہ ایک رات کی ملکہ بنے گی۔ یہی بات اس کے دل و دماغ میں نقش ہو گئی تھی۔ جب ماہم بیگم کے نجومی نے بھی یہی بات کہی تو انہوں نے ایک پوتا اور تخت کا وارث حاصل کرنے کے لیے بادشاہ ہمایوں کا نکاح اختری سے پڑھا دیا۔

بعد میں یہ پیشگوئی درست ثابت ہوئی۔ وہ صرف ایک ہی رات کے لیے اس کی دلہن بن پائی تھی۔ پھر سہاگ کی دوسری رات نصیب نہیں ہوئی۔ وہ بدنصیب حالات کے تھپیڑے کھاتی ہوئی کامران مرزا کے ہتھے چڑھ گئی۔

اس نے بادشاہ ہمایوں سے یہ بات چھپائی تھی کہ جو بیٹا وہ پیدا کرنے والی تھی۔ اس میں ملاوٹ ہو چکی ہے۔ اسے جوتشی کی پیشگوئی پر پورا اعتماد تھا بلکہ عقیدہ تھا کہ وہ ہمایوں کے بیٹے کو ہی جنم دے گی۔ اسی لیے اس نے بادشاہ ہمایوں کو یہ نہیں بتایا کہ کامران مرزا اس کی آبرو پر ہاتھ ڈال چکا ہے۔

چونکہ وہ گل رخ بیگم اور کامران مرزا کی مرضی کے مطابق جھوٹ بول رہی تھی اور ہمایوں کو دھوکا دے رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے کابل میں تمام بیگمات کو قیدی بنا کر رکھا تھا اور اسے محل میں آرام و آسائش کے ساتھ رکھا تھا۔

اختری نے اس مرحلے پر ان تمام بیگمات کی حمایت میں بہت بڑا اقدام اٹھایا۔ اگلے دس بارہ دنوں میں زچگی ہونے والی تھی۔ اس نے خنجر کی نوک کو اپنے پیٹ پر رکھ کر گل رخ بیگم کو مجبور کیا کہ وہ بیگمات کو رہا کر دے۔ ورنہ وہ اپنے ساتھ بچے کی بھی جان لے لے گی۔

گل رخ بیگم اور کامران مرزا نے یہ سوچ رکھا تھا کہ بادشاہ ہمایوں کو کبھی اقتدار حاصل ہوگا اور وہ اس کے زیر اثر آئیں گے تو اختری سے ہونے والے بیٹے کو بادشاہ ہمایوں کی

فربینا کھائیے جان بنائیے

فربینا جسم کو موٹا اور خوبصورت بنانے والی یونانی دوا ہے جو ایک ماہ کے قلیل عرصے میں قدرتی طور پر بازو، کمر، کولہے، گردن، کندھے اور چہرے کے گالوں پر گوشت میں اضافہ کر کے جسم بھرا بھرا موٹا اور خوبصورت بناتی ہے دبلے پتلے جسم سے نجات اور وزن میں قدرتی اضافہ کیلئے فربینا 15 سال سے پاکستان بھر میں مشہور ہے۔ نئی فربینا ایکسٹرا اسٹرونگ وٹامنز اور ہربلز کا ایسا مرکب ہے جو جسم کو فولاد کی طرح مضبوط اور چہرہ گلاب کی طرح سرخ بناتا ہے مضر اثرات سے قطعی پاک، مستقل اثر و جسم موٹا اور خوبصورت بنانے کیلئے فربینا قیمت/375 روپے۔ خط لکھ کر بذریعہ VP منگوائیں۔

حکیم ارشد لیبارٹریز پوسٹ بکس 2608 اسلام آباد

شاکسٹ کراچی خواجہ اسٹورز ایمپریس مارکیٹ صدر فون 521225 ٹاپ میڈیکل سٹورز الائی بلڈنگ ایمپریس مارکیٹ صدر • محمد علی میڈیکوز آرام باغ روڈ فون 2215828 • حرمی دواخانہ مین روڈ لیاقت آباد • کلاسک ہومیو میڈیک بورڈ آفس ناظم آباد فون 661594 حیدر آباد مصطفیٰ دواخانہ نزد راحت سینما فون 78589 • ماریہ دواخانہ الرحیم شاپنگ سنٹر پولیس لائن۔ لاہور علی ہومیو جان محمد آرکیڈ اچھرہ • بلال ٹریڈرز ہجویری میڈیسن مارکیٹ بیرون لوہاری • مشتاق ہومیو اچھرہ • حنیف اینڈ سنز بوہڑ والا چوک فیصل آباد ذیشان ہومیو/ شاہی طبی دواخانہ چنیوٹ بازار سیالکوٹ گڈ لک ہومیو ریلوے روڈ • علی ہومیو سرکلر روڈ گجرات • جرمن ہومیو اردو بازار گوجرانوالہ • سپر ہومیو بخاری مارکیٹ ملتان • طاہر ہومیو بانو بازار رحیم یار خان • ریحان ہومیو موتی بازار وزیر آباد • قدیمی جینوئن دواخانہ کچہری بازار سرگودھا راولپنڈی مرکز ادویات بوہڑ بازار راولپنڈی • عصمت ہومیو بوہڑ بازار • اللطیف کیمسٹ چاندنی چوک اسلام آباد محمد علی دواخانہ لبرٹی شاپنگ سنٹر آبپارہ • یونیورسل سٹورز کراچی کمپنی • ہاشمی دواخانہ گلہڑہ گلی مری • ملت دواخانہ چوک گھنٹہ گھر پشاور • ڈاکٹر ظہیر ہومیو کلینک • نوارہ چوک اٹک شہر

امانت بنا کر پیش کریں گے۔ انہیں یقین تھا' وہ نرم دل بادشاہ ان کی عداوتوں کو ضرور معاف کردے گا۔

گل رخ بیگم یہ نہیں چاہتی تھی کہ اختری کا بچہ ضائع ہو جائے۔ ایسے وقت ہندال نے بھی ان بیگمات کا مطالبہ کیا تھا اس تحریر کو پڑھنے والے یہ یقین کریں کہ انہوں نے ہندال کے مطالبے سے نہیں بلکہ اختری کے جارحانہ اقدام سے مجبور ہو کر ان بیگمات کو رہا کیا تھا۔ وہ بیگمات اختری سے خواہ کتنی ہی نفرت کریں۔ یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ اس نے ان کی خاطر کتنی بڑی قربانی دی ہے۔

گل رخ بیگم نے بیگمات کو رہا کرنے کے بعد اختری پر بڑے مظالم ڈھائے۔ جب اس کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ گئی کہ نجومی کی پیشگوئی کے مطابق اس کا بیٹا بادشاہ ہمایوں کا ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس نے اپنے مجازی خدا سے جھوٹ کہا ہے۔ اپنی بے آبروئی کی بات چھپائی ہے۔ پھر یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ جب بادشاہ ہمایوں کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے تو خدا جانے آئندہ اس کے بیٹے کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا؟ اسے کس طرح استعمال کیا جائے گا؟

یہی ایک آخری بات سمجھ میں آئی کہ جو غلط ہے' وہ ہر حال میں غلط ہے اور اس غلطی کو مٹا دینا چاہیے۔ لہٰذا اس نے زہریلی گولیاں کھا کر خودکشی کر لی۔ دس بارہ دنوں بعد جو بیٹا پیدا ہونے والا تھا۔ اسے بھی اپنے ساتھ مار ڈالا۔ گل رخ بیگم اور کامران مرزا کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ انہوں نے غصے میں اس کی لاش کو ٹھوکریں ماریں۔ پھر حکم دیا کہ اسے اٹھا کر فصیل کے پچھلے حصے کی بلندی سے گہری کھائی میں پھینک دیا جائے۔

مجھ بدنصیب نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

محترمہ ماہم انگہ...! جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ شہزادہ اکبر کو آپ کے ساتھ کابل کے محل میں لایا گیا ہے اور آپ انہیں دودھ پلاتی ہیں تو میرے دل میں بات آئی کہ اپنا دودھ پلانے والی شہزادے کی اور اس کے خاندان کی وفادار ہو گی۔ مجھے یہ ساری روداد لکھ کر آپ تک پہنچانا چاہیے۔ آپ کو تمام حقائق معلوم ہوں گے اور کبھی بادشاہ ہمایوں سے سامنا ہوگا تو انہیں اختری کے متعلق سچ معلوم ہو جائے گا کہ اس بے چاری نے بیگمات کی خاطر اور بادشاہ ہمایوں کی خاطر کتنی بڑی قربانی دی ہے؟ صرف اپنی ہی نہیں۔ اپنے ہونے والے بیٹے کی بھی جان لی ہے۔

میں ایک درمیان والی ہوں۔ نہ ادھر کی ہوں نہ ادھر کی.... اگر زندہ رہی اور بادشاہ اور بیگمات کے سامنے یہ روداد بیان کی تو یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ اسے سچ تسلیم کریں گے۔ آپ ایک معزز خاتون ہیں آپ کی باتوں میں وزن ہوگا۔ شائد وہ اختری کی قربانیوں کو تسلیم کریں اور اسے خراجِ عقیدت پیش کرنے کی خاطر اس کے لیے دعائے مغفرت کریں۔

آخر میں عرض ہے کہ ان کاغذات کو پڑھنے کے بعد فوراً جلا ڈالیں۔ اگر یہ باقی رہے اور کسی کے ہاتھ لگ گئے تو ظالم مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ لیکن ایک ہی حسرت ہے کہ زندہ رہ کر ظالموں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔

فقط بادشاہ ہمایوں کی وفادار۔ ایک خواجہ سرا عرف ردحی صبا۔

اس نے اختری کی روداد بڑے ہی دردناک انداز میں لکھی تھی۔ ماہم انگہ اسے پڑھ کر بے حد متاثر ہوئی۔ دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر حمام میں آ کر اس پلندے کو آگ لگائی۔ ان کاغذات کو آخر تک جلتے ہوئے دیکھا پھر اس راکھ کو گندے پانی کی موری میں بہا دیا۔

☆☆☆

ہندال شکست کھا کر فرار ہو گیا تھا اور اپنا چھینا ہوا علاقہ واپس حاصل کرنے کے لیے بکھری ہوئی فوجی قوت کو یکجا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اس سے پہلے ہی عسکری مرزا اپنے لشکر کے ساتھ قندھار واپس آ گیا۔ وہ اکبر کو قیدی اور یرغمال بنا کر وہاں سے لے گیا تھا۔ لیکن پھر اسے بڑے بھائی کامران مرزا کے حوالے کرنا پڑا تھا۔ ایسے میں اس نے سوچا کہ وہ جیتا ہوا علاقہ خالی پڑا ہے۔ وہ وہاں جا کر پھر سے قبضہ جما سکتا ہے۔

یہی سوچ کر وہ دوبارہ قندھار آ کر وہاں کا حکمران بن گیا۔ لیکن یہ حکمرانی زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ ہمایوں فوجی قوت حاصل کر کے ایران سے واپس آیا تو اس نے سیدھا قندھار کا رخ کیا۔ مرزا عسکری کو اطلاع ملی کہ برادر ہمایوں نے پھر سے قوت حاصل کر لی ہے۔ اس کے لشکر میں پچیس ہزار سپاہی ہیں۔ اتنی بندوقیں اور توپیں ہیں کہ دیکھتے ہی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔

یہ سنتے ہی عسکری مرزا اپنے لشکر کے ساتھ وہاں سے فرار ہو کر سیدھا کابل آ گیا۔ وہاں کامران مرزا کو بتایا کہ ہمایوں نے توقع کے خلاف بہت بھاری فوجی قوت حاصل کی ہے۔ بعد میں ان کے مخبر بھی آتے رہے اور انہیں بتاتے رہے کہ ہمایوں کے تمام سپاہیوں کے پاس بندوقیں ہیں اور بے

حساب گولا بارود ہے۔

وہ دونوں بھائی خبریں سن رہے تھے اور ان کے ہوش اڑتے جا رہے تھے۔ عسکری نے کہا۔ ''ہم تو ان سے مقابلہ نہیں کریں گا۔ ہمارے لشکر میں صرف دس ہزار سپاہی ہیں۔''

کامران نے ڈانٹ کر کہا۔ ''بزدلی کی باتیں نہ کرو۔ ہمارے لشکر میں بیس ہزار سے زیادہ سپاہی ہیں۔ ہمارے ان سپاہیوں کی مجموعی تعداد برادر بادشاہ کے سپاہیوں سے بہت زیادہ ہے۔''

عسکری نے کہا۔ ''برادر! یہ بھی تو سوچیں۔ ہمارے سپاہیوں کے پاس تیر، تلواریں اور نیزے ہیں۔ بندوقیں بہت کم ہیں۔ قلعے کے دروازے پر صرف دو توپیں نصب کی گئی ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے؟''

کامران مرزا نے کہا۔ ''تم اپنے سسر سے اور ہم اپنے سالوں سے مدد حاصل کریں گے۔ ان سے ہمیں اچھی خاصی تعداد میں بندوقیں مل جائیں گی۔ ہمارے بندوق بردار سپاہی قلعے کے باہر رہ کر ان کا مقابلہ کریں گے اور ہم قلعہ بند ہو کر لڑیں گے۔ یہاں برادر بادشاہ کی سب سے بڑی کمزوری اور ہماری سب سے بڑی قوت شہزادہ اکبر ہے۔ وہ کتنی ہی بندوقوں اور گولا بارود کے سامنے آ جائے۔ ہمارے سامنے ہتھیار ڈالنا ہی پڑیں گے۔''

قلعے کے اندر ماہم انگہ تک یہ خبر پہنچی کہ بادشاہ ہمایوں ایک لشکرِ جرار کے ساتھ قندھار پہنچ گیا ہے تو اس نے فوراً ہی سجدہ شکر ادا کیا۔ چار رکعت نماز نفل ادا کی۔ پھر اکبر کو آغوش میں لے کر خوب چومتے ہوئے کہا۔ ''خدا تمہارا اقبال بلند کرے۔ تمہارے بابا اعلیٰ حضرت کسی بھی دن یہاں پہنچنے والے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ ہمیں یہاں سے رہائی نصیب ہو گی۔''

یہ بات روحی صبا تک پہنچی تو اس نے بھی سجدے میں گر کر کہا۔ ''یا خدا! ہم درمیان والوں کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی جاتی۔ ہم دھتکاری ہوئی مخلوق ہیں۔ پھر بھی میں تیرے حضور سجدہ کرتی ہوں اور نمازیں پڑھتی ہوں۔ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اختری پر ظلم کرنے والوں کا یوم حساب قریب آ رہا ہے۔''

گل رخ بیگم بھی بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ وہ دونوں صاحبزادوں کے ساتھ تیزی سے چلتی ہوئی ماہم انگہ کے دروازے پر آئی تو روحی صبا وہاں سجدہ کرنے کے بعد اٹھ رہا تھا۔

وہ ناگواری سے بولی۔ ''دروازے پر نماز کیوں پڑھ رہی ہے؟ اور یہ نماز کا کونسا وقت ہے؟''

اس نے دست بستہ سر جھکا کر کہا۔ ''معافی چاہتی ہوں۔ قضا پڑھ رہی تھی۔''

کامران مرزا نے کہا۔ ''دروازہ کھول...''

اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر دروازے کو کھول دیا۔ اندر ماہم انگہ مصلّے پر دوزانو بیٹھی اکبر کو آغوش میں لیے چوم رہی تھی۔

گل رخ بیگم نے اسے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا آپ بھی قضا پڑھ رہی ہیں؟''

ماہم انگہ نے کہا۔ ''شہزادے کو بخار تھا۔ اب اتر گیا ہے۔ یہ ہنسنے بولنے لگا ہے۔ اس لیے سجدہ شکر ادا کر رہی تھی۔''

وہ مصلّے کو سامنے سے الٹ کر کھڑی ہو گئی پھر بولی۔ ''آپ سب ہی اچانک آئے ہیں۔ کوئی خاص بات ہے؟''

گل رخ بیگم نے ذرا منہ بنا کر کہا۔ ''اکبر کے لیے اچھی خبر ہے۔ ہمایوں سے ایران سے فوجی امداد حاصل ہو گئی ہے۔ اس نے واپس آتے ہی قندھار پر قبضہ جما لیا ہے۔ ان حالات میں آپ کیا کہنا چاہیں گی؟''

''خدا سے دعا مانگوں گی کہ تمام بھائیوں میں صلح ہو جائے۔ میں اسے دودھ پلا رہی ہوں۔ یہ بادشاہ اور حمیدہ بانو بیگم کی امانت ہے۔ بلکہ عسکری مرزا قندھار سے یہی کہہ کر آئے تھے کہ برادر بادشاہ کا بیٹا ان کے پاس امانت کے طور پر رہے گا۔ میں چاہوں گی، یہ اپنے ہاتھوں سے ان کی امانت واپس کر دیں۔ اس طرح بھائیوں میں محبت بڑھے گی۔''

گل رخ بیگم نے کہا۔ ''بے شک۔ آپ ایک ذہین اور معاملہ فہم خاتون ہیں۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ جنگ و جدل اور خون خرابہ نہ ہو۔ ادھر بھی اور ادھر بھی بھائیوں کو امان ملے۔''

کامران مرزا نے پوچھا۔ ''آئندہ کبھی برادر بادشاہ سے سامنا ہوا تو آپ ہمارے سلسلے میں کیا بیان دیں گی؟''

ماہم انگہ نے پوری طرح کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ گل رخ بیگم نے وضاحت کی۔ ''ہمارا بیٹا یہ کہنا چاہتا کہ عسکری مرزا قندھار سے اکبر کو آپ کے ساتھ یہاں لے آیا۔ اگرچہ جبراً لایا لیکن اس کی نیت یہی تھی کہ بھائی کی امانت کو اپنے پاس رکھے گا۔''

عسکری نے کہا۔ ''اور آپ نے دیکھا ہے کہ ہم نے آپ کو اور شہزادہ اکبر کو قیدی بنا کر نہیں رکھا ہے۔''

ماہم انگہ نے کہا۔ ''بے شک! میں اس حقیقت سے انکار نہیں کروں گی۔ یہاں مجھے عزت مل رہی ہے۔ احترام مل

رہا ہے۔ ہر طرح کا آرام اور آسایش ہے۔ میں بادشاہ سلامت ہمایوں سے یہی کہوں گی اور یہی سچ ہے۔''

کامران مرزا نے کہا۔ ''برادر بادشاہ عنقریب اپنے بیٹے کا مطالبہ کرنے والے ہیں۔ ہم خط کتابت کے ذریعہ ان سے معاملات طے کریں گی۔ آپ سے گزارش ہے' اپنے طور پر برادر بادشاہ کے نام ایک خط لکھیں کہ آپ یہاں شہزادہ اکبر کے ساتھ بڑے آرام سے اور بڑی عزت سے رہتی ہیں اور جو کچھ لکھ رہی ہیں۔ وہ کسی کے زیر اثر آ کر یا کسی کے جبر کرنے سے نہیں لکھ رہی ہیں۔ آپ کو خط کتابت کی پوری آزادی ہے۔''

ان ماں بیٹوں نے ہمایوں سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ لیکن کسی برے وقت کے لیے پہلے سے معافی کا راستہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے سب سے پہلے ماہم انگہ کو اپنے حق میں ہموار کر رہے تھے۔ اس دودھ پلانے والی کے ایک حمایتی بیان سے ان کے سارے گناہ معاف ہو سکتے تھے۔

ادھر ہمایوں ایک فاتح کی شان سے محل میں داخل ہوا تو دلدار بیگم اور گلبدن بیگم نے بڑی محبت سے اس کا استقبال کیا۔ دلدار بیگم نے اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے! ہمیں افسوس ہے' ہم تمہاری امانت کی حفاظت نہ کر سکے۔ عسکری مرزا شہزادہ اکبر کو جبراً ہم سے چھین کر لے گیا ہے۔''

گلبدن بیگم نے کہا۔ ''ہم خدا سے اس کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ بس ایک ذرا اطمینان یہ ہے کہ ماہم انگہ جیسی وفادار دایہ اکبر کے ساتھ ہیں۔ وہ بڑی دانائی اور حکمت عملی سے بچے کی حفاظت کرتی رہیں گی۔''

حمیدہ بانو ان خواتین سے گلے مل کر رونے لگی۔ وہ بڑی محبت سے اور ممتا سے وہاں پہنچی تھی۔ اپنے بچے کو کلیجے سے لگا کر ممتا کو تسکین پہنچانا چاہتی تھی۔ مگر یہ سنتے ہی دل ڈوبنے لگا کہ بیٹا سوتیلوں کی قید میں پہنچا ہوا ہے۔ ہمایوں نے تسلی دی۔ ''صبر کرو۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارا بیٹا محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا۔ ہم ابھی بھائیوں کے پاس قاصد بھیجتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ شہزادے کو فوراً ہمارے حوالے کیا جائے۔''

دلدار بیگم نے کہا۔ ''میرے بیٹے ہندال کے پاس بھی قاصد بھیج دو۔ وہ اپنے لشکر کو از سر نو مستحکم کرنے میں مصروف ہے۔ تمہارے استحکام کی خبر ملے گی تو دوڑا چلا آئے گا۔''

ہمایوں نے دونوں طرف اپنے قاصد بھیج دیے۔ ہندال فوراً ہی واپس آ کر ہمایوں کے گلے لگ گیا۔ اس نے ہندال کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''یہ قندھار تمہارا ہے۔ تم ہی یہاں کے حکمران رہو گے۔ ہمیں کامران اور عسکری سے نمٹنا ہے۔ ہم یہاں رہ کر ان کی فوجی قوت کا اندازہ کریں گے۔''

ہندال نے کہا۔ ''جنگ ہوئی تو ہم آپ کے شانہ بشانہ رہیں گے۔ شہزادہ اکبر ہمارے محل میں آپ کی امانت تھا۔ عسکری اسے جبراً لے گیا ہے۔ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

ہمایوں نے کہا۔ ''ہندال! غصہ تھوک دو۔ فی الحال جنگ و جدل سے پرہیز کرنا ہے۔ وہ اکبر کو یرغمال بنا کر ہمیں کمزور بنانے کی کوشش کرتا رہے گا۔ ہماری حکمت عملی ایسی ہونی چاہیے کہ اکبر کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ وہ صحیح سلامت ہمارے پاس پہنچ جائے۔''

دلدار بیگم نے کہا۔ ''انشاء اللہ۔ ہمارا شہزادہ بخیریت ہماری آغوش میں آئے گا۔''

گلبدن بیگم نے کہا۔ ''کامران مرزا بہت ہی ظالم ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس کی رگوں میں فردوس مکانی کا لہو دوڑ رہا ہے۔ پورے شاہی خاندان میں آپ کی والدہ مرحومہ سب سے معزز اور قابل احترام سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن اس بد بخت نے انہیں بھی ہمارے ساتھ قیدی بنا کر رکھا تھا۔ ہمیں جس چار دیواری میں رکھا گیا تھا۔ اس کے دروازے اور کھڑکیوں کو اینٹوں سے چنوا دیا تھا۔ باہر کا کوئی منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کسی کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اوپر چھت میں ایک سوراخ بنایا گیا تھا۔ وہاں سے کھانے پینے کی چیزیں پہنچائی جاتی تھیں۔''

دلدار بیگم نے ہمایوں سے کہا۔ ''یہی سوچ کر کلیجہ کانپ جاتا ہے' جب اس نے تمہاری والدہ مرحومہ کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے تو نجانے اکبر کے ساتھ کیسا سلوک کر رہا ہو گا؟''

حمیدہ بانو نے روتے ہوئے کہا۔ ''خدارا... کسی بھی شرط پر کسی بھی قیمت پر ہمارے بیٹے کو وہاں سے لے آئیں۔''

ہمایوں نے کہا۔ ''خدا پر بھروسا رکھو۔ ہمارا بیٹا بخیریت یہاں آئے گا۔''

قاصد کابل کے قلعے میں پہنچا تو گل رخ بیگم کامران مرزا اور عسکری مرزا سب ہی دوڑے چلے آئے۔ انہوں نے قاصد سے فرمان لے کر پڑھا۔

ہمایوں نے لکھا تھا۔ ''الحمد اللہ۔ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہے۔ یہاں آ دیا اپنے معتبر امرا کو روانہ کرو۔ تاکہ وہ

اپنی آنکھوں سے ہمارے لشکر کے ایک ایک شعبے کو دیکھیں اور فوجی قوت کا حساب کر کے تمہیں بتائیں کہ تم ہمارے سامنے چیونٹیاں ہو۔ ہم جب چاہیں گے' تمہیں مسل کر رکھ دیں گے۔

اگر جنگ و جدل اور خون خرابہ نہیں چاہتے۔ اپنی سلامتی عزیز ہے تو اس پیغام کے جواب میں ولی عہد جلال الدین اکبر کو مادر ماہم انگہ کے ساتھ یہاں بھیج دو۔ ہمارے حکم کی تعمیل کرو گے تو تمہاری سزا کم سے کم ہوگی۔

بے شک۔ تم جان کی امان چاہو گے۔ لیکن ایک ہی شرط پر امان ملے گی کہ کابل چھوڑ کر کہیں بھی چلے جاؤ۔ ہم تمہارا تعاقب نہیں کریں گے۔

ہمارے حکم کی فوراً تعمیل کی جائے۔ شہزادہ اکبر اور مادر ماہم انگہ کو پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ یہاں روانہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں تاخیر کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔

فقط فرماں روائے۔ قلمرو افغانستان نصیر الدین ہمایوں ولد ظہیر الدین بابر مرحوم....''

وہ تینوں ماں بیٹے ہمایوں کا یہ فرمان پڑھ کر آپس میں مشورے کرنے لگے۔ کامران مرزا نے کہا۔ ''ہم اتنی آسانی سے اکبر کو اس کے حوالے نہیں کریں گے۔ یہ سب سے اہم مہرہ ہے۔ اگر ہاتھ سے نکل گیا تو ہم بالکل خالی' کھوکھلے اور کمزور ہو جائیں گے۔''

عسکری نے کہا۔ ''ہمیں اپنے خاص امراء اور لشکر کے اعلیٰ عہدے داروں کا ایک وفد برادر بادشاہ کے پاس بھیجنا چاہیے۔ یہ لوگ اپنی آنکھوں سے اس کے لشکر کو دیکھیں گے اور وہاں کی ایک ایک خبر ہم تک پہنچائیں گے۔ تب ہمیں صحیح صورت حال معلوم ہوگی۔''

گل رخ بیگم نے کہا۔ ''ہمایوں کے فرمان کا جواب لکھا جائے اور اس کے ساتھ ماہم انگہ کا لکھا ہوا خط بھی بھیجا جائے۔ اس طرح ہمایوں کو ایک ذرا تسلی ہوگی کہ اس کا بیٹا یہاں خیر خیریت سے ہے۔''

کامران مرزا کا وفد اس کا جواب لے کر ہمایوں کے سامنے حاضر ہو گیا۔ اس نے لکھا تھا۔

''برادر بادشاہ کا اقبال بلند ہو۔ ہمیں یقین تھا' آپ خوش بخت ہیں۔ پھر سے فوجی طور پر مستحکم ہو جائیں گے۔ ہمارا ایک وفد پیش خدمت ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ انہیں آزادی سے حالات کا جائزہ لینے دیں۔ چھوٹے بھائیوں کی حیثیت سے ہمارا اور عسکری کا سر آپ کے آگے جھکا ہوا ہے۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہم گھٹنے بھی ٹیک دیں گے۔

آپ کا شہزادہ ولی عہد جلال الدین اکبر اور معزز مادر ماہم انگہ یہاں بخیریت ہیں۔ بہت ہی عیش و آرام سے ہیں۔ ان کا ایک خط روانہ کیا جا رہا ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو اپنے صاحبزادے کی سلامتی کا یقین ہو جائے گا۔

آخر میں ہم عسکری مرزا کی اور اپنی آکم مادر کی جاں بخشی چاہیں گے اور کابل کے تخت سے دستبردار ہونا پسند نہیں کریں گے۔ کیونکہ فردوس مکانی (بابر) نے ہمیں کابل تفویض کیا تھا۔ آپ حضرت بابا مرحوم کے فیصلوں کا احترام کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں کابل چھوڑنے پر مجبور نہیں کریں گے۔

فقط۔ آپ کی فرمانبرداری اور تابعداری کے متمنی۔ کامران مرزا اور عسکری مرزا۔''

ہمایوں نے وہ مراسلہ پڑھ کر حکم دیا کہ پورے وفد کی میزبانی کی جائے اور انہیں لشکر کا معائنہ کرایا جائے۔ پھر اس نے جواباً لکھا۔ ''تم نے ہمارے حکم کی فوراً تعمیل نہیں کی۔ جلال الدین اکبر اور مادر ماہم انگہ کو ہمارے حوالے نہیں کیا۔ اس حکم عدولی نے تمہاری سزا میں اضافہ کیا ہے۔

ہم نے مادر ماہم انگہ کا خط پڑھا ہے۔ انہوں یہ واضح طور پر لکھا ہے کہ تمہارے دباؤ میں آئے بغیر وہ آزادی سے یہ سب کچھ لکھ رہی ہیں۔ ہمیں یقین دلا رہی ہیں کہ وہ ہمارے شہزادے اکبر کے ساتھ صحیح سلامت ہیں اور وہاں نہایت عزت و احترام سے رہتی ہیں۔

افسوس صد افسوس۔ ہم کیسے یقین کر لیں کہ ہمارا بیٹا اور مادر ماہم انگہ عزت و احترام سے وہاں رہتے ہیں؟ جبکہ ماضی میں تم نے انتہائی کمینگی اور کم ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ ہماری مرحوم آکم مادر اور ہمشیرہ گلبدن بیگم کو قیدی بنا کر رکھا تھا۔ ان سے بہت برا سلوک کیا تھا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ مادر ماہم انگہ نے تمہارے دباؤ میں رہ کر ہمیں جھوٹی تسلیاں دینے کے لیے یہ خط لکھا ہے۔

سیدھی سی بات ہے' اگر تم نے واقعی ہمارے بیٹے کو خیر خیریت سے رکھا ہے۔ اس کی بہتری چاہتے ہو تو فوراً اسے ہمارے پاس روانہ کر دو۔ تمہاری سچائی اور اعلیٰ ظرفی اسی طرح ثابت ہوگی۔ اگر اس بار ہمارے حکم کی تعمیل نہ کی گئی تو سمجھ لو کہ تمہارا برا انجام بہت قریب ہے۔''

کامران مرزا کا وفد وہ خط لے کر وہاں پہنچا۔ ان امراء نے اور فوجی عہدیداروں نے بیان دیا۔ ''ہمایوں کے لشکر میں پچیس ہزار سپاہی ہیں۔ ہندال کے مزید چھ ہزار سپاہی ان میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان کے سپاہی آپ دونوں

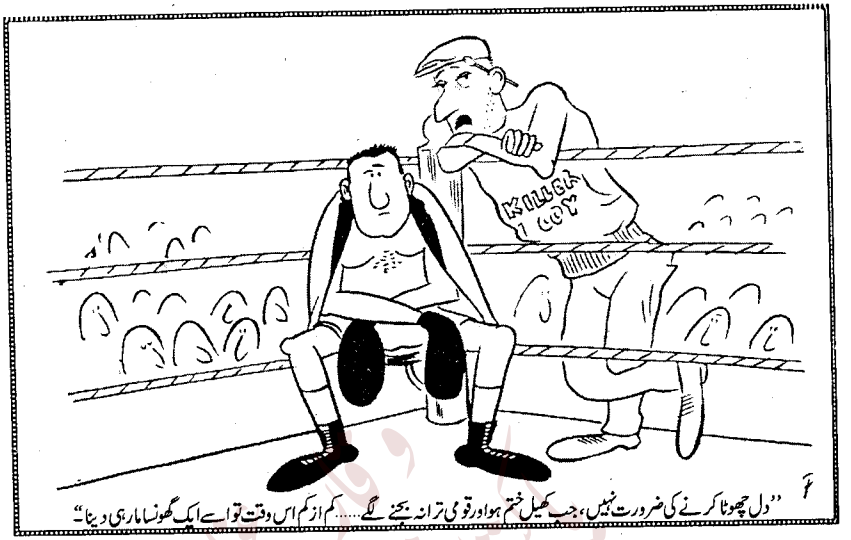

''دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں، جب کھیل ختم ہو اور قومی ترانہ بجنے لگے..... کم از کم اس وقت تو اسے ایک گھونسا مار ہی دینا۔''

بھائیوں کے لشکر کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہیں اور سب ہی بندوقچی ہیں۔

ایک امیر نے کہا۔ ''ہم نے انہیں چاند ماری میں نشانہ بازی کی مشقیں کرتے دیکھا ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ہمایوں کے لشکر میں چھوٹی بڑی بارہ توپیں ہیں۔ پچاس ہزار سے زیادہ بندوقیں ہیں اور گولا بارود کا اتنا بڑا ذخیرہ ہم نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

بڑی تشویشناک اطلاع پہنچائی جا رہی تھی۔ وہ دونوں سوتیلے کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمایوں اتنی بڑی فوجی قوت حاصل کر لے گا پھر اس نے جو حکم نامہ بھیجا تھا' اسے پڑھ کر یقین ہوتا تھا کہ اب وہ پہلے والا نرم دل بادشاہ نہیں رہا ہے۔ گردشِ حالات کی سختیوں نے اس کے تیور بدل دیے ہیں۔

اس نے آگے لکھا تھا۔ ''اعلیٰ حضرت فردوس مکانی نے تمہیں کابُل تفویض کیا تھا اور ہمیں پورا ہندوستان دیا تھا۔ تمہاری عداوتوں اور سازشوں کے باعث ہم ہندوستان ہار گئے۔ تم نے ایسی کمینگی کا مظاہرہ کرتے وقت اعلیٰ حضرت فردوس مکانی کے فیصلے کا احترام نہیں کیا۔ بھائی کو بھائی نہیں سمجھا۔ ایک ہی لہو کو پانی کر دیا تو پھر ہم بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کریں گے۔ کابُل تمہارے پاس نہیں رہے گا۔

اسے ہمارا آخری حکم نامہ سمجھو۔ ہم صرف دو دنوں تک اپنے بیٹے اور مادر ماہم انگہ کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ اگر تم نے انہیں بحفاظت روانہ نہ کیا تو تیسرے دن ہمارا لشکر یہاں سے چل پڑے گا۔''

یہ بہت بڑی دھمکی تھی۔ آخری حکم نامہ تھا۔ حکم کی تعمیل نہ کی جاتی تو تیسرے دن وہاں سے لشکر چل پڑتا اور چوتھے یا پانچویں دن یہاں پہنچ جاتا۔ جنگ لازمی ہو جاتی۔

تمام امراء سے' سپہ سالار سے اور لشکر کے اعلیٰ عہدے داروں سے مشورے ہونے لگے۔ جو عہدیدار اپنی آنکھوں سے ہمایوں کا لشکر دیکھ کر آئے تھے۔ وہ صاف کہہ رہے تھے کہ جنگ نہیں ہونی چاہیے۔

ایک نے کہا۔ ''ان کے پاس بندوقیں بہت زیادہ ہیں۔ ہمارے سپاہیوں کے آگے بڑھتے ہی وہ دور سے انہیں اپنا نشانہ بنائیں گے۔ ہمارا ہر سپاہی تیر اور تلوار چلانے سے پہلے ہی مرتا رہے گا۔''

کامران مرزا نے سپہ سالار کو دیکھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کامران اپنے بھائی ہمایوں کے سامنے جھکنا نہیں چاہتا ہے۔ اس بھاری لشکر والے بادشاہ کو کمزور بنانے کے لیے

اس کے بیٹے کو یرغمال بنایا گیا ہے۔

سپہ سالار نے کہا۔ ''ہم ایسے کمزور بھی نہیں ہیں۔ ہمارے لشکر میں دس ہزار بندوقچی ہیں۔''

کامران مرزا نے کہا۔ ''آج رات تک مزید دس ہزار بندوقیں یہاں پہنچ جائیں گی۔ پہلے تو ہماری کوشش یہی ہوگی کہ جنگ نہ ہو۔ برادر بادشاہ اپنے ولی عہد اکبر کی خاطر ہمارے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔ ہمیں یقین ہے' وہ اپنے بیٹے کی لاش یہاں سے لے جانا نہیں چاہے گا۔''

عسکری نے کہا۔ ''برادر! وہ اختری سے ہونے والا ایک بیٹا ہار چکا ہے۔ دوسرے بیٹے کی بھی پرواہ نہیں کرے گا۔ تب کیا کیا جائے گا؟''

وہ بولا۔ ''تب جنگ ہوگی۔ ہم اس کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکیں گے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں' وہ ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا اور ہم بھی کابل نہیں چھوڑیں گے۔''

امراء نے مخالفت کی۔ انہوں نے کہا۔ ''ہم یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہیں گے۔ اگر آپ جنگ لڑتے ہیں تو ضرور لڑیں۔ ہم اپنے شمالی علاقوں میں جا رہے ہیں۔ جب آپ کو فتح نصیب ہوگی تو خدمت کے لیے حاضر ہو جائیں گے۔''

وہ امراء اجلاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ لشکر کے کتنے ہی عہدے دار جنگ کے خلاف تھے۔ لیکن وہ کامران مرزا اور سپہ سالار کے سامنے کھل کر ان کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ یہی حال عسکری مرزا کا تھا۔ وہ اندر سے سہما ہوا تھا۔ جنگ لڑنے کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن بڑے بھائی کے سامنے مصلحتاً خاموش تھا۔

کامران نے اپنی والدہ گل رخ بیگم اور دوسری بیگمات کو ثمرقند کی طرف روانہ کر دیا۔ گل رخ بیگم بیٹوں کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔

کامران مرزا نے کہا۔ ''آپ ہماری فکر نہ کریں۔ ہم جلد ہی آپ کو فتح مند ہونے کی خوشخبری سنائیں گے۔ برادر بادشاہ جنگ چھیڑنے کے بعد پچھتائے گا۔ کیونکہ بیٹا یہاں قلعے کے اندر ہے۔ وہ ہم پر شدت سے جوابی حملے نہیں کر سکے گا۔''

دوسری طرف حمیدہ بانو' دلدار بیگم اور گلبدن بیگم جنگ کے خلاف تھیں۔ ہمایوں کو منع کر رہی تھیں کہ لشکر کشی نہ کی جائے۔ شہزادہ اکبر قلعے میں ہے۔ اسے نقصان پہنچے گا۔

ہمایوں نے کہا۔ ''وہ بدبخت ظالم اور درندہ ہے۔ خون کے رشتوں کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ اس نے ہماری آکم مادر اور ہمشیرہ گلبدن بیگم کو قیدی بنا کر رکھا۔ آکم مادر اس کی قید میں بیمار پڑ گئیں۔ پھر صحت یاب نہ ہو سکیں۔ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ کیا یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ اس بدبخت نے ہمارے بیٹے اکبر کو زندہ چھوڑا ہوگا؟ مادر ماہم انگہ بھی وہاں زندہ ہیں یا نہیں یہ کون جانتا ہے؟''

حمیدہ بانو نے کہا۔ ''وہ زندہ ہیں۔ تب ہی تو انہوں نے آپ کے نام خط لکھا ہے۔ یہ یقین دلایا ہے کہ ہمارا بیٹا خیریت سے ہے۔''

''تم کامران مرزا کی چال بازیوں کو نہیں سمجھتی ہو۔ اس نے جبراً مادر ماہم انگہ سے یہ خط لکھوایا ہے اور پتا نہیں کتنے عرصے پہلے لکھوایا ہوگا؟ اس کے بعد انہیں زندہ بھی چھوڑا ہے یا نہیں..... ہم کیسے یقین کریں؟''

حمیدہ بانو نے کہا۔ ''کامران مرزا سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ اکبر اور مادر ماہم انگہ کو دور ہی سے پیش کرے۔ تب آپ انہیں دیکھ لیں گے۔ اطمینان ہو جائے گا تو پھر جنگ نہیں کریں گے۔ اپنے لخت جگر کو ہر قیمت پر اور ہر شرط پر واپس لائیں گے۔''

''ہم وعدہ کرتے ہیں' اس کی جو بھی قابلِ قبول شرائط ہوں گی۔ انہیں تسلیم کیا جائے گا۔''

''ہم کچھ نہیں جانتے۔ شرائط قابلِ قبول نہ ہوں' تب بھی آپ تسلیم کریں اور ہمارے بیٹے کو لائیں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اگر وہ ہماری یا تمہاری جان مانگے گا تو کیا ہم اس کی ایسی شرط مان جائیں گے؟''

''خدا نہ کرے' آپ کو جان دینی پڑے۔ وہ ہماری جان مانگے تو بے شک ہمیں پیش کر دیں۔ لیکن ہمارے بیٹے کو واپس لے آئیں۔''

''ایک بچے کی جان بچانے کے لیے صدقہ دے سکتے ہیں۔ جانوروں کی قربانیاں کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی انسان کو قربان نہیں کریں گے۔ خاطر جمع رکھو اور دعا کرو کہ بیٹا زندہ سلامت ملے۔ ہم کسی نہ کسی طرح اسے واپس ضرور لائیں گے۔''

دو دن گزر گئے۔ کامران نے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ شہزادہ اکبر کو واپس نہیں کیا۔ پانچویں روز ہمایوں کا لشکر کابل کے قلعے کے سامنے ایک کوس کے فاصلے پر آ کر ٹھہر گیا۔ تمام توپوں کا رخ قلعے کے مختلف حصوں کی طرف کر دیا گیا۔ کامران کی فوج کا ایک بڑا حصہ قلعے کے باہر تھا۔ باقی سپاہی اندر تھے۔

کامران نے عسکری سے کہا۔ ''ہم قلعے میں رہ کر اکبر کو فصیل پر بٹھائیں گے۔ تاکہ وہ توپوں سے گولا باری نہ کر سکے۔''

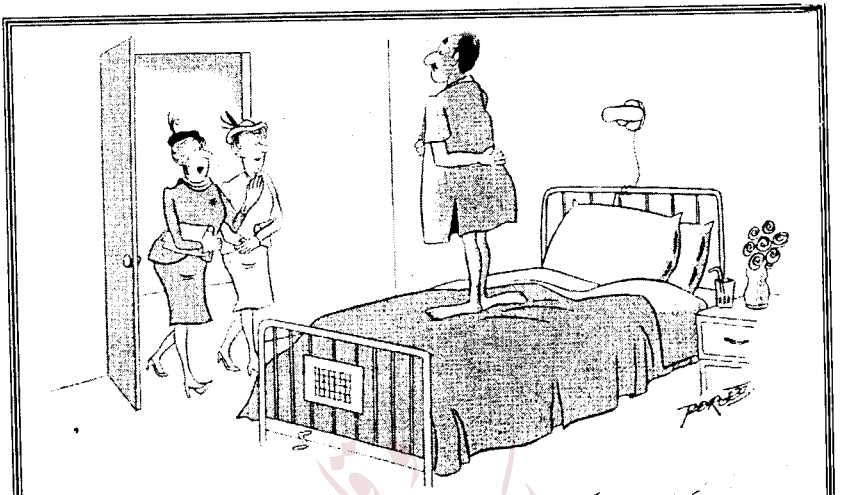

''دیکھیے..... میں نے کتنی مرتبہ آپ سے کہا ہے کہ آپ کو کھڑے ہو کر ہمیں تعظیم دینے کی ضرورت نہیں۔''

عسکری مرزا بڑے بھائی کے حکم سے مجبور ہو کر قلعے سے باہر اپنے لشکر کے ساتھ تھا۔ یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ بڑا بھائی خودغرض اور مکار ہے۔ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے قلعے کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔ اور ان سب کو باہر بھیج کر قربانی کے بکرے بنا رہا ہے۔

ہمایوں نے اپنے قاصد کے ذریعے پیغام بھیجا۔ ''شہزادہ اکبر اور مادر ماہم انگہ کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ تاکہ ہمیں ان کی سلامتی کا یقین ہو۔ اگر تمہارے پاس ارا سی بھی عقل ہے تو ہماری بات مان لو اور انہیں ہمارے پاس بھیج دو۔ ہم اپنا فیصلہ بدل رہے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں' کابل تمہارے لیے چھوڑ دیں گے۔ بیٹے کو لے کر یہاں سے چلے جائیں گے۔''

کامران مرزا نے جواباً شہزادہ اکبر اور ماہم انگہ کو فصیل پر لا کر کھڑا کر دیا۔ ہمایوں نے شمس الدین خان سے کہا۔ ''تم گھوڑا دوڑاتے ہوئے جاؤ اور دیکھو... کیا تمہاری زوجہ ہمارے بیٹے کے ساتھ ہے یا وہ کوئی فریب دے رہا ہے؟''

شمس الدین خان گھوڑا دوڑاتا ہوا قلعے کے سامنے کھڑے ہوئے لشکر کے پاس آیا۔ پھر سر اٹھا کر فصیل کی طرف دیکھنے لگا۔ ان کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی زوجہ کو پہچان لیا۔ وہاں سے چیختے ہوئے کہا۔ ''ماہم بیگم! تم پر خدا کی سلامتی ہو۔ تمہارے ساتھ جو بچہ ہے' وہ اس عرصے میں تین برس کا ہو چکا ہے۔ ہم اسے پہچاننے سے قاصر ہیں۔ تصدیق کرو کہ وہ شہزادہ اکبر ہے۔''

ماہم انگہ نے چیختے ہوئے کہا۔ ''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں' اس وقت میرے سائے میں شہزادہ اکبر ہے۔ یہاں سے کوئی فریب نہیں دیا جا رہا ہے۔''

شمس الدین نے واپس آ کر ہمایوں سے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے' شہزادہ اکبر اور ہماری زوجہ زندہ سلامت ہیں۔''

ایسے وقت کامران کے قاصد نے ایک خط لا کر پیش کیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''برادر بادشاہ کا اقبال بلند ہو۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہے۔ کابل ہمارے لیے چھوڑ رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو اب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ ہماری عداوتیں ختم ہو جائیں گی۔ لیکن بیٹے کو یہاں سے لے جانے کے بعد آپ زبان سے پھر سکتے ہیں۔ ہوسِ حکمرانی سے مجبور ہو کر ہم پر لشکر کشی کر سکتے ہیں۔

لہٰذا اس بات کی ضمانت ہونی چاہیے کہ آئندہ آپ ہمارے خلاف کبھی جنگ نہیں لڑیں گے اور بھول کر بھی کابل کا رخ نہیں کریں گے۔ ہماری یہ بہت آسان سی شرط

ہے۔آپ ہندال کو اپنا حقیقی بھائی اور اس کی والدہ محترمہ کو اپنی حقیقی والدہ تسلیم کرتے ہیں۔اگر بیٹا عزیز ہے تو آپ ہندال اور اس کی والدہ کو ضمانت کے طور پر یہاں بھیج دیں۔ہم انہیں عزت و احترام سے رکھیں گے اور شہزادہ اکبر کو آپ کے حوالے کردیں گے۔''

ہمایوں نے غصے سے لکھا۔''تم بہت ہی کم ظرف ہو۔ایک بیٹا دے کر ہماری ماں اور بھائی کو یرغمال بنانا چاہتے ہو۔ہم آخری بار سمجھاتے ہیں' اگر مسلمان ہو تو ایک خدا اور آخری رسول کو مانتے ہوئے ہماری قسموں کا اعتبار کرو۔ہم کلام پاک ہاتھوں پر رکھ کر قسم کھائیں گے کہ کبھی کابل کا رخ نہیں کریں گے۔کبھی پلٹ کر حملہ نہیں کریں گے۔''

قاصد وہ خط لے کر گیا۔پھر اس کا جواب نہیں آیا۔کامران مرزا اپنے ہاتھوں میں ہمایوں کی کوئی نہ کوئی کمزوری رکھنا چاہتا تھا۔آخر جنگ شروع ہوگئی۔ہمایوں نے حکم دیا۔''جہاں مادر ماہم انگہ ہمارے بیٹے کے ساتھ ہیں۔ادھر گولے نہ داغے جائیں۔دوسری طرف توپوں کا منہ کھول دیا جائے۔''

توپوں نے گولا باری شروع کی تو باہر کھڑی ہوئی فوج تتر بتر ہونے لگی۔عسکری مرزا پہلے ہی بڑے بھائی سے بددل تھا اور ہمایوں سے خوفزدہ ....وہ اپنا لشکر لے کر گھوڑے دوڑاتا ہوا دوسری طرف فرار ہوگیا۔ان حالات میں کامران کا لشکر وہاں کب ٹھہرنے والا تھا۔اس کے سپاہی بھی راہ فرار اختیار کرنے لگے۔

کامران کو اطلاع ملی کہ باہر لشکر منتشر ہو چکا ہے۔سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔عسکری مرزا بھی وہاں سے فرار ہوگیا ہے۔اس نے ماہم انگہ سے کہا۔''اکبر کو گود میں لے کر جہاں کہا جائے' وہاں جاؤ۔فصیل کے جس حصے میں پہنچنے کا حکم دیا جائے' وہاں پہنچتی رہو۔''

اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اکبر کو اور ماہم انگہ کو نشانے پر رکھا جائے۔یہ حکم کی تعمیل نہ کرے تو اکبر کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

پھر اس نے ہمایوں کے نام پیغام بھیجا۔''آپ جدھر گولا باری کریں گے' ماہم انگہ اور اکبر اسی رخ پر موجود رہیں گے۔آئندہ گولا باری کرنے سے پہلے قلعے کی فصیل کو دیکھیں اور اندازہ کریں کہ آپ کا لخت جگر اس دودھ پلانے والی کے ساتھ کہاں ہوسکتا ہے؟ بیٹے کی جان کو داؤ پر لگا کر یہ آنکھ مچولی کھیل سکتے ہیں تو شروع ہوجائیں۔''

ماہم انگہ بے حد پریشان تھی۔سوچ رہی تھی کہ اس ظالم سے کس طرح نجات حاصل کرے؟ جب بھی گولا باری ہوتی تھی تو وہ اکبر کو بازوؤں میں دبوچ کر اپنی پشت ادھر کرلیتی تھی جدھر سے توپیں دندناتی رہتی تھیں۔اکبر کے لیے اس کی ممتا' اس کا جذبہ یہ تھا کہ پہلے وہ نشانے پر آئے اس کے بعد خدانہ کرے شہزادے کو جانی نقصان پہنچے۔

روحی صبا اسی فصیل پر دور کھڑا بڑی بے بسی سے ماہم انگہ اور شہزادے کو دیکھ رہا تھا۔دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔

باہر توپیں خاموش ہوگئی تھیں۔ہمایوں کے توپچی یہ اندازہ نہیں کرسکتے تھے کہ شہزادے کو اور ماہم انگہ کو فصیل کے کس حصے میں نشانے پر رکھا گیا ہے؟ وہ لشکر بندوقوں سے بارود کا دھواں اڑاتا ہوا قلعے کے بالکل قریب آگیا تھا۔ان کے سپاہی اس کے مضبوط دروازے کو توڑنے کی کوششیں کر رہے تھے۔

کامران نے بندوق بردار سپاہیوں سے کہا۔''ہمیں یہاں سے فرار ہونا پڑے گا۔اس سے پہلے اکبر اور اس کی دایہ کو ہمارے سامنے موت کے گھاٹ اتار دو۔''

روحی صبا ہائے ہائے کرتا ہوا۔سینہ پیٹتا ہوا اکبر اور ماہم انگہ کے پاس آیا۔پھر اکبر سے لپٹ کر بولا۔''پہلے مجھے مار ڈالو۔میں مر جاؤں گی مگر شہزادے کی موت نہیں دیکھوں گی۔''

اکبر کو ایک طرف سے روحی صبا نے اور دوسری طرف سے ماہم انگہ نے اپنے اپنے وجود سے چپٹا لیا تھا۔ماہم انگہ ایک ظالم سے رحم کی بھیک نہیں مانگ رہی تھی۔کلام پاک کی آیتیں پڑھ رہی تھی۔صرف اپنے رب کو یاد کر رہی تھی۔اس سے کرم کی بھیک مانگ رہی تھی۔

کامران مرزا نے گرجتے ہوئے سپاہیوں سے پوچھا۔''کیا تم لوگوں نے ہمارا حکم نہیں سنا؟ ان تینوں کو موت کے گھاٹ اتار دو۔''

تمام سپاہیوں نے بڑی خاموشی سے کامران مرزا کو دیکھا۔پھر ان کی گردنیں جھک گئیں۔اس کے بعد ان کی بندوقیں بھی نیچی ہوگئیں۔سپاہیوں کے داروغہ نے کہا۔''ہم معافی کے خواستگار ہیں۔آپ کے بعد یہاں ہمایوں بادشاہ کے رحم و کرم پر رہیں گے۔ابھی شہزادے کو سلامتی دیں گے تو ہمیں بھی سلامتی ملے گی۔اگر انہیں ذرا سا بھی نقصان پہنچا تو ہم سب حرام کی موت مارے جائیں گے۔''

کامران مرزا نے بڑی حیرانی سے پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے سپاہیوں کو دیکھا۔داروغہ نے کہا۔''آپ ہمارے

درمیان رہیں اور وعدہ کریں' یہاں سے فرار نہیں ہوں گے تو ہم آپ کے ساتھ جینے مرنے کو تیار ہیں۔''

کامران مراز وہاں سے پلٹ کر بھاگتا ہوا۔ قلعے کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا ایک چور دروازے کے پاس آیا پھر اسے کھول کر سیڑھیوں سے اترتا ہوا ایک سرنگ کے راستے فرار ہونے لگا۔ اسے اپنی موت نظر آرہی تھی۔ فرار کا یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔

نیچے قلعے کے اندر سپاہیوں نے جان کی امان چاہی اور وہاں کے مضبوط دروازے کو اندر سے کھول دیا۔ اپنے اپنے ہتھیار پھینک کر گھٹنے ٹیک دیے۔ سپہ سالار نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہتھیار ڈالنے والوں کی جانیں نہ لی جائیں۔ فی الحال انہیں قیدی بنا کر رکھا جائے۔ ماہم انگہ اور روحی صبا شہزادہ اکبر کو لے کر سیڑھیاں اترتے ہوئے نچلے حصے میں آگئے۔ ہمایوں تقریباً تین برس بعد اپنے بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ اسے سینے سے بھینچ کر پیار کرتے ہوئے ماہم انگہ سے بولا۔ ''آپ عمر کے لحاظ سے ہماری ہمشیرہ ہیں۔ لیکن ہم آپ کو مادر کہتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے' آپ نے توپوں کے رخ پر ہمارے بیٹے کو تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ ہم آپ کی محبت کو' ممتا کو اور عظمت کو سلام کرتے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''جہاں پناہ! شرمندہ نہ کریں۔ بندی نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ آئندہ بھی فرائض میں کبھی کوئی کوتاہی نہ کروں۔ آپ سب سے پہلے اس ظالم کامران مرزا کے پیچھے سپاہی دوڑائیں۔ وہ یقیناً قلعے کے چور دروازے سے فرار ہوا ہوگا۔''

شمس الدین خان نے کہا۔ ''ہمارے کئی سپاہی اس چور دروازے سے سرنگ کی طرف گئے ہیں۔ امید ہے' وہ فرار ہونے والا گرفتار ہو جائے گا۔''

ہمایوں نے ماہم انگہ اور شمس الدین خان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ دونوں میاں بیوی نے ہمارے شہزادے کی خاطر ایک طویل عرصے تک جدائی برداشت کی ہے۔ آپ یہاں محل میں آرام سے وقت گزاریں۔ اکبر کچھ وقت ہمارے پاس رہے گا۔ ہمارے لختِ جگر کو دودھ پلانے کی خاطر آپ نے اپنے بیٹے ادہم خان کو دوسری دایہ کے حوالے کر دیا تھا۔ اب اسے بھی یہاں بلائیں۔''

پھر اس نے قاصد کے ذریعہ حمیدہ بانو اور دلدار بیگم کو یہ اطلاع بھی سنائی کہ کابل کا قلعہ فتح ہو گیا ہے۔ شہزادہ اکبر اور ماہم انگہ بخیریت ہیں۔ وہ سب یہاں چلے آئیں۔

ماہم انگہ نے کہا۔ ''میں نے وہ خط کامران مرزا کے دباؤ میں آکر نہیں لکھا تھا۔ یہ درست ہے' اس نے مجھے اور شہزادہ اکبر کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے شہزادے سے محبت تھی۔ دراصل وہ آپ سے بہت زیادہ خوفزدہ تھا۔ وہ' اس کی والدہ اور اس کا بھائی عسکری سب ہی چاہتے تھے کہ اکبر کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچایا جائے اور سہولتیں دی جائیں تاکہ ان سب کے لیے معافی کا دروازہ کھلا رہے۔''

ہمایوں نے کہا۔ ''کامران بہت ہی بدبخت ہے۔ اسے معافی مل سکتی تھی۔ لیکن اس کی عاقبت نا اندیشی اسے سزا کا مستحق بنا چکی ہے۔''

روحی صبا کو یہ سن کر دکھ ہوا کہ بادشاہ ہمایوں کے دل میں اب بھی کامران مرزا کے لیے نرم گوشہ ہے۔ اگر وہ ہتھیار ڈال دیتا تو شائد اسے معافی مل جاتی۔ جبکہ اس کا جرم ناقابلِ معافی تھا۔

اس نے ماہم انگہ کو ایک فریادی کی طرح دیکھا۔ وہ اختری کے معاملے میں روحی صبا کے جذبات کو خوب سمجھتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''کامران مرزا کے جرائم اس قدر ہیں کہ وہ ہمارے شہزادے کو واپس کر دیتا اور ہتھیار ڈال دیتا۔ تب بھی اسے معاف کرنا .... گویا شیطان کو زندہ رکھنے کے مترادف ہوتا۔''

اس نے کہا۔ ''ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے کیسے کیسے جرم کیے ہیں اور کن لوگوں پر مظالم ڈھائے ہیں؟''

ماہم انگہ نے کہا۔ ''سب سے زیادہ مظلوم آپ کی منکوحہ اختری تھی۔''

ہمایوں اختری کا نام سن کر چونک گیا۔ پھر بولا۔ ''وہ مظلوم کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ تو کامران مرزا کی مہمانِ خاص بنی ہوئی تھی؟''

وہ بولی۔ ''جہاں پناہ! اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ گلبدن بیگم نے بتایا ہے۔ آپ غور فرمائیں' گلبدن بیگم آپ کی مرحومہ آکم مادر کے ساتھ ایک چار دیواری میں قید تھیں۔ باہر کے حالات نہیں جانتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اختری کامران مرزا اور ان کی والدہ گل رخ بیگم کے زیرِ اثر آگئی تھی۔ آپ کو یہ سن کر صدمہ ہوگا کہ کامران مرزا نے بہت ہی کمینگی اور کم ظرفی کا ثبوت دیا تھا اور اس بے چاری کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔''

یہ سن کر ہمایوں کے ذہن کو ایک جھٹکا سا پہنچا۔ وہ حیرانی سے ماہم انگہ کی باتیں سننے لگا۔ وہ بول رہی تھی' یہ سن رہا تھا اور چشمِ تصور سے اختری کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے

اختری کشش میں مبتلا تھی۔ اپنی بے آبروئی کو مشتہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے بادشاہ ہمایوں سے جھوٹ کہا تھا اور اپنی پارسائی کا ڈھونگ رچایا تھا۔

ماہم انگہ بول رہی تھی اور وہ دیکھ رہا تھا۔ اختری کا ضمیر ملامت کر رہا تھا۔ وہ اپنے ہمایوں کو دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی۔ بیگمات کو قیدی کی حالت میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ وہ لوگ اس کے ہونے بیٹے کو خالص ہمایوں کا بیٹا بنا کر ایک پریشان حال بادشاہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔

ہمایوں چشم تصور سے اختری کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر خنجر کی نوک رکھ لی تھی اور بیگمات کی رہائی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ وہ ہونے والا بچہ گل رخ بیگم اور کامران کے لیے بہت اہم تھا۔ مگر وہ اسے ضائع کر دینا چاہتی تھی۔

ان ظالموں نے مجبور ہو کر اس کا مطالبہ مان لیا اور بیگمات کو وہاں سے رہا کر دیا۔ ان کی رہائی کے بعد اختری سے خنجر چھین لیا گیا اور اس پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ بچے کو زندہ نہیں رکھے گی۔ آئندہ ہمایوں کو کوئی دھوکا نہیں کھانے دے گی۔ یہ فیصلہ کر کے اس نے زہر کی گولیاں نگل لیں اور اپنے ساتھ پیدا ہونے والے بچے کو بھی مار ڈالا۔

ماہم انگہ پوری تفصیل سے اس کی پوری روداد سنا رہی تھی اور ہمایوں جیسے آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ ''بے شک۔ وہ بدبخت قابل معافی نہیں ہے۔ ہم اسے ایسی عبرتناک سزا دیں گے کہ دنیا دیکھے گی۔ ہمیں اختری کے لیے افسوس ہے۔ اگرچہ اس نے ہم سے جھوٹ کہا۔ دھوکا دیا۔ لیکن پھر اس جھوٹ اور فریب کی تلافی بھی کی۔ ہمیں سوتیلے بھائیوں کی مکاریوں سے بچانے کے لیے اپنی اور اپنے بیٹے کی قربانی دی۔ ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں۔ اس کی قربانی کو رائیگاں نہیں جانے دیں گے۔ وہ آبرو کا لفیر اور بدکار ضرور کیفر کردار کو پہنچے گا۔''

کامران مرزا کے تعاقب میں جانے والے سپاہی شام کو واپس آئے۔ انہوں نے بیان دیا کہ سرنگ کے اس پار ایک اصطبل بنا ہوا ہے۔ لیکن کامران مرزا نے وہاں کے تمام گھوڑوں کو بھگا دیا تھا۔ تاکہ ہم اس کا تعاقب نہ کر سکیں۔ ہمیں افسوس ہے وہ ہمارے ہاتھ نہ آ سکا۔

ہمایوں نے کہا۔ ''خدا نے چاہا تو وہ ہمیشہ ذلت کی زندگی گزارے گا۔ آخر ہم سے کب تک چھپتا اور بھاگتا پھرے گا؟ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں ہماری گرفت میں ضرور آئے گا۔''

روحی صبا نے دل ہی دل میں کہا۔ ''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ جب تک وہ گرفت میں نہ آئے' جب تک اسے سزا نہ ملے۔ اسے موت نہ آئے۔ بس میری یہی ایک آخری خواہش ہے۔''

حمیدہ بانو' دلدار بیگم اور گلبدن بیگم دوسرے ہی دن کابل پہنچ گئیں۔ انہوں نے شہزادہ اکبر کو باری باری سینے سے لگایا۔ خوب پیار کیا۔ دلدار بیگم نے کہا۔ ''ہم اپنے پوتے کی سلامتی اور واپسی کی خوشی میں خوب جشن منائیں گے۔''

گلبدن بیگم نے کہا۔ ''اور ایک دن نہیں۔ کئی دنوں تک جشن منایا جائے گا۔''

ہمایوں نے حکم دیا۔ ''ہمارے شہزادے کے لیے ایک سونے کا چھوٹا سا شاہی تخت بنایا جائے۔ اس میں ہیرے جواہرات جڑے جائیں اور ہیرے جواہرات سے مرصع ایک چھوٹا سا تاج بھی تیار کیا جائے۔ کل ہمارے ننھے ولی عہد کو تخت پر بٹھایا جائے گا اور اس کی تاج پوشی ہو گی۔''

تمام بیگمات خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ حمیدہ بانو بار بار اپنے بیٹے کو اٹھا کر سینے سے لگا کر چومتی تھی۔ خوشی کے مارے رونے لگتی تھی۔

ہمایوں نے خزانے کا منہ کھول دیا۔ غریبوں اور محتاجوں میں اشرفیاں لٹاتا رہا۔ جگہ جگہ ناچ گانے اور کھیل تماشے ہوتے رہے۔ ہمایوں کو گردش حالات سے نکلنے کے بعد پہلی بار اتنی بڑی خوشی نصیب ہو رہی تھی۔ وہ خوشیاں بھی منا رہا تھا اور برسوں کی تھکن بھی اتار رہا تھا۔

شاہی دربار میں تین برس کے اکبر کو لایا گیا۔ ہمایوں نے امراء اور ارکین دربار سے کہا۔ ''ہمارا شہزادہ جلال الدین اکبر ابھی بادشاہت کے لائق نہیں ہے۔ لیکن یہ خیال دل میں آیا کہ اس کی جوانی اور تخت نشینی تک خدا جانے ہم اس دنیا میں رہیں یا نہ رہیں۔ تو پھر کیوں نہ آج ہی اپنی آنکھوں سے اسے تخت نشین ہوتے اور تاج پہنتے دیکھ لیں۔''

ایک امیر نے کہا۔ ''خدا آپ کو طویل عمر دے۔ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رہے۔ ایک ننھے ولی عہد کی تخت نشینی اور تاج پوشی بالکل نئی اور انوکھی بات ہے۔ ہم سب پورے جوش و خروش سے جہاں پناہ کی مسرتوں میں شریک ہونے آئے ہیں۔''

دربار کے ایک طرف باریک پردے کے پیچھے بیگمات

ہوئی تھیں۔ ننھے جلال الدین اکبر کو ننھے سے شاہی تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کے سر پر ایک ننھا سا جگمگاتا ہوا تاج رکھا گیا۔ سب ہی مبارک سلامت کہنے لگے۔ پھر سب نے جلال الدین اکبر کی طویل عمر کے لیے دعائیں مانگیں۔ تخت نشینی اور تاج پوشی کے سلسلے میں خوب دل کھول کر جشن منایا گیا۔ پھر کئی دنوں یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس کی اگلی منزل ہندوستان تھی۔ وہ فردوس مکانی (بابر) کی قائم کردہ سلطنت کو کھو دینے کے بعد بے چین رہتا تھا۔ پھر وہاں اپنے باپ کی بخشی ہوئی سلطنت کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے لشکر کے ایرانی سپاہیوں کو نئے سرے سے تربیت دے رہا تھا۔ انہیں ہندوستان کی آب و ہوا اور وہاں کے لوگوں کے مزاج کے متعلق تفصیل سے بتایا جا رہا تھا اور انہیں ہندوستان کی زمین پر لڑنے کی تربیت بھی دی جا رہی تھی۔ چھ ماہ بعد ۱۵۵۰ عیسوی میں اس نے ایک مکمل اور منظم لشکر کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کیا پھر ایک کے بعد ایک فتوحات حاصل کرتا چلا گیا۔

شاہی نجومیوں نے پیشگوئی کی تھی کہ اس سال وہ گردش سے نکل آئے گا۔ پھر کامیابی اور کامرانی اس کا مقدر بنتی چلی جائے گی اور یہی ہو رہا تھا۔ وہ پشاور، جہلم، لاہور سے آگے بڑھتا ہوا آگرہ اور دہلی تک پہنچ گیا۔ وہاں اپنے قدم جماتے ہی اور اپنی حکومت قائم کرتے ہی اس نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ بہت بڑی بازی ہارنے کے بعد بڑی صعوبتیں اٹھانے کے بعد یہ کامیابی نصیب ہوئی تھی۔

اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ کمزور اور نا اہل حکمران نہیں ہے۔ اس کے باپ نے ہندوستان میں مغل سلطنت کی جو بنیاد ڈالی تھی۔ اب وہ اس بنیاد کو مضبوط کرنے والا تھا۔

انہی دنوں کامران مرزا دریائے سندھ پار کر کے وہاں کے ایک سلطان آدم کھکھر کے پاس آیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ امایوں کی طرح صحرا صحرا بھٹکتا رہے گا اور فوجی قوت حاصل کرتا رہے گا تو اسے بھی کھویا ہوا وقار حاصل ہو سکے گا۔

تقدیر اس کی بدلتی ہے جس کی نیت اچھی ہوتی ہے۔ اس کی نیت میں فتور تھا۔ آدم کھکھر نے اسے پکڑ کر اپنی ملاخوں کے پیچھے ڈال دیا۔ پھر ہمایوں کو اطلاع دی۔ ''آپ کا دیرینہ دشمن، وہ سوتیلا بھائی ہماری قید میں ہے۔ آپ ہمارے شہنشاہ ہیں۔ ہم آپ کے غلام۔ فیصلہ کریں، اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''

یہ اطلاع ملتے ہی ہمایوں وہاں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ماہم انگہ نے دست بستہ عرض کیا۔ ''آپ سے ایک گذارش ہے۔''

''آپ ہماری مادر ہیں۔ ہمشیرہ ہیں۔ گذارش نہ کریں۔ اپنی خواہش، اپنی ضرورت بیان کریں۔''

اس نے کہا۔ ''روحی صبا نے اختری کی دن رات خدمت کی ہے۔ اس کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ آج بھی اس کے لیے روتی رہتی ہے۔ اس کی آخری خواہش ہے کہ کامران مرزا کو جو سزا دی جائے، وہ اسے آنکھوں سے دیکھے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنے لشکر کے ساتھ روحی صبا کو بھی لے جائیں۔''

وہ ماہم انگہ کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔ روحی صبا کو ساتھ لے گیا۔ جب وہاں پہنچا تو آدم کھکھر نے اپنے لشکر کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اس کے لیے... پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ جب دسترخوان پر انواع

موٹاپے سے نجات
صحت مند اور اسمارٹ

یاد رکھیے۔! آپ مرد ہوں یا عورت موٹاپا وجہ ہے بے شمار بیماریوں، چھوٹی زندگی اور ناپسندیدہ شخصیت کی۔ صرف اسمارٹ اور مناسب جسم کے افراد رہتے ہیں ہمیشہ صحت مند، چاق و چوبند، پاتے ہیں لمبی عمر اور دلکش و پُروقار شخصیت۔

اپنی شخصیت میں حیرت انگیز تبدیلی لانے کیلئے اپنی عمر اور کیفیت ہمراہ جوابی لفافے کے لکھیں اور حاصل کریں مفید معلومات ہمیشہ اسمارٹ اور فٹ رہنے کیلئے۔

ایم ایم اینڈ سنز پوسٹ بکس 2188 کراچی 74600

واقسام کے کھانے چنے گئے تو کامران مرزا کو زنجیروں سے باندھ کر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ گھٹنے ٹیک کر ہاتھ جوڑ کر رحم کی بھیک مانگنے لگا۔

ہمایوں نے کہا۔ ''تمہارے جرائم اور گناہوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ شائد خدا معاف کردے۔ لیکن بندہ معاف نہیں کرے گا۔''

وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بابا حضور فردوس مکانی (بابر) کی نصیحتوں پر عمل کرتے ہیں۔ انہوں نے خاص طور پر کہا تھا کہ اپنے بھائیوں کا خون کبھی نہ بہانا۔ ہم ان کی نصیحتیں یاد دلا کر جان کی امان چاہتے ہیں۔''

ہمایوں اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ روحی صبا ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑا تھا۔ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ''یا خدا!! اسے جان کی امان نہ ملے۔''

ہمایوں نے کامران مرزا کو شدید نفرت سے دیکھا۔ پھر کہا۔ ''بے شک۔ ہم بابا فردوس مکانی کی نصیحت پر عمل کریں گے۔ تمہیں سزائے موت نہیں دیں گے۔''

پھر اس نے داروغہ کو حکم دیا۔ ''اسے لے جاؤ اور اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالو۔''

روحی صبا نے دست بستہ عرض کیا۔ ''حضور جہاں پناہ! میں اپنی آخری خواہش کی تکمیل چاہتی ہوں۔''

ہمایوں نے داروغہ سے کہا۔ ''روحی صبا کو ساتھ لے جاؤ۔ یہ وہاں کا منظر دیکھے گی اور ماتم کرے گی۔ پھر یہ جو کہے اس پر عمل کیا جائے۔''

کامران مرزا رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ سپاہی اسے وہاں سے گھسیٹ کر لے جانے لگے۔ ہمایوں نے سیلابچی میں ہاتھ دھوئے۔ پھر اپنے میزبان کے ساتھ کھانے لگا۔

کامران مرزا کو عقوبت خانے میں پہنچا کر زمین پر گرایا گیا۔ دونوں ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے۔ پھر اس کی دونوں آنکھوں میں نشتر چبھوئے گئے۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیخ رہا تھا اور رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔

روحی صبا ایک طرف کھڑا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''کامران مرزا...! اب تو دیکھ نہیں سکتا۔ میری آواز سے مجھے پہچان سکتا ہے۔ سن .... میں وہی درمیان والا ہوں۔ جس کے پاس نہ اسلحہ ہے، نہ طاقت ہے، نہ زر ہے، نہ زور ہے۔ پھر بھی میں نے گھر کا بھیدی بن کر تجھے اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔''

جلادوں نے اسے اندھا کرنے کے بعد اس کی آنکھوں پر نمک چھڑک دیا۔ یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تکلیف کی شدت کا کیا عالم ہوگا؟ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ روحی صبا نے اپنے ایک کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک الاپ لگاتے ہوئے گانا شروع کیا۔

''نہ زر ہے میرے پاس، نہ ہی زور ہے۔
یہ اک درمیاں والی بہت کمزور ہے۔
کیا ہوا کہ بیچ والی بن گئی؟
میں نے بدلہ لے لیا۔
جب دل میں میرے ٹھن گئی۔

پھر روحی صبا نے تالی بجاتے ہوئے سپاہیوں سے کہا۔
''میرے ساتھ 'ہاں جی' کہو۔''
پھر وہ بولی۔ ''میں بیچاری نہ بیچارہ۔''
سپاہیوں نے تالیاں بجا کر کہا۔ ''ہاں جی۔''
''دشمن کو میں نے مارا۔''
سپاہیوں نے کہا۔ ''ہاں جی۔''
''پھر اختری نے پکارا۔''
''ہاں جی۔''

روحی صبا کامران مرزا کے چاروں طرف ناچتے ہوئے گانے لگا۔

''جیو میرے خواجہ سرا
میری ڈوری کا آدھا سرا
کبھی یہاں گرا۔ کبھی وہاں گرا
پھر بھی میرا رہا۔
جگ جگ جیو میرے خواجہ سرا.....''

وہ اندھا سوتیلا تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔

(ختم شد)

تاریخی پس منظر کے ماخذ

تاریخ ہندوستان — شمس العلماء مولوی ذکا اللہ
خلاصۃ التواریخ — سبحان رائے بٹالوی
اے سروے آف انڈیا — کے ایم پینکر
دختران ہند — پروفیسر مولانا علم الدین سالک

پرانا درخت

شکیل صدیقی

اس دنیا کی کوئی شے بے مصرف نہیں ہے البتہ علم کی کمی اس کے فائدے تک پہنچنے میں رکاوٹ بنتی ہے، ان کے علاقے میں بھی ایک ٹیلہ اور ایک درخت تھا جو ان کے نزدیک بے مصرف تھا لیکن اس کا کوئی مصرف تو تھا۔

شہر کی مکاریوں سے دور بسنے والے سادہ لوح انسانوں کی عقل مندی کا دلچسپ ماجرا

قصبہ نورپور کے ٹاؤن ہال میں کونسلر ڈاکٹر پرویز صاحب نے میٹنگ بلائی تو قصبے کے سارے اہم اور غیر اہم آدمی وہاں حاضر ہوگئے۔ ایک برس میں ہم لوگوں نے اتنا چندہ جمع کرلیا تھا کہ ایک مسجد تعمیر کروالی تھی، کھیل کا ایک میدان بنوالیا تھا اور ٹاؤن ہال پر پلاسٹر کرا کے اس کا فرش پکا کرالیا تھا۔ اس طرح سے وہاں مل بیٹھنے کی جگہ بن گئی۔ اس میں چند شیلف ڈلوا کر ہم نے اچھی اچھی کتابیں جمع کرلیں۔ ان لوگوں کو مطالعے کا شوق ہوتا وہ یہاں شام کو آجاتے۔ اس طرح سے ٹاؤن ہال میں چہل پہل رہتی۔ دو ماہ پہلے ہم نے وہاں لکڑی کی بنچیں بھی ڈلوالی تھیں۔

کونسلر صاحب قدرے اونچی جگہ پر بیٹھے تھے، ان کی کرسی ذرا مضبوط اور خوش نما تھی۔ وہ پینتالیس برس کے ایک قوی الجثہ شخص تھے۔ ان کا چہرہ جھریوں سے مبرا تھا اور بال اب تک سیاہ تھے۔ انہوں نے ہومیوپیتھی کا کورس پاس کر کے وہاں ایک عدد کلینک کھول لیا تھا۔ چونکہ قصبے میں کوئی اور ڈاکٹر نہیں تھا، اس لیے ان کی ڈاکٹری چل پڑی۔ بال بچوں

والے تھے اور کچھ پیسا بھی آ گیا تو وہ قصبے کے معزز آدمیوں میں شمار ہونے لگے۔ بس پھر کیا تھا...... جب الیکشن ہوئے تو وہ کونسلر بن گئے۔

ان کے قریب ایک کرسی پر باقر بھائی بیٹھے تھے جن کی اس قصبے میں پرچون کی سب سے بڑی دکان تھی۔ جب بھی میرا ہاتھ تنگ ہوتا تھا تو میں ان کا انٹرویو مع ان کی تصویر کے چھاپ کر ان سے سو دو سو روپے کھینچ لیتا تھا۔ وہ بہرحال قصبے کے سب سے مال دار شخص تھے اس لیے ان کی باتوں کو سب ہی اہمیت دیتے تھے۔ چار برس پہلے انہوں نے قصبے کے مسائل پر کچھ اظہار خیال کیا تھا جسے میں نے انٹرویو کی شکل دے دی تھی۔ میں اب تک اس میں ترمیم کر کے اس سے کام چلا رہا تھا۔

مجھے عدنان کہتے ہیں اور میں محکمہ ارضیات میں ملازم ہوں۔ چار برس پہلے مجھے یہاں اس لیے بھیجا گیا تھا کہ میں نور پور میں چھپی معدنیات کا کھوج لگا کر رپورٹ مرتب کروں۔ دو سال بعد میں نے ایک رپورٹ اپنے محکمے کو ارسال کر دی تھی۔ میرے ڈائریکٹر صاحب کو یہ رپورٹ اتنی پسند آئی تھی کہ انہوں نے مجھے مزید موقع دیا کہ میں اپنی تحقیقات جاری رکھوں۔ انہی دنوں اتفاق سے نور پور کا اکلوتا اخبار روزنامہ ''سویرا'' اپنے معاشی مسائل کی وجہ سے بند ہونے جا رہا تھا کہ میں نے اسے اپنی بیوی کے نام سے خرید لیا۔ میں چونکہ گورنمنٹ ملازم تھا اس لیے کسی اور مشغلے میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ اخبار قریبی شہر کے ایک چھوٹے سے پریس میں چھپتا تھا مگر اس کا مقام اشاعت قصبہ نور پور تھا اور جو تھوڑے بہت خریدار تھے وہ بھی یہیں تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں اس کی اشاعت بڑھانے اور اس کے ذریعے کچھ کمانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ سچ پوچھیے تو میں نے یہ سب کچھ اپنی بیوی شاہدہ کے لیے کیا تھا۔ شاہدہ کراچی کے ایک کانونٹ اسکول میں پڑھی ہوئی تھی۔ اس لیے اس کے مزاج نہیں ملتے تھے۔ شروع میں تو اسے نور پور کا ماحول بہت [illegible]ند آیا اور اس نے تبدیلی آب و ہوا کے نکتۂ نظر سے وہاں ر[illegible]نا [illegible]ل کر لیا' مگر پھر وہ اکتاہٹ کا شکار ہو گئی۔ وہ مجھ سے [illegible] کہ میں نے اس سے شادی کر کے اس کی زندگی تباہ [illegible]

[illegible]گی [illegible] بارے میں میرا نکتۂ نظر بہرحال اس سے [illegible] کہتا ہوں کہ جب عورت کی شادی ہو جائے [illegible] شوہر مل جائے تو اسے اور کیا چاہیے؟ [illegible] زندگی کی گاڑی کو آگے دھکیلنا [illegible] کراچی جا کر اسے گھر پر چھوڑ دیا تھا [illegible]

تاکہ وہ اپنی پسند کی زندگی گزار سکے' لیکن وہ نور پور آ گئی کہ میں واپس کراچی چلوں۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا' اس لیے ہماری زندگی میں تلخیاں بڑھتی چلی گئیں۔

جب ڈاکٹر پرویز نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی تو ہال میں ہونے والی کھسر پھسر بند ہو گئی۔

''میرے عزیز دوستو اور بزرگو!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اس قصبے میں کونسلر کا الیکشن جیتنے کے بعد سے میں ایک دن بھی آرام سے نہیں بیٹھا ہوں۔ میں نے اب تک جو کچھ کیا ہے یا کر رہا ہوں اس کی تفصیل میں آپ لوگوں کے سامنے پیش کرتا رہتا ہوں۔ نیشنل ہائی وے یہاں سے کافی دور ہے لیکن قصبے سے وہاں تک جانے والی کوئی سڑک بھی نہیں ہے۔ میں اس سلسلے میں بار بار حکومت کے آدمیوں سے ملا ہوں اور میں نے ذاتی کوششیں بھی کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت نے اس سال کے بجٹ میں ہائی وے تک جانے والی سڑک کے لیے رقم مختص کر دی ہے۔ یہ سڑک انشا اللہ اسی سال بن جائے گی۔ میں نے ٹھیکے داروں سے بھی بات کر لی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ مکمل تعاون کریں گے۔

ہائی وے سے نور پور کا تعلق ہونے کے بعد ہم وطن عزیز کے ترقی یافتہ شہروں میں شمار نہیں ہونے لگیں گے۔ یہاں ابھی سیکڑوں کام ایسے ہیں جو نامکمل پڑے ہیں' لیکن سارے کام ایک ساتھ نہیں کیے جا سکتے۔ ان کے لیے بہت سا پیسا درکار ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ آپ لوگوں کے رائے مشوروں سے ایسے کام کیے جائیں جو بہت ضروری ہوں۔ آج آپ لوگوں کو اسی لیے بلایا گیا ہے کہ میرے سامنے اپنی تجاویزات پیش کر سکیں۔''

ڈاکٹر صاحب اپنی تقریر کر کے بیٹھ گئے تو ہال میں ایک بار پھر سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد چچا فضلو نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا کہ نور پور میں بے شک کچھ لگے نہ لگے ایک عدد پبلک ٹیلی فون بوتھ ضرور لگنا چاہیے۔ ان کی یہ تجویز بہرحال معقول تھی اس لیے کہ نور پور کا باقی دنیا سے ٹیلی فونک رابطہ نہیں تھا۔ ہمارے پاس یہ سہولت نہیں تھی۔ کراچی جیسے شہروں میں تو بہرحال ان دنوں بھی فون عام سی چیز تھی لیکن نور پور جیسے قصبوں اور دیہات میں ابھی عام نہیں ہوئی تھی۔

قصبہ نور پور میں ماموں کریموں کی دودھ کی دکان تھی اور ان کی بیٹی ڈاکٹر صاحب کے لڑکے سے بیاہی ہوئی تھی اس لیے لوگ ان کی بات بھی توجہ سے سنتے تھے۔ انہوں نے تجویز

پیش کی کہ سب سے پہلے قصبے میں بجلی آنی چاہیے۔ انہوں نے کسی اخبار میں پڑھ لیا تھا کہ وطن عزیز سے بجلی پڑوسی ملک کو سپلائی کی جانے والی ہے۔ وہ افسوس کا اظہار کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری بجلی وہاں چلی جائے اور قصبہ نور پور کے لوگ اس سے محروم ہی رہ جائیں۔

فضل دین قصبے میں گھاس چارے کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کی دکان کافی بڑی تھی۔ وہ پچاس برس کا تھا لیکن نوجوان لگتا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس نے دو شادیاں کر رکھی تھیں اور اس کے بہت سے بچے تھے۔ وہ ان سے تنگ نہیں تھا اور انہیں اپنے ہاتھ پیر سمجھتا تھا۔ کسی زمانے میں وہ پولیس میں ملازم تھا۔ ابتدائی دنوں میں اس سے ورزش کرائی گئی تھی' جیسے کہ سب رنگروٹوں سے کرائی جاتی ہے۔ باقی سب تو اسے جلد ہی ترک کر دیتے ہیں' اسی لیے توندیں ہلاتے دکھائی دیتے ہیں لیکن فضل دین نے اب تک ورزش کرنا نہیں چھوڑی تھی۔ وہ فجر کے وقت اپنے بچوں کے ساتھ میدان میں خوب دوڑتا تھا اور پھر مگدر گھماتا تھا، بادام پستہ چرتا تھا اور خوب دودھ پیتا تھا۔ حالانکہ اب اس کا تعلق پولیس سے نہیں تھا' مگر وہ اب بھی تھانے کے چکر کا تار رہتا تھا اور اس کی تھانے دار سے بے تکلفی تھی۔ اس لیے لوگ اسے بھی احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اور اس کی رائے مشوروں کو تعویذ بنا کر گلے میں لٹکانے کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔

اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میری بھی ایک تجویز ہے کہ کیوں نہ ہم اس سال کے بجٹ میں سے رقم خرچ کر کے اس ٹیلے..... بلکہ پہاڑ کو برابر کر ڈالیں جو قصبے کے منہ پر کھڑا ہوا ہے۔''

قصبہ نور پور کو جانے والی کچی سڑک کے ابتدائی حصے میں ہی چکنی مٹی کا ایک بڑا سا پہاڑ کھڑا تھا۔ ہم سب چکر کاٹ کر ہی قصبے میں داخل ہو پاتے تھے۔

''اس کی چوٹی پر کھڑا ہوا برگد کا پرانا درخت بھی بہت بدنما لگتا ہے۔ اسے بھی جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔ جناب عالی! یہ میرا ذاتی خیال نہیں ہے، قصبے کے اکیاون اور بھی لوگ میرے ساتھ شامل ہیں۔'' اس نے کہا اور پھر اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر ڈاکٹر صاحب کو پیش کیا۔ وہ کاغذ نہیں بلکہ دستخط شدہ میمورنڈم تھا۔ لوگ اس کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

جنہیں تجویز پیش کرنے کا خیال نہیں آیا تھا وہ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ مجھے اس بات پر حیرت نہیں

گھر صحرا سے بدتر ہے

جو اولاد نہیں ہے

آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ نقص چاہے خاتون میں ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس ایجاد کیا ہے جس کے استعمال سے آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں آپ کے ہاں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے آج ہی گھر بیٹھے ہم سے فون پر رابطہ کریں اور بذریعہ ڈاک وی پی (V.P) بے اولادی کورس منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ

ضلع وشہر حافظ آباد ـــــ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

0547-522468

اوقات فون

صبح 9 بجے سے دوپہر 2 بجے تک

عصر 4 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں۔ بے اولادی کورس آپ تک پہنچانا ہمارا کام ہے۔

ہوئی کہ اس نے اکیاون آدمیوں کے دستخط کیسے حاصل کر لیے؟ چونکہ اس کی تھانے دار سے دوستی تھی اس لیے سب لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ جو لوگ تن سازی کرتے ہیں ان کے بارے میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ ان کی عقل گھٹنوں میں ہوتی ہے اس لیے مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ یہ خیال اس کے موٹے دماغ میں کیسے سمایا؟ وہ تو دودھ، لسی، مکھن اور دہی کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔

برگد کے اس درخت کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی جھولتی ہوئی جڑوں سے آسیب لٹکتے ہیں' اس لیے اسے ضرور کٹوا دینا چاہیے۔ تجویزیں سب پیش کرتے تھے، اس کے قریب کوئی نہیں پھٹکتا تھا' لیکن اجتماعی طور پر سب اس کے حامی تھے کہ نہ صرف برگد کے اس درخت کو کٹوا دینا چاہیے بلکہ اس ٹیلے کو بھی برابر کر دینا چاہیے تاکہ آمد و رفت میں آسانی پیدا ہو جائے۔

''فضل دین! تم اس درخت کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟'' ڈاکٹر صاحب نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ''قصبے میں اور بھی بہت سے ضروری کام ہونا ہیں۔ انہیں ہو جانے دو پھر میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس درخت کو کٹوا دوں گا۔''

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضل دین اس روز قسم کھا کر آیا تھا کہ کسی کی کوئی بات نہیں سنے گا۔ اس لیے اس کے سب حمایتی مل کر شور مچانے لگے تو ٹاؤن ہال چھلی بازار بن گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی جگہ سے کئی بار اٹھ کر التجا کی کہ ہال کے وقار کو ملحوظ خاطر رکھا جائے لیکن اس روز ان کی التجا کو کوئی خاطر ہی میں نہیں لا رہا تھا۔ اس وقت ان پر نقار خانے میں طوطی کی آواز والا محاورہ فٹ ہو رہا تھا۔

''وہ درخت ہمارے آباواجداد کی نشانی ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے آخری تیر چلایا۔ ''لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ قصبہ قائم ہونے سے پہلے اس جگہ کھڑا ہے اور نور پور کی حفاظت کر رہا ہے۔''

''بھوت اور چڑیلیں ہماری حفاظت کیسے کر سکتی ہیں؟'' فضل دین نے کہا۔ ''قصبے کے تقریباً سب ہی لوگوں نے اس کی جھولتی جڑوں سے سائے لٹکتے دیکھے ہیں۔''

''ٹھیک ہے ہم اس معاملے کو قصبے کے کچھ اور معززین کے سامنے بھی پیش کرتے ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''عدنان صاحب! آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟''

''میں درخت کو کٹوانے کے حق میں نہیں ہوں۔'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ''ہر علاقے کی ایک شناخت ہوتی ہے' اپنی مخصوص چیزوں سے وہ پہچانا جاتا ہے۔ اگر لاہور میں شالامار..... کراچی میں مزار قائد اور ملتان میں بہاؤالدین ذکریا کا مزار نہ ہوتا تو ان جگہوں کی کیا شناخت رہ جاتی؟ کیا وہ اونچے اونچے درخت جو برسوں سے ہماری سرزمین پر لہلہا رہے ہیں، یہ کہہ کر کٹوا دینا چاہئیں کہ ان پر آسیب کا بسیرا ہو چلا ہے؟ کل جب ہمارے پاس رہنے کو جگہ کم پڑے گی تو کیا ہم شالامار باغ پر بلڈوزر چلا کر وہاں رہائشی مکانات بنا سکتے ہیں؟ وہ درخت ایک ٹیلے پر لگا ہے اس لیے اسے بھی باقی رہنا چاہیے۔ ہم برسوں سے اس ٹیلے کے دائیں بائیں سے گھوم کر آ جا رہے ہیں، اب کیا قباحت ہے؟ قصبے میں اس سے بڑے بڑے مسائل ہیں پہلے ہمیں ان سے نمٹنا چاہیے۔ میں تو کہتا ہوں کہ فضل دین ان کی طرف سے ہماری توجہ ہٹا رہا ہے۔ جب تک اس قصبے میں بجلی نہیں آئے گی ہم ترقیاتی کام انجام نہیں دے سکتے۔ اس قصبے میں یوں ہی دھول اڑتی رہے گی۔ میں نے آپ کے سامنے دونوں تصویریں رکھ دی ہیں، فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

کچھ لوگوں نے میرے لیے تالیاں بجائیں جس سے مجھے قدرے تقویت پہنچی۔ ڈاکٹر پرویز نے کوئی فیصلہ سنانے سے پہلے ایک بار پھر فضل دین کی طرف دیکھا۔

''ڈاکٹر صاحب! کیا آپ چند لوگوں کی خاطر رائے عامہ کے خلاف فیصلہ دیں گے؟'' اس نے کہا۔ ''عدنان صاحب نے تاریخی عمارتوں کا حوالہ دیا ہے، اپنی تاریخ سے مجھے بھی محبت ہے' لیکن درختوں کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے دس ہزار روپے جمع کیے ہیں اور میں اسے چندے کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس آسیبی درخت سے چھٹکارا پانے کے بعد ہم اس ٹیلے کو ہموار کر دیں گے اور پھر اس کی جگہ کوئی اچھی سی یادگار قائم کریں گے جو واقعی اس جگہ سے مناسبت رکھتی ہوگی اور لوگ اسے دور دور سے دیکھنے آئیں گے۔ اس قصبے کے بہت سے لوگ جنگ میں شہید ہوئے تھے، کیا ہم ان کی یادگار قائم نہیں کر سکتے؟ ایسی بہت سی یادگاریں سیالکوٹ میں قائم ہیں۔'' اس نے کہا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

کونسلر ڈاکٹر پرویز صاحب ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئے۔ اس لیے کہ اب صرف درخت کو گرانے کی بات نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ قصبے کے شہدا کی ایک یادگار قائم ہونے کی بات تھی اور اس کے لیے قصبے کے لوگوں کی طرف سے دس ہزار روپے بھی مل رہے تھے۔ وہ خاموشی سے بیٹھے غور و فکر

لر رہے تھے کہ ماموں کریموں نے بھی دو ہزار چندہ دینے کا اعلان کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب کے لیے اب خاموش رہنا دشوار ہو گیا۔ انہوں نے کئی بار اپنی عینک کے شیشے صاف کیے اور پھر یہ فیصلہ سنا دیا کہ قصبہ نور پور کا وہ درخت گرا دیا جائے گا اور ٹیلا ہموار کر کے اس کی جگہ ان شہدا کی ایک یادگار قائم کی جائے گی جو اس قصبے سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے 1971ء کی جنگ میں حصہ لے کر وطن عزیز کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔

☆.....☆

جب میں نے اپنی سائیکل اس ٹیلے کے قریب کھڑی کی تو اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ میں نے سائیکل کے پیچھے بندھا ہوا پھاوڑا اور بیلچہ کھول لیا۔ اس کے بعد میں نے اس ٹیلے پر چڑھنا شروع کیا۔ اس میں احتیاط لازمی تھی اس لیے کہ راستہ پھسلواں ہو چکا تھا۔ ذرا سی بھی چوک ہو جاتی تو میری ہڈیاں ٹوٹ جاتیں۔ پھر یہ کہ رات کا وقت تھا اور راستہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر چاند نہ نکلا ہوتا تو میں وہاں آنے کی ہمت بھی نہ کر پاتا۔

جب میں اس درخت کے قریب پہنچ گیا تو میں نے تھوڑی دیر تک اپنا سانس درست کیا اور پھر کدال سے ایک مخصوص جگہ کو کھودنا شروع کر دیا۔ وہاں مٹی بھربھری تھی اس لیے جب میں نے بیلچے سے اس مٹی کو ہٹانا شروع کیا تو آدھی مٹی اس گڑھے میں ہی گر گئی۔ بہرحال میں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنا کام جاری رکھا۔ جب گڑھا کافی گہرا ہو گیا تو میں ٹھہر گیا اور اپنا سانس درست کرنے لگا۔

اس وقت قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر وہ درخت اور اس کے آس پاس کا حصہ اس طرح روشن ہو گیا جیسے وہاں سورج نکل آیا ہو۔ وہ سب طرف سے آئے تھے اس لیے مجھے بھاگنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں نے سب سے قریبی شخص کی طرف بیلچہ اچھالا اور پھر وہاں سے بھاگ جانا چاہا مگر میرا پاؤں پھسل گیا اور میں اسی گڑھے میں گر گیا جو میں اب تک کھودتا آیا تھا۔

میں کچھ اس طرح سے گرا تھا کہ فوراً ہی نہ اٹھ سکا۔ میں نے چند گہرے گہرے سانس لیے اور پھر اپنے چہرے سے دھول جھاڑتا ہوا اٹھ گیا۔ گاؤں کے لوگ اس اثنا میں قریب آ چکے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں ٹارچیں اور لالٹینیں تھیں۔ ایک آدھ نے مشعل بھی جلا رکھی تھی۔

''میں اس وقت کا دو سال سے انتظار کر رہا تھا۔'' سب سے آگے والے آدمی نے کہا۔

میں نے اس کی آواز سے پہچان لیا' وہ فضل دین تھا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟'' میں نے اپنا سانس درست ہونے پر پوچھا۔

''قصبے کے سارے لوگوں کا کہنا ہے کہ اخبار خرید نے میں تم نے اپنی ساری جمع پونجی خرچ کر دی تھی۔ تم بالکل قلاش ہو گئے تھے۔ پھر تمہاری بیوی واپس چلی گئی' مگر یہ حقیقت نہیں تھی۔ تم نے صرف یہ مشہور کیا تھا۔ اس لیے کہ جب تمہاری جیب خالی ہو چکی تھی تو تم نے اسے واپسی کا کرایہ کہاں سے ادا کیا؟ آخری روز تمہارے مکان سے تیز تیز آوازیں آتی سنائی دی تھیں، اس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر تم نے یہ بات پھیلانا شروع کر دی کہ تمہاری بیوی واپس چلی گئی حالانکہ تمہیں کسی نے اسٹیشن کی طرف جاتے نہیں دیکھا۔ میں نے ٹکٹ بابو سے بھی پوچھا لیکن انہوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ اتفاق کی بات یہ کہ اس روز کسی نے قریبی ریلوے اسٹیشن سے کراچی کا ٹکٹ ہی نہیں لیا۔ مجھے بھی یہ شبہ تھا کہ تم نے اپنی بیوی شاہدہ کو مار کر اسی درخت کے نیچے دفن کیا ہے۔ اب اگر میں خود اس جگہ کو کھودتا تو کوئی بات ثابت نہ ہوتی' اس لیے میں نے اس روز کا انتظار کیا۔ میری توقع کے مطابق جب میں نے اس درخت کو گرانے کی تجویز پیش کی تو تم نے سب سے زیادہ اس کی مخالفت کی۔ جب میں نے یہ کہا کہ میں یادگار قائم کرنے کے لیے مزید رقم دے رہا ہوں تو ڈاکٹر صاحب مجبور ہو گئے اور انہوں نے میرے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ یہ سن کر تمہارے حواس جاتے رہے اور تم آج ہی رات بیلچہ اور پھاوڑا لے کر چل پڑے تاکہ اپنی بیوی کا ڈھانچا نہیں اور دفن کر سکو۔ کیوں میں صحیح کہہ رہا ہوں نا عدنان؟'' اس کی بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میرا تعلق کبھی پولیس سے تھا۔'' اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ پھر اس نے مڑ کر تھانے دار مشرف مرزا سے کہا۔ ''اسے اپنی بیوی کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کر لو۔ غالباً تم نے یہ سوچا تھا کہ جب تمہارا اخبار چل پڑے گا تو تم محکمہ ارضیات کی ملازمت سے استعفیٰ دے دو گے' مگر تمہارا یہ خواب پورا نہیں ہوا' اس لیے کہ یہاں لوگوں کو پڑھنے لکھنے سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ مقامی اخبار چلا کر تم زندگی نہیں گزار سکتے۔''

مشرف مرزا نے آگے بڑھ کر میری کلائیوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

سسپنس کا مقبول عام سلسلہ جو تین سو اکیاون ماہ سے جاری ہے

فرہاد علی تیمور

دیوتا

ہنگاموں
رنگینیوں
اور تحیّر کے اس
بے تاج بادشاہ کی
سحرانگیز کہانی جس نے
اپنی بھرپور زندگی میں کبھی
شکست کا ذائقہ نہیں چکھا۔ وہ جب
اور جس کے ذہن میں چاہتا، جھانک لیتا
اور یہی اُس کا مُہلک ترین ہتھیار تھا۔ دونسلوں
پر محیط وہ طلسمِ ہوش رُبا جسے قارئین کی
دوسری نسل بھی بہت شوق سے پڑھ رہی ہے۔ اپنے
اور مُلک و قوم کے دشمنوں کو خیال خوانی کے نرم و نازک
ہتھیار سے خاک و خون میں نہلا دینے والے فرہاد علی
تیمور کی لازوال اور بے مثال داستانِ عبرت جس میں وہ لہو
کے سارے رشتوں کے ساتھ حریفوں سے برسرِ پیکار رہے۔

اُردو زبان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا طویل ترین سلسلہ

سونیا شدید حیرانی سے سن رہی تھی کہ جمائلہ نے وردان کو کیسی درندگی سے ہلاک کر ڈالا ہے۔ سونیا تو مجھ سے سن رہی تھی اور حیران ہو رہی تھی لیکن میں نے تو وردان کے اندر رہ کر جمائلہ کی شیطانی قوت کا مظاہرہ دیکھا تھا۔ اس نے ایک معمولی جھٹکے کے ساتھ ہی اس کی گردن کی ہڈی توڑ ڈالی تھی۔

سونیا نے کہا۔ ''ہم نے خطرناک اور شہ زور دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے ایک طویل زندگی گزاری ہے لیکن کبھی یہ دیکھا نہ سنا کہ ایک بیس بائیس برس کی لڑکی شہزوروں کی ہڈی پسلیاں توڑ دیتی ہے۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ دیوار سے سر ٹکراتی ہے تو وہاں شگاف پڑ جاتا ہے۔''

''وہ بے شک وشبہ خطرناک ہے۔ آج تمہاری بیٹی بنی ہوئی ہے۔ کل کسی وقت بھی جنون میں مبتلا ہو کر تمہاری دشمن بن سکتی ہے۔''

اس نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں۔ اسے بہت سی باتیں آگہی کے ذریعے معلوم ہو جاتی ہیں۔ کبھی یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ میں نے ہی کرونا سے کہا تھا کہ وہ ابوالہول کا بت اپنے آلہ کار کے ذریعے تڑوا دے۔ یہ بھید کھلے گا تو وہ میری جانی دشمن بن جائے گی۔''

''ہم نے دیکھا ہے کہ جب وہ دشمن بنتی ہے تو پھر اپنے شکار کو بچ کر جانے نہیں دیتی۔ اسے پُراسرار علم کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے کہ دشمن کہاں ہے؟ وہ بڑی برق رفتاری سے وردان تک پہنچ گئی تھی۔ خدانخواستہ تمہارے ساتھ ایسا ہوا تو تم اس سے بچ کر کتنی دور جا سکو گی؟ وہ ایسی ہی برق رفتاری سے آ کر تمہیں بھی دبوچ لے گی۔''

وہ بولی۔ ''ہم نے دشمنوں کے خوف سے فرار ہونا نہیں سیکھا ہے۔ ہمیشہ خطرناک اور شہزور دشمنوں کو بڑی ذہانت سے قابو میں کیا ہے۔ اسے بھی کر سکتے ہیں۔''

''کبھی وہ تمہارے خلاف جنون میں مبتلا ہو گئی تو ہم کچھ نہیں کر پائیں گے۔''

''ایک صورت ہے۔ ہم اسے جلد سے جلد بابا صاحب کے ادارے میں لے جائیں تمام بلڈرز بھی یہی چاہتے ہیں۔ وہ اس کے ذریعے جاسوسی کرانا چاہتے ہیں لیکن ہم نیک مقصد سے اسے لے جائیں گے اور ہو سکتا ہے وہاں اس کا روحانی طور پر علاج ہو جائے۔''

''درست کہتی ہو۔ اگر اس کے اندر سے شیطان کو مار دیا جائے تو پھر وہ کبھی ہماری دشمن نہیں بنے گی۔ میں ابھی جاتا ہوں اور براہِ راست جناب اسد اللہ تبریزی سے بات کرتا ہوں۔''

سونیا مجھ سے بات کرنے کے دوران میں اپنی کار ڈرائیو کرتی جا رہی تھی۔ پھر وہ بلڈرٹو کے بنگلے میں پہنچ گئی۔ اس کے احاطے میں گاڑی روک کر بڑے ہال میں پہنچی وہاں تمام بلڈرز موجود تھے۔ بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

بلڈرٹو نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''میڈم! آپ کہاں رہ گئی تھیں؟ وہ وردان جو بت لے کر یہاں آیا تھا۔ جمائلہ نے اسے مار ڈالا ہے۔''

سونیا نے انجان بن کر پریشانی ظاہر کی۔ ''اوہ گاڈ! اس نے ایسا کیوں کیا؟ جبکہ مسٹر وردان کو ایک معزز مہمان بنا کر رکھا گیا تھا؟''

ایک بلڈر نے کہا۔ ''جمائلہ نے ابھی وضاحت نہیں کی ہے۔ صرف اتنا کہا ہے کہ وردان ایک بہروپیا تھا۔ اسے نقصان پہنچانے آیا تھا۔''

بلڈر تھری نے کہا۔ ''یہ تو ہم سب مانتے ہیں کہ وہ پراسرار قوتوں کے ذریعے دوستوں کے درمیان چھپے ہوئے دشمنوں کو پہچان لیتی ہے۔''

سونیا بھی ایک دوست اور ماں بن کر اس سے دشمنی کر رہی تھی۔ اس نے اس کے بت کو تڑوا دیا تھا۔ اور اس کی تابعدار بننے کا ڈھونگ رچا رہی تھی، اسے دھوکا دیتی آ رہی تھی۔ اور جمائلہ اسے ابھی تک پہچان نہیں پائی تھی۔ اگر اس کا ابوالہول پراسرار قوتوں کا مالک ہوتا تو اسے اب تک سونیا کی حقیقت بتا چکا ہوتا۔

اسی لیے سونیا کہتی رہتی تھی کہ جمائلہ کے پیچھے نہ کوئی ابوالہول ہے، نہ کوئی شیطان ہے، وہ قدرتی طور پر ہی کچھ ایسی ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ لہٰذا اسے بابا صاحب کے ادارے میں لے جا کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

جمائلہ وہاں آ گئی اسے دیکھتے ہی سارے بلڈرز اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ''تم نے جہاں اس کو قتل کیا ہے، وہاں اپنے خلاف کوئی ثبوت تو نہیں چھوڑا ہے؟''

وہ بولی۔ ''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے ویران ہائی وے پر اسے روکا تھا، صرف چند منٹ میں اسے ہلاک کیا تھا اور چلی آئی ہوں۔''

''تم نے اسے کس طرح ہلاک کیا ہے؟''

''میں نے اس کی گردن کی ہڈی توڑ دی ہے۔''

''اوہ گاڈ! پولیس اور انٹیلی جنس والے سمجھ جائیں گے کہ

ایسا تم ہی کر سکتی ہو۔''

دوسرے بلڈر نے کہا۔ ''آؤ یہاں آرام سے بیٹھو۔ تم پر الزام آئے گا تو ہم نمٹ لیں گے۔''

وہ سونیا کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں نے آپ سے فون پر رابطہ کرنا چاہا تھا۔ پتا چلا کہ فون بند ہے۔''

''ہاں۔ بیٹری ڈاؤن ہو گئی تھی۔ میں نے اسے چارج کر لیا ہے۔ ہمیں وردان کے متعلق بتاؤ۔ تم تو اس کی بہت عزت کر رہی تھیں۔ پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ دشمن ہے؟''

اس نے آس پاس اور سامنے بیٹھے ہوئے بلڈرز کو دیکھا پھر کہا۔ ''وردان کے دماغ میں کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والی چھپی رہتی تھی۔''

''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ کوئی اس کے اندر چھپی رہتی تھی؟''

وہ بولی۔ ''وردان نے مجھے دھوکے سے اعصابی کمزوری کی دوا پلائی تھی۔ میں بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ تب میں نے اس خیال خوانی کرنے والی کو اپنے اندر بولتے ہوئے سنا۔ اس مکار عورت نے مجھ پر تنویمی عمل کیا تھا۔ مجھے اپنی تابعدار بنا لیا تھا۔''

تمام بلڈرز حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ''اس نے تمہیں تابعدار بنایا اتنی بڑی کامیابی حاصل کی اور ہمیں خبر بھی نہ ہو سکی؟''

''میں تنویمی عمل کے بعد خود ہی نہ جان سکی کہ میرے ساتھ کیا ہو چکا ہے؟ اس نے اسی بنگلے کی انیکسی میں بڑی راز داری سے ایسا کیا تھا۔''

بلڈر ٹو نے کہا۔ ''میرے بنگلے کی انیکسی میں، میری ناک کے نیچے ایسا ہوا اور میں بے خبر رہا؟''

جمائلہ نے کہا۔ ''وہ عورت بہت ہی مکار ہے۔ پہلے تو اس نے فون کے ذریعے مجھ سے بات کی۔ یہ کہہ کر میرا اعتماد حاصل کیا کہ اس نے ابھی خواب میں ابوالہول کو دیکھا ہے۔ اور اس کے حکم سے اس کا بت میرے پاس پہنچا رہی ہے۔ اس نے واقعی ایسا کیا تھا، وہ بت اس کے ذریعے میرے پاس پہنچا ہے۔ اس لیے میں دھوکا کھا گئی۔''

سونیا نے پوچھا۔ ''کیا تم واقعی اس کی تابعدار بن گئی تھیں؟''

''ہاں۔ میں چند گھنٹوں کے لیے اپنے اختیار سے باہر ہو گئی تھی۔ وہ جو حکم دیتی تھی میں اس کی تعمیل کرتی تھی۔ شکر ہے کہ رات ہو گئی، اور پراسرار قوت نے اس کے تنویمی عمل کو میرے دماغ سے مٹا دیا۔''

ایک بلڈر نے کہا۔ ''تم نے ایک رات اسے بری طرح زخمی کیا تھا۔ وہ یہاں تم سے انتقام لینے کے لیے آئی تھی۔''

جمائلہ نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ وہ میری دشمن بن گئی تھی لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ مما کو ہلاک کیوں کرنا چاہتی ہے؟''

سب نے چونک کر جمائلہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''اس نے مجھے تابعدار بنانے کے بعد حکم دیا تھا کہ میں اپنی مما کو ہلاک کروں گی، اور آج ہی کروں گی۔''

سونیا نے حیرانی سے پوچھا۔ ''وہ مجھے کیوں ہلاک کرنا چاہتی ہے؟''

''پتا نہیں۔ اسے آپ سے کیا دشمنی ہے؟ اس نے مجھے کوئی وجہ نہیں بتائی۔''

ایک بلڈر نے کہا۔ ''تعجب ہے وہ تمہیں تابعدار بنانا چاہتی تھی، اور میڈم کو ہلاک کر دینا چاہتی تھی۔ آخر وہ ہے کون؟''

سونیا نے کہا۔ ''میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ آج یہاں اسی ہال میں مجھ پر حملہ کرایا گیا تھا۔ ماؤس مرکر ہمارا اپنا آدمی ہے لیکن اس نے مجبور ہو کر مجھ پر گولی چلائی۔ ہم اب تک سمجھ رہے تھے کہ کرونا ہم سے دشمنی کر رہی ہے لیکن وہ اجنبی ٹیلی پیتھی جاننے والی مجھے مار ڈالنے کا عزم کر کے یہاں آئی ہے۔''

بلڈر ٹو نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''یہی بات ہے پہلے وہ ماؤس مرکر کے ذریعے آپ کو ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ پھر ناکامی کی صورت میں اس نے جمائلہ کو اپنی تابعدار بنا لیا اور اس کے ذریعے آپ کو مار ڈالنا چاہتی ہے۔''

ایک اور بلڈر نے کہا۔ ''ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہم پر بُرا وقت آ گیا ہے۔ پہلے ایک ٹیلی پیتھی جاننے والی کرونا ہماری دشمن تھی۔ اب یہ دوسری دشمن پیدا ہو گئی ہے۔''

بلڈر فور نے کہا۔ ''وہ وردان کو آلہ کار بنا کر یہاں آئی تھی۔ وہ مر چکا ہے۔ سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کی موت کے بعد وہ دشمن یہاں سے چلی گئی ہے یا ابھی یہاں موجود ہے؟''

بلڈر سکس نے کہا۔ ''وہ یہاں موجود ہے۔ اس نے ماؤس مرکر کو بھی آلہ کار بنایا تھا۔ اب اس کے ذریعے پتا نہیں کتنے آلہ کار بنا لے گی؟ اور ہمارے قریب سے قریب رہ کر ہمیں نقصان پہنچاتی رہے گی۔''

وہ سب بول رہے تھے۔ اور یہ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ پتا نہیں اس نے ان کے آس پاس کتنے لوگوں کو آلہ کار بنالیا ہے؟

بلڈر ٹو نے کہا۔ ''ہمیں اپنے اپنے بنگلے سے ایسے تمام سیکورٹی گارڈز کو ہٹا دینا چاہیے۔ جو یوگا کے ماہر نہیں ہیں۔''

ایک بلڈر نے فون کے ذریعے ماؤس مرکر سے رابطہ کیا اور کہا۔ ''ہم تمہیں حکم دے رہے ہیں کہ کسی بھی پہلی فلائٹ سے یہ ملک چھوڑ دو، اگر کسی فلائٹ میں جگہ نہ ملے تو بحری جہاز سے چلے جاؤ یا پھر ہائی وے کے راستے اس ملک سے باہر نکل جاؤ۔ جتنی جلدی ہو سکے ہم سے دور چلے جاؤ۔''

بلڈر ٹو نے اپنے سیکورٹی افسر کو بلا کر کہا۔ ''تم سب یوگا کے ماہر یہاں رہو گے۔ باقی سیکورٹی گارڈز کو چھٹی دے دو۔ انہیں کسی دوسری جگہ ڈیوٹی پر لگا دیا جائے گا لیکن وہ ہمارے بنگلے کے قریب نہیں آئیں گے۔ اور نہ ہی باہر ہم سے کہیں ملاقات کریں گے۔''

دوسرے تمام بلڈرز بھی فون کے ذریعے اپنے اپنے بنگلوں کے سیکورٹی افسر کو یہی حکم دینے لگے۔

نومی نے سب کے دلوں میں دہشت پیدا کر دی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جب وہ جمائلہ جیسی پراسرار قوتیں رکھنے والی کو اپنی تابعدار بنا سکتی ہے تو بڑی مکاری سے ان تمام بلڈرز کو بھی ٹریپ کر سکتی ہے۔

وہ اپنی سلامتی کے لیے بڑے سخت حفاظتی اقدامات کر رہے تھے۔ اور یہ طے کر رہے تھے کہ ابھی دو چار روز تک اپنے اپنے بنگلے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اور کسی جان پہچان والے سے بھی روبرو ملاقات نہیں کریں گے۔

جمائلہ نے کہا۔ ''آپ سب اپنے طور پر حفاظتی انتظامات کریں۔ میں مما کے ساتھ اپنے بنگلے میں جا رہی ہوں۔ وہاں ان پر تنویمی عمل کروں گی۔''

وہ دونوں وہاں سے اٹھ گئیں۔ پھر باہر آ کر اپنی اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگیں۔

ایک بلڈر نے جمائلہ کو فون پر مخاطب کیا اور بڑی راز داری سے کہا۔ ''تمہیں یاد ہے ناں! آج تم میڈم پر کس طرح کا تنویمی عمل کرو گی؟''

''ہاں مجھے یاد ہے۔ آج رات ان کا برین واش ہو جائے گا۔ ان کے ساتھ اب تک جو ہوتا رہا ہے، اسے مٹا کر میں انہیں ان کا ماضی یاد دلاؤں گی۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ وہ اپنی کار میں تھی۔ سونیا اپنی کار ڈرائیو کرتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

نومی سر پکڑ کر رہ گئی تھی۔ بڑی زبردست کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ بُری طرح ناکام ہو گئی تھی۔ زبردست کامیابی یہ تھی کہ اس نے جمائلہ جیسی خطرناک لڑکی کو اپنی معمولہ اور تابعدار بنا لیا تھا۔ لیکن یہ خوش فہمی چند گھنٹوں تک رہی۔ پھر رات ہوتے ہی اس نے نومی کے تنویمی عمل کی ایسی کی تیسی کر دی تھی۔

پہلے وہ وردان کو اپنا تابعدار بنا کر خوش ہو رہی تھی کہ ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا اس کا غلام بن گیا ہے۔ اب اس کی یہ خوش فہمی بھی ختم ہو گئی تھی۔ جمائلہ نے اچانک ہی وردان پر ایسا حملہ کیا تھا کہ نہ وہ کوئی تدبیر سوچ کر اس پر عمل کر سکی۔ اور نہ ہی خیال خوانی کے ذریعے اپنے اس غلام کو بچا سکی۔ یہ اس کا دوسرا نقصان تھا۔

تیسرا نقصان یہ تھا کہ سونیا سے دور ہو گئی تھی۔ دوبارہ اس کے قریب ہونے کے لیے تمام بلڈرز کے سیکورٹی گارڈز کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتی تھی۔ اور ماؤس مرکر کے ذریعے ان تمام سیکورٹی گارڈز تک پہنچنا چاہتی تھی لیکن جلد ہی پتا چل گیا کہ ایسے تمام سیکورٹی گارڈز ان بلڈرز کے بنگلوں سے ہٹا دیے گئے ہیں۔ جو یوگا کے ماہر نہیں تھے۔

یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ سونیا جمائلہ اور تمام بلڈرز محتاط ہو گئے ہیں۔ اور بڑی تیزی سے حفاظتی انتظامات کر رہے ہیں۔ پہلے وہ جتنی آسانی سے ان کے درمیان پہنچ رہی تھی۔ اب اسے وہ آسانی میسر نہیں ہو سکے گی۔

نومی نے اب سے پہلے بلڈر ٹو کے فون پر رابطہ کیا تھا اور اسے دوستی کی پیش کش کی تھی۔ اس کی وہ پیش کش ٹھکرا دی گئی تھی۔ اس کا فون نمبر سی ایل آئی پر آ گیا تھا پھر اس نے جمائلہ سے کہا تھا کہ ابوالہول کا بت اس کے پاس بھیجا جا رہا ہے۔ ایسے وقت جمائلہ کے فون پر بھی اس کا نمبر آ چکا تھا۔ وہ ناکام اور نامراد ہو کر سوچ رہی تھی کہ آئندہ اسے کیا کرنا چاہیے؟

ایسے ہی وقت اس کے موبائل فون کا بزر بولنے لگا۔ اس نے اسے اٹھا کر نمبر پڑھے تو یہ معلوم ہوا کہ بلڈر ٹو کال کر رہا ہے۔ اس نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو.....؟''

بلڈر ٹو نے کہا۔ ''تم نے اپنے فون پر میرا نمبر پڑھا ہو گا۔ پھر یہ بھی سمجھ گئی ہو گی کہ میں کون ہوں؟''

''ہاں۔ تم وہی ہو جسے میں نے دوستی کی پیش کش کی تھی اور تم نے اور تمہارے بلڈرز نے مجھے ایک معمولی ٹیلی پیتھی جاننے والی سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔''

''تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں منہ لگایا جائے۔ تم نے

اداری طرف سے مایوس ہونے کے بعد وردان کو اپنا آلہ کار بنا کر یہاں بھیجا پھر ہمارے جاسوس ماؤس مرر کو آلہ کار بنا کر تم پر جان لیوا حملہ کرایا۔ جمائلہ کو اپنی معمولہ اور تابعدار بنانا چاہا لیکن تمہیں حاصل کیا ہوا؟ دیکھو! تم نے کیسی منہ کی کھائی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ تم ہمارے انتقام سے بچ سکو گی۔''

''کیا مجھے دھمکی دینے کے لیے فون کیا ہے؟''

''نہیں۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تم کون ہو؟ تمہارا اصل نام کیا ہے؟ ہم سے کیوں دشمنی کرنے کے لیے یہاں چل آئی ہو؟''

''میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔''

''بات نہیں۔ ہم تمہاری شہ رگ تک پہنچ کر ہی تمام جواب اگلوا لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھ تک پہنچنے کے سہانے سپنے دیکھتے رہو۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے پھر اس کا بزر سنائی دیا۔ اس نے نمبر پڑھے اس بار جمائلہ کال کر رہی تھی۔ وہ زیر لب بڑبڑائی۔ ''چڑیل کی بچی! میرے ہاتھ آ کر نکل گئی۔ اب فون کر رہی ہے۔''

اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا پھر کہا۔ ''ہاں بولو.....''

جمائلہ نے کہا۔ ''میں دھوکا دینے والے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم مجھ سے دشمنی کرنے کیوں آئی تھیں؟''

''اصل بات یہ ہے کہ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں صرف تم سے خوفزدہ تھی۔ سوچا کہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے تمہیں اپنی تابعدار بنا کر رکھوں گی تو تم سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم خوفزدہ ہو کر ایسا کر رہی تھیں۔ میری دشمن نہیں ہو۔ مگر میڈم سونیا کی تو ہو۔ اس میڈم سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟''

''میں تمہیں اپنی تابعدار بنانے کے بعد تمہارے تمام دشمنوں کو راستے سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ دراصل میں اس کی دشمن نہیں ہوں۔ وہ تمہاری دشمن ہے۔''

''میڈم سونیا کے اندر کی ممتا کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ میری دشمن کبھی نہیں بن سکتیں۔''

''یہی تو تم نہیں جانتی ہو کہ وہ کس طرح تمہیں دھوکا دے رہی ہے۔ وہ دنیا کی سب سے چالاک عورت ہے، تم اسے کبھی سمجھ نہیں پاؤ گی۔''

بیرون ملک مقیم قارئین

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ

سرگزشت اور ماہنامہ دلکش

کے

سالانہ خریدار

بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ائر میل

اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کریں

ایشیا یورپ اور افریقا کے لئے زرسالانہ فی ڈائجسٹ

2000 روپے

امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لئے زرسالانہ فی ڈائجسٹ

2500 روپے

اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، ذیل میں درج پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابل ادائیگی ہونا ضروری ہیں۔ بیرون شہر / ملک ادائیگی کے لئے بینک کمیشن کے دس ڈالر کے مساوی رقم کا اضافہ کر لیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C PHASE II EXTENSION,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
KARACHI 75500
PHONES: (92) (21) 5802552,
5804200 FAX: 5802551,
E-MAIL: jasoosi@attglobal.net

''تم مجھے سمجھاؤ کہ وہ مجھے کس طرح دھوکا دے رہی ہے؟''

''میری بات کو تم اس طرح سمجھ سکتی ہو کہ تم بھی مسلمان ہو اور سونیا بھی ..... مسلمان بتوں کو گرانا اور توڑنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اسی نے تمہارے ابوالہول کے بت کو توڑا ہے۔''

''میں نہیں مانتی۔ میں نے اس کو تنویمی عمل کر کے گہری نیند سلا دیا تھا۔ اسی دوران وہ بت توڑا گیا ہے۔ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اس نے گہری نیند سے اٹھ کر ایسا کیا تھا؟''

''جس طرح میں نے تم پر تنویمی عمل کیا اور خوش فہمی میں مبتلا رہی لیکن تم میرے عمل سے نکل گئیں۔ اسی طرح تم بھی خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ وہ تمہاری معمولہ اور تابعدار بننے کا ناٹک کر رہی ہے۔''

جمائلہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس وقت وہ سونیا کے ساتھ بنگلے میں پہنچ چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس پر تنویمی عمل کرنے والی تھی۔

اس نے سر گھما کر باتھ روم کی طرف دیکھا۔ سونیا اس وقت باتھ روم کے اندر تھی۔ اور ابھی آ کر بیڈ پر لیٹنے والی تھی۔

اس نے فون پر پوچھا۔ ''کیا تم ثابت کر سکتی ہو کہ وہ ناٹک کر رہی ہے؟''

''تم کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے سے پوچھ لو۔ جس کا دماغ زہریلا ہوتا ہے۔ اس پر تنویمی عمل کا اثر نہیں ہوتا۔ سونیا زہریلی ہے۔ بہت ہی زہریلی ہے۔ اس کے دماغ میں کوئی بھی بات دیر تک نقش نہیں کی جا سکتی۔ اسے دیر تک اپنی تابعدار بنا کر رکھا نہیں جا سکتا۔''

''میں کیسے مان لوں۔ مجھے پینا ٹائز کرنے کی صلاحیت ابوالہول نے دی ہے۔ اگر یہ صلاحیت میرے کام نہ آتی اور سونیا مجھے دھوکا دیتی تو ابوالہول مجھے کسی نہ کسی طریقے سے بتا دیتا کہ میں دھوکا کھا رہی ہوں۔''

نومی نے کہا۔ ''میری یہ بات تمہیں بری لگے گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ ابوالہول کوئی شکتی دینے والا دیوتا نہیں ہے۔ وہ تاریخ کا ایک ایسا کردار ہے جس کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایک میگنیٹو کریکٹر رکھنے والا شخص تھا، پتا نہیں تم اس کی پوجا کیوں کرتی ہو؟ وہ تمہیں کسی جھوٹ اور فریب سے نہیں بچا سکتا، اگر بچانا ہوتا تو میں نے تمہیں اس کا بت بھیج کر دھوکا دیا تھا لیکن اس نے تمہیں آگاہ نہیں کیا کہ تم دھوکا کھا رہی ہو۔ وہ تو میری... بدنصیبی تھی کہ میرا تنویمی عمل تمہارے اندر دیر پا نہ رہ سکا۔''

وہ اس کی بات سن کر غصے سے بولی۔ ''تم نہیں سمجھ سکو گی کہ تمہارے تنویمی عمل کو دیر پا نہ کر کے ابوالہول نے مجھے تمہارے فریب سے آگاہ کیا ہے۔''

''یہ تمہارا عقیدہ ہے۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ٹیلی پیتھی جاننے والی کرونا ان بلڈرز کی وفادار تھی پھر بھی دھوکا دے کر فرار ہو گئی۔ میں اندر کی بات تو نہیں جانتی کہ وہ کیوں بلڈرز کی دشمن ہو کر وہاں سے چلی گئی ہے لیکن اتنا جانتی ہوں کہ ان سے دشمنی کرنے کے لیے اس نے سونیا کو اس کے ماضی کی بہت سی باتیں یاد دلائی ہوں گی۔ یہ بھی ضرور کہا ہو گا کہ تم اس کی بیٹی بن کر اسے دھوکا دے رہی ہو۔'' جمائلہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے سر گھما کر واش روم کی طرف دیکھا۔ وہاں شاور سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ سونیا غسل کر رہی تھی۔

بلڈرز نے جمائلہ کو بتایا تھا کہ کرونا نے بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔ وہ اس تہ خانے والے ریکارڈ روم میں گئی تھی۔ وہاں سے بہت سے راز چرائے اور پھر سونیا کی اس ویڈیو فلم کی کاپی بنا کر لے گئی، جس میں سونیا کی زندگی کی پوری تفصیلات موجود ہیں۔

جمائلہ کے دماغ میں سوالات گونجنے لگے۔ ''کیا کرونا نے اس ویڈیو فلم کو میڈم سونیا کے پاس پہنچا دیا ہے؟ کیا میڈم نے وہ ویڈیو فلم دیکھ لی ہے؟ یا پھر فون کے ذریعے یا خیال خوانی کے ذریعے کرونا نے ان کا ماضی یاد دلا دیا ہے؟''

''اگر ایسی بات ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ میڈم اپنے بارے میں سب کچھ جان چکی ہیں اور جاننے کے باوجود انجان بن کر مجھے اور تمام بلڈرز کو دھوکا دے رہی ہیں۔''

اب یہ بات بھی دل کو لگ رہی تھی، اور دماغ تسلیم کر رہا تھا کہ سونیا زہریلی ہے، اور زہریلا ذہن کسی کے بھی زیر اثر نہیں رہتا۔ وہ بے چین ہو کر سوچنے لگی۔ ''میں کیسے معلوم کروں کہ یہ میرے عمل کے نتیجے میں سحر زدہ رہتی ہیں یا نہیں؟''

نومی نے مسکراتے ہوئے فون پر پوچھا۔ ''کیا ہوا چپ کیوں ہو گئیں؟ عقل سے کام لو۔ اس مکار عورت کو آزماؤ وہ تمہاری تابعدار نہیں ہے۔ یہ میں دعوے سے کہتی ہوں۔ آج میری بات تمہاری عقل میں نہیں آئے گی تو کل دھوکا کھانے کے بعد خود ہی سمجھ لو گی۔ جاؤ۔ اسے سمجھتی رہو...''

نومی نے فون بند کر دیا۔ یہ سوچ کر مسکرانے لگی کہ اس نے ابھی جو زہر اگلا ہے۔ وہ جمائلہ کو متاثر کر رہا ہے۔ وہ پس پیش میں ہو گی کہ سونیا اس کے ساتھ مخلص ہے یا اسے دھوکا دے رہی ہے؟

وہ مکاری سے سوچنے لگی کہ اگر میں کسی بھی طرح جمائلہ کو سونیا سے بدظن کردوں، اس کے لیے دل میں نفرت پیدا کردوں، تو وہ شیطانی قوتیں رکھنے والی اسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گی۔ ہوسکتا ہے، سونیا جیسی ناقابلِ شکست عورت کی موت جمائلہ کے ہاتھوں ہی لکھی ہو۔

موبائل فون نے پھر اس کے خیالات میں مداخلت کی۔ اس نے فون کی طرف دیکھا نمبر پڑھے تو ایک دم سے پریشان ہوگئی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا وہ کئی بار مجھ سے فون پر رابطہ کرچکی تھی۔ اسے میرا نمبر اچھی طرح یاد تھا مگر اب وہ سمجھ رہی تھی کہ میں اسے کال کررہا ہوں۔

اس نے اپنی موت کا ناٹک کرنے کے بعد اپنی پچھلی تمام چیزیں بدل دی تھیں۔ موبائل نمبر بھی بدل دیا تھا۔ اب حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ مجھے اس کا نیا نمبر کیسے معلوم ہوگیا؟

ایک جگہ رکھا ہوا فون مسلسل بول رہا تھا۔ اس سے کہہ رہا تھا کہ سونیا کی جگہ لے کر جس کی تنہائی میں جانا چاہتی ہو وہی تمہیں بلا رہا ہے۔ اور جب بلا رہا ہے تو پھر ہچکچانا کیسا؟ چلو اس کے پاس جاؤ.....

اس نے ہچکچاتے ہوئے فون کو اٹھایا پھر اسے آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو.....؟''

میں نے کہا۔ ''بڑی دیر کی مہرباں فون اٹھانے میں.....''

اس نے پھر ہچکچاتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔ ''تم۔ تم کون ہو؟''

میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میرے قہقہے نے اسے سمجھا دیا کہ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔ کم از کم یہ تو معلوم ہوگیا ہے کہ اب وہ مردہ نہیں رہی ہے۔ اس کی زندگی کا سراغ مل گیا ہے۔

اس کے باوجود اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''کیوں..... خوامخواہ ہنس رہے ہو؟ ٹو دی پوائنٹ بات کرو۔ کون ہو تم.....؟''

''میں وہ ہوں جو تمہارے گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گیا ہوں۔ جسے نہ اگل سکتی ہو۔ نہ نگل سکتی ہو۔''

''تم۔ تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ سیدھی طرح بولو.....''

''میں ابھی آواز کے ذریعے تمہارے کانوں میں اتر رہا ہوں۔ کل تمہارے پاس آکر تمہارے وجود میں اتر جاؤں گا۔ میرا پیار حاصل کرلینے کی تڑپ ایسی ہے کہ میری یادیں تمہارے وجود میں لہو کی طرح دوڑتی ہیں۔''

اس نے ایک گہری سانس ایسے لی جیسے سانس کے ذریعے مجھے اپنے اندر اتار رہی ہو۔ وہ بہت ہی سنگدل اور بے رحم تھی لیکن ان لمحات میں رونے لگی۔ روتے روتے کہنے لگی۔ ''فرہاد.....! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ تب سے ہی سونیا بننے کے خواب و خیال میں گم رہتی آئی ہوں۔ ادر میں نے ایسا بن کر دکھا دیا۔ میں سو فی صد نہ سہی ننانوے فی صد سونیا بن چکی ہوں۔ بس ایک فی صد والی کمی یہ رہ گئی ہے کہ میں سونیا بن کر بھی تمہیں متاثر نہ کرسکی۔''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ''میں نے تمہیں پانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے، سونیا تمہاری بہت ہی محبوب ہستی ہے۔ میں اسے مشکلات میں ڈالتی رہی۔ اسے تم سے دور کرتی رہی۔ اور خود تمہارے قریب آنے کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا؟''

وہ دل پکڑ کر کراہتے ہوئے بولی۔ ''ہائے.....! کیا کروں؟ تمہیں پانے کے لیے میں نے اپنی موت کا ڈراما پلے کیا۔ اپنے سب سے وفادار جانثار دستِ راست کا شف جمال کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تمہارے قریب ہونے کے لیے طرح طرح کے خطرات سے کھیلتی رہی۔ مجھے بتاؤ اور میں کیا کروں؟''

وہ بڑے جذبے سے بول رہی تھی۔ ذرا خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ ''جو منزل تک پہنچنے کے لیے شارٹ کٹ یا غلط راستہ اختیار کرتے ہیں وہ ہمیشہ بھٹکتے رہتے ہیں۔ ذلتیں اٹھاتے رہتے ہیں۔ اور آخر کار برے انجام کے ساتھ فنا ہوجاتے ہیں۔''

''بے شک۔ میں نے غلط راستہ اختیار کیا تھا لیکن میں تمہیں پانے کے لیے اب بھی ہر جائز اور ناجائز راستہ اختیار کرسکتی ہوں۔''

''اور جب تک ایسا کرتی رہو گی۔ کبھی میرے سائے تک بھی نہیں پہنچ سکو گی۔ اور اب تو بالکل ہی ناممکن ہوگیا ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''ناممکن کیوں ہوگیا ہے؟''

''اس لیے کہ میں اب تم سے کوئی انتقام نہیں لوں گا۔ تم میرے پاس آنا چاہو گی تو میں تمہیں قبول کرلوں گا لیکن میرے قریب آؤ گی کیسے؟ اب تو تم سونیا کا شکار ہو۔ وہ تمہیں کسی حال میں زندہ نہیں چھوڑے گی۔ میرے قریب آتے ہی تم اس کے ہاتھوں ماری جاؤ گی۔''

''اگر تم اپنے دل میں میرے لیے تھوڑی سی جگہ بنالو۔ مجھے اپنی لائف پارٹنر بنالو تو میں سونیا سے دشمنی مول نہیں لوں گی۔ میرے اندر پھر کوئی جلا پا نہیں رہے گا۔''

''میں کہہ تو رہا ہوں کہ تمہیں قبول کرسکتا ہوں لیکن سو

کو کیسے سمجھاؤ گی؟ وہ تمہاری ایک نہیں سنے گی۔ گن گن کر بدلے لے گی۔''

''کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم سونیا کو کچھ بتاؤ، میں راز داری سے بھی تو تمہاری لائف پارٹنر بن کر رہ سکتی ہوں؟''

میں ہنسنے لگا اس نے پوچھا۔ ''ہنس کیوں رہے ہو؟''

''میں تمہاری تڑپ اور بے چینی کو خوب سمجھ رہا ہوں۔ اگر ابھی راضی ہو جاؤں۔ تمہیں اپنے پاس تنہائی میں بلاؤں اور دوسری طرف سے سونیا کو بھی بلالوں تو تمہارا کیا انجام ہوگا؟''

''میں تمہارے قریب آکر تم پر دل و جان نچھاور کرتی رہوں گی۔ تو کیا پھر بھی مجھے دھوکا دو گے؟''

''نہیں۔ میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ اگر کرنا چاہوں تو ابھی تمہاری بات مان لوں لیکن میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ تم سے خود انتقام نہیں لوں گا۔ میں نے تمہیں سونیا کے حوالے کر دیا ہے، اب تمہارا مقدمہ اس کی عدالت میں ہے، اس کے پاس جاؤ، رحم کی اپیل کرو۔ شاید وہ تمہارے حق میں کوئی فیصلہ سنا سکے۔''

''میں جانتی ہوں، وہ انتقام لینے کے لیے مجھے تلاش کر رہی ہے۔''

''صرف وہی نہیں۔ ہمارے تمام ٹیلی پیتھی جاننے والے اور بابا صاحب کے ادارے سے تعلق رکھنے والے جاسوس تمہیں ہر ملک ہر شہر میں تلاش کر رہے ہیں۔ تم اپنی ذہانت سے کام لے کر جب تک چھپ سکتی ہو چھپو لیکن موت تو پہاڑوں کی چٹانوں کے اندر بھی پہنچ جاتی ہے۔''

وہ ذرا خفگی سے بولی۔ ''ایسی بے نیازی سے تو نہ بولو۔ تم نے میرے بدن کی خوشبو چرائی ہے۔ میں نے اپنا سارا وجود تمہارے نام کر دیا تھا، اسی کا کچھ لحاظ کرو۔ مجھے اپنا بنا لینے کی بات کرو۔''

''میں کہہ چکا ہوں کہ تمہارا مقدمہ میری عدالت سے خارج ہو چکا ہے۔ جاؤ، سونیا کی عدالت میں جاؤ۔ ڈیٹ از آل۔''

میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ مایوس ہونا نہیں جانتی تھی۔ میں اس سے جس قدر دور ہوتا جاتا تھا۔ اسی قدر اس کی محبت اور مجھے پانے کا جذبہ شدت اختیار کرتا جاتا تھا۔ میری خاطر وہ جنون میں آکر بہت کچھ کرتی رہی تھی اور نقصان اٹھاتی رہی تھی۔

بہر حال وہ میرے حصول سے باز آنے والی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر اس نے سونیا کے فون پر رابطہ کیا۔ پتا چلا کہ اس کا فون بند پڑا ہے۔ وہ اس سے فون پر بات کر کے دوستی کرنا چاہتی تھی۔ اس سے معافی مانگ کر میرے پاس آنے کا راستہ ہموار کرنا چاہتی تھی۔

اس نے سوچا کہ خیال خوانی کے ذریعے اسے مخاطب کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے، وہ بات کرنے پر راضی ہو جائے؟

اس نے خیال خوانی کی پرواز کی۔ اس کا خیال تھا کہ پہلے تو وہ پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس کرتے ہی سانس روک لے گی۔ پھر دوسری بار اس کے پاس جانا ہوگا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سونیا کے اندر آسانی سے جگہ مل گئی، اور ایسا اس لیے ہوا کہ ان لمحات میں جمائلہ اس پر تنویمی عمل کر رہی تھی۔

نومی نے فوراً ہی میرے موبائل پر رابطہ کیا۔ میں نے فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

وہ بولی۔ ''میں نے اب تک سونیا سے دشمنی کی ہے۔ اب دوست بننے کا ثبوت دے رہی ہوں۔ فوراً سونیا کے دماغ میں پہنچو۔ جمائلہ اسے ہپناٹائز کر رہی ہے۔ اسے اپنی تابعدار بنا لینا چاہتی ہے۔ میں بروقت اطلاع دے رہی ہوں۔ اس سے تم میرے خلوص اور نیک نیتی کو سمجھ سکتے ہو۔ اب آئندہ میں سونیا سے دشمنی نہیں کروں گی۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم اسی طرح اپنے خلوص اور نیک نیتی کا ثبوت دیتی رہو۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ میرے ٹیلی پیتھی جاننے والے سونیا کے اندر موجود ہیں۔ میں بھی وہیں موجود تھا۔ فون کا بزر سن کر پھر دماغی طور پر حاضر ہو کر تم سے بات کر رہا ہوں۔''

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''میں تو بڑے خلوص سے سونیا کے کام آنے کے لیے تمہیں اطلاع دینے آئی تھی۔ یہ بھول گئی تھی کہ تم بہت محتاط رہ کر اس کی نگرانی کر رہے ہو گے۔''

''مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح نیک نیتی سے سونیا کا خیال رکھو گی۔ اس کے برے وقت میں کام آؤ گی تو شاید وہ تمہیں دوست بنا لے۔ اب جاؤ۔ مجھے سونیا کے پاس جانا ہے۔''

میں نے فون بند کیا پھر سونیا کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں پہلے ہی کرونا، اعلیٰ بی بی اور کبریا پہنچے ہوئے تھے۔ میری ضرورت نہیں تھی۔ پھر بھی میں وہاں رہنا چاہتا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ نومی بھی تجسس میں مبتلا ہو کر وہاں آگئی ہوگی۔ اور یہ دیکھنا چاہتی ہوگی کہ جمائلہ اس پر کس طرح کا تنویمی عمل کر رہی ہے۔

اس بار جمائلہ کا تنویمی عمل کچھ زیادہ ہی طویل تھا کیونکہ وہ موجودہ حالات اس کے ذہن سے مٹا رہی تھی۔ اسے یہ بھول جانے کی تاکید کر رہی تھی کہ وہ اب تک جمائلہ کی ماں بن کر رہتی آئی ہے۔ اور اس سے جھوٹ بولا گیا ہے کہ اس کا شوہر مر چکا ہے اور صرف جمائلہ ہی اس کی اکلوتی اولاد ہے۔

وہ اپنے عمل کے ذریعے یہ ساری باتیں اس کے ذہن سے مٹا رہی تھی۔ اور اس کی یادداشت واپس لانے کے لیے اس کا ماضی اسے یاد دلا رہی تھی۔

سونیا بڑی مکاری سے اس کی باتیں مان رہی تھی۔ یہ تاثر دے رہی تھی کہ وہ اپنے عمل کے ذریعے جو حکم دیتی جارہی ہے۔ وہ اس کی تعمیل کرتی جارہی ہے۔

سونیا اسے مسلسل دھوکا دیتی جارہی تھی۔ تالی دونوں ہاتھوں سے ہی بج رہی تھی۔ جمائلہ بھی اسے اپنی ماں بنا کر دھوکا دے رہی تھی۔ جھوٹ زیادہ دور تک نہیں چلتا اور فریب کبھی نہ کبھی کھل ہی جاتا ہے۔ ہمیں یہ اندیشہ تھا کہ کبھی فریب ظاہر ہوگا تو جمائلہ غصے اور جنون میں آکر سونیا کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن جائے گی۔

میں دوسری ہی صبح جناب اسد اللہ تبریزی کے پاس خیال خوانی کے ذریعے حاضر ہوگیا۔ انہوں نے کہا۔ ''آؤ فرہاد! بہت عرصے کے بعد آئے ہو؟''

میں نے بڑے ہی مودبانہ انداز میں کہا۔ ''جی حضور! جمائلہ نامی ایک لڑکی کا مسئلہ پیش کرنے آیا ہوں۔ وہ ایک عجوبہ ہے۔ اس کے ساتھ قدرتی حالات کچھ ایسے ہیں جو ہمارے لیے ناقابل فہم ہیں۔''

وہ بولے۔ ''ہوں! تو وہ لڑکی دُہری شخصیت کی حامل ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ نے آپ کو روحانی علوم سے مالا مال کیا ہے۔ آپ ہمارے کہنے سے پہلے ہی سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ وہ ایسی کیوں ہے؟ دن کی روشنی میں نہایت ہی پاکباز اور عبادت گزار بن کر رہتی ہے۔ اور رات کی تاریکی میں بالکل اس کے برعکس ہوجاتی ہے۔ اور شیطانی طرز کی زندگی گزارتی ہے۔''

وہ بولے۔ ''اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ وہ اس دنیا کے اور ساری کائنات کے بھید جانتا ہے۔ اس کی قدرت سے ظہور پذیر ہونے والے بڑے بڑے پراسرار واقعات تو ایک طرف ہیں۔ اس کے معمولی سے اسرار کو بھی انسانی عقل سمجھ نہیں پاتی۔''

انہوں نے ایک ذرا توقف سے کہا۔ ''مجھ سے نہ پوچھو کہ جمائلہ کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہر انسان اس دنیا میں آنے کے بعد دوہری زندگی گزارتا ہے۔ وہ اپنے طور پر نیکیاں بھی کرتا ہے اور بدی سے بھی ہمکنار ہوتا رہتا ہے۔ ساری عمر اپنے اندر کے شیطان سے لڑتے لڑتے عاقبت میں یہ اعمال نامہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے کہ اس نے شیطان سے لڑتے وقت کتنی جنگیں جیتی ہیں اور کس طرح زندگی کے پل صراط پر سے گزرتے ہوئے اپنے ایمان کو برقرار رکھا ہے؟''

وہ پھر ذرا خاموش ہوئے اس کے بعد بولے۔ ''جمائلہ بھی انسان ہے اور ہر انسان کی طرح وہ بھی دوہری زندگی گزار رہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہر انسان بیک وقت انسان بھی ہوتا ہے اور شیطان بھی لیکن جمائلہ ذرا مختلف ہے۔ وہ دن کو مکمل انسان ہوتی ہے اور رات کو مکمل شیطان....''

انہوں نے سر جھکا کر کہا۔ ''تم قدرت کے کتنے عجائبات پر حیران ہوتے رہو گے؟ ایسے انسان بھی پیدا ہوتے ہیں جن کے دو سر ہوتے ہیں۔ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ پیدائشی طور پر ابنارمل ہوتے ہیں، کبھی ایسے شیطانی بچے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ جو دودھ پیتے ہوئے ماں کی چھاتی کاٹ کر اسے لہو لہان کردیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''بے شک۔ انڈیا میں جڑواں بہنیں تھیں اچھی خاصی جوان ہونے تک وہ ایک دوسرے سے جڑی رہیں۔ بعد میں کامیاب آپریشن کے ذریعے انہیں الگ کردیا گیا۔ ابنارمل پیدا ہونے والے بچوں کو علاج کے ذریعے رفتہ رفتہ نارمل بنادیا جاتا ہے۔ کیا اسی طرح جمائلہ کا علاج نہیں ہو سکتا؟''

''دنیا میں کوئی بات اور کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔ شاید علم طب کے ذریعے اور علم روحانیت کے ذریعے اس کا علاج ہوجائے۔ میں ابھی یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ تم اسے یہاں لانا چاہتے ہو۔ جب چاہو لے آؤ۔''

میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''شکریہ جناب! آپ نے ہمارے دل کی بات کہہ دی، میں سونیا سے کہوں گا۔ وہ اسے یہاں لے آئے گی۔''

مجھے کچھ یاد آیا میں نے کہا۔ ''ایک اور اہم بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سیون بلڈرز نامی ایک تنظیم ہے۔ جس کا ہیڈکوارٹر پرتگال کے شہر لزبن میں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جمائلہ اس ادارے میں آئے اور یہاں کے اہم راز چرا کر ان کے پاس لے جائے۔''

انہوں نے کامل اطمینان سے کہا۔ ''دشمن تو سازش کرتے ہی رہتے ہیں۔ انہیں کرنے دو۔ جمائلہ کو لے آؤ۔''

میں ان کا شکریہ ادا کر کے دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہو گیا۔ جمائلہ نے سونیا پر تنویمی عمل کیا تھا۔ اور مطمئن ہو گئی تھی اس نے ان چھ بلڈرز سے فون پر بات کی تھی اور کہا تھا کہ مجھے یقین ہے۔ آج بھی میرا تنویمی عمل کامیاب رہے گا۔

ایک بلڈر نے پوچھا۔ ''کیا اسے اپنی پچھلی زندگی یاد آ جائے گی؟''

''ہاں۔ میں نے اس کے ذہن میں یہ بات نقش کر دی ہے کہ وہ فرہاد علی تیمور کی بیوی ہے اور اس کا تعلق بابا صاحب کے ادارے سے ہے۔ وہ تنویمی نیند سے بیدار ہونے کے بعد جب یہ سب کچھ یاد کرے گی تو یقیناً فرہاد یا بابا صاحب کے ادارے سے رابطہ قائم کرنا چاہے گی۔ آپ وہاں کے رابطہ نمبر نوٹ کرائیں۔ تاکہ میں وہ تمام نمبرز میڈم کو بتا سکوں۔''

اسے بابا صاحب کے ادارے کے کئی فون نمبرز نوٹ کرائے گئے۔ ایک نے پوچھا۔ ''کیا اسے یہ یاد رہے گا کہ تم اب تک اس کی بیٹی بن کر رہی تھیں؟''

''نہیں۔ وہ ہماری تمام باتیں بھول جائے گی۔ جب تک میں اس کے ساتھ بابا صاحب کے ادارے میں نہ جاؤں۔ تب تک آپ میں سے کوئی سونیا کے سامنے نہیں آئے گا۔ اور سامنا بھی ہو گا تو آپ سب اجنبی بن جائیں گے۔''

بلڈر ٹو نے کہا۔ ''جب وہ تنویمی نیند سے بیدار ہو گی تو اس وقت تمہیں وہاں موجود ہونا چاہیے۔''

''میں نے اسے سات بجے تک تنویمی نیند سونے کا حکم دیا ہے۔ اس وقت تک میں تبدیل ہو چکی ہوں گی۔ اور اس کے پاس موجود رہوں گی۔''

وہ بلڈرز کو یہ رپورٹ دینے کے بعد اپنی عادت کے مطابق تفریح کے لیے نائٹ کلب اور کیسینو کی طرف چلی گئی۔

میں سونیا کے پاس پہنچا تو وہ گہری نیند میں تھی۔ پرائی موج کی لہروں کو محسوس کرتے ہی بیدار ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ''سوری۔ میں نے نیند میں مداخلت کی ہے۔''

پرابلم۔ کوئی خاص بات ہے تو مجھے بتاؤ؟''

''ہاں۔ خاص بات یہ ہے کہ جناب تبریزی نے جمائلہ کو ادارے میں لانے کی اجازت دے دی ہے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''میں جمائلہ کو جلد سے جلد بابا صاحب کے ادارے میں لے جانے کی کوشش کروں گی۔''

''تمہیں کوشش کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ کل صبح تم یہ ظاہر کرو گی کہ تمہیں پچھلی تمام باتیں یاد آ گئی ہیں۔ اور تم بابا صاحب کے ادارے میں جانا چاہتی ہو، تو جمائلہ خود ہی تمہارے ساتھ جانا چاہے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ صبح اٹھ کر دیکھا جائے گا۔ اب میں سونا چاہتی ہوں۔''

ہاں۔ تمہیں نیند پوری کرنا چاہیے۔ میں جا رہا ہوں۔''

میں اس کے دماغ سے نکل آیا۔ دوسرے دن وہی ہونے والا تھا۔ جو تمام بلڈرز چاہتے تھے۔ انہوں نے اب سے پہلے کئی بار بابا صاحب کے ادارے میں چوری چھپے گھسنے کی کوششیں کی تھیں لیکن وہاں کے صدر دروازے کے اندر ایک قدم بھی رکھ نہیں پائے تھے۔

اب ان کی یہ حسرت پوری ہونے والی تھی۔

☆☆☆

پارس، پورس، اعلیٰ بی بی اور کبریا سب ہی انڈیا کے مختلف شہروں میں تھے۔ انڈین انٹیلی جنس والے ان سب کا محاسبہ کرنے والے تھے۔ محاسبہ اس لیے نہیں ہو پا رہا تھا۔ کہ میری بیٹی اور تینوں بیٹے مختلف ناموں سے مختلف بہروپ میں تھے۔ پہچانے نہیں جا سکتے تھے۔

انڈین انٹیلی جنس میں چھ ایسے سینئر اور جونیئر افسران تھے، جو یوگا کے ماہر تھے۔ ان چھ افسران نے اعلیٰ حکام کے ساتھ ایک میٹنگ میں کہا۔ ''ہمارے دیش میں ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ لوگ ہمارے حساس اداروں کے اعلیٰ افسران کے دماغوں میں پہنچتے ہوں گے، اور ہمارے بہت سے اہم راز معلوم کر لیتے ہوں گے۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''اگر ہم نے ان ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو اس ملک سے نکل جانے پر مجبور نہ کیا تو ہماری حکومت کا اور ہماری فوج کا کوئی راز، راز نہیں رہے گا۔''

اعلیٰ حکام میں سے ایک نے پوچھا۔ ''ہمارے دیش میں کل کتنے ٹیلی پیتھی جاننے والے ہیں؟''

ایک یوگا جاننے والے نے جواب دیا۔ ''یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے ہیں۔ تقریباً ایک برس پہلے معلوم ہوا تھا کہ یہاں فرہاد علی تیمور آیا ہوا ہے۔ اس کے آگے پیچھے کتنے ہی ٹیلی پیتھی جاننے والے ماتحت ہوتے ہیں۔ اس کے بیٹے بیٹی بھی ٹیلی پیتھی جانتے ہیں۔''

دوسرے یوگا جاننے والے نے کہا۔ ''جب ہم معلومات حاصل کرنے لگے تو پتا چلا کہ ہمارے دیش میں بھی کتنے ہی

ہندو ٹیلی پیتھی جاننے والے موجود ہیں۔ایک چنڈال جوگیا اور دوسرا تانترک مہاراج دونوں ہی مر چکے ہیں۔ایک امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والا لوٹی جے یہاں آیا تھا۔اب اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔شاید وہ واپس چلا گیا ہے۔''

ایک اور یوگا جاننے والے افسر نے کہا۔''شمالی ہندوستان میں وردان وشوا ناتھ ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا ہے۔وہ تیز بھاگتا ہے۔فرہاد اور اس کے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو یہاں سے بھگانے کے سلسلے میں ہماری مدد کر سکتا تھا۔لیکن.....''

ایک حاکم نے پوچھا۔''لیکن کیا؟''

''وردان پچھلے کئی ماہ سے فرہاد اور اس کے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔اور پریشان ہو رہا ہے۔اس نے ہمیں ایک مشورہ دیا ہے اگر ہم اس پر عمل کریں تو کامیاب ہو سکتے ہیں۔''

''وہ مشورہ کیا ہے؟''

''وردان نے کہا ہے کہ وہ فرہاد علی تیمور کے سامنے ایک ٹیلی پیتھی جاننے والے کی حیثیت سے ظاہر ہو کر غلطی کر چکا ہے اگر ہمارے پاس کوئی ایسا ٹیلی پیتھی جاننے والا ہو کہ فرہاد اور اس کے ٹیلی پیتھی جاننے والے بھی اس کا سراغ نہ لگا سکیں۔یہ معلوم نہ کر سکیں کہ وہ کون ہے؟ان کے خلاف کیا کر رہا ہے؟تو ہمیں کامیابی ہو سکتی ہے۔''

ایک حاکم نے کہا۔''یہ اچھا آئیڈیا ہے لیکن ہمارے پاس ایسا کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا نہیں ہے۔جسے ہم چھپا کر رکھیں۔''

''نہیں ہے تو ہو سکتا ہے۔اگر ہم امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والوں سے معاہدہ کریں اور ان میں سے کوئی ایک ٹیلی پیتھی جاننے والا یہاں آ کر بڑی رازداری سے ہمارے لیے کام کرے تو فرہاد اور اس کے ٹیلی پیتھی جاننے والے پریشان ہو جائیں گے۔کبھی یہ معلوم نہیں کر پائیں گے کہ ان کے خلاف کون محاذ آرائی کر رہا ہے اور کہاں سے کر رہا ہے؟''

تمام اعلیٰ حکام نے متفق ہو کر کہا۔''یہ تو بہت ہی زبردست آئیڈیا ہے۔اس پر فوراً عمل کرنا چاہیے۔''

انہوں نے امریکی اکابرین سے رابطہ کیا۔اس سلسلے میں ان لوگوں کے درمیان دو دنوں تک بحث ہوتی رہی پھر انہوں نے اپنے ایک ٹیلی پیتھی جاننے والے وائس مین کو خفیہ طور سے خدمات انجام دینے کے لیے انڈیا بھیج دیا۔

وہاں وائس مین کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔اس نے ایک خفیہ میٹنگ میں کہا۔''صرف آپ چھ یوگا جاننے والے مجھے جانتے ہیں۔کسی ساتویں کو نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں کوئی امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والا ہوں۔مجھے یہاں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں ہندوستانی زبان اچھی طرح جانتا ہوں۔''

وہ ٹیلی پیتھی جاننے والا یہ طے کر کے آیا تھا کہ مجھ سے کبھی مخاطب نہیں ہوگا۔کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دے گا کہ امریکا سے کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا میرے مقابلے پر آیا ہے۔پہلے وہ بڑی خاموشی سے خیال خوانی کے ذریعے یہ معلوم کرتا رہے گا کہ ہم ٹیلی پیتھی جاننے والوں میں سے کون فرہاد کار رشتے میں کیا ہوتا ہے اور فرہاد کے کتنے ماتحت یہاں کام کر رہے ہیں؟

وہ بڑی زبردست پلاننگ کے ساتھ آیا تھا،اس وقت تک میں انڈیا سے پیرس چلا آیا تھا۔وہاں پارس، پورس اعلیٰ بی بی، کبریا اور عدنان رہ گئے تھے۔ان دنوں وردان ان جڑواں بہنوں کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔اسے ناکامی اس طرح ہوئی تھی کہ دونوں بہنوں نے خودکشی کر لی تھی۔

وردان نے اس ٹیلی پیتھی جاننے والے وائس مین سے ملاقات کی تھی۔اور کہا تھا کہ یہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔میرے دیش کی سیوا کرنے آئے ہو،میں تمہارے ساتھ بھرپور تعاون کروں گا۔میرا تعاون تو یہی ہے کہ فرہاد کا بیٹا پارس ان دنوں دہلی شہر میں ہے۔وہ ان جڑواں بہنوں کے باپ عبدالرحمن کے پاس آتا جاتا ہے۔

اس نے عبدالرحمن کا پتا بتا دیا۔انڈین انٹیلی جنس والوں نے اور وائس مین نے خیال خوانی کے ذریعے دور سے پارس کو دیکھ لیا' وائس مین نے یوگا کے چھ افسران سے کہہ دیا تھا کہ وہ سب اس کی ہدایت پر عمل کرتے رہیں گے۔

اس نے ہدایت کی کہ فی الحال پارس کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔دور سے ہی اس کی نگرانی کی جائے۔اس طرح ہم اس کے دوسرے رشتے داروں تک پہنچ سکیں گے۔

پورس اپنے بیٹے عدنان اور شیوانی کے ساتھ ایک فیملی لائف گزار رہا تھا۔وردان نے وائس مین کو اور انٹیلی جنس والوں کو بتایا کہ اس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کا ایک پانچ برس کا بیٹا کچھ ابنارمل سا ہے۔میرے علم کے مطابق وہ میرے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔میں اسے ڈھونڈ کر قیدی بنا لیتا یا مار ڈالتا لیکن میں ایسا کچھ نہیں کر سکا۔

وائس مین نے پوچھا۔''کیا تم اسے یا اس کے باپ

تلاش نہیں کر سکے؟''

''میں نے اسے ڈھونڈ نکالا تھا۔لیکن ان کے ٹیلی پیتھی جاننے والے اتنے ہیں کہ ان کی بھیڑ سے اس بچے کو نکال لانا ناممکن ہوگیا۔''

وردان نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔''میں تو شکست تسلیم کر چکا ہوں۔اپنا یہ ملک چھوڑ کر جانے والا ہوں۔''

وائس مین نے پوچھا۔''ایسی مایوسی کیوں طاری ہو گئی؟''

''فرہاد کے خاندان میں صرف ٹیلی پیتھی جاننے والے ہوتے تو کوئی بات نہ ہوتی۔وہاں تو سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک ذلیل ہیں۔بڑے چالاک ہیں۔اتنے حاضر دماغ ہیں کہ آنکھوں سے سرمہ چرا کر لے جاتے ہیں اور خبر بھی نہیں ہوتی۔''

''تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے کہ تم بری طرح مایوس ہو کر اپنے ہی وطن کو چھوڑ رہے ہو؟''

''ایک آدھ بار ناکامی ہوتی تو میں مایوس نہ ہوتا لیکن ہر بار جب بھی انہیں مات دینی چاہی تو خود مات کھاتا چلا گیا۔کیا تم یقین کرو گے کہ آخری بار مجھے ایک پندرہ برس کی لڑکی نے بری طرح شکست دی؟''

اس نے بے یقینی سے کہا۔''تمہارے جیسے جہاندیدہ اور تجربہ کار شخص کو ایک پندرہ برس کی لڑکی نے شکست دی.....!نہیں یقین نہیں آتا۔''

''فرہاد کے خاندان میں عجوبے ہیں۔اس کا پوتا عدنان بھی ایسا عجوبہ ہے کہ اس کا باپ تو کیا اس کا دادا فرہاد بھی اسے سمجھ نہیں پاتا ہے۔''

''تم کسی پندرہ برس کی لڑکی کا ذکر کر رہے تھے۔''

''ہاں۔وہ بھی فرہاد کے خاندان سے ہی تعلق رکھتی ہے۔اس پانچ برس کے لڑکے کی دلہن بننے والی ہے۔''

اس بار وائس مین نے شدید حیرانی سے پوچھا۔''کیا.....؟لڑکی پندرہ برس کی ہے اور لڑکا پانچ برس کا اور وہ اس کی دلہن بننا چاہتی ہے؟یہ تو بہت ہی عجیب اور یقین نہ کرنے والی بات ہے۔''

''میں نے کہا ناں۔اس کے خاندان میں ایسے ہی عجیب وغریب لوگ ہیں۔کیا یقین کرو گے کہ وہ پندرہ برس کی لڑکی بھی بہت اچھی ٹیلی پیتھی جانتی ہے؟''

''یہ بھی یقین نہ کرنے والی بات ہے۔کیا تمہارا اس سے سامنا ہوا تھا؟''

وردان نے کہا۔''ہاں۔خیال خوانی کے ذریعے ہی رابطہ ہوا تھا۔اور ایسا کہ اس نے آتے ہی مجھے اپنا تابعدار بنا لیا تھا۔''

وائس مین نے شدید حیرانی سے کہا۔''اوہ مائی گاڈ!ہم امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والے اکثر فرہاد کے اور اس کی فیملی کے بارے میں باتیں کرتے رہتے ہیں۔یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ آخر وہ پہاڑ جیسا ٹیلی پیتھی جاننے والا کسی سے زیر کیوں نہیں ہوتا؟بات یہی سمجھ میں آتی ہے کہ جس خاندان کا ایک ایک فرد ذہین،حاضر دماغ اور عجیب وغریب ہو بھلا اسے کون شکست دے سکتا ہے؟''

''میرے مہاگرو پربھو دیال شنکر میری مدد نہ کرتے تو میں اس پندرہ برس کی لڑکی اور اس عجوبے عدنان کا معمول اور تابعدار بن کر رہ جاتا۔ساری زندگی ان کی غلامی کرتا رہتا۔''

''یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ وہ سب لوہے کے چنے ہیں۔ہم چبا نہیں سکتے لیکن چپ چاپ ان سے دور رہ کر ان سے چھپ کر ان لوہے کے چنوں کو اپنی تقدیر کی آگ میں پگھلا تو سکتے ہیں۔''

''ابتدا میں میرا بھی یہی خیال تھا کہ ایسا کر سکتا ہوں۔''

''تم بری طرح مایوس ہو گئے ہو،میرا مشورہ ہے کہ یہاں سے نہ جاؤ۔میرے ساتھ رہو گے تو میں تمہاری معلومات سے اور یہاں کے تجربات سے با آسانی ان پر قابو پا سکوں گا۔انہیں یہیں تباہ و برباد کر دوں گا یا فرار ہونے پر مجبور کر دوں گا۔''

''سوری۔تم اپنے عزائم کے مطابق کام کرو۔میں اپنے مہاگرو پربھو دیال شنکر کے احکامات کی تعمیل کرتا رہتا ہوں۔انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ملک چھوڑ کر کہیں دور چلا جاؤں۔اگر میں فرہاد اور اس کی فیملی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔کبھی ان کی برائی نہیں سوچوں گا۔تو میری عمر بہت طویل ہوگی۔ورنہ میں بے موت مارا جاؤں گا۔''

وردان نے اس امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والے وائس مین کو ہمارے بارے میں بڑی معلومات فراہم کیں۔پھر وہاں سے چلا گیا۔اس کے مہاگرو پربھو دیال شنکر کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی کہ وہ ملک سے باہر جا کر ایک طویل عمر گزار سکتا ہے۔اسے صرف ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہیے لیکن اس کے جانے انجانے میں یہی بات ہوگئی۔وہ نومی کا تابعدار بن کر سونیا کے قریب آگیا۔نومی سونیا کو ہلاک کرنا چاہتی تھی۔اور وردان اس کی ہلاکت کا ذریعہ بن

رہا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ وہ اپنے گرو دیو کی پیش گوئی کے مطابق بے موت مارا گیا۔

دردان نے وائس مین کو بتایا تھا کہ پورس اپنے بیٹے عدنان اور شیوانی کے ساتھ ممبئی میں رہتا ہے۔ شیوانی ہندو تھی۔ اس کے رہنے کا طریقہ بھی ہندوانہ تھا۔ لہٰذا اس کے ساتھ رہنے والے پورس اور عدنان کو پہچاننا بہت ہی مشکل تھا۔ پھر بھی انٹیلی جنس والے انہیں تلاش کر رہے تھے۔

دہلی کے ایک افسر نے رپورٹ دی کہ میں نے ایک نہایت ہی خوبصورت اور اسمارٹ لڑکی کو دیکھا ہے میں اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس سے لفٹ لینا چاہتا تھا۔

انٹیلی جنس کا وہ افسر دراصل اعلیٰ بی بی کے بارے میں رپورٹ پیش کر رہا تھا۔ اس نے عالی کو ایک نائٹ کلب میں دیکھا تھا۔ اس نے لفٹ لینی چاہی تھی۔ عالی نے کہا کہ میں پامسٹ ہوں۔ ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر مستقبل کے بارے میں بہت کچھ جان لیتی ہوں۔ جس کے ہاتھ کی لکیر یہ کہے گی کہ وہ میرا لائف پارٹنر بن سکتا ہے، تو میں اسی سے محبت کروں گی۔

اس افسر نے اپنا ہاتھ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا ہاتھ دیکھو اور بتاؤ کہ تم میرے مقدر میں ہو یا نہیں.....؟''

عالی اس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھنے لگی اور اس کے دماغ میں پہنچ گئی۔ اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''تم ایک سرکاری افسر ہو۔ تمہاری تنخواہ زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اوپری آمدنی کے لیے الٹے سیدھے کام کرتے ہو۔ جو مجرم گرفت میں آتا ہے اس سے بڑی بڑی رقمیں لے کر اسے رہا کر دیتے ہو۔''

افسر نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''یہ جھوٹ ہے۔ تم ہاتھ کی لکیریں دیکھنا نہیں جانتیں، غلط کہہ رہی ہو۔''

عالی نے پوچھا۔ ''کیا یہ بھی غلط ہے کہ تم شادی شدہ ہو؟ میرے سامنے خود کو کنوارہ کہہ رہے ہو؟''

وہ اس کی ہر بات نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں۔ میں نے خود کو کنوارہ کہا ہے۔ لیکن ایک طرح سے یہ جھوٹ نہیں ہے۔ کیونکہ میری بیوی شادی کے ایک برس بعد ہی پاگل ہو گئی تھی۔ اب اسے زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا ہے۔ ہمارے درمیان میاں بیوی کے تعلقات بھی نہیں رہے ہیں۔ کیا اس طرح میں خود کو کنوارہ نہیں کہہ سکتا؟''

عالی نے پوچھا۔ ''میں کیسے یقین کروں کہ تمہاری بیوی پاگل ہے؟''

''تم ابھی میرے ساتھ میرے گھر چل سکتی ہو۔ اور اسے دیکھ سکتی ہو۔''

عالی اس کے ارادوں کو سمجھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ جانے کے لیے راضی ہو گئی۔ کلب سے باہر آئی پھر اسے اپنی کار میں بٹھاتے ہوئے بولی۔ ''اتنے بڑے سرکاری افسر ہو لیکن رشوت لینے کے باوجود اس قابل نہیں ہو کہ اپنے لیے ایک کار خرید سکو؟''

''کسی دن لمبا ہاتھ مارو گی تو صرف ایک کار ہی نہیں۔ بڑا سا بنگلا بھی خریدوں گا۔ وہاں تمہیں لے جا کر رکھوں گا۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''تم جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے رہتے ہو۔''

وہ اس کے گھر پہنچ گئی۔ وہاں کوئی نہیں تھا، وہ تو پہلے سے جانتی تھی کہ گھر خالی ہے۔ اور اس کے ارادے خطرناک ہیں۔ اس نے اندر پہنچتے ہی دروازے کو بند کر لیا۔ پھر کہا۔ ''میں نے اپنی بیوی کو ایک برس بعد ہی طلاق دے دی تھی۔ کیا کروں؟ دل بھر گیا تھا۔ اب شادی کرنے کی غلطی نہیں کروں گا۔ جب حسین لڑکیاں یوں ہی مل جاتی ہیں تو گلے میں ڈھول کیوں لٹکاؤں؟''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھتے ہوئے بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''آؤ۔ میری آغوش میں آ کر مجھے مدہوش کر دو۔''

آگے بڑھتے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ عالی نے گھوم کر ایک کک اس کے منہ پر ماری تھی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے چلا گیا۔ ایک لڑکی سے مار کھاتے ہی شرم آئی۔ اس نے پلٹ کر حملہ کیا۔ وہ اچھا خاصا تربیت یافتہ انٹیلی جنس کا افسر تھا۔ مجرموں سے لڑنا اور انہیں قابو میں کرنا جانتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ مجرم تھا۔ اس لیے مار کھا رہا تھا۔

دو چار حملوں کے بعد ہی اس کی ناک اور منہ سے خون رسنے لگا تھا۔ اتنی پٹائی کے بعد سمجھ میں آ گیا کہ مقابلے میں جو لڑکی ہے۔ وہ تر لقمہ نہیں ہے۔ پتھر کا نوالہ ہے۔ وہ اسے نگل نہیں سکے گا۔ پھر بھی اپنی مردانگی کا بھرم رکھنے کے لیے اس نے پھر اس پر ایک آدھ حملے کیے اور اس بری طرح مار کھاتا رہا کہ نڈھال ہو کر فرش پر گر پڑا۔ ہڈیاں پسلیاں دکھنے لگیں۔

عالی نے کہا۔ ''میں تمہیں مار ڈالوں تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ تم مجھے یہاں برے ارادے سے لائے تھے۔ کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ میں چپ چاپ یہاں سے جا سکتی ہوں۔ لیکن بھیک میں تمہیں زندگی دے کر جا رہی ہوں۔''

وہ چلی گئی۔ وہ افسر اس بری طرح زخمی ہوا تھا کہ دو دنوں تک گھر سے باہر نہ نکل سکا تھا۔ تیسرے دن ڈیوٹی پر آیا تو اس کی ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔

اس رات عالی اسی کلب میں تھی۔ اس افسر نے چار ہٹے کٹے غنڈوں کو اپنے ساتھ لیا پھر دور سے ہی انہیں عالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ لڑکی جب بھی باہر نکلے تو اس کا تعاقب کیا جائے۔ اور گھیر کر میرے مکان میں لایا جائے۔

ایک غنڈے نے کہا۔ ''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ہم اسے یہیں سے اٹھا کر آپ کے گھر پہنچا سکتے ہیں۔''

''اسے کوئی معمولی لڑکی نہ سمجھو۔ وہ زبردست فائٹر ہے اسے سوچ سمجھ کر قابو میں کرنا ہوگا۔ میں تم لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔ ہم اسے گن پوائنٹ پر لے جائیں گے۔ میں اسے اکیلا قابو میں نہ کر سکا۔ ہم پانچ مل کر اس کی عزت کی دھجیاں اڑا دیں گے۔''

عالی اس کے خیالات پڑھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی کلب سے باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ گئی۔ پھر وہاں سے جانے لگی۔

وہ اپنے دفتر سے لائی ہوئی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ چار غنڈے بیٹھے ہوئے تھے۔ اسکرین کے باہر بہت دور عالی کی کار جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پہلے تو وہ کار دو چار سڑکوں پر اِدھر اُدھر مڑتی رہی۔ پھر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اس نے اپنی کار روک کر حیرانی سے کہا۔ ''ابھی تو ہماری آنکھوں کے سامنے تھی۔ پھر کہاں گم ہوگئی؟''

عالی اسے غائب دماغ بنا کر دوسری سڑک پر مڑ گئی تھی۔

ایک غنڈے نے کہا۔ ''وہ دائیں طرف گئی ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''نہیں۔ بائیں طرف گئی ہے۔''

تیسرے نے کہا۔ ''ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ کدھر جا رہی تھی۔ میرے خیال سے وہ سیدھی گئی ہے۔''

اس افسر نے پریشان ہو کر زیر لب کہا۔ ''مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ جادو جانتی ہے۔ میں صاف طور سے اسے آگے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر ایسا لگا۔ جیسے وہ جاتے جاتے اس سڑک پر سے گم ہوگئی ہے۔''

وہ پھر کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آخر بچ کر کہاں جائے گی؟ آج نہیں تو کل قابو میں آئے گی۔''

وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کرنے لگا۔ ایک غنڈے نے کہا۔ ''سر! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔''

''میں کوئی اناڑی نہیں ہوں۔ خاموش بیٹھے رہو۔''

اس نے رفتار اور بڑھا دی۔ وہ اندر سے پریشان ہو رہا تھا، کہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ لیکن اپنی مرضی کے خلاف رفتار بڑھا رہا تھا۔ آخر اس نے اچانک ہی ایسا ٹرن لیا کہ گاڑی مڑ کر ایک بڑی سی دکان کے شوکیس سے ٹکراتی ہوئی اندر گھستی چلی گئی۔ پھر اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے؟

جب ہوش آیا تو اس نے خود کو اسپتال میں پایا۔ اس نے یوگا جاننے والے چھ افسران میں سے ایک کو بلا کر کہا۔ ''وہ لڑکی بہت پراسرار ہے۔ میرا خیال ہے جادو جانتی ہے، یا پھر ٹیلی پیتھی جانتی ہے۔''

اس نے اپنی روداد سنائی۔ اس یوگا کے افسر نے بھی روداد وائس مین کو سنائی۔ اس نے کہا۔ ''ہمیں بہت محتاط رہ کر اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہوں گی۔ اگر وہ نوجوان لڑکی ٹیلی پیتھی جانتی ہے تو یقیناً فرہاد کی بیٹی ہو گی۔''

وائس مین پہلے اچھی طرح یقین کر لینا چاہتا تھا۔ کہ وہ ٹیلی پیتھی جانتی ہے۔ اس نے ایک منصوبہ بنایا کہ عالی کے سامنے کسی خوبرو جوان کو پیش کیا جائے۔ جو اس سے دوستی کر سکے، اور اسے متاثر کر سکے۔ جب وہ عالی کے ساتھ رہے گا تو وائس مین اس جوان کے دماغ میں رہ کر آسانی سے معلوم کر سکے گا کہ وہ ٹیلی پیتھی جانتی ہے یا نہیں؟

عالی نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اب انٹیلی جنس والے اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ لہٰذا دہلی شہر چھوڑ دینا چاہیے۔ یوں بھی وہ ممبئی جا کر پورس، عدنان اور شیوانی کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔

ادھر کچھ روز پہلے وائس مین نے سوات سے آنے والے مراد علی باچا کو اپنا تابعدار بنا لیا تھا۔ جب عالی نے ممبئی جانے کے لیے ایک جہاز کا ٹکٹ لیا تو انٹیلی جنس والوں کو معلوم ہو گیا۔ وائس مین نے مراد کو بھی ممبئی جانے پر مجبور کر دیا۔

اس طرح عالی اور مراد کی ملاقات ایئرپورٹ پر ہوئی۔ وہاں سے ان کا ساتھ ممبئی تک رہا۔ وائس مین نے اس دوران میں مراد سے عجیب غریب حرکتیں کرائیں۔ عالی کو یہ تاثر دیا کہ اگر کوئی لڑکی مراد سے محبت کا اظہار کرتی ہے، اور وہ اس کی طرف مائل ہوتا ہے تو اچانک ہی مرد سے عورت بن جاتا ہے۔

عالی نے اس سے محبت کا اظہار کیا اور وہ بھی اس کی طرف مائل ہوا۔ تو اچانک ہی عورتوں کی طرح بولنے اور ناچنے گانے لگا۔

عالی نے مجھے بلا کر کہا۔ ''آپ ذرا اس کے دماغ میں

جا کر دیکھیں۔ یہ کچھ عجیب وغریب سا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اس کے دماغ پر قبضہ جمائے رکھتا ہے۔ اور اس سے ایسی حرکتیں کرواتا ہے۔''

میں اور عالی اس کے اندر جاتے رہے۔ پھر ممبئی پہنچ کر ہم نے ایک مناسب موقع پر تنویمی عمل کے ذریعے معلوم کرنا چاہا کہ کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا اس کے اندر چھپا ہے یا نہیں؟

وائس مین اس وقت اس کے اندر چھپا ہوا تھا، اس نے ہمارے تنویمی عمل میں مداخلت نہیں کی۔ اس طرح ہمیں یقین ہوگیا کہ وہ مراد علی کسی کا تابعدار نہیں ہے۔

ایک شبہ سا تھا۔ میں نے عالی سے کہا۔ ''تم اس کے ساتھ ممبئی میں رہ سکتی ہو، لیکن پورس کی طرف نہ جانا۔''

یہ بات کھٹک رہی تھی کہ اگر مراد پر کسی نے تنویمی عمل نہیں کیا ہے۔ اسے اپنا تابعدار نہیں بنایا ہے تو وہ اچانک ہی ایسا کیوں ہو جاتا ہے؟ کیوں عورتوں جیسی حرکتیں کرتا ہے؟ جبکہ وہ ذہنی مریض بھی نہیں تھا۔ پھر وہ ابنارمل کیوں ہو جاتا ہے؟ جب تک اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہ آتی تب تک میں مطمئن نہیں ہوسکتا تھا۔

پھر جلد ہی ایسے حالات پیش آئے کہ میں نے وردان کے دماغ پر قبضہ جما لیا۔ اس کے خیالات پڑھنے سے پتا چلا کہ ہندوستان میں ایک امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والے کو بلا کر کس طرح اس سے کام لیا جا رہا ہے۔

یہ معلوم ہوا کہ پارس بہت پہلے ہی اس ٹیلی پیتھی جاننے والے وائس مین کی نظروں میں آچکا ہے۔ اب اس نے عالی کو بھی مراد کے ساتھ دیکھ لیا تھا اور اس کی نگرانی کر رہا تھا۔

انڈین انٹیلی جنس کے چھ یوگا جاننے والے افسران وائس مین سے کہہ رہے تھے کہ فرہاد علی کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی نظروں میں آچکے ہیں تو اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ان دونوں کو اس طرح موت کے گھاٹ اتارنا چاہیے کہ فرہاد کو ہم پر شبہ نہ ہو۔

وائس مین نے کہا۔ ''فرہاد کوئی ننھا بچہ نہیں ہے کہ ہم اسے بے وقوف بنا کر نکل جائیں گے۔ اس کی پوری ہسٹری بتاتی ہے کہ کسی بھی دشمن کی کوئی سازش اس سے چھپی نہیں رہتی۔ جب بھی اسے معلوم ہوگا کہ اس کے بچوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں ہمارا ہاتھ ہے تو وہ اس ملک میں ایسی تباہی لائے گا جس کے بارے میں ابھی تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ پھر وہ میرا پیچھا بھی نہیں چھوڑے گا۔ مجھے تابوت میں سُلا کر ہی دم لے گا۔''

یوگا جاننے والے ایک افسر نے کہا۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ وہ ہماری نظروں میں آچکے ہیں۔ کیا ہم انہیں ایسے ہی معاف کر دیں؟ اور انہیں یہاں اپنی من مانی کرنے دیں؟''

وائس مین نے کہا۔ ''آپ سب یہ دیکھیں کہ وہ آپ کے ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا ہے۔ آپ کے کوئی راز نہیں چرا رہا ہے۔ یہاں اس کے ذاتی معاملات ہیں، وہ اپنے معاملوں سے نمٹ رہا ہے۔''

''کچھ بھی ہو۔ ہم فرہاد اور اس کے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو یہاں برداشت نہیں کریں گے۔''

''میں کب کہتا ہوں کہ انہیں برداشت کرو؟ ہم اعلیٰ بی بی اور پارس کو گن پوائنٹ پر رکھ کر فرہاد کو مجبور کریں گے کہ وہ اپنے پورے خاندان والوں کے ساتھ انڈیا چھوڑ دے۔ اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرے۔''

''کیا وہ ہماری بات مان جائے گا؟''

''بے شک۔ جب وہ دیکھے گا کہ ہم نہایت دوستانہ انداز میں اس سے یہ بات کہہ رہے ہیں، اور اس کی بیٹی اور بیٹے کو گولی نہیں مار رہے ہیں۔ کسی بہانے موت کے گھاٹ نہیں اتار رہے ہیں تو وہ ضرور اپنے تمام بچوں کے ساتھ یہاں سے چلا جائے گا۔''

انہوں نے طے کیا کہ دوسرے دن صبح ہوتے ہی ان کے گھر دں میں گھس کر انہیں گن پوائنٹ پر رکھا جائے گا۔ عالی ممبئی میں مراد علی کے ساتھ تھی۔ اور پارس بھی ممبئی کی طرف آرہا تھا، ان تمام بہن بھائیوں نے سوچا تھا کہ ایک ہی شہر میں دور دور رہیں گے لیکن کبھی کبھی راز داری سے ملاقات کرتے رہیں گے۔

جب میں نے ان سب کو وائس مین کے بارے میں بتایا اور یہ انکشاف کیا کہ وہ سب رفتہ رفتہ انٹیلی جنس والوں کی نظروں میں آرہے ہیں۔ اور دور ہی دور سے ان کی نگرانی کی جارہی ہے تو وہ سب الرٹ ہوگئے۔ عالی پانچ منٹ کے اندر ہی مراد علی کو جھانسا دے کر اس سے دور ہوگئی۔

اس ہوٹل میں اس کی طرح کتنی ہی جوان لڑکیاں اور عورتیں تھیں۔ اس نے فوراً ہی ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے چہرے کو تھوڑا سا تبدیل کیا تھا۔ جب وہ ہوٹل سے نکلی تو اس کی نگرانی کرنے والے جاسوس اسے پہچان نہ سکے۔ یہی سمجھتے رہے کہ وہ مراد کے ساتھ اس کے کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی ہوگی۔

وائس مین ان چھ افسران سے گفتگو میں مصروف تھا۔ جب وہ مراد کے پاس آیا تب پتا چلا کہ چڑیا پنجرے سے اڑ

چکی ہے۔

ممبئی کے تمام پولیس اور انٹیلی جنس والے حرکت میں آگئے، اس ایک نوجوان لڑکی کو پورے شہر میں تلاش کرنے لگے۔

کبریا نے عالی سے کہا۔ ''تم میرے پاس چلی آؤ۔ میں یہاں ایک بوڑھے میاں بیوی کے ساتھ رہتا ہوں۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹی سسرال گئی ہوئی ہے۔ تم ان کی دوسری بیٹی بن کر رہ سکو گی۔ میں نے ان سب کو اپنا تابعدار بنایا ہوا ہے۔ ہم دونوں بہن بھائی اس فیملی میں ایڈجسٹ ہو جائیں گے۔ کوئی بھی انٹیلی جنس والا ہم پر شبہ نہیں کر سکے گا۔''

پارس ایک ٹرین کے ذریعے ممبئی کی طرف آرہا تھا۔ میں اور بابا صاحب کے ادارے سے تعلق رکھنے والے دو ٹیلی پیتھی جاننے والے اس کے دماغ میں پہنچ گئے۔ جس کمپارٹمنٹ میں وہ سفر کر رہا تھا۔ ہم اس کے مسافروں کے اندر پہنچے لگے۔ پتا چلا کہ ان میں سے ایک انٹیلی جنس سے تعلق رکھتا ہے۔ اور پارس کی نگرانی کر رہا ہے۔

اس نے اپنے موبائل فون کے ذریعے اپنے افسران کو یقین دلایا تھا کہ پارس اسی ٹرین سے ممبئی پہنچ رہا ہے۔

ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی، تو ایک ٹیلی پیتھی جاننے والے نے اس کے دماغ پر قبضہ جمایا۔ اسے غائب دماغ بنایا، جب ٹرین چل پڑی تو اس جاسوس نے غائب دماغ رہ کر اپنے موبائل فون کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا، تقریباً پچاس میل دور جانے کے بعد اس کے دماغ کو آزاد چھوڑا گیا۔ تو اس نے چونک کر دیکھا کمپارٹمنٹ میں پارس نہیں تھا۔ اس نے اپنے افسران کو فوراً ہی اطلاع دینا چاہی اپنے موبائل فون کو تلاش کرنے لگا۔ تو وہ اس کے پاس نہیں تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پارس کب اس کے پاس آیا تھا اور کب اس کا فون لے کر ٹرین سے اتر کر کہیں چلا گیا ہے؟ اب اسے نہ کوئی ڈھونڈ سکتا تھا اور نہ ہی دیکھ سکتا تھا۔

ہم پرانے کھلاڑی ہیں۔ ٹیلی پیتھی کی آنکھ مچولی کھیلنا خوب جانتے ہیں۔

☆☆☆

نومی کو کامیابیاں حاصل کرنے میں ذرا دیر لگی تھی لیکن ناکام ہونے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پلک جھپکتے ہی وہ بلندی سے پستی میں آگری ہے۔

اس نے اپنی موت کا بڑا زبردست ڈراما پلے کیا تھا۔ مجھے بیوقوف بنایا تھا۔ ایسا چند دنوں کے لیے ہوا تھا۔ پھر طلسم ٹوٹ گیا تھا۔

اسے یہ سوچ کر افسوس ہو رہا تھا کہ آئندہ وہ سونیا کی جگہ لے کر میری زندگی میں نہیں آسکے گی۔ جتنا زبردست فراڈ اس نے کیا تھا، اتنا ہی میرا اعتماد کھو چکی تھی۔

فی الوقت اس کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ خود کو کس طرح چھپائے؟ وہ جانتی تھی کہ میں اور میرے جاسوس اسے تلاش کر رہے ہوں گے۔

سیون بلڈرز کے جاسوس بھی ہر ملک میں رہا کرتے تھے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی جوان لڑکی کو تلاش کر رہے ہوں گے۔ جس کا چہرہ بگڑا ہوا ہے۔

وہ میڈرڈ سے پیرس گئی تھی اور پیرس سے استنبول پہنچ گئی تھی۔ وہاں ایک مسلمان عورت کی طرح عبایا پہنتی تھی۔ اور چہرے کو اسکارف کے ذریعے ڈھانپ لیتی تھی۔ صرف دو آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔

وہ یہ خوب سمجھتی تھی کہ ہمیشہ خود کو اس طرح چھپا کر نہیں رکھ سکے گی۔ اسے جلد ہی پلاسٹک سرجری کے ذریعے چہرہ تبدیل کرانا ہوگا لیکن پلاسٹک سرجری سے پہلے اسے چہرے پر لگے زخموں کا علاج کرانا تھا۔ چہرے کی ہڈیاں بھی دھنستی رہتی تھیں۔ جب تک ان سب کا علاج نہ ہوتا تب تک وہ ایک چہرے پر دوسرا چہرا نہیں بنوا سکتی تھی۔

اسے یہ اندیشہ رہتا تھا کہ تلاش کرنے والے شہر کے ہر اسپتال اور کلینک وغیرہ میں اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ سستے اور مہنگے ڈاکٹروں تک پہنچ کر معلوم کر رہے ہوں گے کہ کوئی زخمی چہرے والی ان کے زیر علاج ہے یا نہیں؟

اس نے استنبول پہنچ کر ایک بہت ہی مشہور اور معروف اور تجربہ کار ڈاکٹر کو ٹریپ کیا تھا۔ اسے ہپناٹائز کر کے اپنا معمول اور تابعدار بنایا تھا۔ ایک بہت ہی مہنگے علاقے میں چھوٹا بنگلا کرائے پر لیا تھا۔ وہیں وہ ڈاکٹر رات کو چھپ کر آتا تھا۔ اس کا علاج کرتا تھا، پھر رات کے اندھیرے میں ہی واپس چلا جاتا تھا۔

وہ مجھ سے جتنی محبت کرتی تھی۔ اتنی ہی خوفزدہ بھی تھی۔ میں نے اس کا موجودہ لب ولہجہ پہچان لیا تھا۔ یہ اندیشہ رہتا تھا کہ اتفاقاً وہ کبھی دماغی طور پر کمزور ہو گی یا چہرے کی سرجری کراتے وقت جب بہت ہی کمزور ہو جایا کرے گی، تو میں اس کے ذہن پر مسلط ہو جاؤں گا۔ اور اسے اپنی تابعدار بنالوں گا۔

وہ ہر طرف سے الجھی ہوئی تھی۔ ایک تو چہرہ ٹریڈ مارک بن گیا تھا۔ کوئی بھی دشمن اسے دیکھ کر پہچان سکتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے بنگلے میں دن رات چھپ کر رہتی تھی۔ ضرورت کے

وقت باہر نکلتی تو نقاب میں رہتی تھی۔ فوراً ہی واپس چلی آتی۔

اس کی دوسری کمزوری یہ تھی کہ ہم ٹیلی پیتھی جاننے والوں نے اس کی موجودہ آواز اور لب و لہجے کو سن لیا تھا، کسی وقت بھی اس کی دماغی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

اس نے سوچا کہ اگر میں اپنی آواز اور لب و لہجے کو بدل ڈالوں تو پھر کوئی بھی ٹیلی پیتھی جاننے والا مجھے تلاش نہیں کر سکے گا۔ کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اب میرا موجودہ لب و لہجہ کیا ہے؟

اس پہلو سے خود کو چھپانے کے لیے ایسے عامل کی ضرورت تھی جو کامیابی سے اس پر عمل کرتا اور عمل کرنے کے دوران میں اسے دھوکا نہ دیتا۔

ہپناٹائز کرنے والے قابل اعتماد نہیں ہوتے موقع ملتے ہی کسی کو بھی اپنے زیر اثر لے آتے ہیں۔ اسے تابعدار بنا کر اپنے مفاد کے لیے کام لیتے رہتے ہیں۔

کسی ہپناٹائز کرنے والے پر اعتماد کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ پہلے وہ اس عامل کو اپنا تابعدار بنائی اور اس کے بعد وہ عمل کرتا تو پھر اس کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔

وہ کسی تجربہ کار عامل کو تلاش کرنے لگی۔ خیال خوانی کے ذریعے ایسے متعلقہ افراد کے دماغوں میں جانے لگی۔ جو عامل حضرات کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتے تھے۔ آخر وہ ایک ہپناٹائز کرنے والے کے دماغ میں پہنچ ہی گئی۔

وہ ستر برس کا ایک بوڑھا تھا۔ اس عمر میں بھی اچھا خاصا صحت مند تھا۔ آواز میں گھن گرج تھی۔ اس شعبے میں اس قدر تجربہ کار تھا کہ منٹوں میں کسی کو بھی اپنا تابعدار بنا لیتا تھا۔

نومی نے اس کے خیالات پڑھنے کے بعد اسے تھوڑی دیر کے لیے سو جانے پر مائل کیا۔ وہ اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پھر وہ گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

اس کے دماغ میں خاموشی تھی۔ اور بڑی خاموشی سے اسے گہری نیند تک پہنچا دیا گیا تھا۔ پھر وہ بولنے لگی۔ طرح طرح کے سوالات کر کے اطمینان کرنے لگی کہ وہ اس کے زیر اثر آ چکا ہے یا نہیں؟

اس نے مطمئن ہو کر اسے حکم دیا۔ ''آج آدھی رات کے بعد میں تمہیں جہاں بلاؤں گی تم وہاں آؤ گے۔''

اس نے تابعداری سے کہا۔ ''آپ مجھے جہاں بلائیں گی۔ میں وہاں آؤں گا۔''

''تم مجھ پر تنویمی عمل کرو گے اور جو باتیں میں تمہارے ذہن میں نقش کر رہی ہوں۔ صرف وہی باتیں تم میرے ذہن میں نقش کرو گے۔ نہ اس سے زیادہ کہو گے، اور نہ اس سے کچھ کم کہو گے۔''

وہ تابعداری سے تمام باتیں دوہرانے لگا۔ نومی کے وہ احکامات اس کے ذہن میں نقش ہو رہے تھے۔

پھر نومی نے کہا۔ ''جب تم میرے پاس آؤ گے تو میں تمہیں ایک آڈیو کیسٹ دوں گی۔ اس میں ایک عورت کی بہت ہی خوبصورت مترنم آواز ہے۔ تم مجھ پر عمل کرنے کے دوران میں وہ کیسٹ سنو گے، اور اس کی آواز اور لب و لہجہ میرے ذہن میں نقش کرو گے۔''

وہ کہہ رہا تھا۔ اس کے تمام احکامات کی تعمیل کرے گا۔ نومی نے کہا۔ ''ایسا کرنے سے پہلے تم میرے موجودہ لب و لہجے کو میرے ذہن سے مٹا دو گے۔''

وہ بڑی تابعداری سے کہہ رہا تھا کہ اس کے موجودہ لب و لہجے کو مٹا دے گا۔ اور آڈیو کیسٹ سے نیا لب و لہجہ سن کر اسے اس کے ذہن میں نقش کر دے گا۔

آخر میں نومی نے کہا۔ ''مجھ پر تنویمی عمل کرنے کے بعد جب تم واپس جاؤ گے تو مجھے اور میرے بنگلے کو بھول جاؤ گے۔ یہ یاد نہیں رہے گا کہ تم کہاں گئے تھے۔ اور تم نے کیا کیا تھا؟''

اس نے تمام اہم باتیں اس کے دماغ میں نقش کیں، پھر اسے ایک گھنٹے تک تنویمی نیند سونے کے لیے چھوڑ دیا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ وہ دس بجے تنویمی نیند سے بیدار ہو گیا، رات بارہ بجے نومی نے اس کے دماغ پر قبضہ جمایا تو وہ اس کی مرضی کے مطابق اپنی کار ڈرائیو کرتا ہوا اس کے بنگلے کے سامنے پہنچ گیا۔

وہ اسے اپنے بیڈروم میں لے آئی۔ وہاں ایک کیسٹ ریکارڈر دیتے ہوئے بولی۔ ''اس میں وہ کیسٹ ہے جس میں ایک عورت کی بہت ہی مترنم آواز ہے۔ تم عمل کے دوران میں یہ آواز مجھے سنا کر میرے ذہن میں اسے نقش کرو گے۔''

عامل نے وہ کیسٹ ریکارڈر اس سے لے لیا، وہ بولی۔ ''اس سے پہلے تم میرا موجودہ لب و لہجہ میرے ذہن سے بالکل مٹا دو گے۔ کیا تمہیں وہ تمام اہم باتیں یاد ہیں، جنہیں تم تنویمی عمل کے دوران میرے ذہن میں نقش کرو گے؟''

وہ بولا۔ ''مجھے تمہاری ایک ایک بات یاد ہے۔ میں

تمہارے تمام احکامات کی تعمیل کروں گا۔''

وہ اپنے بیڈ پر آکر لیٹ گئی۔ ایسے وقت وہ اس کے خیالات پڑھ رہی تھی۔ اور بار بار اپنے آپ کو اطمینان دلا رہی تھی کہ اس سے کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ وہ پوری طرح اس کا معمول اور تابعدار بنا ہوا ہے۔

اور واقعی وہ تابعدار بن چکا تھا۔ اس نے اس پر عمل کرنا شروع کیا۔ نومی نے جتنی باتیں اس کے ذہن میں نقش کی تھیں۔ وہ تمام باتیں اس کے ذہن میں نقش کرنے لگا۔ پھر اس کے ذہن سے موجودہ لب و لہجے کو مٹانے کے بعد اس نے آڈیو کیسٹ کے ذریعے کسی عورت کی بہت ہی مترنم سی آواز سنائی، اور نومی سے کہا۔ ''اسے سنتی رہو اور اپنے ذہن میں نقش کرتی رہو۔ آیندہ تم اسی آواز میں اور اسی لب و لہجے سے بولا کرو گی۔''

اس نے نومی کی مرضی کے مطابق اس پر ایک کامیاب اور مکمل عمل کیا۔ پھر اسے ایک گھنٹے کے لیے تنویمی نیند سلا دیا۔ اس کے بنگلے سے باہر آکر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ اور وہاں سے اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔

ایک گھنٹے کے بعد نومی نے تنویمی نیند سے بیدار ہو کر سب سے پہلے آئینے کے سامنے آکر خود کو دیکھا پھر اپنی آواز کو سنا تو خوش ہو گئی۔ پچھلے لب و لہجے کو یاد کرنا چاہا تو وہ اسے یاد نہیں آیا۔ اس کی مرضی کے مطابق تنویمی عمل کامیاب رہا تھا۔

اس نے خیال خوانی کے ذریعے اس بوڑھے عامل کے دماغ میں پہنچ کر اسے دیکھا تو وہ گہری نیند سو کر اپنے بیڈ پر سونے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ یہ بھول چکا تھا کہ رات بارہ بجے کہاں گیا تھا؟ کس کے گھر گیا تھا؟ کس سے ملاقات کی تھی؟ اور وہاں کیا کرتا رہا تھا؟ وہ یہ تمام باتیں بھول چکا تھا۔

اب کوئی بھی جاسوس اس کے پاس آتا تو اسے کبھی یاد نہ آتا کہ وہ کبھی کسی جلے ہوئے چہرے والی عورت کے پاس گیا تھا۔ اور اس نے اس پر تنویمی عمل کیا تھا۔ نہ یہ باتیں اسے یاد رہتیں اور نہ وہ کسی سے یہ سب کچھ کہہ پاتا۔ نومی اپنے مقاصد میں کامیاب ہو رہی تھی۔

یہ آزمانا باقی رہ گیا تھا کہ کوئی سابقہ لب و لہجے کے ذریعے اس کے دماغ میں آسکتا ہے یا نہیں؟

وہ مجھے دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی لیکن مجھ سے خوفزدہ بھی تھی۔ میری طرف سے یہ اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں کسی وقت میں اس کی دماغی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے اندر نہ چلا آؤں۔

وہ اپنا موبائل فون اٹھا کر میرے نام میسج لکھنے لگی۔

''ہیلو۔ فرہاد! میں اپنے دماغ کا دروازہ کھول رہی ہوں۔ کیا تم آنا چاہو گے؟''

اس نے یہ مختصر سا پیغام میرے نام ڈیلیور کیا۔ مجھے اپنے فون پر سگنل ملنے لگا۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا پھر آپریٹ کر کے میسج پڑھنے لگا۔ میرے ذہن میں پہلا سوال یہی پیدا ہوا کہ اس نے فون پر بات کیوں نہیں کی؟ میسج کیوں بھیجا؟

پھر دوسرا سوال پیدا ہوا کہ یہ اتنی فراخ دل اور حوصلہ مند کیسے ہو گئی کہ میرے لیے دماغ کا دروازہ کھول رہی ہے؟

جب کوئی دروازہ کھول کر خوش آمدید کہے تو ضرور جانا چاہیے۔ میں نے اس کے لب و لہجے کو گرفت میں لیا اور خیال خوانی کی پرواز کی پھر وہاں پہنچنا چاہا تو میری سوچ کی لہریں بھٹکنے لگیں۔ مجھے اس کا دماغ نہیں مل رہا تھا۔

چشم زدن میں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اس نے اپنا لب و لہجہ بدل لیا ہے، اور خود پر تنویمی عمل کرانے کے بعد پچھلے لب و لہجے کو مٹا دیا ہے۔ اسی لیے اس نے میسج دیا بات نہیں کی۔ اپنا موجودہ نیا لب و لہجہ مجھے نہیں سنایا۔

میں نے فون پر اس کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطے کا انتظار کرنے لگا۔ میں یہ جانتا تھا کہ وہ اپنا لب و لہجہ مجھے نہیں سنائے گی۔ پچھلے لہجے کے ساتھ ہمیشہ کے لیے گم ہو جائے گی۔

دوسری طرف اس کے فون پر بزر کی آواز ابھری۔ دوسری آواز کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ دوبارہ میسج بھیجا ''تم میرے دماغ میں کیوں نہیں آرہے؟ پلیز۔ فون نہ کرو۔ خیال خوانی کے ذریعے رابطہ کرو۔''

میں نے جواباً میسج بھیجا۔ ''تم نے پھر آنکھ مچولی شروع کر دی ہے۔ ایک نامعلوم مدت کے لیے گم ہو رہی ہو۔ بہرحال نیا لب و لہجہ مبارک ہو۔ اگر خدا نے چاہا تو پھر کبھی ٹکراؤ ہوگا۔''

نومی اس میسج کو پڑھ کر مسکرانے لگی۔ اسے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کا پورا یقین ہو گیا۔ آیندہ وہ چہرے کی پلاسٹک سرجری کے مرحلے سے گزرتی۔ اور دماغی طور پر کمزور ہوتی تو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میں یا کوئی دوسرا ٹیلی پیتھی جاننے والا اس کے اندر آسکے گا۔

اس نے کمرے کی کھڑکی کھولی پھر اس موبائل فون کو باہر پھینک دیا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اگر وہ رہتا تو ایسے لوگ اسے فون پر ڈسٹرب کرتے رہتے۔ جن سے اب وہ رابطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

جمائلہ نے سونیا پر تنویمی عمل کرنے کے بعد اسے صبح سات بجے تک سونے کا حکم دیا تھا۔ پھر اس کے بیدار ہونے سے پہلے ہی بنگلے میں آ گئی تھی۔ انتظار کر رہی تھی کہ جاگنے کے بعد اسے اپنی پچھلی زندگی یاد آئے گی یا نہیں؟

وہ تمام بلڈرز بھی رات دیر تک جاگنے کے باوجود صبح جلد ہی بیدار ہو گئے تھے۔ انہیں بھی بے چینی تھی۔ نومی نے صرف جمائلہ کو ہی نہیں ان بلڈرز کو بھی فون کے ذریعے بتایا تھا کہ سونیا ان سے فراڈ کر رہی ہے۔ وہ زہریلی عورت ہے۔ اور جس کا دماغ زہریلا ہوتا ہے، وہ کسی کے تنویمی عمل سے متاثر نہیں ہوتا۔

نومی نے ان کے دلوں میں شک کا بیج بو دیا تھا۔ اس بار جمائلہ نے جو عمل کیا تھا۔ وہ بہت اہم تھا، اس کا نتیجہ دیکھ کر ہی پتا چل سکتا تھا کہ سونیا اب تک ان کی تابعدار بن کر رہی ہے یا فراڈ کرتی رہی ہے۔

اگر وہ جمائلہ کے عمل کے زیر اثر نہ آئی تو آج اسے اپنا ماضی بھی یاد نہیں آئے گا۔ وہ پہلے کی طرح جمائلہ کو اپنی بیٹی اور خود کو اس کی ماں سمجھے گی۔ اسے اپنا شوہر اور بچے یاد نہیں آئیں گے۔

جمائلہ صبح ہوتے ہی تبدیل ہو گئی تھی۔ شاور لے کر لباس تبدیل کر کے بیڈ روم میں آئی تو سات بج چکے تھے۔ سونیا نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ خاموش بیڈ پر چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی۔ اور چھت کو تکتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

وہ اپنے طور پر ایکٹنگ شروع کر چکی تھی۔ جمائلہ نے بیڈ روم سے نکل کر اس پر نظر ڈالی پھر وہیں رک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ اپنی پچھلی زندگی یاد کر رہی ہے۔ اور گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

جمائلہ نے ہولے سے کھنکارتے ہوئے اسے خیالات سے چونکایا۔ تو وہ چونک گئی۔ سر گھما کر جمائلہ کو بڑی ہی اجنبی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جمائلہ نے اس کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ ''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

سونیا نے پوچھا۔ ''بیٹی! تم کون ہو؟''

جمائلہ اندر سے خوش ہو گئی۔ اس کا تنویمی عمل کامیاب رہا تھا۔ وہ اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے بولی۔ ''معلوم ہوتا ہے آپ کی یادداشت واپس آ رہی ہے۔ اور یہ بھول رہی ہیں کہ یادداشت گم ہونے کے بعد آپ کے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے؟''

سونیا نے پوچھا۔ ''میرے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے؟''

''آپ بہت بیمار ہو گئی تھیں۔ آپ کو ایک سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس کے زہر نے ایسا اثر کیا تھا کہ آپ اپنے تمام رشتے داروں کو حتیٰ کہ خود کو بھول گئی تھیں۔''

سونیا نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

''میرا نام جمائلہ ہے۔ آپ العقیلہ کے ایک اسپتال میں زیر علاج تھیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہاں آپ کے ساتھ کیا حالات پیش آئے؟ آپ اسپتال سے فرار ہو گئی تھیں۔ راستے میں میری کار سے ٹکرائیں تو میں آپ کو اپنے گھر لے آئی۔ بہت کچھ پوچھتی رہی لیکن آپ اپنے بارے میں کوئی جواب نہ دے سکیں تب میری سمجھ میں آ گیا کہ آپ کی یادداشت گم ہو گئی ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا اس وقت بھی میں العقیلہ میں ہوں؟''

اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ آپ اس وقت پرتگال کے شہر لزبن میں ہیں۔ یہ میرا بنگلا ہے۔''

''کیا تم مجھے وہاں سے یہاں لائی ہو؟''

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں۔ آپ بالکل تنہا اور بے یار و مددگار تھیں۔ میں آپ کو یہاں لا کر پچھلے ایک ہفتے سے آپ کا علاج کرا رہی ہوں۔ ڈاکٹر بہت اچھا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ رفتہ رفتہ آپ کی یادداشت واپس آ جائے گی۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ آپ اپنے بارے میں بہت کچھ یاد کر رہی ہیں؟''

سونیا نے کہا۔ ''ہاں۔ مجھے اپنے بارے میں بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔''

جمائلہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے۔ اب آپ مجھے بتا سکیں گی کہ آپ کو کیا یاد آ رہا ہے؟ آپ کون ہیں؟ آپ کا اصل نام کیا ہے؟''

وہ بولی۔ ''میرا نام سونیا ہے۔ میں مسز فرہاد ہوں۔ کیا تم نے فرہاد علی تیمور کا نام سنا ہے؟''

جمائلہ نے ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا۔ ''وہ تو بہت ہی مشہور و معروف ٹیلی پیتھی جاننے والے ہیں۔ میں نے ان کے اور بابا صاحب کے ادارے کے بارے میں بہت کچھ پڑھا اور سنا ہے۔ میں اکثر سوچتی رہتی ہوں کہ بابا صاحب کے ادارے میں کیسا ایمان افروز ماحول ہو گا۔ جی چاہتا ہے، فوراً ہی اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔''

پھر وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ کہنے لگی۔ ''اوہ سوری۔ میں اپنے ہی جذبات میں بہہ رہی تھی۔ مجھے آپ

کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلوم کرنا چاہیے۔ تاکہ آپ کو آپ کے گھر تک اور رشتے داروں تک پہنچا دوں۔''

''شکریہ۔ تم بہت کم سن ہو۔ اتنی سی عمر میں دوسروں کے لیے کتنے نیک جذبات رکھتی ہو۔ مجھے العقیلہ سے یہاں لاکر میرا علاج کرانی رہیں۔ یہ تمہارا احسان ہے۔ مجھے اپنی پچھلی زندگی یاد آرہی ہے۔ اور اب تم مجھے گھر تک پہنچانے کی بھی بات کررہی ہو۔ میں تمہارا جتنا بھی احسان مانوں کم ہے۔''

وہ سونیا کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''آپ ایسی باتیں کرکے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ کو دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے میری کھوئی ہوئی ماں مجھے مل گئی ہے۔ میں آپ سے اسی لیے متاثر ہوئی ہوں اور اپنے دل میں آپ کے لیے بے انتہا محبت محسوس کرتی ہوں۔ آیندہ بھی کرتی رہوں گی۔ جی چاہتا ہے، ساری زندگی آپ کے ساتھ ہی گزار دوں۔''

سونیا نے پوچھا۔ ''کیا تم اس دنیا میں بالکل تنہا ہو؟ تمہارا کوئی نہیں ہے؟''

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''میرا کوئی نہیں ہے۔ اسی لیے تو محبت سے آپ کی طرف کھنچی چلی آتی ہوں۔''

سونیا نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو میں تمہیں اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی۔ کیا تم میری فیملی میں میرے ساتھ چلو گی؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ آپ ابھی کہیں گی تو ابھی چل پڑوں گی۔''

''تم تنہا کیسے زندگی گزارتی ہو؟ یہاں کیا کرتی رہتی ہو؟''

''یہاں سیون بلڈرز نامی ایک بہت بڑی تنظیم ہے۔ میں ان کی ملازم ہوں۔ انہوں نے مجھے رہنے کے لیے بنگلا دیا ہے اور ماہانہ پچیس ہزار ڈالرز دیتے ہیں۔ جو مجھ جیسی تنہا لڑکی کے لیے کافی ہیں۔''

''آیندہ تمہیں کہیں ملازمت کرنی نہیں پڑے گی۔ تم میرے ساتھ رہو گی۔ اور ساری زندگی عیش کرو گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ بھی رہوں گی۔ مگر ان سیون بلڈرز کے ساتھ بھی رہنا ضروری ہے۔ یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ جب میرا کوئی نہیں تھا۔ میں تنہا تھی تو انہوں نے بزرگ اور سرپرست بن کر مجھے پناہ دی اور عزت و آبرو سے زندگی گزارنے کا موقع دیا۔''

''پھر تو یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ ٹھیک ہے انہیں کبھی نہ چھوڑنا لیکن پہلے میرے ساتھ چلو گی۔ اور میری فیملی سے ملو گی۔''

''کیا میں آپ کو اپنی ممی کہہ سکتی ہوں؟''

''ممی نہیں۔ مجھے مما کہو۔ میرے تمام بچے مجھے یہی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ جب میں نے تمہیں بیٹی کہہ دیا ہے تو تم بھی مجھے یہی کہہ کر مخاطب کرو گی۔''

جمائلہ نے ذرا اداس ہوکر سر کو جھکا لیا۔ سونیا نے اسے غور سے دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ کیا مما کہنا پسند نہیں ہے؟''

''نہیں مما! یہ بات نہیں ہے۔ وہ..... دراصل بات یہ ہے کہ آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، میں کیسے بتاؤں کہ میں کیا ہوں؟''

وہ سوالیہ نظروں سے جمائلہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم کیا ہو؟ ایسی کیا پریشانی کی بات ہے جو مجھے بتا نہیں پارہی ہو؟''

''میں کیا بتاؤں۔ سوچتی ہوں بتاؤں گی تو آپ مجھ سے نفرت کریں گی۔''

وہ اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر بولی۔ ''پھر تو تمہیں بتانا ہی ہوگا۔ جب میں نے بیٹی کہا ہے تو تم جیسی بھی ہو میں کبھی تم سے نفرت نہیں کروں گی۔ چلو بولو۔ بات کیا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''دراصل۔ میں دوہری زندگی گزارتی ہوں۔ دن کو کچھ ہوتی ہوں، اور رات کو کچھ ہو جاتی ہوں۔''

وہ اتنا کہہ کر چپ ہوئی تو سونیا نے کہا۔ ''وضاحت کرو۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ دن کو کچھ ہونا اور رات کو کچھ ہونا کیا ہوتا ہے؟''

''میں دن کو نماز، روزہ کی پابند رہتی ہوں۔ کلام پاک کی تلاوت کرتی ہوں۔ اور میری کوشش ہوتی ہے کہ میری ذات سے کسی دوسرے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اور میں زیادہ سے زیادہ نیکیاں کماتی رہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''لیکن ایسا صرف دن کے وقت ہی ہوتا ہے۔ رات کے وقت میں اس کے بالکل برعکس ہو جاتی ہوں۔ بت پرست بن جاتی ہوں۔ ابوالہول کے بت کی پوجا کرتی ہوں ...وہ مجھے طرح طرح کی قوتیں اور صلاحیتیں دیتا ہے۔ میں اتنی خطرناک ہو جاتی ہوں کہ لوگ مجھ سے خوف کھانے ہیں۔ اتنی طاقتور ہو جاتی ہوں کہ اپنا سر کسی دیوار سے ٹکراتی ہوں تو وہاں شگاف ڈال دیتی ہوں۔ بڑے بڑے شہزوروں کی ہڈی پسلیاں توڑ دیتی ہوں۔ کیا آپ یقین کریں گی؟''

سونیا اسے دیکھ رہی تھی۔ سن رہی تھی۔ انکار میں سر ہلا کر

بولی۔ ''یہ یقین کرنے والی بات نہیں ہے۔''

''آج رات آپ میرے ساتھ رہیں گی تو آنکھوں سے دیکھیں گی۔ تب یقین آجائے گا۔''

سونیا نے ذرا بے چینی سے کہا۔ ''آج رات.....؟''

جمائلہ نے پوچھا۔ ''کیوں۔ کیا ہوا؟''

''میں جلد سے جلد اپنے شوہر اور بچوں سے ملنا چاہتی ہوں۔ ان سے رابطہ ہوتے ہی یہاں سے جانا چاہوں گی۔ آج رات یہاں نہیں رہ سکوں گی۔ بلکہ تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گی۔''

''آپ مجھے جہاں بھی ساتھ لے جائیں گی۔ رات کے وقت میں ایسی ہی تبدیل ہو جایا کروں گی۔ ایک بات اور آپ کو سمجھانا چاہتی ہوں۔ پلیز۔ اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔''

''تم مجھے کیا سمجھانا چاہتی ہو؟''

''یہ کہ جب میں رات کو تبدیل ہو جاؤں تو آپ میرے مزاج کے خلاف کبھی کوئی بات نہ بولیں۔ اور نہ ہی مجھے کسی بات پر غصہ دلائیں۔ ہمیشہ محبت سے پیش آتی رہیں گی تو میں صبح تک بالکل بیٹی بن کر رہوں گی۔ ورنہ۔ دشمن بن جاؤں گی۔''

سونیا نے حیرانی سے کہا۔ ''یہ کیسی عجیب بات ہے کہ تم اتنے جذبوں سے میری بیٹی بن رہی ہو۔ میرے ساتھ یہاں سے جانا چاہتی ہو۔ اور یہ بھی کہتی ہو کہ رات کے وقت اگر میں تمہارے مزاج کے خلاف کچھ بولوں گی تو تم دشمن بن جاؤ گی؟''

''مما! میں اس وقت بہت مجبور ہو جاتی ہوں۔ جب کسی بات پر غصہ دلایا جاتا ہے تو میں جنون میں مبتلا ہو کر کچھ نہیں سوچتی۔ جو مجھے غصہ دلاتا ہے اسے میں بڑی درندگی سے مار ڈالتی ہوں۔''

سونیا نے کہا۔ ''اوہ گاڈ! پھر تو میں تمہیں کبھی غصہ نہیں دلاؤں گی۔ صبح تک پیار اور محبت سے پیش آتی رہوں گی۔''

وہ اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔ ''شکریہ مما! آپ بہت اچھی ہیں۔ میں چاہتی ہوں، صرف رات کے وقت میرے منفی رویوں کو برداشت کرلیں۔ میرے والدین بھی برداشت کرتے رہتے تھے۔ کیا آپ ایسا نہیں کریں گی؟''

''کیوں نہیں بیٹی! میں ایسا ضرور کروں گی۔ کیا میری ایک بات مانو گی؟''

''ایک نہیں ہزار باتیں مانوں گی۔ آپ حکم کریں، میں تعمیل کروں گی۔''

''کیا میرے ساتھ بابا صاحب کے ادارے میں چلو گی؟''

اس نے چونک کر سر اٹھاتے ہوئے سونیا کو دیکھا۔ وہ اس کے دل کی بات کہہ رہی تھی۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''مما! یہ تو آپ میرے دل کی بات کہہ رہی ہیں۔ میں ابھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

سونیا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ابھی کوئی فلائٹ یہاں سے پیرس جائے گی؟''

''نہیں۔ فلائٹس کے بارے میں معلوم کرنا ہوگا۔ جونہی پہلی فلائٹ پیرس جاتی ہوگی ہم اس میں جا سکتے ہیں۔ میں ابھی بلڈرز کے پاس جا رہی ہوں، ان سے کہوں گی تو وہ فوراً ہی ہمارے لیے سیٹیں ریزرو کرا دیں گے۔''

''تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں تمہیں بابا صاحب کے ادارے میں کیوں لے جانا چاہتی ہوں؟''

''میں تو پہلے ہی آپ کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کر چکی ہوں کہ اس ادارے میں جانے کے لیے بہت بے چین رہتی ہوں۔''

''ہاں۔ تمہارے جذبات اپنی جگہ ہیں لیکن میں تمہیں اس لیے لے جا رہی ہوں کہ وہاں تمہارا روحانی علاج ہو سکتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو رات کے وقت شیطانی اعمال کو بھول جاؤ گی۔ دن کی طرح رات کو بھی ایک مسلمان، عبادت گزار لڑکی بن کر رہو گی۔''

وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''مما! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اب آپ اٹھیں اور واش روم جا کر شاور لیں۔ لباس تبدیل کریں۔ میں ناشتا تیار کر رہی ہوں۔ اس کے بعد اپنی ڈیوٹی پر چلی جاؤں گی۔ پھر دو چار گھنٹوں میں واپس آ کر آپ کے ساتھ وقت گزاروں گی۔''

وہ بیڈ سے اتر کر واش روم کی طرف جانے لگی۔ اس وقت میں، الپا اور کرونا اس کے پاس پہنچے ہوئے تھے۔ جب وہ باتھ میں جانے لگی تو ہم اس کے دماغ سے نکل گئے۔ آدھے گھنٹے بعد آئے تو وہ شاور لے چکی تھی اور لباس تبدیل کرنے کے بعد جمائلہ کے ساتھ بیٹھی ناشتا کر رہی تھی۔

کرونا نے کہا۔ ''مما! آپ بڑی کامیابی سے یہ ڈراما پلے کر رہی ہیں۔ جمائلہ بہت خوش ہے کہ اس کا تنویمی عمل کامیاب رہا ہے۔''

الپا نے کہا۔ ''میں تو یہ سوچ کر خوش ہو رہی ہوں کہ اب آپ یہاں سے چلی جائیں گی۔ جمائلہ کو اپنے ساتھ بابا

صاحب کے ادارے میں لے جائیں گی تو اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ آپ اس کے جنون سے اور غیظ و غضب سے محفوظ رہیں گی۔''

میں نے کہا۔ ''جائلہ ابھی سیون بلڈرز کے پاس جا کر تمہارے بارے میں بڑی تفصیلی گفتگو کرے گی۔ ایک بات اچھی طرح یاد رکھو کہ تم اسے رات کے وقت یہاں سے نہیں لے جا سکو گی۔ وہ شیطانی قوتوں کے زیر اثر رہے گی، بابا صاحب کے ایمان پرور ماحول میں جانا نہیں چاہے گی۔''

سونیا نے کہا۔ ''درست کہتے ہو۔ میں نے اس اہم پہلو پر توجہ نہیں دی تھی۔''

اس نے چائے کا ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ ''جائلہ! تم اپنے بلڈرز سے کہنا کہ وہ رات کے وقت جانے والی کسی بھی فلائٹ میں ہماری سیٹ او کے نہ کرائیں۔ ہم دن کے وقت ہی یہاں سے روانہ ہوں گے۔''

اس نے پوچھا۔ ''رات کے وقت جانے میں کیا قباحت ہے؟''

سونیا اسے تفصیل بتانا نہیں چاہتی تھی۔ کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''رات کے وقت اس ادارے کا صدر دروازہ کسی کے لیے کھولا نہیں جاتا ہے۔ ہم یہاں سے دن کے وقت روانہ ہوں گے۔ پیرس تک دو ڈھائی گھنٹے کا سفر ہوگا۔ پھر وہاں سے ایک گھنٹے کے اندر ہم بابا صاحب کے ادارے میں پہنچ جائیں گے۔''

وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں کل دن کی کسی فلائٹ میں دو سیٹیں او کے کرا دوں گی۔''

وہ ناشتا کرنے اور چائے پینے کے بعد اس سے رخصت ہو کر بلڈرز کی طرف چلی گئی۔ الپا نے کہا۔ ''ہم نہیں جانتے کہ وہاں بلڈرز کے ساتھ اس کی کیا باتیں ہوں گی؟ وہ تو نومی سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ انہوں نے اپنے اطراف سخت حفاظتی انتظامات کر رکھے ہیں۔ صرف یوگا جاننے والے ہی سکیورٹی گارڈز ان کے قریب آتے ہیں۔ اور ان کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔''

کرونا نے کہا۔ ''فی الوقت ہم مجبور ہیں۔ کسی کو آلہ کار بنا کر وہاں پہنچا نہیں سکتے۔ اور ان کی گفتگو نہیں سن سکتے۔''

میں نے کہا۔ ''ان کی باتیں سننا ضروری نہیں ہے۔ جب جائلہ یہاں آئے گی تو ساری باتیں سونیا کو بتائے گی۔''

سونیا نے کہا۔ ''مجھے یہ معلوم ہے کہ جائلہ نے ادارے میں جانے کا منصوبہ بلڈرز کے ساتھ رات کو بنایا تھا۔ اس وقت اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ آج اگر رات کو جانا ہوا تو واقعی وہ اعتراض کرے گی۔''

میں نے کہا۔ ''ایسے امکانات ہیں۔ آج تم نے اس سے کھل کر یہ بات کہی ہے کہ تم اس کا روحانی علاج کرنے کے لیے اسے بابا صاحب کے ادارے میں لے جا رہی ہو۔ یہ بات شیطانی قوتوں کے منافی ہے۔ وہ قوتیں اسے وہاں نہیں جانے دیں گی۔''

سونیا۔ ''ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ دیکھتے ہیں، آج رات کیا ہوتا ہے؟''

جائلہ بلڈرز کے درمیان پہنچ گئی تھی۔ وہ سب خوش ہو کر اسے مبارکباد دے رہے تھے کہ اس نے بڑی کامیابی سے سونیا پر تنویمی عمل کیا ہے۔ اور اسے اس کی پچھلی زندگی یاد دلائی ہے۔

جائلہ نے کہا۔ ''اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ میڈم سونیا نے خود ہی اپنی زبان سے کہا ہے، وہ مجھے اپنے ساتھ بابا صاحب کے ادارے میں لے جائیں گی۔ اب آپ کل ہی دن کی کسی فلائٹ میں ہمارے لیے دو سیٹیں.. او کے کرا دیں۔''

ایک بلڈر نے فوراً ہی فون کے ذریعے ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کیا پھر ان کے لیے سیٹیں کنفرم کرانے لگا۔ دوسرے بلڈر نے خوش ہو کر کہا۔ ''آج ہم بہت بڑی کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ تم کل تک بابا صاحب کے ادارے میں داخل ہو جاؤ گی۔ اوگاڈ! ہم نے وہاں قدم رکھنے کی کتنی کوششیں کیں؟ کیسے کیسے ہتھکنڈے آزمائے؟ لیکن ہمیشہ ناکام ہوتے رہے۔ اس بار کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ اور تمہارے قدم اس ادارے کے اندر پہنچیں گے۔''

بلڈر فور نے کہا۔ ''وہ کم بخت ٹیلی پیتھی جاننے والی جو تمہیں تابعدار بنانا چاہتی تھی اور سونیا کو ہلاک کر دینا چاہتی تھی، وہ کہہ رہی تھی کہ سونیا مکاری دکھا رہی ہے۔ تمہیں اور ہمیں دھوکا دے رہی ہے۔ تمہارے تنویمی عمل کے زیر اثر نہیں آتی ہے۔''

جائلہ نے کہا۔ ''وہ بدترین دشمن تھی۔ اس کا جھوٹ کھل چکا ہے۔ میں بابا صاحب کے ادارے سے واپس آتے ہی اسے تلاش کروں گی، اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

بلڈر ٹو نے کہا۔ ''جائلہ! ہم نے جو سمجھایا ہے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ اس ادارے میں پہنچتے ہی تمہاری پہلی کوشش یہی ہوگی کہ تم کسی بھی طرح وہاں کے ریکارڈ روم میں پہنچ جاؤ۔ تمہیں ایسے اہم راز ملیں گے جنہیں وہ ادارے

والے تمام بڑے ممالک اور دنیا والوں سے چھپا کر رکھتے ہیں۔''

بلڈرتھری نے کہا۔ ''وہاں تمہیں ٹرانسفارمر مشین کا پورا نقشہ اور اس کی تفصیلات بھی ملیں گی۔ تم ان کی مائیکرو فلم بنا کر لے آؤ گی پھر یہاں ہم ایک ٹرانسفارمر مشین تیار کر کے اپنے ٹیلی پیتھی جاننے والے پیدا کریں گے۔''

بلڈر ٹو نے کہا۔ ''پھر تم دوسری توجہ ان کی سائنس لیبارٹری پر دو گی۔ وہاں اس دوا کا فارمولا ہوگا، جسے اسپرے کرنے سے ٹیلی پیتھی جاننے والے خیال خوانی کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔''

بلڈر سکس نے کہا۔ ''وہاں اس ادارے کا نقشہ موجود ہوگا۔ اندر اور باہر کی ایک ایک تفصیل اس نقشے میں ہو گی وہاں چور دروازے بھی ہوں گے۔ انڈر گراؤنڈ خفیہ راستے بھی ہوں گے۔ تم یہ سب کچھ رات کے وقت اپنی پُراسرار قوتوں کے ذریعے حاصل کر سکو گی۔''

بلڈر ٹو نے کہا۔ ''یہ سارے کام تمہیں چوبیس گھنٹوں کے اندر کرنے ہیں۔ اگر زیادہ وقت لو گی، وہاں زیادہ رہو گی تو کسی کو بھی تم پر شبہ ہو سکتا ہے۔ اگر تم نے آدھی کامیابی حاصل کی اور بعد میں پکڑی گئیں تو اس آدھی کامیابی سے بھی محروم ہو جاؤ گی۔ لہٰذا چوبیس گھنٹے پورے ہونے سے پہلے ہی تم اس ادارے سے نکل آؤ گی۔''

''میری یہی کوشش ہوگی۔ آپ سب اطمینان رکھیں۔''

بلڈر نو نے کہا۔ ''ہم طرح طرح کے منصوبے بنا رہے ہیں لیکن یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کوئی بچوں کا پلے گراؤنڈ نہیں ہے۔ باباصاحب کا ادارہ ہے۔ بڑے ممالک اپنی سرچ لائٹ کے ذریعے بھی وہاں کی کوئی تصویر نہیں اتار سکتے۔ کوئی راز چرا نہیں سکتے۔ پتا نہیں وہ لوگ کیسی روحانی قوتوں کے مالک ہیں؟ تم سے اس لیے امید کی جا رہی ہے کہ تم بھی پُراسرار قوتوں کی مالک ہو۔ دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا کر سکو گی؟''

وہ تقریباً دو گھنٹوں تک ان کے درمیان بیٹھی رہی۔ طرح طرح کی پلاننگ ہوتی رہی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''میڈم سونیا وہاں تنہا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ رہنا ہے۔ میں آپ سے فون پر رابطہ کرتی رہوں گی۔''

وہ وہاں سے سونیا کے پاس آ گئی۔ سونیا نے کہا۔ ''بچوں کے ساتھ بھی میری باتیں ہو گئی ہیں۔ اور بہت سی باتیں ہوئی ہیں۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ ان کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کرنا چاہتی ہوں۔''

''میں آپ کو خوب شاپنگ کراؤں گی۔ جتنی مہنگی چیزیں خریدنا چاہیں بے فکر ہو کر خریدیں۔ اور انہیں باباصاحب کے ادارے میں لے جائیں۔''

سونیا نے انکار کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ باباصاحب کے ادارے میں ہم باہر سے ایک تنکا بھی نہیں لے جا سکیں گے۔ ہمارے پاس صرف اپنے ہینڈ بیگز ہوں گے۔ ان میں ہمارے ملبوسات اور ضرورت کی چیزیں ہوں گی۔''

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ''پھر آپ اتنی ساری شاپنگ کر کے کہاں لے جائیں گی؟''

''پیرس میں ایک جھیل کے کنارے ہمارے کئی کاٹیج ہیں۔ ان میں ایک میرا اور فرہاد کا کاٹیج بھی ہے۔ فرہاد ہمیں ریسیو کرنے ایئرپورٹ آئیں گے۔ وہاں سے ہم اس کاٹیج میں جائیں گے۔ بچوں کے تمام تحائف وہاں رکھیں گے۔ اس کے بعد باباصاحب کے ادارے کی طرف روانہ ہوں گے۔''

وہ بنگلے سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھ کر ایک بہت بڑے شاپنگ پلازا میں آ گئیں۔ اور وہاں کئی گھنٹوں تک شاپنگ کرتی رہیں۔ جب واپس آنے لگیں تو شام ہونے والی تھی۔

جمائلہ نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ ''اب ہم بلڈر ٹو کے بنگلے میں جا رہے ہیں۔ کیونکہ میری تبدیلی کا وقت ہو رہا ہے۔''

اس نے یہ نہیں بتایا کہ تبدیلی کے وقت وہ بلڈر ٹو کے بنگلے میں کیوں جا رہی ہے؟ ویسے سونیا جانتی تھی کہ اس بنگلے کی انیکسی میں ابوالہول کا بت رکھا ہوا ہے۔ اسی لیے وہ ادھر جا رہی ہے۔

تمام بلڈرز اس بنگلے میں پہنچ گئے تھے۔ انہیں اطلاع مل گئی تھی کہ وہ میڈم سونیا کو لے کر آ رہی ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد اس نے سونیا سے کہا۔ ''آپ ان تمام بلڈرز سے پہلے مل چکی ہیں۔ کیا آپ کو کچھ یاد آ رہا ہے؟''

سونیا نے ان تمام بلڈرز سے باری باری مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سوری۔ میں بھول چکی ہوں۔ آپ لوگ مائنڈ نہ کریں۔''

ان میں سے ایک نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کو اپنی پچھلی زندگی یاد آ گئی ہے اور کل آپ اپنی فیملی سے ملنے جا رہی ہیں۔''

شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ تاریکی پھیل رہی تھی۔ جمائلہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی اس ہال سے باہر

چلی گئی۔ سب اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ بنگلے سے باہر آکر دوڑنے کے انداز میں چلنے لگی۔ انیکسی کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپری حصے میں آئی۔ وہاں ایک کمرے میں ابوالہول کا بت اونچی جگہ پر رکھا ہوا تھا۔ ہرشام اسے دیکھتے ہی ایسا لگتا تھا، جیسے صدیوں بچھڑنے کے بعد اس سے مل رہی ہو۔ دل اس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔

وہ اس کی طرف کھنچی چلی آئی۔ سر جھکا کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر زیرلب کچھ پڑھتی ہوئی اس کی مناجات کرنے لگی۔ پھر کہنے لگی۔ ''میں تیری داسی ہوں۔ تیری پجارن ہوں۔ تیرے بغیر نہیں رہ سکتی لیکن ایک ضروری کام کے لیے کل جاؤں گی۔ پھر پچیس یا تیس گھنٹوں کے اندر واپس تیرے پاس چلی آؤں گی۔''

اس بات کے ساتھ ہی بادل گرجنے لگے۔ بجلیاں کڑکنے لگیں۔ جبکہ باہر کا موسم بالکل ٹھیک تھا۔ لیکن اس کے اندر ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں جاؤں گی.....''

پھر وہ چیختی ہوئی آواز میں بولی۔ ''نہیں۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گی.....''

ایسا کہتے وقت اس کی آنکھیں سرخ انگارا ہو رہی تھیں وہ اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ہاں۔ اب میری عقل میں بات آرہی ہے۔ میں وہاں جاکر بہت بڑی غلطی کروں گی۔''

اس کے اندر بادل گرج رہے تھے۔ بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ تیز ہوا کے جھکڑ جیسے اسے اڑا لے جانا چاہتے تھے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''نہیں۔ میں وہاں جاؤں گی تو وہ میرا روحانی علاج کریں گے۔ اور مجھے تجھ سے دور کردیں گے۔ ہرگز نہیں۔ میں اپنی جان دے سکتی ہوں لیکن تجھ سے دور نہیں ہوسکتی.....''

وہ ایک جھٹکے سے پلٹ گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی انیکسی سے باہر آئی۔ احاطے کے ایک حصے سے گزر کر بنگلے کے ہال میں داخل ہوگئی۔ سونیا اور تمام بلڈرز نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ان کے قریب آتے ہوئے غصے سے گھور رہی تھی۔ پھر دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''تم سب میرے دوست ہو یا دشمن.....؟''

سونیا نے کہا۔ ''بیٹی! یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں صرف دوست ہی نہیں، تمہاری ماں بھی ہوں۔''

وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''تم جھوٹ بول رہی ہو۔ مجھے میرے ابوالہول سے دور کرنے والا کوئی بھی میرا دوست نہیں ہوسکتا۔ تم مجھے اس سے دور لے جانا چاہتی ہو۔ تم میری ماں نہیں ہوسکتیں۔''

بلڈر ٹو نے کہا۔ ''لیکن جمائلہ! تم خود ہی ابوالہول سے دور ہوکر اس ادارے میں جانے کے لیے راضی ہوئی ہو۔''

''ہاں۔ لیکن اس وقت مجھے وہ سچ معلوم نہ ہوسکا تھا جو اب معلوم ہو رہا ہے۔''

اس نے سونیا کی طرف ایک ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ۔ یہ عورت..... یہ مجھے اس ادارے میں لے جاکر میرا روحانی علاج کرانا چاہتی ہے۔ مجھے میرے ابوالہول سے ہمیشہ کے لیے دور کردینا چاہتی ہے۔''

پھر وہ سونیا کی طرف پلٹ کر بولی۔ ''بولو! کیا تم ایسا چاہتی ہو؟ کیا تم زندہ نہیں رہنا چاہتیں؟''

سونیا پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''میرے قریب نہ آؤ۔ میں تمہارے ابوالہول سے تمہیں دور نہیں کرنا چاہتی۔ تم اس ادارے میں جانے کے لیے راضی تھیں۔ اسی لیے میں تمہیں لے جانا چاہتی تھی۔''

وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر بولی۔ ''ہاں۔ میں راضی تھی۔ وہاں ضرور جاتی لیکن مجھے تمہاری سازش معلوم ہوچکی ہے۔ تم روحانی عمل کے ذریعے وہاں مجھے زیر کرنا چاہو گی۔ اور جب میں زیر ہوجاؤں گی تو پھر مجھے وہاں سے کبھی باہر نہیں آنے دو گی۔ نہ میں وہاں سے نکل سکوں گی، نہ اپنے ابوالہول کی... پرستش کرسکوں گی۔ کبھی اسے دیکھ نہیں پاؤں گی۔''

تمام بلڈرز سونیا کے آس پاس اور سامنے آگئے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''اس جھگڑے کو یہیں ختم کردو۔ نہ تم بابا صاحب کے ادارے میں جاؤ گی اور نہ کوئی تم پر روحانی عمل کرسکے گا۔ اب غصہ تھوک دو۔''

سونیا نے ان بلڈرز سے کہا۔ ''آپ ہم ماں بیٹی کے بیچ نہ بولیں۔ جب میری بیٹی کو وہاں جانا منظور نہیں ہے تو پھر یہ نہیں جائے گی۔''

تمام بلڈرز دور ہٹ گئے۔ سونیا نے آگے بڑھ کر اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لیے پیش کیا۔ پھر کہا۔ ''میں نے تمہیں اپنی بیٹی بنایا ہے۔ تم سے دشمنی نہیں کروں گی۔ کیا اپنی ماں سے ہاتھ ملاؤ گی؟''

جمائلہ کا غصہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سونیا سے ہاتھ ملایا۔ تمام بلڈرز خوش ہوکر تالیاں بجانے لگے۔ ایسے وقت وہ اچانک ہی ساکت ہوگئی۔ جس طرف دیکھ رہی تھی، اسی طرف دیکھتی رہ گئی۔ تمام تالیاں بجانے والے خاموش ہوکر اسے تکنے لگے۔ یہ سمجھ میں آرہا تھا کہ اسے آگہی

مل رہی ہے۔

سونیا نے بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ بے شک اسے آگہی مل رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ دن کا وقت ہے، اس نے پورا لباس پہنا ہوا ہے۔ اور سونیا کے ساتھ ایک طیارے میں سوار ہو رہی ہے۔

پھر منظر بدل گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایسی جگہ پہنچی ہوئی ہے جہاں ایک بہت ہی خوبصورت سی مسجد ہے، دارالعلوم ہے، سائنس لیبارٹری ہے، ریکارڈ روم ہے۔

منظر ایک بار پھر بدل گیا۔ اس نے دیکھا ایک بہت ہی پُرنور چہرے والے بزرگ ہاتھ میں تسبیح تھامے اس کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دے رہے ہیں۔

وہ اچانک ہی چیخ مار کر ایکدم سے تن گئی۔ آگہی کی... پُراَسرار دنیا سے باہر آگئی۔ چیختی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ ''نہیں چھوڑوں گی..... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ یہ مجھے اس ادارے میں لے جانے والی ہے۔ مجھے آگہی مل چکی ہے۔ اور میری آگہی کبھی غلط نہیں ہوتی۔''

تمام بلڈرز سہم کر ذرا دور ہو گئے تھے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کہاں ہے وہ.....؟ کہاں چلی گئی؟ مجھ سے بچ کر کہاں جائے گی؟''

پیچھے سے سونیا کی آواز سنائی دی۔ ''میں بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

وہ ایک دیوار کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ جمائلہ نے پلٹ کر دیکھا۔ پھر اس پر نظر پڑتے ہی، ایک جمپ لگاتی ہوئی اس کی طرف ایسے آئی جیسے آندھی آتی ہے۔

سونیا بھی کالی آندھی تھی۔ اپنا داؤ کھیلتے وقت دیکھنے والوں کو دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس نے جیسے ہی جمپ لگائی وہ فرش پر گر کر پھسلتی ہوئی اس کے نیچے سے نکل گئی۔ اس کی شیطانی رفتار جیسے دو سو میل فی منٹ کے حساب سے تھی۔ وہ اتنی تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی دیوار سے ٹکرا گئی۔ ایک دھماکا سا ہوا اور اس دیوار میں شگاف پڑتا چلا گیا۔

تمام بلڈرز ان سے دور کھڑے ہوئے تھے، سہم کر حیرانی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ پہلی بار جمائلہ کو بھی تکلیف کا احساس ہوا۔ اس سے پہلے وہ سوچ سمجھ کر دیوار پر سر مارتی تھی اور شگاف پیدا کر دیتی تھی۔ اس بار توقع کے خلاف انجانے میں ٹکرائی تھی۔ اس لیے تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔

سونیا نے اس پر حملہ نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ مار کھا گئی تھی۔ اس بات نے اسے اور زیادہ جنون میں مبتلا کر دیا۔ اس نے چیخیں مارتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ سونیا کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ''میں یہاں ہوں.....''

اس بار وہ ایک آئرن سیف سے لگی کھڑی تھی۔ لوہے کی وہ الماری چھ فٹ چوڑی اور چھ فٹ اونچی تھی۔ وہ جب بھی جنون میں مبتلا ہوتی تھی تو اس کے سامنے شکار بے بس ہو جایا کرتے تھے۔ ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ شکار ایک بار ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔

وہ کوئی تربیت یافتہ فائٹر نہیں تھی۔ بس جنون میں مبتلا ہو کر بے تکے حملے کرتی تھی۔ اس بار بھی اس نے تیزی سے جمپ لگائی۔ پہلے کی طرح تیزی سے چیختی ہوئی سونیا کی طرف جھپٹی۔ اس کے قریب آنے سے ایک سیکنڈ پہلے ہی سونیا اچھل کر اس کے سر پر سے ہو کر قلابازی کھاتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔

نتیجہ ظاہر تھا۔ اس بار وہ لوہے کی الماری سے ٹکرائی تھی۔ شیطانی قوتوں کے باوجود آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ سر اور بدن کی ہڈیاں پھوڑے کی طرح دکھنے لگیں۔ وہ کراہتی ہوئی پیچھے کی طرف الٹ کر فرش پر گر پڑی۔

اس بار وہ فوراً ہی اٹھ نہ سکی۔ اسے سونیا کی آواز سنائی دی۔ ''میں نے تمہیں پیار سے سمجھایا، منایا لیکن تم ماننا نہیں چاہتی تھیں۔ جو بھوت باتوں سے نہیں مانتے وہ لاتوں سے مان جاتے ہیں۔''

جمائلہ نے بڑی مشکل سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میری ایک لات پڑے گی تو تم بولنے کے قابل نہیں رہو گی۔ جو دل فرہاد کے لیے دھڑکتا ہے، اسے میں ایک پل میں ہی تمہارے سینے سے نوچ کر نکال لوں گی۔''

سونیا کی ہنسی سنائی دی۔ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''تم ابھی بچی ہو۔ جاؤ! آرام کرو۔ کل دن کی روشنی میں سمجھاؤں گی۔''

جمائلہ کا سر چکرا رہا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا۔ اسے بہت پہلے یہ آگہی ملی تھی کہ سونیا سے اس کا مقابلہ ہوگا۔ اور وہ پہلی عورت ہوگی جو شیطانی قوتوں کو مات دے گی۔

بلڈرز نے اپنے چھ مسلح گارڈز کو بلا لیا تھا۔ وہ سب دروازے کے پاس آ کر، اپنے ہتھیار تان کر کھڑے ہو گئے تھے۔ جمائلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ چیخ کر بولی۔ ''کہاں ہے وہ؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

بلڈر ٹو نے کہا۔ ''تھوڑی دیر کے لیے میڈم سونیا کو بھول

جاؤ۔ پہلے ہماری بات توجہ سے سنو۔ تم ہمیشہ سے دیکھتی آرہی ہو کہ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ ہمیشہ تمہاری بات مانتے آئے ہیں۔ آج تم ہماری بات مان لو۔ صرف ایک بات مان لو۔ سونیا کو اپنے دل و دماغ سے نکال دو۔ کیونکہ وہ اپنی پچھلی زندگی یاد کر چکی ہے۔ اس کا شوہر فرہاد علی تیمور اور اس کے ٹیلی پیتھی جاننے والے بچے سب اس سے رابطہ کر چکے ہیں۔''

بلڈر فائیو نے کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ فرہاد کے پاس ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی فوج ہے۔ اگر سونیا کو ذرا سا بھی نقصان پہنچاؤ گی تو وہ صرف تمہیں نہیں، ہم سب کو تباہ کر دیں گے۔ کیا تمہاری وفاداری اسی دن کے لیے ہے کہ تم ہم سب کو تباہ کر دو؟''

وہ ذرا نرم پڑتے ہوئے بولی۔ ''میری آگہی کہہ رہی ہے کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح اس ادارے میں لے جائے گی۔ اگر میں اسے مار ڈالوں تو پھر وہ مجھے نہیں لے جا سکے گی۔''

''تم ہم پر بھروسا کرو، ہم وعدہ کرتے ہیں، وہ کبھی تمہیں یہاں سے نہیں لے جائے گی۔ اور تم بھی اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لو گی کہ تمہیں اس کے ساتھ نہیں جانا ہے تو پھر تم بھی نہیں جاؤ گی۔''

بلڈر فور نے کہا۔ ''اور اگر اس کے ساتھ جاؤ گی تو تم خود ہی عقل سے سوچو کہ یہ تمہارا قصور ہوگا۔ اس کی غلطی نہیں ہو گی۔''

وہ دونوں مٹھیاں بھینچے کھڑی ہوئی تھی۔ غصے سے تنی ہوئی تھی لیکن پہلے کی نسبت غصہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ جاؤں گی تو یہ میری غلطی ہوگی۔ اور میں کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گی۔ آج پہلی بار اپنی ہی ملنے والی آگہی کو چیلنج کرتی ہوں کہ جو کچھ دیکھا ہے، اسے پورا نہیں ہونے دوں گی۔''

وہ ایک بلڈر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اور اگر وہ مجھے گن پوائنٹ پر لے جانا چاہے گی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

بلڈر ٹو نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ تم ہماری بات مان رہی ہو۔''

''اس لیے مان رہی ہوں کہ اس ادارے میں جانے کی پلاننگ ہم نے ہی کی تھی۔ اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ سونیا کے ساتھ وہاں جاؤں گی تو میرا روحانی علاج کرایا جائے گا۔ میں نے غصے اور جنون میں نہیں سوچا تھا، اب سوچ رہی ہوں، سمجھ رہی ہوں کہ جب میں خود وہاں جانا نہیں چاہوں گی تو سونیا مجھے زبردستی نہیں لے جا سکے گی۔ پھر بھی چاہتی ہوں کہ اس خطرناک عورت کو یہاں سے دور بھگا دیا جائے۔''

بلڈر تھری نے کہا۔ ''ہم ابھی اسے حکم دیتے ہیں کہ وہ اس شہر سے چلی جائے۔ بلکہ ہائی وے کے راستے اس ملک سے ہی چلی جائے۔''

بلڈر تھری نے اس کے دماغ کو زیادہ سے زیادہ ٹھنڈا رکھنے کے لیے فوراً ہی فون پر سونیا سے رابطہ کیا اور کہا۔ ''میڈم! ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کے خلاف ایک فیصلہ کر رہے ہیں۔ آپ کو ابھی اس فیصلے پر عمل کرنا ہوگا۔''

پھر وہ جمائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے فون پر بولا۔ ''آپ کو ابھی اسی لمحے ہائی وے کے راستے پُرتگال کا بارڈر کراس کرنا ہوگا۔ اس ملک کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے جانا ہوگا۔''

اس بلڈر نے خاموش رہ کر دوسری طرف کی باتیں سنیں پھر کہا۔ ''تھینک یو میڈم! اس میں آپ ہی کی بہتری ہے اگر اس ملک میں دوبارہ واپس آئیں گی تو مس جمائلہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑیں گی۔''

اس نے دوسری طرف کی کچھ باتیں سننے کے بعد فون کو بند کر دیا۔ پھر جمائلہ سے کہا۔ ''میڈم دوبارہ تم سے مقابلہ کر کے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتیں۔ وہ خود ہی اپنی سلامتی کے لیے یہاں سے جانا چاہتی ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں تم سے ایک درخواست کر رہی ہیں۔''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''اب وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے؟''

''وہ کہہ رہی ہیں کہ رات کے وقت یہاں سے پُرتگال اور اسپین کے بارڈر تک بہت لمبا تھکا دینے والا سفر ہوگا۔ وہ کل صبح کسی فلائٹ سے جانا چاہتی ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو وہ یہاں سے ابھی ایئرپورٹ جا کر سیٹ ریزرو کرا لیں گی اور وہیں رات گزاریں گی پھر صبح پہلی فلائٹ سے چلی جائیں گی۔''

وہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی بلڈر ٹو نے کہا ''مس جمائلہ! وہ پہلے ہی تمہاری احسان مند ہیں کہ تم انہیں العقیلہ سے یہاں لا کر علاج کرا رہی تھیں۔ اور تمہاری وجہ سے ان کی یادداشت واپس آئی ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ ان پر ایک احسان اور کر دو۔ انہیں اس ملک میں رات گزارنے دو۔ وہ صبح ہوتے ہی پیرس چلی جائیں گی۔''

دوسرے بلڈرز نے بھی اسے سمجھایا کہ وہ سونیا پر احسان کرے گی تو فرہاد علی تیمور کی فیملی سے اس کے اچھے تعلقات رہیں گے۔

وہ بولی۔ ''اچھی بات ہے۔ اس سے کہو کہ وہ آدھے گھنٹے کے اندر میرا بنگلا چھوڑ کر ایئر پورٹ چلی جائے۔''

ان سب نے اسے راضی کرلیا۔ سونیا نے اپنے مخالفین سے نہ کوئی معافی مانگی تھی اور نہ کوئی گذارش کی تھی۔ وہ ایک رات اس شہر میں رہنے کے لیے جمائلہ سے اجازت لینے کی محتاج نہیں تھی۔

اس وقت بلڈر تھری اور سونیا کے درمیان فون پر کچھ اور باتیں ہوئی تھیں لیکن بلڈر تھری نے جمائلہ پر یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ اس شہر میں ایک رات گزارنے کے لیے اس کی اجازت طلب کررہی ہے۔ اصل بات یہ طے پائی تھی کہ کسی بھی طرح یہ رات گزار لی جائے، صبح ہوتے ہی جمائلہ تبدیل ہو جائے گی۔ اس وقت یہ غصہ اور جنون نہیں رہے گا ابوالہول کی کشش بھی نہیں رہے گی اور سونیا اسے سمجھا بجھا کر بڑی سہولت سے بابا صاحب کے ادارے میں لے جاسکے گی۔

وہ تمام بلڈرز اس سلسلے میں سونیا سے اس لیے تعاون کر رہے تھے کہ جمائلہ کو اس ادارے میں بھیج کر اپنے منصوبوں کے مطابق اس سے کام لے سکیں۔

جمائلہ نے آدھے گھنٹے بعد اپنی پُراسرار صلاحیتوں کے ذریعے دیکھا۔ سونیا اس بنگلے کو چھوڑ چکی تھی۔ اور ایئر پورٹ کے ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ مطمئن ہو کر اپنی عادت کے مطابق رات گزارنے کے لیے نائٹ کلب کی طرف چلی گئی۔

صبح تبدیل ہو کر اپنے بنگلے میں آئی تو وہ بنگلا سونیا کے وجود سے خالی تھا۔ اس وقت چونکہ اس کا من مزاج بدل چکا تھا۔ اس لیے سونیا کی عدم موجودگی سے دل دکھنے لگا، پچھتا کر سوچنے لگی کہ اس نے پچھلی رات کیوں اس سے دشمنی کی تھی اور اسے مار ڈالنا چاہا تھا؟

اس نے غسل کرنے کے بعد لباس تبدیل کیا پھر جائے نماز پر آکر نماز ادا کرنے لگی۔ آخر میں دعا کے لیے ہاتھ بلند کر کے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر کہنے لگی۔ ''یا خدا! یہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟ میڈم سونیا نے درست کہا تھا، بابا صاحب کے ادارے میں میرا روحانی علاج ہوگا تو میں بالکل ہی تبدیل ہو جاؤں گی۔ رات کے وقت بھی اسی طرح ایک مسلمان اور عبادت گزار بن کر رہوں گی۔''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ''مجھے اس ادارے میں جا کر اپنے آپ کو تبدیل کرنے کا بہت اچھا موقع مل رہا تھا۔ افسوس! ---- میں نے وہ موقع گنوا دیا۔ یا اللہ تعالیٰ! میں کیا کروں؟ میڈم سونیا ابھی ایئر پورٹ میں ہوں گی۔ کیا میں ان کے ساتھ یہاں سے چلی جاؤں؟''

اب اس کے خیالات مثبت تھے۔ اب وہ مسلمان تھی۔ صراطِ مستقیم پر چلنے والی تھی۔ اس لیے سچے اور سیدھے راستے پر چلنے کے سلسلے میں سوچ رہی تھی اور دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ رہی تھی۔

اسی لمحے میں مدد مل گئی۔ پیچھے سے سونیا کی آواز سنائی دی۔ ''اللہ تعالیٰ نے تمہاری دعا قبول کرلی ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔''

اس نے فوراً ہی دعا کو مختصر کیا پھر منہ پر ہاتھ پھیرتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی۔ پلٹ کر سونیا کو دیکھا تو ایکدم سے تڑپ کر مما کہتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ وہ بھی شعلہ ہوتی تھی، کبھی شبنم ہو جایا کرتی تھی۔ ان لمحات میں ایک ماں سے لپٹ کر شبنم رو رہی تھی۔

تمام بلڈرز جمائلہ کو بابا صاحب کے ادارے میں بھیجنے کی پلاننگ پر عمل کررہے تھے۔ لیکن ذہنی طور پر الجھے ہوئے بھی تھے۔ آپس میں بحث کررہے تھے کہ جمائلہ کا وہاں جانا فائدہ مند ثابت ہوگا یا نہیں.....؟

سونیا کی اس بات نے صرف جمائلہ کو ہی نہیں، ان تمام بلڈرز کو بھی الجھا دیا تھا کہ وہاں اس کا روحانی علاج ہوگا۔

وہ تمام بلڈرز روحانیت کو نہیں مانتے تھے لیکن دل میں ایک اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اگر اس کا روحانی علاج کامیاب ہو گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آرہی تھی کہ علاج کامیاب ہوگا تو جمائلہ تبدیل ہو جائے گی، شر پسندی سے باز آجائے گی جناب علی اسد اللہ تبریزی سے متاثر ہو جائے گی۔ پھر ان کے ہی احکامات کی تعمیل کرے گی اور تمام بلڈرز کی پلاننگ کو بھول جائے گی۔ ان کے لیے وہاں کے اہم راز چرا کر نہیں لائے گی۔

ایک بلڈر نے کہا۔ ''ہمیں مایوس ہو کر نہیں سوچنا چاہیے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ رات کے وقت وہ بالکل تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت اسے دینِ اسلام متاثر نہیں کرتا ہے۔ اگر کرتا تو قاہرہ میں بے شمار مسجدیں تھیں، وہ شام کو ابوالہول کی طرف جانے کے بجائے کسی مسجد میں چلی جاتی تو وہیں اس کا روحانی علاج ہو جاتا۔ پھر وہ شیطانی مزاج کی

اور شیطانی قوتوں کی حامل نہ رہتی۔''

وہ روحانیت کو نہیں مانتے تھے۔اس لیے خود کو یقین دلانے لگے کہ اس کا روحانی علاج کیا جائے گا تو کامیاب نہیں ہوگا۔وہ پیدائشی طور پر جیسی ہے، ویسی ہی رہے گی۔

وہ سب جمائلہ اور سونیا کو سی آف کرنے ایئرپورٹ آئے۔وہاں بلڈرٹو نے جمائلہ کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

''ہم ایک مدت کے بعد تمہارے ذریعے اس ادارے میں سُرنگ بنا رہے ہیں۔تم ایک بہت ہی اہم فرض ادا کرنے جا رہی ہو۔''

وہ بولی۔''مجھے اپنا یہ اہم فرض یاد رہے گا۔''

''تم یہ بھی مانتی ہو کہ ہم تمہیں جبراً نہیں بھیج رہے ہیں۔ تم ہمارے منصوبے سے متفق ہو کر اپنی مرضی سے وہاں جا رہی ہو۔رات کو تبدیل ہونے کے بعد ہمارے خلاف بھی یہ نہ سوچنا کہ ہم تمہارا روحانی علاج کرانا چاہتے ہیں۔''

''میں ایسا نہیں سوچوں گی۔کیونکہ آپ سب تو اس ادارے کی کمزوریاں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔اور مجھے وہاں کے اہم راز چرانے کے لیے بھیج رہے ہیں۔میں آپ لوگوں سے متفق ہو کر جا رہی ہوں۔''

''تمہارے دل میں کسی طرح کا اندیشہ تو نہیں ہے؟''

وہ بولی۔''اندیشہ تو ہے۔میرے اندر ایک شیطانی خیال پیدا ہوتا رہتا ہے کہ مجھے اس ادارے میں نہیں جانا چاہیے۔ابھی میڈم کے ساتھ جانے سے انکار کر دینا چاہیے لیکن میں ایک مسلمان ہوں۔خدا سے ڈرتی ہوں۔میرے اندر یہ ایمانی جذبہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مجھے صراطِ مستقیم پر چلاتا ہوا اس ادارے تک لے جا رہا ہے تو مجھے ضرور جانا چاہیے۔''

سونیا دوسرے بلڈرز سے باتیں کر رہی تھی۔میں نے سوچ کے ذریعے کہا۔''بلڈرٹو جمائلہ کو ایک طرف لے جا کر نہ جانے کیا باتیں کر رہا ہے؟ان لوگوں کے ارادے ڈانواڈول ہو رہے ہیں۔ایسا نہ ہو کہ جمائلہ کو جانے سے روک دیں۔''

وہ سوچ کے ذریعے بولی۔''ایسا نہیں ہوگا۔ان لوگوں کو پہلی بار اس ادارے میں سُرنگ بنانے کا موقع مل رہا ہے۔ انہیں پورا یقین ہے کہ جمائلہ وہاں سے کامیاب لوٹے گی۔''

جمائلہ واپس آ گئی۔فلائٹ کی روانگی کا وقت ہو رہا تھا۔ لہٰذا سب سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ دونوں اندر آئیں۔ وہاں سے بورڈنگ کارڈ حاصل کر کے طیارے میں اپنی سیٹوں پر آ کر بیٹھ گئیں۔اب ان کے راستے میں کسی طرح کی بھی کوئی رکاوٹ پیدا ہونے والی نہیں تھی۔اس وقت میں، الپا اور کرونا سونیا کے اندر موجود تھے۔جب وہ جہاز وہاں سے روانہ ہوا تو میں نے سونیا سے کہا۔''میں جا رہا ہوں۔وہاں دماغی طور پر حاضر رہوں گا۔دو گھنٹے بعد جہاز وہاں پہنچنے والا ہے۔اب پیرس کے ایئرپورٹ پر ملاقات ہوگی۔''

میں دماغی طور پر حاضر ہو گیا۔ایئرپورٹ جانے کی تیاری کرنے لگا۔اس وقت میں جھیل کے کنارے والے کاٹیج میں تھا۔کچھ دیر بعد ہی لباس تبدیل کر کے باہر آ گیا۔

وہاں جھیل کے کنارے دور تک بے شمار کاٹیجز بنے ہوئے تھے۔ان میں سے چھ کاٹیج ہمارے تھے۔ایک میرے اور سونیا کے لیے تھا۔باقی پارس، پورس، اعلیٰ بی بی اور کبریا کے لیے تھے۔ایک کاٹیج کو گیسٹ ہاؤس کے طور پر رکھا تھا۔ تاکہ ہم میں سے کسی کا بھی مہمان وہاں آ کر رہ سکے۔

میں کار میں آ کر بیٹھ گیا پھر اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتا ہوا ایئرپورٹ کی طرف جانے لگا۔جہاز کی آمد کے لیے ایک گھنٹا رہ گیا تھا۔اور میں ایک گھنٹے سے پہلے ہی وہاں پہنچنے والا تھا۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ سونیا اور جمائلہ کے راستے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔وہ سیدھی ادھر آنے والی تھیں لیکن میرے راستے میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔آگے جا کر پتا چلا کہ میری گاڑی کی بریک کام نہیں کر رہی ہے۔اس وقت میں ایسے راستے پر تھا، جو ڈھلان کی طرف جا رہا تھا۔ایسے راستے پر کسی بھی صورت سے گاڑی روکنا ممکن نہیں تھا۔ڈھلان کے باعث رفتار مزید بڑھ گئی تھی۔

میں پریشان ہو کر کبھی ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔ کبھی عقب نما آئینے میں پیچھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔اور کبھی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔آگے پیچھے دائیں بائیں گاڑیاں گزرتی جا رہی تھیں۔اور مجھے ان گاڑیوں سے کترا کر بڑی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھتے رہنا تھا۔میں ڈرائیونگ میں مہارت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔لیکن کب تک کرتا رہتا؟

آگے جا کر میری کار ایک بھاری بھرکم ٹرک سے ٹکرا گئی۔ایک دھماکا سا ہوا، ونڈ اسکرین کے شیشے ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے میری طرف آئے۔اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

کسی کو کب کیسا حادثہ پیش آ جائے یہ وقت سے پہلے کوئی نہیں جان سکتا۔میں بھی انجانے میں ایک ایسے حادثے سے دوچار ہو گیا' جس نے مجھے عارضی طور پر بے دست و پا بنا دیا۔میں نہیں جانتا کہ کن لوگوں نے مجھے اسپتال پہنچایا؟ اور

میں کب تک بے ہوش پڑا رہا؟

ادھر سونیا جمائلہ کو لے کر پیرس پہنچنے والی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ کون انہیں ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے والا تھا؟ سونیا نادان بچی نہیں تھی۔ وہ جمائلہ کو بابا صاحب کے ادارے تک لے جا سکتی تھی لیکن میں بھی تو نادان بچہ نہیں تھا۔ پھر ایئرپورٹ تک کیوں نہ پہنچ سکا؟

ہم سب طاقتور ہونے اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہونے کے باوجود تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا بنے رہتے ہیں۔ ابھی میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ تقدیر کو کیا منظور ہے؟ سونیا جمائلہ کو بابا صاحب کے ادارے تک پہنچا سکے گی یا نہیں؟

میں ابھی اپنا، سونیا کا اور جمائلہ کا ذکر کروں گا۔ لیکن اس سے پہلے نومی کرسٹل کا ذکر کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ کیونکہ میری یہ طویل داستان ایک نئے اور عجیب موڑ پر آ رہی ہے۔

☆☆☆

نومی کرسٹل ہر پہلو سے مطمئن ہو گئی تھی۔ اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرانے کے دوران جب وہ دماغی طور پر کمزور ہوتی تو ہم میں سے کوئی اس کے اندر نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اس قدر اطمینان حاصل کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ جلد سے جلد چہرے کو تبدیل کیا جائے۔ اس کا بگڑا ہوا چہرہ اس کی پہچان بن گیا تھا۔ وہ اس پہچان کو بھی مٹا دینا چاہتی تھی۔ چہرے کے تمام عیب ختم ہو جاتے، وہ تبدیل ہو جاتی تو ہر پہلو سے مطمئن ہو جاتی۔ پھر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مکمل آزادی کے ساتھ کہیں بھی جا سکتی تھی۔

وہ اس آخری مرحلے سے گزر کر تمام وسوسوں اور اندیشوں کو اپنے دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک ماہر سرجن کو ٹریپ کیا۔ اسے پلاسٹک سرجری میں مہارت حاصل تھی۔ وہ بگڑے ہوئے چہروں کو نہایت حسین بنا دیا کرتا تھا۔

اس کے خیالات نے بتایا کہ چند گھنٹوں کی محنت سے سرجری مکمل ہو جائے گی۔ نومی نے حساب لگایا کہ اگر وہ سرجری کے دوران میں دو گھنٹوں تک بے ہوش رہے گی تو ہوش میں آنے کے بعد شاید چار یا چھ گھنٹے تک دماغی کمزوری میں مبتلا رہے گی۔ خیال خوانی کے قابل نہیں رہے گی۔ اور نہ ہی پرائی سوچ کی لہروں کو محسوس کر سکے گی۔ یعنی دس گھنٹوں تک دماغی کمزوری میں مبتلا رہنے کے بعد پھر رفتہ رفتہ توانائی حاصل کرے گی۔

اس نے پہلی بار بڑے دکھ سے سوچا۔ ''آہ! کاشف جمال میرا کس قدر وفادار ماتحت تھا۔ اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہتا تھا۔ میں نے صرف ایک فائدے کے لیے اس کی جان لے لی۔ اور وہ مفاد بھی حاصل نہ کر سکی۔''

ایسے برے وقت میں کاشف جمال اسے یاد آ رہا تھا۔ آج وہ موجود ہوتا تو دماغی کمزوری کے دوران میں اس کی حفاظت کرتا رہتا۔ اب ایسا کوئی نہیں تھا جس پر وہ بھروسا کرتی۔

بہرحال سرجری تو لازمی تھی۔ اس نے ماہر سرجن کو اپنا معمول اور تابعدار بنا کر حکم دیا کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے سرجری کے ذریعے اس کے چہرے کو تبدیل کر دیا جائے۔ اور جب تک اس کا کام مکمل نہ کرے، اس وقت تک وہ کسی بھی دوسرے کام میں مصروف نہ رہے۔

اس سرجن نے دوسرے دن اپنا کلینک بند کر دیا۔ بند کلینک میں نومی کو بے ہوش کرنے کے بعد اس کے چہرے کی سرجری کرنے لگا۔ نومی نے اپنی آواز اور لب و لہجہ تبدیل کرانے کے بعد تمام خیال خوانی کرنے والوں کا راستہ روک دیا تھا۔ اس کی بے ہوشی کے دوران میں کوئی اس کے اندر نہیں آ سکتا تھا۔ اور نہ ہی سرجری کے دوران کوئی مداخلت کر کے اس سرجن کو روک سکتا تھا۔

بس ایک تقدیر ہے جو کسی کی بھی ٹھوس اور مستحکم تدبیر کو ناکام بنا دیتی ہے۔ آدمی کرتا کچھ ہے، ہوتا کچھ ہے۔ نومی کے ساتھ بھی کچھ ہونے والا تھا۔ جس سے وہ ابھی بے خبر تھی۔

وہ تقریباً دو گھنٹے تک بے ہوش رہی۔ جب ہوش میں آئی تو بے حد کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''میں نئے چہرے کی مبارکباد دیتا ہوں۔ کیا اپنا چہرہ دیکھنا چاہو گی؟''

اس نے ہولے سے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر ایک بڑا سا آئینہ لے کر اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے سر گھما کر وہاں دیکھا تو اپنے عکس کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔ بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا، جیسے اپنے آپ کو نہیں کسی اجنبی حسین دوشیزہ کو دیکھ رہی ہو۔

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''یہ۔ یہ میں ہوں؟''

''ہاں۔ چہرے کو چھو کر دیکھو۔ اور آئینے کو دیکھو۔ یہ تم ہی ہو۔''

وہ آئینے میں اپنے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ اور چہرے کو چھو کر یقین کر رہی تھی کہ پہلے خوب تھی، اب خوب تر ہو گئی ہے۔ نیا چہرہ حسین بھی تھا اور نہایت پُرکشش بھی تھا۔ کوئی بھی

سامنے سے گزرنے والا اسے ایک نظر دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

اس نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا۔ پھر فیس سے دوگنی رقم دیتے ہوئے کہا۔ ''میں بہت کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ ڈرائیونگ نہیں کرسکوں گی۔ مجھے گھر تک پہنچادو۔''

اس ڈاکٹر نے اسے اس کے بنگلے تک پہنچادیا۔ وہ ایک معمول اور تابعدار کی حیثیت سے اس کا کام کر رہا تھا۔ نومی نے تنویمی عمل کے ذریعے اس کے ذہن میں یہ بات نقش کی تھی کہ جب پلاسٹک سرجری مکمل ہوجائے گی۔ اور اس سلسلے کا کوئی کام باقی نہیں رہے گا تو وہ اپنے گھر پہنچ کر سو جائے گا نیند پوری ہونے کے بعد جب بیدار ہوگا تو یہ بھول چکا ہوگا کہ اس پر تنویمی عمل کیا گیا تھا۔ اور اس نے کسی لڑکی کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کی تھی۔

نومی نے اپنے بنگلے میں پہنچ کر پھلوں کا جوس تیار کیا۔ توانائی حاصل کرنے کے سلسلے میں جوس کے ساتھ ڈاکٹر کی دی ہوئی دوائیں استعمال کیں۔ پھر بیڈروم میں آکر بستر پر لیٹ گئی۔ اسے امید تھی کہ چار چھ گھنٹے بعد توانائی حاصل ہوجائے گی۔ اس نے پچھلا فون پھینک کر ایک نیا موبائل فون خرید لیا تھا۔ ہم میں سے کوئی اس نئے فون کا نمبر نہیں جانتا تھا۔ اس نے اب تک اس نئے نمبر کے ذریعے کسی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ رابطہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

بیڈ پر لیٹتے ہی کمزوری کے باعث نیند آنے لگی۔ ایسے ہی وقت وہ ایکدم سے چونک گئی۔ سرہانے رکھے ہوئے فون کا بزر بول رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ بڑی حیرانی سے فون کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے کسی کو اپنا نیا نمبر نہیں دیا تھا پھر کون اسے کال کر رہا تھا؟

اس نے فون کو اٹھا کر نمبر پڑھے تو وہ کوئی نیا نمبر تھا۔ کوئی اجنبی کال کر رہا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ پھر کہا۔ ''ہیلو.....؟''

دوسری طرف سے جو آواز سنائی دی، اسے سنتے ہی کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ میری آواز تھی، میرا لب ولہجہ تھا۔ ''تم نے میری آواز سے مجھے پہچان لیا ہوگا؟''

وہ شدید حیرانی سے بولی۔ ''تم.....؟''

''ہاں میں ہوں۔ کیا کانوں سے سن کر بھی یقین نہیں ہو رہا ہے؟''

''تم۔ تمہیں یہ نمبر کہاں سے ملا؟''

''تم نے تو چھپنے کے ہزار جتن کر لیے اور کامیاب بھی رہی ہو لیکن مجھ سے نہ چھپ سکیں۔''

''پلیز۔ مجھے بتاؤ۔ تمہیں میرا نمبر کیسے معلوم ہوا؟''

''جس ڈاکٹر نے تمہارے چہرے کی سرجری کی ہے۔ میں اس سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ تم اس پر تنویمی عمل کر رہی تھیں۔ اس وقت میں بھی اس کے اندر پہنچا ہوا تھا۔ تمہاری آواز اور لب ولہجہ سن رہا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ تم اس سے سرجری کرانے والی ہو۔''

یہ سنتے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپریشن کے دوران میں بے ہوش ہوگئی تھی اور دماغی کمزوری میں تو اب تک مبتلا ہوں۔ تو تم میرے دماغ میں بھی آسکتے ہو؟''

''بے شک۔ آسکتا ہوں۔ لیکن آنہیں رہا ہوں۔ سوچا کہ اچانک آؤں گا تو خوف کے مارے تمہارا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ اسی لیے پہلے فون پر بول رہا ہوں۔''

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ دماغی طور پر کمزور ہے، فرہاد علی تیمور اس کے اندر آسکتا ہے پھر بھی وہ یقین نہیں کرنا چاہتی تھی۔

بے یقینی سے بولی۔ ''سچ بتاؤ۔ کیا تم میرے اندر آسکتے ہو؟''

''آسکتا ہوں۔ لیکن کسی حسینہ کے اندر بغیر اجازت نہیں آنا چاہیے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ کیا اجازت ہے؟''

''تم میری دماغی کمزوری کا مذاق اڑا رہے ہو۔ میں اجازت نہ دوں تب بھی تم جب چاہو گے اندر چلے آؤ گے۔ اور میں تمہیں روک نہیں پاؤں گی۔''

''تم ڈرتی کیوں ہو؟ زندگی میں کسی نہ کسی کو تو اپنا ساتھی بنانا ہی پڑتا ہے۔ اس پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔ اگر تم مجھے چاہتی ہو۔ میری دیوانی ہو تو پھر مجھے دماغ کے اندر آنے دو۔ میں صرف تمہارے دل کا نہیں تمہارے دماغ کا بھی مالک بننا چاہتا ہوں۔''

وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ ''اب تو تم بن کر ہی رہو گے۔ میں لاکھ کوشش کے باوجود بھی تمہیں روک نہیں پاؤں گی۔''

اس کا موبائل فون بند ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس نے میری آواز اپنے اندر سنی۔ ''آخر میں تمہارے اندر پہنچ ہی گیا۔ تم مجھے چاہتی بھی ہو، اور مجھ سے گھبراتی بھی ہو۔ آئندہ گھبرانا چھوڑ دو گی۔ عورت اس دنیا میں مرد کے زیر اثر رہنے کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ جب سونیا جیسی ناقابل شکست عورت میری برتری تسلیم کرتی ہے تو تمہیں بھی تسلیم کرلینا چاہیے۔ اور آج سے تم یہی کرو گی۔''

وہ عاجزی سے بولی۔ ''تم مجھے اپنی معمولہ اور تابعدار بناؤ گے۔ تو میں سونیا کے سامنے بھی بے بس ہو کر رہوں گی۔ میں نے اس سے بھی دشمنی کی ہے، اس کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔ اب وہ انتقام لے گی۔''

''فکر نہ کرو۔ وہ تم سے انتقام نہیں لے گی۔ اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دو۔ اور آنکھیں بند کرلو۔''

میں اس کے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ وہ میرے کسی بھی حکم سے انکار نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے مجبوراً آنکھیں بند کر لیں۔ جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ خود کو میرے حوالے کر دیا۔ میں نے ذرا سی دیر میں خیال خوانی کے ذریعے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔

میں نے اسے ٹرانس میں لانے یعنی اپنے زیر اثر لانے کے بعد کہا۔ ''بتاؤ۔ میں کون ہوں؟''

اس نے کہا۔ ''تم فرہاد علی تیمور ہو۔''

میں نے کہا۔ ''بے شک۔ میں فرہاد ہوں۔ لیکن وہ نہیں ہوں، جس سے تم اب تک ملتی رہی تھیں اور بولتی رہی تھیں۔ میں فرہاد کا ہمزاد ہوں۔''

وہ نومی کے ذہن میں ایسی بات نقش کر رہا تھا۔ جو ناقابل یقین تھی۔ چونکہ وہ معمولہ اور تابعدار بن چکی تھی۔ لہٰذا پلٹ کر اپنے عامل سے سوال نہیں کرسکتی تھی۔ سوال نہ کرنے کے باوجود یہ کبھی مان نہیں سکتی تھی۔ کہ فرہاد علی تیمور کا کوئی ہمزاد اس دنیا میں ہے۔ تمام بڑے ممالک اور خطرناک تنظیموں کے ریکارڈ روم جو میری لائف ہسٹری تھی، اس میں کہیں یہ ذکر نہیں تھا کہ فرہاد کے ساتھ کوئی اور فرہاد بھی پیدا ہوا تھا۔

یہ بات نہ ماننے کے باوجود، وہ ماننے والی تھی۔ کیوں کہ اس کی معمولہ اور تابعدار بن چکی تھی۔ جو بھی باتیں وہ اس کے ذہن میں نقش کر رہا تھا۔ نومی اسی کو سچ تسلیم کرنے والی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''چونکہ ہم ہمزاد ہیں۔ اس لیے دونوں بھائیوں کا مزاج ایک جیسا ہے۔ اسی لیے جو تعلیم اور تربیت اس نے حاصل کی جو ٹیلی پیتھی کا علم اس نے سیکھا ہے۔ وہی سب کچھ میں بھی سیکھتا رہا تھا۔''

اس نے نومی کو حکم دیا۔ ''تم کوئی سوال کیے بغیر، کوئی بحث کیے بغیر تسلیم کرلو کہ میں اس کا ہمزاد ہوں۔''

وہ ایک تابعدار کی حیثیت سے بولی۔ ''میں تسلیم کرتی ہوں کہ تم فرہاد علی تیمور کے ہمزاد ہو۔''

''تم دوسری سونیا ہو۔ فرہاد کی زندگی میں اس کی سونیا کی جگہ لینا چاہتی ہو۔ ویسے لاکھ کوشش کرلو۔ اس کی جگہ نہیں لے سکو گی۔ ہاں۔ یہ ضرور ہوگا کہ یہ فرہاد علی تیمور تمہیں اپنی سونیا بنا کر ایک نئے فرہاد اور سونیا کی داستان کا راوی بنے گا۔ آیندہ تم میری سونیا بن کر زندگی گزارتی رہو گی۔''

وہ تابعداری سے بولی۔ ''میں تمہاری سونیا بن کر تمہارے ساتھ زندگی گزارتی رہوں گی۔''

وہ اس پر تنویمی عمل کرتا رہا، اور اہم باتیں اس کے ذہن میں نقش کرتا رہا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ دو گھنٹے تک وہ تنویمی نیند سوتی رہے۔

جب وہ دو گھنٹے بعد واپس آیا تو نومی نیند پوری کر چکی تھی۔ آنکھیں کھولے بستر پر لیٹی اپنے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟

پھر اسے یاد آیا کہ اس کے دماغ میں فرہاد آیا تھا۔ اور وہ فرہاد خود کو اصل فرہاد کا ہمزاد کہہ رہا تھا۔

وہ ایک تابعدار کی حیثیت سے سوچنے لگی۔ ''بے شک۔ وہ فرہاد کا ہمزاد ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے وہ نہ سہی یہ فرہاد تو مل رہا ہے۔ میں سونیا بن کر اُس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی، نہ رہ سکی۔ لیکن اِس فرہاد کے ساتھ ایک کامیاب زندگی گزاروں گی۔ وہاں دوسری سوکن سونیا نہیں ہوگی۔''

وہ اپنے عامل فرہاد کے بارے میں سوچنے لگی۔ کہ جب وہ اس کا ہمزاد ہے تو یقیناً اسی فرہاد کی طرح ذہین، حاضر دماغ، شہ زور اور ناقابل شکست بھی ہوگا۔ میں بھی سونیا سے کچھ کم نہیں ہوں۔ اب ہم سونیا اور فرہاد بن کر آج تک شہرت کمانے والے سونیا فرہاد سے زیادہ شہرت کمائیں گے۔ ایسے کارنامے انجام دیں گے کہ دنیا انہیں بھول کر ہمیں یاد کرتی رہے گی۔''

اسے اپنے فرہاد کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو سونیا! میں تمہارے خیالات پڑھ رہا ہوں۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ تم اسی جذبے سے سوچو۔ ہم ضرور ان سونیا فرہاد سے زیادہ شہرت حاصل کریں گے۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا میرا نام سونیا رہے گا؟ کیا ہم کھل کر ان کے مقابلے پر آسکیں گے؟''

''تمہارا نام سونیا ہی رہے گا۔ ہم جہاں بھی خیال خوانی کے ذریعے پہنچیں گے۔ وہاں سونیا اور فرہاد کہلائیں گے۔ جب بھی کوئی کارنامہ انجام دیں گے۔ تو ان ہی ناموں سے پہچانے جائیں گے۔ لیکن عام حالات میں سماجی معاشرتی زندگی گزارتے وقت ہمارا نام فرضی ہوگا۔ جب بھی ضرورت ہوگی ہم اپنا نام بدلتے رہیں گے۔''

''کیا تم یہاں استنبول میں ہو؟''

''یہاں ہوتا تو ابھی تمہارے پاس چلا آتا۔ میں پیرس میں ہوں۔ سونیا پر نکال سے جمائلہ کو ساتھ لے کر پیرس پہنچنے والی ہے۔ آج میں پہلی بار اس کے روبرو جاؤں گا۔ اور فرہاد کو اس کے پاس پہنچنے نہیں دوں گا۔''

''تم بہت بڑا خطرہ مول لینا چاہتے ہو۔ سونیا بہت مکار ہے۔ پہچان لے گی کہ تم اس کے فرہاد نہیں ہو۔''

''سونیا کے فرشتے بھی مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔''

''کیا تم تنہائی میں سونیا کے ساتھ وقت گزارو گے؟''

''مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں صرف فرہاد کے لیے چیلنج بنتا رہوں گا۔ آج سے وہ جو کرنا چاہے گا۔ وہ نہیں کر پائے گا۔ اس سے پہلے وہی کام میں کر گزروں گا۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔''

''تم پہلی بار سونیا کے روبرو جا رہے ہو۔ مجھے بے چینی رہے گی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ وعدہ کرو کہ تم آتے رہو گے۔ اور اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہو گے۔''

''ہاں۔ تم میری سونیا ہو۔ میں تمہیں اپنے حالات نہیں بتاؤں گا تو اور کسے بتاؤں گا؟ ٹھیک ہے میں آتا جاتا رہوں گا۔''

وہ دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہو گیا۔ اس نے سونیا اور میرے مقابلے پر آنے کے لیے بہت اچھی اور مضبوط پلاننگ کی تھی۔ وہ یہ جانتا تھا کہ میں سونیا کو ریسیو کرنے کے لیے ایئر پورٹ جاؤں گا۔ لیکن وہ وہاں جانا چاہتا تھا۔ اور وہاں جانے کے لیے مجھے راستے سے ہٹانا ضروری تھا۔

مجھے راستے سے ہٹانا میرے ارادے سے مجھے باز رکھنا اتنا آسان نہیں تھا۔ لیکن اس نے اس معاملے کو آسان بنا لیا تھا۔ میری لاعلمی میں میری گاڑی کے بریک کو ناکارہ بنا کر دور سے تماشا دیکھ رہا تھا۔

جب وہ میری گاڑی تک اور میرے کاٹیج تک پہنچ ہی چکا تھا، تو مجھے چھپ کر گولی بھی مار سکتا تھا۔ لیکن میری زندگی میں ایسے دشمن بھی آتے رہے ہیں، جو مجھے جان سے مارنا نہیں چاہتے تھے۔ مجھے اپاہج بنا کر میری بے بسی کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ کار کے حادثے میں میری جان نہیں جائے گی، لیکن میں اپاہج ضرور ہو جاؤں گا۔

خدا کا شکر ہے کہ میرے ہاتھ پاؤں سلامت رہ گئے۔ ونڈ اسکرین کے شیشے ٹوٹ کر میرے چہرے اور جسم میں پیوست ہوئے تھے۔ اور میرا سر بری طرح ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا تھا، اسی لیے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے عارضی طور پر بے دست و پا بنا دیا تھا۔

جہاز رن وے پر اتر چکا تھا۔ سونیا ایک طویل جدائی کے بعد پہلی بار مجھ سے ملنے آ رہی تھی۔ اپنی منزل تک پہنچ رہی تھی۔ لیکن چلتے چلتے کبھی کبھی راستے پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ منزل بدل جاتی ہے۔ لوگوں کے نام بدل جاتے ہیں۔ کام بدل جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ لوگ بدل جاتے ہیں۔

اس نے ہال سے باہر آ کر فرہاد علی تیمور کو دیکھا تو خوشی سے کھل گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی آ کر اس کے گلے لگ گئی۔ فرہاد نے اسے بڑی محبت سے بھینچتے ہوئے کہا۔ ''میری جان! تم کہاں بھٹکتی رہی تھیں؟ کتنا تڑپاتی رہی تھیں؟''

وہ ایک دم سے تڑپ کر الگ ہو گئی۔ وہ میلوں دور سے کسی کی بھی بو سونگھ کر اسے پہچان لیتی تھی۔ خواہ وہ کتنے ہی بہروپ میں رہے۔ اگرچہ وہ سونگھنے کی شدید حس اب نہیں رہی تھی۔ لیکن یہ صلاحیت بالکل ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس فرہاد کے گلے لگتے ہی اسے پتا چل گیا کہ وہ پسینے کی مہک میری نہیں ہے۔

فرہاد نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا۔ تم اس طرح اچانک الگ کیوں ہو گئیں؟''

وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''تم کون ہو؟''

وہ اندر سے ذرا گھبرایا پھر فوراً ہی ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے بولا۔ ''اچھا سمجھ گیا۔ تمہیں میری مخصوص مہک نہیں مل رہی ہے؟''

وہ گھور کر بولی۔ ''وضاحت کرو۔ مہک تبدیل کیسے ہو گئی؟''

''تم پچھلی زندگی بھول چکی تھیں۔ رفتہ رفتہ تمہیں بہت ساری باتیں یاد آ رہی ہیں۔ اور بھی یاد آتی رہیں گی۔ کیا کبھی حالات سے مجبور ہو کر ہم اپنے جسم کی مہک عارضی طور پر تبدیل نہیں کر لیتے ہیں؟''

سونیا ایک ذرا نرم پڑ گئی۔ وہ بولا۔ ''ایک دشمن میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اس کی سونگھنے کی حس بہت تیز ہے۔ اسے ڈاج دینے کے لیے میں ایک ایسا پرفیوم استعمال کر رہا ہوں جو انسانی پسینے کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔''

سونیا کو یاد آیا کہ نومی نے اس کے پسینے کی مہک آرڈر دے کر تیار کرائی تھی۔ اور اسے اپنے بدن پر اسپرے کرنے کے بعد سونیا بن کر مجھے دھوکا دیا تھا۔

الپا اور کرونا اس کے اندر موجود تھیں۔ الپا نے کہا۔ ''مما! آپ کو الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پاپا درست کہہ رہے ہیں۔ آپ کی تسلی کے لیے میں ان کے دماغ میں جاتی ہوں۔ اگر یہی پاپا ہوں گے تو مجھے ان کے اندر جگہ مل جائے

گی۔''

وہ فرہاد خیال خوانی کی تکنیک کو اچھی طرح سمجھ کر آیا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ دو افراد کا لب ولہجہ بالکل ایک جیسا ہو آواز بھی ایک جیسی ہو۔ تو خیال خوانی کی لہریں پہلے اس کے اندر آئیں گی' جو دوسرے کے مقابلے میں قریب ہوگا۔

اس وقت میں دور کسی اسپتال میں تھا۔ اور وہ سونیا اور الپا کے قریب تھا۔ انہوں نے خیال خوانی کی پرواز کی تو اس فرہاد کے اندر جگہ مل گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میری ایک ہی بیٹی الپا ہے' یا کرونا بیٹی بھی آ گئی ہے؟''

دونوں نے خوش ہو کر کہا۔ ''پاپا! ہم دونوں یہاں موجود ہیں۔''

وہ بولا۔ ''اگر اطمینان ہو گیا ہو تو فوراً سونیا کے پاس واپس جاؤ۔ کیونکہ وہ دشمن کبھی کبھی میرے دماغ میں آنے کی کوشش کرتا ہے۔ تم دونوں کی وجہ سے اسے میرے اندر جگہ مل جائے گی۔ میں یہ نہیں چاہتا۔''

وہ دونوں سونیا کے پاس آ کر بولیں۔ ''مما! یہی ہمارے پاپا ہیں۔ آپ سارے شبہات اپنے دل سے نکال دیں۔''

سونیا نے کہا۔ ''تم میں سے کسی ایک کو اپنے پاپا کے اندر رہ کر ان کے چور خیالات پڑھنا چاہیے۔''

''مما! دشمن ان کے دماغ میں آنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ہم میں سے کوئی ان کے اندر موجود رہے گا۔ تو وہ آسانی سے ان کے اندر جگہ پیدا کر سکتا ہے۔''

کرونا نے کہا۔ ''پلیز۔ آپ شبہ نہ کریں۔ مطمئن ہو جائیں۔''

سونیا نے مسکرا کر فرہاد کو دیکھا۔ پھر جمائلہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اس سے ملو۔ یہ ہماری بیٹی جمائلہ ہے۔''

فرہاد نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ آنے والی جمائلہ ہی ہو سکتی ہے۔''

پھر اس نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔ ''اب تم ہماری بیٹی بن کر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا کرو گی۔''

وہ تینوں وہاں سے چلتے ہوئے پارکنگ ایریا میں آئے۔ پھر کار میں بیٹھ کر کاٹیج کی طرف جانے لگے۔ فرہاد نے الپا کے اندر پہنچ کر پوچھا۔ ''تمہارے حالات کیا ہیں؟ کیا تم سے دشمنی کرنے والے یہودی اکابرین اب بھی اپنے عہدوں پر فائز ہیں؟''

الپا نے کہا۔ ''نہیں۔ ان میں سے کئی عہدے دار ملک چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ وہاں جو رہ گئے ہیں' انہوں نے اپنے عہدوں سے استعفا دے دیا ہے۔ اب وہاں نئی حکومت قائم ہونے والی ہے۔''

الپا سونیا کے اندر تھی۔ وہ بھی اس کے اندر رہ کر الپا سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ تاثر دے رہا تھا کہ وہ صرف سونیا ہی کے نہیں الپا اور کرونا وغیرہ کے تمام حالات سے اچھی طرح واقف ہے۔

اس نے پوچھا۔ ''کیا وہ امریکی ٹیلی پیتھی جاننے والا سلومن وکٹر اب بھی تل ابیب میں موجود ہے؟''

''نہیں۔ وہ شاید جا چکا ہے۔''

فرہاد نے کہا۔ ''اگر وہ جا چکا ہے، تب بھی ہم اسے معاف نہیں کریں گے۔ وہ تم سے دشمنی کرنے اور تمہارے دشمنوں کی مدد کرنے تل ابیب آیا تھا۔''

وہ بولی۔ ''یس پاپا! ہم صرف سلومن وکٹر کا ہی نہیں بلکہ امریکی اکابرین کا بھی محاسبہ کریں گے۔''

وہ بولا۔ ''ہاں۔ آج جمائلہ کو بابا صاحب کے ادارے میں پہنچا دیں۔ اس کے بعد ایسے دشمنوں سے نمٹ لیں گے۔''

پھر اس نے کرونا سے پوچھا۔ ''تم آج کل کہاں ہو؟''

''پاپا! جب مجھے معلوم ہوا کہ مما جمائلہ کو لے کر یہاں آ رہی ہیں۔ تو میں بھی اسی شہر میں آ گئی ہوں۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہم جمائلہ کو بابا صاحب کے ادارے میں پہنچانے کے بعد تم سے ضرور ملیں گے۔''

وہ سب کاٹیج میں پہنچ گئے۔ فرہاد نے کہا۔ ''الپا اور کرونا! اب تم دونوں جاؤ۔ کبھی کبھی آتی جاتی رہنا اور ہماری خیریت معلوم کرتی رہنا۔ تمہیں بھی اپنی اپنی جگہ دماغی طور پر حاضر رہنا چاہیے۔ ورنہ کوئی دشمن انجانے میں نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

وہ دونوں چلی گئیں۔ وہ تینوں کاٹیج کے اندر آ گئے۔

فرہاد نے سونیا سے پوچھا۔ ''کیا وہ جا چکی ہیں؟''

''ہاں اب وہ میرے اندر نہیں ہیں۔''

یہ سنتے ہی اس نے لباس کے اندر سے ریوالور نکالا اور اسے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں فرہاد علی تیمور ہوں۔ لیکن میرا مزاج اور میرے ارادے بدل چکے ہیں۔''

سونیا نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''یہ کیا مذاق کر رہے ہو؟''

اس کی بات ختم ہوتے ہی ٹھائیں کی آواز کے ساتھ

ایک گولی چلی اور سونیا اپنا بازو پکڑ کر رہ گئی۔ گولی اس کے بازو کے گوشت کو ایک ذرا سا ادھیڑ کر گزرتی چلی گئی تھی۔

وہ بولا۔ ''تم میری سنجیدگی کا اندازہ ایک گولی سے لگا سکتی ہو۔ دوسری گولی تمہاری زندگی کا اختتام کر دے گی۔''

جمائلہ سہم کر دیوار سے جا لگی تھی۔ فرہاد نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں' رات کو تم جتنی خطرناک ہو جاتی ہو۔ دن میں اتنی ہی بزدل بن جاتی ہو۔''

سونیا اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''کوئی چالاکی دکھاؤ گی تو بری طرح پچھتاؤ گی۔''

وہ بازو کو تھام کر تکلیف برداشت کرتے ہوئے بولی۔ ''تو میرا شبہ درست تھا؟ تم میرے فرہاد نہیں ہو؟''

وہ سینہ تان کر بولا۔ ''میں فرہاد علی تیمور ہی ہوں۔ تمہارے فرہاد کا ہمزاد ہوں۔ میرے اس ہمزاد نے غلط ہسٹری پیش کی۔ جس کی وجہ سے دنیا آج تک مجھ سے بے خبر رہی۔ اب سب کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا ایک ہمزاد بھی اس دنیا میں موجود ہے اور یہ ہمزاد کیا کیا گل کھلانے والا ہے یہ تو رفتہ رفتہ ہی معلوم ہوگا۔''

پھر اس نے جمائلہ سے کہا۔ ''میں ابوالہول کا غلام ہوں۔ تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔ وہ نہیں چاہتا کہ تم ان کے ذریعے بابا صاحب کے ادارے میں جاؤ۔ اور وہاں تمہارا روحانی علاج کیا جائے۔''

وہ بولی۔ ''میں تمہیں ابوالہول کا غلام تسلیم کرتی ہوں۔ مگر میری مما کو گولی نہ مارو۔''

''میں اپنے ہاتھوں سے اسے نہیں ماروں گا۔ دن کا ایک بجا ہے۔ پانچ گھنٹے کے بعد تم تبدیل ہو جاؤ گی۔ پھر تمہیں یہ دیکھ کر غصہ آئے گا کہ سونیا تمہیں بہلا پھسلا کر بابا صاحب کے ادارے میں لے جا رہی تھی۔ تمہارا روحانی علاج کر کے تمہیں ابوالہول سے دور کر دینا چاہتی تھی۔ پھر تم خود ہی اس سے انتقام لو گی۔''

جمائلہ سونیا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح سونیا کی مدد کرے؟ پھر ذہن ابوالہول کی طرف بھی مائل تھا۔ اور وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ دشمن ایک کے بعد دوسری گولی چلائے اور سونیا کو مار ڈالے۔ پھر لاشعوری طور پر یہ بھی مان رہی تھی کہ وہ ابوالہول کا غلام ہے اور اسے روحانی علاج سے روکنے کے لیے آیا ہے۔

فرہاد نے کہا۔ ''تم مجھے ابوالہول کا غلام مانو' یا نہ مانو۔ لیکن میرے حکم کی تعمیل کرو۔ مضبوط رسیاں تلاش کر کے یہاں لے آؤ۔''

وہ جھجکتے ہوئے ایک اسٹور روم کی طرف چلی گئی۔ وہ بڑی توجہ سے سونیا کو نشانے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں' تم کتنی مکار ہو؟ ایک لمحے کے لیے بھی میں تم سے غافل نہیں رہوں گا۔ اگر اپنی سلامتی چاہتی ہو تو اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔''

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہیں جمائلہ سے کیا دلچسپی ہے؟ اسے اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتے ہو؟''

''میں تمہارے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔''

جمائلہ مضبوط رسیوں کا ایک بنڈل لے آئی۔ اس نے کہا۔ ''اپنی اس مما کو کرسی کے ساتھ مضبوطی سے باندھو۔''

وہ بے بسی سے سونیا کو دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''بیٹی! کوئی بات نہیں۔ یہ جو کہتا ہے' وہی کرو۔ مجھے کتنے ہی بے بس اور مجبور بنانے والے آئے پھر خود ہی مجبور ہو کر اس دنیا سے چلے گئے۔''

جمائلہ نے اسے کرسی کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا۔ اس نے جمائلہ کے بازو کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ''میں نے فرہاد کو حادثے سے دوچار کیا ہے۔ وہ ایک اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔''

سونیا نے چونک کر سر اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''میں چاہتا تو اسے گولی مار سکتا تھا۔ اور میں چاہوں تو ابھی تمہیں گولی مار سکتا ہوں لیکن میں نے عہد کیا ہے کہ تم دونوں کو جان سے نہیں ماروں گا۔ آج تک تم نے جتنی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اتنی ہی ناکامیوں کا منہ تمہیں دکھاؤں گا۔ تم میاں بیوی جو بھی مہم سر کرنے نکلو گے۔ میں اس مہم کو تم سے پہلے سر کروں گا۔ اور قدم قدم پر تمہیں یقین دلاؤں گا کہ تم دونوں میرے سامنے کتنے بے بس اور مجبور ہو؟''

پھر اس نے جمائلہ سے کہا۔ ''اسے دیکھ لو۔ اس کا میچ کو اچھی طرح یاد کر لو۔ اور میں اس اسپتال میں تمہیں لے جاؤں گا۔ وہاں تم فرہاد کو دیکھ لو، شام کا اندھیرا پھیلتے ہی جب تم تبدیل ہو جاؤ گی۔ تو خود ہی آندھی طوفان کی طرح ان کے پاس پہنچو گی۔ اور ان کی ہڈی پسلیاں توڑ کر رکھ دو گی۔ اب چلو یہاں سے.....''

وہ اس کا بازو تھام کر اسے کھینچتا ہوا کاٹیج سے باہر چلا گیا۔

ٹیلی پیتھی کے فسوں کار فرہاد علی تیمور کی اس مقبول عام سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں پڑھیے

وہ افق پر نظریں گاڑے ریلیف کیمپ کے قریب خاموش بیٹھا تھا۔ جیسے کوئی پتھر کا مجسمہ ہو یا ہمالیہ کی گپھاؤں کا جوگی۔ اس کے استخوانی بازو گھٹنوں پر رکھے تھے اور وہ بازوؤں پر اپنی ٹھوڑی ٹکائے ہوئے تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ کافی دیر سے اسی انداز میں بیٹھا تھا۔ میرا خیال ہے صبح سویرے جب ہم ریلیف کیمپ میں ڈیوٹی پر آئے تھے تب سے وہ وہیں بیٹھا تھا۔

دو دن قبل گولیاں چلی تھیں..... یا یوں کہنا چاہیے کہ اچانک گولیوں کی بارش ہوگئی تھی اور پلک جھپکتے ہی بہت سے مرد، عورتیں اور بچے دکانوں کے اندر، دکانوں کے باہر..... اٹ پاتھوں اور راستوں پر گر گئے تھے۔ کئی لوگ مر گئے تھے اور کئی زخمی ہوگئے تھے۔ گولیوں کی اس بارش سے متاثر ہونے والے لوگوں کی امداد کے لیے انتظامیہ کی طرف سے ریلیف کیمپ قائم کیا گیا تھا۔

مختلف محکموں کے کچھ ملازمین کی ڈیوٹی اس ریلیف کیمپ میں لگائی گئی تھی۔ ہر ایک کو مختلف ذمے داری سونپی گئی تھی۔ میں فائرنگ میں ہلاک ہونے اور زخمی ہونے والوں کی تفصیل رجسٹر میں درج کر رہا تھا۔ میرے ساتھ رفیق گنجا اور سلیمان سندھی بھی تھا۔ سب سے زیادہ بھیڑ میری ٹیبل پر تھی۔

وہ شخص میری ٹیبل کے بالکل سامنے لیکن کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا اور اس کی نگاہیں آسمان پر گڑی ہوئی تھیں۔

عشق کا پیغمبر

امر جلیل / رفعت رضا

کائنات کا وجود محبت سے معنون ہے، اس کا مقصد محبت ہے، وہ محبت جو بے غرض ہے، بے لوث ہے اور اگر یہاں محبت ہی نہ رہے تو کائنات کا کیا مقصد باقی رہ جائے گا۔

خوبصورت الفاظ اور بے پناہ طاقت کی حامل ایک پر تاثر کہانی، سندھی ادب سے انتخاب

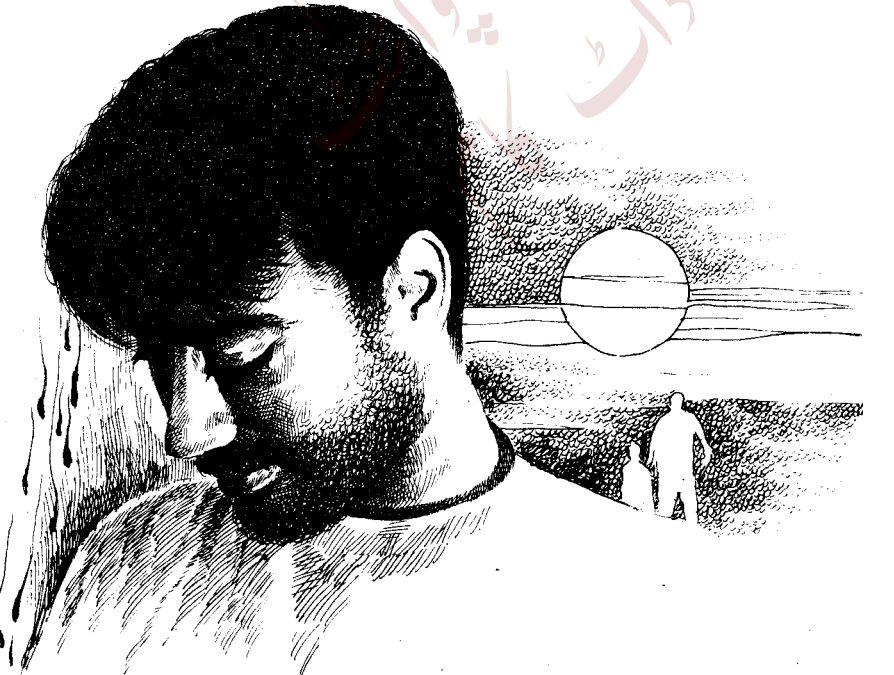

میں نے سوچا یہ بے چارہ ضرور انسان کی جدید ایجادوں اور جہالتوں کا مارا ہوا ہے اور اپنے ہوش وحواس گنوا بیٹھا ہے۔

میں اپنی میز سے اٹھ کر اس کے قریب چلا گیا اور اپنا تعارف کرانے کے بعد اس جوگیوں جیسے شخص سے کہا ''تم اپنا نام اور پتا لکھوادو اور یہ بھی بتادو کہ فائرنگ میں تمہارا کیا نقصان ہوا ہے؟''

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے گویا مجھے اور میرے عہدے کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ بہ دستور آسمان پر نظریں گاڑے خاموش بیٹھا رہا۔

میں مزید اس کے قریب ہوگیا اور واضح اور قدرے اونچی آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔ ''تم مجھے فائرنگ سے متاثر نظر آتے ہو۔ میری بات سنو..... میں فائرنگ کے متاثرین کی تفصیلات جمع کررہا ہوں۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''

وہ اب بھی خاموش رہا۔ اس کی نظریں آسمان پر تھیں۔ جیسے وہ آنکھوں سے پرواز کرجانے والے خوابوں کو تلاش کررہا ہو۔ میں نے سوچا کہ سودائی ہے اور اس پر جو گزری ہے' اس پر پچھتا رہا ہے..... یا پچھتاوے کے احساس سے آزاد ہوگیا ہے لیکن خاموش رہ کر تو وہ اپنا ہی نقصان کررہا ہے۔ سرکار کی طرف سے ہلاک ہونے والوں اور زخمیوں کے لیے معاوضے کے طور پر بڑی رقم رکھی گئی تھی۔

میں نے تقریباً چیخ کر کہا ''اس طرح آسمان کو گھورنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا..... کچھ بولو' کچھ بتاؤ!''

میں گویا پتھر کے مجسمے سے ہم کلام تھا۔ اس کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

''یار! تم کس قسم کے متاثر آدمی ہو'' میں نے قدرے غصے سے کہا ''کہیں تم بہرے تو نہیں ہو؟''

اس نے آہستہ آہستہ گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

''اس کا مطلب ہے تم بہرے نہیں ہو'' میں نے کہا ''تم مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔''

وہ چپ چاپ میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اسے سرکار کی طرف سے معاوضے کی رقم کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا ''فائرنگ میں اگر تم مرگئے ہوتو تمہیں پچاس ہزار روپے ملیں گے۔''

اس کے ویران ہونٹوں پر اداس مسکراہٹ جھانک کر غائب ہوگئی۔ اچانک مجھے اپنے جملے کی حماقت کا احساس ہوا۔ ''اگر تمہاری ایک ٹانگ ضائع ہوگئی ہے تو تمہیں دس ہزار روپے ملیں گے'' میں نے جلدی سے کہا ''اور اگر تمہاری دونوں ٹانگیں ضائع ہوگئی ہیں تو پھر تمہیں پچیس ہزار روپے ملیں گے۔''

ایک بار پھر اس کے اداس ہونٹوں پر جاڑے کی دھوپ کی طرح مسکراہٹ جھانک کر غائب ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں سلامت تھیں۔

''ضائع ہونے والے بازو کا معاوضہ سرکار نے دس ہزار روپے رکھا ہے'' میں نے مزید کہا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی سانجھی اداس مسکراہٹ تیر آئی۔ اس کے تمام اعضا سلامت تھے۔ ہاتھ' پیر' ناک' آنکھیں..... سب اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے۔

میں گدی کھجاتا ہوا ریلیف کیمپ میں واپس اپنی کرسی پر جاکر بیٹھ گیا۔ پھر ایک خیال کے آنے پر میں ایک دم اٹھا اور رفیق گنجے کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا ریلیف کیمپ سے باہر لے گیا۔ میں نے جوگیوں جیسے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''یار گنجے! یہ شخص مجھے متاثرین میں سے لگتا ہے لیکن یہ بدبخت اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔''

''ہوسکتا ہے.....'' رفیق گنجے نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''فائرنگ کی زد میں آکر اس کی ماں مرگئی ہو۔''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''جب ماں مرجاتی ہے ناں' تب تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ مرجاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سب کچھ فنا ہوگیا ہے'' رفیق گنجے نے جواب دیا ''اس وقت اس شخص کے لیے پوری کائنات' ماحول' تم' میں' ہم سب مرگئے ہیں۔''

رفیق گنجا اور میں اس شخص کے قریب جاکر بیٹھ گئے۔ میں نے اسے سمجھانے کے سے انداز میں ہمدردی سے کہا ''یار! بات سنو' معاوضے کے طور پر سرکار تمہیں دوسری ماں تو نہیں دے سکتی البتہ مرنے والی ماں کے عوض تمہیں پچاس ہزار روپے مل سکتے ہیں۔''

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جیسے میری بات اسے ناگوار گزری ہو۔

''میرا خیال ہے.....'' میں نے رفیق گنجے سے کہا ''اس کی بیوی گولیوں کا شکار ہوکر مرگئی ہے۔''

''یار! تم تو بہت ہی بڑے احمق ہو'' رفیق گنجے نے مجھے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔

"کیوں......؟"

"اگر اس کی بیوی مرگئی ہوتی تو یہ اس طرح منہ لٹکا کر نہ بیٹھا ہوتا بلکہ خوشی خوشی اس کی 'قیمت' وصول کرنے آتا۔"

"لو میرج کرنے والے تم لوگ بیویوں کے دشمن ہوتے ہو۔" میں نے گنجے کو لعن طعن کرتے ہوئے کہا "شکر ہے کہ میں نے جس سے محبت کی تھی' اس سے شادی نہیں کی تھی۔"

"یار! ناراض کیوں ہوتے ہو" رفیق نے کہا "چلو' اسی سے پوچھ لیتے ہیں۔"

پھر وہ اس شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "میرا دوست پردیسی ٹھیک کہتا ہے۔ پچاس ہزار روپے میں تمہیں دوسری ماں تو نہیں مل سکے گی۔ ہاں...... یہ ہوسکتا ہے۔ یقین کرو پچاس ہزار روپے میں تمہیں ایک عدد ٹھیک ٹھاک بیوی ضرور مل جائے گی۔"

اس شخص نے گھور کر رفیق گنجے کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی جسے دیکھ کر رفیق گھبرا گیا اور میری طرف دیکھ کر بولا "لگتا ہے اس کا جوان بیٹا مارا گیا ہے؟"

میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ میں اس کے قریب ہو کر زمین پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ میں نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اگر تم بول نہیں سکتے تو اس کاغذ پر وہ سب کچھ لکھ دو جو تم پر بیتی ہے۔ کچھ کمی بیشی ہوئی تو میں اسے ٹھیک کر دوں گا۔"

اس نے کاغذ میرے ہاتھ سے نہیں لیا' بس کاغذ کی طرف دیکھتا رہا۔ رفیق گنجے نے کہا "بے وقوف! اس طرح اس کے قریب نہ بیٹھو۔ یہاں اعلیٰ افسروں کا آنا جانا لگا ہوا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو وہ سمجھے گا کہ تم معاوضے کی رقم سے اپنا حصہ وصول کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

رفیق گنجا مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا ریلیف کیمپ میں لے آیا اور بولا "کافی لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ جاؤ' اپنا کام کرو۔"

کرسی پر بیٹھنے کے بعد میں نے کیمپ سے باہر دیکھا۔ جوگیوں جیسا وہ شخص پتھر کے بت کی طرح بیٹھا تھا اور آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس دوران میں کافی تعداد میں لوگ میری میز کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ فائرنگ میں کسی کا بیٹا مرگیا تھا' کسی کی بیٹی' کسی کا بھائی اور کسی کی بہن! گویا گولیوں کی برسات میں ہر رشتہ مرگیا تھا۔

ایک شخص ایک عورت کو ساتھ لے آیا۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس شخص نے کہا "گولی لگنے سے اس کی ماں مرگئی ہے۔"

عورت نے روتے ہوئے کہا "مجھے کچھ نہیں چاہیے... میں اپنی ماں کا معاوضہ نہیں لوں گی۔"

"بے وقوف نہ بنو فرخندہ!" مرد نے قدرے سخت لہجے میں عورت سے کہا "تم معاوضہ لو یا نہ لو' تمہاری ماں دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتی۔"

عورت آہستہ آہستہ روتی رہی۔ مرد نے میری طرف دیکھ کر کہا "تم تفصیل لکھو۔"

پھر اس نے مجھے مرجانے والی عورت کی تفصیل بتائی۔

"عمر ستر سال' گھر نمبر فلاں' گلی نمبر فلاں' ملازمہ دوسرے محلے میں لوگوں کے برتن دھوتی تھی اور جھاڑو پونچھا کرتی تھی۔ کام سے واپس آتے ہوئے فائرنگ کا شکار ہو گئی۔ وارث فرخندہ' رشتہ بیٹی!"

میں نے یہ ساری تفصیل رجسٹر میں نوٹ کر لی۔

مرد نے پوچھا "معاوضے کا چیک کب ملے گا؟"

"بہت جلد!" میں نے رجسٹر کا صفحہ پلٹتے ہوئے کہا "کوئی وزیر' ایم این اے یا ایم پی اے چیک لے کر تمہارے پاس آئے گا۔ چیک دیتے ہوئے اخباری فوٹو گرافروں سے فوٹو بنوائے گا۔ فاتحہ پڑھے گا' دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے گا۔ آنکھوں میں آنسو لانے کی کوشش کرے گا اور یہ ساری کارروائی ٹی وی والوں سے ریکارڈ کرائے گا۔ پھر شام والی خبروں میں چلوائے گا۔"

مرد کی باچھیں پھیل گئیں۔ خوشی کے مارے وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے ہی والا تھا کہ جلدی سے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ مجھے تعجب ہوا' اس نے عورت کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔

"آؤ فرخندہ چلیں؟"

"مرحومہ تمہاری کیا لگتی تھی؟" میں نے مرد سے پوچھا۔

"وہ میری ساس تھی۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

روتی ہوئی عورت اور مسکراتا ہوا مرد ریلیف کیمپ سے باہر نکل گئے۔

میں نے کیمپ سے باہر دیکھا۔ جوگیوں جیسا شخص چپ چاپ بیٹھا تھا اور بدستور آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں چار ہٹے کٹے جوان بھیڑ کو چیرتے ہوئے آ کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ایک جوان نے کہا "ہمارا باپ مرگیا ہے۔"

"اسے گولی لگی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔"

''معاوضے کے لیے آدمی کو گولی لگنا لازمی ہے'' میں نے کہا۔

اس نے دوسرے نوجوانوں کی طرف دیکھا۔ جس نوجوان کی قمیص کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ وہ آگے بڑھ آیا اور بولا ''ہمارا باپ فائرنگ کے دوران میں مرگیا تھا۔ عین اسی وقت!''

میں الجھ کر رہ گیا۔ سلیمان سندھی' جو فائرنگ سے مال ملکیت کے ہونے والے نقصان کی تفصیل تحریر کررہا تھا۔ وہ اپنی میز چھوڑ کر میرے پاس آگیا اور بولا ''ذرا اکیلے میں آکر میری بات سننا۔''

میں نوجوانوں سے معذرت کر کے سلیمان سندھی کے ساتھ ایک طرف چلا گیا۔

''میں ان چاروں بدمعاشوں کو جانتا ہوں۔'' سلیمان نے کہا ''میرے محلے ہی میں رہتے ہیں۔''

''ان کا باپ تو سچ مچ مرگیا ہے ناں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں'' اس نے جواب دیا ''بے چارہ معذور تھا۔ فالج کا مریض تھا۔ یہ چاروں مشٹنڈے اسے روزانہ صبح کو پیر سائیں کی درگاہ پر چھوڑ کر خود سٹے بازی اور پھڈے بازی کرنے نکل جاتے تھے۔''

''یہ کہتے ہیں کہ ان کا باپ فائرنگ کے دوران میں مرگیا تھا؟''

''ہاں'' سلیمان نے کہا ''فائرنگ کے دوران میں ہی وہ گرتا پڑتا پیر سائیں کی درگاہ سے چل دیا تھا۔ پھر وہ گندے پانی کے نالے میں گر کر مرگیا تھا۔''

''یہ بدمعاش ہیں یا نہیں' اس بات کو چھوڑ'' میں نے کہا ''تم مجھے یہ بتاؤ کہ معاوضہ حاصل کرنے کے لیے گولی کا لگنا ضروری ہے یا نہیں؟''

''چلو رفیق گنجے سے پوچھتے ہیں'' سلیمان نے جواب دیا ''وہ افلاطون قسم کا گنجا ہے۔''

ہم دونوں رفیق گنجے کے پاس آگئے اور اس سے مشورہ کرنے لگے۔ رفیق نے کہا ''فائرنگ کے دوران میں مرجانا کافی نہیں ہے۔ گولی لگنی ضروری ہے۔''

ہم تینوں نوجوانوں کے پاس آگئے۔ میں نے ان سے کہا ''سوری' معاوضے کے لیے آپ کے والد کا صرف مرنا کافی نہیں ہے بلکہ گولی کھا کر مرنا ضروری ہے۔''

نوجوانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جس نوجوان کی ناک کے نیچے ہیبت ناک مونچھیں تھیں' اس نے کہا ''مجھے معلوم تھا کہ تم جیسے ہونق کوئی نہ کوئی قانونی نکتہ ضرور اٹھائیں گے۔''

دوسرے تین نوجوانوں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن مچھل بولتا رہا ''میرے بھائیوں کو بھی پتا نہیں ہے...... یہ دیکھو' میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھوالیا ہے کہ گولی لگنے کے بعد ہمارا باپ گندے پانی کی نالی میں گر گیا تھا اور مرگیا تھا۔''

میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھی۔ واقعی اس میں یہی لکھا تھا کہ بوڑھا گولی لگنے کے بعد گندے پانی کی نالی میں گر پڑا تھا اور مرگیا تھا۔

''بالکل ٹھیک......'' میں نے نوجوانوں سے کہا ''آپ معاوضے کے حق دار ہیں۔''

میں نے رجسٹر کھول کر اس میں بوڑھے کی تفصیل لکھ دی۔ مونچھوں والے نوجوان نے پوچھا ''معاوضے والا چیک ہمیں کب تک مل جائے گا؟''

''بہت جلد'' گہرا سانس لے کر کہا ''عنقریب کوئی امیر' وزیر' پروڈیوسروں' اخباری نمائندوں' فوٹو گرافروں' ریڈیو اور ٹی وی کے نمائندوں کے جلوس کے ساتھ آپ کے گھر آئے گا اور چیک دینے کی ساری کارروائی ریکارڈ کرائے گا۔''

وہ خوش خوش وہاں سے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد سلیمان سندھی نے کہا ''یار! یہ تو سراسر ظلم ہے۔ یہ چاروں مشٹنڈے اپنے معذور باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔''

''بے کار میں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے سلیمان!'' رفیق گنجے نے کہا ''کاغذوں میں بوڑھا گولی لگنے سے مرا ہے۔ یہ چاروں نوجوان اس کے بیٹے ہیں۔ اس کے وارث ہیں اور معاوضے کے قانونی حق دار ہیں۔''

سلیمان کو بہت غصہ آیا۔ وہ قانون کو سات سُروں کی سناتا وہاں سے چلا گیا اور جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اگلے متاثرہ شخص کے نقصان کی تفصیل لکھنے سے پہلے میں نے ریلیف کیمپ سے باہر بیٹھے ہوئے گم صم شخص کی طرف دیکھا۔ گھٹنوں پر بازو اور بازوؤں پر اس کی ٹھوڑی ٹکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں تصور کے کسی منظر میں کھوئی ہوئی تھیں۔

اچانک کسی نے میز پر ہاتھ مار کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ لگ بھگ پچاس برس کا ایک شخص ملگجے سے لباس میں میرے سامنے کھڑا تھا۔

''جی...... فرمایئے۔'' میں نے پوچھا۔

''فائرنگ میں ضائع ہونے والے سارے لوگوں اور زندہ بچ جانے والوں کے ضائع شدہ اعضا کی تم نے کیا قیمت

لگائی ہے؟'' اس نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے عام لوگوں سے قدرے مختلف محسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ مجھے خاموش پا کر اس نے اپنا سوال دہرایا ''تم نے فائرنگ میں ضائع ہونے والے اعضا کی کیا قیمت لگائی ہے؟''

''میں ایک معمولی سا سرکاری ملازم ہوں'' نہ جانے کیوں مجھے شرمندگی کا احساس ہوا تھا ''میری کیا حیثیت کہ میں انسانوں اور انسانی اعضا کی کوئی قیمت مقرر کرسکوں۔''

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ فضول کی تمہید مت باندھو'' اس کے لہجے میں غصہ تھا ''میں بھی تمہارے انہی افسروں کی بات کررہا ہوں' جو کچھ بھی نہیں کرتے لیکن لگتا ایسا ہے جیسے سب کچھ وہی کررہے ہیں۔ ان بندروں نے پوری انسانی جان کی کتنی قیمت رکھی ہے؟ اور ان کے ایک ایک عضو کا کیا ریٹ مقرر کیا ہے؟''

بغیر کسی سبب کے مجھے اس سے خوف محسوس ہوا۔ میں نے ہکلاتے ہوئے اسے تفصیل بتائی ''پوری طرح مرنے والے آدمی کا معاوضہ ہے پچاس ہزار روپے..... ضائع ہونے والی ایک ٹانگ کے دس ہزار' دونوں ٹانگوں کے پچیس ہزار۔ ایک بازو کے دس ہزار اور دونوں کے لیے پچیس ہزار۔''

اس نے ایک دم پوچھا ''انہوں نے ضائع ہونے والی ناک کی بھی کوئی قیمت لگائی ہے یا نہیں؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''قیمت نہیں..... معاوضہ مقرر کیا گیا ہے۔''

''بس' بس چچے! زیادہ عقلمند بننے کی کوشش مت کرو'' اس نے غصے سے کہا ''بتاؤ' انہوں نے ضائع ہونے والی ناک کا کتنا معاوضہ رکھا ہے؟''

پورے کیمپ میں موجود لوگ پلٹ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ سوائے کیمپ سے باہر بیٹھے ہوئے شخص کے۔ وہ اب بھی خلاؤں میں جھانک رہا تھا۔ رفیق گنجا اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا ''کھسکا ہوا لگتا ہے۔ اس سے زیادہ بات نہ کرو اور جان چھڑانے کی کوشش کرو۔''

''اے او جارج پنچم!'' میرے سامنے کھڑے ہوئے شخص نے چیخ کر رفیق گنجے سے کہا ''چچے کو کون سی پٹی پڑھا رہے ہو؟ جاؤ' جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھو اور رجسٹروں کا پیٹ بھرو۔''

رفیق گنجا اپنے گنج کو کھجاتا ہوا وہاں سے کھسک گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' وہ بول اٹھا ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے معاشرے میں ناک کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں..... نہیں' نہیں' تمہارے معاشرے میں ناک کی کوئی اہمیت' کوئی قیمت نہیں ہے۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بہ ظاہر اس کی ناک سلامت تھی۔ اس نے گویا میری آنکھوں میں یہ سوال پڑھ لیا تھا۔ یک لخت ایک عجیب قسم کی کیفیت اس کے چہرے پر تیر آئی۔ میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی دکھ' غصے اور بغاوت کا ملا جلا اظہار اس طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بولا تو اس کی آواز بھاری' گونج دار اور گپھاؤں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''میری بیٹی نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا تھا..... وہ بہت خوش تھی۔ اپنے لیے نئی کتابیں خریدنے گئی تھی۔ عین اسی وقت..... جب وہ کتابیں خرید کر دکان سے نکلی تھی..... گولیوں کی برسات شروع ہوگئی تھی۔ ایک لمحے میں مرنے اور زخمی ہونے والے لوگوں کے انبار لگ گئے۔ جو بچ گئے تھے' وہ اندھا دھند بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ بھاگنے والوں نے سمت کا تعین نہیں کیا تھا۔ جان بچانے کے لیے وہ اس جگہ سے دور ہوجانا چاہتے تھے۔''

ہمارے اردگرد ایک ہجوم جمع ہوگیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے گویا سسکیوں کو روکنے کے لیے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ پھر جیسے وہ کوئی سخت چیز نگلتے ہوئے بولا ''میری بیٹی نے علاقے کے ایک معزز شخص کے گھر میں گھس کر پناہ لی تھی اور اس شخص نے میری بیٹی کو اڑتالیس گھنٹے تک اپنی اور اپنے دوستوں کی ''پناہ'' میں رکھا تھا۔ پورے اڑتالیس گھنٹے تک!''

وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ جیسے درد کی لہروں نے اس کے وجود کو نگل لیا ہو۔ اس نے اپنی خشک آنکھوں کو اس طرح پونچھا جیسے وہ ازل سے اپنی آنکھوں میں سمندر لیے پھر رہا ہو۔ پھر گویا وہ درد کی سرکش لہروں سے لڑتا سطح پر ابھر آیا۔ ٹوٹے ٹوٹے سے' دلوں میں چھید کرنے والے لہجے میں بولا۔

''کل..... عصر کے وقت میری بیٹی واپس لوٹ آئی تھی..... اور آج صبح اس نے خودکشی کرلی.....''

ہجوم میں کھڑے ہوئے لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر گردنیں جھکادیں۔ اچانک ایسی خاموشی چھا گئی تھی جیسے سب کی سانسوں کی آمدورفت کا سلسلہ رک گیا ہو۔ سب لوگ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سامنے رکھے ہوئے رجسٹر میں دو دن کی لکھی ہوئی ساری تفصیلات غائب ہوگئی ہیں' ورق سفید اور سادہ ہوگئے ہیں۔

''تمہاری سرکار کے پاس میرے لیے کوئی معاوضہ ہے؟'' وہ الٹے پاؤں چلتا ہوا آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہونے لگا۔ اس کی آواز مجھے سنائی دیتی رہی ''تمہاری سرکار کے پاس میرے لیے کوئی معاوضہ ہے.....؟ تمہاری سرکار کے پاس.....''

اس کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز لاکھوں کروڑوں لوگوں کے ماتمی جلوس میں گم ہوگئی۔ میں نے اس سے قبل کائنات کی کسی سمت میں بھی ایسی ماتمی آواز کبھی نہیں سنی تھی۔ عجیب الفاظ تھے' عجیب جملے تھے' ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ الفاظ' یہ جملے میرے اپنے وجود کو پھاڑ کر باہر نکلے ہوں۔ وہ درست تھے یا غلط' بہرحال میری سمجھ سے باہر تھے۔

ماتمی جلوس میرے وجود کو روندتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ہزاروں گھوڑوں کے گرد آلود' کیچڑ میں لت پت سم مجھے کچلتے ہوئے نکل گئے۔ میں نے گردن اٹھا کر ریلیف کیمپ سے باہر گم صم' بے کل شخص کی طرف دیکھا۔ اب وہ اس جگہ پر موجود نہیں تھا جہاں میں صبح سے اسے بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا۔

میرے جسم کو جیسے کرنٹ سا لگا۔ میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر تقریباً دوڑتا ہوا ریلیف کیمپ سے باہر نکل گیا۔ میں اِدھر اُدھر بھاگتا ہوا اسے تلاش کرنے لگا۔ اس طرح میں ایک کھلے میدان میں جا پہنچا۔ جہاں آسمان مجھے اپنے بہت قریب محسوس ہوا' تب اچانک اگربتیوں اور لوبان کے دھوئیں جیسے پھیلے ہوئے دھند آلود ماحول میں' میں نے اسے دیکھا۔ اس کی اُنگلی ایک معصوم بچے کے ہاتھ میں تھی..... اور وہ دونوں سورج کے غروب ہونے والے راستے پر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

''رکو' رکو.....'' میں انہیں پکارتا ہوا ان کے پیچھے دوڑنے لگا۔ وہ رکے نہیں' سورج کے غروب ہونے والے راستے پر بہ دستور آگے بڑھتے رہے۔ میں دوڑتا ہوا ان سے آگے نکل گیا اور پھر پلٹ کر ان کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ میں ہانپ رہا تھا۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ دونوں رک گئے۔ کھوئے کھوئے سے بے کل شخص کی انگلی بچے کی ننھی سی مٹھی میں تھی اور وہ پہلے ہی کی طرح خلاؤں میں دیکھ رہا تھا۔

''تم کون ہو.....؟'' میں نے تقریباً گڑگڑانے کے سے انداز میں اس سے پوچھا ''گولیوں کی ہونے والی برسات میں لگتا ہے تمہارا کوئی بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ تم اپنے نقصان کی تفصیل مجھے کیوں نہیں بتاتے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پہلے کی طرح خاموش رہا۔

''میں سرکار کو تمہارے نقصان سے آگاہ کروں گا۔ میں تمہیں تمہارے نقصان کا معاوضہ دلانے کی پوری کوشش کروں گا'' میں اس کی منت کرنے لگا ''پلیز بتاؤ' کچھ بولو..... آخر تم بولتے کیوں نہیں؟''

وہ خاموش رہا۔

''ٹھیک ہے..... تم اپنے نقصان کے بارے میں بے شک نہ بولو لیکن اتنا تو بتا دو کہ تم ہو کون؟''

''تم اسے نہیں پہچانتے؟'' اچانک بچہ بول اٹھا۔

میں نے چونک کر بچے کی طرف دیکھا۔ بچے کی عمر بہ مشکل چار' پانچ سال تھی لیکن اس کا لہجہ بڑوں کی طرح سنجیدہ اور گمبھیر تھا۔ بچے نے اپنا سوال دہرایا ''تم سچ مچ اسے نہیں پہچانتے؟''

''نہیں'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''میں اسے نہیں جانتا۔''

''یہ محبت کا پیغمبر ہے۔'' بچے نے بتایا۔

کچھ نہ سمجھتے ہوئے میں نے احمقوں کی طرح کہا۔ ''گولیوں کی برسات میں اس کا کوئی بہت بڑا نقصان ہوگیا ہے کیا؟''

''ہاں'' بچے نے جواب دیا ''اس سے اس کا وطن چھن گیا ہے۔''

میں اس جواب کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔

بچہ بولتا رہا ''اب تمہارے معاشرے میں سچل اور سامی پیدا نہیں ہوں گے۔ صرف سیاست داں پیدا ہوں گے جو خود کو پیر کہلوائیں گے۔''

بچے کی گفتگو نے میری بے چینی میں اضافہ کر دیا تھا۔ اتنے چھوٹے سے بچے کو میں نے اس سے پہلے اتنے صاف اور واضح الفاظ میں بولتے ہوئے کبھی نہیں سنا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ پُراسرار اور مبہم سا محسوس ہو رہا تھا۔

''تم کون ہو؟'' میں نے بچے سے پوچھا۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر آئی ''تم مجھے بھی نہیں پہچانتے؟''

''نہیں.....'' میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ''میں تمہیں بھی نہیں جانتا۔''

''میں تمہارا مستقبل ہوں۔ میں تمہارا کل ہوں'' بچے نے جواب دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے میرا مستقبل' محبت کے پیغمبر کی انگلی تھامے سورج کے غروب ہونے والے راستے پر آگے بڑھ گیا۔

پلک جھپکتے ہی وہ دونوں فضا میں تحلیل ہو کر میری نظروں کے سامنے غائب ہوگئے۔

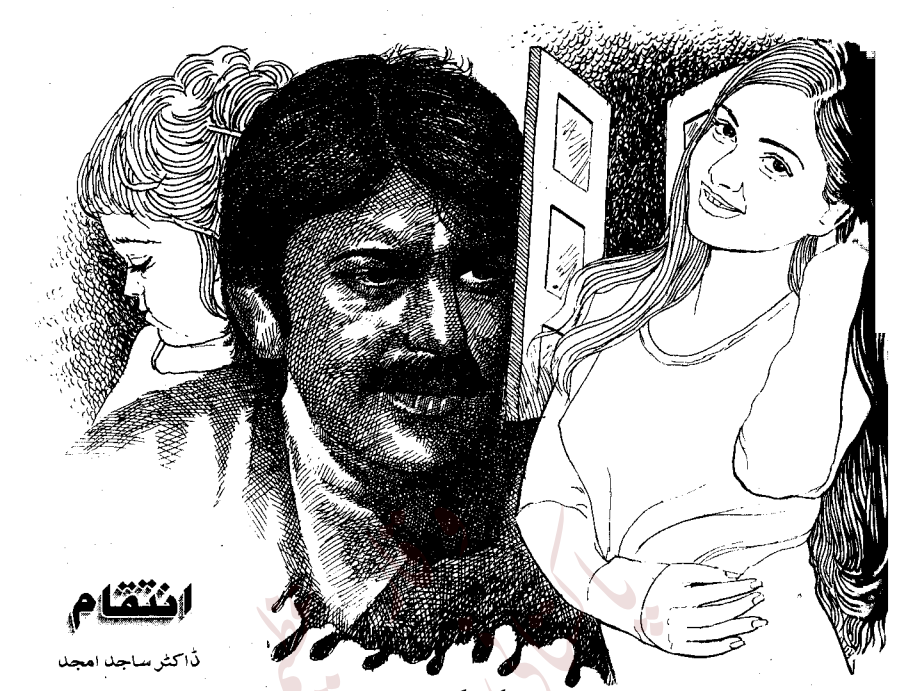

انتقام

ڈاکٹر ساجد امجد

جو لمحہ گزر گیا وہ ماضی کا حصہ بن کر محض یاد کی صورت باقی رہ جاتا ہے، ایسی یاد جو گزرتے لمحوں کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ بالآخر معدوم ہوجاتی ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماضی آئینہ کی صورت میں پلٹ کر سامنے آجاتا ہے اور اس میں انسان کو اپنا چہرہ بھی مکروہ دکھائی دینے لگتا ہے۔

زندگی کی تیرگیوں کی عکاس ایک عبرت ناک کتھا

لمبے قد، چھریرے بدن اور معمولی نقوش والی وہ لڑکی اسے سرراہ ملی تھی اور ملتے ہی اپنے آپ کو اس کے سپرد کرنے پر تیار ہوگئی تھی۔ ایسی لڑکی کے بارے میں کوئی بھی اچھی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ اس نے بھی اسے برا ہی سمجھا تھا مگر یہ سوچ کر وہ ہنسا بھی تھا کہ میں بھی تو اتنا ہی برا ہوں۔ میں بھی تو اسے اپنے ساتھ لے جارہا ہوں۔

عام طور پر ایسی لڑکیاں گاڑی والے کو ڈھونڈتی ہیں لیکن وہ اس کے ساتھ پیدل چل رہی تھی۔ وہ لباس سے بھی غریب معلوم ہورہا تھا اس کے باوجود اس لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ وہ فلم کا آخری شو دیکھ کر نکلا تھا۔ اس نے کچھ دیر تک اپنی بس کا انتظار کیا تھا اور پھر گھر تک پیدل جانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ فلم ہاؤس سے نکلنے والے لوگ اِدھر اُدھر چھٹ گئے تھے۔ وہ ابھی بس اسٹاپ سے ہٹ کر اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک کی طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ لڑکی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ کچھ دور تک روشنی رہی اور پھر اندھیرا آ گیا۔

''آپ مجھے جہاں لے کر جارہے ہیں، وہ جگہ اگر یہاں سے دور ہے تو بے شک آپ ٹیکسی وغیرہ لے لیں۔ میرے پاس پیسے ہیں۔'' اس لڑکی نے اس کے قریب آ کر کہا۔

''پیسے تو میرے پاس بھی بہت ہیں لیکن آپ کو یہ غلط فہمی کیونکر ہوگئی کہ میں آپ کو لے کر جارہا ہوں۔'' اس آدمی نے کہا۔

''چلو، میں خود ہی تمہارے ساتھ جارہی ہوں۔ بات تو ایک ہی ہے۔''

''مگر کیوں جارہی ہو؟''

''میں ہر رات کسی نہ کسی کے ساتھ جاتی ہوں۔ آج تمہارے ساتھ سہی اور ہاں، یوں دور دور مت چلو۔ قریب ہو کر چلو تاکہ لوگ شک نہ کریں بلکہ میرا ہاتھ تھام لو۔'' اس لڑکی

نے کہا اور اس آدمی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس آدمی کو ایک جھٹکا سا لگا لڑکی کا ہاتھ برف کی طرح سرد ہو رہا تھا جبکہ اتنی سردی بھی نہیں تھی اور پھر یہ کہ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس ہاتھ میں زندگی کی حرارت ہی نہ ہو۔ جیسے وہ لڑکی نہ ہو، اس کی لاش ہو۔ کہیں یہ چڑیل تو نہیں؟ اس آدمی نے گھبرا کر اس کے پیروں کی طرف دیکھنا چاہا۔ اندھیرے میں کچھ بھی تو نظر نہ آ سکا۔ وہ قرآنی آیات کا ورد کرتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ وہ مسلسل خاموش تھی اس لیے ماحول کچھ اور بھی پُراسرار ہو گیا تھا۔ کئی مرتبہ اس آدمی کا جی چاہا کہ اسے چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہو لیکن یہ لالچ اسے روکے رہا اگر وہ واقعی لڑکی ہے تو آئے ہوئے شکار کو کیوں چھوڑے۔

اس کش مکش میں وہ اپنے گھر کے قریب پہنچ گیا۔ گھر کیا تھا کسی نے خالی پلاٹ پر دو کمرے بنا کر اسے کرائے پر دے دیے تھے۔ پلاٹ کا پچھلا حصہ صحن کا درجہ رکھتا تھا جہاں وہ سردیوں کے دنوں میں دھوپ کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ دائیں بائیں کے دونوں پلاٹ خالی پڑے تھے اس لیے سناٹا رہتا تھا اور اس وقت تک آدھی رات گزر چکی تھی۔ اس سناٹے کے باوجود وہ سخت گھبرایا ہوا تھا کیونکہ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی لڑکی کو اپنے ہمراہ لایا ہو۔ اس نے جلدی جلدی تالا کھولا اور اسے لے کر کمرے میں آ گیا۔

''مجھے معلوم تھا تم تنہا رہتے ہو گے۔ اس لیے میں تمہارے ساتھ چلی آئی۔'' اس لڑکی نے برقع اتارتے ہوئے کہا۔

''میں اس کمرے میں بھی تنہا ہوں، محلے میں بھی اور دنیا میں بھی۔'' مرد نے کہا۔

''خیر یہ تو میں بعد میں پوچھوں گی کہ دنیا میں کیوں تنہا ہو، پہلے یہ بتاؤ کچھ کھانے کو ہے؟''

''بازار سے لانا پڑے گا۔''

''اس وقت مل جائے گا۔''

''یہاں سے کچھ فاصلے پر دکانیں دیر تک کھلی رہتی ہیں۔''

''پھر جلدی کچھ لے کر آؤ۔''

''ڈرو گی تو نہیں۔''

''میں تم سے نہیں ڈری تو تمہارے جانے کے بعد کیا ڈروں گی۔''

''میں باہر سے تالا ڈال کر چلا جاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا اور جہاں بیٹھی تھی وہیں لیٹ گئی۔

وہ ابھی تک پُراسرار بنی ہوئی تھی۔ وہ آدمی ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ یہ لڑکی انسانی مخلوق ہے یا آسیبی مخلوق۔ اس کا خوف اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ جلد از جلد اس سے دور ہو جائے۔ وہ باہر نکلا اور کمرے کو اچھی طرح بند کر کے تالا ڈال دیا۔ کئی گہرے گہرے سانس لیے اور بازار کی طرف چل دیا۔ اردگرد بنے ہوئے عالی شان مکان، گہری نیند سو رہے تھے۔ اس کے باوجود اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے دیواروں نے اس کی چوری پکڑ لی ہے۔ وہ آگے بڑھتا رہا۔

بہت سی دکانیں اور ایک ہوٹل کھلا ہوا تھا۔ اس نے ہوٹل سے بچا کھچا کھانا خریدا، بیکری سے ناشتا لیا اور گھر کی طرف چل دیا۔

تالا کھولتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ وہ غائب ہو چکی ہو گی لیکن وہ نہ صرف موجود تھی بلکہ بستر پر مزے سے دراز تھی۔

''آ گئے تم؟'' اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں سوچ رہی تھی، تم مجھے یہاں بند کر کے پولیس کو بلانے گئے ہو گے۔''

''پولیس کو کیوں بلاتا؟'' اس نے کہا۔ ''تم نے ایسا کیا جرم کیا ہے کہ میں پولیس کو بلاتا۔''

''میں نے قتل کیا ہے۔'' وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''قتل، قتل کیا ہے تم نے؟'' وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

''کیوں مذاق کرتی ہو۔ مجھے ڈرانا چاہتی ہو۔ میں ڈرنے والا نہیں۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''ڈرتو تم گئے ہو۔ خیر چھوڑو اسے۔ میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ یہ بتاؤ کھانے کے لیے کیا لائے ہو؟''

اس مرد نے دو تین دھلے ہوئے برتن نکالے اور جو کچھ لے کر آیا تھا اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ اس کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑی جیسے کئی دن سے کچھ نہ کھایا ہو۔ اس دوران وہ بالکل خاموش رہی۔ وہ آدمی اب اسے جی بھر کے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چہرہ اسے مانوس لگ رہا تھا۔ پھر وہ دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ ہر لڑکی ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔

وہ اچھا خاصا کھانا لے کر آیا تھا لیکن وہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام کھانا اکیلی چٹ کر گئی اور پھر خود ہی تمام برتن اٹھا کر اس جگہ رکھ دیے جہاں دوسرے برتن رکھے ہوئے تھے۔

''اس کمرے کے باہر کیا ہے؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''میرا صحن ہے۔''

''چلو، صحن میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''پاگل ہو گئی ہو؟ کسی کی نظر پڑ گئی تو میری کم بختی آ جائے گی۔''

''اتنا ڈرتے ہو تو یہاں کی لائٹ بھی بجھا دو۔''

وہ اس کی چالاکی پر ہنس رہا تھا۔ کس ترکیب سے لائٹ بجھانے کی ضد کر رہی ہے۔ اب کھانا کھا چکی ہے۔ لائٹ بجھنے

کے بعد نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اب اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر کیوں آ گیا۔ نہ جانے کس کا قتل کر کے آئی ہے۔ کیا خبر تھوڑی دیر میں پولیس بھی آ جائے اور اسے پناہ دینے کے جرم میں مجھے بھی پکڑ کر لے جائے۔ ایک یہ وہم بھی آ رہا تھا کہ موقع دیکھ کر میری جیب ہی خالی کر کے نہ چلتی بنے۔ اگر اس وقت وہ شور مچا کر محلے کو اکٹھا کر لے تو کیا ہو۔ اسے باتوں میں لگائے رکھنا چاہیے۔ اس نے سوچا۔

''تمہارا نام میں نے ابھی تک نہیں پوچھا۔'' مرد نے کہا۔

''اکثر لوگ میرا نام نہیں پوچھتے۔ بس کام سے کام رکھتے ہیں۔ تم بھی چاہو تو ایسا کر سکتے ہو۔'' لڑکی نے کہا۔

''مجھے دوسروں کی طرح مت سمجھو۔''

''میں نے بھی تو تمہارا نام نہیں پوچھا۔''

''میرا نام جہانگیر ہے اور تمہارا؟''

''آسیہ۔''

''تمہارے گھر والے ہیں؟''

''سب ہیں لیکن میں کسی سے نہیں ملتی۔ میرا کام ہی ایسا ہے کہ ان سے مل نہیں سکتی بلکہ وہ خود ہی مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔''

''تم ایسا کیوں کرتی ہو۔ تمہیں خبر نہیں یہ گناہ ہے۔''

''مجھے اپنا پیٹ بھی تو بھرنا ہے۔''

''اور بھی تو کام ہیں۔''

''زیادہ پارسا بننے کی کوشش مت کرو۔ اتنے پارسا ہوتے تو مجھے یہاں نہ لاتے۔''

''کم از کم میں کسی کا قاتل تو نہیں ہوں۔''

''میں نے قتل کیا ضرور تھا لیکن میں سزا بھگت چکی ہوں۔ اب آزاد ہوں۔''

''مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے قتل کیا ہوگا۔ کس کا قتل کیا تھا تم نے۔''

''بتا دوں؟ مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگو گے۔''

''میری نفرت سے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ میں تو یہ دیکھنے کے لیے پوچھ رہا ہوں کہ وہ کون بدنصیب تھا جسے تم نے قتل کر دیا۔''

''یہ نہیں پوچھو گے کہ حالات کیا تھے؟''

''چلو یہ بھی بتا دو۔''

وہ کچھ دیر کو چپ ہو گئی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔

''میں اسکول میں پڑھتی تھی کہ ایک لڑکا مجھے بھا گیا۔ اس نے بھی مجھے پہلی نظر میں پسند کرلیا۔ وہ مجھے [illegible] جیسے آج آپ مل گئے۔ میں اسکول جاتی تھی تو وہ مجھے راستے میں ملتا تھا۔

کچھ دن یونہی ہنسی اشارے چلتے رہے اور پھر ایک دن وہ حوصلہ کر کے میرے سامنے آ گیا۔ مجھے بالکل بھی برا نہیں لگا کیونکہ میں تو خود اس دن کے انتظار میں تھی۔ اس نے مجھے اشارہ کیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی ایک باغ میں پہنچ گئی۔ وہاں ہم دونوں قریب قریب بیٹھ گئے۔ وہ مجھ سے محبت بھری باتیں کرنے لگا۔ مجھے اس کی باتیں اتنی اچھی لگ رہی تھیں کہ اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میری عمر زیادہ نہیں تھی لیکن وہ اچھی عمر کا بڑا لڑکا تھا۔ وہ شیشے میں اتارنے کا ایسا ہنر جانتا تھا کہ میں اس میں اٹک کر رہ گئی۔

اب میں اسکول جانے کے بجائے اس باغ میں جانے لگی جہاں بیٹھ کر ہم دونوں پیار محبت کی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے شادی کے وعدے کیا کرتا تھا۔ ہر لڑکی کو شوق ہوتا ہے کہ اس کی شادی ہو جائے، مجھے بھی تھا لہٰذا میں نے یقین کر لیا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا اس لیے اب اس سے کیا تکلف۔

''آسیہ، تم رات کو یہاں نہیں آ سکتیں؟'' ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا۔

''رات کو کیسے آ سکتی ہوں۔ مجھے کون نکلنے دے گا؟''

''یہ تو بڑی مصیبت ہو گئی۔'' اس نے کہا۔ ''پیار کرنے والے تو رات میں ملتے ہیں۔ ہم کب تک یوں دن میں ملتے رہیں گے؟''

''رات سے کیا ہے؟ ہم ملتے تو ہیں دن میں سہی......''

''تم نہیں سمجھو گی۔'' اس نے کہا تھا۔ ''بس کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ ہم رات میں مل سکیں۔''

''تم میری چھت پر آ سکتے ہو۔'' میں نے بہت غور کرنے کے بعد کہا تھا۔

''تمہاری چھت پر کیسے آؤں گا اور وہ بھی رات کے وقت۔''

''تم فکر مت کرو۔ جب سب سو جایا کریں گے، میں دروازے کی کنڈی کھول دیا کروں گی۔ تم دبے پاؤں زینہ چڑھ جایا کرنا۔''

''کسی دن کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''گرمیوں کا تو میں کہہ نہیں سکتی لیکن سردیوں میں ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔''

''ابھی تو گرمیاں ہیں۔''

''ابھی دن میں ملتے ہیں۔ سردیاں آئیں گی تو رات

میں مل لیا کریں گے۔''

ہم دونوں نے بڑی مشکل سے گرمیوں کے یہ دن کاٹے۔ جب سردیاں آئیں اور گھر والے کمروں میں سونے لگے تو میں نے اسے چھت پر بلانے کا انتظام کرلیا۔ گھر والوں کے سو جانے کے بعد میں نے کنڈی کھول دی اور وہ بڑے آرام سے چھت پر پہنچ گیا۔ اس کے اوپر پہنچنے کے بعد میں بھی اوپر پہنچ گئی۔

میرے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں چچا چچی کے پاس رہتی تھی۔ میرے باپ نے اچھی خاصی جائداد چھوڑی تھی اس لیے اس گھر میں میری قدر ہو رہی تھی۔ چچا کا ایک ہی لڑکا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں سوتا تھا، میں اپنے کمرے میں۔ اس لیے کسی کو معلوم ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ کب میں اپنے کمرے سے نکلی اور چھت پر پہنچ گئی۔

پھر پتا ہے کیا ہوا۔ وہ بے اختیار ہنسنے لگی اور پھر اچانک رونے لگی۔ میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ کب وہ رونا بند کرے اور اپنی کہانی سنائے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر خود اس کے آنسو پونچھتا۔

کچھ دیر بعد اس نے خود پر قابو پایا اور اپنی کہانی کو آگے بڑھایا۔ ''پھر وہ ہوا جو شادی سے پہلے نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

سردیاں گزر گئی تھیں۔ اب ہم چھت پر نہیں مل سکتے تھے۔ وہ مجھ سے دن کے وقت باغ میں ملنے آتا تھا لیکن اب اس میں وہ گرم جوشی نہیں رہی تھی۔ ادھر میرا یہ حال تھا کہ اس سے شادی کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں اس سے شادی کے تقاضے کرتی رہی اور وہ ٹالتا رہا۔

اس نے خود کہا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا لیکن اب کئی مجبوریاں اس کا راستہ روک رہی تھیں۔ اب اسے اپنے گھر والے یاد آنے لگے تھے جو اس شادی کی مخالفت کرسکتے تھے۔ اب اسے یہ بھی یاد آنے لگا تھا کہ وہ کچھ کماتا تو ہے نہیں، شادی کے بعد مجھے رکھے گا کہاں؟ کھلائے گا کہاں سے؟ اسے میری مجبوریوں کی پروا نہیں تھی، اپنی مجبوریوں کا خیال تھا۔ میں نادانی میں اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی لیکن اس کے نزدیک میری اس رسوائی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

ایک دن اس کے ساتھ میری خوب جنگ ہوئی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ وہ شادی کرے یا نہ کرے میں آج اس کے ساتھ اس کے گھر جاؤں گی۔

میں اپنے گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، میں اس کے ساتھ جاؤں گی۔ میری یہ ضد دیکھ کر وہ پریشان ہوگیا۔ وہ مجھ سے زیادہ دیر لڑ نہیں سکتا تھا کیونکہ سارا قصور اسی کا تھا۔ اپنی صفائی میں کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے مجھے بڑے پیار سے سمجھایا۔

''بس آج کا دن اور گزار لو۔ آج اپنے گھر چلی جاؤ۔ کل میں انتظام سے آؤں گا اور تمہیں اپنے گھر لے کر جاؤں گا۔ تم سے شادی کروں گا۔ تمہیں رانی بنا کر رکھوں گا۔''

اس کی باتیں ہی ایسی تھیں کہ میں جھانسے میں آ گئی اور خوش خوش اپنے گھر چلی آئی۔ یہ میری اس سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد وہ کبھی اس باغ میں نہیں آیا۔

میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ میں اتنی بے وقوف تھی کہ اتنے دن میں یہ بھی معلوم نہیں کرسکی تھی کہ وہ رہتا کہاں ہے۔ اس نے اپنا نام ضرور بتایا تھا لیکن یہ نام غلط بھی تو ہوسکتا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں اس کے علاوہ کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا۔ کوئی ایسی سہیلی بھی نہیں تھی جس پر میں نے یہ راز ظاہر کیا ہو۔ کسی سے مشورہ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی۔ برباد کرنے والا برباد کر کے جا چکا تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا کہ جس سے میں اس کی شکایت کرسکتی اور جب یہ خیال آتا کہ کچھ مہینوں بعد میں ناجائز بچے کی ماں بنوں گی تو میرے ہوش اُڑ جاتے تھے۔ میری حالت آہستہ آہستہ بگڑنے لگی تھی۔ مجھے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ اسکول جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ تنہائی میں بیٹھی خود سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ کئی کئی دن کپڑے نہیں بدلتی تھی۔ خود کو چھپائے رکھتی تھی کہ کوئی میرا جسم دیکھ کر میرے اندر ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس نہ کر لے۔ مختصر یہ کہ میری حالت پاگلوں سے مختلف نہیں تھی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، میری گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب میں نے سوچ لیا تھا کہ رسوا ہونے سے پہلے اپنی جان دے دوں گی لیکن جان دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ کئی ہفتے یہ سوچتے ہوئے گزر گئے کہ خودکشی کا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے کہ صرف میری جان جائے کسی اور پر مصیبت نہ آئے۔

اپنی کہانی سناتے ہوئے اس پر عجیب اضطراب کا عالم طاری تھا۔ کبھی لیٹ جاتی کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی تھی۔ کبھی اس کا چہرہ سفید پڑ جاتا تھا، کبھی مسکراہٹ ابھر آتی تھی۔ یہ کہانی کبھی بھی ایسی کہ اس کیفیت سے اسے دوچار ہونا ہی تھا۔ وہ مرد اس کی طرف ہمدردی کی آنکھوں سے دیکھنے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔

''ایک گلاس پانی ملے گا۔'' اس نے کہا اور وہ شخص اس کے لیے پانی لینے کو دوڑا جیسے فوراً اسے پانی نہ ملا تو وہ مر جائے گی۔

''کہانی سن کر خوف زدہ ہو گئے ہو؟'' اس نے پانی کا گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''میں خوف زدہ تو نہیں ہوں لیکن کہانی ایسی ہے کہ تم سے ہمدردی ضرور ہو رہی ہے۔''

''بیٹھو، میں تمہیں آگے کی کہانی سناتی ہوں۔'' اس نے پانی کا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنی کہانی سنانی شروع کردی۔

''میری حالت ایسی نہیں تھی کہ زیادہ دن چھپی رہتی۔ میری چاچی کی جہاں دیدہ نظروں نے میری بدلتی ہوئی جسمانی کیفیت کو بھانپ لیا۔ جب انہوں نے شفقت کا ہاتھ میرے سر پر رکھا تو میں پگھل گئی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پھر پوری کہانی لفظ بہ لفظ انہیں سنادی۔ انہوں نے تو سر پیٹ لیا۔ اتنا صدمہ شاید انہیں اس وقت بھی نہ ہوتا جب میں مرجاتی جتنا اس حقیقت کو سن کر ہوا تھا۔ انہوں نے خود بھی یہی کہا تھا، آسیہ اگر تو مرگئی ہوتی تو صبر کرلیتی لیکن اب کیا کروں۔ تو پرائی اولاد ہے۔ لوگ تو یہی کہیں گے، ہم تیری حفاظت نہ کرسکے۔

کچھ دیر بعد ان کا غصہ اترا تو انہوں نے مجھے تسلی دی۔ بڑے پیار سے کہا، تو معصوم ہے اللہ تجھے معاف کردے گا۔ مجھے سمجھایا کہ میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤں کہ ان سب کا منہ مزید کالا ہو۔ میں نے غصے میں آکر کہہ دیا تھا کہ میں اپنی جان دے دوں گی۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ جان دینے کا کوئی فائدہ نہیں، وہ سب سنبھال لیں گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دیں گی۔ یہ الجھن ایسی نہیں تھی کہ وہ اکیلی سنبھال لیتیں۔ چاچا کو بتانا ضروری تھا۔ انہوں نے چاچا کو بھی بتادیا۔ پہلے تو وہ خوب گرجے لیکن ظاہر ہے میرا گلا تو گھونٹ نہیں سکتے تھے۔ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ چوری ہو چکی تھی اور چور کا پتا نشان کوئی نہیں تھا، وہ جا کر کس کا گریبان پکڑتے۔ پولیس تک بات پہنچانا اپنی رسوائی کو خود دعوت دینا تھا۔ وہ بھی چاچی کی طرح سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

اس دن کے بعد سے چاچی نے میری حفاظت شروع کردی تھی کہ کہیں میں ایسا ویسا کوئی قدم نہ اٹھا بیٹھوں۔ میں اتنی چھوٹی تھی کہ مجھے تو کوئی قدم اٹھانا بھی نہیں آتا تھا۔ میں تو چاچی کا منہ تکتی رہتی تھی۔

آخر وہ ''وقت'' آگیا۔ چاچی نے ایک ایسی عورت کا انتظام کرلیا جو ''یہی'' کام کرتی تھی۔ اس نے بھاری رقم لے کر رازداری کی شرط قبول کرلی۔

دو تین دن برابر وہ عورت مجھے دیکھنے کے لیے آتی رہی۔ ان دنوں میری ذہنی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ میری سوچیں مجھے نہ جانے کیا کیا یاد دلا رہی تھیں۔ مجھے وہ رہ رہ کر وہ یاد آرہا تھا جو میرا مجرم تھا۔ میں اس سے انتقام لینا چاہتی تھی لیکن وہ میرے سامنے نہیں تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر بیٹی پیدا ہوئی تو میرا انتقام پورا ہو جائے گا۔ میں اس کو ایسی آوارہ زندگی دوں گی کہ ہمیشہ اپنے باپ کے نام پر کالک ملتی رہے گی۔ جوں جوں پیدائش کا وقت قریب آرہا تھا میرے دل میں انتقام کی آگ تیز ہوتی جارہی تھی۔

چاچی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ پیدائش کے بعد اس بچے کو دنیا کی نظروں سے کیسے چھپائیں گی۔ اس کا حل یہ نکالا گیا تھا کہ اس کام سے نمٹتے ہی مجھے ایک اور چاچا کے گھر بھیج دیا جائے گا جو دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔ بچہ کچھ بڑا ہو جائے گا تو اسے کسی خیراتی ادارے کے سپرد کردیا جائے گا یا کسی بے اولاد کو دے دیا جائے گا اور میں واپس آجاؤں گی۔

میری قسمت..... یا پھر اس بدبخت کی قسمت جو میرا مجرم تھا کہ بیٹی نہیں بیٹا پیدا ہوا۔ میں نے اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا تھا۔ میں جب بھی اسے دیکھتی، میری آنکھوں میں خون اتر آتا۔ اس کی وجہ سے میری بے عزتی ہوئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بند پڑی ہوئی تھی۔ میں اپنا قصور بھول گئی تھی۔ مجھے تو بس اتنا یاد تھا کہ اس کے آنے سے میری دنیا اندھیر ہوگئی تھی۔

ایک دن ایسا رونا لگا ہوا تھا کہ چپ ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ چاچی بار بار آکر مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اسے چپ کرالوں۔ میں ان کے تقاضوں سے تنگ آگئی تھی۔ پھر نہ جانے کون سے جذبے نے مجھے بے قابو کردیا۔ میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے بچے کا گلا گھونٹ دیا۔ اس میں جان ہی کتنی تھی۔ ذرا سا دباؤ پڑا تو وہ ہمیشہ کے لیے چپ ہوگیا۔ اسے مردہ دیکھ کر مجھ پر ایسی ہذیانی کیفیت طاری ہوئی کہ میں نے اپنے بال نوچ ڈالے، کپڑے تار تار کرلیے اور کمرے سے نکل آئی۔ میری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ میرے پاگل ہونے میں کسی کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

بچے کی پیدائش تو چھپ گئی تھی لیکن اس کا قتل نہیں چھپ سکا۔ میں نے خود چیخ چیخ کر سب کو بتادیا کہ میں قاتل ہوں۔ معاملہ پولیس تک پہنچ گیا۔ چاچا بھی گرفتار ہوگئے۔ مجھے بھی پکڑ لیا گیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں اپنی جان بچانے کے لیے سچ مچ کی پاگل بن جاؤں۔ میں نے تھانے پہنچتے ہی گالیاں بکنا شروع کردیں۔ جو چیز ہاتھ میں آئی، اٹھا کر پھینک دی۔

اس میں تو کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ میں پاگل ہوگئی ہوں اور پاگل کی کوئی سزا نہیں لیکن اب پولیس کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ بچہ ناجائز تھا لہٰذا انہیں رقم گھسیٹنے کا موقع مل گیا۔ چاچا ایسے پھنس گئے کہ انہوں نے اپنی جان بچانے کے لیے پولیس کو بھاری رقم دے کر منہ بند کردیا۔ مجھے بھی گھر لے آئے۔

میرے ان چاچا' چاچی کو بھی بلا لیا گیا جن کے گھر میں بچے کو جنم دینے کے بعد جانے والی تھی۔ میری حالت دیکھ کر میرے دونوں چاچا ایک خوفناک منصوبے پر عمل کرنے کے لیے ایک ہو گئے۔ میرے باپ نے بہت ساری جائداد چھوڑی تھی جس کی میں اکیلی وارث تھی۔ میری شادی ہوتے ہی وہ جائداد میری ہو جاتی۔ چاچا نہ جانے کب سے اسے ہتھیانے کے چکر میں ہوں گے۔ اب انہیں موقع مل گیا۔ سب دیکھ چکے تھے کہ میں پاگل ہو گئی ہوں۔ پاگل ہوئے بغیر کون اپنے بچے کو مار سکتا ہے۔

میں چیختی رہ گئی کہ میں پاگل نہیں ہوں لیکن کون پاگل ہوگا جو کہے گا، میں پاگل نہیں ہوں۔ انہوں نے مجھے رسیوں سے باندھ دیا۔ میرے بال کاٹ دیے، کھانا پینا بند کر دیا۔ زیادہ چیختی تو مجھے مارتے۔ چند دنوں میں میری حالت واقعی پاگلوں جیسی ہو گئی۔ محلے کی عورتیں مجھے دیکھنے آتی تھیں۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ میں پاگل ہو گئی ہوں۔ چاچا نے اپنی مضبوطی دیکھ کر مجھے پاگل خانے میں داخل کرا دیا۔

وہ ایسی جگہ ہے جہاں اچھے بھلے آدمی کو داخل کرا دو تو وہ سچ مچ کا پاگل بن کر نکلے۔ ڈاکٹروں نے مجھے بجلی کے اتنے جھٹکے دیے کہ میں ادھ موئی ہو گئی۔ خطرناک پاگل عورتوں کے درمیان رہ رہ کر مجھے بھی ان جیسا بننا پڑا۔ دو تین کی ٹھکائی کی تب کہیں جا کر انہوں نے مجھے برداشت کیا۔

میں اکیلے میں روتی تھی کہ سزا تو اس ظالم کو ملنی چاہیے تھی جو میری عزت سے کھیلا لیکن سزا مجھے مل رہی ہے۔ پاگل بھی مشہور ہوئی اور گھر سے بھی گئی۔

پاگل خانے میں وقت کا حساب کیسے رہتا ہے۔ کیا خبر کتنے برس بیت گئے۔ اب تو مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میرا گھر کیسا تھا۔ بس ایک چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ اس لڑکے کا چہرہ جس نے مجھے اس حال کو پہنچایا تھا۔ گھر سے کوئی ملنے بھی نہیں آتا تھا جو مجھے بتاتا کہ میری جوانی کے کتنے سال یہاں کٹ گئے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ مجھے وہاں سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ میرے وارڈ میں ڈاکٹر کسی کو دیکھنے آیا تھا۔ دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ میں چپکے سے باہر نکل آئی۔ ٹہلتے ہوئے، مختلف دروازوں سے ہوتی ہوئی بیرونی دروازے تک آ گئی لیکن گیٹ بند تھا اور وہاں چوکی دار موجود تھا۔ میں ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی اور موقع کا انتظار کرنے لگی۔

اندھیرا پھیلنے لگا تھا جو میرے حق میں اور بھی اچھا تھا۔ اتنی دیر میں رات کا ڈاکٹر آیا۔ اس کی گاڑی کے لیے چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ گاڑی اندر آئی اور اس سے پہلے کہ چوکی دار دروازہ بند کرتا، ڈاکٹر صاحب نے اسے بلایا۔ وہ دوڑتا ہوا اندر آنے والی گاڑی کی طرف گیا اور مجھے موقع مل گیا۔ میں آرام سے دروازے سے باہر نکلی اور جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑی ہوئی۔

مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور رات کہاں گزاروں گی پھر آپ کی طرح ایک مہربان آدمی مل گیا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہ اس وقت گھر میں اکیلا تھا لیکن وہ بیوی بچوں والا تھا۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب اس نے مجھ سے کہا، میں نہالوں اور یہ کپڑے پہن لوں۔ اس نے زنانہ کپڑوں کا ایک جوڑا مجھے دیا۔ میں نے غسل کیا اور کپڑے پہن لیے۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ صبح جب میں اس کے گھر سے رخصت ہوئی تو اس نے مجھے پیسے بھی دیے۔

میں ابھی تک اپنے ظالم عاشق کو نہیں بھولی تھی۔ میرا نام اس کے نام کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ میری عقل نے اس وقت یہی فیصلہ کیا کہ میری تباہی اس کی تباہی ہے۔ میں نے اپنی دانست میں اس سے انتقام لینا شروع کر دیا۔ اب میں ہر رات ایک نئے گھر میں بسر کر رہی تھی۔

ایک دن بڑا مزہ آیا۔ مجھے گشت پر موجود پولیس والوں نے پکڑ لیا اور پھر پتا ہے کیا ہوا۔ وہ مجھے تھانے لے جانے کے بجائے ایک گھر میں لے گئے۔ قانون کے رکھوالوں نے بھی میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو اور لوگ کر رہے تھے۔ مجھے جیل میں بھی بند نہیں کیا، گھر میں بھی نہیں رکھا۔ صبح ہوتے ہی گھر سے نکال دیا۔ میں نے بھی سوچا، چلو جان چھوٹی لاکھوں پائے۔ یہ میری بھول تھی کہ جان چھوٹ گئی۔ رات کو پھر وہی دو پولیس والے آ گئے کہ چلو، ہمارے صاحب نے تمہیں تھانے بلوایا ہے۔ میں نے کہا بھی کہ تھانے کا بہانہ کیوں کرتے ہو۔ سیدھی بات کر دیں لیکن وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے تھانے لے گئے۔ وہاں ایک موٹا مونچھوں والا آدمی بیٹھا تھا۔ یہ ان کا صاحب تھا۔

جب ہر رات میرے ساتھ یہ سلوک ہونے لگا تو مجھے فکر ہوئی۔ میری تو آمدنی ماری جا رہی ہے۔ مجھے یہ تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ میں کہاں ہوں، کس شہر میں ہوں۔ میں ٹرین میں بیٹھی اور اس سے بھی بڑے شہر کراچی آ گئی۔ کل ہی میں کراچی پہنچی تھی اور آج تم مل گئے۔ تم کیا ملے میری محنت وصول ہو گئی۔ میں کہاں ٹھوکریں کھاتی۔ ایک رات کا سہارا تو ہوا۔ تم چاہو تو میرے مستقل گاہک بھی بن سکتے ہو۔ تم مجھے اچھے لگے ہو اور اکیلے بھی ہو۔ ویسے تم کرتے کیا ہو؟''

''میں ایک کارخانے میں ویلڈنگ کا کام کرتا ہوں۔'' جہانگیر نے کہا۔

''آمدنی تو ٹھیک ٹھاک ہو جاتی ہوگی؟''

''بس گزارہ ہو ہی رہا ہے۔''

''میرا مطلب ہے، مجھ پر خرچ کرنے کے لیے تو پیسے ہوں گے۔ ویسے میں زیادہ خرچ نہیں کراؤں گی۔''

اس لڑکی کی کہانی سن کر جہانگیر کو یہ بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس کے سامنے ہے۔ وہ اس کی باتوں کا اب بھی دے رہا تھا تو اس طرح جیسے خواب میں بول رہا ہو۔ پہلی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

''تم سب کی ہمدردیاں اسی کہانی کو سنا سنا کر خریدتی ہو؟'' جہانگیر نے کچھ اور اگلوانے کی نیت سے پوچھا۔

''مجھے کیا پڑی ہے کہ اپنا وقت برباد کرتی پھروں۔ یہ کہانی تو میں نے صرف آپ کو سنائی ہے۔''

''مجھ میں ایسی کیا بات ہے کہ میرے سامنے اپنا ماضی دہرانے بیٹھ گئیں۔''

''بس تم مجھے اچھے لگ گئے۔ میری طرح سیدھے سادے۔ اپنے اپنے سے لگے۔ سوچا، دل ہلکا کرلوں حالانکہ یہ کہانی سن کر تمہیں مجھ سے نفرت ہوگئی ہوگی۔ ویسے ہونی نہیں چاہیے کیونکہ میں نے یہ کہا ہی نہیں کہ میں کوئی شریف لڑکی ہوں۔ شریف ہوتی تو یوں تمہارے ساتھ نہ چلی آتی۔ شریف تو استاد تم بھی نہیں ہو ورنہ مجھے لے کر نہ آتے۔''

وہ خود ہی بول رہی تھی خود ہی سن رہی تھی۔ جہانگیر کے کانوں میں سناٹے سیٹیاں بجا رہے تھے۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں اتنی دور نکل آیا تھا کہ وہ لڑکی اسے ڈھونڈ بھی نہیں سکتی تھی۔

آسیہ اس کے قریب سمٹ آئی تھی۔ اب غالباً اس نے بولنا بھی بند کر دیا تھا۔ سناٹا اور بڑھ گیا تھا۔

''تمہیں تو اپنے پیسے چاہیے ہیں ناں؟'' جہانگیر نے اسے دور ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں اپنی فیس تو وصول کروں گی۔''

''پھر چپ ہو کر سو جاؤ۔ تمہیں تمہارے پیسے مل جائیں گے۔''

''میں نے باتوں میں رات گزار دی، اس لیے ناراض ہو؟''

''میں ناراض نہیں ہوں۔ بس تم سو جاؤ۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو حکم ماننے کی فیس لیتی ہوں۔ حکم جو بھی ہو۔ یہ ہے تو یہی سہی۔'' آسیہ نے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن وہ سو نہیں رہا تھا، یہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ اس لڑکی نے اچانک اسے پندرہ سال پیچھے بھیج دیا تھا۔ اسے اپنے سوتیلے بھائی یاد آ رہے تھے جن کے ساتھ وہ رہا کرتا تھا۔ اسے وہ دن بھی یاد آ رہا تھا جب وہ کسی کو بتائے بغیر گھر سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ سوچنے کے لیے اور بھی بہت کچھ تھا لیکن اس وقت تو وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ فرار کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں یا کوئی دروازہ بھی کھلا رہ گیا ہے۔

صبح ہونے میں دیر ہی کتنی رہ گئی تھی۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ دن نکل آیا۔ اسے اب کارخانے جانے کے لیے گھر سے نکلنا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے اٹھتے ہوئے دیکھ کر وہ بھی اٹھ بیٹھی۔ غالباً وہ بھی اسی کی طرح سوئی نہیں تھی کچھ سوچ رہی تھی۔

''کارخانے جانے کے لیے اٹھے ہو؟''

''ہاں۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے۔ ویسے تو میں نے گھر دیکھ لیا ہے۔ آتی جاتی رہوں گی۔''

''نہیں۔ تم آج یہیں رہو گی۔''

''ڈبل فیس ہو جائے گی۔''

''میں دوں گا۔ تم فیس کی فکر مت کرو۔''

''آج بھی باتیں کرو گے یا.....''

''تمہیں اس سے کیا۔ تم تو حکم ماننے کے لیے ہو۔''

''میں آپ کے لیے ناشتا بناتی ہوں۔''

''میں ناشتا باہر کر لوں گا۔ تم چاہو تو نہا کر کھا لینا۔ میں دوپہر تک آ جاؤں گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔''

دن کی روشنی میں جہانگیر نے اس کی طرف دیکھا اور اسے بہت کچھ یاد آ گیا لیکن اس وقت کچھ ظاہر کرنا اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ وہ پہلے یہ طے کر لینا چاہتا تھا کہ کیا مناسب ہے اور کیا نامناسب ہے۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور باہر نکل آیا۔ وہ ہر روز باہر سے تالا لگا کر جاتا تھا لہٰذا تالا لگانا ضروری تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ یہ ڈر بھی تھا کہ ''وہ'' بھاگ نہ جائے۔ اس نے باہر سے تالا لگا دیا اور گلی سے نکل آیا۔ اسے اچانک یوں لگا جیسے ہر آنکھ اسے دیکھ رہی ہو۔ اس کا چہرہ سیاہ ہو چکا ہے۔ آسیہ کے گناہوں کی جتنی سیاہی ہے، اس کے چہرے پر آ گئی ہے۔ ٹھیک ہے، وہ اسے نہیں پہچان سکی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو پہچان چکا تھا۔ وہ وہی آدمی تھا جس نے اسے اس حال کو پہنچایا ہے۔ وہ اسے کیسے پہچان سکتی تھی۔ اس واقعے کو تقریباً پندرہ سال گزر چکے تھے۔ وہ لڑکے سے مرد بن چکا تھا۔ اس نے چہرے پر ہلکی سی داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ وہ خود بھی ابتدا میں اسے پہچان نہیں

سکا تھا۔ اگر وہ اپنی کہانی نہ سناتی اور اس کا ایک ایک لفظ اس کی یادداشت کو نہ جھنجوڑ دیتا تو وہ کب اسے پہچان پاتا۔ آسیہ میں بھی کتنی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ پندرہ سال کی لڑکی سے وہ تیس سال کی عورت بن گئی تھی۔ حالات کی دھوپ میں وہ اس قدر جلی تھی کہ اس کا اصلی چہرہ باقی ہی کب رہا تھا۔

اس کہانی میں صرف ایک لفظ ایسا تھا جو جہانگیر سے متعلق نہیں تھا اور وہ تھا اس کا نام۔ جہانگیر سے جب اس کی ملاقات ہوئی تھی تو اس نے اپنا نام جہانگیر نہیں کچھ اور بتایا تھا۔ کیا بتایا تھا، یہ اب اسے بھی یاد نہیں رہا تھا۔ بس اتنا یاد تھا کہ اس کی نیت میں شروع سے ہی کھوٹ تھا اس لیے نام غلط بتایا تھا۔

وہ شکر ادا کر رہا تھا کہ آسیہ نے اسے پہچانا نہیں ورنہ قیامت آ جاتی۔ اس کی قسمت ایک مرتبہ پھر اسے اس کے سامنے لے آئی تھی۔ اس میں خدا کی کیا مصلحت پوشیدہ ہے، وہ کارخانے تک پہنچتے پہنچتے یہی سوچتا رہا۔ کارخانے پہنچنے کے بعد جب وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا تو بھی وہ یہی سوچتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ آج وہ کوئی کام نہ کرے، اکیلا بیٹھ کر سوچتا رہے کہ اسے کیا کرنا ہے لیکن ایسا ضروری کام آ گیا تھا کہ اسے فرصت نہیں مل سکی تھی۔ دوپہر تک اس کے ہاتھ اور دماغ ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

دوپہر کو کھانے کا وقفہ ہوا تو حاجی صاحب نے اسے آواز دی۔ حاجی صاحب اس کارخانے کے مالک بھی تھے اور اس کے استاد بھی۔ وہ اس پر اتنے مہربان تھے کہ اس کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ جہانگیر نے جلدی جلدی ہاتھ دھوئے اور حاجی صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ وہ دسترخوان بچھائے اس کا انتظار ہی کر رہے تھے۔

کھانے کے دوران بھی وہ چپ چپ رہا۔ حاجی صاحب نے کئی مرتبہ پوچھا لیکن وہ ٹال گیا۔ کھانے کے بعد اچانک اسے خیال آیا کہ حاجی صاحب بزرگ ہیں اور اس سے محبت بھی کرتے ہیں۔ وہ جو بھی مشورہ دیں گے اس کے حق میں ہوگا۔ ان سے مشورہ کرنا چاہیے۔

''حاجی صاحب، آپ سے ایک اہم مشورہ لینا ہے۔ آپ نے دنیا دیکھی ہے۔ آپ مجھے کوئی صحیح مشورہ دیں گے۔''

''بول بھائی، کیا مسئلہ ہو گیا تجھے؟''

''حاجی صاحب، میں جب اپنے شہر میں تھا تو مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ اس محبت میں ہم بہت دور تک چلے گئے تھے پھر میں ڈر گیا اور اسے چھوڑ کر، کراچی بھاگ آیا۔ آپ کو تو معلوم ہے، میں سوتیلے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ دوبارہ پلٹ کر بھی نہیں گیا۔ مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہاں کیا ہوتا رہا۔ اب وہ لڑکی زمانے کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی مجھ تک پہنچ گئی ہے۔ وہ مجھے نہیں پہچان سکی لیکن میں اسے پہچان گیا ہوں۔ وہ تقریباً وہی ہے۔ اب بتائیے میں کیا کروں؟''

''کرنا کیا ہے؟'' حاجی صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تو نے اسے برباد کیا تھا، اب تو ہی اسے آباد کر لے۔''

''کھل کر بتائیے حاجی صاحب۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''شادی کر لے اس سے۔ تیرا گھر بھی بس جائے گا اور اس غریب کو بھی ٹھکانا مل جائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے حاجی صاحب، میں ٹھیک سوچ رہا تھا۔''

''کیا تو نے بھی یہی سوچا تھا؟''

''سوچا تو یہی تھا لیکن میں ٹھیک ہوں یا نہیں، یہ سوچنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اب آپ کی گواہی مل گئی تو میں مطمئن ہو گیا۔ میرے گناہوں کا ازالہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ اب جوانی کی وہ ترنگ رخصت ہو چکی ہے جس کے بہاؤ میں بہہ کر میں نے اسے لوٹ لیا تھا۔ میں تو یہی سمجھتا رہا تھا کہ وہ رو دھو کر چپ ہو گئی ہوگی لیکن میری ایک غلطی کی اتنی بڑی سزا ملی ہوگی، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

''پھر دیر کس بات کی ہے! کر لے شادی۔''

جہانگیر نے حاجی صاحب کو یہ نہیں بتایا تھا کہ آسیہ اب تک کس قسم کی زندگی گزارتی رہی ہے۔ وہ نہ جانے کن کن لوگوں کے ساتھ راتیں بسر کر چکی ہے اور اب میں اسے اپنا بنا لوں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان تھا جو اسے کش مکش میں مبتلا کیے ہوئے تھا پھر اس نے سوچا، لوگ طوائفوں سے بھی تو شادی کر لیتے ہیں اور پھر آسیہ کو طوائف بنانے والا تو میں خود ہوں۔ میں گناہ گار ہوں تو پھر سزا بھی مجھ ہی کو ملنی چاہیے۔ اگر میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تو وہ پھر گناہوں کے اس سمندر میں اتر جائے گی۔ میں اسے یہیں روک دوں تو شاید میری بخشش ہو جائے۔

وہ حاجی صاحب کے پاس سے اٹھ کر بہ ظاہر اپنے کام میں لگ گیا تھا لیکن اس کا ذہن برابر اس گتھی کو سلجھانے میں مشغول تھا۔ کبھی ایک حل ڈھونڈتا تھا کبھی دوسرا۔ وہ آسیہ سے دوپہر تک آنے کا کہہ آیا تھا لیکن کسی نتیجے پر پہنچے بغیر وہ گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ اپنے آپ سے سوال کرتا رہا، جواب ڈھونڈتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ کارخانہ بند ہونے لگا تو اسے بھی گھر کی طرف لوٹنا پڑا۔ وہ ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا لیکن

گھر تو جانا تھا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے تالا کھولا اور گھر میں داخل ہوا۔ گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ صفائی منہ سے بول رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی مزے سے کوئی پرانا رسالہ پڑھ رہی تھی۔

''آ گئے آپ۔'' اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا ''کارخانے میں کام زیادہ ہوگا ورنہ آپ تو دوپہر ہی کو آجاتے۔ یہی کہہ کر گئے تھے۔''

''ہاں، کام زیادہ تھا۔''

''کھانا تو آپ نے کھالیا ہوگا؟''

''کھالیا تھا۔'' کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ بولی۔

''میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

''میں چائے نہیں پیوں گا۔ یہ تمہارے لئے کھانے کو کچھ لایا ہوں۔ بھوک لگ رہی ہوگی۔ کھالو۔''

''آپ کے ساتھ بیٹھ کر کھاؤں گی۔ آپ ہاتھ منہ دھولیں۔''

وہ نہانے کے لیے اس دیوار کے پیچھے چلا گیا جس کی آڑ لے کر وہ نہالیا کرتا تھا۔ اس کا مسل خانہ تھا۔ آسیہ اگر مستقل اس گھر میں آ گئی تو مجھے مسل خانہ بنوانا پڑے گا۔ تو کیا میں اس سے شادی کر رہا ہوں؟ اس کا ذہن پھر سوچنے لگا۔ نہ جانے وہ میری پیش کش قبول بھی کرے یا نہیں کیونکہ جن عورتوں کو برائی کی زندگی کی چاٹ پڑ جاتی ہے وہ اتنی آسانی سے گناہوں سے باہر نہیں آتیں۔ اس سے کہہ کر دیکھتا ہوں۔ اگر وہ مان گئی تو پھر دیکھا جائے گا۔

وہ نہا کر نکلا تو بہت پُرسکون تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ جس الجھن کا اب تک شکار تھا، اس سے نجات مل چکی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے ہمت کر کے بات چھیڑنے کی کوشش کی۔

''آسیہ، میں تمہاری کہانی سن کر بہت متاثر ہوا ہوں۔ دن بھر تمہارے بارے میں سوچتا رہا اور اس شخص پر غصہ آتا رہا جس نے تمہیں برباد کیا۔''

''مجھے معلوم ہے آپ سوچتے رہے ہوں گے۔ میری کہانی ہی ایسی ہے کیا کروں۔ آپ کیوں غصہ کرتے ہیں؟ وہ آدمی آپ تھوڑی ہیں۔''

''وہ اگر مل جائے تو تمہاری طرف سے میں اس سے بدلہ لوں۔''

''اسی کو تو ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ نہ جانے یہ سفر کب تک رہے گا؟''

''تمہیں اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔''

''کیوں، کیا آپ میرے مستقل گاہک بننے کو تیار ہیں۔''

''میں نے تمہیں گناہ کی اس دلدل سے نکالنے کا ایک حل نکالا ہے۔''

''کیا؟''

''میں سوچتا ہوں، کیا خبر یہ حل تمہیں منظور ہو یا نہ ہو.....!''

''آپ کہیں تو سہی۔ میں تو اب خود اس زندگی سے عاجز آ چکی ہوں۔''

''میں چاہتا ہوں، تم سے شادی کرلوں۔''

''مجھ سے اور شادی! کیوں مذاق کرتے ہو۔ ہر آدمی اپنے لیے پاک اور پارسا بیوی چاہتا ہے۔ میری زندگی کے بارے میں تم جان چکے ہو۔ مجھ سے تو اب شاید وہ شخص بھی شادی کے لیے تیار نہ ہو جس نے مجھے برباد کیا ہے۔''

''تم خود خراب نہیں تھیں۔ تمہیں حالات نے خراب کیا ہے۔ اس کا ذمے دار مجھ جیسا ایک مرد ہی تو تھا۔ اب وہ نہیں ہے ورنہ میں اسے مجبور کرتا۔ اب میں ہوں، میں تمہیں سہارا دے سکتا ہوں۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو۔''

''آپ سوچ لیں۔ کل کلاں کو آپ کو اپنے کیے پر پچھتاوا نہ ہو۔''

''میں دن بھر یہی تو کرتا رہا ہوں۔ خوب اچھی طرح سوچ لیا ہے۔''

''ایک دن سے کیا ہوتا ہے اور سوچ لیں۔ میں آپ سے یہاں رہنے کی فیس وصول نہیں کروں گی۔'' وہ ہنسنے لگی۔

جہانگیر نے پہلے تو سوچا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے مزید سوچنا چاہیے۔ آگے چل کر کہیں مجھے پچھتاوا نہ ہو۔ یہ مجھے پہچانی نہیں ہے، آسانی سے مل جائے گی لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔

''مزید سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔''

''میں یہ برداشت نہیں کروں گی کہ آپ مجھے میرے ماضی کا طعنہ دیں۔''

''میں بھول کر بھی زبان پر نہیں لاؤں گا۔ میں نے جو کچھ سنا بھول چکا ہوں۔''

''اگر ایسا ہے تو میری طرف سے اقرار ہے۔''

''تم خوشی سے کہہ رہی ہو ناں؟''

''کوئی مجھے مجبور نہیں کرسکتا۔''

''تم بھی سوچ لو۔ بعد میں تمہیں پچھتاوا نہ ہو۔''

''اتنے طویل سفر کے بعد میری منزل سامنے ہے۔ جو سوچا تھا، وہ اب پورا ہونے کو ہے۔ مجھے خوشی کیوں نہیں ہوگی؟ میں آج بہت خوش ہوں۔ اتنی خوش کہ بیان نہیں کرسکتی۔ یہ وقت آپ کو بتائے گا۔ آپ بعد میں سوچیں گے کہ میں اس وقت کتنی خوش تھی!''

جہانگیر نے رات مستقبل کے منصوبے بناتے، سوچتے اور آسیہ کو اپنی خوشی میں شریک کرتے ہوئے گزار دی۔ صبح ہوئی تو ایک نئی زندگی اس کا استقبال کررہی تھی۔

آسیہ نے اسے روایتی بیویوں کی طرح رخصت کیا۔ جہانگیر نے کارخانے پہنچتے ہی حاجی صاحب کو خوش خبری سنادی۔ ان کا خوش ہونا بھی لازمی تھا۔

''تم نے ایسا کام کیا ہے کہ تمہیں اس کا صلہ اس جہان میں بھی ملے گا اور دوسری دنیا میں بھی۔'' حاجی صاحب نے کہا۔

''اب سارا انتظام آپ کو کرنا ہے۔''

''تم فکر مت کرو۔ بس اتنا کرو کہ اس لڑکی کو میرے گھر پہنچادو۔ برات لے کر تم میرے گھر آؤ گے اور میں اس لڑکی کو بیٹی کی طرح اپنے گھر سے رخصت کروں گا۔''

جہانگیر نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کا خیال تو یہ تھا کہ حاجی صاحب بزرگ کی حیثیت سے قاضی وغیرہ کا انتظام کردیں گے۔ انہوں نے تو بزرگ ہونے کا حق ادا کردیا۔ وہ اسی وقت کارخانے سے گھر پہنچا اور آسیہ کو حاجی صاحب کے گھر پہنچادیا۔

حاجی صاحب کی ہدایات کے مطابق اس نے دلہن کے لیے جوڑے وغیرہ خریدے اور ایک ہفتے بعد برات لے کر ان کے گھر پہنچ گیا۔ اس کا تو کوئی تھا نہیں حاجی صاحب کے رشتے داروں نے براتیوں کا کردار ادا کیا۔ حاجی صاحب نے بالکل بیٹیوں کی طرح جہیز کے ساتھ دلہن کو اپنے گھر سے رخصت کیا۔

آسیہ دلہن بن کر آئی تو گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ جہانگیر کی اس طرح خدمت کی کہ وہ سوچنے لگا کاش میں اس لڑکی سے اسی وقت شادی کرلیتا۔ میری زندگی کے اتنے برس یونہی بے کار گئے اور اس غریب نے الگ اپنی عمر سے بڑے دکھ جھیلے۔

جہانگیر نے صرف شادی نہیں کی تھی، اپنے گناہوں کا ازالہ کیا تھا اس لیے وہ بھی اسے پھولوں کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھ رہا تھا۔ پھول بڑے نازک ہوتے ہیں۔ ذرا سی ٹھیس ان کی پتی پتی بکھیر دیتی ہے۔ آسیہ نے جو دکھ اٹھالیے تھے وہی بہت تھے۔ اب جہانگیر یہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی بھی تکلیف پہنچے۔ ہر وقت اس کی ناز برداری میں لگا ہوا تھا۔

حاجی صاحب بھی اس کا پورا ساتھ دے رہے تھے۔ اپنے تجربوں سے زندگی حسین بنانے کے گر سکھا رہے تھے۔ انہوں نے جہانگیر کی تنخواہ بھی بڑھادی تھی۔ ویسے بھی تیسرے چوتھے دن کچھ نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیتے تھے کہ جاؤ ہماری بیٹی کو سیر کرادینا۔

یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ اس شہر میں آتے ہی آسیہ کی ملاقات جہانگیر سے ہوگئی تھی۔ کسی دوسری آنکھ پر اس کا اصل روپ ظاہر نہیں ہوا تھا۔ بدنام ہونے سے پہلے وہ اسے مل گئی تھی ورنہ اسے ساتھ لے کر نکلنا دشوار ہوجاتا۔ وہ اسے لے کر تقریباً روز ہی کہیں نہ کہیں چلا جاتا۔

جہانگیر کے سوتیلے بھائی گجرات میں تھے۔ جب سے وہ کراچی آیا تھا، ایک مرتبہ بھی گجرات نہیں گیا تھا۔ اب آسیہ کا خوف دل سے نکل گیا تو اسے گجرات کی یاد آئی۔ اسے بھائیوں کے طعنے یاد آئے جن کا جواب دینے کا اب وقت آگیا تھا۔ وہ گجرات جاکر انہیں بتانا چاہتا تھا کہ تم مجھے ناکارہ سمجھتے تھے، اب آکر دیکھو میں کیسی کامیاب زندگی گزار رہا ہوں۔ مجھے کیسی خدمت گزار بیوی ملی ہے۔ وہ آسیہ کو یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ گجرات کا رہنے والا ہے جہاں کی وہ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اسے پہچان لے۔ وہ اسے نہ بھی پہچانتی تو بھی گجرات میں آسیہ کو پہچاننے والے بہت تھے۔ وہ گجرات جاکر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے بیان میں کتنی سچی ہے۔ اس پر واقعی یہ سب گزری ہے یا اس نے مظلوم بننے کے لیے یہ کہانی گھڑی ہے۔

کچھ اپنا شہر دیکھنے کی خواہش کچھ آسیہ کی جاسوسی کی خواہش۔ اس نے آسیہ کو حاجی صاحب کے گھر چھوڑا اور لاہور میں ایک شادی کا بہانہ کرکے گجرات پہنچ گیا۔

وہ پندرہ سال بعد اپنے گھر آیا تھا۔ بھائی اور بھابی کو اچھا سلوک تو کرنا ہی تھا اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اس نے شادی کرلی ہے اور شریفانہ زندگی گزار رہا ہے تو وہ اور بھی خوش ہوئے۔

ایک دن گھر میں گزارنے کے بعد اس نے آسیہ کے محلے کا چکر لگایا کہ شاید کچھ باتیں سامنے آجائیں۔ اتفاق سے ایک دوست مل گیا جو اسی محلے کا رہنے والا تھا۔ جہانگیر نے کسی بہانے سے آسیہ کا ذکر چھیڑ دیا۔

''ارے، وہ جو ایک لڑکی آسیہ تھی۔ اس کا کچھ معلوم ہوا۔''

''آسیہ کون؟''

''جب میں یہاں تھا تو کسی لڑکے سے اس کا چکر چلا تھا۔''

''مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ وہ پاگل ہوگئی تھی۔ اب تو مرکھپ گئی ہوگی۔''

''کچھ معلوم ہوسکتا ہے؟''

''تمہیں کیا پڑی اس کی۔ ایسے واقعے تو دنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟''

جہانگیر نے بھی زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں لیکن اتنی تصدیق ہوگئی کہ آسیہ سچی ہے۔ اسے پاگل مشہور کردیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس پر کیا گزری، کن کن مراحل سے گزری، یہ ظاہر ہے یہاں کے لوگوں کو معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔

وہ کچھ دن گجرات میں رہ کر لوٹا تو اس کے دل میں آسیہ کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ چکی تھی۔ آسیہ نے اس کے ساتھ دھوکا نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے بیان میں سچی تھی۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ جہانگیر کا چھوٹا سا گھر جنت کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ پھر ایک دن آسیہ نے اسے بتایا کہ وہ امید سے ہے۔ یہ ایسی خوشی تھی جو جہانگیر سے سنبھالی نہیں جارہی تھی۔ اس پر ایک نشہ سا طاری تھا۔ اب تو آسیہ اس کے لیے ایسی قیمتی چیز بن گئی تھی جس کی حفاظت کے لیے وہ اپنی جان دے سکتا تھا۔ وہ اس کی دل جوئی اور دلداری کے لیے دن رات ایک کیے دے رہا تھا۔ آسیہ کی خوشی بھی ایسی تھی کہ چھپائی نہیں جاسکتی تھی۔

''باپ بننے کی بہت خوشی ہورہی ہے؟'' ایک دن آسیہ نے جہانگیر سے کہا۔

''ظاہر ہے، خوشی تو ہوتی ہے۔''

''اگر میں نہ رہی تو؟''

''ایسا مت کہو آسیہ۔ تمہارے بغیر میری زندگی کیا رہے گی؟''

''سب کہنے کی باتیں ہیں۔ سب جی لیتے ہیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میری محبت کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔''

''محبت پر نہیں آدمی اپنی شکست پر کڑھتا ہے۔ آپ بھی میرے جانے پر میری محبت میں نہیں اپنی شکست پر افسردہ ہوں گے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کہاں جارہی ہو تم۔ خبردار، آسیہ! ایسی بات آیندہ زبان پر مت لانا۔''

''آپ ناراض ہوگئے۔ میں تو مذاق کررہی تھی۔''

''کبھی ایسا مذاق مت کرنا۔''

''جانے والے کو کون روک سکتا ہے!''

''پھر وہی بات۔''

وہ ہنسنے لگی۔ جہانگیر نے بھی اس کا ساتھ دیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

شادی کو ڈیڑھ سال ہوا تھا کہ آسیہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ بچی کا نام اس نے نائلہ رکھا۔ آسیہ بہت خوش تھی، کیوں نہ ہوتی آخر ماما تھی۔ اسے بیٹی کی خواہش بھی بہت تھی۔ خواہش پوری ہوگئی تو دہری خوشی ہوگئی۔

اب آسیہ صرف بیوی نہیں تھی، جہانگیر کی بیٹی کی ماں بھی تھی۔ جہانگیر پہلے سے بھی بڑھ کر اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔

نائلہ چھ مہینے کی ہوگئی تھی لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ آسیہ کچھ الجھی الجھی رہنے لگی ہے۔ ہر وقت مغموم اور گھبرائی گھبرائی سی رہتی ہے۔

وہ حسبِ معمول کارخانے سے واپس آیا تو گھر کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ پروا کرتا لیکن اس کے ہوش اس وقت اڑ گئے جب گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ آسیہ نہ نائلہ۔ پڑوس میں گئی ہوگی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک پرچے پر نظر پڑی۔

''میں اسی دن کے انتظار میں تھی کہ میں ایک بیٹی پیدا کردوں جو تم سے ہو۔ میں مایوس ہوگئی مگر قدرت نے یہ موقع مجھے فراہم کردیا۔ تم مجھے سرِراہ ملے اور میں تمہیں پہچان گئی۔ تم ایسے اندھے کہ پھر بھی مجھے نہ پہچان سکے۔

میں اسی دن کے انتظار میں تھی کہ تمہاری بیٹی میرے ہاتھ لگے اور میں اسے وہ زندگی دوں جو زندگی مجھے تم دے کر گئے تھے۔ میں نے بہت چاہا کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں لیکن تم نے میری روح پر اتنے گھاؤ لگائے ہیں کہ میں تم سے انتقام لیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں پندرہ برس کی معصوم لڑکی تھی جسے تم نے رسوائی اور بدنامی کے حوالے کردیا۔

میں اسی دن کے انتظار میں تھی۔ وہ دن آگیا۔ میں تمہاری بیٹی کو لے کر جارہی ہوں۔ اب کہو یہ سوچ کر تمہیں کیسا لگ رہا ہے کہ یہ کسی کوٹھے پر بیٹھے گی، غیر مردوں کے ساتھ راتیں بسر کرے گی۔

مجھے معاف کردینا۔ اب تم تڑپو اور میری بے کسی کو محسوس کرو۔

وہ چلی گئی اور اب جہانگیر کی باری تھی کہ وہ دنیا کے سمندر میں دو قطرے تلاش کرتا پھرے۔

ایک بتا دو

مرزا امجد بیگ

ایک حد تک سادگی قابل تعریف ہے، لیکن یہ صفت جب معقولیت کی حد کو عبور کرلے تو حماقت میں شمار ہونے لگتی ہے۔ ایسا بے وقوف شخص جو بھی کرلے، کم ہے۔ روز مرہ کی احمقانہ حرکات جہاں اس کی زندگی کو مضحکہ خیز بناتی ہیں وہیں دوسروں کے لیے باعث تفریح بھی بن جاتی ہیں۔ اک ایسے ہی سادہ لوح کا قصہ جس کی سادگی نے اس کے لیے عذاب کا سامان پیدا کردیا تھا۔

حرص و ہوس کے پجاریوں کی داستان عبرت، مرزا صاحب کی ڈائری سے منتخب ایک سچا واقعہ

جس طرح بعض لوگ اسم با مسمّٰی ہوتے ہیں ویسے ہی، میں نے اس کی شکل دیکھی تو ذہن میں اس کے لیے ''احمق الاحمقین'' کے الفاظ چمک اٹھے۔ ازاں بعد وہ میرے اندازے پر صد فی صد پورا بھی اترا۔ بہرحال، میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے آنے والے کا استقبال کیا اور خوش اخلاقی سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

وہ میری میز کے سامنے رکھی کرسیوں میں سے ایک کو کھینچ کر ہچکچاہٹ آمیز انداز میں اس پر براجمان ہوگیا۔ اس چھوٹے سے کام کے لیے اس نے اتنی احتیاط کا مظاہرہ کیا جیسے وہ چوبی کرسی نہ ہو بلکہ ایٹم بم ہو جو اس کے تشریف رکھتے ہی ایک خوفناک دھماکے سے پھٹ جائے گا۔

میں اس کے اسٹائل پر دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی آمد کی غرض و غایت دریافت کی۔ جواب دینے کے بجائے وہ بے یقین سے لہجے میں متفسر ہوا۔

''وکیل صاحب آپ ہی ہیں نا؟''

اس کی صورت تفریح کی دعوتِ عام تھی، میری زبان بھی تھوڑی سی پھسل گئی۔ میں نے گہری سنجیدگی کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کون سے وکیل صاحب؟''

''وہ..... وہ جن کا یہ دفتر ہے؟'' اس نے اپنے تئیں وضاحت کی۔

میں نے کہا۔ ''یہ دفتر تو میرا ہی ہے اور میں ایک وکیل بھی ہوں!''

''اچھا اچھا!'' اس نے بڑی شدت سے اثبات میں گردن کو متعدد جھٹکے دے ڈالے پھر بولا۔ ''اس کا مطلب میں آپ ہی سے ملنے آیا ہوں۔''

''جی ہاں۔'' میں نے گہری نظر سے اسے دیکھا۔ ''مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔''

''آپ کا نام کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''میں نے دفتر کے باہر آپ کے نام کی تختی تو دیکھی تھی لیکن ذہن سے نکل گیا.....'' بات کو ادھورا چھوڑ کر اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔

انداز ایسا ہی تھا جیسے اس کے ذہن سے میرا نام نہ نکلا ہو بلکہ کھوپڑی میں سے ذہن نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہو..... اور ذہن کے مفرور ہونے سے پہلے ہی اس نے بڑی حفاظت کے ساتھ اپنے سر کو تھام لیا ہو۔ میں نے اس شخص پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور کہا۔

''کوئی بات نہیں، بعض اوقات ایسا ہوجاتا ہے۔ اگر انسان کے ذہن میں بہت زیادہ غیر متعلق چیزیں بھری ہوئی ہوں تو ذہن اس قسم کی بغاوت کر جاتا ہے۔'' میں نے دانستہ ''فضول'' کے بجائے ''غیر متعلق'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ ''بہرحال..... میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔''

''آپ نے نام بھی تو اتنا لمبا چوڑا رکھا ہوا ہے نا!'' وہ آنکھیں سکوڑ کر اور زیرلب مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''نام میری طرح کا ہونا چاہیے..... امین!''

میں نے نام کے مختصر یا طویل ہونے کے سلسلے میں اس سے کوئی بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔ ''امین صاحب! بتائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

جملہ مکمل کرتے ہی میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا۔

مدعا بیان کرنے کے بجائے وہ تنقیدی نظر سے میرا اور میرے چیمبر کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کسی خاص شے کی تلاش ہو یا پھر وہ کسی حوالے سے اپنی تسلی کرنا چاہتا ہو۔ میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی ان حرکات کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔

ایک ڈیڑھ منٹ میں اس کی تشفی ہوگئی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''میں مطمئن ہوگیا ہوں۔ مجھے یقین ہوگیا ہے' آپ میرا مسئلہ حل کرسکتے ہیں!''

اس کا یہ فیصلہ کن جملہ ایسا بے سروپا تھا کہ میں جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوگیا' قدرے بیزاری سے میں نے کہا۔ ''امین صاحب! اب آپ اپنا مسئلہ بھی بیان کریں تو مہربانی ہوگی۔''

''مسئلہ فرزانہ کا ہے۔'' اس نے پراسرار انداز میں بتایا۔

''فرزانہ..... یہ کوئی محترمہ ہیں؟''

''فرزانہ میری بیوی ہے مرزا.....؟'' وہ میرے نام کو یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ!'' میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے صرف مسٹر بیگ یا بیگ صاحب بھی کہہ سکتے ہیں۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے بیگ صاحب!'' وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''تو میں آپ کو بتا رہا تھا' میری بیوی فرزانہ نے مجھے بڑی مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ میں اس کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ آپ میرے مسئلے کو حل کردیں تو آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

''یہ احسان تو میں اس وقت کرپاؤں گا جب آپ مجھے اس کا موقع دیں گے۔'' میں نے زچ ہوتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور ایسا موقع نکلے گا اس وقت جب آپ مجھے اپنے مسئلے سے آگاہ کریں گے!''

وکالت کے پیشے میں بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور میں ان میں بعض امین جیسے باتونی اور موضوع سے کھسکے ہوئے افراد بھی ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ تو اس پیشے کا حصہ ہے۔ ہر شخص کو اس کے لیول پر برداشت کرنا پڑتا ہے..... سو اس وقت میں یہی کررہا تھا۔

امین نامی اس شخص کی عمر پچپن کے اریب قریب رہی ہوگی۔ قد درمیانہ اور جسمانی صحت انتہائی مخدوش۔ ذہنی صحت کا اندازہ اس کی بات چیت سے بہ خوبی ہورہا تھا۔ اس نے اپنی عمر کو چھپانے کے لیے سر اور مونچھوں کے بالوں کو کسی گھٹیا خضاب میں رنگ رکھا تھا لیکن یہ کوشش بری طرح ناکام نظر آتی تھی کیونکہ اول تو اس غیر معیاری اور سستے خضاب نے اپنے غیر فطری رنگ کے باعث اس چوری کی قلعی کھول دی تھی۔ دوم' ایک دن کے شیو نے سونے پر سہاگہ والا کام کردکھایا تھا۔ چہرے پر شیو کی جگہ ایک دن عمر کے جو بال نمودار ہوچکے تھے وہ سر کے بالوں کے مقابلے میں ''اندھیرا اجالا'' کی سی کیفیت پیدا کررہے تھے۔ ایسے لوگوں کو روزانہ نہایت پابندی کے ساتھ داڑھی مونڈھنا چاہیے یا پھر مناسب سے باز آجانا چاہیے، بصورت دیگر دو رنگی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس بلیک اینڈ وہائٹ مودی کو برداشت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے..... کم از کم --- میرے سامنے بیٹھا ہوا امین نامی وہ شخص ایسا دل گردے والا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

''مسئلہ بہت سیدھا سا ہے بیگ صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن محلے والوں نے اسے ٹیڑھا بنادیا ہے۔''

میں نے محسوس کیا' وہ ایک مرتبہ پھر پٹڑی سے اترنے جارہا تھا۔ میں نے جلدی سے اسے سنبھالا دیا اور ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک منٹ امین صاحب! آپ مجھے اپنی بیوی فرزانہ کا مسئلہ بتانے والے تھے۔ بیچ میں یہ محلے والے کہاں سے ٹپک پڑے۔ پلیز! آپ اپنی بیوی فرزانہ کی بات کریں تو آپ کا اور میرا قیمتی وقت محفوظ رہے گا۔''

''محلے والوں کا ذکر کیے بغیر فرزانہ کے مسئلے کی وضاحت نہیں ہوسکتی بیگ صاحب!'' وہ کسی ڈبیٹر کے سے انداز میں بولا۔ ''ان نامراد محلے والوں نے ہی ہمارا ناک میں دم کررکھا ہے۔ یہ لوگ میری بیوی کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ جب فرزانہ پریشان ہوتی ہے تو لامحالہ مجھے بھی پریشان ہونا پڑتا ہے۔ آپ میرے مسئلے کو حل کردیں تو ہم دونوں میاں بیوی آپ کو بہت دعائیں دیں گے۔''

بات ختم کرتے کرتے اس کے لہجے میں زمانے بھر کی یتیمیت اور مسکینیت شامل ہوگئی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ امین سے ہونے والی اب تک کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ تو بہ خوبی ہوگیا تھا' ان تلوں میں تیل کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ وہ میرے لیے کسی ''کیس'' کی صورت اختیار نہیں کرسکتا لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ جہاں پندرہ بیس منٹ برباد کیے ہیں، مزید دس منٹ نکال کر اگر میں اس شخص کی بپتا سن لوں تو ممکن ہے' اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوجائے!

میں نے امین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں آپ کی بات پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ آپ اپنا مسئلہ بیان کرڈالیں۔''

وہ شکل صورت سے جیسا دکھائی دیتا تھا، اپنا مسئلہ بیان

کرتے ہوئے اس نے خود کو ویسا ثابت بھی کر دکھایا۔ اس نے بڑے سنجیدہ الفاظ میں مجھے بتایا کہ اس کے محلے دار اس کی بڑی فرزانہ کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ ایک ساتھ باہر نکلیں یا فرزانہ اکیلی کہیں جائے، وہ لوگ انہیں چھیڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ طرح طرح کے جملے اور آوازے کستے ہیں۔ اس صورتِ حال نے ان کا جینا دوبھر کر رکھا ہے..... وغیرہ وغیرہ!

اس کا مسئلہ سن کر مجھے غصہ بھی آیا اور اس کی حالت پر افسوس بھی ہوا اور اس حوالے سے اس کی عقل پر ماتم کرنے کو بھی جی چاہا کہ وہ ایک معمولی سے معاشرتی مسئلے کے لیے بطور وکیل میری خدمات حاصل کرنے میرے دفتر پہنچ گیا تھا۔ اس مسئلے کو باہمی افہام و تفہیم یا محلے کے کسی ''بڑے'' کی مدد سے بہ آسانی حل کیا جا سکتا تھا۔ اس حوالے سے میں نے اب اس سے استفسار کیا تو بڑے مجبور سے لہجے میں بولا۔

''میں نے ایسی کوشش کی تھی لیکن کوئی میری سننے کو تیار نہیں۔''

میں نے برسبیلِ تذکرہ پوچھ لیا۔ ''تمہاری رہائش کراچی کے کس علاقے میں ہے؟''

اس نے نیو کراچی کے ایک ایریا کا نام بتایا۔

''اور تم کرتے کیا ہو..... میرا مطلب ہے تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟''

''میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس کمپنی کا دفتر میکلوڈ روڈ پر ہے۔''

نیو کراچی اور میکلوڈ روڈ (آئی آئی چندریگر روڈ) میں میلوں کا فاصلہ حائل ہے۔ میں نے سوچا' جب وہ دفتر میں ہوتا ہوگا تو محلے والے اس کی بیوی کو کچھ زیادہ ہی چھیڑتے ہوں گے۔ اسی تناظر میں، میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''تم دونوں میاں بیوی کے علاوہ گھر میں اور کتنے افراد ہیں؟''

''کوئی بھی نہیں۔'' وہ مایوسی سے بولا۔ ''ہماری شادی کو ابھی ایک سال ہوا ہے۔ اولاد وغیرہ کی طرف سے بھی کوئی خوش امیدی نظر نہیں آتی۔''

اس کی شادی کے عرصے کا سن کے مجھے شدید حیرت ہوئی۔ وہ پچپن اور ساٹھ کے درمیان تھا۔ میری شدید حیرت کا اصل سبب اس کی عمر سے زیادہ اس کی مخدوش صحت تھی۔ کوئی بھی معقول آدمی اس قسم کی ''صورتِ حال'' میں شادی بیاہ کے بارے میں سوچنے کی حماقت نہیں کرتا۔ پھر میرے ذہن میں آیا کہ ممکن ہے' اس نے اپنی ہی عمر کی کسی بڑی بی سے بیاہ رچا لیا ہو۔ اپنی تسلی اور تصدیق کے لیے میں نے وضاحت ضروری جانی اور امین سے پوچھ لیا۔

''آپ کو اس عمر میں شادی کی کیا سوجھی؟''

''اس عمر میں..... کیا مطلب؟'' وہ بھڑک اٹھا۔ ''آپ کے خیال میں میری عمر اس وقت کتنی ہوگی؟'' الٹا اس نے مجھ ہی سے سوال کر ڈالا۔

میں نے محتاط روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی کوئی پچاس، باون سال!''

میری احتیاط اس کے بھڑکنے کے سبب تھی۔ میں... خوامخواہ اس کے جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے میرے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ میری محنت رائیگاں گئی۔

اس نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ کیا میں آپ کو پچاس سال کا نظر آتا ہوں؟''

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جو نظر آ رہا ہے وہی بیان کیا ہے۔ اگر آپ کو میرا بیان ناگوار گزرا ہو تو مجھے افسوس ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے بڑی فراخ دلی سے اس نے مجھے معاف کر دیا ہو۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میں بتاتا ہوں آپ کو۔ دراصل میری عمر اس وقت پینتالیس سال ہے لیکن میں پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا۔''

بات ختم کرتے ہی وہ داد طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس خوش فہم شخص کو بڑی پٹخارے دار داد پیش کرنے کو جی تو بہت چاہا لیکن میں نے اپنی خواہش کو دبا دیا۔ اس کے لیے شروع میں میرے دل میں جو ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے تھے وہ اب رفتہ رفتہ کوفت میں بدلتے جا رہے تھے۔ مجھے اس کی سوچ نارمل نہیں لگی۔ وہ کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھا۔ میں نے جلے کٹے انداز میں پوچھ لیا۔

''اور..... جس بیوی کی وجہ سے آپ بے حد پریشان ہیں اس کی عمر بھی بتا دیں؟''

میں اسے اپنے دفتر سے رخصت کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا، اس پچپن ساٹھ سالہ شخص نے ایک سال پہلے جس عورت سے شادی کی ہے وہ اپنی زندگی کی کس منزل پر کھڑی ہے تاکہ یہ اندازہ قائم کیا جا سکے کہ کس کے کرم سے کس کے نصیب پھوٹے ہیں۔

اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''فرزانہ

تیس اور پینتیس کے درمیان ہے۔'' پھر سینہ نما ہڈیوں کے ایک ضعیف سے پنجرے کو بڑے فخریہ انداز میں پھلاتے ہوئے بولا۔ ''بیوی کو شوہر سے کم از کم دس سال ضرور چھوٹا ہونا چاہیے۔ اس طرح وہ رعب میں رہتی ہے۔''

اس کے فلسفے کو زیر بحث لانا تو دور کی بات ہے، میں اس پر لمحاتی غور کو بھی وقت کا زیاں سمجھ رہا تھا۔ اس شخص نے اپنی احمقانہ موشگافیوں سے جس قدر میرا وقت برباد کر دیا تھا وہی کافی تھا لہٰذا میں نے جان چھڑانے کی غرض سے کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے امین صاحب! میں نے آپ کی پریشانی کی کہانی تو سن لی۔ اب یہ بھی فرمائیں کہ اس سلسلے میں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''یہ فیصلہ تو آپ کریں گے۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''قانون کی ساری کتابیں تو آپ نے پڑھ رکھی ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ کوئی ایسا قانونی چکر چلائیں کہ محلے والے ایک دم بندے دے پتر بن جائیں تاکہ ہم بھی سکھ کا سانس لے سکیں۔''

''آپ نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے تو پھر توجہ سے میری بات سنیں۔'' میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنے مسئلے کے حل کے لیے بالکل غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔''

''جی.....!'' اس نے بے یقینی سے آنکھیں سکوڑ کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا ہوں بیگ صاحب!''

میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''آپ کو کسی وکیل کے پاس آنے کے بجائے سیدھا اپنے علاقے کے پولیس اسٹیشن جانا چاہیے۔ وہی لوگ آپ کے مسئلے کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔''

''میں وہاں بھی گیا تھا۔'' اس نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ ہی کے جیسے کسی شریف آدمی نے مجھے تھانے جانے کا مشورہ دیا تھا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا۔

''میں جا کر تھانیدار انچارج سے ملا اور اسے اپنے مسئلے سے آگاہ کیا۔ اس نے بڑی غیر سنجیدگی سے میری بات سنی (میں نے دل میں کہا' تھانے دار نے گویا بڑی سمجھ داری کا ثبوت دیا) مجھے اس کے رویے پر غصہ تو بہت آیا مگر ظاہر ہے میں ایک کمزور سا آدمی تھا تھانہ انچارج کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس لیے منت عاجزی سے کام لیا۔ اس کے جواب میں تھانے دار نے کہا..... ٹھیک ہے میں نے تمہاری شکایت سن لی۔ میں اپنے کسی بندے کو بھیج کر انکوائری کرواؤں گا۔ اگر تمہارا بیان درست نکلا تو میں تمہاری شکایت دور کرنے کا بندوبست کر دوں گا۔''

''پھر تھانہ انچارج نے انکوائری کروائی؟'' وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا تو میں نے استفسار کیا۔

اس نے برا سا منہ بنایا اور زہریلے لہجے میں بولا۔ ''ہاں کروائی..... بہت ہی واہیات انکوائری کروائی تھی اس نے۔ جس روز میں نے تھانے میں شکایت درج کروائی اسی رات لگ بھگ دس بجے ایک اے ایس آئی معاملے کی تفتیش کرنے کے لیے ہمارے گھر پہنچا۔ اس نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا کہ وہ ہمارے دروازے پر دستک دینے سے پہلے محلے میں گھوم پھر کر صورت حال کا اندازہ لگا چکا ہے اور اس نے چند بے ہودہ افراد کی فہرست بھی تیار کر لی ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد وہ ہمارا مسئلہ حل کر دے گا۔ اس کی بات سن کر مجھے دلی خوشی ہوئی کیونکہ اس نے بڑے مضبوط لہجے میں مجھے یقین دہانی کرائی تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''ہونا کیا تھا وکیل صاحب!'' وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ''سمجھیں کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار کا بھیجا ہوا تفتیشی اے ایس آئی روزانہ رات کو ہمارے گھر کے چکر کاٹنے لگا۔ وہ گھنٹا، آدھا گھنٹا گھر میں بیٹھتا، کھاتا پیتا اور جلد ہی ہمارے مسئلے کو حل کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو جاتا۔ ہم حسب توفیق اس کی خاطرہ اور خفیہ ''خدمت'' کر رہے تھے۔ اس کا ایک پھیرا سو پچاس سے کم میں نہیں پڑتا تھا۔ میں کسی بھی طرح اپنا مالی اور اناجی نقصان برداشت کر رہا تھا کہ مجھے پتا چلا' اس اے ایس آئی نے میری غیر موجودگی میں دن کے وقت بھی گھر میں پھیرا لگانا شروع کر دیا تھا۔ اے ایس آئی کی یہ حرکت بداخلاقی کے زمرے میں آتی تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا پھر ایک رات میں نے تھانہ انچارج سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور دفتر سے سیدھا تھانے پہنچ گیا۔ میں نے اے ایس آئی کی حرکات کی شکایت کی تو تھانے دار الٹا مجھ پر گرم ہو گیا۔ آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا۔

''میاں! تفتیشی افسر نے انکوائری مکمل کرنے کے بعد مجھے رپورٹ دے دی ہے۔ محلے والوں سے زیادہ قصور خود تمہاری بیوی کا ہے۔ میں ایک عورت کی خاطر محلے کے دس

ہیں افراد کو گرفتار کر کے حوالات میں بند تو نہیں کر سکتا۔ یہاں تو اتنی گنجایش بھی نہیں ہے۔'' وہ لمحے بھر کو رکا، تھوڑا سوچا پھر مشورہ دینے والے انداز میں بولا۔

''تمہارے مسئلے کا فی الحال مجھے ایک ہی حل نظر آ رہا ہے۔ میری مانو تو' یا تو تم اس محلے ہی کو چھوڑ دو..... اور یا پھر بیوی کو۔''

''میں منہ کھول کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے تھانے دار سے ایسے داہیات جواب کی توقع نہیں تھی۔ بہرحال' میں وہاں سے اٹھا اور اپنے گھر آ گیا۔ یہ دو روز پہلے کا واقعہ ہے..... اور اب میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔''

امین نے متعلقہ تھانہ انچارج اور اس کے مقرر کردہ انکوائری آفیسر کے رویے کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ انتہائی افسوس ناک تھا۔ اگر اس اے ایس آئی کی تفتیش کسی حد تک درست بھی تھی تو بھی اسے ایسے الفاظ کا استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بات ختم کر کے وہ پرامید نظر سے مجھے دیکھنے لگا تو میں نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

''اگر تم کہو تو میں تمہارے علاقے کے تھانہ انچارج سے بات کرتا ہوں.....!''

''کیا بات؟'' اس نے بدکے ہوئے انداز میں استفسار کیا۔

میں نے کہا ''یہی کہ وہ تمہارے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرے اور ہر صورت میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔''

اس نے بڑی بے یقینی اور گھائل نظر سے مجھے دیکھا لیکن خاموش رہا۔

میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا ''اگر میں تھانہ انچارج سے بات کروں گا تو دیکھا کچھ نہیں ہوگا جیسا بہ قول تمہارے، پہلے ہوا ہے۔ اس قسم کے خدشات کو ذہن سے خارج کر دو!''

چند لمحات تک گہرے تذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے قدرے شکستہ لہجے میں کہا ''میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ میرے لیے کچھ نہیں کریں گے؟''

''میں جو کچھ کر سکتا ہوں وہی کر رہا ہوں'' میں نے خلوصِ نیت سے کہا ''میرے متحرک ہونے کے بعد تھانہ انچارج ان افراد کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائے گا جو تمہاری بیوی کو تنگ کرتے ہیں' اس پر آوازے کستے ہیں اور آتے جاتے سیٹیاں بجاتے ہیں!''

وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''میرا خیال ہے' آپ پولیس کو اس معاملے میں نہ ہی ڈالیں تو اچھا ہے۔ میں نے سنا تھا، پولیس والے بہت برے ہوتے ہیں مگر ذاتی تجربے سے میں پہلی مرتبہ گزر رہا ہوں'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر ملتجیانہ انداز میں بولا۔

''بیگ صاحب! آپ مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کریں..... پلیز!''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا ''امین صاحب! اپنی بیوی کے بارے میں' آپ کا کیا خیال ہے؟''

یہ سوال کرتے ہوئے میرے ذہن میں کوئی واضح مقصد نہیں تھا۔ پتا نہیں' اس نے میرے اس استفسار سے کیا مطلب لیا، بڑی سادگی سے بولا۔ اس سادگی میں بے بسی بھی شامل تھی۔

''میں یہ محسوس کرتا ہوں جیسے میں نے کسی مرد سے شادی کر لی ہو!''

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

وہ اپنی ہی رو میں کہتا چلا گیا ''فرزانہ میں عورتوں والی کوئی بات ہی نہیں، سارے شوق مردوں والے ہیں۔ صفائی ستھرائی، کھانے پکانے سے کوئی دل چسپی نہیں۔ ہمارے گھر میں اکثر بازار سے کھانا آتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ مجھے آنکھیں دکھانے لگتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس کی بیوی ہوں۔ پہلے میری تنخواہ مہینا بھر چلتی تھی بلکہ تھوڑی بہت رقم میں پس انداز بھی کر لیا کرتا تھا لیکن اس ہوٹل بازی نے میرا ہاتھ بہت تنگ کر دیا ہے۔ پندرہ دن کے بعد جیب خالی ہو جاتی ہے۔ باقی کے دن قرض ادھار کر کے مہینا پورا کرنا پڑتا ہے۔ میں آپ کو بتاؤں.....''

''تم اپنی بیوی کو ان فضول خرچیوں کے لیے سمجھاتے نہیں ہو؟'' میں نے دانستہ قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

مجھے سخت اندیشہ تھا کہ اگر میں نے مداخلت نہ کی تو وہ کوئی طولانی قصہ چھیڑ بیٹھے گا حالانکہ میں اس سے یہ بھی پوچھ سکتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے' اس نے میاں بیوی کے مابین عمروں کے ضروری تفاوت کے سلسلے میں جو فلسفیانہ دعویٰ کیا تھا وہ کیا ہوا؟ اس دعوے کے مطابق تو فرزانہ کو اس سے دب کر، ڈر کر اور سہم کر رہنا چاہیے تھا! میں نے اس موضوع کو چھونے کی کوشش بھی نہیں کی اور خاموش رہا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا ''میں نے بہت سمجھایا ہے اسے..... اور اس نے اس مسئلے کا حل بھی نکال لیا ہے'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''وہ کہتی ہے، اگر میری تنخواہ پوری نہیں پڑ رہی تو وہ جاب

کر لیتی ہے۔ مجھے بتائے بغیر وہ ایک دو جگہ انٹرویو بھی دے آئی تھی۔ وہ تو میں ہی اڑ گیا ورنہ جاب تو پکی تھی اس کی..... آپ بتائیں وکیل صاحب! میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ وہ دس مردوں کے بیچ بیٹھ کر نوکری کرے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی نا!''

یہ بہت ہی اچھی بات ہے کہ کسی بھی گھر کا کفیل، کفالت کے سلسلے میں اتنا مضبوط ہو کہ اس گھر کی کسی عورت کو معاشی مجبوری کے تحت' ملازمت کی خاطر گھر سے نہ نکلنا پڑے لیکن ہر گھر کے معاشی حالات ایک جیسے نہیں ہوتے۔ جہاں ضرورت' حقیقت بن کر گھر کے در و دیوار کو جھنجوڑ رہی ہو وہاں گھر کے معاشی ذمے دار کو لنگڑی غیرت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اپنی کم زوریوں پر غور کرنا چاہیے۔ فی زمانہ، پیسے کے بغیر کسی بھی گھر میں کوئی خوش حالی نہیں آسکتی اور..... پیسا کمانے کے لیے گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔ گھر کے مرد اگر کسی بھی سبب اس محاذ پر کم زور پڑ رہے ہوں تو عورتوں کو قدم سے قدم ملا کر ان کا ساتھ دینا چاہیے تاکہ زندگی کی گاڑی سبک خرامی سے آگے بڑھتی رہے..... اپنے انہی دو پہیوں پر.....!

میں نے امین سے کہا'' آپ نے اپنی بیوی کی جو خوبیاں بیان کی ہیں ان کی روشنی میں تو محلے کے کسی آوارہ' لفنگے کو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہونا چاہیے مگر آپ اس کے متضاد کہانی سنا رہے ہیں؟''

''بس جی' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا!'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے، میں سمجھانے کی کوشش کروں گا'' میں نے سرسری انداز میں کہا'' تم کسی روز اسے میرے پاس لے آؤ''

پتا نہیں کیوں' میرے اندر امین کی بیوی فرزانہ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس عورت سے کوئی معقول اور ڈھنگ کی بات کی جاسکتی ہے اور اس بات چیت کے نتیجے میں مجھے قوی امید تھی کہ اس کے مسئلے کا کوئی مثبت حل بھی نکل آئے گا لیکن امین نامی وہ گھامڑ میری آسان سی بات کو بھی نہ سمجھ سکا۔

اس نے بڑے پریشان کن انداز میں آنکھیں سکوڑیں اور بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا'' جناب! میں ان دس بارہ لفنگوں کو پکڑ کر آپ کے پاس کیسے لاسکتا ہوں۔ وہ کہاں میری بات کو ماننے کے لیے تیار ہوں گے!''

میں نے خفگی آمیز انداز میں اسے صورت حال سے آگاہ کیا' اپنا وزیٹنگ کارڈ تھمایا اور بہ زور الفاظ دھکیل کر اپنے دفتر سے رخصت کر دیا۔ فی الحال' میں یہی کر سکتا تھا۔

☆☆☆

کسی کے پاس اگر بہت سا فارغ وقت ہو اور وہ ہر لمحہ تفریح کے موڈ میں بھی رہتا ہو تو ایسے شخص کے لیے امین ایک ناقابلِ فراموش شخصیت تھا مگر میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باعث ایسی تفریحات افورڈ نہیں کر سکتا۔ آپ اسے میری مجبوری یا بدقسمتی جو دل چاہے، سمجھ لیں چنانچہ جب کافی دنوں تک امین پلٹ کر نہیں آیا تو میری یادداشت نے اسے فراموش کر دیا۔

اس واقعے کے دو ماہ بعد کا ذکر ہے۔ ایک روز ایک عورت مجھ سے ملنے میرے دفتر آئی۔ وہ خوب صورت نقش و نگار کی مالک ایک دل کش عورت تھی۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچیس اور چھبیس کے قریب لگایا۔ جسم قدرے بھرا بھرا مگر ایک مخصوص کینڈے کے اندر۔ اسے فربہ یا مائل بہ فربہی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس کے سراپا کو پرکشش کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کی صورت میں مجھے ایک معروف اداکارہ کی جھلک نظر آئی لیکن بہر حال، نہ مذکورہ اداکارہ تھی اور نہ ہی اس کی کوئی قریبی رشتے دار.....!

میں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور بڑے ہی شائستہ انداز میں اس کی آمد کی غرض و غایت دریافت کی۔ وہ چند لمحات تک... متاملانہ انداز میں دیکھتی رہی جیسے یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ اپنی آمد کے مقصد سے مجھے آگاہ کرے یا نہ کرے۔ میں سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتا رہا تو بالآخر وہ کوئی فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

اس نے اپنا پرس کھولا اور پرس کے اندر سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔'' وکیل صاحب! یہ کارڈ آپ ہی کا ہے نا؟''

میں کارڈ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ اس میں کسی شک و شبہے کی گنجایش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ کارڈ میرا ہی تھا۔ میں نے کارڈ کو تھامنے کے لیے اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' ہاں یہ میرا تعارفی کارڈ ہے۔''

''پھر تو آپ کو یہ بھی یاد ہوگا، یہ کارڈ آپ نے کس کو دیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

اس کا سوال اگرچہ فضول سا تھا لیکن اس سوال کے پیچھے جھلکتی سنجیدگی نے مجھے چونکا دیا۔ وہ یقینی طور پر کسی خاص معاملے کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

''میں روزانہ درجنوں افراد کو اپنا وزیٹنگ کارڈ پیش کرتا

ہوں کارڈ کو دیکھ کر یہ بتانا ناممکن ہے کہ میں نے مذکورہ کارڈ کسی شخص کو دیا تھا کیوں کہ میرے وزیٹنگ کارڈز ایک جیسے ہیں اور میں افراد کے لحاظ سے ان پر کسی قسم کی مخصوص نشانیاں نہیں لگاتا ہوں'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنا تعارف کرائیں اور بتائیں' میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

وہ کارڈ کو واپس اپنے پرس میں رکھتے ہوئے بولی'' کچھ عرصے پہلے میرا شوہر آپ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے اس ملاقات کے بارے میں مجھے بتا دیا تھا۔ رخصت کے وقت آپ نے یہ کارڈ اسے دیا تھا۔ آپ کا وزیٹنگ کارڈ مجھے اس کے سامان میں رکھا ہوا ملا ہے اس لیے ڈھونڈتے ڈھانڈتے ہوئے میں آپ کے دفتر تک پہنچ گئی ہوں۔ آپ ایک وکیل ہیں اور مجھے اس وقت ایک وکیل ہی کی ضرورت ہے۔ آپ یقین کریں، میں سخت پریشان ہوں۔''

وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اندرونی پریشانی اس کے چہرے سے مترشح تھی تاہم اس پریشانی نے اس کی دل کشی اور رعنائی کو متاثر نہیں ہونے دیا تھا۔ میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

''آپ کے شوہر کا نام کیا ہے اور وہ کس سلسلے میں مجھ سے ملنے آیا تھا؟''

''امین!'' اس نے جواب دیا'' وہ محلے والوں کی ایک سنگین شکایت لے کر آپ کے پاس آیا تھا۔ میرا خیال ہے' امین ایسا شخص تو نہیں جسے آسانی سے بھلایا جاسکے!''

اس نے یاد دلایا تو مجھے یاد آگیا۔ وہ یقیناً امین نامی اسی احمق کا ذکر کررہی تھی جو اپنی بیوی کی وجہ سے پریشان تھا اور چاہتا تھا، میں اپنی وکالت کے زور پر کوئی ایسا شعبدہ دکھاؤں کہ اس کے محلے والے ایک دم بندے دے پتر بن جائیں اور میں نے اس کی بے وقوفانہ سوچ کے پیش نظر بڑی خوبصورتی سے اسے ٹرخا دیا تھا۔ وہ پلٹ کر میرے پاس نہیں آیا تو میرے ذہن نے بھی اسے یاد رکھنا ضروری نہ سمجھا۔

''آپ یقیناً فرزانہ ہیں.....!'' میں نے اپنے سامنے بیٹھی خوبصورت مگر پریشان عورت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی'' جی ہاں..... میرا نام فرزانہ ہی ہے۔''

امین نے مجھے بتایا تھا' اس کی بیوی کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان ہے لیکن فرزانہ کسی بھی طور پچیس سے زیادہ کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے بہ غور اس کا جائزہ لیا اور کہا۔

''کیا آپ اپنے محلے داروں کی وجہ سے پریشان ہیں؟''

''محلے داروں کو نی الحال ڈالیں جہنم میں'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی'' میں امین کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔''

''عجیب اتفاق ہے!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا'' چند ماہ پہلے وہ آپ کے سبب پریشان تھا اور میرے پاس اپنے مسائل کے حل کے لیے آیا تھا اور آج آپ اس کی وجہ سے پریشان ہوکر یہاں آئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا' میں آپ لوگوں کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔ اگر آپ کے محلے دار.....''

''محلے داروں کو بھول جائیں وکیل صاحب!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی قطع کلامی کرتے ہوئے بولی'' فی الحال مسئلہ امین کا ہے۔ پولیس نے اسے گرفتار کرکے تھانے میں بند کردیا ہے۔''

میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ فرزانہ نے بات ہی ایسی کردی تھی کہ میرا چونک جانا لازم تھا۔ میں نے سیاق وسباق کی روشنی میں پوچھا'' کیا آپ کے شوہر کا کسی محلے دار سے کوئی سنگین نوعیت کا جھگڑا وغیرہ ہوگیا ہے؟''

''وکیل صاحب!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی'' محلے داروں کا فی الحال کوئی مسئلہ نہیں۔ پولیس نے امین کو پرویز شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے جو ادھر حیدری میں رہتا تھا۔''

''اوہ!'' میں متاسفانہ انداز میں فرزانہ کو دیکھنے لگا پھر پوچھا'' حیدری میں رہنے والے کسی پرویز شاہ کا امین سے کیا تعلق ہے؟''

''پرویز شاہ کا تعلق امین سے نہیں بلکہ مجھ سے تھا'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

میں نے چونک کر حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا'' کسی پرویز شاہ کا آپ سے کیا تعلق ہوسکتا ہے اور امین اس پرویز شاہ کو کیوں قتل کرے گا..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا؟''

''میں سمجھاتی ہوں'' فرزانہ گلوگیر آواز میں بولی'' مجھے پورا یقین ہے' امین نے پرویز شاہ کو قتل نہیں کیا۔ وہ اگر اتنا ہی ہمت والا ہوتا تو محلے میں تین چار لفنگوں کی لاشیں گرا چکا ہوتا۔ وہ بہت ہی غصیلا اور بے وقوف شخص ہے اور امین کی انہی خصوصیات نے اسے اس مصیبت میں گرفتار کیا ہے۔ وہ قاتل نہیں لیکن حالات وواقعات اس کے خلاف جارہے

ہیں۔ میں اس لیے آپ کے پاس آئی ہوں۔ اب آپ ہی اسے سزا سے بچا سکتے ہیں۔ میں امین کا کیس آپ کے حوالے کرنا چاہتی ہوں۔''

اس نے بے ربط انداز میں جو آدھی ادھوری تفصیل بتائی وہ کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے کے لیے ناکافی تھی۔ شاید یہ اس کی پریشانی کے سبب تھا۔ میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور جب وہ خاموش ہوئی تو کہا۔

''دیکھو فرزانہ بی بی.....!'' میرے لہجے میں ہم دردی کا عنصر نمایاں تھا۔ ''اگر تمہارا شوہر بے گناہ ہے تو میں اسے بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' میں آپ سے تم پر آیا تو اس نے زیادہ اپنائیت محسوس کی، میں نے مزید کہا ''لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھے حالات سے بالکل درست آگاہی دو۔ جب تک میں موجودہ صورتِ حال سے واقف نہیں ہو جاؤں گا، تمہارے لیے اور تمہارے شوہر کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی تک تو تم نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ حیدری میں رہنے والے اس پرویز شاہ سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ تمہارے شوہر کو اس کے قتل کے الزام میں کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟''

وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اپنے ذہن میں بکھرے ہوئے مختلف خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر وہ ٹھہر ٹھہر کر مجھے حالات کے بارے میں بتانے لگی۔ اس کے بیان میں ملے جلے واقعات شامل تھے۔ بعض باتیں میرے لیے انکشاف کا درجہ رکھتی تھیں میں نے پوری توجہ سے اس کی بپتا سنی اور اہم نکات کو پیڈ پر نوٹ کرتا چلا گیا۔

یہاں میں فرزانہ سے ہونے والی گفتگو اور اس گفتگو کے نتیجے میں سامنے آنے والے اہم گوشوں کا ذکر کر رہا ہوں تاہم میں نے اس کے طولانی بیان میں سے غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں کو حذف کر دیا ہے۔ اس تفصیل کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو جائیں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو!

☆☆☆

امین کی سوچ، انداز اور رویے سے آپ اچھی طرح آگاہ ہو چکے ہوں گے۔ اس کو سمجھنے کے لیے زیادہ عقل یا کوشش کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس جیسے افراد کم و بیش ہر خاندان میں پائے جاتے ہیں جو دوسروں کی تفریح طبع کا سامان ثابت ہوتے ہیں اور اپنی عقل بندانہ حماقتوں کے باعث ہر وقت نہ صرف اپنے لیے بلکہ خود سے وابستہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی پریشانی کا سبب بنتے رہتے ہیں اور اس کیس میں بھی تعین ایسا ہی ہوا تھا۔

امین نے مجھے بتایا تھا، فرزانہ کے اندر بہت ساری مردانہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس کی سوچ میں ایک خاص قسم کی ٹیڑھ پائی جاتی تھی لہٰذا اس کی رائے پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ فرزانہ کی اس ضد کو بھی مردانہ وصف سے تعبیر کرتا تھا کہ وہ جاب کرنا چاہتی ہے حالانکہ فرزانہ معاش کی گاڑی کو دھکیلنے کی نیت سے اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہتی تھی۔ اس کی تنخواہ پندرہ بیس دن میں ختم ہو جاتی تھی، باقی کا مہینا قرض ادھار کے طفیل بسر ہوتا۔ امین اس تنگی و ترشی کو فرزانہ کی فضول خرچی کے کھاتے میں ڈال دیتا۔ وہ اس بات کے سخت خلاف تھا کہ فرزانہ نوکری کی غرض سے گھر سے نکلے اور کسی دفتر میں' مردوں کے درمیان بیٹھ کر کام کرے حالانکہ وہ خود جس دفتر میں کام کرتا تھا وہاں تین چار لڑکیاں بھی اس کے ساتھ کام کرتی تھیں۔ گویا' وہ لڑکیوں اور عورتوں کے بیچ بیٹھ کر کام کرتا تھا!

ہر انسان کی سوچ کا اپنا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ عموماً ہم جن چیزوں کی مذمت کر رہے ہوتے ہیں، بعض حالات میں انہیں اپنے لیے انتہائی جائز قرار دے دیتے ہیں۔ امین بھی کچھ اسی قسم کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کر رہا تھا!

بہرحال' فرزانہ کے مطابق..... ایک ماہ قبل اس نے لڑ جھگڑ کر جاب والا معاملہ حل کر لیا۔ امین نے راضی خوشی اسے نوکری کی اجازت تو نہ دی البتہ فرزانہ نے اس کی ناراضی کی پروا کیے بغیر ایک جگہ ملازمت کر لی۔ امین چند روز تک روٹھا روٹھا سا رہا۔ وہ فرزانہ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کر رہا تھا تاہم کچھ ہی دن میں اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور جب دس دن بعد فرزانہ تنخواہ کی رقم لے کر گھر آئی تو سب ٹھیک ہو گیا۔ فرزانہ نے بیس تاریخ کو دفتر جوائن کیا تھا لہٰذا اس ماہ اسے دس دن کی تنخواہ ملی۔

فرزانہ نے ایک عقل مندی یہ کی کہ تنخواہ کی رقم اس نے لا کر امین کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ اس بات نے امین کو خوش کر دیا۔ اس نے اس رقم سے پہلی فرصت میں اپنا ادھار چکایا اور آئندہ کے لیے فرزانہ کی نوکری پر معترض ہونے کا خیال دل سے نکال دیا۔ پتا نہیں' یہ اس کی کوئی مصلحت تھی یا منافقت بہرحال، عموماً اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں.....!

چند روز راضی خوشی گزر گئے پھر اچانک ایک بھونچال سا آ گیا۔ فرزانہ کی جاب ناگن چورنگی پر تھی۔ ناگن چورنگی، نیو کراچی سے زیادہ دور نہیں لہٰذا وہ نوکری کے لیے ساڑھے دس بجے گھر سے نکلتی اور ساڑھے پانچ بجے تک واپس آ جاتی۔ اس کی ڈیوٹی گیارہ سے پانچ بجے تک کی تھی۔ اس کے برعکس امین گھر سے نو بجے کا نکلا ہوا رات آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے واپس آتا تھا۔ ایک رات وہ گھر میں داخل ہوا تو سخت برہم تھا۔ فرزانہ نے اس کی برہمی کا سبب دریافت کرنا چاہا تو وہ پھٹ پڑا۔

''بس فرزانہ.....! میں اس سے زیادہ بے غیرتی برداشت نہیں کر سکتا!''

''بے غیرتی!'' وہ ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی ''تم کس بے غیرتی کی بات کر رہے ہو؟''

''وہ بے غیرتی..... جس کا مظاہرہ تم نے شروع کر رکھا ہے!'' وہ غصیلے انداز میں دہاڑا۔

''میں نے کیا کیا ہے؟'' فرزانہ نے الجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

''دیکھو تو کیسی ان جان بن کر پوچھ رہی ہو..... میں نے کیا کیا ہے؟'' امین نے منہ بگاڑ کر اپنی بیوی کے کہے ہوئے الفاظ دہرا دیے ''میں تمہاری چکر بازیوں کو سمجھ گیا ہوں!''

''یہی تو میں بھی پوچھ رہی ہوں۔'' فرزانہ چیخ پڑی ''تم میری کون سی چکر بازیوں کو سمجھ گئے ہو؟ میں نے کون سی بے غیرتی دکھائی ہے۔ تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟ صاف الفاظ میں کہو، جو کہنا چاہتے ہو!''

''صاف الفاظ میں سننا چاہتی ہو تو سنو'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا ''مجھے پتا چل گیا ہے، کوئی کار والا روزانہ تمہیں گھر چھوڑ کر جاتا ہے!''

''تو.....؟'' فرزانہ نے اس ایک لفظ کو غصے کی شدت سے کچھ زیادہ ہی کھینچ ڈالا۔

''مجھے بتاؤ، گرے کار والے اس شخص کا تم سے کیا ناتا ہے؟'' امین نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا ''وہ کیوں تمہیں اپنی گاڑی میں یہاں چھوڑنے آتا ہے؟''

''اس شخص کا نام پرویز شاہ ہے'' فرزانہ نے غصیلے لہجے میں بتایا ''میں اسی کے پاس کام کرتی ہوں اور تمہارا یہ کہا ہوا بالکل غلط ہے کہ وہ مجھے روزانہ گھر چھوڑنے آتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں دو تین مرتبہ پرویز شاہ کی گاڑی میں بیٹھی ہوں۔ اسے سرجانی ٹاؤن جانا تھا اس لیے مجھے گھر پر ڈراپ کر کے آگے نکل گیا۔''

''تم دو تین مرتبہ بھی اس کی گاڑی میں کیوں بیٹھی ہو؟'' وہ کٹ حجتی پر اتر آیا ''تمہیں پتا ہے، کسی نامحرم..... میرا مطلب ہے، یہ ٹھیک نہیں.....'' اس نے گڑبڑانے والے انداز میں جملہ مکمل کرنے کی کوشش کی صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ کچھ کہتے کہتے عین وقت پر رک گیا ہے۔

فرزانہ کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ وہ پرویز شاہ کو نامحرم گردانتے ہوئے اس کی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے مذمت کرنا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر اسے بات کو ادھورا چھوڑنا پڑا کہ کہیں پلٹ کر فرزانہ اس سے نہ پوچھ بیٹھے کہ وہ بھی تو تین چار نامحرم عورتوں کے ساتھ مل جل کر دفتر میں کام کرتا ہے۔ وہ اس بحث کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی لہٰذا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''امین! تم مجھ پر..... یا پرویز شاہ پر خواہ مخواہ کا شک کر رہے ہو۔ ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں جس انداز میں تم سوچ رہے ہو۔ وہ خاص طور پر مجھے گھر چھوڑنے کبھی نہیں آیا۔ سرجانی ٹاؤن میں اس کا پلاٹس کا ایک وسیع پراجیکٹ ہے۔ وہ اسی سلسلے میں ادھر جاتا رہتا ہے۔ تم اپنے ذہن کو صاف رکھو۔''

''میں اپنے ذہن کو کس طرح صاف رکھوں!'' وہ آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا ''مجھے پتا چلا ہے، جب پرویز شاہ تمہیں گھر پر چھوڑتا ہے تو تم دونوں ایسے والہانہ انداز میں ایک دوسرے کو 'خدا حافظ' کہتے ہو جیسے تمہارے درمیان کوئی گہرا رشتہ ہو۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا فرزانہ!''

''ہمارے درمیان صرف ملازم اور مالک کا تعلق ہے'' فرزانہ نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا ''اور اس تعلق کو کسی رشتے کا نام نہیں دیا جا سکتا اور جہاں تک مسکرا کر کسی کو 'خدا حافظ' کہنے کا تعلق ہے میرے خیال میں اخلاقیات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے اس نے امین سے استفسار کیا۔

''کیا تم جب اپنے دفتر پہنچتے ہو تو ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں اور عورتوں سے سلام دعا نہیں کرتے ہو؟ اسی طرح رخصت ہوتے وقت انہیں 'اللہ حافظ' نہیں کہتے ہو؟ اور اگر تم ایسا کرتے ہو تو کیا اس دوران میں تمہارے چہرے پر غصہ چھایا رہتا ہے، تم ذرا سا نہیں مسکراتے بلکہ کوئی بات کرے تو تم اسے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہو!'' جذبات کی رو میں بولتے بولتے اس کا لہجہ خاصا کڑوا ہو گیا ''بتاؤ، تمہارے دفتر میں کام کرنے والی عورتیں نامحرم نہیں ہیں؟''

''میری بات دوسری ہے!'' وہ سٹ پٹائے ہوئے

انداز میں بولا۔

''دوسری کیوں ہے؟'' اس نے چیخ سے مشابہ آواز میں پوچھا۔

وہ کوئی جواب نہ دے پایا۔ فرزانہ نے ایک کھلی حقیقت بیان کی تھی۔ امین کے پاس اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا وہ بغلیں جھانکتے ہوئے کھسیانے سے لہجے میں بولا۔

''میں تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بس، میں نے جو کہا ہے اس کا خیال رکھنا۔''

''امین! یہ بات تم کسی معقول طریقے سے بھی کہہ سکتے تھے'' وہ شکایتی انداز میں بولی ''تم سیدھا سیدھا کہہ دیتے کہ میں پرویز شاہ کی گاڑی میں نہ بیٹھا کروں، تمہیں اچھا نہیں لگتا۔ میں تمہاری بات مان لیتی لیکن تم نے جس انداز میں میرے کردار پر شک کیا ہے اس سے مجھے دلی صدمہ ہوا ہے..... کاش..... کاش.....!''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئی۔ امین نے اس کی شکایت پر نہ کوئی شرمندگی ظاہر کی اور نہ ہی کوئی غصہ دکھایا بلکہ دوسری طرف دیکھتا رہا۔ اچانک فرزانہ کے ذہن میں ایک اچھوتا سوال ابھرا۔ امین صبح نو بجے گھر سے نکلتا تھا پھر اس کی واپسی رات آٹھ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ جب کہ وہ خود سوا پانچ، ساڑھے پانچ تک گھر پہنچ جاتی تھی۔ اوقات کی اس ترتیب میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اسے پرویز شاہ کی گاڑی میں بیٹھے ہوئے یا گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھ پاتا۔ پرویز شاہ کے حوالے سے اس نے فرزانہ پر جو بھی شک کیا تھا اس کے لیے اس نے ''مجھے پتا چل گیا ہے'' اور ''مجھے پتا چلا ہے'' ایسے الفاظ ادا کیے تھے۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، محلے کے کسی شخص نے اس کے کان بھرے تھے کیونکہ پرویز شاہ کی گرے گاڑی میں اس کی آمد محلے والوں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

اسی تناظر میں اس نے اپنے شوہر سے پوچھ لیا۔

''امین! ایک بات سچ سچ بتاؤ گے.....؟''

وہ خفگی آمیز سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا پھر بولا ''پوچھو کیا پوچھنا ہے؟''

''تمہیں یہ بات کس نے بتائی کہ میں کسی گرے گاڑی میں بیٹھ کر گھر آتی ہوں؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے'' وہ بدستور تیوری چڑھا کر بولا ''تم نے اقرار کرلیا ہے پھر تصدیق کی کیا ضرورت ہے؟''

''میں نے اقرار کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی ''اسی لیے میں جاننا چاہتی ہوں میرا ایسا ''خیر خواہ'' کون ہے جس نے تمہیں میرے بارے میں اتنی اہم اطلاعات دی ہیں؟''

وہ تھوڑی دیر تک متامل دکھائی دیا پھر غصیلے لہجے میں بولا ''مجھے محلے ہی کے لوگوں سے اس گرے گاڑی والے کے بارے میں پتا چلا تھا۔''

''میں بھی تو یہی پوچھ رہی ہوں'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی ''تم مجھے اس شخص کا نام بتاؤ جس نے تمہیں بتایا ہے؟''

''کوئی ایک ہو تو بتاؤں!'' وہ قدرے خجل ہوتے ہوئے بولا۔

''اگر ایک سے زیادہ افراد ہیں تو بھی بتادو'' وہ اپنے غصے کو دباتے ہوئے معتدل لہجے میں بولی ''تاکہ پتا تو چلے کس کس کو کیا کیا تکلیف ہے؟''

''یہ وہی لوگ ہیں جن کی وجہ سے ہمارا جینا دوبھر ہوکر رہ گیا ہے'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا ''انہی لوفروں نے اس جانب میری توجہ مبذول کرائی ہے۔ بڑے طنزیہ انداز میں کہہ رہے تھے..... تمہیں ہم محلے والوں ہی سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ ہم دل پشوری کرنے کے لیے کوئی جملہ پھینک دیں تو تم پولیس کو بلالاتے ہو اور جب غیر محلے دار تمہاری بیوی کو گاڑیوں میں سیر کراتے پھریں تو تمہاری غیرت جوش نہیں مارتی؟ واہ بھئی واہ! ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ یہ اچھا دستور ہے۔ اپنوں کو کاٹو اور غیروں میں بانٹو!'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں نے اس لفنگے کے منہ سے ایسی لوفرانہ باتیں سنیں تو مجھے خود پر قابو نہ رہا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ سے اس کا گریبان پکڑلیا۔ اس کی مدد کو دوسرے بھی لپک آئے۔ یہ سب وہی لوگ تھے جو ہم پر چپکے چپکے آوازے کستے ہیں اور تمہیں دیکھ کر معنی خیز انداز میں سیٹیاں بجاتے ہیں۔ انہوں نے زور زبردستی کر کے اپنے ساتھی کا گریبان چھڑالیا اور اس کی حمایت میں بولے..... ہم سے کیوں الجھتے ہو؟ اگر تمہارے اندر اتنی ہی زیادہ غیرت بھری ہوئی ہے تو جا کر اپنی بیوی سے پوچھو وہ آج کل کس یار کی گرے فورڈ میں بیٹھ کر سیر سپاٹے کرتی پھرتی ہے؟''

وہ ایک مرتبہ پھر سانس کی درستی کے لیے متوقف ہوا۔ سانس پوری طرح ہم وار بھی نہیں ہو پائی تھی کہ وہ دوبارہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

''ان بدبختوں کے تمہارے بارے میں ایسے بے ہودہ کلمات سن کر تو میرا دماغ ہی گھوم گیا۔ میں مرنے مارنے پر تل گیا لیکن میں ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ ان چار کے مقابلے میں میری پیش نہ گئی۔ یہ تو اچھا ہوا، انہوں نے مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا' صرف دھکے ہی دیتے رہے ورنہ اس وقت میں تمہیں یوں صحیح سلامت نظر نہ آتا۔ میں ابھی ابھی انہی شیطانوں سے نمٹ کر آرہا ہوں۔ ایک ذلیل نے تو یہاں تک کہہ دیا..... اگر تم سے بیوی سنبھالی نہیں جاتی تو تھانیدار کے مشورے پر عمل کرلو۔ میں یہ پگھلا ہوا سیسا اپنی سماعت میں انڈیل کر سیدھا تمہارے پاس آرہا ہوں۔ بتاؤ، میں کہاں غلطی پر ہوں.....!''

بات ختم کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اب اس آواز میں غصے اور برہمی کے بجائے بے چارگی عود کر آئی تھی۔ اس نے بیوی کی طرف سے نگاہ چراتے ہوئے زخمی لہجے میں استفسار کیا۔

''تم تو جانتی ہی ہو' تھانیدار نے مجھے کیا مشورہ دیا تھا؟''

فرزانہ قانون کے اس پاسبان کے مشورے کو نہیں بھولی تھی۔ تھانیدار نے اس کے شوہر کو بڑے مخلصانہ انداز میں مشورہ دیا تھا کہ وہ یا تو اس محلے کو چھوڑ دے اور یا پھر اپنی بیوی کو..... کہ جس کی وجہ سے وہ مشکلات اور مسائل سے دوچار ہے۔ تھانیدار کا یہ ''نیک'' مشورہ اس بوگس رپورٹ کی روشنی میں تھا جو تفتیشی افسر اے ایس آئی شمشاد نے تیار کر کے اس کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اس رپورٹ میں فرزانہ کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے سارے فتنے کی جڑ قرار دیا گیا تھا۔ فرزانہ کی مخالفت میں اے ایس آئی نے محض اس وجہ سے رپورٹ تیار کی تھی کہ اس نے اے ایس آئی کے پھیلائے ہوئے جال میں قدم رکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ محلے کے چند شرپسند اوباش لفنگوں کی باتیں سن کر اے ایس آئی یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ فرزانہ اس کے لیے انتہائی آسان شکار ثابت ہوگی لیکن اس کی پیہم کوشش کے باوجود بھی جب ایسا کچھ ثابت نہیں ہوا تو اپنی ناکامیابی کے انتقام کے طور پر اس نے فرزانہ ہی کو قصوروار ٹھہراتے ہوئے کہانی الٹ دی تھی۔

یہ ساری ترش حقیقتیں فرزانہ کے ذہن میں بڑی تیزی سے گردش کر رہی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی قلق تھا کہ اس کے شوہر نے اس کے مقابلے میں ان لفنگوں کی بات کو اہمیت دی جو اس کی عزت کے دشمن بنے بیٹھے تھے۔ وہ نامراد ہر لمحے اس موقع کی تاک میں رہتے کہ کب اس کے قدم ڈگمگائیں اور ان کا داؤ چل جائے۔

ان شیطانوں کے خلاف پولیس نے بھی کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ اس نے جی میں ٹھان لی کہ کوشش کر کے وہ بہت جلد اس محلے ہی کو خیرباد کہہ دیں گے۔

اس رات ان کے بیچ ایک پراسرار خاموشی حائل رہی۔ امین گومگو کی کیفیت سے دوچار رہا۔ اسے اپنی بے بسی پر غصہ آتا، کم زوری چاہے اعصابی ہو، دماغی ہو، جسمانی ہو یا کسی بھی اور نوعیت کی ہو وہ انسان کے اندر غصے کو جنم دیتی ہے، اس کی قوت برداشت کو کھا جاتی ہے۔ کم زور انسان ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔ تحمل اور بردباری اس کے پاس سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ وہ اپنی تمام تر ناکامیوں اور ناکامرانیوں کے لیے دوسروں کو موردالزام ٹھہرانے لگتا ہے۔ امین بھی یہی کچھ کر رہا تھا۔ محلے کے لفنگوں پر اس کا بس نہیں چلتا تھا لہٰذا وہ گھر کی مرغی پر سارا غصہ اتارتا تھا۔ اس کے خیال میں اس کے تمام تر مسائل کا سبب فرزانہ تھی۔ وہ جانتا تھا، فرزانہ کا کوئی قصور نہیں لیکن اس کی کم زور سوچ اسی خیال سے بہل جاتی تھی کہ یہ سب کچھ فرزانہ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ وہ الٹی سیدھی باتیں کرنے والوں کے منہ توڑنے کی سکت نہیں رکھتا تھا اس لیے موقع محل دیکھ کر وہ فرزانہ پر برس کر اپنے دل کا غبار نکال لیتا تھا۔ نادان کو اس بات کا ذرا سا بھی احساس نہیں تھا کہ فرزانہ بے چاری اپنا غبار نکالنے کے لیے کہاں جا کر کس پر برسے!

وہ سرد مہر رات جیسے تیسے گزر رہی گئی۔

اسی رات سونے کی کوشش میں جاگتے ہوئے فرزانہ نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ پہلی فرصت میں اس محلے کو چھوڑ دیں گے اور جب تک وہ لوگ یہاں ہیں' وہ پرویز شاہ کی گاڑی میں بیٹھ کر اس طرف نہیں آئے گی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور کمزور اعصاب شخص تھا اور وہ عمر کی اس منزل پر کھڑا تھا جہاں انسان کے اندر تبدیلی لانا ناممکن نہیں ہوتا..... اور انسان بھی ایسا کہ جو خود کو سقراط و بقراط سے کم نہ سمجھتا ہو!

آئندہ دو روز امن و سکون سے گزر گئے۔ کوئی خوش گوار یا ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آیا۔ فرزانہ نے سکھ کی سانس لی کہ مصیبت ٹل گئی لیکن یہ اس کی خوش فہمی ثابت ہوئی۔ تیسرے دن' رات کو امین دفتر سے لوٹا تو اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ اس نے فرزانہ سے کوئی اچھی بری بات نہ کی اور منہ پھلا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ فرزانہ نے یہی سمجھا کہ اس کے دفتر میں کوئی ایسا ویسا واقعہ پیش آگیا ہے جس کی وجہ سے وہ ایسے رویے کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ شامت کی ماری نے اس سے پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے امین! تم خاموش کیوں ہو؟''

''خاموش نہ رہوں تو کیا۔ اپنی رسوائی کا اعلان کرتا پھروں!'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''رسوائی؟'' فرزانہ نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا ''کس نے تمہاری رسوائی کردی!''

''تمہارے ہوتے ہوئے یہ کارنامہ اور کون انجام دے سکتا ہے!'' وہ جلے کٹے انداز میں بولا۔

فرزانہ کو بھی تاؤ آگیا، اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی ''تم ہوش میں تو ہو۔ میں نے تمہاری رسوائی کے لیے ایسا کیا کردیا ہے؟''

''کیا یہ بات بھی مجھے ہی بتانا ہوگی؟'' وہ عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''جو الزام لگاتا ہے وہی اس کا سبب بھی بتاتا ہے!'' فرزانہ نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا۔

''میں نے تمہیں سختی سے منع کیا تھا نا، تم اس پرویز کی گاڑی میں نہیں بیٹھو گی'' وہ آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا ''لیکن تم نے میری بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا۔ کل پھر تم اسی منحوس شخص کی گرے گاڑی میں گھر آئی ہو!''

''یہ جھوٹ ہے..... ایک سو ایک فی صد جھوٹ!'' وہ چلا اٹھی ''میں اس دن کے بعد سے پرویز شاہ کی گاڑی کے قریب بھی نہیں گئی۔ کسی بدبخت نے تمہیں سراسر غلط اطلاع دی ہے۔''

''جب لوگ دیکھیں گے تو بولیں گے بھی!'' وہ زہریلے لہجے میں پھنکارا۔

''اس کا مطلب ہے' محلے کے آوارہ اور لفنگے تمہاری نظر میں مجھ سے زیادہ معتبر ہیں'' فرزانہ بھی ہتھے سے اکھڑ گئی ''تمہیں ان کی بات کا اعتبار ہے لیکن میرے کہے کا یقین نہیں۔ میں جب کہہ رہی ہوں کہ میں اس شخص کی کیا، کسی بھی شخص کی گاڑی میں نہیں بیٹھی ہوں تو تمہیں میری بات کو سچ ماننا چاہیے۔''

''تم یہ لوکری چھوڑ ہی دو'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا ''نہ رہے گا بانس اور نہ ہی بجے گی بانسری۔ میں نہ محلے والوں کی زبانیں بند کرسکتا ہوں اور..... اور''

''اور نہ ہی ان کے بازو توڑ سکتے ہو'' فرزانہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے اس کے کپکپاہٹ آمیز جملے کو مکمل کردیا اور نہایت ہی کٹیلے لہجے میں بولی ''امین! تم انتہائی بزدل اور کانوں کے کچے انسان ہو۔ میں تم سے شادی کرکے پچھتا رہی ہوں۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ تم مجھ پر بھروسا کرنے کے بجائے ان لوگوں کی لگائی بجھائی پر یقین کررہے ہو جو ہمارے دشمن ہیں'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ان تمام مسائل کا صرف ایک ہی حل ہے کہ ہم جلد از جلد یہ محلہ چھوڑ دیں، میں نے ناگن چورنگی کے قریب ہی ایک چھوٹا سا گھر دیکھ لیا ہے اور.....''

''ناگن چورنگی!'' امین نے ایک ایک لفظ چبا کر اس کی بات کاٹ دی اور زہریلے لہجے میں بولا ''ناگن چورنگی کا نام بھی نہ لینا میرے سامنے۔ یہ نام سنتے ہی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی موذی ناگن مجھے ڈنک مار رہی ہو'' پھر وہ منہ کو ٹیڑھا کرکے عجیب سے لہجے میں بولا ''تمہارے پرویز شاہ کی ایجنسی بھی تو ناگن چورنگی پر ہی ہے نا؟''

امین کا یہ جملہ کسی برچھی کے مانند اس کے کلیجے میں پیوست ہوگیا۔ امین نے اس کے حوالے سے پرویز شاہ کا ذکر بڑے بھونڈے انداز میں کیا تھا۔ ایک شوہر کو اپنی بیوی کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ اسے یقین ہوگیا کہ امین اس کے کردار پر شک کررہا ہے اور یہ بات کسی بھی شخص کے لیے انتہائی اذیت کا باعث ہوتی ہے کہ اس کے کردار کو شبہے کی نظر سے دیکھا جائے۔ فرزانہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ اس کی باطنی سماعت نے ایک چھناکے کی بڑی واضح آواز سنی تھی۔

کوئی بھی انسان جب اندر سے ریزہ ریزہ ہوتا ہے تو یا تو وہ بالکل ختم ہوجاتا ہے اور یا پھر اس کے پارہ پارہ اندرون میں ایک بغاوت، ایک ضد یا ایک سرکشی جنم لیتی ہے۔ فرزانہ پر بھی یہ ضد سوار ہوگئی کہ کچھ بھی ہو' وہ پرویز شاہ کی ایجنسی والی ملازمت نہیں چھوڑے گی۔

پرویز شاہ نامی وہ شخص ایک عجیب وغریب کاروبار کرتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک دھوکے باز شخص تھا جو معصوم، سادہ لوح اور بے وقوف لوگوں کو مستقبل کے سنہری خواب دکھا کر لوٹتا تھا۔ اس کا لوٹنا ایسے معمولی انداز کا تھا کہ کسی کو اس کی بد نیتی کے بارے میں پتا نہیں چلتا تھا۔ فرزانہ بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کا باس کتنا بڑا فراڈیا ہے۔ فراڈ اور دھوکا دہی کا کاروبار کرنے والے افراد عموماً بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں..... نہایت ہی محبت اور خوش اخلاقی کے ساتھ۔ وہ اپنے مصنوعی دوستانہ رویے سے لوگوں کو دل جیت لیتے ہیں۔ لوگ آسانی سے ان پر بھروسا کرلیتے ہیں اور یہیں سے ان کی کامیابی کا آغاز ہوتا ہے۔

پرویز شاہ نے ''برائٹ فیوچر اسٹیٹ'' کے نام سے ایک ایجنسی قائم کر رکھی تھی جس کا دفتر ناگن چورنگی کی ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر واقع تھا۔ اس دفتر میں صرف تین افراد بیٹھتے تھے۔ پروپرائٹر پرویز شاہ، اس کی سیکریٹری نما ملازم فرزانہ اور آفس اسسٹنٹ فرید احمد، باقی تین افراد کی تین ٹیمیں فیلڈ میں کام کرتی تھیں جسے پرویز شاہ مارکیٹنگ کا نام دیتا تھا اور یہی اصل کام تھا۔ یہ نو افراد (تین لڑکے اور چھ لڑکیاں) گھر گھر دروازہ کھٹکھٹا کر انعامی چیاں فروخت کرتے اور لوگوں کو یہ حسین خواب دکھاتے کہ قرعہ اندازی میں ان کے قیمتی انعامات نکلیں گے۔ مذکورہ انعامات سلائی مشین سے شروع ہو کر ایک سو بیس گز کے پلاٹ تک جاتے تھے۔ بہر حال' کسی نے کیا خوب کہا ہے..... جب تک دنیا میں بے وقوف موجود ہیں، عقل مند بھوکا نہیں کر سکتا!

اس رات دونوں میاں بیوی کے درمیان اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی۔ امین اس بات پر مصر تھا کہ فرزانہ جاب چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے اور فرزانہ کا اصرار تھا کہ وہ نوکری نہیں چھوڑے گی، امین کو چاہیے کہ وہ اپنی مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے محلہ چھوڑ دے۔ ناگن چورنگی نہ سہی، وہ کراچی کے کسی بھی حصے میں جا بسے' اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بہر حال' وہ رات بدمزگی میں دونوں نے اپنے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دی۔

اگلی صبح امین ناشتا کیے بغیر گھر سے نکل گیا۔ فرزانہ نے بھی زیادہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے اپنے شوہر کی رات والی حرکت پر سخت غصہ تھا۔ امین کی طرف سے اس کا دل بری طرح دکھا ہوا تھا۔ وہ اس کے جانے کے بعد کافی دیر تک پڑی روتی رہی۔

اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کسی بھی حال میں جاب نہیں چھوڑے گی لہٰذا اپنے وقت پر تیار ہو کر وہ گھر سے نکل گئی۔ وہ حسب معمول جاب پر پہنچ بھی گئی لیکن وہاں پہنچ کر اسے ایک ناخوش گوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا باس پرویز شاہ اور آفس اسسٹنٹ فرید احمد دس بجے تک دفتر آجاتے تھے۔ فرزانہ کی آمد کے لگ بھگ گیارہ بجے ہوتی تھی۔ فیلڈ ورکرز کی تینوں ٹیمیں بھی صبح دفتر میں جمع ہوتیں اور ہفتہ واری میٹنگ کے بعد اپنے کام پر نکل جاتیں۔ اس نے دفتر میں قدم رکھا تو وہ دونوں موجود تھے لیکن ان کے منہ پھولے ہوئے تھے، فرزانہ ان کی برہمی کا سبب نہیں جانتی تھی۔ انہوں نے اس کے سلام کا صحیح طور پر جواب بھی نہیں دیا۔

فرزانہ نے فرید سے پوچھا ''کیا بات ہے۔ آپ کا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟''

''چہرہ اترا ہوا نہیں بلکہ چڑھا ہوا ہے۔'' فرید نے خفگی آمیز لہجے میں جواب دیا۔

''یہی تو میں بھی پوچھ رہی ہوں۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی ''اس برہمی اور ناراضی کا سبب کیا ہے؟''

''سبب کے بارے میں شاہ جی بتائیں گے!'' فرید نے پرویز شاہ کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اس دفتر کو پارٹیشن کی مدد سے دو کمروں میں بدل دیا گیا تھا۔ عقبی کمرے میں پرویز شاہ بیٹھتا تھا اور بیرونی کمرا دیگر اسٹاف کے استعمال میں تھا پرویز شاہ فرزانہ کو اپنے ساتھ عقبی کمرے میں لے گیا۔ جب وہ بیٹھ چکی تو پرویز شاہ نے پوچھا۔

''تم نے اپنے شوہر کا نام امین ہی بتایا تھا نا؟'' اس کے لہجے سے خفگی جھلکتی تھی۔

''ہاں.....'' فرزانہ نے اثبات میں جواب دیا پھر الجھن زدہ نظر سے اپنے باس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھ لیا ''آپ میرے شوہر کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟''

پرویز شاہ نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے تصدیقی لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا تمہارا شوہر امین کوئی نفسیاتی مریض ہے؟''

فرزانہ کے جی میں تو آئی کہ فوراً کہہ دے ''ہاں'' لیکن اس نے اپنی زبان کو قابو میں رکھا اور مصلحت آمیز لہجے میں بولی ''سر! نفسیاتی مریض تو نہیں البتہ امین غصے کا ذرا تیز ہے''

''میں اس سے زیادہ غصے والا ہوں'' پرویز شاہ نے برہمی سے کہا ''آج گھر جا کر اسے اچھی طرح یہ بات سمجھا دینا کہ آئندہ میرے آفس میں قدم نہ رکھے ورنہ میں پہلی فرصت میں اس پاگل کے بچے کو پولیس کے حوالے کر دوں گا اور تم.....'' وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی برہمی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

''اور تمہیں اگر نوکری نہیں کرنا تو ابھی اور اسی وقت جا سکتی ہو۔ مجھے اپنے دفتر کے لیے بہت لڑکیاں مل جائیں گی۔ آج کل ویسے بھی بے روزگاری عروج پر ہے۔''

فرزانہ سمجھ گئی کہ امین نے وہاں آ کر کوئی بڑی گڑبڑ کر دی ہے۔ اس نے اپنی تسلی کی خاطر پرویز شاہ سے پوچھ لیا ''سر! کیا امین یہاں آیا تھا؟''

''ہاں' آیا تھا'' وہ سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں بولا ''تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی گیا ہے وہ

کریک۔ میں نے تمہاری وجہ سے اس کے ساتھ خاصی رعایت برتی ہے ورنہ لوگوں کو جمع کر کے میں اس کی تشریف مبارک پر اتنے جوتے لگوتا کہ کئی دنوں تک اسے گھائل تشریف کے بل آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا!''

فرزانہ کے پیہم اصرار پر پرویز شاہ نے اسے بتایا کہ امین نے وہاں پہنچ کر بڑے جذباتی پن کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ فرزانہ کے حوالے سے پرویز شاہ کو الٹی سیدھی سناتا رہا اور مطالبہ کیا وہ فرزانہ کو نوکری سے نکال دے۔ اس کی وجہ سے ان کی عزت خاک میں مل رہی ہے۔ محلے والے بڑی پراسرار چہ میگوئیاں کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ نیز اس نے بڑے واشگاف الفاظ میں پرویز کو دھمکی دی کہ اگر آیندہ وہ فرزانہ کو اپنی گاڑی میں گھر چھوڑنے آیا یا ان کے محلے میں کہیں دکھائی دیا تو وہ کوئی لحاظ کیے بغیر اس کی ٹانگیں توڑ دے گا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے پرویز شاہ کو متعدد سنگین اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں۔ پانچ دس منٹ کی اس ہنگامہ آرائی کے بعد وہ پاؤں پٹختا ہوا دفتر سے رخصت ہو گیا۔

یہ تفصیل بیان کرنے کے بعد پرویز شاہ نے فرزانہ سے پوچھا ''تم اتنے بدتمیز شخص کے ساتھ کیسے گزارا کرتی ہو۔ کیا تمہیں شادی کے لیے کوئی اور نہیں ملا تھا؟''

''سر.....! آپ فکر نہ کریں'' وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی ''میں امین کو اچھی طرح سمجھا دوں گی۔ آیندہ وہ اس طرف کا رخ نہیں کرے گا، میں اس کے ناشائستہ رویے کے لیے آپ سے معافی چاہتی ہوں''

پرویز شاہ نے زہریلے لہجے میں کہا ''میں ٹانگیں توڑنے کی بات کرتے ہوئے اس کانگڑی پہلوان کی اپنی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ میں نے اس کی صحت کی خاموش التجا کو سن لیا ورنہ وہ تمہارا پوستی ایک ہاتھ کی مار بھی نہیں۔ پتا نہیں، وہ کس بات پر اتنا اکڑ رہا تھا۔ نہ جسم میں جان اور نہ ہاتھ پاؤں میں طاقت، اس کس مپرسی پر بھی وہ اچھل اچھل کر مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر عجیب سے لہجے میں اس نے فرزانہ سے استفسار کیا۔

''سچ سچ بتاؤ' تم نے کیا دیکھ کر اس بڑے میاں سے شادی کی تھی؟''

''سر' جانے بھی دیں'' وہ بات کو رفع دفع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ''میں امین کو اچھی طرح سمجھا دوں گی۔ آیندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ مجھے اس واقع کا سخت افسوس ہے۔''

فرزانہ ''جانے بھی دیں'' کی بات کر رہی تھی لیکن پرویز شاہ چھوڑنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنی ہی رو میں بولتا چلا گیا۔

''جب اس بڈھے طوطے نے یہاں آ کر تمہارے بارے میں استفسار کیا تو میں یہی سمجھا کہ وہ تمہارا والد بزرگوار ہے لیکن پھر اس نے مجھے تمہارے ساتھ منسوب کر کے الٹی سیدھی بکواس شروع کر دی اور اپنی شوہریت کا ڈھنڈورا پیٹنے لگا تو مجھے پتا چلا کہ اس وقت کس مخلوق کے روبرو ہوں..... بہرحال'' وہ تھوڑی دیر کو رکا پھر افسوس ناک انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''تمہارے شوہر کو دیکھ کر مجھے تمہاری بدقسمتی پر بہت دکھ محسوس ہوا ہے۔ پتا نہیں' تم نے کس مجبوری کے تحت میں ہانپتے کانپتے زرد پتوں والے پیڑ کے سایے میں پناہ لی ہے۔ مجھے تمہارے نجی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن ایک نکتے کو ذہن نشین کر لو.....'' وہ لمحاتی توقف کے دوران میں میز پر رکھی ہوئی اشیا کو اضطراری انداز میں اِدھر اُدھر کرتا رہا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

''میں اس بے ہودہ شخص کو دوبارہ یہاں دیکھنا نہیں چاہتا۔ اگر آیندہ دفتر میں مجھے اس کی شکل نظر آ گئی تو میں سوچے سمجھے بغیر اسے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ پھر مجھ سے کوئی شکوہ نہ کرنا۔ تم دونوں کے درمیان جس بھی نوعیت کے گھریلو اختلافات پائے جاتے ہیں انہیں اپنی ہی ذات تک محدود رکھو۔ اگر تمہیں میری یہ شرائط منظور ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں اپنے لیے کسی اور سیکریٹری کا بندوبست کر لیتا ہوں۔ تم اپنے شوہر کو سنبھال لو گی یا کسی نئی جگہ نوکری کرو گی۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے.....!''

فرزانہ نوکری نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ امین نے آج یہاں آ کر جس بے ہودگی کا مظاہرہ کیا تھا اس کے بعد تو اس کی نوکری کرنے کی ضد اور بھی پکی ہو گئی۔ وہ چند لمحات تک خاموش بیٹھی اپنے حالات پر غور کرتی رہی پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے پرویز شاہ سے کہا۔

''سر! آج یہاں جو کچھ ہوا' میں اس کے لیے ایک مرتبہ پھر آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میرا شوہر آیندہ یہاں نہیں آئے گا۔ میں گھر جا کر اسے اچھی طرح سمجھا دوں گی..... اور یہ کہ میں جس طرح جاب پر آتی ہوں ایسے ہی آتی رہوں گی۔''

''ٹھیک ہے' مجھے کوئی اعتراض نہیں'' پرویز شاہ نے سرسری انداز میں کہا۔

اس طرح یہ تلخ موضوع لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔

اس رات فرزانہ نے اپنے شوہر سے شدید جھگڑا کیا۔ ان کے درمیان اچھی خاصی گالم گلوچ بھی ہوئی۔ نوبت ہاتھا پائی تک بھی پہنچ جاتی اگر امین ذرا ہمت سے کام لیتا تو لیکن اسے اپنی دانشگاف ناتوانی کا پوری طرح احساس تھا، وہ ایسی غلطی کر کے اپنی ہڈیوں کو سپرد عذاب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس بات کے امکانات تھے کہ فرزانہ باقاعدہ اس سے دھینگا مشتی تو نہ کرتی لیکن اگر وہ غصے میں دو چار ہاتھ بھی چھوڑ دیتی تو امین کو لینے کے دینے پڑ جائے۔ وہ ایک دو جھانپڑ سے زیادہ کا نہیں تھا لہٰذا اپنی اوقات کو دیکھتے ہوئے اس سلسلے میں اس نے بہت احتیاط برتی اور زبانی جوش خروش سے کام چلاتا رہا۔

وہ چیخ چلّا کر فرزانہ سے اس بات پر اصرار کر رہا تھا کہ وہ پہلی فرصت میں نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے ورنہ وہ اسے اور پرویز شاہ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کی اس گیدڑ بھبکی سے فرزانہ ذرا بھی متاثر نہ ہوئی اور اس نے ترکی بہ ترکی کہہ دیا' وہ اسے اور پرویز شاہ کو تو زندہ چھوڑے گا یا نہیں البتہ' یہ بات طے ہے کہ اگر آیندہ اس نے پرویز شاہ کے دفتر میں قدم رکھا تو وہ ضرور اسے تھانے میں بند کروا دے گا۔

فرزانہ نے ایک کھلی حقیقت بیان کی تھی لیکن یہ بات امین کو بہت زور کی لگی۔ وہ بلبلا اٹھا اور شدید غصے کے عالم میں اول فول بکنے لگا۔ وہ چیخ چیخ کر فرزانہ کو برا بھلا کہنے لگا زور اس بات پر تھا کہ وہ اپنے شوہر کے مقابلے میں ایک نامحرم پرویز شاہ کی حمایت میں کیوں بولی تھی۔ فرزانہ کی حقیقت گوئی سے امین کی شوہرانہ انا کو بڑی ظالم ٹھیس لگی تھی۔ اس کی غصیلی اور لایعنی حرکات کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا' اچانک اس کے بدن میں پتنگے لگ گئے ہوں۔

ان دونوں کے درمیان اس رات جو چپقلش دہاڑ ہوئی وہ آن ائر اڑدس پڑوس تک بھی پہنچی جسے انہوں نے انجوائے کیا۔ اس غصیلی، بحث وتکرار تک محدود گرم جنگ کا اختتام ان کلمات پر ہوا۔

''میں آخری بار کہہ رہا ہوں فرزانہ!'' امین نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا ''تم کل سے نوکری پر نہیں جاؤ گی!''

''میں جاؤں گی'' وہ سرکش لہجے میں بولی ''تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟''

''میں تمہارا شوہر ہوں..... اور کون ہوں!'' وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

''شوہر تو بیوی کے لیے ایک سایہ دار درخت کے مانند ہوتا ہے۔'' وہ دکھی لہجے میں بولی ''ایک مضبوط چھتری کی طرح اسے موسم کے سرد و گرم، خنک و نم سے بچاتا ہے ہر حوالے سے اس کی حفاظت کرتا ہے، اسے آرام و آسایش پہنچاتا ہے لیکن تم نے کیا کیا ہے۔ مجھے کچھ دینے کی تو تمہیں کبھی کوئی توفیق نہیں ہوئی۔ الٹا میری کردار کشی پر کمربستہ ہو۔ ذرا گریبان میں جھانک کر دیکھو! کیا تم شوہر کہلوانے کے قابل ہو؟''

''تم مجھے گالی دے رہی ہو!'' وہ ناچ اٹھا۔

''اور تم تو اب تک مجھ پر پھول برسا رہے ہو'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی ''تمہیں کچھ احساس بھی ہے' اس گل باری نے میرے پندار کو کتنی بڑی طرح زخمی کیا ہے؟''

امین شرمندہ ہونے کے بجائے ڈھٹائی پر ڈٹا رہا اور فرزانہ کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا، بالآخر اس نے حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ سناتے ہوئے لہجے میں اس نے فرزانہ سے کہا۔

''اگر تم اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو مجھے خود ہی کوئی بندوبست کرنا ہوگا!''

میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہے کہ اس میں اٹھتے بیٹھتے نوک جھوک ہوتی رہتی ہے اور جہاں میاں بیوی میں بے پناہ محبت ہوتی ہے وہاں بھی یہ سلسلہ موجود نظر آتا ہے، ذرا مختلف انداز میں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہوں اور ان کے درمیان بحث وتکرار نہ ہو..... بعض ماہرین تو میاں بیوی کے بیچ ہونے والی اس 'تو تو' میں میں'' کو پرمسرت اور خوش گوار ازدواجی زندگی کا ثبوت قرار دیتے ہیں۔

اس قسم کے اختلافات اور اس نوعیت کی بحث وتکرار کی عمر نہایت ہی مختصر ہوتی ہے۔ رات گئی، بات گئی کے مصداق..... صبح تک سب ٹھیک ہو جاتا ہے!

ان کی زندگی میں بھی صبح آئی لیکن کچھ بھی ٹھیک نہ ہو سکا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میاں بیوی والی زندگی نہیں گزار رہے تھے، دوسرے دن دونوں کا منہ پھولا ہوا تھا۔ وہ اپنے اپنے وقت پر اپنی اپنی نوکری پر چلے گئے۔ وہ دن اسی سرد مہری اور تناؤ کی سی کیفیت میں گزر گیا۔ رات کو وہ کلام کیے بغیر اپنے اپنے بستر میں دبک کر سو رہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ڈٹے رہے۔

اس سے اگلے روز کی صبح بھی گزشتہ سے پیوستہ ثابت ہوئی لیکن اس دن کا اختتام بڑا ہی ہولناک تھا۔ امین اپنے وقت معمول سے کافی پہلے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ ناپید ہو چکی تھی لیکن رات کی تاریکی

نے ابھی تک اپنے پر نہیں پھیلائے تھے۔ گھر پہنچتے ہی وہ سیدھا واش روم میں گھس گیا پھر واش روم کے اندر سے اس کے نہانے کی مخصوص آواز ابھرنے لگی۔

فرزانہ کو اس کی اس خلاف معمول حرکت پر شدید حیرت ہوئی کیونکہ امین نہانے کے معاملے میں خاصا چور ثابت ہوا تھا اور خاص طور پر شام یا رات کے وقت نہاتے ہوئے تو اس کی جان جاتی تھی۔ اس کے فرار نما انکار سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ گوشت پوست کا نہیں بلکہ کاغذ کا انسان ہو جو ذرا سا بھیگنے پر بھی پھس ہو جائے گا۔ وہ عموماً ہفتے میں ایک دن' چھٹی کے روز دوپہر کے وقت نہالیا کرتا تھا۔

فرزانہ نے اپنی حیرت بھری الجھن کا اظہار نہیں کیا تاہم وہ دل ہی دل میں یہ سوچتی رہی کہ اس بگڑے ہوئے اللہ کے بندے کو سرِشام غسل کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر واش روم سے باہر آنے کے بعد امین نے خود سے کوئی بات کی تو وہ اس سے اپنی اس الجھن کا سبب ضرور دریافت کرے گی لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

امین ابھی فارغ ہو کر واش روم سے نکلا بھی نہیں تھا کہ ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ فرزانہ لپک کر دروازے پر پہنچی پھر جب اس نے دروازہ کھولا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے پولیس والے کھڑے تھے۔

پولیس والے اس کی اجازت حاصل کیے بغیر گھر میں گھس آئے اور تھوڑی سی کوشش کے بعد انہوں نے امین کو گرفتار کرلیا۔ فرزانہ کے استفسار پر اسے بتایا گیا کہ امین کو پرویز شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جارہا ہے۔ اس نے تفصیل جاننا چاہی تو اسے تھانے آنے کو کہا گیا۔

وہ تھانے میں قدم نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ انکوائری افسر اے ایس آئی شمشاد علی والے واقعے نے اسے پولیس کی طرف سے خاصا متنفر کردیا تھا لیکن امین کے حوالے سے اس پر ایسا وقت آن پڑا تھا کہ وہ مجبور ہوگئی۔ اسے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے تھانے جانا پڑا۔ وہاں جاکر اسے کوئی خاص بات معلوم نہ ہوسکی۔ پولیس والوں نے اسے اپنے شوہر سے ملنے تک نہیں دیا۔ اسے بس یہی بتایا گیا کہ امین کو ''برائٹ فیوچر اسٹیٹ'' کے مالک پرویز شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے..... اور اسے اگر مزید کچھ معلوم کرنا ہو تو عدالت سے رجوع کرے۔

فرزانہ کا کبھی تھانے کچہری سے واسطہ نہیں پڑا تھا اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی پریشان ہوگئی اگلے روز وہ عدالت پہنچی اور عدالتی کارروائی کو بھی دیکھا لیکن پریشانی کے باعث کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وہ محض اتنا جان پائی کہ پولیس نے اس کے احمق اور غصیلے شوہر کو عدالت میں پیش کرکے سات روز کا ریمانڈ حاصل کرلیا تھا۔ جب پولیس والے اسے اپنے ساتھ لے کر جارہے تھے تو چند لمحات کے لیے اسے امین سے بات کرنے کا موقع مل گیا، گھبراہٹ کے انہی لمحات میں امین نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس کے سلسلے میں فوری طور پر مجھ سے آکر ملے۔ امین نے اسے میرے وزیٹنگ کارڈ کے بارے میں بھی بتایا تھا کہ وہ اس نے اپنے سامان میں کہاں رکھا ہوا ہے۔

اور اب یہی پریشان حال' خوبصورت فرزانہ میرے سامنے بیٹھی تھی!

☆☆☆

بہ وجوہ' اس روز میں امین سے ملاقات کے لیے متعلقہ تھانے نہ جاسکا۔ مغرب کے بعد پے در پے ایسی مصروفیات سامنے آئیں کہ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی سر کھجانے کی فرصت نہ مل سکی اور دفتر سے فارغ ہوتے ہی میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا پھر جب میں اپنے گھر سے چند گز کے فاصلے پر تھا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے دفتر سے اٹھنے کے بعد سیدھا تھانے جانا تھا اور امین سے ملاقات کرکے ضروری معلومات حاصل کرنا تھیں۔ بہرحال، اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا میں نے اس کام کو کل کے لیے رکھ چھوڑا اور گھر پہنچ گیا۔

آئندہ روز میں عدالتی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دفتر پہنچا تو انتظار گاہ میں فرزانہ کو بیٹھے دیکھ کر چونک اٹھا۔ میں نے کل اسے اپنے دفتر سے رخصت کرتے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کے شوہر سے ضرور ملاقات کروں گا۔ اسی وعدے کے تناظر میں اسے دیکھتے ہی مجھے ندامت کا احساس ہوا کیونکہ میں اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکا تھا۔ فوری تلافی کے لیے میں نے سب سے پہلے فرزانہ ہی کو اپنے چیمبر میں بلا لیا..... ویسے بھی اس وقت میرے دفتر کی انتظار گاہ میں زیادہ رش نہیں تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا ''بیگ صاحب! کل رات آپ امین سے ملنے تھانے نہیں پہنچے؟''

میں نے اس وعدہ خلافی پر شرمندگی کا اظہار کیا اور اسے یقین دلاتے ہوئے کہا ''آپ فکر نہ کریں۔ آج میں خاص وقت نکال کر اس سے ضرور ملاقات کروں گا۔''

پچھلی ملاقات میں، میں فرزانہ کے لیے ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا تھا تاکہ وہ زیادہ سہولت کے ساتھ اپنا مدعا

بیان کر سکے اور میرا یہ حربہ خاصا کامیاب رہا تھا اور اب میں نے اسے دوبارہ ''آپ'' سے مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔

اس نے اپنی بپتا سنانے کے بعد میرے درجن بھر سوالات کے بڑے تسلی بخش جوابات دیے تھے اور انہی بیانات کی روشنی میں، میں نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے فرزانہ سے دو چار نجی نوعیت کے سوالات بھی کیے تھے جن کا لبِ لباب یہ تھا کہ وہ کون سے مجبور لمحات تھے جن کے زور پر اس نے امین سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور..... یہ کہ اس کی ہزار ناالتفاتی اور نامعقولیت کے باوجود بھی وہ اس کے لیے اس قدر پریشان کیوں تھی؟

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس نے مجھے ٹال دیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے اس پہلو کو زیرِ بحث لانے کے لیے تیار نظر نہ آئی تو میں نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا اور یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ بعد میں کسی موقع پر، اس کا موڈ خوش گوار دیکھتے ہوئے میں اسے اس حوالے سے ٹٹولوں گا۔ میں نے ان دونوں کو بڑی وضاحت سے دیکھا اور بڑی توجہ سے سنا تھا۔ ان میں مجھے کوئی میل تال دکھائی نہ دیا۔ وہ بلاشبہ ایک بے جوڑ جوڑا تھا!

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر فرزانہ نے کہا ''بیگ صاحب! میں روز روز تھانے جا کر امین سے نہیں مل سکتی۔ مجھے پولیس والوں سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ وہ بڑی بری نظروں سے بہت دور تک گھورتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ آپ امین سے ملاقات کر کے صورتِ حال کا جائزہ لے لیں تو مجھے اطمینان ہو جائے گا۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''آپ کچھ زیادہ ہی گھبرائی ہوئی ہیں۔ اس طرح خوف زدہ ہونا آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔ اپنے اندر ہمت پیدا کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں پوری طرح آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں'' میں چند لمحات کے لیے متوقف ہوا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ باہر جا کر ویٹنگ روم میں بیٹھیں۔ میں اپنے دو تین کلائنٹس کو فارغ کر کے ابھی آپ کے ساتھ تھانے چلتا ہوں۔''

وہ میرے ان تشفی آمیز کلمات سے خاصی مطمئن نظر آنے لگی۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے چیمبر سے نکل گئی۔ میں نے اپنی سیکریٹری سے انٹرکام پر رابطہ کر کے دریافت کیا کہ آج کے لیے کتنے اپائنٹمنٹ ہیں۔ اس نے بتایا۔

''سر..... تین افراد تو ویٹنگ لابی میں بیٹھے ہیں۔''

وہ انہی کلائنٹس کا ذکر کر رہی تھی جنہیں میں انتظار گاہ میں بیٹھے دیکھ چکا تھا۔ میں نے کہا ''ان کے علاوہ باقاعدہ اپائنٹمنٹ کے بارے میں مجھے بتاؤ؟''

''سر..... چھ بجے سے پہلے کا باقاعدہ اپائنٹمنٹ کوئی نہیں۔'' سیکریٹری نے جواب دیا۔

میں نے کہا ''ٹھیک ہے انہیں باری باری میرے پاس بھیج دو۔''

چھ بجنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں نے لگ بھگ آدھے گھنٹے میں ان تین ملاقاتیوں کو نمٹا دیا۔ پھر فرزانہ کے ساتھ اپنے دفتر سے نکل آیا۔ سیکریٹری کو میں نے بتا دیا کہ واپسی میں مجھے کم و بیش ایک گھنٹا لگ جائے گا اور یہ کہ میں چھ بجے سے پہلے دفتر پہنچ جاؤں گا۔ اس دوران میں اگر کوئی مجھ سے ملنے آ جائے تو وہ بٹھا لے۔ سیکریٹری نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا تو میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

امین سے میں نے لگ بھگ آدھا گھنٹا ملاقات کی۔ میں نے اپنی کوشش کے ذریعے اس کے اندر سے جو تفصیلات اور مفید معلومات باہر نکالیں ان کی روشنی میں، میں نے اس کے کیس کی پیروی کا فیصلہ کر لیا۔ ان تمام تر باتوں کو یہاں دہرا کر، میں آپ کے قیمتی وقت اور سسپنس کے محدود صفحات کو ضائع کرنے کے حق میں قطعاً نہیں ہوں۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں یہ اہم نکات مناسب مواقع پر ایک ایک کر کے آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان پیش کر دیا۔

جج اس روز ذرا دیر سے عدالت پہنچا تھا۔ لہٰذا کارروائی بھی کچھ تاخیر ہی سے شروع ہوئی میں نے ملزم امین کی

> ''دیکھو بیٹا! اگر تم آج خاموشی سے اسکول چلے جاؤ گے اور دن بھر کوئی شرارت نہیں کرو گے تو میں تمہیں شام کو دو روپے کا بالکل نیا..... چمکتا سکہ دوں گی۔'' ماں نے کمسن بیٹے کو لالچ دیا۔
>
> ''نیا اور چمکتا ہوا سکہ آپ اپنے پاس ہی رکھ لیں..... مجھے دس روپے کا میلا سا نوٹ دے دیں۔'' بچے نے کہا۔

درخواستِ ضمانت جج کے سامنے پیش کردی۔ اس درخواست کے ساتھ ہی میرا وکالت نامہ بھی تھا۔ میں نے گزشتہ ملاقات میں، امین سے اس وکالت نامے پر دستخط لے لیے تھے۔ اس دستاویز کی رو سے میں اس کا وکیل تھا اور وہ میرا موکل تھا!

وکیل استغاثہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور جج سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''جناب عالی! یہ پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ تین سو دو کا کیس ہے۔ ملزم نہایت ہی خطرناک شخص ہے لہٰذا اس کی درخواست ضمانت کو منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔''

میں نے تڑ کی یہ کہا ''جناب عالی! وکیل استغاثہ میرے سادہ دل موکل کے ساتھ بڑی زیادتی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ ان سے پوچھا جائے، میرے موکل کو موصوف کس بنا پر ''انتہائی خطرناک شخص'' قرار دے رہے ہیں؟''

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے!'' جج کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا ''امین نامی اس شخص پر قتل کا الزام ہے۔ کیا قتل جیسا فعل خطرناکی کے اعتبار سے کسی بھی طور کم ہوسکتا ہے؟''

میں نے وکیل مخالف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''آپ کے سوال کا جواب تو میں بعد میں دوں گا پہلے آپ میری ایک حیرانی تو دور فرمائیں''؛ میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ''آپ نے اپنی بات کے آغاز میں ہاتھ کے ساتھ کنگن اور آرسی، لکھنے پڑھنے کے ساتھ فارسی کا ذکر کیا ہے مگر آپ کے ہاتھ میں نہ تو کنگن اور آرسی نظر آرہا ہے اور نہ ہی زبان پر فارسی سننے کو مل رہی ہے۔ یہ کیا معما ہے میرے فاضل دوست؟''

میں نے محض اسے تپانے کے لیے اس قسم کا استفسار کیا تھا حالانکہ میں جانتا تھا، اس کے کہنے کا مطلب کیا تھا۔ میرے استفسار کے مقصد کو حاضرینِ عدالت میں سے بہت سوں نے بہ عین سمجھ لیا چنانچہ مضحکہ خیز انداز میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

وکیل استغاثہ کو قدرے خفت اٹھانا پڑی۔ اس نے کھنکار کر لوگوں کو خاموش رہنے کی اشاراتی تلقین کی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے معاندانہ انداز میں بولا ''یہ معما نہیں، محاورہ ہے!''

''اوہ..... آئی سی.....!'' میں نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا ''تو آپ اس محاورے کے زور پر میرے موکل کو مجرم ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں''؛ میں سانس لینے کو رکا پھر خاصے کڑے لہجے میں وکیل استغاثہ سے پوچھا۔

''کیا آپ عدالتی کارروائی شروع ہونے سے پیش تر ہی، میرے موکل پر عائد کردہ الزامات کو ثابت کرچکے ہیں جو اتنے دھڑلے سے اسے مجرم گردان رہے ہیں..... اسے خطرناک قاتل قرار دے رہے ہیں؟''

وہ بوکھلا گیا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ اسی بوکھلاہٹ میں اس نے کہا ''یہ عدالت اسی لیے تو لگی ہے کہ ملزم کو مجرم ثابت کیا جائے.....!''

''دی پوائنٹ از ٹو بی نوٹیڈ!'' میں نے اپنا ردئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا ''وکیل استغاثہ واشگاف الفاظ میں عدالت کی ایک نئی تعریف سامنے لارہے ہیں۔ آج تک تو یہی سنا، پڑھا اور بتایا تھا کہ عدالت انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے لگائی جاتی ہیں جہاں جج ایک غیر جانب دار منصف کا کردار ادا کرتا ہے لیکن میرے فاضل دوست نے جس قسم کی موشگافی فرمائی ہے اس سے تو ظاہر ہوتا ہے، اگر کوئی ملزم عدالت میں پیش ہو تو اسے ہر صورت میں، اس پر عائد کردہ الزام کے تحت سزا ضرور سنائی جائے گی چاہے وہ بے گناہ بھی کیوں نہ ہو!'' میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! اگر واقعی ایسا ہونے لگا جیسا وکیل استغاثہ نے بیان کیا ہے تو کوئی بھی ملزم عدالت کا رخ کرنے کے بجائے ''مارنے مرنے'' کی حکمت عملی کو ترجیح دے گا۔ وہ کورٹ میں ہرگز ہرگز قدم نہیں رکھے گا کیونکہ وہاں سے تو سزا سنا کر اسے سیدھا جیل بھجوا دیا جائے گا۔ وہ حتی الامکان یہی کوشش کرے گا کہ قانون کے جو رکھوالے اسے عدالت تک پہنچانے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں وہ بہ بانگِ دہل ان سے ٹکرا جائے گا۔ یا تو انہیں کوئی نقصان پہنچا کر فرار ہونے کی کوشش کرے گا او یا پھر ان سے کوئی شدید نقصان اٹھالے گا..... میں ابھی.....''

وکیل استغاثہ کا صبر جواب دے گیا، وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا ''جناب عالی!'' اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''وکیل صفائی ایک مقامی ڈائجسٹ میں اپنے کیسز کی روداد کہانی کے انداز میں لکھتے ہیں اور کہانیاں لکھتے لکھتے یہ عدالت کو بھی کوئی ڈراما ہاؤس سمجھنے لگے ہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانا اور رائی کو پہاڑ میں بدلنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ میں نے تو محض، ملزم پر عائد سنگین اور خطرناک الزام کا حوالہ دیا تھا اور میرے فاضل دوست کسی الاسٹک کے مانند بات کو کھینچ کر کہاں سے کہاں تک لے گئے ہیں.....'' وہ لمحے بھر کو اپنا حوصلہ مجتمع کرنے کے لیے رکا پھر اصل بات کی

طرف آتے ہوئے بولا۔

''میں تو معزز عدالت کو صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ ملزم کو ضمانت پر رہا کرنا انصاف کے تقاضوں اور قانون کے منافی ہوگا، جائے وقوعہ سے ایسے شواہد ملے ہیں جو ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔ میں وہ تمام حقائق مناسب موقع پر عدالت کے سامنے لاؤں گا۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''جنابِ عالی! مجھے وکیل استغاثہ کی دو باتوں پر سخت اعتراض ہے'' وکیل استغاثہ نے میرے اس اظہار پر بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا، میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے پر اسرار انداز میں کہا ''نمبر ایک' میں اپنے کیسز کی روداد کو کہانی کے رنگ میں نہیں لکھتا۔ قلم میرا میدان نہیں اور یہ میرے بس کا کام نہیں۔ یہ کام کسی اور شخص کے ذمے ہے لہٰذا یہ کہنا کہ میں کہانیاں لکھتے لکھتے کوئی کہانی کا ربن گیا ہوں' بالکل غلط ہوگا۔ نمبر دو' میرے فاضل دوست نے رائی سے پہاڑ اور بات کا بتنگڑ کے حوالے سے ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے مبالغہ گو کہنے کی کوشش کی ہے جو کہ اخلاقی اصول کے منافی ہے اور جہاں تک ڈراما ہاؤس کا تعلق ہے تو بہت پہلے ولیم شیکسپیر کہہ گیا تھا..... یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور اس دنیا میں پایا جانے والا ہر شخص ایک کردار ہے جو ایک مخصوص اسکرپٹ کے مطابق اپنے حصے کا رول کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اسی روشنی میں، میں یہ کہوں گا کہ میرے موکل کے خلاف جو استغاثہ تیار کیا گیا ہے وہ ایک سوچی سمجھی سازش (اسکرپٹ) کا نتیجہ ہے اسی لیے ایک ملزم کو بڑھ چڑھ کر مجرم گردانے کی کوشش کی جارہی ہے حالانکہ جب تک کسی ملزم کا جرم ثابت نہ ہو جائے اسے مجرم نہیں کہا جا سکتا۔''

جج ہماری اس باہمی بحث و تکرار سے مکدر نظر آنے لگا۔ اس نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''آپ آپس میں الجھنے کے بجائے عدالت کی کارروائی کو آگے بڑھائیں تو اچھا ہے..... اور یہ کہ جب تک ملزم امین پر عائد الزام ثابت نہیں ہو جاتا اسے مجرم کہنے سے اجتناب برتا جائے۔''

وکیل استغاثہ نے کچھ بولنے کے بجائے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا ''جنابِ عالی.....! میرا موکل بے قصور ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کیا گیا ہے۔ اس کی گرفتاری سراسر بدنیتی پر مبنی ہے لہٰذا میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو منظور کیا جائے۔''

قتل عمد کے کیس میں ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی، اس حقیقت سے میں اچھی طرح واقف تھا تاہم میرا یہ سارا زور اس ذیل میں تھا کہ اگر میں اپنے موکل کی ضمانت نہ بھی کروا سکوں تو کم از کم استغاثہ پر دباؤ ضرور قائم ہو جائے۔

وکیل استغاثہ نے ضمانت کی مخالفت میں دلائل دیتے ہوئے کہا ''جنابِ عالی.....! استغاثہ کے پاس ایسے شواہد موجود ہیں جو ملزم کی جائے وقوعہ پر موجودگی اور محرکِ جرم کو ثابت کرتے ہیں لہٰذا ملزم کی ضمانت پر رہائی آئندہ عدالتی کارروائی میں روک پیدا کر سکتی ہے چنانچہ' میں معزز عدالت سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ عدالت کی باقاعدہ کارروائی کے لیے تاریخ دے کر ملزم کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے۔''

اس کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے موقف کے حق میں دلائل دیتے رہے۔ جج نے پوری توجہ سے ہماری وضاحتیں سنیں اور ملزم کی ضمانت کی درخواست کو منسوخ کرتے ہوئے آئندہ پیشی کے لیے دس روز بعد کی تاریخ دے دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عدالت کو برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جرنڈ!''

☆☆☆

دس روز کی یہ مدت پھیل کر دو ماہ تک دراز ہوگئی۔ اس دوران میں مختلف قسم کی عدالتی خانہ پریاں ہوتی رہیں۔ ان کارروائیوں کی تفصیل بیان کرنا آپ کو بور کرنے کے مترادف ہوگا اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں آپ کو براہِ راست عدالت کی باقاعدہ کارروائی کی طرف لے چلتا ہوں اور اس سے پہلے چند ضروری رپورٹس کا ذکر کرنا نہیں بھولوں گا۔

استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق، ملزم مقتول سے شدید نفرت کرتا تھا اور ایک دو مواقع پر وہ اسے قتل کی دھمکیاں بھی دے چکا تھا۔ اسے شک تھا کہ مقتول اس کی بیوی کے قریب ہونے کی کوشش کر رہا ہے، وہ وقوعہ سے چند روز قبل مقتول کے دفتر پہنچا اور اسے سنگین نتائج کی دھمکی دے کر چلا آیا۔ اس نے گھر میں اپنی بیوی سے جھگڑا کرتے ہوئے بھی اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر مقتول اور اس کی بیوی نے اپنی روش نہ بدلی تو پھر وہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے گا' وغیرہ وغیرہ۔ استغاثہ کے مطابق' وقوعہ کے روز ملزم کو جائے واردات سے افراتفری کے عالم میں فرار ہوتے ہوئے دیکھا گیا تھا بلکہ مقتول کی بیوی اس بات کی گواہ تھی کہ ملزم وقوعہ سے چند منٹ پہلے اس کے شوہر سے ملنے گھر پر آیا تھا۔ مقتول کی بیوی شائستہ بیگم کے بیان کے مطابق، وہ ملزم کو ڈرائنگ

روم میں مقتول کے پاس چھوڑ کر خود گھر کے ایک دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد جب وہ کسی ضروری کام سے ڈرائنگ روم کی طرف گئی تو اس نے وہاں ایک وحشت ناک منظر دیکھا۔ مقتول پرویز شاہ ڈرائنگ روم کے فرش پر اپنے ہی خون میں لت پت پڑا تھا اور ملزم کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ بے ساختہ باہر کی جانب دوڑی اور اس وقت اس نے ملزم کو بنگلے کے گیٹ سے نکل کر فرار ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ بے طرح لپک کر بنگلے سے باہر نکلی اور شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کرلیا۔ ازاں بعد اس واقعے کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دی گئی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول پرویز شاہ کی موت چھ اپریل کی سہ پہر تین اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ مقتول کو اعشاریہ تین دو کیلی بر کے ریوالور سے ہلاک کیا گیا تھا۔ مذکورہ ریوالور سے نکلنے والی دو مہلک گولیوں نے مقتول کے دل میں جگہ بنائی اور اسے ابدی نیند سلا دیا۔ اس رپورٹ میں ایک نکتے پر خاص زور دیا گیا تھا اور وہ یہ کہ مقتول کو براہ راست فائرنگ کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں یہ بھی درج تھا کہ انتہائی قریب سے اسے شوٹ کیا گیا تھا۔ آلہ قتل' جائے واردات سے برآمد کرلیا گیا تھا۔

براہ راست فائرنگ کا نشانہ نہ بنانے کی وضاحت پولیس چالان میں موجود تھی۔ جائے واردات پر سے وہ کشن بھی مل گیا تھا جسے مقتول کے سینے پر رکھ کر فائرنگ کی گئی تھی۔ یقیناً یہ طریقہ اپنانے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ فائرنگ کی آواز پیدا نہ ہو۔ گھائل کشن میں ایک بڑا سا سوراخ بن گیا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ ریوالور کے بیرل کو ایک ہی مقام پر رکھ کر دو مرتبہ ٹریگر کو دبایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی کئی باتیں تھیں جن میں سے ضروری اور اہم کا ذکر مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے میری ہدایت کے مطابق' صحتِ جرم سے انکار کردیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ جج نے میری درخواست کو منظور کرلیا۔ کسی بھی کیس کا انکوائری آفیسر ہر پیشی پر عدالت کے کمرے میں موجود ہوتا ہے۔ جج کے حکم پر مذکورہ انکوائری آفیسر گواہوں والے کٹہرے میں آکر کھڑا ہوگیا۔

انکوائری آفیسر ایک سب انسپکٹر تھا۔ استغاثہ کی جو رپورٹ عدالت میں پیش کی گئی تھی اس میں تفتیشی افسر کی کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا میں گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک آیا اور انکوائری آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''صادق علی!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا آپ کو اپنے نام کے معنی معلوم ہیں؟'' میں نے استفسار کیا۔

''صادق علی ایک اچھا نام ہے'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اس لیے اس کے معنی بھی اچھے ہی ہوں گے۔ ظاہر ہے' والدین سوچ سمجھ کر ہی اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں۔''

''صادق علی صاحب! آپ کی وضاحت میرے سوال کا جواب نہیں' بہر حال!'' میں نے لحاتی توقف کے بعد کہا ''صادق علی کے لفظی معنی ہیں..... شیرِ خدا سچے ہیں والدین اپنی اولاد کا نام منتخب کرتے وقت اپنے دل میں یہ خواہش ضرور رکھتے ہیں کہ ان کا بچہ یا بچی اسم بامسمّٰی ثابت ہو۔ کیا آپ بھی اپنے قول و فعل اور کارکردگی میں کھرے اور سچے واقع ہوئے ہیں؟''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ ناموں کی یہ بحث کیوں چھیڑ بیٹھے ہیں.....!'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا ''اس سوال و جواب کا زیرِ سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟''

وکیل استغاثہ کو جھنڈا اگاڑنے کا موقع مل گیا' جلدی سے بولا ''انکوائری آفیسر صاحب! یہ اپنے بیگ صاحب اس قسم کی غیر متعلق جرح کے لیے خاصے مشہور ہیں، ابھی تو آغاز ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا.....!''

جج نے گہری سنجیدگی سے مجھے مخاطب کیا اور کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ آگے..... او سے صرف وہ سوال کریں جس کا پرویز مرڈر کیس سے تعلق بنتا ہو!''

''او کے یور آنر!'' میں نے تعظیمی انداز میں گردن کو خم کیا اور آگے۔ اوکی جانب متوجہ ہوگیا۔

''آگے..... او (انکوائری آفیسر) صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب دی گئی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''تھانے کے روزنامچے کے مطابق، وقوعہ کے روز چار بجے سہ پہر اس قتل کی اطلاع دی گئی تھی'' اس نے جواب دیا۔

''اطلاع کس نے فراہم کی اور کس ذریعے سے......؟''

''مقتول کی بیوہ شائستہ بیگم نے فون کر کے ہمیں بتایا تھا کہ کسی نے اس کے شوہر کو قتل کر دیا ہے۔'' انکوائری آفیسر نے بتایا۔

''پولیس کتنے بجے جائے وقوعہ پر پہنچی تھی؟''

''لگ بھگ ساڑھے چار بجے۔''

''ملزم کو کتنے بجے اور کہاں سے گرفتار کیا گیا؟''

''شام ساڑھے چھ بجے اس کے گھر' واقع نیو کراچی سے ہم نے اسے گرفتار کیا تھا۔''

''آپ نے کس کی نشان دہی پر ملزم کو گرفتار کیا تھا؟''

''میں سمجھا نہیں' آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں!'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے مقتول پرویز شاہ کے قتل کے سلسلے میں میرے موکل ہی کو کیوں گرفتار کیا۔ کیا کسی شخص نے خاص طور پر اس جانب اشارہ کیا تھا یا آپ کوئی پُراسرار قسم کا علم جانتے ہیں؟''

تفتیشی افسر نے ایک گہری سانس خارج کی اور بتایا ''مقتول کے بنگلے پر اس وقت ایک دراز قامت شخص بھی موجود تھا۔ مقتول کی بیوہ شائستہ بیگم چونکہ ملزم کو شکل سے جانتی تھی۔ اس واقعے سے تھوڑی دیر پہلے وہ اس کے شوہر سے ملنے آیا تھا اور شائستہ اسے اپنے مقتول شوہر کے ساتھ ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر بنگلے کے ایک اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی تھی......''

وہ سانس لینے کی خاطر متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جوڑتے ہوئے بتانے لگا ''جب مقتول کی بیوہ نے ملزم کا حلیہ تفصیل سے بیان کیا تو دراز قامت شخص نے فوراً اسے شناخت کر لیا۔ اسی دراز قامت شخص کی نشان دہی پر ہم نے ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔''

''آپ کی وضاحت سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مذکورہ دراز قامت شخص ملزم کو اچھی طرح جانتا ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

''جی ہاں......' اس میں کیا شک ہے!'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ معزز عدالت کو اس شخص کا نام بتانا پسند فرمائیں گے!'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا ''آپ نے یقیناً اس شخص کا بیان بھی قلم بند کیا ہوگا؟''

''جی ہاں......'' تفتیشی افسر نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا ''میں نے نہ صرف اس شخص کا بیان لیا تھا بلکہ وہ استغاثہ کے اہم گواہوں میں بھی شامل ہے۔ اس دراز قامت شخص کا نام ہے فرید احمد!''

''اوہ......!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا ''کیا یہ صاحب وہ فرید احمد تو نہیں جو مقتول کے اسٹاف میں شامل ہے اور اس کی ڈیوٹی ادھر ناگن چورنگی والے دفتر میں ہوتی ہے؟''

''جی ہاں...... جی ہاں' وہ بڑی سرعت سے بولا ''میں اسی فرید احمد کی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دوبارہ تفتیشی افسر کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''آئی......او صاحب! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور آپ کے پیش کردہ چالان کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ مقتول کے سینے پر کشن رکھنے کے بعد فائرنگ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ ماشاءاللہ! آپ نے مذکورہ سوراخ دار کشن اور آلۂ قتل جائے واردات سے برآمد کر لیا تھا۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو یہ دونوں چیزیں کہاں پڑی ملی تھیں؟''

وہ ایک لمحے سوچنے کے بعد گویا ہوا ''صوفے کا کشن تو مقتول کی لاش کے پاس ہی پڑا ہوا ملا تھا۔ اس کا سوراخ بتاتا تھا کہ وہ سنگل فائر کا نتیجہ نہیں اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے مقتول کے جسم میں سے بتیس بور کی دو گولیاں برآمد ہوئی ہیں اور آلۂ قتل......!''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس میز کی جانب بڑھا جہاں اس واردات میں استعمال ہونے والا ریوالور سیلوفین بیگ میں محفوظ تھا۔ اس نے وہ بیگ اٹھایا اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا ''یہ ہے وہ آلۂ قتل جو ہمیں جائے وقوعہ پر پڑا ملا تھا۔ آپ نے پوچھا ہے، جائے وقوعہ پر کس جگہ...... تو اس سوال کا جواب ہے، پردوں کے عقب میں ڈرائنگ روم کی ایک دیوار کے ساتھ ترتیب سے صوفہ سیٹ رکھا ہوا ہے۔ صوفہ سیٹ کے پیچھے پردہ لٹکا ہوا ہے۔ اسی پردے کے پیچھے یہ ریوالور پڑا ملا تھا۔''

''اور آپ کے خیال' بلکہ تحقیق و تفتیش کی روشنی میں آلۂ قتل کو میرے موکل نے اس پردے کے پیچھے پھینکا تھا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''ظاہر ہے، اور کون پھینکے گا!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا ''جس نے قتل کی واردات کی ہے، یہ ریوالور بھی اسی

نے پردے کے پیچھے پھینکا ہے۔''

''کیا آپ نے میرے موکل کو قتل کی واردات کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ بھی کیسی عجیب بات کر رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا ''میں تو وقوعہ کے وقت اپنے تھانے میں موجود تھا۔''

''عجیب بات میں نے نہیں بلکہ آپ نے کی ہے'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''کوئی عینی شاہد ہی اتنے وثوق سے یہ بات کر سکتا ہے۔''

وہ سٹ پٹائے ہوئے انداز میں بولا ''میں وقوعہ کے وقت جائے واردات پر موجود تھا اور نہ ہی میں نے اسے یعنی ملزم کو اپنی آنکھوں سے آلۂ قتل کو پردے کے پیچھے پھینکتے ہوئے دیکھا ہے۔''

میں نے کڑے لہجے میں دریافت کیا ''اس کا مطلب ہے، آلۂ قتل کو پردے کے پیچھے ملزم کے علاوہ کوئی اور بھی پھینک سکتا ہے؟''

وہ چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد متذبذب انداز میں بولا ''ہاں' ایسا ہو تو سکتا ہے لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول کے جسم سے برآمد ہونے والی دونوں گولیاں......''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو ہم بعد میں ڈسکس کریں گے'' میں نے ہاتھ اٹھا کر بہ آوازِ بلند کہا اور قطع کلامی کرتے ہوئے استفسار کیا ''آئی...... او صاحب! کیا آپ نے گرفتاری کے بعد ملزم کے فنگر پرنٹس لیے تھے؟''

''نہیں' ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیوں ضرورت محسوس نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''دراصل، جب آلۂ قتل برآمد ہوا تو ہم نے اس پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات کھوجنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش کا نتیجہ صفر کے برابر نکلا۔ اس ریوالور پر کوئی فنگر پرنٹس نہیں ملے'' اس نے سیلوفین بیگ میں موجود آلۂ قتل کی جانب اشارہ کیا اور مزید بولا ''امکان اس بات کا ہے کہ ملزم نے ریوالور کو پردے کے پیچھے پھینکنے سے پہلے اس پر سے اپنے فنگر پرنٹس کو بالکل صاف کر دیا ہوگا۔''

بات ختم کر کے وہ خجل سے انداز میں جج کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا، اسے اپنے کہے کا خود بھی اعتبار نہیں ہے۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے مگر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آئی او صاحب! آپ نے اپنی تفتیش کے سلسلے میں فنگر پرنٹس کے حوالے سے جو نئے نئے کارنامے انجام دینا شروع کیے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ بہت جلد آپ دو پھول سے تین پھول والے ہو جائیں گے!''

وہ میرے طنز کو سمجھا کہ نہیں سمجھا، البتہ کھسیاہٹ آمیز نظر سے حاضرینِ عدالت کو دیکھنے لگا۔ میں نے سوال و جواب کے سلسلے کو موقوف کر دیا تو جج کی اجازت حاصل کر کے استغاثہ کا گواہ گل بادشاہ گواہی کے لیے کٹہرے میں آن کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے، عدالت سے یہ اس کا پہلا واسطہ ہے۔

گل بادشاہ اس پرائیویٹ کمپنی کا چوکیدار تھا جہاں میرا موکل ملازم تھا۔ گل بادشاہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے کٹہرے کے قریب چلا گیا۔

گل بادشاہ کی عمر چالیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ اس کے سر کے سامنے والے بال ندارد تھے۔ قد درمیانہ اور جسم مائل بہ فربہی۔ وکیل استغاثہ نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم امین کی طرف دیکھا پھر گل بادشاہ کی توجہ اس طرف مبذول کروانے کے بعد مستفسر ہوا۔

''کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟''

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں'' گل بادشاہ نے جواب دیا ''یہ ہمارے دفتر میں کام کرتا ہے۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ ملزم بڑا غصے والا اور جھگڑالو قسم کا آدمی ہے؟''

''جی ہاں...... یہ بات سولہ آنے درست ہے۔''

''اور گل بادشاہ! تمہیں تو یہ معلوم ہی ہوگا کہ غصہ کتنی خطرناک چیز ہے!'' وکیل استغاثہ نے بڑے ڈرامائی انداز میں دریافت کیا۔

''جی وکیل صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہو، غصہ واقعی بہت خطرناک شے ہے۔'' گل بادشاہ نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہمارے چچا کا لڑکا بہت غصے والا تھا۔ وہ ذرا سی بات پر غصے سے لال پیلا ہو جاتا۔ اکثر اس کا لوگوں سے جھگڑا ہوتا رہتا۔ آج کل وہ جیل میں ہے۔ اس نے غصے میں تین بندوں کو قتل کر دیا تھا۔''

بات ختم کرتے ہی گل بادشاہ نے سراسیمہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ وکیل استغاثہ نے اگلا سوال کیا۔

''گل بادشاہ! کیا یہ درست ہے کہ ملزم کا اکثر و بیشتر دفتر والوں سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا؟''

''جی ہاں' یہ بات بالکل صحیح ہے۔'' گل بادشاہ نے جواب دیا۔

''سننے میں آیا ہے' وقوعہ سے چند روز قبل، ملزم نے تم سے ریوالور مانگا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے اس سوال کے اختتام پر فاتحانہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

گل بادشاہ نے اس سوال کا اثبات میں جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے جرح ختم کر دی۔

اپنی باری پر میں جج کی اجازت سے وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور استغاثہ کے گواہ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''گل بادشاہ! تم گل ہو یا بادشاہ؟''

''وکیل صاحب! ہم گل ہے اور نہ بادشاہ'' وہ نہ سمجھنے والے انداز میں بولا ''ہم صرف گل بادشاہ ہے''

''گل بادشاہ! تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم بڑا غصے والا اور جھگڑالو قسم کا آدمی ہے'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا ''کیا کبھی تم سے اس کا جھگڑا ہوا تھا؟''

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا ''نہیں، ہم سے کبھی منہ ماری نہیں ہوا۔''

''تم نے وکیل استغاثہ کے ایک اور سوال کے جواب میں اس بات کی تائید کی ہے کہ ملزم کا اکثر و بیش تر دفتر والوں سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا.....!'' میں نے اس کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے پوچھا ''کیا تم دفتر میں نہیں ہوتے؟''

''ہم دفتر میں نہیں ہوگا تو پھر کدھر جائے گا'' وہ اظہاری لہجے میں بولا ''وکیل صاحب! ہم ادھر ڈیوٹی کرتا ہے۔ ہماری ایک ایک بات پر نظر ہے۔ ہم اس دفتر کا چوکی دار ہے۔''

''پھر ملزم کا کبھی تم سے جھگڑا کیوں نہیں ہوا؟''

''بس، نہیں ہوا تو نہیں ہوا۔''

''اس کا مطلب ہے' تمہاری حد تک وہ جھگڑالو نہیں ہے؟''

''آں..... ہاں'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ میرے اس سوال کا کیا جواب دے۔

میں نے اسے الجھن میں گرفتار رہنے دیا اور اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے اگلا سوال کیا ''گل بادشاہ! تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم کا اکثر و بیش تر دفتر والوں سے جھگڑا ہوتا رہتا تھا.....!'' میں نے اس کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے پوچھا ''کیا تم دفتر میں نہیں ہوتے؟''

''ہم دفتر میں نہیں ہوگا تو پھر کدھر جائے گا'' وہ اظہاری لہجے میں بولا ''وکیل صاحب! ہم ادھر ڈیوٹی کرتا ہے۔ ہماری ایک ایک بات پر نظر ہے۔ ہم اس دفتر کا چوکی دار ہے۔''

''پھر ملزم کا کبھی تم سے جھگڑا کیوں نہیں ہوا؟''

''بس، نہیں ہوا تو نہیں ہوا۔''

''اس کا مطلب ہے' تمہاری حد تک وہ جھگڑالو نہیں ہے؟''

''آں..... ہاں'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ میرے اس سوال کا کیا جواب دے۔

میں نے اسے الجھن میں گرفتار رہنے دیا اور اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے اگلا سوال کیا ''گل بادشاہ! تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ سے چند روز قبل ملزم نے تم سے ریوالور مانگا تھا۔ ذرا وضاحت کرو، کون سا ریوالور؟''

''ریوالور تو ریوالور ہی ہوتا ہے وکیل صاحب!'' گل بادشاہ نے متذبذب انداز میں جواب دیا ''اس میں کون سا والی کون سی بات ہے.....؟''

''تم شاید میرے سوال کو سمجھ نہیں سکے!'' میں نے وضاحتی لہجے میں کہا ''اس میں کون سا والی کون سی بات یہ ہے کہ ملزم نے تم سے تمہارا ریوالور مانگا تھا یا کوئی اور.....؟''

''یہ تو اس نے بتایا ہی نہیں'' وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا ؟

میں نے کہا ''اور یقیناً اس نے تمہیں یہ بھی نہیں بتایا ہوگا کہ اسے کس مقصد کے لیے ریوالور چاہیے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے بڑی سرعت سے نفی میں گردن ہلائی اور بولا ''ہاں واقعی، اس نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا۔''

''کیا تم نے اسے ریوالور مہیا کر دیا تھا؟''

''نہیں.....!'' وہ قطعی لہجے میں بولا ''ہم ایسی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا دماغ بہت گرم ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہتھیار دینا ٹھیک نہیں تھا۔ ہم نے صاف منع کر دیا۔ پتا نہیں، اس نے کہاں سے ایک ریوالور حاصل کیا اور کسی شاہ جی کو قتل کر ڈالا۔''

''کیا یہ بات تمہیں وکیل استغاثہ نے بتائی ہے یا تم نے خود اپنی آنکھوں سے یہ قتل ہوتے دیکھا تھا۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''ہم خدا سے بہت ڈرتا ہے وکیل صاحب!'' وہ کانوں کو (اپنے) ہاتھ لگاتے ہوئے بولا ''مرنے کے بعد ہم کو اپنی قبر میں جانا ہے اس لیے ہم جھوٹ نہیں بولے گا'' اس نے ایک مرتبہ پھر توبہ کے انداز میں اپنے کانوں کو چھوا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا ''ہم نے ملزم کو واردات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ بات ہم کو وکیل صاحب نے بتائی ہے۔''

''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور جرح کے سلسلے میں موقوف کر دیا۔

جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے دو گواہ پیش کیے

گئے۔ ان میں سے ایک تو میرے موکل کا پڑوسی امداد حسین تھا۔ وقوعہ سے ایک آدھ روز قبل ملزم اور اس کی بیوی کے درمیان خاصا زور دار جھگڑا ہوا تھا اور ان کی تیز و ترش آوازیں آس پڑوس میں بڑی واضح سنی گئی تھیں۔ ملزم نے شدید غصے کے عالم میں اپنی بیوی سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر مقتول نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔ طیش کی حالت میں ملزم کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ امداد حسین کی صورت آج ایک گواہی بن کر عدالت تک پہنچ گئے تھے۔ استغاثہ کی جانب سے امداد حسین اس بات کی تصدیق کرنے عدالت پہنچا تھا کہ اس کا پڑوسی خاصا غصہ ور اور جھگڑالو قسم کا شخص تھا اور اس نے مقتول کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔

دوسرا گواہ انہی لفنگوں میں سے ایک تھا جو ملزم اور اس کی بیوی پر آوازے کسا کرتے تھے۔ اس شخص کو ملزم کے خلاف زہر اگلنے کا ایک نادر موقع مل گیا تھا سو اس نے اپنا جی ٹھنڈا کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر ارمان نکالے۔ اس نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں زور دے کر کہا ملزم اپنی بیوی کے حوالے سے ایک خاص قسم کے مرضِ نفسیات میں مبتلا تھا۔ اگر کوئی شخص اس کی خوبصورت بیوی کو نظر بھر کر بھی دیکھ لیتا تو وہ طیش میں آجاتا اور فوراً مرنے مارنے پر تیار ہوجاتا۔ قیصر نامی اس لفنگے استغاثہ کے گواہ نے یہاں تک کہہ دیا کہ ملزم نے کئی مرتبہ اسے بھی قتل کی دھمکی دی تھی حالانکہ اس نے تو ایک آدھ بار محض اس کی بیوی کو غور سے دیکھا تھا جب کہ ملزم کی بیوی نہ صرف یہ کہ مقتول کے دفتر میں ملازمت کرتی تھی بلکہ وہ اکثر و بیشتر اسے اپنی گاڑی میں گھر چھوڑنے بھی آتا تھا وغیرہ وغیرہ!

امداد حسین اور قیصر محمود کے بیانات کا خلاصہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کردیا ہے۔ انہوں نے عدالت میں میرے موکل کے خلاف کوئی ایسا پہاڑ نہیں پچھاڑا جس کی تفصیل کو بیان کرنا ناگزیر ہو' لہٰذا میں آپ کو آگے لیے چلتا ہوں۔

استغاثہ کی گواہوں سے پہلے ملزم کا طویل بیان ریکارڈ کیا گیا تھا۔ شاید میں اس کا ذکر کرنا بھول گیا ہوں۔ فردِ جرم سے انکار کے بعد اس نے معزز عدالت کے روبہ رو حلفیہ بیان ریکارڈ کراتے ہوئے بتایا تھا کہ وقوعہ سے ایک آدھ رات پہلے اس نے غصے کی کیفیت میں اپنی بیوی سے جو کچھ کہا وہ ایک وقتی اشتعال اور جذباتی ابال تھا۔ دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کہیں ملازمت کرے..... وہ بیوی کے حوالے سے فوراً جیلس ہوجاتا تھا، جب اس کی بیوی نے ملازمت چھوڑنے کے سلسلے میں اس کی کوئی بات نہیں مانی تو وہ اتمامِ حجت کے لیے اس کے غیاب میں اس کے دفتر پہنچ گیا اور مقتول کو خاصی کھری کھری سنا ڈالیں۔ اس وقت تک ملزم کی بیوی دفتر نہیں پہنچی تھی۔ وہ اس غصیلی کارروائی سے صرف ایک مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا اور وہ یہ کہ اس کے طرزِ عمل کے ردِعمل میں مقتول فوراً سے پیش تر اس کی بیوی کو ملازمت سے نکال دے لیکن بہرحال' ایسا ہو نہ سکا!

میرے موکل نے اپنا موقف عدالت پر واضح کرنے کے بعد بتایا کہ وقوعہ کے روز جب اسے لنچ سے فارغ ہوئے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ اس کے لیے کسی اجنبی کا فون آگیا۔ اس وقت دوپہر کے ڈھائی بجے تھے۔ اس نے فون سنا۔ دوسری طرف سے بولنے والے نے اسے بتایا کہ وہ اس کا ایک نادیدہ ہمدرد اور خیر خواہ ہے اور اس کی بیوی کے سلسلے میں اسے ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہے۔ بیوی اس کا انتہائی حساس مسئلہ تھا چنانچہ اس کا ذکر سنتے ہی ملزم کے کان کھڑے ہوگئے پھر اس کے اضطراری اصرار پر فون کرنے والے اجنبی مخلص نے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مقتول اس کی بیوی کو ساتھ لے کر اپنے بنگلے کی طرف گیا ہے۔ اطلاع کنندہ کو شک ہے کہ مقتول کی نیت ٹھیک نہیں، مقتول اور اس کی بیوی کے درمیان پچھلے کچھ عرصے سے جو کھچڑی پک رہی ہے، شاید اس کے دسترخوان تک پہنچنے کا وقت آگیا ہے۔ اگر وہ اپنی بیوی کو تباہی سے بچانا چاہتا ہے تو فوراً مقتول کے بنگلے پر پہنچ جائے۔

کسی بھی شوہر کے لیے اس بیوی کے حوالے سے اس نوعیت کی اطلاع بوکھلا دینے والی ہوتی ہے۔ میرا موکل بھی چکرا کر رہ گیا۔ اس نے اطلاع فراہم کرنے والے شخص سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس کا مقتول کے یا اس کی بیوی کے معاملات سے کیا تعلق ہے؟ دوسری طرف سے بولنے والے نے اس کے سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا اور یہ کہتے ہوئے فون بند کردیا کہ اس نے اپنا فرض پورا کردیا۔ اب ملزم کی صوابدید پر ہے کہ وہ اپنی بیوی کی عزت کی حفاظت کرتا ہے یا کسی بے غیرت شوہر کے مانند آنکھیں بند کیے ایک طرف پڑا رہتا ہے!

اس اطلاع نے میرے موکل کو ہلا کر رکھ دیا تاہم اس افراتفری کے لمحات میں اس نے اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھا اور عقل مندی کا ایک کام کر ڈالا۔ اس زمانے میں کالر آئی ڈی کی سہولت ابھی متعارف نہیں ہوئی تھی کہ پتا چلایا جاسکتا، اسے بیوی کے حوالے سے اطلاع فراہم کرنے والا

کس نمبر سے بات کررہا تھا۔ فوری طور پر میرے موکل کی سمجھ میں یہی آیا کہ وہ اپنی بیوی کے دفتر فون کرے تاکہ صحیح صورت حال کا علم ہوسکے۔ اس نے اس فیصلے پر پہنچتے ہی ''برائٹ فیوچر اسٹیٹ'' کے دفتر فون کیا اور کوشش کی کہ وہ آواز بدل کر بات کرے۔ وہ ایک آدھ روز پہلے اسی دفتر میں پہنچ کر اپنی بیوی کے حوالے سے اچھی خاصی ہنگامہ آرائی کر آیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا نام یا حوالہ سنتے ہی دوسری طرف سے فون بند کردیا جائے یا پھر اسے کھری کھری سننا پڑیں۔

کئی گھنٹیوں کے بعد اس کی کال ریسیو کرلی گئی۔ دوسری طرف جو کوئی بھی تھا وہ بہرحال، پرویز شاہ ہرگز نہیں تھا۔ ملزم نے اپنے لہجے میں مصنوعی پن لاتے ہوئے پوچھا۔

''شاہ جی کہاں ہیں۔ مجھے ان سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔''

''شاہ جی تو اس وقت اپنے دفتر میں نہیں ہیں۔'' اسے جواب دیا گیا۔ ''آپ کو ان سے کیا کام ہے؟''

''کام تو میں بعد میں بتاؤں گا'' ملزم نے آواز کی تبدیلی والی اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا ''پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں؟''

ملزم کو امید تھی کہ دوسری جانب بولنے والا پرویز شاہ کا ساتھی فرید احمد ہوگا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اسے بتایا گیا ''میں شاہ جی کا خاص بندہ فرید بات کررہا ہوں۔ آپ اسٹیٹ سے متعلق کوئی بھی معاملہ مجھ سے ڈسکس کرسکتے ہیں۔''

''بات تو مجھے شاہ جی ہی سے کرنا تھی'' ملزم نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا ''وہ کہاں گئے ہیں اور کتنی دیر میں واپس آجائیں گے؟''

''وہ ایک نئی سائٹ کے معائنے کے لیے اورنگی کی طرف گئے ہیں'' فرید احمد نے بتایا ''اور ان کی واپسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

''ان کی سیکریٹری تو دفتر میں موجود ہوگی۔ آپ اس سے میری بات کروادیں۔'' ملزم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا ''وہ خاتون میرے مسئلے کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔''

''اتفاق سے فرزانہ بھی اس وقت دفتر میں موجود نہیں۔'' فرید نے بتایا۔

''کیا وہ بھی شاہ جی کے ساتھ گئی ہے؟'' ملزم نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں.....'' فرید نے قطعی لہجے میں جواب دیا ''دراصل فرزانہ کے سر میں شدید درد ہورہا تھا اس لیے شاہ جی جب دفتر سے نکلنے لگے تو انہوں نے اس سے کہا کہ وہ اگر چاہے تو شاہ جی اسے گھر پر ڈراپ کردیں گے لہٰذا وہ آج دفتر سے جلدی چھٹی کرکے چلی گئی ہے۔ شاہ جی اسے گھر چھوڑ کر اورنگی کی طرف نکل جائیں گے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا ''آپ نے ابھی تک اپنے کام کے بارے میں بتایا ہے اور نہ ہی اپنا تعارف کرایا ہے؟''

جواب میں ملزم نے فون بند کردیا۔ فرید احمد کے سوالات کا اس سے اچھا اور کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ریسیور تو کریڈل کردیا لیکن اس کا ذہن تیز آندھیوں کی زد میں آچکا تھا۔ فرید احمد سے ہونے والی گفتگو نے اسے یقین دلا دیا کہ پرویز شاہ فرزانہ کے ساتھ ہی گیا ہے..... تو گویا تھوڑی دیر پہلے کسی مخلص نادیدہ اجنبی نے فرزانہ کے حوالے سے اسے جو اطلاع فراہم کی تھی وہ سچ تھا؟

اس سنسنی خیز اور دماغ کی چولیں ہلا دینے والے سوال نے اسے سلگا کر رکھ دیا۔ اس کے جی میں آئی کہ اس کے پنکھ نکل آئیں اور وہ آن واحد میں پرواز کرتے ہوئے حیدری پہنچ جائے۔ فرزانہ کی زبانی اسے معلوم ہوچکا تھا کہ پرویز شاہ حیدری کے کس بنگلے میں رہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کی بہت ہی کم خواہشیں پوری ہوتی ہیں۔ ملزم کے پنکھ نکل سکتے تھے اور نہ ہی وہ پرواز کے قابل ہوسکتا تھا مگر جائے واردات پر پہنچنا بھی ضروری تھا لہٰذا وہ اپنی بساط اور اوقات کو مدِنظر رکھتے ہوئے جلد از جلد منزل تک پہنچانے والی سواری پکڑ کر پرویز شاہ کے بنگلے واقع حیدری پہنچ گیا۔

اس وقت سہ پہر کے چار بجے تھے۔ ملزم کو یقین تھا کہ اگر اطلاع فراہم کرنے والے نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تو اس بنگلے میں اس وقت پرویز شاہ اور اس کی بیوی کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ بنگلے کا گیٹ بند تھا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

ان لمحات میں اس کا دماغ کسی دہکتے ہوئے تنور کا نقشہ پیش کررہا تھا۔ ان سنگین ساعتوں میں اس نے ایک خطرناک فیصلہ کیا کہ اگر آج اس کی بیوی اس بنگلے سے برآمد ہوجاتی ہے تو وہ اس کا جو حشر کرے گا وہ دیکھنے والوں کے لیے تو عبرت کا باعث ہوگا ہی، اس کے ساتھ ہی خود فرزانہ کے لیے بھی کسی کڑی سزا سے کم نہیں ہوگا۔ انہی منتقمانہ سوچوں کے درمیان وہ پرویز شاہ کو بھی کوئی یادگار سبق سکھانے کی پلاننگ کررہا تھا لیکن جب ایک ادھیڑ عمر مگر خوب صورت عورت نے

گیٹ کھول کر اس کی آمد کی وجہ دریافت کی تو وہ بھونچکا رہ گیا۔

وہ خوب صورت عورت اس کی بیوی فرزانہ نہیں بلکہ مقتول پرویز کی بیوہ شائستہ بیگم تھی وہ عورت ملزم کے لیے اجنبی تھی۔ وہ بوکھلا گیا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا ''میں پرویز شاہ سے ملنے آیا ہوں.....''

شائستہ بیگم نہایت ہی شائستگی سے اسے بنگلے کے اندر لے گئی۔

☆☆☆

شائستہ بیگم نے موسم کی مناسبت سے پرنٹیڈ لان کا ایک نفیس سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اس کی عمر کا تخمینہ پینتالیس کے قریب بنتا تھا لیکن اس نے خود کو بڑے سلیقے سے سنبھال رکھا تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا بیان ریکارڈ کروادیا۔ اس کے بیان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ کم وبیش وہی باتیں تھیں جو وہ وقوعہ کے روز پولیس کو بتا چکی تھی۔

وکیل استغاثہ نے رسمی سی جرح کے بعد اسے فارغ کردیا تو میں جج کی اجازت سے گواہوں والے کٹہرے میں کھڑی شائستہ بیگم کے پاس آگیا میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''شائستہ بیگم! آپ مقتول کو کب سے جانتی ہیں؟''

میرا یہ سوال اس کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ اس نے ناپسندیدہ نظر سے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا ''میں آپ کے سوال کو سمجھ نہیں سکی بہرحال، میں پرویز شاہ کو اس وقت سے جانتی ہوں جب ہماری شادی ہوئی تھی..... یعنی کم وبیش سترہ سال سے۔''

''آپ اپنے ذہن کو نہ الجھائیں مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا ''آپ کے کتنے بچے ہیں.....؟''

''ہمارے بچے نہیں ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ دونوں میاں بیوی کے علاوہ بنگلے میں اور کون رہتا تھا؟''

''کوئی نہیں، صرف ہم دونوں ہی وہاں رہتے تھے۔'' اس نے دکھی لہجے میں بتایا۔

میں نے پوچھا ''کیا وقوعہ کے روز بھی آپ دونوں کے سوا اس بنگلے میں اور کوئی موجود نہیں تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا ''میرا اشارہ اس مخصوص دورانیے کی طرف ہے جب وہ اندوہ ناک واقعہ پیش آیا..... یعنی سہ پہر تین بجے سے پانچ بجے تک کے درمیان؟''

اس نے ایک لمحہ میرے سوال پر غور کیا اور بولی ''نہیں، ہمارے سوا اس وقت بنگلے میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔''

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا ''آپ کے مقتول شوہر عموماً کتنے بجے گھر سے نکل جاتے تھے؟''

''دس، سوا دس بجے تک۔''

''اور ان کی واپسی کب تک ہوتی تھی؟''

''واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔'' اس نے تامل کرتے ہوئے جواب دیا ''کبھی تو سات آٹھ بجے آجاتے تھے اور کبھی دس گیارہ بھی بج جاتے۔ ان کی واپسی کا انحصار کاروباری مصروفیات پر ہوتا تھا۔''

''سات آٹھ بجے.....!'' میں نے گویا اس کے آخری جملے کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا ''اس کا مطلب ہے، وہ عام طور پر شام سے پہلے گھر نہیں آتا تھا؟''

''جی ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' شائستہ بیگم نے گول مول جواب دیا۔

میں نے پوچھا ''وقوعہ کے روز مقتول بھری سہ پہر میں اپنے بنگلے میں موجود تھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''ہاں.....!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی ''دراصل، اس رات کو ہمیں ایک شادی کی تقریب میں جانا تھا۔ وہ گھر کے قریب سے گزر رہے تھے کہ آگئے۔ میں نے ان کے ساتھ کچھ ضروری شاپنگ کے لیے جانا تھا اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ دن میں جب بھی موقع ملا وہ تھوڑی دیر کے لیے گھر کا چکر لگالیں گے لیکن.....'' اس کی آواز بھرا گئی ''کیسی شاپنگ اور کیسی شادی کی تقریب..... سب کچھ ختم ہوگیا..... سب کچھ'' پھر وہ ملزم کی سمت انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے جذبات انگیز لہجے میں بولی۔ ''اس مردود نے ہماری خوشیاں لوٹ لیں۔''

ان لمحات میں وہ خاصی دل گرفتہ ہورہی تھی۔ میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا کہ اس کی یہ دل گرفتگی حقیقی تھی یا مصنوعی!

وہ تھوڑی سنبھلی تو میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا ''کیا آپ ملزم کو جانتی تھیں؟''

''نہیں.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی ''وقوعہ کے روز میں نے اسے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ میرے شوہر سے ملنے آیا ہے اور میں نے اسے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا، یہ بدبخت میرا سہاگ اجاڑ کر چلا جائے گا۔''

''جب آپ نے ملزم کو ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا تو اس کے بعد آپ بنگلے کے کسی اندرونی کمرے میں چلی گئی تھیں۔''

میں نے کہا'' ڈرائنگ روم میں دو فائر ہوئے اور آپ کو اس فائرنگ کے بارے میں کوئی خبر نہ ہوئی۔ پھر جب آپ کو کوئی ضروری کام یاد آیا تو.....''

''ایک منٹ.....!'' اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا'' یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ملزم نے وہ دونوں فائر کشن پر کیے جو مقتول کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کارروائی سے اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ فائرنگ کی آواز ڈرائنگ روم سے باہر نہ نکلے اور پھر میں تو بنگلے کے ایک اندرونی کمرے میں موجود تھی۔ علاوہ ازیں، میں نے ٹی وی آن کر رکھا تھا اس لیے بھی فائرنگ کی موہوم آواز بھی مجھ تک رسائی حاصل نہ کر سکی۔''

''ڈیٹس رائٹ'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا'' آپ کی وضاحت سمجھ میں آتی ہے۔'' پھر پوچھا'' آپ کو اچانک ایسا کون سا کام یاد آ گیا تھا جو آپ ڈرائنگ روم میں پہنچ گئیں؟''

''مجھے شاپنگ ہی کے سلسلے میں پرویز شاہ سے بات کرنا تھی۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

میں نے پوچھا'' جس وقت یہ واقعہ پیش آیا' آپ میاں بیوی کے علاوہ بنگلے میں اور کون کون موجود تھا؟''

''یہ نامراد موجود تھا!'' اس نے نفرت انگیز انداز میں ملزم امین کی جانب انگلی اٹھا دی۔

''جب آپ کسی ضروری کام سے ڈرائنگ روم میں پہنچیں تو آپ کے بیان کے مطابق، ملزم بنگلے سے نکلنے کی کوشش میں تھا۔ جب تک آپ ڈرائنگ روم سے نکل کر بیرونی دروازے تک پہنچتیں، ملزم بنگلے کا گیٹ کھول کر وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔ اس کے بعد آپ نے کیا کیا؟''

''میں نے آس پاس کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے کے لیے واویلا مچایا اور لوگ میرے بنگلے کے سامنے جمع ہو گئے۔ اس کے بعد ہی پولیس کو اطلاع دے دی گئی۔''

''جو لوگ آپ کی چیخ پکار پر جمع ہوئے ان میں سے کسی نے ملزم کو پکڑنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟'' میں نے ایک پیچیدہ سوال کیا۔

''آپ کی اطلاع پر پولیس آپ کے بنگلے تک پہنچ گئی؟'' میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا'' انہوں نے لاش کا معائنہ کیا' آلۂ قتل کو برآمد کیا اور ضروری کارروائی کے بعد ملزم کی گرفتاری کے لیے نیو کراچی کی جانب روانہ ہو گئے۔''

میں لمحے بھر کو سانس لینے کی غرض سے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا'' انکوائری افسر کے مطابق' ملزم کی نشان دہی کے لیے فرید احمد نامی ایک شخص نے بڑی سرگرمی دکھائی تھی۔ آپ کے بیان کردہ ملزم کے حلیے کو فرید نامی اس شخص نے فوراً شناخت کر لیا اور پولیس کو بتایا کہ وہ نیو کراچی کے کس ایریا میں رہائش پذیر ہے، گویا ملزم کی گرفتاری میں فرید احمد کا غالب ہاتھ ہے۔ آپ سے میرا صرف اتنا سا سوال ہے.....''

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا'' کیا فرید نامی یہ شخص جائے واردات پر پہلے سے موجود تھا؟''

''آں ہاں.....نن نہیں.....'' وہ گڑبڑا گئی پھر جلد ہی سنبھلتے ہوئے بولی'' فرید پولیس کی آمد کے تھوڑی دیر بعد بنگلے پر پہنچا تھا اور.....اور میں نے خود اسے بلایا تھا.....ورنہ اس وقت فرید کا بنگلے پر کیا کام؟''

اس کے گھبراہٹ اور زبان کی لکنت نے مجھ پر واضح کر دیا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے اور اس دروغ گوئی کو نبھانے کے لیے مزید جھوٹ کا سہارا لے رہی ہے۔ میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''آپ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے' فرید نامی یہ شخص آپ کی فیملی کے بہت قریب ہے اسی لیے مصیبت کے وقت آپ نے اسے آواز دی کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں.....آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا'' فرید احمد میرے شوہر کے آفس میں کام کرتا ہے اور خاصا ذمے دار شخص ہے۔ وہ ہمارے لیے ایک فیملی ممبر کے مانند ہے۔ میں نے اس اندوہ ناک صورتِ حال میں فرید کو فون کیا اور وہ دفتر بند کر کے فوراً میرے پاس چلا آیا۔''

میں نے پوچھا'' آپ نے پہلے پولیس کو بلانے کے لیے فون کیا تھا یا فرید کو؟''

''میں نے پہلے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی؟'' اس نے جواب دیا۔

میں نے سوالات کی ترتیب میں گڑبڑ کر کے اس کی زبان سے سچ اگلوانے کی کوشش کی'' فرید احمد نامی آپ کا یہ خیر خواہ کتنے بجے تک بنگلے پر پہنچ گیا تھا؟''

''میرا خیال ہے' اس وقت سہ پہر کے پونے پانچ بجے تھے۔''

''آپ نے پولیس کو کتنے بجے فون کر کے اس اندوہ ناک واقعے کی اطلاع دی تھی؟''

''میں نے گھڑی میں ٹائم تو نہیں دیکھا' وہ تامل کرتے

ہوئے بولی ''لیکن میرا خیال ہے' اس وقت سہ پہر کے چار بجے ہوں گے۔''

''آپ کا اندازہ قطعی درست ہے'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''پولیس نے روزنامچے میں اس اطلاع کا وقت چار بجے ہی درج ہے۔''

وہ الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس سے اس قسم کے سوالات کیوں پوچھ رہا ہوں اور اس سے پہلے کہ وہ سمجھنے کی کوشش کرتی، میں نے ایک اور تیکھا سوال کردیا۔

''شائستہ بیگم! کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے، پولیس کتنے بجے تک آپ کے بنگلے پر پہنچ گئی تھی؟''

وہ حتمی لہجے میں بولی ''ساڑھے چار بجے''

انکوائری آفیسر نے بھی میری جرح کے جواب میں جائے وقوعہ پر اپنی آمد کا یہی وقت بتایا تھا میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے درخواست کی ''یور آنر! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے آئی۔ او صاحب سے ایک بات کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔''

انکوائری آفیسر کا ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہنا لازمی ہوتا ہے۔ جج نے مجھے اجازت دے دی۔ آئی..... او سب انسپکٹر صادق علی وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔ چند لمحات کے لیے شائستہ بیگم کو کٹہرے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ میں نے آئی..... او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت ہی ٹھوس انداز میں سوال کیا۔

''سب انسپکٹر صاحب! چند روز قبل آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ آپ نے ایک دراز قامت شخص فرید احمد کی نشان دہی پر ملزم کو اس کے گھر واقع نیو کراچی سے گرفتار کیا تھا۔ مزید' آپ کا ہی یہ بیان بھی تھا کہ مذکورہ دراز قامت شخص اس وقت بنگلے پر موجود تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں وکیل صاحب' آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''جب موقع کی کارروائی کر رہا تھا تو وہ دراز قامت شخص وہاں موجود تھا۔ وہ مقتول کی بیوہ کے لیے خاصا پریشان نظر آتا تھا۔''

''آپ نے یہ بھی تصدیق کی تھی کہ جائے واردات پر آپ کی آمد کا وقت سہ پہر ساڑھے چار بجے تھا؟'' میں نے تیکھے انداز میں سوال کیا۔ ''آپ کے اس بیان کی تصدیق استغاثہ کے گواہ شائستہ بیگم کے بیان سے بھی ہوتی ہے بہر حال۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ سے اس وقت میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں آئی او صاحب کہ آپ نے ملزم کو اپنے ہاتھوں سے گرفتار کیا ہے اور مقتول کی لاش کو الٹ پلٹ کر بھی آپ ہی نے معاینے کی نگاہ سے گزارا ہے لہٰذا ملزم اور مقتول کی جسمانی صحت آپ سے ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتی۔ کیا یہ..... کیا یہ..... کیا یہ ممکنات میں سے ہے کہ ملزم جیسا سنگل..... نہیں بلکہ آدھی پسلی کا یہ نحیف و ضعیف شخص مقتول ایسے ہٹے کٹے، تنومند شخص کو پچھاڑ سکے۔ نہ صرف پچھاڑ سکے بلکہ اس کے سینے پر کشن رکھ کر سوار بھی ہوجائے..... نہ صرف سوار ہوجائے بلکہ براستہ کشن اس کے سینے میں دو مہلک گولیاں بھی اتارنے میں کامیاب ہوجائے..... بتائیں آئی او صاحب! ہاؤ کین اِٹ پاسبل؟''

''بظاہر یہ ممکن تو دکھائی نہیں دیتا۔'' بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

''اور بہ باطن؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

''وہ بات یہ ہے جناب.....'' وہ اچانک پلٹا کھاتے ہوئے بولا۔ ''واقعات و حالات کی روشنی میں.....''

''اس روشنی کی فی الحال ضرورت نہیں ہے۔ عدالت کے کمرے میں اچھا خاصا اجالا موجود ہے آئی او صاحب!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرے سوالات کے بالکل درست جوابات دیے۔ مجھے آپ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

میرے آخری جملے پر جج نے انکوائری آفیسر کو کٹہرے سے نکلنے اور شائستہ بیگم کو وہاں کھڑا ہونے کی ہدایت کردی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دوبارہ مقتول کی بیوی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''شائستہ بیگم! میں آپ سے مقتول اور ملزم کی صحت کا موازنہ نہیں کراؤں گا کیونکہ شاید یہ کام آپ سے ہو نہ سکے۔ ملزم کو آپ نے صرف ایک مرتبہ چند لمحات کے لیے دیکھا تھا۔ بہر حال میں آپ سے ایک نہایت ہی اہم سوال پوچھ رہا ہوں اور یہ اس جرح کا آخری سوال بھی ہوگا۔ ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا۔''

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

''شائستہ بیگم! آپ نے معزز عدالت کے روبرو ابھی اقرار کیا ہے کہ آپ نے ایک فون پولیس کو کیا اور دوسرا فرید احمد کو۔ آپ کے بیان کے مطابق پولیس ساڑھے چار بجے جائے واردات پر پہنچ گئی تھی اور فرید احمد پونے پانچ بجے

وہاں پہنچا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جب پولیس آپ کے بنگلے پر آئی۔ فرید احمد وہاں موجود نہیں تھا لیکن حالات و واقعات اور آئی او کی تصدیق تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہی ہے۔ آئی او کے مطابق دراز قامت فرید احمد نامی وہ شخص بنگلے پر موجود تھا اور اسی نے ملزم کی گرفتاری کے سلسلے میں بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ آپ کا بیان آئی او کے بیان سے لگا کیوں نہیں کھاتا؟''

وہ لمحے بھر کے لیے متزلزل ہوئی پھر ہٹ دھرمی کے سے انداز میں بولی۔ ''میں نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے وہی درست ہے۔ آئی او صاحب کو وقت کے سلسلے میں کوئی سہو ہو گیا ہوگا۔''

میں نے جارحانہ انداز میں کہا ''شائستہ بیگم......! آپ اس کیس کی مدعی ہیں اور سب انسپکٹر صاحب اس کیس کے انکوائری آفیسر۔ استغاثہ کا دارو مدار آئی او کی رپورٹ پر ہے۔ اگر آپ اپنے بیان میں راسخ ہیں تو پھر آئی او صاحب جھوٹے پڑ جائیں گے۔ آپ دونوں کا متحد رہنا ضروری ہے۔ یہ پھوٹ آپ کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرے گی۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے اس بات کا؟''

وہ جز بز ہو کر کبھی وکیل استغاثہ اور کبھی انکوائری آفیسر کو دیکھنے لگی۔ جج نے قدرے سخت لہجے میں اس سے دریافت کیا ''بی بی......! تم وکیل صاحب کے سوال کا واضح جواب دو......''

''وکیل صاحب! آپ نے مجھ سے کیا پوچھا تھا؟'' وہ مجھ سے پوچھ بیٹھی۔

وہ اس وقت بہت زیادہ نروس ہو رہی تھی۔ کچھ تو میری جرح نے زچ کر کے اسے لاجواب کر رکھا تھا۔ اس پر جج کے سخت استفسار نے اسے مزید بوکھلا دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔

اسی ناسمجھی میں وہ مجھ سے سوال کر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کے پوچھنے کے جواب میں اپنا سوال دہرا دیا۔ وہ اپنے موقف سے ایک انچ ادھر ادھر نہ ہٹی اور اٹل لہجے میں بولی۔

''فرید احمد، پولیس کی آمد کے بعد وہاں پہنچا تھا۔ اس وقت جائے وقوعہ پر ایسی افراتفری مچی ہوئی تھی کہ وقت ناپنے کا کسے ہوش تھا اسی سبب آئی او صاحب کو غلط فہمی ہو گئی ہوگی......''

بات ختم کرتے ہی وہ بوکھلاہٹ آمیز نظر سے ادھر ادھر تکنے لگی۔ وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر کو اس کا جواب قطعی پسند نہیں آیا تھا تاہم انہوں نے اس موقع پر بلبلانے یا واویلا مچانے کی کوشش نہیں کی، صرف شکایتی نظروں سے اسے گھور کر رہ گئے۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے جرح ختم کر دی۔

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی لہٰذا استغاثہ کی طرف سے ایک اور گواہ کو پیش کر دیا گیا۔ اس شخص کا نام منظور تھا، منظور کی گلی کے آخری سرے پر ایک دکان تھی جہاں وہ سگریٹ اور کولڈ ڈرنکس فروخت کرتا تھا۔ جہاں سگریٹ فروخت ہوتی ہو وہاں پان کی فروخت بھی ایک لازمی بات ہے۔ بہرحال، منظور اس بات کا گواہ تھا کہ اس نے وقوعہ کے روز ملزم کو افراتفری اور نہایت ہی ہنگامی انداز میں جائے وقوعہ سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

وکیل استغاثہ کافی دیر تک گھما پھرا کر اس سے مختلف سوال کرتا رہا جس کا لب لباب یہی تھا کہ ملزم وقوعہ کے روز جائے واردات سے فرار ہوتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ میں نے گواہ پر زیادہ جرح نہیں کی۔ اس تمام تر جرح میں ایسی کوئی خاص بات نہیں جسے بیان کیا جائے لہٰذا میں آپ کو بور کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ فہرست کے مطابق، استغاثہ کا صرف ایک گواہ بچا تھا یعنی فرید احمد لیکن عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

جج نے نئی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

اگر اس روز فرید احمد عدالت میں موجود بھی ہوتا تو وقت کی تنگی کے باعث اس کی گواہی ممکن نہیں تھی۔ جج نے وکیل استغاثہ کو تاکید کر دی کہ آیندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہ فرید احمد کو ضرور عدالت میں پیش کیا جائے۔ دراصل، آئی او اور شائستہ بیگم پر جرح کے دوران میں چند ایسے نکات اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے جن کی تصدیق یا تردید فرید احمد ہی کر سکتا تھا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں فرید احمد کھڑا تھا!

یہ شخص بڑی مشکل سے قابو آیا تھا۔ گزشتہ پیشی پر جج نے دس دن بعد کی تاریخ دی تھی لیکن اب اس بات کو ڈیڑھ ماہ سے زیادہ گزر گیا تھا۔ اس دوران میں ایک مرتبہ گواہ کی ناسازی طبع کی درخواست پہنچ گئی اور ایک بار وکیل استغاثہ بہ وجوہ عدالت میں حاضر نہ ہو سکا۔ بہرحال، اس وقت وہ بہ نفس نفیس وٹنس باکس میں موجود تھا۔

اس کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ نے جج کی اجازت سے جرح شروع کر دی۔ اس کا سارا زور یہ

ثابت کرنے کے لیے تھا کہ ملزم ایک انتہائی غصہ ور اور جھگڑالو قسم کا شخص تھا۔ وہ اس دھمکی کا پکا گواہ تھا جو کچھ عرصہ پہلے ملزم نے مقتول کے آفس پہنچ کر اسے دی تھی۔ گواہ کے مطابق، ملزم نے مقتول کو بڑے واشگاف الفاظ میں یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اگر وہ باز نہ آیا تو کوئی بھی خطرناک نتیجہ سامنے آسکتا ہے اور گواہ کے مطابق، وہ خطرناک نتیجہ پرویز شاہ کی موت کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ بہرحال، میں اپنی باری پر جرح کے لیے فرید والے کٹہرے کے قریب چلا گیا۔

میں نے اس شخص سے نمٹنے کے لیے بڑی خاص تیاری کی تھی۔ کیس کی فائلوں میں سر کھپانے کے علاوہ مجھے باہر نکل کر کچھ فیلڈ ورک بھی کرنا پڑا تھا، بہرحال میں اپنی تیاری سے مطمئن تھا۔

میں نے دراز قامت فرید احمد کا بہ غور جائزہ لیا۔ اس نے خاصی تگڑی مونچھیں پال رکھی تھیں اس کی صحت کو قابلِ رشک کہا جاسکتا تھا۔ اسے دیکھ کر کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ پچھلے دنوں بیمار رہا ہوگا۔ کسی طاقت ور سے طاقت ور شخص کو اگر ایک دن بھی بخار آجائے تو وہ جھٹک کر رہ جاتا ہے لیکن ہفتے بھر کی بیماری نے بھی فرید کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ ایک دم صحت مند اور تر و تازہ دکھائی دیتا تھا۔

میں نے ہم دردانہ لہجے میں اس کی مزاج پرسی کی ''فرید صاحب! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''بس ٹھیک ہے'' وہ اپنی آواز میں نقاہت بھرتے ہوئے بولا۔

میں اس کی اداکاری کے تاثر میں نہیں آیا اور جارحانہ انداز میں جرح شروع کردی ''آپ کو وہ دن تو یاد ہوگا جب پرویز شاہ کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا۔ چھ اپریل.....''

اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا تھا۔ وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا ''ہاں یاد ہے۔ آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے پوچھا ''وقوعہ کے روز دوپہر' بلکہ سہ پہر تین بجے آپ کہاں تھے؟''

''میں کہاں ہوں گا' اپنے دفتر ہی میں تھا!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''مقتول کی بیوہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے لگ بھگ ساڑھے چار بجے فون پر آپ کو پرویز شاہ کے قتل کی اطلاع دی اور آپ کم و بیش پندرہ منٹ کے اندر، آفس بند کرکے اس کے بنگلے پر پہنچ گئے..... یعنی پونے پانچ بجے کے قریب؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''ہاں' میں بیگم صاحبہ کا فون سن کر ہی دفتر سے اٹھا تھا۔ وہ اطلاع ہی ایسی تھی کہ میں ایک لمحہ بھی دفتر میں نہیں رک سکا تھا لیکن.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ''وقت کے سلسلے میں بیگم صاحبہ کو تھوڑا مغالطہ ہو رہا ہے اور اس کی وجہ وہ پریشانی ہے جس میں وہ اس وقت گھری ہوئی تھیں۔ اس قسم کی صورت حال میں ایسا ہو جاتا ہے۔ بہرحال، میں کم و بیش ساڑھے چار بجے ہی بنگلے پر پہنچا تھا تاہم پولیس مجھ سے چند منٹ بعد وہاں پہنچی تھی۔''

''ناکن چورنگی سے مقتول کے گھر کتنے منٹ کی ڈرائیو ہے'' میں نے پوچھا ''یہ بات میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے پتا چلا ہے' آپ بائیک پر سوار ہوکر آئے تھے؟''

''آپ کو بالکل درست پتا چلا ہے'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''میں نے سوا چار بجے آفس بند کیا تھا اور لگ بھگ پندرہ منٹ میں، میں مقتول کے بنگلے پر پہنچ گیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، آئی..... او کا یہ بیان صحیح ہے کہ جب وہ لوگ جائے واردات پر پہنچے تو آپ وہاں موجود تھے'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''اور آپ ہی کی نشان دہی پر ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا!''

''جی ہاں حقیقت یہی ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا ''آپ نے ملزم کی نشان دہی اتنے بھرپور انداز میں کی تھی کہ لگتا ہے، آپ اس سے خاصی گہری واقفیت رکھتے ہیں..... اسے پہچانتے ہیں؟''

''میں نے اس واقعے سے پہلے ملزم کو صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا'' اس نے جواب دیا ''اور وہ دیکھنا ایسا یادگار تھا کہ میں اس کی شکل کو قیامت تک بھلا نہیں سکتا۔ اس کا ایک ایک نقش میرے حافظے میں نقش ہوکر رہ گیا ہے۔ یہ اپنی اوقات اور صحت سے زیادہ اچھل اچھل کر باتیں کر رہا تھا اور پرویز صاحب کو پتا نہیں، کہاں کہاں کی خطرناک دھمکیاں دے رہا تھا۔ مجھے اس کی اس پر اشتعال حرکت پر غصے کے بجائے ہنسی آئی تھی۔ شاہ جی کے مقابلے میں وہ ایسا ہی تھا جیسے ہاتھی کے سامنے کوئی مریل سا چوہا کھڑا ہو۔''

''غالباً آپ اس واقعے کا ذکر کر رہے ہیں جس پر وکیل استغاثہ نے خاصی لمبی چوڑی جرح کی ہے؟'' میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا' میں نے کہا ''فرید صاحب! آپ نے بہت اچھی بات کی ہے، بہت ہی خوبصورت مثال دی ہے..... ہاتھی کے مقابلے میں مریل سا چوہا۔ اس مثال سے

اگرچہ میرے موکل کی توہین کا پہلو نکلتا ہے لیکن یہ نکتہ اتنا اہم ہے کہ میرے موکل کی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔''

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا پھر پوچھ بیٹھا ''وہ کس طرح؟''

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ''فرید صاحب! آپ نے وقوعہ کے روز سوا چار بجے ''برائٹ فیوچر اسٹیٹ'' کا دفتر بند کردیا تھا۔ اس دفتر میں آپ کے علاوہ ملزم کی بیوی فرزانہ بھی ملازمت کرتی تھی۔ کیا وہ بھی سوا چار بجے ہی گھر چلی گئی تھی یا وہ اس سے پہلے جا چکی تھی؟''

''ہم ایک ساتھ ہی آفس سے نکلے تھے'' وہ میرے بچھائے ہوئے جال میں قدم ڈالتے ہوئے بولا ''فرزانہ ناگن چورنگی کی طرف سے نیو کراچی چلی گئی اور میں حیدری کی جانب آگیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، سوا چار بجے تک فرزانہ بھی آپ کے ساتھ دفتر میں موجود تھی؟''

''جی ہاں، میرے کہنے کا مطلب یہی تھا'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا ''کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کے آفس کے برابر میں پرنس پارٹی ڈیکوریٹر کی دکان ہے۔ جس کے مالک کا نام ہے اکرام بھٹی۔ پرنس ڈیکوریٹر صبح گیارہ بجے سے رات دس بجے تک کھلا رہتا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''ہاں، میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں'' وہ جلدی سے سر ہلاتے ہوئے بولا ''اور آپ پرنس ڈیکوریٹر کے بارے میں جو کچھ بتا رہے ہیں وہ بھی سولہ آنے درست ہے۔''

میں نے اچانک سوالات کا زاویہ بدل دیا۔ اور پوچھا ''وقوعہ کے روز لگ بھگ تین بجے آپ کے آفس میں کسی کا فون آیا تھا۔ وہ مقتول کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ جب آپ نے بتایا کہ مقتول آفس میں موجود نہیں تو وہ مقتول کی سیکریٹری کے بارے میں پوچھنے لگا۔ آپ نے اس سے کہہ دیا کہ سیکریٹری کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا لہٰذا وہ چھٹی لے کر گھر چلی گئی۔ شاہ جی کے حوالے سے آپ نے بتایا کہ وہ کسی نئی سائٹ کے معائنے کے لیے اورنگی گئے ہیں۔ اسی دوران میں اس شخص نے فون بند کردیا تھا؟''

''ہاں، ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایسا فون آیا تو تھا'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا ''مجھے تو وہ کوئی جھکی سا لگا تھا اسی لیے میں نے فرزانہ سے اس کی بات نہیں کرائی تھی۔ شاہ جی تو خیر اس وقت واقعی آفس میں موجود نہیں تھے۔'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر سنجیدگی سے بولا ''دکانداری میں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے وکیل صاحب! ایک سے ایک پاگل ٹکراتا ہے۔''

میں نے پوچھا ''اگر میں آپ کو اس جھکی اور پاگل شخص سے ملوا دوں جس نے وقوعہ کے روز تین بجے سہ پہر آپ کو فون کیا تھا تو آپ کے تاثرات کیا ہوں گے؟''

''کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟'' وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

''نہ صرف جانتا ہوں بلکہ ابھی اور اسی وقت میں آپ کو اس شخص سے ملوا بھی سکتا ہوں!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کہیں مذاق تو نہیں کر رہے وکیل صاحب؟'' وہ مجھے شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے ملزم امین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''وہ پراسرار شخص یہی تو تھا! اس نے آواز بدل کر آپ سے گفتگو کی تھی'' پھر میں نے اس گفتگو کی حقیقت فرید احمد کے گوش گزار کردی۔

''کیا واقعی!'' وہ حیرت سے معمور آواز میں بولا ''مجھے یقین نہیں آرہا۔ یہ ایسا لگتا تو نہیں ہے!''

''ہیں نا؟'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا ''آپ ٹھیک کہتے ہیں یہ شخص واقعی ایسا نہیں دکھائی دیتا جس قسم کے واقعات اس سے منسوب کر کے بیان کیے جا رہے ہیں جیسا کہ......'' میں نے دانستہ تھوڑا سا ڈرامائی توقف کیا پھر کہا۔

''جیسا کہ استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ اس ہڈیوں کے کہنہ سال پنجر نے گراں ڈیل مقتول کے سینے پر سوار ہو کر گلشن کے راستے اس کے سینے میں دو مہلک گولیاں اتاری ہیں...... فرید صاحب! جس طرح آپ کو یقین نہیں آرہا کہ اس نے آواز بدل کر آپ سے گفتگو کی تھی اور جس طرح آپ کو یقین نہیں آرہا کہ وقوعہ سے چند روز قبل اس نے اچھل اچھل کر مقتول کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں بالکل ویسے ہی مجھے...... اور کسی کو بھی یقین نہیں آئے گا کہ مقتول کی موت جس انداز میں واقع ہوئی ہے وہ ملزم ہی کا کارنامہ ہے لیکن آپ اور استغاثہ کی پوری مشینری یہی ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے کہ پرویز شاہ کو میرے موکل نے قتل کیا ہے......!''

میں نے جملہ مکمل چھوڑا تو وہ سمجھ گیا' میں اسے اپنے دام میں لانے کی چال چل رہا ہوں۔ وہ قدرے برہمی سے بولا ''اس دنیا میں سب کچھ ہوسکتا ہے...... سب کچھ......!''

''ہاں واقعی' سب کچھ ہوسکتا ہے'' میں نے چیخ سے

مشابہ آواز میں کہا ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ وقوعہ کے روز سہ پہر سوا تین بجے آفس بند کردیں۔ فرزانہ کو چھٹی دے کر گھر بھیج دیں اور خود بیگم صاحبہ کے بنگلے کی راہ لیں لیکن حیرت انگیز طور پر آپ سوا چار بجے اسی دفتر میں بیٹھ کر بیگم صاحبہ کی کال سنیں۔ وہ آپ کو بتائیں کہ کسی نامراد نے ان کے شوہر کو قتل کردیا ہے۔ آپ فوراً بنگلے پر پہنچیں اور آپ فرزانہ کو نیو کراچی کی طرف روانہ کر کے مقتول کے بنگلے پر پہنچ جائیں اور.....''

''یہ کیا بکواس ہے'' اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ میں میٹھی چھری سے اس کے حوصلے کو بڑی بے دردی سے ذبح کرڈالا تھا۔ وہ جارحانہ لہجے میں بولا ''آپ یہ کس قسم کی فضول باتیں کررہے ہیں۔''

جج نے اس ''بہادری'' پر اسے سخت ڈانٹ پلائی اور تنبیہی لہجے میں کہا ''مسٹر فرید! اپنی آواز کو قابو میں رکھو ورنہ میں توہین عدالت کے جرم میں تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچادوں گا۔

وہ ماتھے پر آنے والے پسینے کو اضطراری انداز میں صاف کرتے ہوئے معاندانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا ''آپ میں تو ذرا سی سچائی سننے کا حوصلہ نہیں ہے؟''

جج مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''بیگ صاحب! آپ نے بہ یک وقت متضاد باتیں کی ہیں۔ معزز عدالت ان کی وضاحت چاہتی ہے۔''

میں نے کہا ''جناب عالی! استغاثہ کے گواہ فرید احمد کا دعویٰ ہے کہ اس نے ٹھیک سوا چار بجے آفس بند کیا اور مقتول کے بنگلے کی طرف روزانہ ہوگیا لیکن اس کے آفس کے برابر میں واقع پرنس ڈیکوریٹر کا مالک اکرام بھٹی اس بات کا گواہ ہے کہ وقوعہ کے روز ''برائٹ فیوچر اسٹیٹ'' کا دفتر سہ پہر سوا تین بجے بند ہوگیا تھا۔ میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ استغاثہ کے گواہ فرید احمد سے پوچھا جائے اس کھلی دروغ گوئی سے اس کا مقصد کیا ہے؟''

''میں نے کوئی دروغ گوئی نہیں کی'' وہ چیخ کر بولا ''ایک حقیقت بیان کی ہے۔''

جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا ''بیگ صاحب! کیا آپ اکرام بھٹی نامی اس پارٹی ڈیکوریٹر کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کرسکتے ہیں؟''

میں نے جج کے سوال کا جواب دینے کے بجائے تیکھی نظر سے استغاثہ کے گواہ فرید احمد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ تاثرات سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی کٹہرے سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوگا۔ اس کی کیفیت کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں تھا۔

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''جناب عالی! پرنس پارٹی ڈیکوریٹر کا مالک اکرام بھٹی اس وقت عدالت کے برآمدے میں موجود ہے۔ آپ کی اجازت ہو تو میں اسے صفائی کے گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کرسکتا ہوں۔''

میرا یہ کہنا تھا کہ فرید احمد آپے سے باہر ہوگیا۔ وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھام کر چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ''بلالیں..... جس کو بھی بلانا ہے بلالیں۔ میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔ یہ اکرام بھٹی کیا بیچتا ہے۔ یہ میرے خلاف گواہی دے گا۔ میں تو اس کی ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دوں گا اور اس وکیل بیگ کے بچے.....''

''آرڈر..... آرڈر.....'' جج کی تحکمانہ آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔

اس آواز کے ساتھ ہی سناٹا چھا گیا۔ فرید احمد کے رویے نے اسے سب کی نظروں سے مشکوک ثابت کردیا تھا۔ حاضرین عدالت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ پھر جج کے حکم پر اکرام بھٹی کو گواہی کے لیے وٹنس باکس میں لایا گیا۔ اس طرح فرید احمد کے جھوٹ کا پول کھل گیا۔

جج نے استغاثہ کے گواہ فرید احمد کو پولیس کے حوالے کرتے ہوئے از سر نو اس کیس کی انکوائری کے احکام صادر کردیے۔ صورت حال روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی تھی۔

فرید پولیس کی تفتیش کا سامنا نہ کرسکا اور اس نے ایک ہی رات کی خاطر مدارات کے بعد اقبال جرم کرلیا۔ فرید احمد اور مقتول کی بیوہ آپس میں ملے ہوئے تھے اور ان کی ملی بھگت سے پرویز شاہ کو ٹھکانے لگایا گیا تھا۔ قربانی کے بکرے کے طور پر انہیں امین جیسا ایک احمق مل گیا تھا اس لیے ان کا کام آسان ہوگیا۔ انہوں نے امین کو پھنسانے کی پلاننگ کی۔ فرزانہ کے حوالے سے امین کو فون بھی انہوں نے کرایا تھا تاکہ وہ مشتعل ہوکر سیدھا مقتول کے بنگلے پر پہنچ جائے جہاں اس کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کا مکمل بندوبست تھا۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل امین کو باعزت بری کردیا۔

انتہائی احمق اور بے وقوف ہونے کے باوجود بھی وہ خاصا خوش قسمت ثابت ہوا تھا اور میرا خیال ہے اس خوش قسمتی میں اس کی بیوی کی دعاؤں اور کوششوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا ورنہ وہ جس قسم کی سچویشن میں پھنس گیا تھا۔ اس کا بچنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

ہیری کا شراب خانہ ایک الگ تھلگ اور خاموش سی جگہ پر واقع تھا۔ وہاں زیادہ تر بوڑھے لوگ ہی آیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہیری کے شراب خانے میں نوجوانوں کی دلچسپی اور کشش والی کوئی چیز نہیں تھی۔ نہ وہاں جگمگاتا رنگین ٹیلی وژن تھا، نہ روشنیاں پیدا کرتی پن مشین اور نہ ہی شور مچاتا جیوک بکس تھا البتہ ہیری نے ایک ریڈیو سیٹ ضرور رکھا ہوا تھا جس کے ذریعے اس کے شراب خانے پر آنے والی بڑی عمر کے لوگ ملکی اور غیر ملکی خبریں سنا کرتے تھے۔ ہیری کو اپنے ان بوڑھے گاہکوں سے جو آمدنی ہوتی تھی اسی میں وہ گزر بسر کیا کرتا تھا۔

ہیری کے ہاں باقاعدگی سے آنے والوں میں ایک تو آرنلڈ تھا۔ وہ ایک اپارٹمنٹ ہاؤس کا چوکیدار تھا اور ہر روز ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد وہاں ضرور آتا تھا۔ دوسری ایک خاتون تھیں جن کا نام مس مارچ تھا۔ لیسٹر نام کا ایک ریٹائرڈ ریلوے ملازم تھا۔ ایک شخص وہاں چارلی نام کا بھی آتا تھا جو ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ شراب خانے کا

جوانی کے جوش میں دنیا و مافیہا سے بے خبر نوجوان کے انجام کا عبرت ناک قصہ

جہاں دیدہ

محمود احمد مودی

عمر اور اس تجربے کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا، جوانی کا جوش بڑھاپے کے ہوش میں تبدیل ہو کر زیادہ سود مند اور کار آمد ہوجاتا ہے۔ اسی ہوش مندی کی عکاس ایک مختصر کہانی۔

مالک ہیری خود بھی شامل ہو جاتا تھا۔ جب یہ سب لوگ اکٹھے ہوتے تو بچے بن جاتے تھے۔ خوب گپ شپ کرتے، اپنی اپنی پسند کی شراب پیتے اور لفظ مکمل کرنے والے معمے حل کرتے۔ اس طرح ان بوڑھے لوگوں کے شب و روز گزر رہے تھے۔

ایک شام آرنلڈ نے مس مارچ سے کہا۔ ''تم نے کچھ سنا ہے؟ آج کل اس علاقے میں لوٹ مار اور چھینا جھپٹی کی کافی وارداتیں ہو رہی ہیں۔''

''اچھا؟ کوئی نئی واردات ہوئی ہے؟'' مس مارچ نے اپنی گہری نیلی آنکھیں آرنلڈ کے چہرے پر جما کر سوال کیا۔

''ہاں یہاں سے تین بلاک دور ایک عورت پر چند لفنگوں نے حملہ کیا اور اس کا پرس چھین کر فرار ہو گئے۔''

''کیا وہ عورت زخمی بھی ہوئی تھی؟'' مس مارچ نے بے پروائی سے سوال کیا۔ اس خبر سے وہ ذرا بھی خوفزدہ نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ بڑے اطمینان سے گلاس سے چسکیاں لے رہی تھی۔

''نہیں..... زخمی تو نہیں ہوئی۔'' آرنلڈ نے جواب دیا۔ ''مگر ہو بھی سکتی تھی۔ آج کل اس علاقے میں لوٹ مار اور راہزنی کی وارداتوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور خاص طور سے خواتین زیادہ خطرے میں ہیں۔ تم ذرا محتاط رہا کرو۔''

یہ سنتے ہی مس مارچ کی ہنسی نکل گئی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ارے! مجھ بوڑھی کو کون لوٹے گا۔ میرے پاس رکھا ہی کیا ہے؟ اور پھر میرے ساتھ لیٹر بھی تو ہوتا ہے۔''

''لیٹر؟ وہ بے چارا تو خود ایک کمزور بوڑھا ہے۔'' آرنلڈ نے کہا۔ ''ایک ریٹائرڈ اور پنشن یافتہ شخص تمہاری کیا حفاظت کرے گا؟ وہ اپنی حفاظت کے قابل تو ہے نہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' مس مارچ نے قدرے غصے سے کہا۔

''ارے بھئی تم تو برا مان گئیں۔'' آرنلڈ نے جلدی سے کہا۔ ''تم صرف واپسی میں لیٹر کے ساتھ جاتی ہو مگر آتی تو اکیلی ہو۔ ایسے میں ذرا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔'' مس مارچ نے کہا تو آرنلڈ خاموش ہو گیا۔

شراب خانے کا مالک ہیری بھی ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بھی لوٹ مار کے قصے سن چکا تھا اور اکثر و بیشتر پریشان رہتا تھا۔ چند روز پہلے اس موضوع پر ہیری، چارلی اور آرنلڈ سے بات کر چکا تھا۔ ان سبھی کو مس مارچ کی فکر تھی۔ اس موقع پر چارلی نے کہا تھا کہ کمزور اور بوڑھا لیٹر مشکل وقت میں مس مارچ کی حفاظت نہیں کر سکے گا۔

''مگر مس مارچ کسی کی سنتی بھی تو نہیں۔'' ہیری نے کہا تھا۔

''اس کے ساتھ لیٹر کے بجائے کوئی جوان اور صحت مند شخص ہونا چاہیے۔'' آرنلڈ نے کہا تھا۔ ''اس کی موجودگی میں کسی غنڈے بدمعاش کی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ مس مارچ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔''

''میرے خیال میں اس کام کے لیے ہیری کا کزن جارج بالکل مناسب رہے گا۔'' چارلی نے تجویز پیش کی تھی۔ ''وہ غالباً پولیس میں ملازم ہے۔ وہ کسرتی جسم کا مالک ایک بہادر شخص ہے۔ تم اس سے کہہ دو کہ وہ واپسی کے وقت مس مارچ اور لیٹر پر نگاہ رکھا کرے تاکہ یہ دونوں بہ حفاظت اپنے گھر پہنچ جائیں۔''

''ہاں..... جارج پولیس میں ملازم ہے۔'' ہیری نے کہا۔ ''وہ کرائے کا بھی ماہر ہے مگر اس کا محکمہ اسے اجازت نہیں دے گا کہ وہ..... ہر روز لیٹر اور مس مارچ کو ان کے گھر چھوڑنے جائے۔''

''ارے..... محکمے کو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟'' آرنلڈ نے کہا۔ ''وہ یہ کام خاموشی سے کر سکتا ہے۔''

''نہیں، یہ ممکن نہیں۔'' ہیری نے کہا۔ ''جارج ایک اصول پسند اور دیانت دار پولیس افسر ہے اور محکمے کی اجازت کے بغیر کبھی کوئی کام نہیں کرے گا۔ محکمے کو اس کی ضرورت کسی بھی وقت پڑ سکتی ہے۔ اگر وہ اس وقت اپنے دفتر میں نہیں ہوا تو اس کی فرض شناسی پر حرف آئے گا۔''

یہ کئی روز بعد کی بات ہے۔ ہیری کے شراب خانے میں مس مارچ اور لیٹر اپنی مخصوص میز پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ وہ ایک طوفانی رات تھی۔ ہوا بڑی تیز تھی، ساتھ ہی موسلا دھار بارش بھی ہونے لگی جس کی وجہ سے ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ ہیری کے شراب خانے میں مس مارچ اور لیٹر کے علاوہ چارلی اور آرنلڈ موجود تھے۔

اچانک شراب خانے کا دروازہ بے ہنگم طریقے سے کھلا اور ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ وہ شکل و صورت سے کوئی غنڈا بدمعاش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی تھی۔ اس نے شعلے برساتی نظروں سے شراب خانے میں موجود تمام لوگوں کی طرف دیکھا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''یہ دروازہ بند کر کے لاک کر دو اور کھڑکیوں کو بھی بند کر دو۔ تم سب اس وقت میرے رحم و کرم پر ہو۔''

اس وقت ہیری بار کاؤنٹر کے عقب میں کھڑا ہوا گلاس ایک سفید کپڑے سے چمکا رہا تھا۔ اس نے کپڑا ایک طرف رکھ دیا اور تذبذب کے عالم میں اس نوجوان کو دیکھنے لگا۔ نوجوان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کھٹکے دار چاقو نکال لیا اور اسے مخصوص انداز سے کھولا۔

"جلدی کرو۔" اس نے ہیری کو حکم دیا۔ ہیری کی نظریں چاقو کے چمک دار پھل پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کوئی حیل حجت نہیں کی بلکہ کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا اور نوجوان غنڈے کے احکام کی تعمیل کرنے لگا۔ مس مارچ، لیسٹر، آرنلڈ، چارلی سبھی دم بخود تھے۔

غنڈے نے اطمینان بھری نظروں سے ان سب کا جائزہ لیا۔ اس نے ایک کرسی پر لات ماری اور دوسری پر بیٹھ گیا۔ چاقو اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے جسم پر گندی جین، ایک ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ اور پیروں میں کیچڑ زدہ جوتے تھے۔ بڑے بڑے بالوں والے اس نوجوان کی عمر بہ مشکل بیس اکیس سال ہوگی۔

مس مارچ اب ذرا سنبھل گئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف و دہشت کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ غور سے اس غنڈے کی طرف دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یقیناً یہ کسی عورت کا پرس چھین کر بھاگا ہے اور پولیس سے بچنے کے لیے اسی کے شراب خانے میں گھس آیا ہے جہاں اسے مزید لوٹ مار کا موقع مل گیا ہے۔ سوچتے سوچتے اسے چھینک آگئی تو غنڈا بری طرح اچھل پڑا اور پلٹ کر مس مارچ کو قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا۔

"کیا بات ہے؟ سکون سے نہیں بیٹھا جارہا؟ زیادہ بے چینی ہورہی ہے؟ ابھی دماغ ٹھیک کردوں گا۔"

"تم ایک غنڈے اور آوارہ گرد ہو۔" مس مارچ نے ہمت کرکے کہہ ہی دیا۔ اس کی بات سن کر لیسٹر، ہیری، آرنلڈ اور چارلی، سبھی لرزنے لگے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب بڑی بی کی خیر نہیں۔ انہوں نے خواہ مخواہ اس لفنگے کو چھیڑا ہے۔

"بکواس بند کر بڑھیا!" غنڈا پھنکارا۔

"تم ذلیل اور کمینے ہو۔" مس مارچ نے کہا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی میز سے اٹھی اور نوجوان کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔ "تم محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرنے والے انسان نہیں بلکہ اچکے اور لفنگے ہو۔ تمہارا کام ہی راہزنیاں کرنا، ڈاکے ڈالنا اور عورتوں کے پرس چھیننا ہے۔"

"میں کہہ رہا ہوں اپنی زبان بند رکھو!" نوجوان چیخا۔

"تاکہ تم جیسے غنڈے دندناتے پھریں اور شریف لوگوں کو لوٹیں...... ماریں۔ تم کمینے اور خبیث...... آوارہ ہو......"

ابھی مس مارچ کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ غنڈا اپنی جگہ سے اچھلا اور اس نے مس مارچ کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ بوڑھی عورت لڑکھڑا کر گری اور خونی نظروں سے غنڈے کو گھورنے لگی۔ شراب خانے میں یکلخت سناٹا چھا گیا۔ غنڈے کے علاوہ وہاں چار مرد تھے مگر وہ چاروں بوڑھے اور کمزور تھے اس لیے ان میں سے کسی نے بھی نوجوان بدمعاش کے مقابل آنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ حیرت اور صدمے کے عالم میں فرش پر گری ہوئی مس مارچ کو دیکھ رہے تھے۔

"بڑی بی! شکر کرو کہ میں نے ہلکا ہاتھ مارا ہے۔" غنڈے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ ہاتھ ذرا بھی تگڑا ہوتا تو تمہارا چہرہ بدصورت ہوجاتا۔"

فرش پر پڑے پڑے مس مارچ نے ذرا سی کروٹ بدلی تو نوجوان بری طرح اچھل پڑا۔ مس مارچ کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا دھاتی کیپسول تھا۔ اس سے پہلے کہ بدمعاش کچھ سمجھ پاتا، اس دھاتی کیپسول سے ایک پھواری نکلی اور نوجوان کے چہرے پر پڑی۔ وہ بری طرح چیخنے لگا اور جنونی انداز سے اپنی آنکھوں کو مسلنے لگا۔ اس کی حالت عجیب ہورہی تھی۔ یہ موقع غنیمت جان کر ہیری نے شراب کی ایک بوتل اٹھائی اور بدمعاش کے سر پر دے ماری۔ بدمعاش کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

☆☆☆

"یہ کیا ہے مس مارچ؟" سب سے پہلے آرنلڈ نے پوچھا۔

ہیری، چارلی اور لیسٹر بھی اس دھاتی کیپسول کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے اور اس کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

"یہ ایک دفاعی ہتھیار ہے۔" مس مارچ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسے ہم ایک طرح کی آنسو گیس کہہ سکتے ہیں۔ تم سب لوگ کئی روز سے اس علاقے میں ہونے والی لوٹ مار اور راہزنی کی باتیں کررہے تھے تبھی میں نے محض حفاظتی اقدام کے طور پر یہ کیپسول خرید لیا تھا مگر یہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ نوجوان کی بے ہوشی کی وجہ یہ کیپسول نہیں ہے بلکہ وہ تو ہیری کے وار سے بے ہوش ہوا ہے۔"

"بہرحال تم نے آج جس جرأت کا مظاہرہ کیا ہے اس نے ہم سبھی کو حیران کردیا۔" آرنلڈ نے مس مارچ کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ چارلی اور لیسٹر بھی

حیرت اور خوشی سے مس مارچ کو دیکھ رہے تھے۔ اس بوڑھی عورت نے مردوں کی موجودگی میں یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔

''میں نے اسے ذلیل، حقیر، کمینہ صرف اس لیے کہا تھا کہ وہ طیش میں آئے مگر اصل کام تو ہیری نے کیا ہے۔'' مس مارچ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مس مارچ! میں نے تو تمہارے پیش کردہ ڈرامے کا ڈراپ سین کیا ہے۔'' ہیری نے کہا۔ ''یہ کارنامہ پورا کا پورا تمہارا ہے اور اس کی کامیابی کا سہرا تمہارے ہی سر جاتا ہے۔''

وہ سب فرش پر پڑے ہوئے اس بے ہوش غنڈے کو دیکھ رہے تھے۔ آخر ہیری نے ہی وہ خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ''سوال یہ ہے کہ اب اس شخص کا کیا کیا جائے؟''

''میرے خیال میں تو ہمیں پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔'' چارلی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... مناسب تو یہی ہے۔'' ہیری نے کہا۔

''مگر.....''

''مگر کیا؟'' لیٹر نے کہا۔ ''کیا اس کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہے؟''

''پولیس آئے گی اور اس بدمعاش کو پکڑ کر لے جائے گی۔'' ہیری نے جواب دیا۔ ''مگر اس کے بعد کیا ہوگا؟ تم سب جانتے ہو۔''

''ہاں، میں تمہاری بات سمجھ گئی۔'' مس مارچ نے کہا۔ ''پولیس اس بدمعاش کو عدالت میں پیش کرے گی جہاں جج اس کی نوجوانی کو دیکھتے ہوئے اسے سرزنش کرے گا۔ صحیح راستے پر چلنے کی تلقین کرے گا۔ تھوڑی سی لعنت ملامت کرے گا۔ تھوڑا سا لیکچر دے گا اور یہ نوجوان ایک بار پھر سڑک پر آجائے گا۔ اس کے بعد یہ سیدھا ہمارے پاس آئے گا اور ہم سے کہے گا۔ ''کیا بگاڑ لیا تم نے میرا؟'' اس موقع پر ہمارے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں ہوگا بلکہ ہماری سلامتی کے لیے زیادہ خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ یہ ہم سے انتقام لیے بغیر تو باز نہیں آئے گا۔ آج کل یہی تو ہو رہا ہے۔''

''مگر اب بھی تو اس نے ہمارے لیے خطرہ پیدا کیا تھا۔'' ہیری نے کہا۔ ''تم نے دیکھا نہیں کہ یہ کس بدتمیزی سے اندر داخل ہوا تھا؟''

''ہاں..... اور اس نے آتے ہی ہم سب پر چاقو بھی تان لیا تھا۔'' لیٹر نے بھی ہیری کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''میں مانتی ہوں کہ کسی کو چاقو دکھا کر ڈرانا دھمکانا خلافِ قانون ہے۔'' مس مارچ نے کہا۔ ''مگر اس کی اتنی بڑی سزا نہیں ملے گی کہ یہ آئندہ ادھر کا راستہ ہی بھول جائے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے۔'' ہیری نے کہا۔ ''اس کا پکا انتظام ہونا چاہیے۔ کوئی راستہ تلاش کرو۔''

''بھلا ہم ایک غنڈے بدمعاش کو کیا سزا دے سکتے ہیں؟'' چارلی نے کہا۔ ''یہ کام ہمارا نہیں ہے۔''

''میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔'' ہیری نے کہا تو وہ سب اس کے پاس آگئے۔ ''میں تمہیں بتاتا ہوں۔''

☆☆☆

کوئی پندرہ منٹ بعد جب اس بدمعاش کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک کرسی کے ساتھ بندھے ہوئے پایا۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا اور رسیوں سے اسے کرسی کی پشت اور ٹانگوں کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا گیا تھا۔ غنڈے نے غصے کے عالم میں اس جگہ کا جائزہ لیا تو وہاں اس کرسی کے علاوہ اور کوئی چیز نظر نہیں آئی جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔

وہ ایک چھوٹا سا اسٹور نما کمرا تھا جس میں کوئی کھڑکی تک نہیں تھی۔ صرف ایک دروازہ تھا، وہ بھی بہت موٹا دکھائی دیتا تھا اور مضبوط لکڑی کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ غنڈے کے سر کے اوپر مدھم روشنی کا ایک بلب جل رہا تھا۔ اس نے ہڑبڑاہٹ کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور اس میں سے وہ پانچوں اندر داخل ہوئے۔ مس مارچ کے ساتھ ہیری، آرنلڈ، لیٹر اور چارلی اندر آئے تھے اور اس نوجوان کو غور سے دیکھ رہے تھے جو مسلسل اپنی رسیوں کے ساتھ زور آزمائی کر رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟ میں کہاں ہوں؟'' بدمعاش نے پوچھا۔

''تم اس وقت میرے تہ خانے کے اسٹور میں ہو۔'' ہیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جتنا جی چاہے چیخو، چلاؤ۔ تمہاری آواز باہر نہیں جائے گی اور نہ کوئی تمہیں چھڑانے یہاں آسکے گا۔ میں نے یہاں سے ہر ضروری اور غیر ضروری چیز ہٹا دی ہے تاکہ تم کوئی حرکت نہ کرسکو۔''

جواب میں غنڈے نے قہر آلود نظروں سے ہیری کو دیکھا اور بولا۔ ''کیا چاہتے ہو تم؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''میں نے آج رات اس شراب خانے کو بند کردیا ہے۔'' ہیری نے اطمینان سے کہا۔ ''اور ایک ماہ کی چھٹیاں منانے اس شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ میں نے تمام کمرے بند کردیے ہیں۔ اس اسٹور اور تہ خانے کو بھی لاک کر کے جا رہا

ہوں۔''

یہ سنتے ہی نوجوان کے چہرے پر پریشانی اور خوف کے آثار نمودار ہوگئے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جگمگانے لگے۔

''تم سب پاگل اور خبطی ہو۔'' بدمعاش نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''غلط..... بالکل غلط!'' مس مارچ نے ایک خاص انداز سے کہا۔ ''ہم میں سے کوئی بھی پاگل یا خبطی نہیں ہے۔ یہ بات تم اپنے ذہن سے نکال دو۔ ہم سب بے حد ذہین اور سمجھ دار ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ انسان کھائے بغیر تو کئی ہفتے زندہ رہ سکتا ہے مگر پانی کے بغیر اس کا چند روز بھی زندہ رہنا مشکل ہے۔''

نوجوان غنڈے نے جھنجلا کر رسیوں پر زور لگانا شروع کردیا۔ اس کے انداز میں دہشت آگئی تھی۔ اس نے چیختے ہوئے کہا۔ ''تم..... لوگ..... اے..... ایسا..... نہیں کرسکتے۔''

''لو بھلا..... ہمیں کون روک سکتا ہے؟'' لیٹر نے کہا۔

پھر وہ پانچوں دروازے کی طرف چل دیے۔ ان میں آرنلڈ بھی شامل تھا مگر اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ صاف نظر آرہی تھی۔ وہ غالباً اپنے ساتھیوں کے اس اقدام سے متفق نہیں تھا مگر وہ کیا کرسکتا تھا؟

''خدا حافظ لفنگے انسان!'' مس مارچ نے مخصوص انداز سے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہوگیا۔ نوجوان نے بیرونی دروازہ بھی بند ہونے کی آواز سنی۔ ان لوگوں نے دونوں دروازے لاک کردیے تھے۔

☆☆☆

چند منٹ تک تو وہ نوجوان خاموش بیٹھا حالات پر غور کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے نئے سرے سے جدوجہد شروع کردی اور ایک بار پھر رسیوں سے زور آزمائی کرنے لگا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو وہ چیخنے لگا اور ان سب کو گالیاں دینے لگا۔ ساتھ ہی وہ انہیں برے نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہا تھا مگر اس کی چیخ پکار کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی مدد کو کوئی نہیں آیا۔

چیختے چیختے جب وہ نڈھال ہوگیا تو رونے لگا۔ روتے روتے تھک گیا تو اس نے دوبارہ چیخنا شروع کردیا۔ اسی عالم میں ایک مرتبہ اس نے اپنے جسم کو جنونی انداز سے حرکت دی تو وہ کرسی سمیت پشت فرش پر گر گیا۔ اس کے سر اور ٹانگ میں زوردار چوٹ لگی۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا مگر اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا۔ اگر وہ کسی نہ کسی طرح خود کو ان رسیوں اور کرسی سے نجات دلا لیتا تب بھی اس کے لیے اس اسٹور سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دروازہ مضبوط اور موٹی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ اسٹور اب اس کی قبر تھا۔ اسے اسی میں جان دینی تھی۔

یکایک نوجوان نے کوئی آہٹ سنی تو وہ چونک اٹھا۔ باہر کوئی تھا جو بے قدموں چل رہا تھا۔ اس نے چیخ کر آنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد اسٹور کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور دروازے میں آرنلڈ نظر آیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا گویا چوری چھپے اسٹور میں داخل ہو رہا تھا۔

''تم..... تم ٹھیک تو ہو نا نوجوان؟'' آرنلڈ نے سرگوشی کی۔

''تم..... تم..... مگر میں..... تم پر بھروسا کیسے کرسکتا ہوں؟'' نوجوان نے کہا۔ ''اچھا پہلے میری رسیاں کھولو۔''

''فکر مت کرو۔ میں تمہاری خاطر ہی یہاں آیا ہوں۔'' آرنلڈ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیا جائے اسی لیے میں خاموشی سے واپس آگیا۔ دروازہ میں پہلے ہی کھلا چھوڑ گیا تھا۔ میں تمہاری رسیاں ابھی کھولتا ہوں۔'' یہ کہہ کر آرنلڈ نے نوجوان بدمعاش کی بندشیں ٹٹولیں اور انہیں تھوڑنے لگا۔

''میں تمہارے قتل میں حصے دار نہیں بننا چاہتا تھا۔'' آرنلڈ نے دوبارہ کہا۔ ''مگر وہ ہیری..... وہ اس شراب خانے کا مالک ہے۔ وہ میری بات سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ اسی نے دوسرے لوگوں کو بھی مجبور کیا تھا کہ.....''

رسیاں ڈھیلی پڑنے لگی تھیں۔ بدمعاش جھٹکے سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ پیر ورزش کے انداز میں ہلائے تاکہ اس کے جسم کا دوران خون بحال ہوجائے پھر اس نے غراتے ہوئے زیرلب ہیری کو گالی دی۔

''وہ چھٹیاں منانے گیا ہے؟ یہ چھٹیاں اس کی زندگی کی آخری ہوں گی۔ اب وہ یا تو اسپتال جائے گا یا قبر میں۔'' یہ کہہ کر وہ گھوما اور آرنلڈ کا گریبان پکڑ لیا۔ ''کہاں رہتا ہے وہ کمینہ ہیری؟ مجھے اس کا پتا چاہیے۔ میں اسے اس کی بہادری کی وہ سزا دوں گا کہ ساری دنیا دیکھے گی۔''

''مجھے معلوم نہیں۔'' آرنلڈ نے گھگیاتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے کیوں مار رہے ہو؟ میں نے تو تمہاری مدد کی تھی اور تم.....''

''مجھے یہ بتاؤ کہ وہ کہاں رہتا ہے؟'' بدمعاش غرایا۔

آرنلڈ نے بے بسی سے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم.....''

''مجھ سے جھوٹ مت بولو۔ سیدھی طرح اس کا پتا بتادو۔'' بدمعاش نے کرخت لہجے میں کہا اور اس کی کلائی پکڑ کر پوری قوت سے مروڑنے لگا۔ آرنلڈ کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ وہ بدمعاش سے احتجاج بھی نہیں کرپا رہا تھا۔

بدمعاش نے کہا۔ ''سیدھی طرح اس بڈھے ہیری کا پتا بتادو ورنہ تمہارے دونوں بازو توڑ ڈالوں گا۔''

''مجھ پر مہربانی کرو..... ایسا مت کرو۔'' آرنلڈ نے کہا۔

''مجھے اس کا پتا چاہیے۔'' بدمعاش نے بے پروائی سے آرنلڈ کا ہاتھ مروڑتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں غیظ و غضب تھا۔

آرنلڈ زیادہ دیر اس وحشی کا مقابلہ نہیں کرسکا۔ اس نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور پتا بتادیا۔

☆☆☆

دوسری رات کو ہیری کے شراب خانے پر وہ سب لوگ حسبِ معمول جمع تھے۔ جشن کا سا سماں تھا۔ وہ سبھی لوگ بے حد خوش نظر آرہے تھے۔

''آرنلڈ! تمہاری کلائی تو ٹھیک ہے نا؟'' مس مارچ نے پوچھا۔ ''اس کمبخت نے تو حد ہی کردی تھی۔''

''معمولی تکلیف ہے۔'' آرنلڈ نے جواب دیا۔ ''مگر ہم سب نے مل کر اس بدمعاش کے ساتھ جو کھیل کھیلا ہے، اس کے مقابلے میں میری کلائی کی تکلیف اور سوجن کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ ایک آدھ دن میں ٹھیک ہوجائے گی۔ فکر کی بات نہیں ہے۔''

''ویسے آرنلڈ! تم نے تو کمال کردیا۔'' چارلی نے ستایشی نظروں سے آرنلڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا غضب کی اداکاری کی تھی تم نے..... اوہ بدمعاش واقعی یہ سمجھا کہ تم نے ہم سے غداری کی ہے اور اس کی ہمدردی تمہیں اس کے پاس لے گئی ہے۔ اس عمدہ اداکاری پر تمہیں ایوارڈ ملنا چاہیے۔''

''مگر ہمارا کھیل بالکل کامیاب رہا۔'' ہیری نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس ڈرامے کے سوا ہمارے سامنے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ ہم یہ نہ کرتے تو کیا کرتے؟''

ہیری کے ہاتھ میں جو اخبار تھا اس میں اس نوجوان بدمعاش کی تصویر کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی تھی۔

''پولیس افسر جارج کے گھر میں زبردستی گھسنے والا لٹیرا گرفتار۔ اس نے قانون کے محافظ کی جان لینے کی کوشش بھی کی تھی مگر پولیس افسر کی بروقت کارروائی نے نہ صرف اس کی جان بچالی بلکہ شہر کو لاحق ایک خطرے سے بھی محفوظ کردیا۔ جارج نامی پولیس افسر کراٹے کا بھی ماہر ہے۔ اس نے دو ہی ہاتھوں میں اس نوجوان غنڈے کو زمین چٹادی۔''

''ویسے ہیری..... تمہارے کزن نے تو ناقابلِ یقین کارنامہ انجام دیا ہے۔'' لیٹر نے کہا۔

''میں بتاتا ہوں کہ اصل کہانی کیا تھی۔'' ہیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس روز جارج کی چھٹی ہوتی ہے اور وہ ڈیوٹی پر جانے کے بجائے گھر پر ہوگا..... اور یہی ہوا بھی..... دوسرا مسئلہ یہ ہوا کہ ہم لوگوں کو اتنی مہلت ہی نہیں ملی کہ جارج کو فون کرکے ساری صورتِ حال بتاتے ورنہ اسے پہلے سے معلوم ہوجاتا کہ اس کے گھر میں کوئی آنے والا ہے تو زیادہ پرجوش طریقے سے اس کا استقبال کرتا۔''

''بہرحال پھر بھی اچھا ہی ہوا۔'' آرنلڈ نے کہا۔ ''جب اس بدمعاش نے میری کلائی مروڑ کر مجھ سے تمہارا پتا پوچھا تو میں نے تمہارے گھر کے پتے کے بجائے جارج کا پتا اسے بتادیا۔ ظاہر ہے ہم سب نے یہ پہلے ہی طے کرلیا تھا کہ ہمیں اس لفنگے کو کس کے پاس بھیجنا ہے۔''

''اور پھر وہ ہیری کا گھر سمجھ کر جارج کے گھر میں گھسنے کی حماقت کر بیٹھا جس کی سزا اسے یہ ملی کہ جارج نے کراٹے کے ایک دو وار آزما کر اس کی ہڈی پسلی ایک کردی۔'' مس مارچ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہی ہمارا منصوبہ بھی تھا۔ اب اس لفنگے کو کوئی بھی مجسٹریٹ آسانی سے معاف نہیں کرے گا اور نہ ہی محض زبانی تنبیہ کرکے رہا کرے گا۔ ظاہر ہے ملزم نے قانون کے محافظ کے گھر میں گھس کر اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس کی سزا تم سب جانتے ہی ہو۔ اب وہ کئی سال کے لیے جیل میں رہے گا..... اور امید ہے جب باہر آئے گا تب تک اس کا دماغ درست ہوچکا ہوگا۔''

''یقیناً.....'' چارلی نے کہا۔ ''بہرحال ہم سب کو آئندہ بھی مستعد اور چوکس رہنا چاہیے اور اپنی حفاظت کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے بعد سارے غنڈے اور بدمعاش ہم سے ڈریں گے اور خوفزدہ ہوں گے۔''

''چلو بھئی..... اب جشن منائیں۔'' ہیری نے کہا کہ تو ان سب نے زوردار نعرہ لگایا اور اپنے اپنے گلاس اٹھالیے۔

احمد رضا کا ماتھا اسی وقت ٹھنک گیا تھا جب تقسیم انعامات کی تقریب کے بعد ڈائریکٹر صاحب نے سحرش اور اسے آفس میں بلایا تھا اور دس پندرہ منٹ دونوں سے باتیں کی تھیں۔ ڈائریکٹر آفتاب سردار نے احمد رضا کے سامنے ان کی بیٹی سحرش کی تعریف کی تھی اور اسے اپنے کالج کی ہونہار اور لائق ترین طالبہ قرار دیا تھا۔ سحرش سر جھکا کر مسکراتی رہی تھی اور اس کے ہونٹ شکریے کے انداز میں ہلتے رہے تھے۔

آفتاب سردار ان لوگوں میں سے تھا جن کے چوبیس گھنٹوں کا ہر ہر لمحہ شیڈول کی زنجیر میں جکڑا ہوتا ہے۔ صبح سویرے ہی ان کے معاون طے کر دیتے ہیں کہ انہیں کن کن لوگوں سے کہاں کہاں ملنا ہے اور کس کس کام کے لیے کتنے کتنے منٹ یا لمحے صرف کرنے ہیں۔ آفتاب سردار آج کل تو ویسے بھی ہمیشہ سے زیادہ مصروف تھا۔ اس کا تعلق جس سیاسی جماعت سے تھا' وہ صوبے بھر میں بڑی واضح اکثریت سے الیکشن جیتی تھی۔ یوں آفتاب کی سیاسی اور کاروباری مصروفیات دونوں ہی کئی گنا بڑھ گئی تھیں۔ اس کی انگلیاں گھی میں اور سر تو پہلے ہی کڑاہی میں تھا' اب وہ جیسے پورے کا پورا کڑاہی میں چلا گیا تھا۔ اس کی دو ٹیکسٹائل ملز زیر تعمیر تھیں اور دو پوری رفتار سے کام کر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک جدید ترین اسپتال بھی گروپ آف ہاسپٹلز میں تبدیل ہونے والا تھا۔ کالج کا روز افزوں کاروبار اس کے علاوہ تھا۔

آہوں' کراہوں اور سسکیوں سے معمور ایک بے بس شخص کا جگر پارہ پارہ کرتی داستان

اس کا جرم صرف اسکی کم مائیگی تھا، ایسا جرم جس کی کوئی معافی نہیں ہوتی تاہم اگر سزا صرف اسے ملتی تو شاید غنیمت ہوتا مگر اس سزا کے عذاب میں تو وہ ذات بھی آگئی تھی جو اس کے لیے جان سے زیادہ عزیز تھی۔

چیونٹی

طاہر جاوید مغل

اگلے تین چار ہفتوں میں احمد رضا کو سحرش کی زبانی گاہے گاہے ایسی اطلاعات ملتی رہیں جن سے احمد رضا کو پتا چلا کہ کالج کے مالک و کرتا دھرتا آفتاب سردار صاحب سحرش کو اپنی خصوصی عنایات کا مستحق ٹھہرا رہے ہیں۔ وہ اسے اسکالرشپ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس عندیے کا اظہار بھی کیا ہے کہ بی ایس کے فوراً بعد سحرش کو اپنے ہی کالج میں تدریسی ذمے داریاں سونپی جاسکتی ہیں۔

سحرش بہت خوش تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ معصوم تھی لیکن احمد رضا خوش نہیں تھے۔ تقسیم انعامات کے موقع پر انہوں نے ڈائریکٹر صاحب کی آنکھوں میں جو رنگ دیکھا تھا' وہ ایک اندیشہ بن کر ان کے ذہن میں موجود تھا اور یہ اندیشہ روز بہ روز جڑ پکڑ رہا تھا۔ کسی وقت وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔ خود کو باور کراتے کہ وہ خوامخواہ دور دراز کے وسوسوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ آفتاب سردار ایک بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کے اختیار اور اثر رسوخ کی سرحدیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی نیک نامی اور بیکراں شہرت کو سینے پر تمغے کی طرح سجا کر پھرتا ہے۔ پھر وہ کوئی جذباتی نوجوان بھی نہیں ہے۔ اس کی عمر تینتیس' چونتیس سال سے زیادہ ہے۔ وہ بال بچے دار ہے۔ وہ اس قسم کی سوچ کو ذہن میں کیسے جگہ دے سکتا ہے۔ بالفرض اگر وہ اس مزاج کا آدمی ہے بھی..... تو پھر اس کے لیے اپنے روز و شب کو رنگین بنانے کے لیے بے شمار مواقع مہیا ہوں گے۔ اس کے اردگرد درجنوں نہیں سیکڑوں ایسی خوبصورت عورتیں اور لڑکیاں موجود ہوں گی جو اس کی آنکھ کے ایک اشارے پر بڑی خوشی سے ہر حد تک جانے کو تیار ہوں گی۔ پھر اسے کیا ضرورت پڑی ہے ایک غریب آرٹسٹ احمد رضا کی کم عمر بیٹی کے بارے میں سنجیدہ ہونے کی۔

پھر ایک روز جب احمد رضا اپنے گھر کے ایک کشادہ کمرے میں بڑی یکسوئی سے باہائے قوم کی ایک پورٹریٹ بنا رہے تھے' گیٹ کے سامنے ایک لمبی سیاہ کار آکر رکی۔ کار پر سبز نمبر پلیٹ تھی۔ کار کی پچھلی نشست پر سے سحرش اتری۔ ساتھ ہی گھنگھریالے بالوں والا ایک ادھیڑ عمر شخص بھی تھا۔ اس نے براؤن واسکٹ اور سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا۔ سحرش اسے انکل کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ پھر وہ بے حد اخلاق کے ساتھ اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

کچھ ہی دیر بعد ادھیڑ عمر شخص اور احمد رضا تعارف کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ احمد رضا کو معلوم ہوا کہ ادھیڑ عمر شخص کا نام حاجی الطاف رحمانی ہے۔ وہ خاصا پڑھا لکھا بندہ تھا اور آفتاب سردار کے سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کی رہائش ایک قریبی علاقے جوہر ٹاؤن میں تھی۔ آج سحرش کی دین کسی وجہ سے لیٹ تھی۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ دین کے انتظار میں کھڑی تھی۔ حاجی الطاف اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر یہاں تک لے آئے تھے۔ اب سحرش کے بے حد اصرار پر وہ گھر کے اندر آگئے تھے۔

احمد رضا سمجھ گئے کہ یہ سارا پالیسی بیان ہے ورنہ آفتاب سردار کے سیکریٹری کو کسی نہ کسی طور پر اس ڈرائنگ روم تک پہنچنا ہی تھا۔ احمد رضا کے سینے میں دھواں سا بھر گیا۔ ان کے اندیشے' حقیقت سے قریب ہوتے چلے جا رہے تھے۔

حاجی الطاف نے کہا ''سردار صاحب نے بیٹی سحرش کو پہلی بار تقسیم انعامات کی تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اکثر مجھ سے بس اسی کے بارے میں بات کرتے رہتے ہیں۔''

''وہ خود اچھے ہیں اس لیے دوسروں میں بھی اچھائی ڈھونڈ لیتے ہیں۔'' رضا صاحب نے یہ رسمی فقرہ بے دلی سے کہا۔

تاہم اس فقرے کی وجہ سے سردار صاحب کے سیکریٹری کو ان کی تعریف و توصیف بیان کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ کہنے لگا ''دل کے بہت ہی اچھے ہیں سردار صاحب۔ روپیا اور اختیار اپنے ساتھ بہت سی برائیاں لے کر آتے ہیں لیکن سردار صاحب بالکل الگ فطرت کے مالک ہیں۔ بڑی سچی' کھری زندگی گزار رہے ہیں۔ ہر انسان کی طرح اندر سے وہ بھی دکھی ہیں۔ کئی محرومیاں بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد جیسی نعمت سے محروم رکھا ہوا ہے۔ گھریلو زندگی بہت زیادہ پرسکون نہیں ہے۔ پھر بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ اور لفظوں میں مٹھاس رہتی ہے۔''

سردار صاحب کا یہ سیکریٹری آدھ پون گھنٹا رضا صاحب کے ساتھ رہا۔ اس کی گفتگو اور تعریف کا محور سردار صاحب ہی تھے۔ سیکریٹری کے جانے کے بعد رضا صاحب کے اندیشے گمبھیر تر ہو گئے۔

چند دن بعد ایک تصویری نمایش کے افتتاح کے موقع پر سیکریٹری حاجی الطاف سے رضا صاحب کی ایک ملاقات اور ہوئی۔ اس ملاقات میں سیکریٹری صاحب مزید کھل کر سامنے آئے۔ ان کی باتوں سے بالکل واضح ہو گیا کہ محترم سردار صاحب سحرش میں کس انداز اور نوعیت کی دلچسپی لے رہے

ہیں۔ ایک نہایت بااختیار شخص نے آرٹسٹ احمد رضا کی خوش شکل بیٹی کو گری پڑی چیز سمجھ لیا تھا اور ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں سیکریٹری حاجی الطاف نے بڑے شائستہ انداز میں رضا صاحب کو ایک دو خوش آیند پیش کشیں بھی کیں۔ ان میں سے ایک پیش کش احمد رضا صاحب کو سرکاری سطح پر بہ طور مصور پرموٹ کرنے کی بھی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے احمد رضا صاحب کو سردار صاحب کی چھوٹی بہن رخشندہ کے بارے میں بتایا۔ وہ مصوری میں بے حد دلچسپی رکھتی تھی اور کسی اچھے استاد سے فن مصوری کے رموز سیکھنا چاہتی تھی۔ سیکریٹری الطاف نے رضا صاحب کو یہ اشارہ بھی دیا کہ اگر وہ اس حوالے سے کچھ وقت نکال سکیں تو بہت سے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ سب باتیں سن کر رضا صاحب کا دماغ چٹخنے لگا تھا۔ انہوں نے بے حد برداشت کا ثبوت دیتے ہوئے سیکریٹری الطاف سے تو کچھ نہیں کہا مگر رات گئے تک وہ اپنے اندر ہی اندر ہانڈی کی طرح ابلتے رہے۔ سردی کے باوجود ان کا سارا جسم پسینے میں نہایا رہا۔

سحرش ان کی متاعِ حیات تھی۔ سحرش کی والدہ کو فوت ہوئے سات آٹھ سال ہو چکے تھے۔ سحرش سے بڑا صرف ایک بیٹا تھا۔ وہ اٹلی کے سفارت خانے میں ملازم تھا اور اپنے بیوی بچوں سمیت وہیں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ سحرش، رضا صاحب کو بچپن سے ہی بہت پیاری تھی۔ من موہنی سی، نازک سی، پھولوں کی طرح دلکش اور آئینوں کی طرح شفاف۔ اس ویران گھر میں اس کے وجود سے روشنی تھی۔ وہ جیسے چلتے پھرتے بہ زبانِ خاموشی، رضا صاحب سے کہا کرتی تھی ...... ''ابو! مجھے بہت دیکھ بھال کر خود سے جدا کرنا۔ میں اتنی کومل ہوں کہ ذرا سی گرم ہوا بھی مجھے کملا کر رکھ دے گی۔''

اور گرم ہوا آ گئی تھی۔ ہوا کیا تھی ''وہ تو بادِ سموم تھی'' حرص و ہوس کے صحرا سے اٹھنے والی ایک ایسی آندھی جو پتھروں کو بھی جھلسا دے ...... یہ آندھی احمد رضا صاحب کے سامنے دھیرے دھیرے زور پکڑ رہی تھی۔ معصوم سحرش ان سارے حالات سے بے خبر اپنے بابل کے آنگن میں چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی۔

سحرش بے شک خوبصورت تھی لیکن اس کا مزاج عام گھریلو لڑکیوں کی طرح ہی تھا۔ وہ کمپیوٹر پڑھ رہی تھی اور بی سی ایس کے پہلے سال میں تھی۔ رضا صاحب جب اسے دیکھتے تھے تو انہیں یوں لگتا تھا کہ وہ ایک شیشے کو دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایسا شیشہ جس کے آر پار بھی کچھ نظر آتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے، سحرش کی سوچیں کس طرح کی ہیں۔ اس کے اردگرد اور آس پاس کوئی ایسا لڑکا نہیں تھا جسے وہ ''خاص نظر'' سے دیکھتی ہو لیکن اپنی عمر کی سب لڑکیوں کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی کچھ سپنے تھے۔ وہ بھی یقیناً کسی خوبرو، من پسند ساتھی کا تصور ذہن میں بسائے ہوئے تھی۔ کوئی ایسا جیون ساتھی جو اسے سچی محبت اور خوشی دے سکے۔ ان سپنوں اور تصورات میں ایک پختہ عمر کے نیم گنجے، شادی شدہ کا تصور ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک دن سحرش کالج سے واپس آئی تو بہت گم صم اور زرد رو دکھائی دیتی تھی۔ رضا صاحب کا دل انجانے خدشوں کے زیرِ اثر شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ شام تک سحرش سے اس کی خاموشی کی وجہ پوچھنے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے لیکن اس نے کچھ بتا کر نہیں دیا۔ آخر میں بس اس نے اتنا کہا کہ وہ کسی دوسرے کالج میں داخل ہونا چاہتی ہے۔

اگلے روز بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ سب کچھ واضح ہو گیا۔ سردار صاحب کا سیکریٹری حاجی الطاف، رضا صاحب

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسا برس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو اپنی ناسمجھی کی بنا پر پیچیدہ امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے انکے لیے اپنے تجربے و تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے کئی ناکارہ بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور مایوس گئے گزرے کمزور نوجوان ایک ایک ہفتے آزما کر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ جوہر واقعی بے پناہ قوت کا سرچشمہ ہے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پہ سرخی ہاتھ پیروں میں چستی توانائی ظاہر کر کے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپکو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جائینگی جسکے لیے آپ ایک مدت سے محروم رہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز
پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

کے گھر آیا۔ وہ بہت دیر بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ بالآخر وہ اصل موضوع پر آیا اور اس نے بتایا کہ سردار صاحب اپنی پہلی بیوی کی اجازت اور رضامندی سے دوسری شادی کے خواہاں ہیں اور اس حوالے سے ان کی نظر انتخاب سحرش پر پڑی ہے۔ اگر رضا صاحب کی طرف سے مثبت اشارہ مل جائے تو اس بات چیت کو مروجہ طریقے سے آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

اب یہ سب کچھ رضا صاحب کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ سیکریٹری الطاف پر پھٹ پڑنا چاہتے تھے۔ تاہم انہوں نے بہ مشکل اپنے طیش پر قابو پایا اور سیکریٹری سے کہا ''اگر سردار صاحب اپنے قیمتی وقت میں سے بیس تیس منٹ نکال سکیں تو میں اس سلسلے میں ان سے خود بات کرنا چاہوں گا۔''

اگلے روز بارہ بجے آفتاب سردار کے ساتھ احمد رضا کی ''اپائنٹ منٹ'' ہوئی۔ دھڑکتے دل اور لرزتے جسم و جاں کے ساتھ احمد رضا' سردار صاحب سے ملنے ان کے مین آفس واقع اقبال ٹاؤن میں پہنچے۔ انہیں محسوس ہوا جیسے وہ کسی ملک کے فرماں روا سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ سکیورٹی کے دو تین مراحل سے گزر کر وہ انتظار گاہ میں پہنچا دیے گئے۔ معلوم ہوا کہ بڑے صاحب ایک ضروری میٹنگ میں ہیں اور میٹنگ بس ختم ہوا ہی چاہتی ہے۔ پولیس' پرائیویٹ گارڈز' نگراں کیمرے' بوگیر کتے۔ غرض سردار صاحب کے اردگرد ہر وہ شے موجود تھی جس کا تعلق شان و شوکت اور دبدبے سے تھا۔

انتظار کٹھن تھا۔ بہرحال احمد رضا صاحب کو یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ میٹنگ برخاست ہوتے ہی آفتاب سردار انہیں لینے کے لیے خود انتظار گاہ میں داخل ہوا۔ اس نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور چند منٹ کی تاخیر پر معذرت بھی کی۔ احمد رضا اس کے ساتھ وسیع و عریض آفس میں داخل ہوئے۔ اپنی پرشکوہ میز کے عقب میں بیٹھنے کے بجائے آفتاب سردار' رضا صاحب کے قریب صوفے پر بیٹھا۔

''ٹھنڈا لیں گے یا گرم؟'' اس نے پوچھا۔

''میں یہاں کچھ کھانے پینے کے لیے نہیں آیا سردار صاحب! صرف ایک ضروری بات کرنی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کا زیادہ وقت لیے بغیر وہ بات آپ تک پہنچادوں۔''

''جی کہیے۔'' آفتاب سردار نے اپنے دونوں موبائل فونز بند کرتے ہوئے کہا۔

احمد رضا بولے ''سردار صاحب! آپ حاکم ہیں' بااختیار ہیں۔ آپ کے ایک اشارے پر سارے شہر کی انتظامیہ حرکت میں آسکتی ہے۔ میرا آپ کا کوئی مقابلہ نہیں' نہ ہی موازنہ ہے۔ میں ایک معمولی آرٹسٹ ہوں۔ بے شک لوگ مجھے بھی جانتے ہیں۔ ایک خاص طبقے میں میری بھی شناخت ہے..... لیکن یہ شناخت اور حیثیت آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اگر میں اپنی حیثیت دیکھوں تو شاید آپ سے بات کرنے کی جرأت بھی نہ کرسکوں۔ لیکن اگر میں بات کرنے کی جرأت کررہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں آپ کو ایک اچھا انسان' اچھا منصف اور حاکم سمجھ رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری بات ''بڑے پن'' سے سنیں گے۔''

''جی کہیے۔'' سردار صاحب کے ماتھے پر ایک شکن ابھر کر غائب ہوگئی۔

''سردار صاحب! اس حقیقت سے یقیناً آپ کو انکار نہیں ہوگا کہ اپنی اولاد پر ہر ماں باپ کا حق ہوتا ہے۔ وہ اولاد کی اچھائی برائی کے بارے میں سوچنے کا پورا اختیار رکھتے ہیں۔'' سردار صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ احمد رضا صاحب دوٹوک انداز میں بولے ''آپ میری بیٹی سحرش کے بارے میں جس انداز سے سوچ رہے ہیں' وہ میرے لیے بالکل قابل قبول نہیں۔ میری بیٹی کی عمر بہت چھوٹی ہے' اس کی ساری توجہ ابھی اپنی پڑھائی لکھائی کی طرف ہے۔ میں آپ کو پوری سچائی کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ جس دن سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔ میرا اور میری بیٹی کا ذہنی سکون غارت ہوکر رہ گیا ہے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو شاید..... ہم یہ شہر یا ملک ہی چھوڑنے پر مجبور ہوجائیں۔''

آفتاب سردار نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا ''رضا صاحب! آپ میرے بزرگوں کی طرح ہیں۔ میں دل کی گہرائی سے آپ کی عزت کرتا ہوں لیکن یہ کہنے پر مجبور ہورہا ہوں کہ آپ اس معاملے میں جلد بازی سے کام لے رہے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے آپ ٹھنڈے دل سے خوب سوچ بچار کرلیں۔ پھر آپ جو بھی کہیں گے' مجھے قبول ہوگا۔ جہاں تک بات سحرش کی ہے..... اس کے موجودہ ردِعمل کو آپ حتمی نہ سمجھیں۔ ہوسکتا ہے کہ اسے وقتی طور پر تھوڑا سا شاک لگا ہو لیکن وہ بہت جلد صورت حال سے مطابقت پیدا کرلے گی اور اگر.....''

''دیکھیں سردار صاحب! اپنی بیٹی کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں' کوئی باہر کا فرد نہیں جان سکتا۔ اور اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو غلطی پر ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا ہے

کہ طاقت اور حیثیت کے لحاظ سے میرا آپ کا کوئی مقابلہ نہیں۔ آپ جب اور جس طرح چاہیں ہمیں روند سکتے ہیں لیکن اگر آپ حق سچ بات سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ مجھے اپنی بیٹی کے لیے آپ کی پیشکش کسی طور پر قبول نہیں۔ نہ آج نہ کل' نہ آیندہ کبھی۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا سارا وجود خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ان کے اٹھتے ہی آفتاب سردار بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ عجیب گمبھیر انداز میں مسکرایا۔ ''آپ اس وقت جذباتی ہو رہے ہیں رضا صاحب! میرا خیال ہے کہ ہم پھر کبھی بات کریں گے۔''

احمد رضا کہنے کو تو بہت کچھ کہہ آئے تھے لیکن اب اندر سے ڈر بھی رہے تھے۔ آفتاب سردار اگر باپ بیٹی کو سزا دینا چاہتا تو اس کے لیے اس کے پاس ہزاروں راستے تھے۔ احمد رضا سوچنے لگے۔ شاید پرانے وقتوں میں لوگ ٹھیک ہی کیا کرتے تھے۔ وہ علاقے کے بااختیار اور طاقتور لوگوں سے اپنی خوش شکل عورتیں چھپا کر رکھتے تھے۔ انہیں اندیشہ رہتا تھا کہ اگر کسی عیاش نے ان کی بہو بیٹی کو سرِراہ دیکھ لیا تو اسے خلوت میں طلب کرلیا جائے گا۔

سحرش نے دو دن بعد ہی وہ کالج چھوڑ دیا اور گھر کے نزدیک ایک دوسرے کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ کچھ گم صم سی نظر آنے لگی تھی۔ اس کی شوخی اور کھلکھلاتی ہوئی ہنسی کو جیسے کسی کی نظر لگ گئی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے سرکتا رہا۔ دو تین بار سیکریٹری الطاف سے بھی سرسری ملاقات ہوئی۔ وہ اس رویے سے خوش نہیں تھا جو رضا صاحب نے اس کے باس سے اپنایا تھا۔ الطاف نے بین السطور رضا صاحب کو سمجھایا کہ یہ صورت حال ناخوشگوار رخ اختیار کرسکتی ہے۔

بہ مشکل دو تین ماہ گزرے تھے کہ وہ ''ناخوشگواری'' ظاہر ہونے لگی جس کا ذکر ایک روز سیکریٹری الطاف نے کیا تھا۔ رضا صاحب کی زندگی بھر کی پونجی ایک آرٹ گیلری تھی۔ یہ گیلری اوقاف کی جگہ پر تھی۔ برسوں سے الطاف صاحب باقاعدگی سے کرایہ ادا کرتے چلے آرہے تھے۔ اس سلسلے میں کبھی کوئی تنازع پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے تنازع پیدا ہوگیا۔ رضا صاحب کو اوپر تلے کئی نوٹس موصول ہوئے۔ محکمۂ اوقاف سے کرائے دار کی حیثیت سے رضا صاحب پر کڑی شرائط عائد کی جارہی تھیں' بہ صورت دیگر انہیں جگہ چھوڑنے کے لیے کہا جارہا تھا۔

ابھی وہ اس دھچکے سے سنبھلے بھی نہیں تھے کہ ان کے انکم ٹیکس کی فائل جو تین چار سال پہلے بند ہوگئی تھی پھر سے پورے اہتمام کے ساتھ کھل گئی۔ متعلقہ آئی ٹی او اور دیگر اہلکار زور شور سے ان کے گھر اور گیلری کے چکر لگانے لگے۔ ان پر پریشانیوں اور الجھنوں میں دو تین ماہ گزر گئے۔ اسی دوران میں تیسرا جھٹکا لگا اور یہ شدید ترین تھا۔ معلوم ہوا کہ ان کے اکلوتے بیٹے کو بدعنوانی کے الزام میں محکمانہ کارروائی کا سامنا ہے اور اسے اٹلی سے پاکستان واپس بلایا جارہا ہے۔

اس تازہ دھچکے نے جیسے رضا صاحب کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ رضا صاحب کی عمر اڑتالیس سال ہوچکی تھی لیکن وہ ابھی پوری طرح صحت مند تھے۔ ان کی دلکش شخصیت کو ان کی خوش لباسی اور خوش گفتاری سے بڑھاوا ملتا تھا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہر محفل کی جان بن جاتے تھے لیکن اوپر تلے پڑنے والی ان مصیبتوں نے چند ہی ماہ میں انہیں مرجھا کر رکھ دیا۔ وہ مضمحل اور پژمردہ نظر آنے لگے۔ دوسری طرف وہ سحرش میں ایک مختلف قسم کی تبدیلی دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں رضا صاحب کو محسوس ہوتا تھا کہ چند ہی ماہ میں سحرش نے سنجیدگی اور دانائی کی کئی منزلیں طے کرلی ہیں۔ وہ اب ایک چنچل کالج گرل کے بجائے میچور عورت کی طرح سوچتی تھی۔ اکثر اوقات اس کی سوچ اتنی گہری ہوتی تھی کہ وہ قرب وجوار کو ہی فراموش کردیتی تھی۔ کچھ ہی روز پہلے وہ کالج سے آتے ہوئے اپنی وین میں بیٹھنے کے بجائے دوسری وین میں بیٹھ گئی اور دو تین اسٹاپ آگے جانے کے بعد اسے واپس آنا پڑا۔ اس کی یہ پریشان خیالی رضا صاحب کو تکلیف دیتی تھی۔ ایک دن باتوں باتوں میں اس نے ایک عجیب فقرہ کہا۔ باپ بیٹی کے سامنے صبح کا تازہ اخبار پڑا تھا۔ اخباروں میں عموماً آفتاب سردار کی تصویریں چھپتی رہتی تھیں۔ آج بھی میگزین کے رنگین صفحے پر آفتاب سردار کی ایک بڑی تصویر آئی تھی۔ وہ لاہور کے مرکز میں ایک بہت بڑے شاپنگ پلازا کا سنگ بنیاد رکھ رہا تھا۔ سحرش بولی ''ابو! یہ سردار صاحب دیکھنے میں اتنے بڑے بھی نہیں لگتے۔ لگتا ہے کہ ستائیس اٹھائیس سال کے ہی ہیں۔''

رضا صاحب چونک کر سحرش کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ نظریں جھکائے یہ ظاہر لاتعلق بیٹھی تھی۔ وہ اپنے باپ کو جو اشارہ دے رہی تھی' وہ باپ نے وصول کرلیا تھا لیکن وہ اس اشارے کے پیچھے دیکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ کیونکہ

وہ اس کے باپ تھے۔ ایک لحظے میں ہی احمد رضا صاحب نے جان لیا کہ سحرش جو کچھ کہہ رہی ہے کہ اس کے پیچھے جبر اور ستم کا بے پناہ دباؤ ہے۔ وہ ان سارے حالات کو دیکھ رہی ہے جو باپ بیٹی کے اردگرد موجود ہیں اور ان حالات کے تناظر میں وہ اپنے اندر قربانی اور ایثار کا جذبہ ابھار رہی ہے۔ ایک ایسے شخص کو اپنی نوخیز زندگی میں داخلہ دینے کے بارے میں سوچ رہی ہے جو عمر میں اس سے قریباً دگنا ہے' جو پہلے سے شادی شدہ ہے..... اور جس کو وہ ہرگز پسند نہیں کرتی۔

جس روز اخبار کی تصویر والی بات ہوئی' اسی روز دوپہر کو ایک اہم فون کال آئی۔ آفتاب سردار کی پی اے نے رضا صاحب کو یہ سنسنی خیز اطلاع دی کہ سردار صاحب آپ سے بات کریں گے۔ اس متوسط طبقے کے گھر میں داخل ہونے والی فون لائن کے لیے یہ بہت بڑا ''اعزاز'' تھا کہ اس پر سردار صاحب جیسے طاقتور بااختیار شخص کی آواز گونجنے والی تھی۔

رضا صاحب پتھر کی طرح ساکت وجامد بیٹھے رہے ''ہیلو رضا صاحب! میں آفتاب سردار بات کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے نرم ملائم لہجے میں کہا گیا۔

''جی' میں سن رہا ہوں۔'' احمد رضا کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''محترم! مجھے الطاف رحمانی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ آپ کو ایک دو مسئلے درپیش ہیں۔ آپ کی پریشانی کو میں نے اپنی پریشانی کی طرح محسوس کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں ایک اور طرح کی فکرمندی بھی پیدا ہوئی۔ میرے ذہن میں آیا کہ کہیں آپ ان پریشانیوں کا ناتا کسی طور پر میرے ساتھ نہ جوڑ دیں۔ میری اور آپ کی جو آخری ملاقات ہوئی تھی' وہ میرے لیے زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھی۔ اس قسم کی صورت حال میں عموماً بدظنی پیدا ہو جاتی ہے۔''

''اب آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' احمد رضا نے اپنے اندرونی احساسات کو دباتے ہوئے پوچھا۔

''الطاف نے کل انکم ٹیکس اور اوقاف کے متعلقہ اہلکاروں کو بلایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ دو چار دن میں اس سارے معاملے کو ہینڈل کر لے گا۔ اگر مزید کوئی پیچیدگی پیدا ہوئی تو میں خود دیکھ لوں گا۔ انشاءاللہ' آپ کے یہ دو مسائل تو اب آپ کو پریشان نہیں کریں گے۔''

''شکریہ!'' رضا صاحب بہ مشکل یہی کہہ سکے۔

''اور رضا صاحب! میری طرف سے اپنا دل بالکل صاف رکھیے۔ میں آپ کے بارے میں جو کچھ سوچتا ہوں' اس میں کسی طرح کے مفاد یا غرض کو دخل نہیں ہے۔ میں اپنے نجی معاملات کو اپنی سماجی ذمے داریوں سے بالکل الگ رکھتا ہوں۔''

''جی!''

دو چار مزید باتیں کرنے کے بعد آفتاب سردار نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

احمد رضا کا سارا جسم پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ منافق کے لفظوں کے پیچھے چھپے ہوئے جبر اور قہر کو بڑی اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔ وہ ایک فن کار تھے اور ان کی حساسیت انہیں آفتاب سردار کی اندرونی خباثت سے پوری طرح آگاہ کر رہی تھی۔

فرط غضب سے ان کے رگ وپے میں آگ بھر گئی۔ وہ دیکھ رہے تھے' آفتاب سردار ان کی چھوٹی موئی' خوش رنگ بیٹی کو سالم نگلنے کے لیے ایک مگرمچھ کی طرح دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور بے تابی سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ آفتاب کے مقابلے میں وہ کمزور تھے۔ بے حد ناتواں تھے لیکن اگر چیونٹی کو بھی مسلا جائے تو وہ مزاحمت کا حق ادا کرتی ہے۔ وہ کیا کر سکتے ہیں؟ کیا کر سکتے ہیں؟

وہ بے حد بے قراری کے عالم میں سوچنے لگے۔ انہوں نے کبھی کبھی مچھر نہیں مارا تھا لیکن ان لمحوں میں وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے تھے کہ وہ آفتاب سردار کو گولی مار دیں۔ سارے نتائج سے بے پروا ہو کر وہ سیدھے آفتاب سردار کے آفس میں جائیں۔ اس کی آنکھوں میں دیکھیں اور پستول سیدھا کر کے اس کے سینے میں تین چار گولیاں اتار دیں۔ آتشیں گولیاں ..... جو ہر اونچ نیچ' ہر کمزوری اور طاقت کو برابر کر دیتی ہیں۔ جو انصاف کے راستے مسدود ہونے کے بعد انصاف اور مساوات کی پیامبر بنتی ہیں۔

لیکن..... لیکن سوچنا آسان اور عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ احمد رضا بھی کئی پہر اپنے آپ سے لڑتے رہے۔ ایک پل جیتے اور ایک پل مرتے رہے۔ آخر بے بسی کے آنسو بہاتے' نڈھال سے ہو کر بستر پر لیٹ گئے۔ ان کا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ وہ آفتاب سردار جیسے عفریت کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔ یہ ظاہر تو مزاحمت کے راستے موجود تھے۔ پولیس تھی' عدالتیں تھیں' احمد رضا کا اپنا حلقۂ احباب تھا۔ فن کی دنیا سے منسلک ہونے کے باعث انہیں ایک دو اہم فورم مہیا ہو سکتے تھے مگر نتیجہ کیا تھا؟ نتیجہ وہی تھا جو صدیوں سے نکلتا آیا ہے..... ذہنی اذیت' بدنامی' جگ ہنسائی اور اس کے ساتھ ساتھ بسا اوقات پسپائی۔

انہوں نے ابھی تک اپنے حلقۂ احباب میں سے کسی کو اس تکلیف دہ صورتِ حال کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ انہیں پتا تھا کہ اگر وہ بتائیں گے تو دو چار قریبی ساتھی تو ضرور غم ٹھونک کر اٹھ کھڑے ہوں گے لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ وہ قریباً ایک گھنٹے تک شدید تذبذب کے عالم میں فون سیٹ کے پاس بیٹھے رہے مگر کسی دوست کو فون کرنے کی ہمت انہیں نہیں ہوئی۔

سہ پہر کو سیکریٹری الطاف ان سے ملنے چلا آیا۔ الطاف کا آنا انہیں بھی اچھا نہیں لگا تھا اور آج تو وہ اس کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ بہرحال اپنے گریز پر ضبط کرتے ہوئے انہوں نے سحرش سے کہا کہ وہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔

آج سیکریٹری الطاف نے رضا صاحب سے مختلف ڈھنگ سے بات کی۔ وہ بولا ''رضا صاحب! آپ ایک بلند پایہ فن کار ہیں تاہم اس حیثیت سے قطع نظر ہم دونوں ایک ہی کلاس کے لوگ ہیں۔ ہمارے طبقے کے مسائل تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ آپ جس کیفیت سے گزر رہے ہیں' میں اسے بڑی اچھی طرح سے سمجھ رہا ہوں اور بہ خدا میں دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ میں تہ دل سے چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کا کوئی ایسا حل نکل آئے جو آپ کے لیے قابل قبول ہو۔''

اس تمہید کے بعد سیکریٹری الطاف نے پہلی بار اپنے ان داتا سردار صاحب کے بارے میں مختلف انداز سے رائے زنی کی۔ اس نے بتایا کہ آفتاب سردار کا پس منظر جاگیردارانہ ہے۔ یوں ان میں انا پرستی' ضد اور تند مزاجی جیسی وہ ساری صفتیں پائی جاتی ہیں جو ایسے لوگوں کا خاصہ ہوتی ہیں۔ بہرحال ان میں اچھی صفتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ وہ دوستوں کے دوست بھی ہیں اور ایسے ہیں کہ محبت کا حق ادا کردیتے ہیں۔

اس گفتگو کے دوران میں الطاف نے ڈھکے چھپے انداز میں شائستہ طریقے سے رضا صاحب کو یہ بات سمجھائی کہ اگر کسی طور ان کی بیٹی سردار صاحب کے خاندان کی عزت بن جائے تو یہ بہت خیر اور بھلائی کی بات ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ بہت خوش آیند بھی۔

رضا صاحب کو یہی لگ رہا تھا کہ وہ ہر طرف سے شکنجے میں جکڑتے چلے جارہے ہیں۔ اس دن حاجی الطاف کے جانے کے بعد وہ اسٹڈی میں بند ہوکر بہت دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ شاید ان کے ماضی کی کچھ کوتاہیاں تھیں' جن کا صلہ انہیں آج اس صورت میں مل رہا تھا۔ ان کی ذہنی اذیت انہیں بہ تدریج ماضی کے دریچوں میں دھکیلنے لگی۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے ماہ و سال کو یاد کرنے لگے۔

وہ ہمیشہ سے خوبرو تھے۔ جوانی ان پر ٹوٹ کر آئی تھی۔ سفید کھلتا ہوا رنگ' ہلکی براؤن آنکھیں' گھنے ریشمی بال اور لمبا قد۔ وہ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھے۔ جن دنوں وہ فائن آرٹ کالج میں پڑھتے تھے' کئی لڑکیوں سے ان کی دوستی ہوئی۔ درحقیقت وہ جس لڑکی کو نظر بھر کر دیکھ لیتے تھے' وہ ان کی طرف مائل ہو جاتی تھی۔ ان دنوں کسی بھی لڑکی کو سر کرنا ان کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا۔ بلکہ وہ چاہتے تو اکثر لڑکیوں کو جسمانی طور پر بھی فتح کرسکتے تھے لیکن ان کا مزاج ایسا نہیں تھا۔ ان کی زیادہ تر دوستیاں بس ایک حد کے اندر ہی رہیں۔ اوائل عمری کے اس دور میں بھی اخلاق اور شائستگی کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹا..... شاید یہی وجہ تھی کہ ''تعلق'' ختم ہونے کے بعد بھی اکثر لڑکیاں نارمل انداز میں ان سے ملتی رہتی تھیں۔ وہ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی تھیں اور وہ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

ایک صرف ایک لڑکی ایسی تھی جس کے ساتھ احمد رضا کا تعلق آگے تک گیا تھا..... ان دونوں کے جذبات میں شدت آئی تھی اور وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے لیکن اس لڑکی کو احمد رضا نے چھوڑا نہیں تھا۔ اسے شریک حیات بنایا تھا اور وہی سحرش کی مرحومہ ماں تھی۔ اس کا نام نائلہ تھا اور وہ بھی احمد رضا کی طرح فنون لطیفہ میں دلچسپی رکھتی تھی۔ خوشگوار ازدواجی زندگی کے بیس سال گزارنے کے بعد اب وہ دوسری دنیا کی باسی تھی۔

شادی سے پہلے جب احمد رضا کالج لائف میں ایک آزاد پنچھی کی سی زندگی گزار رہے تھے' ان کے دوست ان کے لیے ایک معروف اصطلاح ''لیڈی کلر'' استعمال کیا کرتے تھے اور وہ واقعی لیڈی کلر تھے۔ صنف مخالف ان کی طرف مقناطیس کی طرح کھنچتی تھی۔ اس دور میں کبھی کبھی تو احمد رضا کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ''رومانی تعلق'' بس ان کی توجہ کا نام ہے۔ وہ جس لڑکی یا خاتون پر بھی چند دن یا ہفتوں کے لیے اپنی توجہ مرکوز کرتے تھے۔ وہ ان کی طرف مائل ہو جاتی تھی۔ بعد ازاں اپنے یقین کے پختہ ہو جانے کے بعد انہوں نے اپنی اس خداداد صلاحیت کو کئی بار آزمایا بھی۔ اس کی مثال یوں بھی کہ کوئی چہرہ انہیں اچھا لگتا تھا۔ وہ اسے اپنی آنکھوں میں بساتے تھے۔ اسے سوچتے تھے' اس کی تمنا کرتے تھے۔ اس سے ملتے جلتے' اسے باتیں کرتے' وہ اس

کی خواہش اپنے اندر ابھارتے رہتے تھے اور تین چوتھائی کیسوں میں یہ ہوتا تھا کہ وہ ''خوبرو خاتون یا لڑکی'' ان میں دلچسپی لینے لگتی تھی۔ ان دنوں احمد رضا عام ڈگر سے ہٹ کر سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ محبت کی نہیں جاتی' ہو جاتی ہے۔ اسے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خودرو ہوتی ہے' وغیرہ وغیرہ لیکن ان دنوں احمد رضا اس حتمی نتیجے پر پہنچے تھے کہ سارے نہیں تو کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ''محبت'' کو پیدا کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس لطیف جذبے کی مینوفیکچرنگ کر سکتے ہیں۔ ایسے عاشق مزاج لوگوں کو جو چہرہ بھاتا ہے' وہ اسے اپنے ذہن میں فوکس کرتے ہیں' اس کے لیے آہیں بھرتے ہیں' بے قرار ہوتے ہیں' اس کی خواہش کو مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے اندر ابھارتے ہیں۔ ان کی طلب میں اتنی شدت اور ثابت قدمی ہوتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں فریق ثانی ان کی ''طلب'' کی لپیٹ میں آ جاتا ہے اور رومانس کے خدوخال واضح ہونے لگتے ہیں۔

احمد رضا' ماضی کی سوچوں میں گم تھے۔ وہ تصور کے دریچوں سے بیتے ہوئے وقت کو دیکھ رہے تھے اور گزری ہوئی کیفیات کو محسوس کر رہے تھے۔ ان کے سفیدی مائل بالوں کی کچھ لٹیں ان کی کشادہ پیشانی پر لہرا رہی تھیں۔ یقیناً اوائل عمری میں انہوں نے زندگی کو اپنے ڈھنگ سے انجوائے کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر بھی مواقع موجود ہونے کے باوجود انہوں نے بڑی حد تک خود کو سنبھالے رکھا تھا۔ وہ بیٹھے رہے اور اپنے ماضی کا تجزیہ کرتے رہے۔ وہ بالائی منزل پر تھے۔ ان کی نگاہیں کھڑکی سے باہر اور لان سے آگے تارکول کی سیاہ سڑک کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی لاڈلی کالج سے لوٹنے والی تھی۔ اپنی کھنکتی آواز میں انہیں ''السلام علیکم' ابو!'' کہنے والی تھی۔ پھر اپنے ہاتھوں سے ان کے سامنے دوپہر کا کھانا پروسنے والی تھی۔ وہ اپنے ماضی کو کھنگالنے کے ساتھ ساتھ بے خیالی میں بیٹی کی کالج وین کا راستہ بھی تکتے جا رہے تھے۔ آج وہ زیادہ شدت سے اس کے منتظر تھے کہ وہ صبح سوجی سوجی آنکھوں کے ساتھ کالج گئی تھی۔

اور پھر کالج وین سڑک کے موڑ پر نمودار ہوئی۔ اس نے حسب معمول سحرش کو موڑ پر اتارا اور آگے بڑھ گئی۔ سفید براق یونیفارم میں ملبوس سحرش چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی گھر کی طرف بڑھی۔ ایک فائل اور دو چار کتابیں اس کے سینے سے لگی تھیں۔ سر پر سبز دوپٹا تھا۔ گردن جھکی ہوئی تھی۔ عجیب اداسی بھرے کھوئے کھوئے انداز میں وہ گھر کی طرف چلی آ رہی تھی۔ وہ شوخی' ترنگ اور تیزی جو اس کی ذات کا حصہ تھی' کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ وہ سب کچھ ایک طاقتور' خودسر اور بے اصول شخص کے اڑائے ہوئے گرد و غبار میں گم ہو چکا تھا۔ وہ اسی گرد و غبار میں ڈگمگاتی ہوئی سی مین گیٹ کی طرف آ رہی تھی۔ اس کا انداز دیکھ کر احمد رضا کا دل سو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ سحرش اپنے آپ میں اتنی گم تھی کہ اس تیز رفتار ویگن کو نہیں دیکھ سکی جو برق رفتاری سے موڑ پر نمودار ہوئی تھی۔ احمد رضا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ سحرش نے ایک تہائی سڑک پار کی تھی جب بریکوں کی خوفناک چنگھاڑ ابھری۔ ویگن نے سحرش کو اٹھایا اور ربڑ کی گڑیا کی طرح اچھال کر کئی میٹر دور پھینک دیا۔ احمد رضا کو اپنی معصوم بچی کی کتابیں ہوا میں اڑتی ہوئی نظر آئیں۔ پھر وہ چلاتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بھاگے۔

☆☆☆

سحرش کو شدید چوٹیں آئی تھیں۔ اس کی دائیں پنڈلی کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ پاؤں کے علاوہ چہرے اور کندھے پر بھی زخم آئے تھے۔ اسپتال میں اس کی کنپٹی اور رخسار پر بیس ٹانکے لگے۔ ٹانگ میں پلیٹیں وغیرہ لگانے کے لیے ایک بڑا آپریشن کرنا پڑا۔ وہ قریباً دو ہفتے تک اسپتال میں رہی پھر گھر واپس آ گئی۔

آنے والے دنوں میں احمد رضا نے اپنی لاڈلی کے علاج معالجے پر کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ انہوں نے مکان گروی رکھ دیا اور سحرش پر پیسا پانی کی طرح بہایا۔ اٹلی سے بھائی نے بھی جو کچھ ہو سکا' بہن کے لیے کیا۔ وہ خود بھی برے وقت کا شکار تھا اور ملازمت کے حوالے سے اس کا مستقبل خطرے میں پڑا ہوا تھا۔ بہترین علاج معالجے سے سحرش کی پنڈلی تو ٹھیک ہو گئی لیکن پاؤں پر جو پیچیدہ چوٹ آئی تھی' اس کی وجہ سے اس کی چال میں مستقل لنگڑاہٹ پیدا ہو گئی۔ چہرے کا زخم چھپانے کے لیے کراچی سے اس کی پلاسٹک سرجری کرائی گئی۔ یوں چہرے کی یہ بدنمائی کافی حد تک چھپ گئی۔

کچھ بھی تھا' وہ اب پہلے جیسی سحرش تو رہی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آفتاب سردار کی صورت میں جو آسیب باپ بیٹی کو چمٹ گیا تھا' وہ خود بخود ہی اپنے شکار کو چھوڑ گیا۔ ظاہر ہے کہ جب ہدف ہی نہیں رہا تھا تو ''دشمن ہاتھ'' کمان کس لیے کھینچتے۔ چند مہینوں میں ہی بدباطن آفتاب سردار کی وجہ سے پیدا ہونے والے سارے مسئلے آپوں آپ حل ہو گئے یا پس

منظر میں چلے گئے۔

ان واقعات کے قریباً ایک سال بعد احمد رضا نے بڑی خاموشی سے بیٹی کی شادی کر دی۔ اپنے شاگردوں میں سے ہی ایک درمیانی شکل صورت کا ضرورت مند لڑکا دیکھ کر انہوں نے سحرش کے ہاتھ پیلے کر دیے۔ سنہری خوابوں کے وہ سارے محل مسمار ہو چکے تھے جو احمد رضا نے کبھی اپنی دلکش بیٹی کے لیے بنائے تھے۔ اب تو بس زندگی گزارنے کے لیے ایک چھت اور چار دیواری کی ضرورت تھی۔

نازک مزاج اور بے حد حساس سحرش اپنے جسمانی عیب سے کبھی مطابقت پیدا نہ کر سکی۔ ایک احساس کمتری تھا جو اسے ہمیشہ گھن کی طرح چاٹتا رہتا تھا۔ پھر ایک ستم یہ بھی ہوا کہ میاں بیوی اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں تو زندگی کا لازمی جزو ہوتی ہیں۔ یہ خوشیاں سحرش کو بھی ملتی رہیں لیکن پھر ایک دن ایک بڑا غم اس کے سامنے آ گیا۔ اس کی پنڈلی کی چوٹ جیسے پھر سے ہری ہو گئی۔ ٹیسٹوں کے بعد پتا چلا کہ اسے سرطان ہے۔ یہ ہڈی کا سرطان تھا۔ اس کے بعد کے واقعات بڑی تیزی سے رونما ہوئے۔ اس تیزی سے جس تیزی سے کبھی سحرش اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھتی تھی‘ اپنے لان میں بھاگتی تھی اور اپنے ابو کے ساتھ کھیلتی کودتی تھی۔ ٹیسٹ‘ اسپتال‘ آپریشن ...... پھر ٹیسٹ پھر اسپتال۔ بس دو سال کے دورانیے کا ایک جان لیوا چکر تھا۔ اس جان لیوا چکر کا اختتام اٹلی روانگی پر ہوا۔ بھائی نے جاں بہ لب بہن کے لیے آخری کوششیں کرنا چاہی تھیں اور باپ سمیت اسے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اٹلی میں سحرش بس ایک سال اور زندہ رہی۔

☆☆☆

وقت مدام چلتا رہتا ہے۔ رات اور دن کے چولے بدلتا‘ نئے نئے واقعات کو وجود دیتا‘ پرانے واقعات کو گرد میں ڈھانپتا‘ یہ سدا حرکت میں رہتا ہے۔ اٹلی کے ایک مسلم قبرستان میں ایک جواں سال لڑکی کی قبر بننے کے بعد بھی وقت حرکت میں رہا۔ صبح اور شام کے رنگ آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ درختوں پر پرندے چہکتے رہے۔ جھرنوں میں پانی بہتا رہا۔ موسم آتے اور جاتے رہے۔ اسی طرح دس برس گزر گئے۔ بہت کم لوگوں کو یاد رہا کہ لاہور کے ایک پرسکون گوشے میں ایک اسٹائلش گھر تھا جہاں معروف مصور احمد رضا اپنی خوش رو بیٹی سحرش رضا کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ سفید براق یونیفارم پہن کر کالج جاتی تھی اور وہ بالائی منزل کی کھڑکی میں بیٹھ کر اس کی راہ تکتا تھا۔ باپ بیٹی ایک دوسرے کی کل کائنات تھے۔ پھر ایک روز باپ کی کائنات ایک حادثے کا شکار ہو کر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

ہاں...... بہت کم لوگوں کو یہ یاد رہا اور یہ بات تو دو تین افراد کے سوا کسی کو معلوم ہی نہیں تھی کہ احمد رضا کی کائنات اس شخص کے سبب تباہ ہوئی جس کا نام آفتاب سردار ہے۔ اسی کی پھیلائی ہوئی مایوسیوں کی زہریلی دھند میں وہ بے چاری ٹھوکر کھا کر ایک سانحے کی گود میں گری اور اٹھ نہ سکی۔ ہاں‘ وہی آفتاب سردار جو اخلاقی قدروں کا علمبردار اور بہت بڑا ’’سماج دوست‘‘ بن کر لاہور کی سڑکوں پر دندناتا ہے۔ جس کے اردگرد وفاکیشوں اور اطاعت گزاروں کے جمگھٹے ہوتے ہیں اور جب کسی کو یہ معلوم ہی نہیں تھا تو پھر کوئی آفتاب سردار کے حوالے سے جرم وسزا کے فلسفے پر کیسے غور کر سکتا تھا۔ کسی کے ذہن میں یہ بات کیسے آ سکتی تھی کہ ہر عمل کا ردِعمل ہوتا ہے اور کمزور ونا تواں چیونٹی کو بھی مسلا جائے تو وہ مزاحمت کا حق ادا کرتی ہے۔

حقیقت اپنی جگہ پر موجود تھی اور حقیقت یہ تھی کہ کچھ عرصہ پہلے ایک چیونٹی کو مسلا گیا تھا...... وہ چیونٹی مزاحمت اور بدلے کا حق محفوظ رکھتی تھی۔

☆☆☆

وہ بہار کی ایک خوبصورت شام تھی۔ لاہور رنگوں اور خوشبوؤں کی لپیٹ میں تھا۔ نہر کے نزدیک آفتاب سردار کی محل نما کوٹھی سبزے میں گھری ہوئی اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی ایک خوشنما منظر پیش کرتی تھی لیکن یہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ جو گھر باہر سے خوبصورت و پرسکون لگیں‘ وہ اندر سے بھی آرام دہ وسکون بخش ہوں۔ آفتاب سردار کی محل نما کوٹھی بھی اندر سے پرسکون نہیں تھی۔ وہاں ایک بہت بڑی ہلچل رونما ہو چکی تھی۔ ایک گمبھیر طوفان آ چکا تھا۔ آفتاب سردار کی اکلوتی بہن ڈاکٹر رخشندہ سردار سوجی ہوئی سرخ آنکھوں اور تمتمائے چہرے کے ساتھ اپنی قریبی سہیلی ماہم کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں بیٹھی تھی۔ خوبرو رخشندہ سردار کی عمر اب تیس کے قریب تھی لیکن دیکھنے میں وہ پچیس چھبیس کی ہی نظر آتی تھی۔ چار پانچ برس پہلے اس کی شادی نیوی کے ایک بہت بڑے افسر سے ہوئی تھی لیکن بہ وجوہ دو تین ماہ میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس وقت سے رخشندہ مجرد زندگی گزار رہی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت تصویریں پینٹ کرنے یا میوزک سننے میں گزرتا تھا۔

یہ کوئی پانچ چھ مہینے پہلے کی بات ہے جب رخشندہ کی زندگی ایکا ایکی ایک انقلابی تبدیلی سے روشناس ہوئی تھی۔ شروع میں یہ ’’تبدیلی‘‘ بہ ذریعہ انٹرنیٹ رخشندہ کی زندگی

میں داخل ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے رخشندہ سرتاپا اس تبدیلی کی لپیٹ میں آ گئی۔ اس تبدیلی نے رخشندہ کو تو بے طرح متاثر کیا ہی تھا' اس کے گھرانے بلکہ پوری فیملی کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ ایک زلزلہ تھا جو پچھلے پانچ چھ ماہ سے گاہے گاہے ان بہ ظاہر پرسکون دیواروں کے اندر ٹہلکہ مچاتا تھا اور ہر شے کو لرزا دیتا تھا۔ اس وقت بھی رخشندہ اپنی قریبی سہیلی کے ساتھ اسی موضوع پر بات کر رہی تھی۔

وہ روہانسی آواز میں کہہ رہی تھی ''ماہم! میں سب کچھ سمجھتی ہوں' سب کچھ جانتی ہوں۔ مجھے پتا ہے' وہ عمر میں مجھ سے دگنا بڑے ہیں۔ میں تمہاری اس بات کو بھی رد نہیں کرتی کہ ماضی میں احمد رضا صاحب اور بھائی جان میں کسی طرح کا تنازع پیدا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ میرا یہ فیصلہ شاید تمہارے سمیت کسی کو پسند نہیں ہے لیکن..... لیکن مجھے یہ فیصلہ کرنا ہے..... مم..... میں بہت آگے نکل چکی ہوں ماہم! اب واپسی میرے لیے ممکن نہیں' کسی صورت ممکن نہیں۔''

''لیکن رخشی! یہ بھی تو دیکھو اس میں جگ ہنسائی ہے۔ سب سے بڑھ کر اس میں تمہارے بھائی جان کی عزت اور وقار کا سوال ہے۔''

''کوئی عزت و وقار کا سوال نہیں ہے ماہم!'' رخشندہ تیزی سے بولی ''کیا عورتیں اور لڑکیاں بڑی عمر کے مردوں سے شادی نہیں کرتیں؟ کیا میری یہ شادی روئے زمین پر پہلی ہوگی۔ اور تو اور ہمارے اپنے خاندان میں کم از کم ایسی دس شادیاں میں تمہیں گنوا سکتی ہوں۔ یہ سب ہلکی پھلکی باتیں ہیں ماہم! ذرا سا وزن نہیں ہے ان میں..... اگر وزن ہے تو اس حقیقت میں ہے کہ وہ ایک بے حد اچھے' بے حد نفیس انسان ہیں اور میں انہیں دل کی گہرائیوں سے پسند کرتی ہوں۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں ماہم! ان کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک دن بتانے کے لیے میں اپنی پوری زندگی قربان کر سکتی ہوں۔''

ماہم نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا ''کتنی جلد کتنا بدل گئی ہو رخشندہ۔ یقین نہیں آتا۔''

اس سے پہلے کہ رخشندہ جواب میں کچھ کہتی' اس کے موبائل کی ''وائبریشن'' نے بتایا کہ کال آئی ہے۔ رخشندہ نے نمبر دیکھا اور اس کی بھیگی آنکھوں میں سچے موتیوں کی چمک نمودار ہوگئی۔ چہرے پر ایک انوکھی روشنی پھیلی۔ یہ اوورسیز کال ہالینڈ سے آئی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی ''ہیلو رضا صاحب! کیسے ہیں آپ..... جی..... جی..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ نے کل فون کیوں نہیں کیا؟''

جس وقت رخشندہ کی خواب گاہ میں یہ باتیں ہو رہی تھیں' کوٹھی کے ایک قریبی کمرے میں آفتاب سردار اپنے ہاتھ پشت پر باندھے زخمی شیر کی طرح چکر لگا رہا تھا۔ اس کی بہن نے پوری طاقت کے ساتھ علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ وہ بالغ تھی' تعلیم یافتہ اور میچور تھی۔ اس کا اپنا حلقۂ احباب تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ آفتاب سردار کی بہن تھی۔ آفتاب کے ماتھے پر پسینے آ رہے تھے۔ سارے جسم پر لرزاطاری تھا۔

تین دن بعد صبح کے وقت ملک بھر کے چھوٹے بڑے اخبارات ایک چٹکھاڑتی دہاڑتی خبر کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ایک بڑے اخبار کی سرخی یہ تھی ''آفتاب سردار کی ہمشیرہ ڈاکٹر رخشندہ سردار گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ قریبی ذرائع کے مطابق وہ ایمسٹرڈیم پہنچ چکی ہیں۔''

مختلف خبروں کے متن کا مفہوم کچھ اس طرح تھا ''باخبر ذرائع کے مطابق ملک کے جانے پہچانے مصور احمد رضا آج کل ہالینڈ میں مقیم ہیں۔ رخشندہ سردار ان کی پرانی فین تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے انٹرنیٹ پر احمد رضا اور رخشندہ سردار کا رابطہ ہوا۔ یہ رابطہ جلد ہی ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی میں ڈھل گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ دو ڈھائی ماہ پہلے ہی رخشندہ سردار نے مصور احمد رضا کو شریک حیات بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس فیصلے کے بعد سردار گھرانے میں اختلافات پیدا ہوئے جو بہ تدریج سنگین شکل اختیار کر گئے۔ احمد رضا اور رخشندہ سردار کی عمروں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس کے علاوہ اسٹیٹس اور خاندانی پس منظر کا تفاوت بھی نمایاں ہے۔ یاد رہے کہ چند ہفتے قبل رخشندہ سردار کو تشویش ناک حالت میں اسپتال بھی داخل کرایا گیا تھا۔ اس وقت میڈیا کی طرف سے یہ قیاس آرائی کی گئی تھی کہ شاید یہ خودکشی کی کوشش ہے۔ بہرحال خاندانی ذرائع کی طرف سے اس خبر کی سختی کے ساتھ تردید کی گئی تھی۔ آج اس طویل کشمکش کا ڈراپ سین اس شکل میں ہوا ہے کہ رخشندہ سردار ہالینڈ پہنچ گئی ہیں۔ معتبر ذرائع کے مطابق آئندہ چند دنوں میں ہالینڈ میں کسی مقام پر احمد رضا اور ڈاکٹر رخشندہ' رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والے ہیں۔''

شہ زور آفتاب سردار اور کمزور احمد رضا کی کشاکش اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی تھی۔ کہنے والے نے سچ کہا ہے کہ ''مدّ زور پانی کی طرح'' ناانصافی اور زیادتی کا ''ردِعمل'' بھی اپنے لیے کوئی نہ کوئی مناسب نا مناسب راستہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔

خطرناک

ایس ایم شجاع رضوی

اپنے دفاع میں اٹھایا گیا کوئی بھی قدم قانون کی نگاہ میں کبھی جرم نہیں قرار پاتا۔ چاہے وہ جان لینے جیسا انتہائی اقدام ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے بھی اس قانونی موشگافی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

ٹیلی فون سے نالاں ایک بوڑھی بیمار اور معذور عورت کا غیر معمولی واقعہ

''نہیں' بہت شکریہ..... مجھے ٹیلی فون کی ضرورت نہیں۔ یہ بہت خطرناک چیز ہے۔'' مس ایملی نے قطعی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ویلفیئر آرگنائزیشن کی نوجوان ورکر نے فارم بھرتے بھرتے حیرت سے پلکیں جھپکا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے حال ہی میں اپنی ٹریننگ مکمل کی تھی اور پہلی مرتبہ بوڑھے افراد کے لیے بنائے جانے والے اس شیلٹرڈ ہاؤسنگ یونٹ کے لیے کام کر رہی تھی۔

''ٹیلی فون نہیں چاہیے؟'' اس نے حیرت سے کہا ''لیکن مس ایملی! آپ جیسی..... میرا مطلب ہے کہ آپ بیمار رہتی ہیں۔ آپ کے جوڑوں میں درد رہتا ہے جس کی وجہ سے آپ ٹھیک طرح سے چل پھر بھی نہیں سکتیں۔ آپ کے لیے تو ٹیلی فون انتہائی ضروری ہے۔ آپ ہماری لسٹ پر ہیں۔ ہمارا ڈیپارٹمنٹ اس کے اخراجات خود برداشت کرے گا..... آپ سمجھ گئیں نا؟ میرا مطلب ہے کہ یہ آپ کی ضرورت ہے..... باہر کی دنیا سے آپ کے رابطے کا واحد ذریعہ ہے۔''

یہ آخری جملہ ویلری نے اپنے کورس کے دوران سیکھا تھا۔ اسے ادا کرتے ہوئے وہ خود کو خاصا پراعتماد محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ آپ کے پاس ٹیلی فون ضرور ہونا چاہیے مس ایملی! یہ آپ کا حق ہے۔ ہمارا ڈیپارٹمنٹ پینسٹھ سال سے زیادہ عمر کے ایسے لوگوں کو جو ضرورت مند ہیں.....''

یہ کیس بلاشبہ انتہائی ضرورت مندی کا ہی تھا۔ ویلری نے اپنی فائل میں موجود کاغذات پر جلدی سے ایک نظر دوڑائی۔

''ایملی جان! ریٹائرڈ ڈریس میکر' غیر شادی شدہ' کوئی رشتے دار موجود نہیں۔ سو فیصد معذور' آرتھرائٹس' ذیابیطس' ہائپر ٹینشن.....''

فائل میں موجود نوٹس پر نظر ڈالنے کے بعد ویلری کا یقین اس کی ضرورت مندی پر اور بھی پختہ ہو گیا۔ اس نے ایک نئے عزم کے ساتھ سر اٹھا کر اپنے سامنے موجود بڑی بی کو دیکھا جو اپنی گدلی گدلی آنکھوں سے اسی کو گھور رہی تھیں۔

یہ بوڑھے اور بیمار لوگ آخر خود کو بوڑھا اور بیمار کیوں نہیں سمجھتے؟ اس نے کچھ حیرت اور کچھ مایوسی سے سوچا۔

''مس ایملی! فرض کریں کہ اگر کبھی آپ بیمار ہو جاتی ہیں؟'' اس نے محتاط لہجے میں کہا ''فرض کریں۔''

''اس میں فرض کرنے کی کیا بات ہے؟'' مس ایملی

نے ترشی سے کہا ''میں واقعی بیمار ہوں۔ کئی برس سے بیمار ہوں اور روز بروز مزید بیمار ہوتی جارہی ہوں۔ بڑھاپے میں تو ایسا ہی ہوتا ہے لیکن میں ٹیلی فون کیوں لگواؤں؟''

ویلری کے ذہن کو ایک بار پھر جھٹکا سا لگا۔ اسے کورس کے دوران پڑھے ہوئے نوٹس یاد آنے لگے۔ جس میں ایسے افراد کے متعلق خبردار کیا گیا تھا جو تنہائی، ذہنی ابتری اور کسی قسم کے ڈر، خوف کا شکار ہوتے ہیں۔

''یہ بہت آسان کام ہے'' اس کے آفیسر نے اسے کام کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا۔ ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد یہ ویلری کا پہلا اسائنمنٹ تھا جس میں شیلٹرڈ ہاؤسنگ یونٹ کے ہر فلیٹ کے دروازے پر جانا تھا اور ایسے افراد کے لیے فری ٹیلی فون لگوانے کا انتظام کرنا تھا جو اس کے مستحق تھے، ضعیف العمری کی وجہ سے یا معذوری کی وجہ سے..... یا پھر دونوں وجوہ کی بنا پر۔

وہ اپنے ذہن میں یہ تصور لیے کام پر نکلی تھی کہ جب وہ کسی معذور بوڑھے کو یہ خوش خبری سنائے گی کہ وہ اس کے لیے مفت ٹیلی فون لگوانے کے لیے آئی ہے تو وہ اپنی بوڑھی آنکھوں میں تشکر کے آنسو بھر کے شفقت سے اس کی طرف دیکھے گا..... اور اس کا انتہائی شکریہ ادا کرے گا۔

لیکن اسے تو پہلے دروازے پر ہی بری طرح مایوسی کا سامنا ہوا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ مس ایملی جیسی عمر رسیدہ اور بے یار و مددگار عورت اس کی توقع کے خلاف آخر اس طرح کیوں پیش آرہی تھی؟

''مس ایملی! آپ کے پاس ٹیلی فون ہونا چاہیے'' اس نے ایک بار پھر مختلف انداز سے اپنی بات دہرائی ''میرا مطلب ہے کہ جیسی آپ کی کیفیت ہے اس کے پیش نظر اگر کبھی آپ کو ڈاکٹر کی ضرورت پڑی؟''

''مجھے اب ڈاکٹر کی ضرورت نہیں پڑتی..... ڈاکٹر میرے لیے بھلا کیا کرے گا؟'' مس ایملی نے خشک لہجے میں کہا ''تم نے اپنی فائل میں دیکھا ہی ہوگا کہ مجھے کون کون سی بیماریاں ہیں اور میری عمر کتنی ہوچکی ہے۔ کسی ڈاکٹر کے پاس ان باتوں کا علاج نہیں..... تو پھر میں کیوں خواہ مخواہ کسی ڈاکٹر کو بلانے کا تردد کروں؟''

شدت پسند، ضدی، اپنے ہی مفاد سے بے خبر! اسے کورس کے دوران بڑھتی ہوئی عمر سے تعلق رکھنے والے ان مسائل کے بارے میں بتایا گیا تھا لیکن مسائل کے حل کے بارے میں کوئی ایک ایسا کلیہ یا قانون موجود نہیں تھا جس کا اطلاق ہر ایسے شخص پر کیا جاسکتا جو ان مسائل کا شکار ہو۔ اس بارے میں آپ کو خود ہی فیصلہ کرنا تھا کہ کب اور کہاں کیا قدم اٹھانا تھا!

اسے سکھایا گیا تھا کہ ایسے افراد کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھتے ہوئے اپنے موقف پر ڈٹے رہنا تھا مگر ان سے بحث ہرگز نہیں کرنی تھی..... ویلری نے ایسا ہی کیا اور بالآخر پیار و محبت سے مس ایملی کو فری ٹیلی فون لگوانے پر راضی کرلیا۔

''خدا حافظ مس ایملی! مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد اچھی ہوجائیں گی۔'' اس نے رخصت ہوتے ہوئے خوش دلی سے کہا تھا۔ اس کے بعد وہ تیزی سے وہاں سے روانہ ہوگئی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے پیچھے مس ایملی کی بڑبڑاہٹ نہیں سنی تھی جو کہہ رہی تھی ''اچھی ہوجاؤں گی! ہونہہ..... اس عمر میں اچھے ہونے کا بھلا کیا سوال..... میری حالت تو اب روز بہ روز مزید خراب ہوتی جائے گی۔ کیا تمہیں ٹریننگ کے دوران یہی جھوٹ بولنا سکھایا گیا ہے؟''

☆☆☆

''کتنا اچھا دن ہے آج؟'' ویلری نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے مسرت بھرے لہجے میں کہا ''اس وقت وہ اسٹاف کینٹین میں لنچ کے لیے اپنے ساتھیوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ اس نے کہا ''آج میرے کام کا پہلا دن تھا اور پتا ہے..... آج ہی میرا سابقہ ایک ایسی بوڑھی عورت سے پڑا جس کی عمر اسی سال سے بھی زیادہ تھی۔ اس کا نام فری ٹیلی فون کے لیے ہماری مستحق افراد کی فہرست میں موجود تھا لیکن جب میں اس کے پاس گئی تو پتا ہے اس نے کیا کہا؟''

سب لوگ ویلری کی طرف متوجہ ہوگئے۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور بالکل مس ایملی کے الفاظ میں اس کی نقل اتارنے لگی۔ ''نہیں..... بہت شکریہ..... مجھے ٹیلی فون کی ضرورت نہیں..... یہ بہت خطرناک چیز ہے۔''

بہت خطرناک چیز ہے! یہ بات سنتے ہی وہ سب آپس میں مختلف تبصرے کرنے لگے۔ بے آواز کالوں کا ذکر ہونے لگا۔ آدھی رات کے بعد سنائی دینے والی مردانہ سانسوں کی آواز پر تبصرے ہونے لگے۔ غرض سب ہی اپنے اپنے تجربات یا دوسروں سے سنے سنائے واقعات بیان کرنے لگے۔ بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور ویلری بڑی مشکل سے ان سب کو دوبارہ موضوع پر لائی۔

سب کا خیال یہی تھا کہ اگر اس عمر میں بڑی بی کے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے تو یہ ان کی خوش قسمتی ہوگی! وہ سب اس واقعے کو ہلکے پھلکے انداز میں لے رہے تھے اور اس سے لطف اٹھا رہے تھے تاکہ اپنے اپنے کام کی ٹینشن کم کرسکیں۔

مگر کئی لڑکیوں کو ایسے واقعات بھی یاد تھے کہ کئی عمر رسیدہ خواتین کو بھی مختلف انداز سے تشدد کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا گیا تھا لیکن ایسے واقعات کم ہی ہوتے تھے۔

☆☆☆

ٹیلی فون لگنے کے تقریباً تین ماہ بعد مس ایملی نے فون پر بھاری بھاری مردانہ سانسوں کی آواز سنی..... وہ اتوار کی رات تھی اور آدھی رات کا وقت تھا۔ گمنام کالیں عموماً ایسے ہی وقت آیا کرتی ہیں۔ مس ایملی اس وقت تک سونے کے لیے بستر پر نہیں لیٹی تھیں۔ وہ اپنی بڑی سی آرام کرسی پر اونگھ رہی تھیں۔ آج وہ بہت تھکی ہوئی تھیں۔ انہیں اپنا لباس تبدیل کرنا اور بستر تیار کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

آج کا دن ان کے لیے بہت تھکا دینے والا تھا۔ اتوار کے روز شیلٹرڈ ہاؤسنگ کے مکینوں کو ان کے اعزا یا دوست احباب اپنے ساتھ اپنے اپنے گھر لے جاتے تھے۔ جہاں وہ کچھ وقت اپنے پیاروں اور عزیزوں کے ساتھ باہر کی دنیا میں گزارتے تھے وہ دنیا جو انہیں مسترد کر چکی تھی۔

ایملی اس بات سے اچھی طرح واقف تھی کہ باہر کی دنیا میں اب اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کے باوجود جب ہر چھ ہفتے بعد اس کی پرانی دوست گلیڈی اپنے شوہر کے ساتھ اسے لینے آتی تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کیوں اس کے ساتھ اس کے گھر چلی آتی۔

وہ دونوں میاں بیوی شاید یہ سمجھتے تھے کہ ایملی ان کے ساتھ کچھ وقت گزار کے اور شام کی چائے پی کے بہت خوشی محسوس کرتی ہوگی..... جبکہ وہ ان دونوں کو ایک ساتھ زندگی گزارتے دیکھ کر رشک محسوس کرتی تھی کیونکہ بیاسی سال کی ایک تن تنہا عورت کسی کی بھی شادی شدہ گھریلو زندگی کو رشک کی نظر سے ہی دیکھ سکتی تھی چاہے وہ زندگی کتنی ہی ناخوشگوار بلکہ ناقابل برداشت ہی کیوں نہ ہو۔

خاص طور پر اس صورت میں جبکہ وہ شادی ایک دوست نے دوسری دوست کا منگیتر چھین کر کی ہو۔

ایملی کو وہ دن اس طرح یاد تھا جیسے وہ کل ہی کی بات ہو۔ جب اس نے اپنے منگیتر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ وہ ایک فوجی تھا' دراز قد اور ہینڈسم..... خاکی یونیفارم اس پر بہت جچتی تھی۔

''وہ کہتا ہے کہ تم اس کی ہم مزاج نہیں ہو'' گلیڈی نے ایک شام اپنی خوشی کو بہ مشکل اس سے چھپاتے ہوئے کہا تھا۔ اسے ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ وہ اپنی بچپن کی دوست سے اس کی زندگی کی واحد خوشی بھی چھین رہی تھی۔ اس کی زبان پر تو صرف یہی الفاظ تھے' ''وہ کہتا ہے.....''

اس کے بعد کی تفصیلات کچھ خاص نہیں تھیں۔ ایملی یہ صدمہ خاموشی سے پی گئی تھی۔ اسے گلیڈی سے بہت زیادہ شکایت بھی نہیں تھی..... جب اس کا منگیتر ہی اس کا وفادار نہیں تھا تو پھر کسی دوسرے سے کیسی شکایت!

وہ اس صدمے کو بھلا تو نہیں پائی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ صدمہ ماند پڑتا گیا تھا۔ اب اس کے دل میں صرف ایک موہوم سی کسک باقی تھی ورنہ کچھ تو وقت کی گرد نے اس کے جذبات دھندلا دیے تھے اور کچھ اپنے سابقہ منگیتر کے بارے میں اس کی رائے بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔

بلکہ اسے تو گلیڈی پر حیرت ہوتی تھی اس نے کس طرح پچپن سال سے اس شادی کو قائم رکھا ہوا تھا؟ ظاہر ہے کہ نہ تو اس نے گلیڈی سے اس بارے میں کوئی سوال کیا تھا اور نہ ہی گلیڈی نے کبھی اس موضوع پر کوئی بات کی تھی مگر اس کے باوجود ان دونوں میاں بیوی کے انداز سے یہ بات عیاں تھی کہ وہ محض ایک دوسرے کو برداشت کر رہے تھے۔

اس اتوار کو ان کے گھر جانا ایملی کے لیے معمول سے زیادہ تھکا دینے والا ثابت ہوا تھا۔ اس شام چائے کے ساتھ سادہ کیک یا بسکٹ کے بجائے ڈرائی فروٹ کیک تھا۔ وہ ڈرائی فروٹ ایملی کے مسوڑوں سے چپک کر رہ گئے اور وہ خواہ مخواہ تکلیف اور شرمندگی سے دوچار ہوگئی تھی۔ اس پر گلیڈی نے بجائے اس سے معذرت کرنے کے کہا کہ آئندہ میں تمہارے لیے انگوروں والا کیک بناؤں گی۔

اسکول میں ایک کلاس کے بچوں کو کسی سواری کے بارے میں تقریباً ڈھائی سو الفاظ پر مشتمل ایک مضمون لکھنے کے لیے کہا گیا۔ ایک بچی نے لکھا:

''میرے ابو نے ایک پرانی کار خریدی۔ پہلی رات وہ ہمیں اس میں بٹھا کر سپر ہائی وے پر بہت دور ایک ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گئے۔ راستے میں کار خراب ہوگئی۔ ہمیں کوئی دوسری سواری بھی نہیں ملی اور کسی نے ہمیں لفٹ بھی نہیں دی۔ ہمیں کئی میل تک پیدل چلنا پڑا..... مس! یہ تقریباً پچاس الفاظ ہو گئے..... تقریباً دو سو الفاظ وہ ہیں جو راستے میں ابو نے بولے..... مگر وہ لکھنے کے قابل نہیں ہیں.....''

اس کے علاوہ کار کے لمبے سفر اور بوریت نے اس کو تھکا ڈالا۔ گھر پہنچنے کے بعد اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ چائے کا ایک کپ بنا کر پی لے یا ٹی وی کھول کے اس کے آگے بیٹھ جائے۔ اس کا دل بس یہی چاہ رہا تھا کہ اپنی آرام کرسی میں سکون سے بیٹھی سونے کا وقت ہو جانے کا انتظار کرتی رہے۔

وہ ابھی سے سونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بہت پہلے سن رکھا تھا کہ جب آپ بوڑھے ہو جائیں تو پیسوں کی طرح نیند کا بھی حساب کتاب رکھیں۔ اگر آپ دن میں سو گئے تو اس کے نتیجے میں رات بھر جاگتے ہی رہیں گے۔ لہٰذا وہ اپنی آرام کرسی میں بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں سوچتی رہی تاکہ پونے دس ہو جائیں تو پھر وہ سونے کی تیاری کرے۔

مگر بڑھاپے میں تھکے ہوئے جسم اور تھکے ہوئے ذہن کو زبردستی جگائے رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ آہستہ آہستہ اس کا سر سینے کی طرف جھکتا چلا گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

مگر غنودگی کے عالم میں بھی اس کے اندر ایک بے چینی سی تھی..... اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اسے کوئی بہت ضروری نوعیت کا کام درپیش تھا۔ جیسے اسے کوئی ٹرین پکڑنی تھی یا جیسے وہ گھر کا دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی یا کوئی اور اہم کام کرنے سے رہ گیا تھا۔

پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے دماغ پر دستک دے رہا تھا۔ وہ ٹیلی فون کی گھنٹی تھی جس نے اسے جگایا تھا لیکن جاگنے کے بعد بھی اس کا ذہن کچھ دیر تک سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکا تھا۔ چند لمحوں تک وہ یونہی بے حس و حرکت اپنی کرسی پر بیٹھی رہی۔

وہ کہاں تھی؟ کیا کر رہی تھی؟ پھر آہستہ آہستہ اس کے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا..... وہ اپنے کمرے میں اپنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ آج اتوار کی رات تھی اور وہ گلیڈی کے گھر سے بخیر و عافیت واپس اپنے گھر آ چکی تھی۔ ایک تکلیف دہ شام گزارنے کے بعد اور ابھی دوبارہ اس کے گھر جانے میں چھ ہفتے پڑے تھے۔ اس عرصے میں وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر وہاں جانے یا نہ جانے کے بارے میں فیصلہ کر سکتی تھی لہٰذا ابھی سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی پھر اس کا دل اتنی زور زور سے کیوں دھڑک رہا تھا؟

ہاں، ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی اور مسلسل بجے ہی چلی جا رہی تھی جیسے کبھی بند ہی نہیں ہو گی۔ وہ سوچنے لگی کہ اس وقت اسے کون فون کر سکتا تھا؟ پھر اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بج چکے تھے۔

اوہ! آدھی رات ہو گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے اونگھتے اونگھتے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ ایسی نیند تو اسے کبھی نیند کی گولیاں کھا کر بھی نہیں آئی تھی۔

.....اور ٹیلی فون کی گھنٹی ابھی تک بج رہی تھی..... اس کا ذہن اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اسے فون کا جواب دینا تھا۔

''ہیلو؟'' اس کے گلے سے تقریباً سرگوشی جیسی آواز برآمد ہوئی۔ نیند کی وجہ سے اس کی آواز بیٹھی بیٹھی سی ہو رہی تھی۔ اس نے عادتاً کہا ''ایملی جان!'' پھر اپنا فون نمبر دہرایا۔

مگر دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ بس کسی کے سانسوں کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر وہ آواز ذرا تیز ہو گئی۔ ایملی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے کانوں کے پردے سے کسی دریا کی لہروں کی آواز ٹکرا رہی تھی۔

کئی لمحوں تک وہ یونہی خاموش بیٹھی رہی۔ جس ہاتھ سے اس نے ریسیور تھام رکھا تھا، آہستہ آہستہ وہ پسینے سے بھیگ گیا۔ اس کے ذہن میں مختلف خیالات گردش کرنے لگے۔

اسے زندگی کے مختلف مواقع پر، پہلے بھی ایسی کالیں متعدد بار موصول ہوئی تھیں اور وہ جانتی تھی کہ ان سے نمٹنے کا کوئی خاص طریقہ موجود نہیں تھا۔ اگر آپ کچھ بھی کہے بغیر ریسیور رکھ دیں تو رات کو پھر کسی وقت آپ کو تنگ کیا جائے گا..... اور اگر آپ نے بات کر لی تو پھر فضول گفتگو کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ بے ہودہ تجاویز پیش کی جائیں گی۔

بہرصورت حال ایک تنہا رہنے والی بوڑھی اور بیمار عورت کے لیے خاصی اعصاب شکن تھی۔ ایملی نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ تخت یا تختہ!

''سنو!'' اس نے اپنی آواز کی لرزش پر حتی الامکان قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا ''میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو اور کیوں مجھے فون کر رہے ہو لیکن میرا خیال ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں بتا دوں کہ میری عمر بیاسی سال ہے۔ میں بالکل تنہا رہتی ہوں، مستقل مریضہ ہوں اور اب پولیس کو بلانے والی ہوں۔''

دوسری جانب سے چند لمحوں کے بعد ریسیور رکھنے کی آواز سنائی دی اور ایملی نے سکون کی سانس لی۔ پھر وہ سوچنے لگی کہ کیا اس گمنام کال والے نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا ہو گا؟ جبکہ اس کا لہجہ خود یقین سے عاری تھا..... شاید وہ دل ہی دل میں یہ سمجھ رہا ہو کہ اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

بالکل اسی طرح پانچ سال پہلے ہوا تھا یا شاید چھ سال پہلے..... جب وہ ایک اور فلیٹ میں رہا کرتی تھی۔ اس رات

کے بارے میں یاد کر کے وہ ابھی تک کانپ جایا کرتی تھی ......
اس کے بعد ایک اور مرتبہ، چند سال پہلے جب وہ وینڈرورتھ کے ایک فلیٹ میں منتقل ہوئی تھی۔ وہاں بھی اسی طرح نیا نیا فون لگا تھا۔

بہرحال، میں نے اس چرب زبان، ویلفیئر ورکر کو پہلے ہی ٹال دیا تھا۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے اسے خبردار نہیں کیا تھا کہ ٹیلی فون ایک خطرناک چیز ہے مگر تین سالہ ٹریننگ کورس مکمل کرنے کے بعد شاید وہ سمجھتی تھی کہ وہ ہر بات بہتر جانتی ہے!

ٹریننگ کورس بلاشبہ اہمیت رکھتا ہے مگر کیا زندگی خود ایک زیادہ مشکل اور زیادہ اہم ٹریننگ کورس نہیں؟

تقریباً ایک بج رہا تھا مگر ایملی نے اب تک لباس تبدیل کیا تھا اور نہ سونے کی کوئی تیاری کی تھی۔ اسے ٹیلی فون رکھے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا مگر وہ اب تک پرسکون نہیں ہو پائی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہے لیکن پھر اس نے خود کو سمجھایا کہ یہ اس کا وہم تھا۔ کوئی یقینی بات نہیں تھی۔ لہٰذا سونے کی تیاری کر لی جائے تو بہتر ہوگا۔

اس نے لائٹ بند کر دی، اس طرح وہ خود کو زیادہ محفوظ محسوس کرنے لگی اور سردی سے بچنے کے لیے ایک کمبل اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا لیکن اس کے بعد بھی وہ سوئی نہیں بلکہ جاگتی رہی اور کسی انہونی کا انتظار کرتی رہی۔

اس وقت پوری بلڈنگ پر بالکل خاموشی طاری تھی۔ نہ قدموں کی کوئی آہٹ تھی، نہ دروازے بند ہونے کی آواز تھی اور نہ ہی کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس وقت تک بلڈنگ کا کیئر ٹیکر بھی سونے کے لیے نیچے بوائلر روم میں چلا جاتا تھا۔

ایملی، اس سے پہلے کبھی اس وقت تک اس طرح نہیں جاگی تھی۔ یکایک اس پر سر سے پاؤں تک کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اس مرتبہ کچھ ہوا تو شاید وہ بچ نہیں پائے گی...... دس سال پہلے تک...... بلکہ پانچ سال پہلے تک وہ باآسانی چل پھر سکتی تھی۔ دروازے سے باہر نکل سکتی تھی، گھر سے دور جا سکتی تھی اور چاہتی تو کئی روز تک گھر سے دور کہیں اور رہ سکتی تھی۔

لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ اب وہ چلنے پھرنے سے تقریباً معذور ہو چکی تھی۔ جیسے ہی یہ خیال اس کے ذہن میں آیا وہ ایک دم ہوشیار ہو کر بیٹھ گئی۔ کیونکہ اس کے کانوں میں ایک آواز آئی تھی۔ وہ آواز بالکل صاف اور واضح تھی۔ وہ باآسانی پہچان سکتی تھی کہ وہ آواز اس کے دروازے کا ہینڈل گھمانے کی تھی...... کوئی خاموشی سے اس کے دروازے کا ہینڈل گھما رہا تھا۔

سناٹے میں وہ آواز اسے بخوبی سنائی دے رہی تھی۔

ایملی نے بڑی احتیاط سے سائڈ ٹیبل کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر اندھیرے کے باوجود وہ لمبا سا چاقو اٹھالیا جو ہر وقت اسی جگہ رکھا رہتا تھا۔

ویسے یہ سب کرتے ہوئے اسے تھوڑا تاسف تو ضرور ہوتا تھا کہ فون پر ان سے اچھی طرح بات کرنے اور انہیں اپنا نام اور اپنے بارے میں ساری تفصیل بتانے کے بعد انہیں یہ تاثر دینا کہ وہ کوئی نوجوان لڑکی تھی جو محض ڈر خوف کی وجہ سے اپنی عمر کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے رہی تھی...... یہ واقعی بڑی شرم کی بات تھی مگر اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی؟

اندھیرے میں کسی مرد کا سایہ اس کے قریب آیا۔ اسے اپنے چہرے کے قریب کسی کی گرم گرم سانسیں محسوس ہوئیں پھر دو بے تاب ہونٹ اس کے ہونٹوں سے ٹکرائے۔

ایک لمحے کے لیے اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دوبارہ جوان ہو گئی تھی اور جیسے اس کے قریب موجود شخص کوئی اجنبی نہیں بلکہ خاکی یونیفارم میں ملبوس اس کا وہی محبوب تھا جسے کبھی اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا...... کبھی وہ یونہی اس کی بانہوں میں سمٹ کر ساری دنیا سے بے خبر ہو جایا کرتی تھی۔

ان چند پاگل اور وحشی لمحات کے دوران اس اجنبی کی بے تاب انگلیاں اس کے لباس سے الجھنے لگیں...... مگر اس سے پہلے کہ وہ انگلیاں اس کے بدن سے ٹکراتیں، وہ ایک دم ہوش میں آ گئی۔ تھی تو بڑی شرم اور افسوس کی بات...... لیکن وہ کیا کرتی؟ وہ اس اجنبی کو اپنے بوڑھے جسم کو ٹٹولنے کی اجازت تو نہیں دے سکتی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ایملی نے پوری قوت صرف کر کے اس بے نام، اجنبی شخص کے سینے میں اپنا چاقو اتار دیا۔

ظاہر ہے کہ اس نے اپنے بچاؤ کی کوشش میں ایسا کیا تھا...... اپنا بچاؤ کرنا اس کا حق تھا اور قانون اس کی اجازت دیتا تھا۔ اس سے پہلے بھی قانون نے کئی مرتبہ ایسے مواقع پر اس سے رعایت برتی تھی۔

اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا...... اس کے پاس بس ایک یہی راستہ تھا کہ پھرتی اور ہوشیاری سے انہیں ختم کر ڈالے ورنہ وہ جان جاتے کہ وہ درحقیقت کس قدر بوڑھی تھی! وہ انہیں ایسا موقع بھلا کس طرح دے سکتی تھی؟

”نہیں، بہت شکریہ...... مجھے ٹیلی فون کی ضرورت نہیں، یہ بہت خطرناک چیز ہے“ اس کا مطلب تھا کہ یہ واقعی بہت خطرناک چیز ہے...... دوسروں کے لیے!

★★

محفل شعر و سخن

اوّل انعام یافتہ شعر

☆ واصف ملک...... اسلام آباد

صہبائے تند و تیز کی جدت کو کیا خبر
شیشے سے پوچھیے جو مزہ ٹوٹنے میں تھا

دوم انعام یافتہ شعر

☆ انس جاوید............ کراچی

شکوۂ گردشِ حالات لیے پھرتا ہے
جس کو دیکھو وہ یہی بات لیے پھرتا ہے

سوم انعام یافتہ شعر

☆ ایان فیصل...... کراچی

حرف و معنی کی تجلی بند آنکھوں میں کہاں
بات گہری کہنے والا سب کو دیوانہ لگا

☆ حنا عروج...... جیکب لائنز، کراچی

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

☆ رانا ریاض الحسن...... سندھ

کب تک اسے سینچو گے تمنائے ثمر میں
یہ صبر کا پودا تو نہ پھولا نہ پھلا ہے

☆ صدف مہر...... ایبٹ آباد

قرارِ راحت جاں بھی وہی ہے کیا کیجیے
وہ جس کے ہاتھ سے سینہ فگار اپنا ہے

☆ سید امجد علی شیرازی...... لاہور

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھ کو بھلانے کے لیے

☆ شہزاد ظفر...... ساہیوال

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

☆ رانا ادیب الرحمٰن...... رحیم یار خان

یہی اندازِ دیانت ہے تو کل کا تاجر
برف کے باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

☆ محمد عتیق ناز...... پنن وال

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

☆ عبدالرؤف تبسم...... ساؤوال

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

☆ ٹھیکیدار محمد سعید...... گوجرانوالہ

جانتا ہوں ایک ایسے شخص کو میں بھی منیر
غم سے پتھر ہوگیا لیکن کبھی رویا نہیں

☆ حیدر زمان مغل...... سندھ

نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

☆ تحسین بیگ...... کوملے

مرضی یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

☆ برہان احمد...... لاہور

بے نام مسافت ہی مقدر ہے تو کیا غم
منزل کا تعین کبھی ہوتا ہے سفر سے

☆ راشد حبیب تابش...... ضلع اٹک چھچھ

منتِ حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے!

☆ صوبیدار محمد اقبال...... گوجرانوالہ

میں بھلا کون کسی حرف پہ انگلی رکھوں
تو مرا کاتبِ مختار ہے جو تو لکھے

☆ ملک عبدالغفار ہنا...... گوجرانوالہ

پیے جاتا تھا انور آنسوؤں کو
عجب اس شخص کو چسکا لگا تھا

☆ بابر عباس...... کھاریاں

زندگی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بہترین شعر بھیجیے اور حافظ حلوہ کی جانب سے انعامات حاصل کیجیے

☆ راشد حبیب تابش...... اٹک
بھٹکتے پھرتے ہیں دشتِ جنوں میں مثلِ غبار
وہ لوگ جن کو محبت کا آسرا نہ ملا
☆ وقاص نواز...... آزاد کشمیر
ثابت قدم رہوں کہ تلاطم کا ساتھ دوں
ساحل کے رخ تو لا نہ سکوں گا ہوا کو میں
☆ احمد حسن رضی...... تھولہ شریف
ہاں وہ نہیں خدا پرست' جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
☆ محمد زاہد بھٹہ...... رحیم یار خان
ضبط کی شہر پناہوں کی میرے مالک! خیر
غم کا سیلاب اگر مجھ کو بہانے آئے
☆ عرفان احمد عاجز...... چکوال
عمر اک ایسی بھی ہوتی ہے کہ جس میں دل کو!
اچھی لگتی ہے ہر اک بات حقیقت کے سوا
☆ پرنس اصغر اشرفی...... چیتالوی
کر یاد ان دنوں کو کہ آباد تھیں جہاں
گلیاں جو خاک و خوں کی دہشت سے بھر گئیں
☆ ایم سرور نجم...... تحصیل و ضلع وہاڑی
گرچہ سو بارِ غمِ ہجر سے جاں گزری ہے
پھر بھی جو دل پہ گزرنی تھی کہاں گزری ہے!
☆ خالد حسن چیمہ...... پنڈی بھٹیاں
نجانے کون سی منزل کی جستجو تھی مجھے
تمام عمر چلا پھر بھی رہ گزر میں رہا
☆ محمد فراز کاٹھیا...... ضلع جھنگ
یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کسی نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی
☆ غلام حسین عاصم...... منڈی صادق گنج
فقیرِ شہر کے تن پر لباس باقی ہے
امیرِ شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے
☆ ملک صابر علی...... حافظ آباد
نہ ٹھہرا ایک بھی امجد مری آنکھوں کے ساحل پر
ہزاروں کارواں اس راہ گزارِ آب سے نکلے
☆ اسما حسین...... لاہور
شبِ فراق تو کٹتی نہیں کسی صورت
خیالِ یار میں آؤ فراز سو جائیں!
☆ سید جمیل احمد زیدی...... کراچی
ظرف اپنی جراُتوں کا آزمانے کے لیے
جب ملا ساحل تو خود ٹکرا گئے ساحل سے ہم

☆ عاصم لاشاری...... ضلع لیہ
تم نے کیا خوب طبیعت مری پہچانی ہے
آج اک اور ہی تقریبِ پریشانی ہے
☆ سید مجتبیٰ علی قمر نقوی...... گوجرانوالہ
فضا میں پھیل چکی ہے میری بات کی خوشبو
ابھی تو میں نے ہواؤں سے کچھ کہا بھی نہیں
☆ الطاف حسین عظمٰی...... ٹنڈو محمد خان
کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے
☆ ذیشان زندگی جی...... کراچی
گزر تو خیر گئی ہے عدم! حیات مگر
ستم ظریف بڑی بے رخی سے گزری ہے
☆ رانا انیق پسرور...... سیالکوٹ
نہ جانے کون سا آسیب دل میں رہتا ہے
کہ جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا
☆ حسن رضا باقر...... ڈیرہ غازی خان
ٹوٹا تو ہوں مگر ابھی بکھرا نہیں فراز
میرے بدن پہ جیسے شکستوں کا جال ہے
☆ ایم نعیم عباس...... چکوال
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
☆ محمد عتیق ناز...... ٹھان وال
کیا مرگئے ہیں اہلِ جنوں کچھ خبر تو ہو
اٹھتی نہیں کہیں سے بھی دار و رسن کی بات
☆ سید نسیم عباس...... فیصل آباد
یہ دوستی تو نہیں مصلحت پسندی ہے
ملے جو راہ میں منیر اسی کا ہو جاتا
☆ شاکر عباس...... فیصل آباد
تم نے تو تھک کے دشت میں خیمے لگا لیے
تنہا کٹے کسی کا سفر، تم کو اس سے کیا
☆ راجا عامر عباس...... عباس ٹاؤن
ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے
☆ عبدالغفور خان خٹک...... ضلع اٹک
بڑا سکون ملا آج اس کے ملنے سے
چلو یہ دل سے توقع کا وسوسہ بھی گیا
☆ احسان سعد خان...... صوبہ سرحد
نہ اجنبی ہے کوئی اور نہ آشنا کوئی
اکیلے پن کی بھی ہوتی ہے انتہا کوئی

☆چوہدری محمد اویس ڈھانہ.....ڈھرانجھا

ایک جلوہ تو سمیٹا نہیں جاتا اس سے
شوق کو پھر گلۂ تنگیٔ داماں کیوں ہے؟

☆رومانہ سحر.....سانگھڑ

گھر بھی عزیز، شوق بھی دل میں سفر کا ہے
یہ روگ ایک پل کا نہیں، عمر بھر کا ہے

☆محمد رشید سیال.....گھکھر

فقیروں کو بہ چشمِ کم نہ دیکھو
کہ ان میں اولیا اکثر چھپے ہیں

☆محمد رفیق پروانہ.....آزاد کشمیر

چرکے بھی لگے جاتے ہیں دیوارِ بدن پر
اور دستِ ستمگر بھی دکھائی نہیں دیتا

☆احمد فراز.....گوجرانوالہ

اب تو دریا کی طبیعت بھی ہے گرداب پسند
اور پہلی سی سکت بھی نہیں چپوؤں میں

☆الیف اے شازیہ خان.....صادق آباد

ہے ایک عمر اور اس میں شریک سب میرے
مرے لیے بھی تو ہوتے ہیں یہ روز و شب میرے

☆ریاض بٹ.....حسن ابدال

اب چھوڑ دو تذکرہ وفا کا
یہ بات بھی عام ہوگئی ہے

☆بابر زمان دشتی بلوچ.....رحیم یار خان

کاش میں تجھ پہ ریاضی کے سوالوں کی طرح
خود کو تقسیم کروں، کچھ بھی حاصل نہ آئے

☆الطاف عظمی.....ٹنڈو محمد خان

بزمِ وفا میں اپنی تہی دامنی نہ پوچھ
اک دردِ دل تھا وہ بھی کسی کا دیا ہوا

☆فگاس کائناتی.....گوجرانوالہ

کیا ہوا شہرِ محبت تیری آبادی کو
ہم سے دیکھا نہیں جاتا ترا ویراں ہونا

☆فرزانہ سورتی.....کراچی

مجھ کو مری شکست کا کوئی جواز نہ دو
کہتے ہیں روشنی کا نشاں تھا مری طرف

☆محمد اشفاق.....جھنگ

اس سے پہلے بھی محبت کا قرینہ تھا یہی
ایسے بے حال ہوئے اس بار کہ بس

☆محمد سلیم شاہد.....جہلم

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

☆نوشین عامر.....فیصل آباد

ضبط کرتا ہوں تو گھٹتا ہے قفس میں مرا دم
آہ کرتا ہوں تو صیاد خفا ہوتا ہے

☆صداقت حسین ساجد.....جھنگ

پلک جھپکتے ہی دنیا اجاڑ دیتی ہے
وہ بستیاں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں

☆ایم اے صدیقی.....راولپنڈی

نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے، بے وضو ہی سہی

☆سیدہ حمکین فاطمہ.....بھکر

زندگی! اس سے زیادہ تو نہیں عمر تری
بس کسی دوست کے ملنے سے جدا ہونے تک

☆رب نواز.....سرگودھا

کچھ ہم ہی کو نہیں احساں اٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں

☆مسز سین آغا حسن.....کراچی

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

☆یمنی احمد.....کراچی

وہ دور کوئی اور تھا جب دل کا بھرم تھا
اب ملتا ہے بازار میں دو چار درم کا

حافظ سوہن حلوہ ملتان کی جانب سے محفل شعر و سخن کے تین بہترین اشعار پر انعامات دیئے جائیں گے

محفلِ شعر و سخن

کوپن برائے شمارہ جون 2006

نام : _____

پتا : _____

_____

نوٹ: اشعار فل اسکیپ کاغذ پر بھجوائیں مکمل نام و پتا اور فون نمبر (بصورت دستیابی) کوپن پر لازمی تحریر فرمائیں۔

موت کے سوداگر

اقلیم علیم

ایک نوجوان کی
خود نوشت اس نے منشیات
کے عالمی اسمگلروں کے خلاف ذاتی
طور پر محاذ کھولا اور وطن عزیز سے ان ملک
دشمنوں کا صفایا کرنا اپنا ایمان بنالیا شہر، شہر،
ملک ملک، اور براعظم براعظم اپنے مشن کی تکمیل کے
لئے خاک اڑاتا اس نوجوان کا شغل ہوگیا مگر موت کے سوداگر
بھی تو اس کی جان کے دشمن بن گئے۔ انھوں نے بھی اپنی طرف سے
کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ایک جنگ جو ابھی جاری ہے۔

سسپنس کا تعمیری سلسلہ۔ آئندہ نسلوں کو زہر فروخت کرنے والوں کی تصویریں

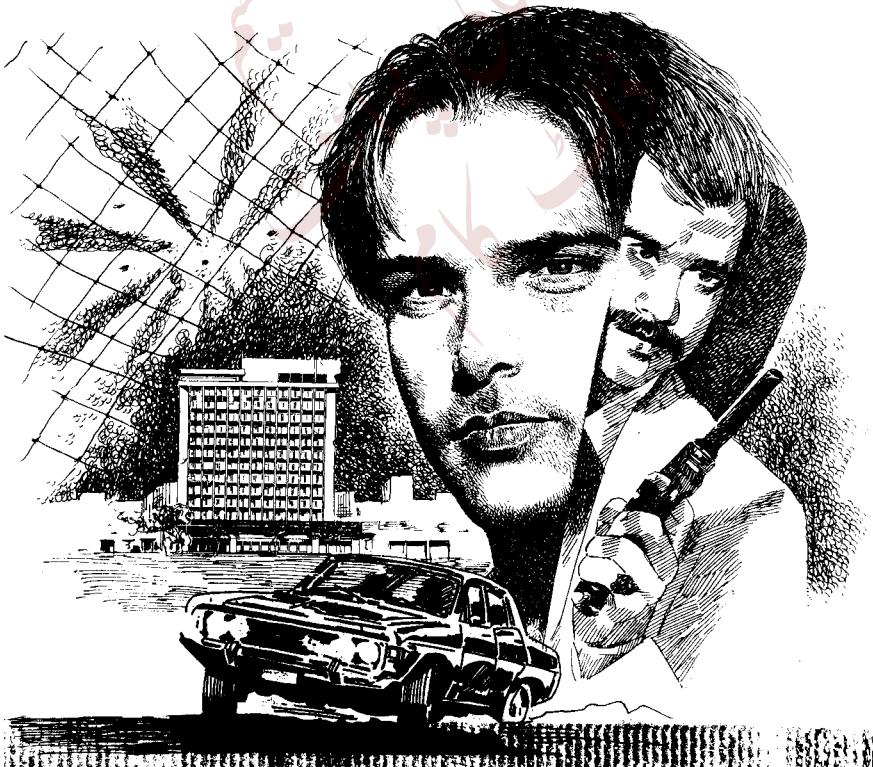

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

لاہور میری جائے پیدائش ہے۔ والد صاحب کی وفات اور سوتیلی ماں کے مظالم پر میں نے گھر اور شہر چھوڑ کر کراچی میں پناہ لی تو یہاں جہانگیر، داؤد اور نادر سے میری دوستی ہوئی اور ہم چاروں بے روزگاری سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں منشیات فروشوں کی ایک بھیانک عالمی تنظیم شی کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان لوگوں نے مغربی معاشرے کو ہیروئن کی وبا سے محفوظ رکھنے کے لیے پاکستان میں چرس کا بحران پیدا کر کے ہیروئن کو فروغ دیا اور قدم جمانے کے بعد پاکستان کے خلاف ہر محاذ پر تخریبی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ ان ہی دنوں سلطان شاہ مجھ سے آٹکرایا اور بعد میں میرا دست راست ثابت ہوا۔ شی کے سربراہ جمی لائیڈ کی ملک دشمن سرگرمیوں نے مجھے شی سے بغاوت پر مجبور کر دیا جس پر جمی لائیڈ میرے لہو کا پیاسا بن گیا۔ میں نے ملک میں اور ملک سے باہر ان کی تخریبی اور دہشت گرد کارروائیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ میرا لگایا ہوا ہر زخم ان لوگوں کے اشتعال میں اضافہ کر دیتا تھا مگر وہ میرا بال بھی بیکا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قومی مفاد کے اہم ترین منصوبوں کے تحفظ میں مجھے اول خان نے بہت مدد فراہم کی۔ وہ زندگی سے بے پروا اور دھن کے پکے جاں بازوں کی ایک ایسی پراسرار فارمیشن کا مقامی سربراہ تھا۔ جسے اسپیشل ٹاسک فورس کہا جاتا تھا۔ جمی لائیڈ کی بیٹی ویرا بھی ابتدائی دشمنی کے بعد میری حلیف بن گئی۔ ویرا میری دوست تھی مگر غزالہ ایک مدت سے میری محبت تھی۔ حالات کی ستم ظریفی کہ ہم دونوں کو مکاؤ میں ڈون کوانگ نو نامی ایک چینی بدمعاش کے دباؤ پر شادی پر مجبور ہونا پڑا۔ دوسری طرف امریکا میں آئزک بیل نامی ایک نسل پرست یہودی دہشت گرد اپنے اثر ورسوخ کی بنا پر شی کے بے اندازہ مالی وسائل پر قابو پا کر انہیں ڈیوڈ اسٹارز نامی صیہونی تنظیم کے لیے استعمال کرنے کا خواہاں تھا۔ جمی لائیڈ کو صدارتی انتخابات میں کامیابی کی مجبوری کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ اس کی پراسرار ہلاکت کے بعد آئزک بیل اس خطے کی بہترین ہیروئن کے پیداواری ذرائع پر قبضہ کرنے کے منصوبے کے علاوہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو نقصان پہنچانے کے مذموم خواب کو عملی جامہ پہنانے کی سازشوں کے ساتھ پاکستان پہنچا مگر یہاں اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ اپنے انجام سے خوف زدہ ہو کر واپس امریکا فرار ہوا، ہم بھی اس کے تعاقب میں امریکا پہنچے جہاں ہماری کوششوں سے اس کی بربادیوں کا آغاز ہوا اور وہ ڈیوڈ اسٹارز اور امریکی حکومت کے مابین ہونے والے خفیہ معاہدے گیپ کے افشا ہونے کے باعث امریکیوں کی نظر میں معتوب ٹھہرا۔ اپنے مشن کی کامیابی کے بعد ہم پاکستان واپس آ گئے۔ ہمارا اگلا معرکہ بھارتیوں سے ان کے اپنے دیش میں ہوا جس میں ہم سرخرو ہوئے۔ بھارت سے واپسی پر ہمیں علم ہوا کہ پاکستان میں را سرگرم عمل تھی اور اس کی پشت پناہی کوبرا کے کوڈ نیم تلے ایک پاکستانی سیاست دان کر رہا تھا۔ بہت جلد ہمیں اس کا سراغ مل گیا۔ وہ سوبھراج تھا۔ ہم اس پر سنجیدگی سے ہاتھ ڈالنے کا سوچ رہے تھے۔ اسی وقت ہمیں اطلاع ملی کہ جہانگیر کے گھر میں گھس کر اسے اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ جہانگیر نے ایک بدمعاش کو قابو میں کر لیا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ کام سنیل کے ذریعے سوبھراج نے کرایا تھا۔ تاہم ناکامی کے بعد وہ معافی تلافی پر اتر آیا تھا۔ سوبھراج نے ہمیں بہت دوڑایا۔ کئی مرتبہ وہ میرے دام میں آیا اور پھر چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر نکلنے میں کامیاب ہوا۔ تاہم مقدر اس کا کب تک ساتھ دیتا اسے نوشتہ دیوار صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے آخری کوشش کے طور پر پاکستان سے فرار اختیار کیا اور بنکاک پہنچ گیا۔ میں اور غزالہ وہاں پہلے سے موجود تھے جبکہ سلطان شاہ اور ویرا امریکا میں تھے۔ ہم چند مجبوریوں کی بناء پر ملک سے نکلنے پر مجبور ہوئے تھے۔ امریکی ہماری جان کے دشمن تھے اور مقامی حکام ان کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کی خود میں سکت نہیں پا رہے تھے۔ تھائی لینڈ میں آئی بی ایجنٹ اسد ہمارا منتظر تھا۔ وہ چھوٹا راجن اور سوبھراج دونوں سے بخوبی واقف تھا۔ میرے مشن کی تفصیلات جاننے کے بعد اس نے بتایا کہ بنکاک کی زیر زمین دنیا کا ڈان برنارڈ راجن کے خلاف ہماری مدد کر سکتا تھا۔ اس کے بارے میں اسد کا کہنا تھا، ڈان برنارڈ خود بھی چھوٹا راجن کا ڈسا ہوا تھا اور بنکاک کے بدمعاشوں کی بزدلی پر سخت نالاں تھا۔ ڈان سے ملاقات دلچسپ رہی اور وہ چھوٹا راجن کے خلاف میری مدد کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے مجھے چاؤ فان سے ملایا جو نہایت تیز بدمعاش تھا۔ وہاں سلطان شاہ نے ایک بھکاری میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔ اس نے چھوٹا راجن کے کلب میں بم دھماکے کرائے۔ اسی دوران سوبھراج بھی بنکاک پہنچ گیا۔ چھوٹا راجن کا ایک محافظ میری انگوٹھی کے زہر کا نشانہ بن گیا تھا جس کے باعث سوبھراج نے بنکاک میں میری موجودگی کا شک ظاہر کیا۔ مگر میں اسے چکر دینے میں کامیاب رہا۔ اول خان کی رائے تھی کہ سوبھراج کی بنکاک میں موجودگی کی اطلاع امریکیوں کو دے دی جائے۔ وہ اپنے غدار سے خود ہی نمٹ لیں گے۔ میری مرضی شامل ہوتے ہی اس نے اس پہ عملدرآمد کر لیا۔ امریکی فوجیوں نے چھوٹا راجن کے گھر چھاپا مارا مگر سوبھراج خطرہ بھانپتے ہی وہاں سے نکل گیا۔ دوسری طرف امریکا میں سلطان شاہ کو ایک مفلوک الحال بھکاری میں اپنی دلچسپی کا سامان نظر آ رہا تھا مگر ویرا اس کی مخالفت پہ تلی ہوئی تھی۔ گاڑیوں کے ٹریکنگ سسٹم کے باعث مجھے سوبھراج کے نئے ٹھکانے کا علم ہو گیا اور میں چاؤ فان کے ہمراہ بنکاک کے مضافات میں واقع ایک قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے اس کی موت وہاں گھیر کر لے گئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں اس کی قسمت اس کا ساتھ چھوڑ گئی اور وہ لوپ بوری کے کھیتوں میں واصل جہنم ہو گیا۔ اسی کے ساتھ تھائی لینڈ میں ہی میرا مشن پورا ہو گیا تھا۔

میں وہاں سے نکلنا چاہ رہا تھا مگر ڈان نے ہمارے پاسپورٹ اپنے قبضے میں لے لیے۔ اسی دوران میں امریکیوں نے راجن کے گھر میں دھماکا کرایا مگر ڈان نے اس کا کریڈٹ مجھے دیا۔ اس نے مجھے ملاقات کے لیے بلوایا اور ایک لاکھ بھات بطور انعام دیے۔ میں اس سے مل کر واپس آیا تو غزالہ نے بتایا کہ سارے نامی پولیس آفیسر کمرے کی تلاشی لینے آئی تھی۔ میں نے اس بارے میں ڈان سے بات کی تو اس نے مجھے بتایا کہ سارے کو اس نے بھیجا تھا۔ یہ ایک مشکل صورت حال تھی۔ ڈان کا کہنا تھا وہ میرا اس طرح امتحان لینا چاہ رہا تھا اور خوش قسمتی سے میں اس میں سرخ رو ہوا تھا۔ میں وہاں سے روانگی کے لیے پر تول رہا تھا کہ راجن کے آدمیوں سے میرا ٹکراؤ ہوا۔ وہ مجھے اور اسد کو سبق سکھانا چاہتے تھے مگر ہم سے پٹ کر فرار ہوئے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب راجن سے دو دو ہاتھ کیے بغیر وہاں سے روانہ نہیں ہوں گا۔ اسی دوران ڈان سے ملاقات میں میں نے راجن کی بوٹ کو تباہ کرنے کی تجویز پیش کی اور وہ خوش ہو گیا۔ جلال نے بتایا کہ اس کی بنکاک تبادلے کے احکام جاری ہو چکے تھے۔ اسد بنکاک میں اپنی آخری رات گزار رہا تھا جب چھوٹا راجن کے گرگے اس کے گھر پہنچے اور اسے بتایا کہ وہ اس سے دوبارہ ملنا چاہتا تھا۔ ان کے انداز مفاہمانہ تھے اس لیے اس نے زیادہ تکرار نہیں کی تاہم انہیں آگاہ کر دیا کہ گزشتہ شب ہم دونوں پہ اس کے ہرکاروں نے حملہ کیا تھا۔ انہوں نے اس کی تردید نہیں کی بلکہ اس واقعے پر معذرت طلب کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اسد پاکستان روانہ ہو گیا دوسری طرف پاکستان میں ایف بی آئی کا ایک ایجنٹ جہانگیر کے فلیٹ تک جا پہنچا اسے میری تلاش تھی مگر سلمٰی نے وزنی بیلن سے اس کی کھوپڑی چٹخا دی اور وہ واصل جہنم ہو گیا جس کے بعد جہانگیر سلمٰی کو لے کر اسٹیشن فور میں قیام پذیر ہو گیا۔

بنکاک میں چاؤ فان اپنی مہم پہ لگا ہوا تھا۔ بہت جلد اس نے مجھے بتایا کہ لی نامی ایک عورت راجن کی بوٹ کے تلے میں بم لگانے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ میں اس عورت سے ملا وہ بھی راجن کی ڈسی ہوئی تھی۔ تمام کام بخیر وخوبی انجام پایا اور وائٹ ہاک سمندر کے پانیوں میں غرق ہو گئی۔ میں نے اکبر کے فرضی نام سے راجن سے رابطہ کیا وہ مجھ سے ملنے کے لیے بے چین تھا مگر میں اسے ٹالتا رہا۔ مادام لی زبردست عورت تھی اس نے مجھے چائے پر بلایا میں بادل نخواستہ اس کے کاٹیج پہنچا۔ میں اندر داخل ہی ہوا تھا کہ باہر ایک فائر کی آواز گونجی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بعد میں مادام لی نے بتایا کہ یہ اس کے دیرینہ عاشق نامراد کی حرکت تھی۔ خوش قسمتی سے چاؤ فان باہر موجود تھا اس نے اس دن لی کے اس عاشق کی درگت بنا ڈالی۔ لی مائل بہ التفات تھی مگر میں اس سے گریزاں تھا تاہم اس کے آگے میری نہ چل سکی اور وہ چائے میں ایل ایس ڈی کی آمیزش کرا کے مجھے اپنی مرضی پر چلانے میں کامیاب رہی۔ میں آسودہ ہو کر اس سے رخصت ہوا۔ دوسری طرف امریکا میں سلطان شاہ کا شکاری سی آئی اے والوں سے نہیں بچ سکا اور سلطان شاہ کی موجودگی میں اس کو قتل کر دیا گیا۔ سلطان شاہ کو خطرہ تھا کہ اسے بھی دیکھ لیا گیا ہے وہ فوری طور پر ویرا کے ہمراہ امریکا سے نکل گیا اب ان کا رخ بنکاک کی طرف تھا۔ اسد کی جگہ نئے افسر نے ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں اس نے

مجھے آگاہ کیا کہ راجن ساحلی علاقے کی طرف جاتا ہوا دیکھا گیا تھا میرے لیے یہ اچھا موقع تھا میں نے چاؤفان کو ساتھ لیا اور اس کی گھات میں بیٹھ گیا مگر اس کی قسمت اچھی تھی اس کی طراری اس کے کام آئی اور وہ میرا شکار نہ بن سکا تاہم میں اسے زخمی کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کے علاوہ اس کے تین ساتھی میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوگئے۔ ڈان کے لیے یہ سب حیرت ناک تھا وہ میری صلاحیتوں کا معترف ہوتا جارہا تھا۔ اسی دوران راجن نے مجھے اکبر کے نمبر پر فون کیا وہ مجھ سے ملنے کا خواہش مند تھا۔ اس کے اصرار کے پیش نظر مجھے اس کے محل جانا پڑا۔ وہاں وہ تنہا نہیں تھا بلکہ اس خطے کے چھ نامور بدمعاش مجھ پر جرح کرنے کے لیے تیار تھے۔ مجھے ان کی جرح سے جان چھڑانا ناممکن لگ رہا تھا یوں لگتا تھا میں نے راجن کے محل میں آکر غلطی کی تھی جس کی سزا مجھے ملنے والی تھی مگر اس وقت چاؤفان اور اس کے ساتھیوں کی راج محل پر فائرنگ اور بموں کی بارش کے باعث مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ راج محل پر فائرنگ معمولی واقعہ نہیں تھا اس کی دعوت پر آئے چھ بدمعاش وہاں سے نکل گئے اسی کے ساتھ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ راجن تنہا تھا اور اسے اطلاع مل چکی تھی کہ ڈان برنارڈ اس کے خلاف میدان میں اترا ہوا ہے۔ اس نے مجھے راج محل طلب کیا وہ ڈان برنارڈ کے خلاف مجھے استعمال کرنا چاہتا تھا مگر میں اب اسے کوئی موقع دینے پر آمادہ نہیں تھا وہ میرا شکار بنا اور اس کی لاش کو چنا کے حوالے کر کے میں واپس لوٹ آیا۔ ڈان برنارڈ اس خبر سے بے حد خوش ہوا تاہم وہ مجھ سے اس سارے واقعے کی تفصیل جاننا چاہتا تھا میں نے امریکی کرنل گیری اور بنکاک کے ٹیلی فون نظام میں گڑبڑ کی کہانی سنا کر اسے قائل کر دیا کہ جو کچھ ہوا اس میں میری کارکردگی سے زیادہ راجن کی بدقسمتی کارفرما تھی۔ اسی دوران ویرا اور سلطان شاہ بھی بنکاک پہنچ چکے تھے وہ ہم سے علیحدہ قیام پذیر تھے ہمارا خیال تھا کہ وہ بنکاک میں محفوظ ہیں مگر سلطان شاہ کے کمرے کی تلاشی لی گئی تو ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی بج اٹھی اس کے بعد معلوم ہوا کہ سلطان شاہ کی نگرانی کی جارہی تھی جس پر ویرا نے اپنی فطری ذہانت سے کام لے کر نگرانی کرنے والے کی درگت بنا ڈالی۔ یہ خطرناک صورت حال تھی۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ سی آئی اے ایجنٹ سلطان شاہ کے تعاقب میں تھائی لینڈ تک پہنچ چکے تھے۔ میں اب وہاں سے نکلنے کے لیے پر تول رہا تھا مگر ڈان کا اصرار تھا کہ میں اس کا دست راست بن کر وہیں رہوں۔ امریکیوں سے نفرت کرنے کے باوجود وہ راجن کی موت کے بعد ان کے ہاتھوں میں کھیلنا چاہ رہا تھا۔ کرنل گیری نے اس کے ذمے سلطان شاہ اور ویرا کو ڈھونڈنے کی ذمہ داری لگا دی تھی۔ اس موقع پر میں نے چاؤفان سے مدد لینے کا فیصلہ کیا میں اس کی مدد سے تھائی لینڈ چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ میری باتوں میں آگیا اور میرے فرار کا منصوبہ بنانے میں مصروف ہوگیا۔

اب آپ قسط نمبر 257 کے واقعات ملاحظہ کیجئے

تھائی لینڈ جیسے اجنبی ملک میں دو باوردی افسران کی طلبی پر نہ جانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ مجھے جانا تھا اور سر کے بل جانا تھا۔ ان افسروں نے مجھے اپنے روبہ رو بلانے کے لیے ایسا فول پروف بندوبست کیا تھا کہ فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آرہی تھی۔

ہوٹل کے کسٹمر کیئر منیجر نے ہمارے دروازے کے باہر موجود جس شخص کو روم سروس کا آدمی قرار دیا تھا' وہ میری دانست میں پولیس یا ایسے ہی کسی ادارے کا کوئی تجربے کار کمانڈو تھا جسے زیر کیے بغیر میں وہاں سے اپنی مرضی کی راہ اختیار نہیں کرسکتا تھا۔

ریسیور میرے کان سے لگا ہوا تھا اور ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ مجھے فوری طور پر فیصلہ کرکے ہوٹل کے افسر سے فون پر بات آگے بڑھانی تھی۔

''میں ابھی آتا ہوں!'' اس ذہنی تجزیے کے دوران میں الفاظ میری زبان سے گویا پھسل گئے۔ شاید میرے ذہن کے کسی نہاں خانے میں یہ احساس پوری شدت سے بیدار ہو چکا تھا کہ میں انکار کرکے اپنے لیے خطرات مول لوں گا۔

''میں زحمت دینے کے لیے ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں۔'' وہ فون پر بچھا جارہا تھا ''آپ دونوں اپنے پاسپورٹ ساتھ لانا نہ بھولیں۔''

جب جانا ہی تھا تو اس کے سامنے جاکر بغلیں جھانکنے سے بہتر تھا کہ میں فون پر پوری بات کرلوں۔ میں نے کہا ''پاسپورٹ میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ نشستوں کی بکنگ کے لیے میں نے اپنے ایک دوست کو دیے ہوئے ہیں۔''

میں نے محسوس کیا کہ اسے وہ جواب دیتے ہوئے' ایرکنڈیشنر کی پھیلائی ہوئی خنکی کے باوجود میری پیشانی پر پسینہ ابھر آیا تھا۔

''سر! ذرا ایک منٹ ہولڈ کریں۔'' اس نے جلدی سے کہا اور لائن پر گہرا سکوت طاری ہوگیا۔ شاید وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر وردی والوں سے میرے بیان کیے ہوئے مسئلے پر مشورہ کررہا تھا۔

''اوکے سر!'' چند لمحوں بعد اس کی تروتازہ آواز سنائی دی ''آپ دونوں میرے دفتر میں تشریف لے آئیں۔ ضرورت ہوئی تو پاسپورٹ بعد میں دیکھ لیے جائیں گے۔''

میں نے مختصر سا جواب دے کر فون بند کردیا۔ اس دوران میں غزالہ ہمہ تن میری طرف متوجہ تھی اور میرے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات سے اندازہ لگا چکی تھی کہ اچانک کوئی گڑبڑ رونما ہو چکی ہے۔

''کہاں جارہے ہیں..... اچانک پاسپورٹوں کی کیا ضرورت پیش آگئی؟'' اس نے سراسیمگی کے عالم میں پوچھا۔

''میرے ساتھ تم کو بھی چلنا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے چند فقروں میں پوری صورت احوال سے آگاہ کردیا۔

''چاؤفان بہت کمینہ نکلا!'' غزالہ کا بے ساختہ ردِعمل میری سوچ سے ذرا بھی مختلف نہیں تھا۔ ''ہمارے پاسپورٹ تھیاتے ہی اس نے اپنا کھیل شروع کردیا۔ مجھے آپ کا ابتدائی شبہ درست ثابت ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔''

''کس شبہے کی بات کرتی ہو؟'' میں نے دروازے کی

طرف جاتے جاتے پلٹ کر پوچھا۔

''وہ ہمیں کمبوڈیا کا چکر دے رہا ہے۔'' وہ تنفر آمیز لہجے میں بولی ''اس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ ڈان کو اتنا بڑا چکما دے سکے۔ یہ بات اس کے دماغ میں بیٹھ گئی ہے کہ آپ اس کی راہ کا روڑا ہیں۔ وہ آپ کو کسی چکر میں پھنسوا کر ڈان کی نظروں سے گرادے گا۔ بہت آسانی سے اس کا راستہ صاف ہوجائے گا۔''

''اس نے مجھے ڈبونے کی کوشش کی تو میں اپنے ساتھ اسے بھی لے ڈوبوں گا'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا ''اب جلدی آؤ..... ان لوگوں کا بھیجا ہوا فرشتہ ہمارے دروازے پر موجود ہے۔''

غزالہ کے ہاتھ پیر پھولے ہوئے تھے۔ وہ کیا مجھے خود بھی اپنا سارا منصوبہ برباد ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔ چاؤفان نے کمبوڈیا کی آزاد فضاؤں کا سراب دکھا کر ہمیں بنکاک ہی میں دبوچ لینے کا پورا بندوبست کرلیا تھا۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو روم سروس کے روایتی لباس میں گٹھے ہوئے جسم والا ایک درشت رو مقامی راہ داری میں کھڑا نظر آیا۔ مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی وہ خوش خلقی سے مسکرایا لیکن اس کی کینہ توز نگاہیں اس مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں یا کم از کم مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

میرے پیچھے غزالہ کمرے سے برآمد ہوئی تو نووارد کے سکڑتے ہوئے ہونٹ دوبارہ مسکرانے کے انداز میں پھیل گئے۔ اس بار اس نے اپنے سر کو قدرے خم دے کر غزالہ کو تعظیم بھی پیش کی۔ اس وقت وہ مجھے یکایک بدمعاش اور منافق نظر آرہا تھا مگر میں اس پر اپنی برہمی ظاہر کرنے سے قاصر تھا۔ وہاں سے دفتر تک پہنچنے کے دوران میں مجھے صرف اسی سے اصل معاملے کا کچھ سراغ مل سکتا تھا۔

وہ مقامی تھا لیکن بنکاک کے ایک بڑے ہوٹل میں ملازمت کررہا تھا جہاں دن رات سیکڑوں غیر ملکیوں کی آمدورفت رہتی تھی اس لیے اپنے بگڑے ہوئے تلفظ سے قطع نظر صاف اور اچھی انگریزی بول رہا تھا۔ اس نے اخلاق سے ہمیں اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا اور راہ داری میں لفٹ کی طرف ہولیا۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا اور شکایتی لہجے میں بولا ''یہ انوکھی بات ہے کہ تمہارا منیجر ہمیں اپنے دفتر میں بلا رہا ہے۔ یہ حرکت مہمان داری کے اصولوں کے سراسر منافی ہے۔ یہ میری زندگی کا تلخ تجربہ ہے۔''

''سر! میں آپ کی کوفت کا اندازہ کررہا ہوں۔'' اس نے سرہلا کر مؤدب لہجے میں کہا ''اسے بھی کوئی مجبوری درپیش ہوگی۔ اس کے کمرے میں ایک بڑا پولیس افسر آیا ہوا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پولیس کہیں کی بھی ہو ہوٹل والوں کو ان سے دبنا پڑتا ہے۔''

انگریزی میں آپ کا کوئی صیغہ نہیں ہوتا لیکن اس کے طرز تکلم سے عزت افزائی کے اس قرینے کا اظہار ہو رہا تھا۔

''وہ دو پولیس والے بتا رہا تھا۔'' میں نے کسی باریکی کا لحاظ کیے بغیر اس کی تردید کی۔

''پولیس والا تو ایک ہی ہے۔'' وہ اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا ''اس کے ساتھ ایک امریکی فوجی لڑکا بھی ہے جو وردی میں ہے۔ شاید منیجر نے جلدی میں اسے بھی پولیس والا کہہ دیا ہوگا۔''

اس نے کسی پس وپیش کے بغیر مجھے اصل بات بتادی۔ اس کے خلاف میرے ذہن میں ابھرنے والے شبہات دھندلانے لگے۔ اگر اس کا تعلق پولیس کے محکمے سے ہوتا تو وہ بھول کر بھی ہوٹل والوں پر پولیس کے ناروا دباؤ کا ذکر نہ کرتا۔

اس نے ہمارے لیے لفٹ کا دروازہ کھولا اور آخر میں اندر آکر میز نائن فلور کا بٹن دبادیا۔ لفٹ تیزی سے نیچے روانہ ہوگئی۔

''ہم نے اس ہوٹل میں قیام کرکے کوئی جرم نہیں کیا' پولیس کو ہم سے کیا لینا ہے؟'' میں نے اپنا شکوہ جاری رکھا۔

''سر! میں کیا کہہ سکتا ہوں' ذرا سی دیر میں سب کچھ سامنے آجائے گا۔'' اس نے نہایت عاجزی سے کہا ''معاملہ کچھ عجیب سا ہے۔ انٹرکام کے بجائے مجھے نیچے بلاکر آپ لوگوں کے بارے میں بتایا گیا تھا۔''

لفٹ ایک ہلکے سے جھٹکے سے رک گئی۔

لفٹ سے باہر نکلتے ہی اس نے راہ داری میں نظر آنے والے تیسرے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''سر! اس دفتر میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔''

اس دروازے کے اوپری نصف حصے میں لگے ہوئے شفاف شیشے سے روشنی چھن کر باہر آرہی تھی۔ ہماری منزل اتنے قریب تھی کہ ہمیں لانے والے سے مزید گفتگو کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔ میں اس کی طرف سے اپنی بدگمانی پر دل ہی دل میں نادم تھا۔ میں نے مسکرا کر الوداعی انداز میں اس کی طرف دیکھا اور اس کے بتائے ہوئے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

شیشے کے سامنے پہنچتے ہی اندر کا منظر میرے سامنے تھا۔ وہاں کل تین نفوس تھے جن میں سے ایک اپنے سیاہ سوٹ کی وجہ سے ہوٹل کا کوئی بڑا ملازم نظر آ رہا تھا۔

میرے دل پر اضطراب اور بے یقینی کی کیفیت طاری تھی مگر میں نے اس موقع پر اپنی برہمی بلکہ بدتمیزی کا مظاہرہ ضروری سمجھا۔ دستک دیے بغیر دروازہ کھولا اور اندر گھس گیا۔ غزالہ میرے پیچھے تھی۔

تینوں نے چونک کر ہماری طرف دیکھا اور پھر امریکی نژاد نوجوان فوجی اپنے سر کو مایوسانہ انداز میں ہلانے لگا۔ تھائی پولیس افسر نے ہمیں دیکھ کر گورے فوجی کی طرف دیکھا اور اس کے مایوسانہ ردِعمل کو دیکھ کر اپنی زبان میں سیاہ سوٹ والے سے جلدی جلدی کچھ کہنے لگا۔

اس دوران میں سیاہ سوٹ والا ہمارے استقبال کے لیے اپنی کرسی چھوڑ کر اپنی جگہ سے کئی قدم آگے بڑھ آیا۔

''تیسرے درجے کی کسی سرائے میں بھی مہمانوں سے ایسا سلوک نہیں ہوتا۔'' میں اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز کر کے پھٹ پڑا ''یہ میری زندگی کا بدترین تجربہ ہے۔ ہمیں مجرموں کی طرح کیوں طلب کیا گیا ہے؟''

وہ خفت آمیز انداز میں اپنا ادھنا ہاتھ بالوں پر پھیرتے ہوئے بولا ''میں آپ سے معافی کا خواست گار ہوں۔ میں پھر کہوں گا کہ میں نے ان دونوں بادردی افسران کے ساتھ آپ کے دروازے پر آنا مناسب نہیں سمجھا۔ بلاوجہ پورے فلور پر چہ میگوئیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ تشریف رکھیں اور حکم کریں کہ آپ کے لیے کیا منگوایا جائے؟''

''میں ایک لمحے کے لیے بھی یہاں رکنا پسند نہیں کروں گا۔'' میں نے اپنا جارحانہ رویہ برقرار رکھتے ہوئے کہا ''مجھے جس کام کے لیے بلایا گیا ہے' وہ بلاتاخیر ختم کیا جائے۔''

پولیس افسر نے کرسی چھوڑ دی۔ امریکی فوجی نے بھی اس کی تقلید کی۔ پولیس والے نے اپنی زبان میں کچھ کہہ کر سوٹ والے سے ہاتھ ملایا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گیا ''مسٹر اور مسز علی! میں بھی تم سے معافی چاہتا ہوں۔ تمام پوٹ نے میرے ایما پر تم دونوں کو بلایا تھا۔ دراصل ہمیں ایک مشتبہ پاکستانی جوڑے کی تلاش ہے۔ ہم اپنے مہمانوں کی عزت کرتے ہیں لیکن کبھی مجبوریاں پیش آ جاتی ہیں۔ ہم شہر کے سارے ہوٹلوں میں پاکستانی جوڑوں سے مل رہے ہیں۔ یہ میرا اور کپتان اولڈ کا پانچواں ہوٹل ہے۔ ابھی ہمیں مزید جوڑوں سے ملنا ہے۔''

''.....اور اب آپ شیئرز کے بھاؤ سنیے..... امریکن اسٹیل، دوڈالر زیادہ..... عرب ریفائنری، ڈیڑھ درہم کم.....''

اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کے ہونٹوں پر بکھری ہوئی خلیقانہ مسکراہٹ سے مجبور ہو کر میں نے نیم دلی سے ہاتھ ملا لیا۔ اس کے بعد کپتان اولڈ سے ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے اس کا ناقدانہ جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ وہی مردود تھا جو سلطان شاہ کے کمرے میں گھس کر اس کا ایک بیگ اٹھا لے گیا تھا۔

ویرا نے اپنے ہوٹل میں گائن نامی ویٹریس سے سن کر نامعلوم امریکی کا جو حلیہ بتایا تھا' وہ کیپٹن اولڈ پر سو فی صد صادق آ رہا تھا۔

وہ دونوں تیزی کے ساتھ دفتر سے نکل گئے اور تمام پوٹ ہماری خوشامدوں میں مصروف ہو گیا۔ وہ ہمیں ہر قیمت پر کچھ دیر کے لیے اپنے دفتر میں بٹھانا چاہ رہا تھا۔

ہمیں کچھ باتیں تھائی پولیس افسر نے بتا دی تھیں۔ رہی سہی کسر کپتان اولڈ کی شناخت نے پوری کر دی۔ میرے لیے صورت احوال بالکل صاف ہو چکی تھی' جس میں تمام پوٹ بالکل بے قصور نظر آ رہا تھا۔ پولیس والے کے دباؤ نے اسے بے بس کر دیا تھا۔

ویرا اور سلطان شاہ کے ہوٹل میں یقینی طور پر کیپٹن اولڈ ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ کاغذی ریکارڈ سے قطع نظر' وہ ان

دونوں کو بہ چشم خود دیکھ چکا تھا۔ اس نے سلطان شاہ کے کمرے کی تلاشی لے ڈالی مگر گائن کے متوجہ ہوجانے کی وجہ سے ویرا کے کمرے میں گھسنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

وہ چلا گیا' اس کی جگہ سارجنٹ پال ان دونوں کی گھات میں لگا۔ وہ ہوٹل کا حساب بے باق کرکے نکلے تو پال ان کے پیچھے لگ گیا۔ ویرا کی ذہانت اور چالاکی کے نتیجے میں پال مقامیوں سے بری طرح مار کھا کر جہنم واصل ہوگیا۔ کسی کو پتا نہیں چل سکا ہوگا کہ فرشتۂ اجل کا دیدار ہونے سے پہلے اس پر کیا کچھ گزری تھی۔

پال ان دونوں کی نگرانی پر مامور تھا۔ وہ ہوٹل چھوڑ کر غائب ہوچکے تھے۔ شہر میں بڑے پیمانے پر ان کی تلاش شروع کردی گئی۔ اولڈ ان دونوں کو پہچانتا تھا۔ اس لیے وہ تھائی پولیس افسر کو اپنے ساتھ لیے بنکاک کے ہر بڑے ہوٹل میں پاکستانی جوڑوں کو تنگ کرتا پھر رہا تھا۔ اس امریکی گدھے کو اس کام پر لگانے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ ریٹا اور اکبر سیام انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں الگ الگ کمروں میں مقیم تھے۔ اپنا ٹھکانا بدلنے کے بعد بھی وہ الگ الگ رہتے۔ ان تک پہنچنے کے لیے جوڑوں کو کھنگالنا بے سود تھا۔

اس وقت شہر کے بڑے ہوٹلوں میں ان دونوں کی تلاش کی مہم جاری تھی' جس کی ناکامی یقینی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اس معاملے میں امریکی اعصاب زدہ ہوکر فیصلے کررہے تھے۔ بڑے ہوٹلوں میں ناکامی کے بعد اگر کیپٹن اولڈ شہر میں بکھرے ہوئے گیسٹ ہاؤسز وغیرہ کا رخ کرلیتا تو ویرا اور سلطان شاہ کے لیے مشکلات پیدا ہوسکتی تھیں۔ ان دونوں نے روزی اور جیکب کے نام ضرور اختیار کرلیے تھے تاہم ان کے چہرے وہی تھے۔ اولڈ انہیں دیکھتے ہی پہچان لیتا۔ ایک طرف وہ جال پھیلا دیا گیا تھا' دوسری طرف ڈان اور چاؤفان کے آدمی انہیں ڈھونڈنے میں لگے ہوئے تھے۔

میں بہ وقت تمام تھام پوٹ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوسکا کہ میں اس کی مجبوری کا اندازہ لگا چکا تھا۔ پولیس والے اور امریکی فوجی کے دباؤ پر وہ ہوٹل میں مقیم سارے مہمانوں کو بھی کسی میدان میں جمع کرنے پر مجبور ہوجاتا۔

اس نے لفٹ کے دروازے تک آکر ہمیں بہت تپاک سے رخصت کیا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی موبائل فون پر ویرا کا نمبر ملالیا۔ اس وقت خلاف توقع سلطان شاہ کی آواز سنائی دی۔

''ریٹا کہاں ہے؟'' میں بے ساختہ سوال کر بیٹھا۔

''ابھی فون مجھے دے کر اپنے کمرے میں گئی ہے۔ کیا بات ہے' تم آواز سے کچھ پریشان معلوم ہورہے ہو۔'' میرے لب ولہجے نے اس کے کان کھڑے کردیے۔

''کان کھول کر سن لو اور اسے بھی بتا دینا۔ بڑے ہوٹلوں میں مشتبہ جوڑے کی سرکاری اور غیر سرکاری طور پر تلاش شروع ہوگئی ہے۔ ادھر سے ناکامی کے بعد وہ چھوٹے ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز کا بھی رخ کرسکتے ہیں۔'' میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا ''ابھی دشمن بولائے ہوئے ہیں۔ اوسان ٹھکانے آتے ہی قرینے سے جال پھیلا کر تم تک پہنچ سکتے ہیں۔ دونوں کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''یہ خبر پرانی ہے اور اس پر ریٹا سے شاید تمہاری بات بھی ہوچکی ہے۔'' وہ بولا۔

''اب اس میں نیا وزن پیدا ہوگیا ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا ''میں ابھی صدف کے ساتھ ایک خطرناک مہم بھگت کر آرہا ہوں۔ تمہارے کمرے کی تلاشی لینے والا' ایک تھائی پولیس افسر کے ساتھ بڑے ہوٹلوں میں پاکستانی جوڑوں سے ملتا.....''

میری بات ادھوری رہ گئی۔ اچانک دروازے پر دستک کی آواز سن کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور میں نے اضطراری طور پر فون بند کردیا۔ یکا یک عجیب وغریب باتیں ظہور میں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ پتا نہیں اس وقت کون ہمارے دروازے پر آپہنچا تھا۔

میں پھرتی سے فون جیب میں ڈال کر یوں کرسی پر بیٹھ گیا جیسے دیر سے میرے پاس کوئی کام نہ ہو۔ میرے اشارے پر غزالہ نے دروازہ کھولا تو میرے کانوں میں تھام پوٹ کی لجلجائی ہوئی آواز آئی ''مسز علی! یہ میری اور ہوٹل کی انتظامیہ کی طرف سے خیر سگالی کا تحفہ ہے..... آج آپ کو ڈسٹرب کیا گیا ہے۔ آج کا کرایہ آپ کے بل میں سے منہا کردیا جائے گا۔''

''شکریہ!'' غزالہ کی سنجیدہ آواز آئی ''پھلوں کی ٹوکری دے دیں۔ شمپین کی بوتلیں ہمارے لیے بے کار ہیں۔ ہم کوئی شراب نہیں پیتے۔''

میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی' غزالہ نے اسے دروازے سے ہی ٹال دیا۔ وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں ٹکوں سے بنی ہوئی ایک خوبصورت ٹوکری جھول رہی تھی جس میں پھلوں کے ساتھ چاکلیٹ کے پیکٹ بھی نظر آرہے تھے۔

''میں گھبرا گئی تھی کہ اب نہ جانے کون سی مصیبت نازل ہوگئی۔'' اس نے خفت آمیز انداز میں ہنستے ہوئے وہ لدی پھندی ٹوکری لکھنے کی میز پر رکھ دی ''وہ بے چارہ اپنے ناکردہ گناہ کا کفارہ ادا کرنے آیا تھا۔''

''اس کی گرہ سے کچھ نہیں گیا لیکن یہ اچھی اور کامیاب انتظامی پالیسی کا اظہار ہے۔ آج کی رات مفت میں گزرے گی۔ ہم ان پھلوں پر ہی گزارا کرتے رہیں تو یہ ٹوکری ہماری روانگی تک خالی نہیں ہوگی۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔

بات آئی گئی ہوگئی مگر میرے ذہن پر ایک بوجھ سوار ہوگیا۔

میں نے چاؤفان پر ضرورت سے زیادہ بھروسا کرلیا تھا۔ اسے عمر بھر تھائی لینڈ میں ڈان کے ساتھ رہنا بسنا تھا۔ میں اس کے لیے ایک غیر ملکی شناسا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اگر اس کی ذہنی رو صحیح سمت میں چل پڑتی تو وہ پوری بے خوفی سے ہمارے ساتھ وہ سب کرسکتا تھا جو میں کچھ دیر پہلے تک سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا تھا۔

اس کے بارے میں صرف ایک بات اچھی تھی کہ وہ ذہین نہیں تھا۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی سمت میں سوچنے کا عادی تھا اور اپنی پوری صلاحیتیں اسی سمت میں صرف کردیتا تھا۔ اگر ہمیں ڈان کی پارٹی سے فرار کرانے کی سازش اس کے ذہن میں بیٹھ چکی تھی تو اسے یہ دھیان آنا محال تھا کہ وہ کسی اور طرح بھی مجھ سے چھٹکارا حاصل کرسکتا تھا۔

فکر وتشویش کے سائے میں وہ رات آئی اور کسی نہ کسی طرح گزر گئی۔ میرے اعصاب پر کمبوڈیا کا پُرخطر سفر سوار ہوچکا تھا۔ سونے سے پہلے میں دیر تک اس امکان پر غور کرتا رہا کہ ہمیں ڈان کو دھوکا دے کر بنکاک سے بھاگنا تھا تو اس کے لیے اگلے دو دن انتظار کی کوفت میں گزارنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم فوری طور پر اپنا مختصر سا اسباب سمیٹ کر اس شہر خرابات سے کوچ کرسکتے تھے لیکن چاؤفان کے تعاون کے بغیر ہمارا فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔

وہ ڈان سے بہت زیادہ خوف زدہ رہتا تھا۔ دوسری طرف وہ پارٹی کے انتظامات میں الجھا ہوا تھا۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ سب کام چھوڑ کر بے خوفی سے ہماری روانگی کا بندوبست کردے گا۔ یہی غنیمت تھا کہ اس نے ڈان کی پارٹی میں ہمیں قابل اعتماد گاڑی اور سفر کے لوازم مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ اس دوران میں چاؤفان کی ذہنی رو نہ بھٹکے اور وہ ڈان کے عفریت سے ہماری گلوخلاصی کرادے۔

اگلی صبح کے اخبار میں مشتبہ پاکستانی جوڑے کی زور وشور سے تلاشی کے بارے میں خبر موجود تھی۔ خبر پہلے بھی آچکی تھی۔ اس بار زور وشور کا اضافہ ہوگیا تھا۔ موتی محل میں لگنے والی آگ اور راجن کی موت کے بارے میں خبریں موجود تھیں لیکن ان کے تیور بدل گئے تھے۔ جب تک وہ زندہ تھا' اسے معزز اور شریف شہری قرار دیا جاتا تھا۔ اس کے مرتے ہی اخبار والوں نے اس کا ماضی اچھالنا شروع کردیا تھا۔ یکایک ان کی بینائی تیز ہوگئی تھی اور انہیں ماضی قریب میں ہونے والے بہت سے منظم اور بڑے جرائم میں راجن کا ہاتھ نظر آنے لگا تھا۔

دھونس' دھاندلی' طاقت اور سازشوں کے بل پر بھرپور زندگی گزارنے والے دونوں ساتھی یکساں انجام سے دوچار ہوئے تھے۔ سوبھراج کی موت ریکارڈ پر نہیں آئی تھی مگر اس کے کرتوت ہر ایک کے سامنے آنا شروع ہوگئے تھے۔ راجن کی موت کی تصدیق ہوگئی تھی۔ اس کے خلاف دل کھول کر بھڑاس نکالی جارہی تھی۔

دوپہر کے بارہ بجے غیر متوقع طور پر ڈان کا فون آگیا۔ اس کے لب ولہجے سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ بہت زیادہ خوش تھا۔ اس نے نہایت پُرتپاک لہجے میں میری مزاج پرسی کی پھر بولا ''تم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ گے؟''

''ہاں..... میری کچھ ذاتی مجبوریاں ہیں۔ مجھے جانا ہوگا مگر میرا وعدہ ہے کہ میں جلد ہی واپس آؤں گا۔ تمہارے پاس سال چھ مہینے رہ کر میں اتنا کما سکتا ہوں جو پاکستان میں رہ کر عمر بھر حاصل نہیں ہوسکے گا۔''

فون پر ڈان کے بے ساختہ قہقہے کی آواز گونجی۔ میرے کانوں نے پہلی بار اس کا قہقہہ سنا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ''معلوم ہوتا ہے کہ تم نے فرصت میں اس موضوع پر خاصی دماغ سوزی کی ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم کچھ دنوں کے لیے یہاں رکو۔ اگلی بار آؤ تو اپنی عورت کو ساتھ نہ لانا۔ عورت کا ساتھ انسان کو بہت کمزور کردیتا ہے۔''

''تم نے میرے دل کی بات پڑھ لی۔'' میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا ''اگلی بار میں اکیلا آنے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔''

''تم نے اپنی واپسی کا معاملہ چاؤفان کے سپرد کردیا ہے۔ یہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے۔ میں بار بار تمہیں نہیں بتاسکتا کہ بے پروائی اس کے خمیر میں شامل ہے۔'' ڈان نے اپنی سازش کی داغ بیل ڈال دی ''اب اس کے پیچھے لگ کر اپنے ٹکٹ اور پاسپورٹ جلد لے لینا۔ نشے میں اس نے یہ

چیزیں کہیں چھوڑ دیں تو اسے مر کر بھی یاد نہیں آئے گا کہ اس نے تمہاری چیزیں کہاں چھوڑی ہوں گی۔ تم لنک کر رہ جاؤ گے۔''

''ڈان! مجھے ایسی بددعا نہ دو۔ وہ اتنا غیر ذمے دار بھی نہیں ہے۔''

''میری ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اس وقت میں نے تمہیں دعوت دینے کے لیے فون کیا ہے۔ کل رات چاؤفان تمہیں لے آئے گا۔ اپنی عورت کو ضرور ساتھ لانا۔''

وہ غزالہ کو بار بار عورت کہہ رہا تھا۔ چاؤفان کو میں اس تحقیر آمیز انداز پر جھاڑ چکا تھا۔ ڈان کو کچھ کہنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں نے اوپری دل سے کہا ''ہم ضرور آئیں گے۔''

''ہو سکے تو ایک کام بھی کر ڈالو۔'' ڈان نے سرسری لہجے میں کہا۔

''حکم دو۔ میں جب تک یہاں ہوں' ہر کام کے لیے حاضر ہوں۔''

''پاکستانی جوڑا..... جوڑا نہیں بلکہ ایک مرد اور ایک عورت..... ان کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ بنکاک میں ہزاروں ہوٹل اور گیسٹ ہاؤس بکھرے ہوئے ہیں۔ میرے آدمی ان کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ پتا نہیں چل رہا کہ وہ سیام کانٹی نینٹل سے نکل کر کہاں غائب ہو گئے۔ تم بھی اپنے طور پر کوشش کرو' تم نے ان کو ڈھونڈ لیا تو میں تمہیں ایک بڑا انعام دوں گا۔''

''میں کوشش کرتا ہوں!'' میں نے پورے خلوص سے اسے یقین دلایا۔

''تمہیں ان کے کوائف یاد ہیں ناں..... اکبر خان اور رینا الیف ہیریسن..... وہ.....!''

''مجھے سب یاد ہے۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا ''تم نے میرے سامنے چاؤفان کو ان کے بارے میں ہدایات دی تھیں۔''

''ویری گڈ!'' ڈان کی ستایشی آواز آئی ''یہ کام ہو جائے تو کل کے جشن کا مزہ دوبالا ہو جائے گا۔ مرد کو عورتیں گھیر لیں گی' عورت مردوں کے نرغے میں ہوگی۔ ہمارے پس ماندہ قبائلی اسے طاغوتی رقص کہتے ہیں۔ یہ دشمن کے گرد ناچا جاتا ہے.....''

میں اس سے زیادہ تفصیل سننا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر نرمی سے اس کی بات کاٹ دی ''ڈان! آج تم سنسنی خیز باتیں کر رہے ہو۔ میں نے سنا تھا کہ تم عورتوں کی بہت عزت کرتے ہو' اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا تم نے!''

''میں نے عورت کو حقیر' کم تر اور کمزور سمجھ کر ہمیشہ معاف کیا ہے۔'' اس کی آواز تکبر آمیز ہو گئی ''اس پر رحم کیا جا سکتا ہے' اس کی عزت نہیں کی جا سکتی۔ یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں عورتوں کی عزت کرتا ہوں۔''

''مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ یہ میرا اندازہ تھا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا ''اچھا ہوا کہ تم نے میری غلط فہمی دور کر دی۔ کمزور سمجھ کر رحم کھانے اور عزت کرنے میں بہت فرق ہے۔''

''عزت بڑوں یا برابر والوں کی کی جاتی ہے۔'' اس وقت ڈان چبا چبا کر بول رہا تھا۔ اقتدار کا نشہ اس کے لب و لہجے سے جھلک رہا تھا۔ اس نے میرے جواب میں چھپے ہوئے ہلکے سے طنز کو سمجھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔

''تمہاری ہر بات میں حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔'' میں نے کوئی نئی تلخی پیدا کرنے کے بجائے اس کی ہاں میں ہاں ملانے میں عافیت جانی۔ میں وہ سنبھالا لینے کے بجائے کوئی کڑوی بات کہہ دیتا تو ڈان کا مزاج برہم ہو سکتا تھا ''اپنے سے کم رتبے والوں کی کوئی عزت نہیں کرتا۔'' میں نے اپنی بات پوری کی۔

''کل تم تماشا دیکھ لینا۔'' وہ بولا ''وہاں بہت بڑی بھیڑ نہیں ہوگی' چیدہ چیدہ لوگ آئیں گے۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جنہیں میں نے جان بوجھ کر نہیں بلایا مگر وہ آئیں گے تاکہ مجھے اپنی قربت اور وفاداری کا یقین دلا سکیں۔''

''ایسے لوگ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان سے تمہیں بہت زیادہ ہوشیار رہنا ہوگا۔'' میں نے رسمی لہجے میں کہا۔

''میں یہ سب کھیل جانتا ہوں۔ دنیا کو نچانے والے اب میری انگلیوں کے اشاروں پر ناچیں گے۔ اس تماشے کی جھلک کل رات کو نظر آ جائے گی۔''

شاید ڈان نے واقعی مجھے مدعو کرنے کے ارادے سے فون کیا ہو مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے میری غلطی کی نشان دہی کرنے کے لیے فون کیا ہو۔ چاؤفان مجھے ڈان کے ارادے سے باخبر کر چکا تھا۔ چاؤفان کی غیر ذمے داری پر زور دے کر ڈان نے گویا اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ چند روز بعد وہ مجھے دونوں پاسپورٹ گم ہونے کی خبر دیتا تو ساتھ ہی یہ ٹیپ کا بند بھی دہرا دیتا کہ چاؤفان کے بارے میں وہ پہلے ہی اپنے اندیشے کا اظہار کر چکا تھا۔ میں ڈان کے سامنے شکایت کا ایک لفظ بھی اپنی زبان پر لانے کے قابل نہ رہتا۔

چند ثانیوں تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ڈان نے فون بند کر دیا۔

''ڈان اپنا کام نکال لینے کے بعد شرارت پر تلا ہوا ہے تو آپ اس بارے میں کیوں فکرمند ہو رہے ہیں؟'' غزالہ نے پوری روداد سن کر قدرے حیرت کے ساتھ کہا ''اس کی پارٹی ختم ہونے سے پہلے ہم تھائی لینڈ کی سرحد عبور کر کے کمبوڈیا میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ ہمارے نکل جانے کے بعد ڈان جو چاہے کرتا پھرے' اس سے ہمیں کیا نقصان پہنچے گا؟''

''اب وہ پرانا ڈان نہیں رہا'' میں نے دھیرے سے کہا ''وہ موذی ہو گیا ہے۔ اگر کہیں بھی کوئی گڑبڑ ہو گئی اور ڈان کو ہمارا سراغ مل گیا تو وہ ہماری زندگیاں عذاب بنا دے گا۔''

''یہ خطرہ پہلے بھی تھا' اب بھی ہے۔ ڈان سے ہونے والی گفتگو کے بعد اس میں کون سا نیا اضافہ ہوا ہے جو آپ پریشان ہو رہے ہیں؟''

''تم بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟'' میں نے ذرا جھنجلا کر کہا ''پہلے بات کھلی نہیں تھی۔ ڈان سے لحاظ و مروت کی امید کی جا سکتی تھی۔ اب وہ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ اس نے چاؤفان کی غیر ذمے داری کا ذکر کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پاسپورٹوں کی خورد برد کے بارے میں چاؤفان نے مجھ سے غلط بیانی نہیں کی۔ وہ پاسپورٹ غائب کر کے مجھے اپنا قیدی بنانا چاہتا ہے۔ اسے ہمارے فرار کی ذرا بھی سن گن مل گئی تو کم از کم مجھے پکڑ دینے کی بھرپور کوشش ضرور کرے گا۔ یوں سمجھو کہ اب اس کے ساتھ میری سرد جنگ کا آغاز ہو چکا ہے۔''

''یہ کافی ہے کہ یہ سرد جنگ زیادہ لمبی نہیں ہو گی۔ کل رات اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہاں سے نکل جانے کے بعد آپ اس کے چنگل سے آزاد ہو جائیں گے۔''

''تم یہ سوچ سکتی ہو' میرے لیے یہ فرض کرنا مشکل ہے۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں تمہارے علم میں نہیں ہیں اس لیے تم خوش گمانی میں مبتلا ہو۔''

''آپ اس وقت شدید ذہنی دباؤ میں آئے ہوئے ہیں۔'' غزالہ نے متانت سے کہا ''چھوٹی اور بڑی ہر اہم بات مجھے بتا دیں تاکہ میں آپ کو بہتر مشورہ دے سکوں۔ یہ ہم سب کے لیے بہت خطرناک مرحلہ ہے۔ ذرا سی چوک ہو گئی تو سب مارے جائیں گے۔''

''ڈان کے سارے روابط بہت تیزی سے استوار ہو رہے ہیں'' میں نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد کہنا شروع کیا ''چاؤفان بتا رہا تھا کہ امیگریشن کے محکمے کا سربراہ ڈان کا پرانا دوست ہے۔ ڈان میرے بارے میں اسے ہدایت دے چکا تھا۔ اگر میں خاموشی سے بنکاک سے روانہ ہونے کی کوشش کرتا تو امیگریشن والے کسی بھی بہانے مجھے سفر کرنے سے روک دیتے۔''

''آپ نے پاسپورٹ لوٹا دیے ہیں۔ اب ایسا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔''

میں نے خاموشی سے غزالہ کی آنکھوں میں جھانکا پھر کہا ''تم درست کہہ رہی ہو لیکن اس سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ ڈان کا اثر رسوخ بہت زیادہ ہے۔ وہ کمبوڈیا میں بھی ہمیں تلاش کر سکتا ہے۔ تھائی لینڈ کے قرب و جوار کے ملکوں میں ہم زیادہ دیر تک اس سے نہیں بچ سکیں گے۔''

''یہ مسئلہ واقعی گمبھیر ہے۔ سفری دستاویزات کے بغیر ہم وہاں سے کیسے نکل سکیں گے..... اس بار ہمارے پاسپورٹوں کی تیاری میں جلال کو کیا مشکل پیش آ رہی ہے؟''

''پاسپورٹ بن چکے ہیں۔ ان کا کوئی مسئلہ نہیں' ساری دشواری ویزا کے حصول میں پیش آ رہی ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا ''ہمارے لیے متعدد ملکوں کا ویزا ضروری ہے۔ بعض ممالک نے ویزا کے اجرا کا طریقہ پیچیدہ بنا دیا ہے جس کے باعث دیر ہو رہی ہے۔''

''اب پوری صورتِ حال واضح ہو گئی۔'' وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی ''پاسپورٹ بنوانا جلال کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ساری دشواری ویزا کی ہے' اب کیا ہو گا؟''

''وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔'' میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ''اس سے ایک بار پھر بات کرنی پڑے گی۔ ہماری یہاں سے روانگی اٹل ہے۔ ہمارے پاسپورٹ تاخیر سے آتے ہیں تو طارق کو کمبوڈیا تک دوڑ لگانی ہو گی۔ جب تک ہم تھائی لینڈ کی سرحدوں سے دس پانچ ہزار میل دور نہیں نکل جاتے' ڈان کا خطرہ ہمارے سروں پر منڈلاتا رہے گا۔''

وہ نکتہ میرے ذہن میں اتنا واضح نہیں تھا۔ غزالہ سے ہونے والے سوال و جواب میں بات سے بات نکلتی رہی اور وہ نتیجہ سامنے آ گیا۔

کمبوڈیا اس علاقے کا ایک افلاس زدہ ملک تھا۔ چاؤفان نے اس ملک کے سرحدی پاسبانوں کی بدعنوانیوں اور رشوت خوری کی جو تصویر پیش کی تھی اس سے یہ امید پیدا ہو چلی تھی کہ کمبوڈیا میں رقم خرچ کر کے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا لیکن ایسے لین دین اور سہولتوں کے حصول کے لیے

زبان سے واقفیت ضروری تھی۔

تھائی لینڈ میں دنیا بھر سے انگریزی بولنے والے لاکھوں سیاح آتے ہیں لیکن بنکاک میں انگریزی جاننے والے عام مقامیوں کی تعداد قابل رحم حد تک کم تھی۔ کمبوڈیا میں مجھے اس سے بدتر حال نظر آنے کی توقع تھی۔ جب زبان یارمن ترکی دمن ترکی نمی دانم والا معاملہ ہو تو روزمرہ گزارا مشکل ہوجاتا ہے۔ ایسے ملک میں کسی سے غیر قانونی سفر کے بارے میں معاملات طے کرنا مشکل ہی نہیں' خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا۔

بہتر یہی تھا کہ ہم جیسے تیسے تھائی لینڈ سے نکل جاتے اور کمبوڈیا میں کہیں ٹک کر جلال کے بھیجے جانے والے نئے پاسپورٹوں کا انتظار کرتے۔ ان پر بنکاک میں داخلے کی مہروں کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان پر ہمارے کمبوڈیا میں داخل ہونے کا اندراج ہوتا تو ہم ان پاسپورٹوں پر نئے ناموں کے ساتھ نہایت اطمینان سے کسی اور منزل کی طرف روانہ ہوسکتے تھے۔ ڈان یا گیری کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوسکتا تھا کہ ہم بنکاک سے کہاں غائب ہوگئے تھے۔

اس موضوع پر مسلسل سوچتے رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند باریکیاں میرے ذہن میں واضح ہوگئیں جو بدلے ہوئے حالات میں کلیدی اہمیت اختیار کرگئی تھیں۔

نئے ناموں سے ہمارے لیے پاسپورٹ اور ویزا کے حصول کے لیے جلال کی ہدایات پر جو کچھ ہورہا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم بنکاک سے کسی بین الاقوامی پرواز کے ذریعے کسی دور دراز مقام کے لیے روانہ ہوسکیں۔ اس پلان میں کمبوڈیا جیسے غیر معروف ملک کا سرے سے کوئی ذکر نہیں تھا۔

جلال سے آخری بار میری گفتگو ہوئی تو میں نے اسے یہ بتادیا تھا کہ میں ہر قیمت پر بنکاک سے نکل بھاگنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے میری اگلی منزل کے بارے میں جاننا چاہا تو میں اسے کوئی جواب نہیں دے سکا کیونکہ اس وقت تک مجھے خود بھی علم نہیں تھا کہ چاؤفان مجھے کدھر کا رخ کرنے کا مشورہ دے گا۔

جلال کو یہ معلوم ہونا بہت ضروری تھا کہ تاخیر ہونے کی صورت میں ہمیں تھائی لینڈ کے ویزا کی ضرورت رہی تھی نہ بنکاک میں داخلے کی مہروں کی ضرورت تھی۔ ان لوازم کی تکمیل کمبوڈیا کے حوالے سے ہونی تھی۔ جب تک ہمارے پاس کمبوڈیا میں داخل ہونے کا جائزہ اور قانونی ثبوت نہ ہوتا ہم وہاں سے آسانی سے نہیں نکل سکتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ وہ مسئلہ اتنی شدت کے ساتھ میرے ذہن پر سوار ہوتا چلا گیا کہ میں نے بے چین ہوکر جلال کا فون نمبر ملالیا۔

وہ اس وقت دبئی انٹرنیشنل ایرپورٹ پر تھا۔

''ایرپورٹ پر تم کیا کررہے ہو؟'' جلال کی زبان سے وہ خبر سنتے ہی میں نے بے ساختہ سوال کیا۔

''ایک گھنٹے بعد میں کراچی روانہ ہورہا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے کس سلسلے میں فون کیا ہے؟'' اس نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔

''کراچی!'' میں نے چونک کر دہرایا ''کیا تمہاری کانفرنس ختم ہوگئی؟''

''کل کانفرنس کا آخری دن ہے۔ میں اپنے معاون کو یہاں چھوڑ کر واپس جارہا ہوں۔ میرے لیے تم چاروں کا معاملہ زیادہ اہم ہے۔ اس میں گڑبڑ ہوئی تو ہمیں بچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔'' اس کی آواز سے بے چینی مترشح ہورہی تھی۔

''میں تمہارا ممنون ہوں۔'' میں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا ''تم نے معاملات کا صحیح اندازہ لگایا ہے۔ یہاں کے حالات پل پل رنگ بدل رہے ہیں' ہم دونوں اپنے پاسپورٹوں سے محروم ہوچکے ہیں۔ ہم کسی نہ کسی طرح کل رات یہاں سے نکل جائیں گے.....''

اس نے اضطراری انداز میں میری بات کاٹ دی ''کسی طرح دو دن اور گزارلو۔ میں تم لوگوں کے مکمل پاسپورٹ وغیرہ لے کر خود بنکاک آؤں گا۔ اس کے بعد میں تمہیں ایک پل بھی نہیں روکوں گا۔ میں نے اندازہ لگالیا ہے کہ تم بہت برے پھنسے ہوئے ہو۔ عجلت میں تمہارے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو میں عمر بھر خود کو معاف نہیں کرسکوں گا۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا ''میں نے ناپا تلا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس میں کامیابی کا نوے فی صد سے زیادہ امکان ہے۔ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے تو وہ ہمارے مقدر کی خرابی کے سبب ہوگی۔ مقدر کو ٹالنا میرے اور تمہارے بس سے باہر ہے۔''

''اب تک تم نے یہ تو طے کرلیا ہوگا کہ تمہیں کہاں جانا ہے؟''

''کمبوڈیا! ہم رشوت دے کر زمینی راستے سے وہاں پہنچیں گے۔'' میں نے اسے بتایا ''اب بنکاک اور تھائی لینڈ کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ ہمارے پاسپورٹوں کے مندرجات

کچھ ایسے ہونے چاہئیں کہ ہم کمبوڈیا سے بلا روک ٹوک نکل سکیں۔"

"بہت مناسب فیصلہ ہے۔" اس نے بے ساختہ لہجے میں میری تائید کی "بنکاک تمہارے بدترین دشمنوں کی آماج گاہ بن چکا ہے۔ کمبوڈیا میں تمہیں ان سب سے نجات مل جائے گی...... ہوسکے تو مجھے اپنے منصوبے کے کچھ خدوخال بتادو۔"

آخری فقرے پر اس کے لہجے میں عاجزی سمٹ آئی تھی۔ میں چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ وہ آئی بی کا ایک ذمے دار اور باخبر افسر تھا۔ اگر وہ فون پر کچھ جاننے کی خواہش ظاہر کررہا تھا تو اسے اس خواہش کے مضمرات کا بھی اندازہ ہونا چاہیے تھا۔ فون پر میری کہی ہوئی باتیں کسی اور کے کانوں میں پڑجاتیں تو میں بہت مخدوش حالات کا شکار ہوسکتا تھا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں نے اپنے موتی محل کے داخلے کے سلسلے میں فون پر کراس ٹاک سننے کا افسانہ تراشتے ہوئے بنکاک کے فون سسٹم پر اپنے عدم اعتماد کا اظہار کیا تو ڈان نے پورے اعتماد سے اس سسٹم کی وکالت کی تھی۔ ویسے بھی میں نے بنکاک آنے کے بعد کسی اہم بات کے لیے لینڈ لائن استعمال کی تھی اور نہ ہی ایس ڈی سامان سے نکالنے کی نوبت آئی تھی۔ سارے اہم اور خفیہ رابطوں کے لیے دو موبائل فون میرے استعمال میں رہتے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ محتاط رہنے کے باوجود مجھے ان پر بہت کچھ کہنا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود میرے قیام کے دوران میں اس حوالے سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ جب تک خاص طور پر کوشش نہ کی جاتی، میرے موبائل فونز پر ہونے والی گفتگو کوئی غیر متعلق آدمی نہیں سن سکتا تھا۔

دوسرا اور اہم ترین نکتہ یہ تھا کہ ڈان اور چاؤفان کو میرے اس فون کا سرے سے کوئی علم نہیں تھا جو مجھے اول خان نے دیا تھا۔ میرے سارے بیرون ملک رابطے اسی فون پر ہوتے تھے۔ ان دونوں کو صرف اس مقامی موبائل فون کا علم تھا جو میں نے بنکاک میں لیا تھا۔ ڈان میری سرگرمیوں سے باخبر رہنے کے لیے کسی کو میرے پیچھے لگاتا تو اس کی ساری توجہ اسی فون نمبر پر مرکوز رہتی جس پر میں ڈان اور چاؤفان سے بات کرتا تھا۔

میری چند لمحوں کی خاموشی سے جلال نے میری الجھن بھانپ لی اور میرے لب کشا ہونے سے پہلے مضطربانہ لہجے میں بولا "فکر نہ کرو...... موبائل فون محفوظ ہے، ہماری گفتگو کوئی نہیں سن سکے گا، کسی نے سن بھی لی تو اردو اس کے پلے نہیں پڑے گی۔"

اس کا تبصرہ سنتے ہی میں نے اسے اشاروں کنایوں میں اپنے پورے منصوبے سے آگاہ کردیا۔ میں نے چاؤفان کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میری زبان سے ایسے کلمات سنتے ہی وہ مصر ہوجاتا کہ میں کوئی خطرہ مول لینے کے بجائے اس کی طرف سے آنے والے پیکٹ کا انتظار کرلوں۔ مجھے اس کے خلوص کے بارے میں کبھی کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی کہ اس نے ہماری پریشانی کا ادراک کرتے ہوئے دبئی کی کانفرنس سے قبل از وقت واپس لوٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور بذات خود ہمارے پاسپورٹ بنکاک لانے پر تل گیا تھا۔

"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکا کہ کسی وقت تمہیں کمبوڈیا جانا پڑے گا۔" اس نے میری روداد سن کر پرتشویش آواز میں کہا "تمہارے پرانے پاسپورٹ پر کمبوڈیا کا اندراج تھا نہ اب یہ ملک شامل ہے۔ میں کراچی پہنچتے ہی کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ آثار بتارہے ہیں کہ اب مجھے بنکاک کے بجائے کمبوڈیا میں تم سے ملنا ہوگا۔"

"ابھی مجھے خود اندازہ نہیں کہ ہم کس شہر میں نکلیں گے۔" میں نے تفکر آمیز لہجے میں جواب دیا "اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہاں سے نکل کر کمبوڈیا میں داخل ہونا ہے۔ یہ مرحلہ طے ہوتے ہی میں تم کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کروں گا۔"

"یہ خیال رکھنا کہ شہر بڑا ہو اور وہاں سے بین الاقوامی پروازیں روانہ ہوتی ہوں۔" اس نے پرخلوص لہجے میں مشورہ دیا۔

"مجھے تمہاری مجبوریوں اور ذمے داریوں کا اندازہ ہے۔" میں نے کہا "پاسپورٹوں کے اندراجات درست ہوں تو تمہیں کمبوڈیا آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے کسی بھی قابل اعتماد آدمی کے ہاتھ ہمارا پیکٹ بھیج سکتے ہو......"

اس نے میری بات درمیان سے کاٹ دی "تم ان تفکرات کو اپنے ذہن سے جھٹک دو، میں نے اپنے ذہن میں ایک خاکہ بنالیا ہے۔ دعا کرو کہ میں اپنی کوششوں میں کامیاب رہوں۔ تم سے بس اتنی گزارش ہے کہ اب اپنا نام منظر عام پر نہ آنے دینا۔"

"مجھے تمہاری ہدایت اچھی طرح یاد ہے۔ راجن ● آخری مقابلے میں، میں نے بیم گن ضرور استعمال کی مگر اس کی نشانیاں اس طرح مٹائیں کہ اب تک کہیں سے اس کا اثر

سننے میں نہیں آیا۔'' میں نے اس کی مکرر تاکید کا برا منائے بغیر جواب دیا ''میری کوشش ہوگی کہ آیندہ ایسی کوئی نوبت بھی نہ آنے پائے مگر مجبوری انسان کو بے بس کر دیتی ہے۔''

''میرے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہے کہ میرا مشورہ تمہارے ذہن میں جاگزیں ہے۔ تم نے سرسری انداز میں اسے فراموش نہیں کیا۔''

''میں اب یہاں سے کسی سے رابطہ نہیں کروں گا۔ تم سے بات کرنی ضروری تھی۔ یہ تو بتاؤ کہ اول خان کا کیا حال ہے' وہ کیا کر رہا ہے؟''

''محنتی آدمی کہیں بھی ہو' اپنا وجود منوا لیتا ہے۔'' جلال کی آواز سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی ''میرا اندازہ ہے کہ امریکی کیمپ کا دباؤ ختم کرنے کے لیے اسے کراچی سے گوادر بھیجا گیا تھا۔ اس نے وہاں اپنے لیے کام تلاش کر لیا۔ باقی کسر تمہاری ٹپ نے پوری کر دی۔ میری تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اس نے تین آدمی دھر لیے ہیں۔ ان میں ایک مقامی اور دو بھارتی ہیں۔''

''کیا یہ غیر معمولی پیش رفت نہیں ہے؟'' میں نے اس کی گفتگو میں وقفہ آتے ہی تحیر زدہ لہجے میں سوال کیا۔

''یہ اس کی انتہائی غیر معمولی کامیابی ہے۔'' اس سے زیادہ حیران کن حقیقت یہ ہے کہ زندہ بچنے والے بھارتی نے بہت تیزی سے سب کچھ اگل دیا ہے۔''

''یہ کیسے ہوا......؟ کیا ان میں سے کوئی مارا بھی گیا ہے؟'' میری حیرت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''تینوں کچھ مزاحمت کے بعد زندہ پکڑے گئے تھے۔ تمہارا اول خان ملک کے دشمنوں کے لیے بہت سفاک آدمی ہے۔ روٹین کی بازپرس میں ناکامی کے بعد اس نے دو کے سامنے ایک بھارتی ایجنٹ کو گندھک کے تیزاب سے نہلا دیا۔ رنگ سازوں کے برش سے اس کے پورے بدن پر دھیرے دھیرے تیزاب پھیرا گیا اور وہ بلبلا اٹھا۔ اس کی کرب ناک موت دیکھ کر دونوں نے ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولنا شروع کر دیا۔ تمہاری دی ہوئی خبر سو فی صد درست تھی۔ بنکاک سے تین کی ٹولی وہاں پہنچی تھی۔ ان کے سرغنہ کو راجن ہی نے اپنے ساتھ لایا تھا۔ شاید وہی را کا اصل ایجنٹ تھا۔ اس کی تلاش جاری ہے۔ بقیہ دونوں بدمعاش اس کے مددگار تھے۔ ایک مر گیا' دوسرا اول خان کا قیدی ہے۔''

وہ تفصیل سن کر میرے ذہن میں سوالات کا ایک طوفان اٹھا۔ میری دانست میں وہ بہت بڑا واقعہ تھا۔ اس بارے مکمل معلومات اول خان ہی فراہم کر سکتا تھا۔ وہ جلال سے زیادہ جرح کرنے کا محل نہیں تھا۔ میں نے کہا ''اس نے پنجاب جانے والی دوسری پارٹی کے بارے میں بھی کچھ بتایا ہوگا۔''

''ہاں' ابھی اتنی خبر ملی ہے کہ ان کی تعداد چار ہے۔ ان کے لیے چوہے دان تیار کیا جا چکا ہے۔ وہ اپنے قیدی کو چھڑانے کے لیے جوں ہی نمودار ہوں گے' بھاری سادہ پوش نفری انہیں گھیر لے گی۔''

''مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں نے یہاں بیٹھ کر اپنا وقت برباد نہیں کیا۔ اپنے ملک کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا رہا ہوں۔ کاش' میں جلد از جلد وہاں آ سکوں۔''

جلال کی طرف سے فوری طور پر کوئی جواب نہیں آیا۔ میرے بے ساختہ کلمات سے شاید اسے ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ لمحہ بھر کے نہایت واضح سکوت کے بعد اس کی ٹھہری ہوئی اور دھیمی آواز ابھری ''فکر نہ کرو' میں کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ تم کو جلاوطن شہزادہ نہ بننا پڑے' تم جلد از جلد ہمارے درمیان لوٹ آؤ۔ تم کو اندازہ نہیں ہے کہ میرے اور بہت سے دردمند پاکستانیوں کے دلوں میں تمہارے لیے کتنی عزت ہے۔ ایک فرد کی حیثیت سے تم نے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ تم کچھ بھی نہ کرتے تو ہم راجن کے خاتمے پر ہمیشہ تمہارے احسان مند رہتے۔ تم نے را کے بڑے بڑے ستون گرائے ہیں۔ ان کا ایک زخم بھرنے نہیں پاتا کہ تم انہیں دوسرا گھاؤ لگا دیتے ہو۔''

''یہ ہماری خوش فہمیاں ہیں۔ دہلی میں نریش شرما اور انل بسواس مارے گئے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ اب را کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ پاکستان کے خلاف ان کی کارروائیاں ایک لمبے عرصے کے لیے ماند پڑ جائیں گی لیکن وہ آج بھی اسی طرح سرگرم عمل ہیں۔'' میں نے ہلکی سی تلخی سے کہا ''دراصل فرد اور ادارے میں یہی فرق ہوتا ہے۔ فرد ختم ہوتا ہے تو اس کا بنایا ہوا پورا شیش محل اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ اداروں میں افراد کے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انل دہلی سے ڈوریاں ہلا رہا تھا۔ ساگر نے بنکاک میں راجن کا سہارا لے لیا۔ پاکستان کے خلاف ان کی سازشیں اور سرگرمیاں آج بھی جاری ہیں۔''

''ان کی نوعیت دوسری ہے جو نیٹ ورک تم نے توڑا تھا' اس کا متبادل اب تک تیار نہیں کیا جا سکا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے پاس راجن کے بارے میں حساس اور خفیہ معلومات موجود تھیں جو میں تم کو بھی نہیں دے سکتا تھا۔ راجن ایک الگ اور بڑا مسئلہ تھا۔ وہ خود گیا' گوادر میں اس کے بھیجے

ہوئے آدمی پکڑے گئے۔ ساہیوال آنے والی پارٹی چند روز میں پکڑلی جائے گی۔'' اس نے ایک ایک لفظ اور فقرے پر زور دیتے ہوئے میری بات کا جواب دیا ''تم اسے معمولی کام نہ سمجھو کہ تمہاری محنت کے نتیجے میں سوبھراج کا جماجمایا نیٹ ورک تباہ ہوا' تم نے نئی دہلی جاکر انہیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا' وہاں سے گرین کوبرا' فائل لے آئے اور اب بنکاک میں انہیں ادھیڑ ڈالا۔ کسی بھی سیکرٹ ایجنٹ کے لیے اتنی کامیابیاں قابلِ فخر ہوتی ہیں۔''

میں بے اختیار ہنس دیا ''میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ تمہارا سیکرٹ ایجنٹ ہونا بہت بڑا اعزاز ہے' میں تو حالات کے بھنور میں پھنس کر اپنا نام بھی کھو چکا ہوں۔ یہاں علی احمد بن کر آیا تھا' پتا نہیں اب تم مجھے کیا نام دیتے ہو؟''

''تمہاری ان باتوں سے میرے دل پر چوٹ لگتی ہے۔'' اس کی آواز کچھ دکھی ہوگئی ''لیکن تمہارا شکوہ بجا ہے۔ ان دونوں کے وہی نام ہیں جو انہوں نے ہوٹل چھوڑنے کے بعد اختیار کیے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ ان کی نئی شناخت کا تسلسل برقرار رہے مگر اب سب کچھ بدل گیا ہے۔ ملک بدلنے کے ساتھ ان ناموں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی' تم راجا یوسف ہو' غزالہ کے کاغذ سلمیٰ راجا کے نام سے بنوائے گئے ہیں۔''

مجھے احساس ہوا کہ میں نے ذرا سی دیر میں دوبارہ تلخ نوائی سے کام لے کر اس کے احساسات کو مجروح کر دیا تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا' وہ میرے اپنے کاموں کا نتیجہ تھا۔ جلال میرے دوسرے ہمدردوں کے بھرپور تعاون کے باوجود ان حالات کو بدلنے سے قاصر تھا۔ میں نے اس تلخی کو کم کرنے کے لیے ہنس کر کہا ''اب میری بیوی کو سلمیٰ بنا کر تم جہانگیر سے میرا جھگڑا کروادو گے۔''

''مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا۔'' اس نے اعتراف کیا ''نام اچھا تھا' میں نے چن لیا۔''

''جہانگیر کی کیا خیر خبر ہے...... وہ اب کہاں ہے؟'' اس کا ذکر آتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ وہ اسٹیشن فور میں رہ رہا تھا۔ نہ جانے اول خان کے تبادلے کے بعد اس کا کیا بنا تھا؟

''تبادلے کا حکم ملنے کے بعد اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔'' جلال نے بتایا ''اس وقت جہانگیر کی حفاظت کا سوال بھی زیرِ غور آیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں تھا اور اول خان اس کی سلامتی کے بارے میں فکرمند تھا۔ اس کی فورس کے آدمیوں کے ساتھ میرے آدمی بھی اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ تمہیں اس کی طرف سے فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔''

میں اپنے چکروں میں الجھ کر بہت کچھ بھولا ہوا تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ لوگ میرے جگری دوست کی خبرگیری سے غافل نہیں تھے۔

☆☆☆

ہمارا بقیہ وقت بے کاری' انتظار اور سنسنی کے عالم میں گزرتا رہا۔ رات آئی اور گزر گئی۔ اگلا دن ہمارے لیے ڈی ڈے تھا۔ شام کو ڈان کی پارٹی منعقد ہونی تھی۔ وہاں سے ہماری آزادی اور بقا کا فیصلہ کن مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔

اس دوران میں ہم دونوں اپنے کمرے میں محصور رہے۔ ہماری معلومات کے حصول کے ذرائع صرف ٹیلی وژن اور اخبارات تک محدود تھے۔ راجن کی موت اور موتی محل کی آتش زدگی کے واقعات جس گھن گرج کے ساتھ ذرائع ابلاغ پر نمودار ہوئے' اسی تیزی کے ساتھ معدوم ہو رہے تھے۔ ان واقعات کے اچھلنے کی صورت میں بنکاک کے بہت سے پردہ نشین افسروں کے نام بے نقاب ہو سکتے تھے اس لیے کسی کو بھی راجن کی بربادی سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ گاؤ آمد و خررفت والا معاملہ تھا۔ مرنے والے سے ہمدردی جتا کر کسی کو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ سب لوگ نئے آنے والے کی خوشنودی حاصل کرنے میں تن' من' دھن سے لگے ہوئے تھے۔

وہ واقعہ بڑا تھا اس لیے کہیں کہیں اس کی بازگشت موجود تھی۔ راجن کی ہلاکت کو کھلے الفاظ میں کسی گینگ وار کا انتقامی نتیجہ قرار دیا جا رہا تھا لیکن کسی میں ڈان برنارڈ کی طرف اشارہ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ شہر کے افسران لگے بندھے انداز میں یہ دعوے کر رہے تھے کہ وہ اس واقعے کے ذمے داروں کو جلد ہی کیفرکردار تک پہنچا دیں گے۔ میری دانست میں وہ کھوکھلے دعوے تھے کیونکہ ان ہی افسروں نے ڈان برنارڈ سے وفاداریوں کے اظہار کا خفیہ سلسلہ شروع کر دیا تھا جس کی نشاندہی چاؤفان کر چکا تھا۔

سارجنٹ پال کی مشتعل تھائی نوجوانوں کے ہاتھوں ہلاکت کا معاملہ البتہ سرفہرست برقرار تھا۔ مقامی حکام کے ساتھ امریکی اہل کار بھی اس واقعے کی تفتیش میں مصروف تھے۔ واقعہ بھرے بازار میں اور مصروف اوقاتِ کار میں پیش آیا تھا' وہاں دکانیں بھی تھیں اور خوانچہ فروش بھی علاقے میں ہر وقت پھیری لگاتے رہتے تھے لیکن اس واقعے کے بارے میں سب انجان بنے ہوئے تھے۔ سرتوڑ کوششوں کے باوجود وہ لوگ کوئی چشم دید گواہ تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔

میرے لیے وہ صورتِ حال بہت دلچسپ تھی۔ امریکی

یہ معما مر کر بھی حل نہیں کر سکتے تھے کہ اکبر اور ریٹا کی نگرانی کرنے والا سارجنٹ پال یکا یک تھائی لڑکوں کے غیظ وغضب کا نشانہ کیوں بن گیا۔ ویرا نے اس امریکی کو ایک نازک مرحلے پر آنکھ مار کر جس طرح اپنے جال میں پھنسایا تھا' اس سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ کس طرح دارعورت کی ایک جنبشِ ابرو سے فتنہ وفساد کے ہزار در کھل جاتے ہیں۔

بنکاک میں ہمیں اندر کی خبریں فراہم کرنے والا سب سے بڑا ذریعہ چاؤفان تھا۔ اس عرصے میں اس سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہوسکا۔ اس کے ساتھ مل کر اپنے فرار کا منصوبہ بنانے کے بعد میں محتاط ہوگیا تھا اور وہ شاید ڈان کے جشن کے انتظامات میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے کھل کر ہمدردی اور وفاداری کا اظہار کرتا رہا تھا لیکن میں ابتدا ہی سے اس طرف سے متذبذب تھا۔ وہ سب سے زیادہ ڈان سے وفاداری کا دم بھرتا تھا اور میرے سامنے بارہا اس دعوے کے عملی مظاہرے بھی کرتا رہا تھا۔ جب وہ اسے دغا دے کر میرے فرار کی منصوبہ بندی میں سرگرم ہوسکتا تھا تو اس سے یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ مجھے اپنے اعتماد میں لے کر ڈان کے گرگوں کے ہاتھوں مروادے۔ یہ میری مجبوری تھی کہ میں اپنے تمام تر شکوک وشبہات کے باوجود اس پر بھروسا کرنے پر مجبور تھا۔

ڈان مجھے بہ ظاہر اپنا دستِ راست قرار دیتا تھا لیکن اس کے ذہن میں میرے خلاف سنگین شبہات پل رہے تھے۔ اس نے مکاری سے کام لے کر ایک مرتبہ پھر ہمارے پاسپورٹ اپنی تحویل میں لے لیے تھے۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ پاسپورٹ لوٹانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ چاؤفان کی فراہم کی ہوئی اطلاع کے مطابق آخرکار ان پاسپورٹوں کی گمشدگی کی خبر آجانی تھی۔ دوسری طرف ڈان نے جس سرعت کے ساتھ کرنل گیری سے اپنے سارے اختلافات فراموش کر کے گہرے مراسم استوار کیے وہ میرے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ ڈان میری غیر معمولی کارکردگی کی بنا پر شک ظاہر کر چکا تھا کہ میں علی احمد کے روپ میں ڈینی تھا۔ بعد میں اس نے میری اداکاری کے نتیجے میں یہ مان لیا کہ مجھ جیسا شخص ڈینی نہیں ہوسکتا۔ شک کا بیج اس کے ذہن میں بہرحال موجود تھا۔ گیری سے اس کے گٹھ جوڑ کے بعد میرے لیے اپنے دہرے کردار کو نباہنا بہت مشکل ہوجاتا۔ میں زیادہ دیر تک بنکاک میں رکا رہتا تو امریکی اپنے وسائل کی مدد سے یہ جان لیتے کہ پاکستان میں علی احمد اور صدف علی کا کوئی حقیقی وجود نہیں رہا۔ اس انکشاف کے بعد ہمارے ساتھ جو کچھ ہوتا اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا۔

طارق نے اپنے بڑوں کی ہدایت پر گیری کی نگرانی کے اڑتالیس گھنٹے پورا کرنے کے بعد گھر کی راہ لے لی تھی۔ یہ اس کی سعادت مندی تھی کہ مقررہ وقت پورا ہونے کے بعد اس نے مختصر پیغام دے کر مجھے آگاہ کردیا تھا۔ ان اڑتالیس گھنٹوں میں مجھے اس سے ایک اہم خبر ملی تھی جو ہزار خبروں پر بھاری تھی۔ صبح کے ملگجے اندھیرے میں سیلرز بار میں ڈان سے ملاقات کے علاوہ گیری کی تمام نقل وحرکت سینٹو ہیڈ کوارٹرز کے اسپتال اور اپنے دفتر تک محدود رہی تھی۔

جوں جوں دن ڈھل رہا تھا' میرے ذہن پر دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ میں خاموشی اور یک سوئی سے بنکاک کے حالات اور اپنی روانگی کے منصوبے پر بار بار غور کرتا رہا۔ میری خواہش تھی کہ بنکاک میں کوئی ایسا کام نہ رہ جائے جس پر مجھے بعد میں پچھتانا پڑے۔

''بنکاک میں مجھے کچھ خریداری کرنی تھی۔'' دوپہر کو غزالہ نے باتوں کے دوران میں کہا ''میں نے یہ کام آخر کے لیے چھوڑا ہوا تھا لیکن اب یہاں سے خالی ہاتھ جانا ہوگا۔''

''ظاہر ہے!'' میں نے اس کے آخری فقرے کی تائید کی ''ان حالات میں ہم تن کے تین کپڑوں کے ساتھ یہاں سے صحیح سلامت نکل جائیں تو میں اللہ کا شکر ادا کروں گا..... ایسی کون سی خریداری تھی جو تمہیں اس وقت یاد آگئی؟''

''کچھ ذاتی چیزیں تھیں!'' اس نے مسکرا کر مبہم سا جواب دیا۔

''پاکستان میں سب کچھ مل جاتا ہے۔ بھاری مقدار میں اسمگل ہونے کی وجہ سے وہاں کے دام بھی شاید کم یا مناسب ہوتے ہوں گے' تم.....''

اس نے میری بات درمیان سے ہی اچک لی ''آپ یوں کہہ رہے ہیں جیسے ہم رات کی پرواز سے پاکستان روانہ ہونے والے ہوں۔ پتا نہیں کمبوڈیا میں کیا ملتا ہوگا۔ یہاں بعض چیزیں بہت خوب صورت اور سستی ہیں۔ دل چاہتا ہے سب خرید لیا جائے۔''

بنکاک سے روانگی کا مرحلہ قریب آنے پر غزالہ کے اندر کی عورت جاگ اٹھی تھی۔ وہ لاکھ پڑھی لکھی اور روشن خیال سہی لیکن ایک عورت تھی۔ وہ بھی سستے کے فریب میں ہرنی اور اچھی چیز خریدنے کی خواہش مند تھی۔ میں نے وہ کلیہ بیان کرنے کے بجائے نرمی سے کہا ''تم فکر مت کرو' ہم عمر بھر یوں ہی خانہ بدوش نہیں رہیں گے۔ جب بھی پاکستان

لوٹنے کا موقع ملا' یہ میرا وعدہ ہے کہ ہم بنکاک میں رکتے ہوئے جائیں گے تاکہ تم دل کھول کر اپنی خریداری کرسکو۔''

''آنے والا وقت کس نے دیکھا ہے۔ میرے دل میں ایک بات آئی اور میں نے آپ سے کہہ دی۔ یہاں اور کون ہے جس سے دل کی بات کی جائے۔'' اس نے ایک ادا سے اپنا سر جھٹک کے کہا ''ایک دوسرے سے کچھ کہہ سن لیا جائے تو دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔''

''فکر نہ کرو۔ چند گھنٹوں کی بات ہے پھر تمہارے چہیتے تم سے آملیں گے۔ ویرا کی بعض عادتوں کو ناپسند کرنے کے باوجود اس سے تمہاری گاڑھی چھنتی ہے۔ سیام پارک میں ہونے والی پہلی ملاقات میں تم اس کے ساتھ الگ بیٹھ کر یوں راز و نیاز کررہی تھیں جیسے وہ تمہاری اکلوتی سہیلی ہو۔''

''اوہ.....! آپ نے یہ بھی نوٹ کرلیا۔'' اس نے بے ساختہ ایک گہرا سانس لے کر کہا ''عورتوں کی بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو آپس میں کی جاتی ہیں۔ میں آپ کے خلاف کوئی سازش نہیں کررہی تھی۔''

اس کے لہجے کی شوخی نے وہ بات وہیں ختم کردی مگر میں نے دل ہی دل میں طے کرلیا تھا کہ پہلی فرصت میسر آنے پر اس کی خریداری کی خواہش کو پورا کرنے کا موقع ضرور دوں گا۔

چار بجے چاؤفان کی کال آگئی۔ اس کی آواز اور لب و لہجے سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ بہت بری طرح الجھا ہوا اور بدحواس ہورہا تھا۔ اس نے مجھے یہ یاددہانی کرانے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ٹھیک ساڑھے چھ بجے ہوٹل پہنچ جائے گا۔

اس نے زیادہ بات کی نہ میں نے چھیڑ چھاڑ کی کوئی کوشش کی۔ میری رضامندی پاتے ہی اس نے فون بند کردیا۔

ہوٹل کا حساب کچھ اس طرح چل رہا تھا کہ ہر وقت ہمارا ایک دن کا کرایہ وغیرہ پیشگی جمع رہتا تھا۔ ہم کسی اطلاع کے بغیر رخصت ہوجاتے تو ہوٹل والوں کو کم از کم واجبات کی حد تک کوئی شکوہ نہ ہوتا۔ میں نے پیشگی جمع کرائی ہوئی آخری رسید کا جائزہ لے کر اسے تلف کردیا۔ غزالہ نے پورے کمرے کی تلاشی لینی شروع کردی تھی۔

اسے مصروف چھوڑ کر میں غسل خانے میں گھس گیا تاکہ بنکاک میں آخری پُرتعیش غسل سے لطف اندوز ہوسکوں۔

چھ بجے ہم دونوں پوری طرح تیار ہوچکے تھے۔ ویرا کی طرح غزالہ بھی میک اپ کی عادی نہیں تھی۔ ڈان کی تقریب میں شرکت کے لیے اس نے سیاہ دھاریوں والا سوٹ زیب تن کیا تھا' جس میں اس کا نکھرا نکھرا سراپا بہت زیادہ دلکش لگ رہا تھا۔ میں نے ناقدانہ نظروں سے اس کا بھرپور جائزہ لیا لیکن کوئی نکتہ تلاش نہ کرسکا جس کے سہارے غزالہ کی شخصیت کو دبایا جاسکے۔

وہ شرابیوں اور زن پرستوں کا جشن تھا جہاں ذہنی کج روی کو مہمیز دینے کے سارے اسباب جمع کیے جانے تھے۔ مجھے فکر تھی کہ غزالہ وہاں آنے والوں کی بدنگاہی سے محفوظ رہ سکے۔ ڈان کے مہمانوں میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا تو میرے لیے اپنی کھوپڑی پر قابو پانا دشوار ہوجاتا اور فرار کا منصوبہ پسِ پشت چلا جاتا۔

غزالہ میری تیز نگاہوں کا مدعا بھانپ کر مسکراتے ہوئے بولی ''مجھے یوں گھور گھور کر نہ دیکھیں۔ میں نے دانستہ یہ سیاہ دھاریوں والا لباس پہنا ہے۔ رنگ اور ڈیزائن کے لحاظ سے یہی سب سے ہلکا تھا۔ میں وہاں خود کو سنبھال لوں گی۔ بس آپ اپنے غصے پر قابو رکھیے گا۔''

غزالہ نے ہمارا ضروری اسباب ایک تھیلے میں سمیٹ لیا تھا۔ جو شولڈر بیگ کی صورت میں آسانی سے اس کے شانے کی زینت بن سکتا تھا۔ کپڑے وغیرہ وہیں چھوڑ دیے گئے کیونکہ ہم کوئی بڑا تھیلا لے کر ڈان کی پارٹی میں شریک نہیں ہوسکتے تھے۔ چاؤفان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ہمارے اسباب کا تھیلا خاموشی سے مسروقہ کار میں منتقل کردے۔ ہمیں بالکل نارمل انداز میں پارٹی میں شریک ہونا تھا تاکہ ڈان کو ہمارے عزائم پر کوئی شبہ نہ ہوسکے۔

سوا چھ بجے ہم نے اپنے کمرے کا الوداعی جائزہ لے کر اسے خیرباد کہہ دیا۔

اپنے فلور سے ہوٹل کے دروازے تک مجھے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے ہر آنے جانے والا ہمیں غور سے دیکھ رہا ہو۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے سنسنی خیز معرکے سر کیے تھے لیکن کسی ملک سے ایک منظم سازش کے ذریعے فرار ہونے کا وہ پہلا تجربہ تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز تھیں اور آنے والے مراحل کے بارے میں ذہن میں ایک بھونچال سا آیا ہوا تھا۔

ہم اپنے خوف اور وسوسوں کو اپنے دلوں میں چھپائے' خراماں خراماں ہوٹل سے باہر نکلے تو دور ہی سے چاؤفان کی سیاہ اکارڈ نظر آگئی۔ وہ اپنے معمول کے مطابق مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے ہی آپہنچا تھا۔

ہمارے کار تک پہنچنے سے چند لمحے پہلے اس نے نیچے اتر کر غزالہ کے لیے ادب سے پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر مجھے حیران کردیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی یا پرائی کسی بھی عورت کی عزت نہیں کرتے' صنفِ نازک کو ہر حال میں

ایک پُرتعیش کھلونا تصور کرتے ہیں۔

دروازہ بند کرکے اس نے کسی مستعد ڈرائیور کی طرح اپنی جگہ سنبھالی اور گاڑی تیزی سے حرکت میں آگئی۔

''ماسٹر! تمہارا سامان کہاں ہے؟'' اس نے دھیمی اور سپاٹ آواز میں پوچھا۔

''سب ہوٹل میں چھوڑ دیا۔ ڈان سے آزادی کے لیے یہ قربانی ضروری تھی [illegible] نے کہا۔

''اچھا کیا' میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم پارٹی میں تھیلا کہاں لیے پھرو گے۔''

''کیا تم اسے ہماری گاڑی میں نہیں ڈال سکتے تھے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ماسٹر! توبہ کرو..... اب میں بھول کر بھی اس گاڑی کے قریب نہیں جاؤں گا۔ وہ شان دار بجیرد ہے اور وہاں پہنچائی جاچکی ہے۔'' بات کرتے ہوئے اس نے اپنا بایاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالا اور چابی نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا ''اس میں سب کچھ موجود ہے' ٹنکی بھری ہوئی ہے۔ فاضل کین بھی تیل سے بھرا ہوا ہے۔ تمہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی پھر بھی میں نے احتیاط سے کام لیا ہے..... آج میں خود کو معزز سمجھ رہا ہوں۔ اپنی مادام کو پہلی بار میری گاڑی میں بٹھا کر تم نے میری عزت افزائی کی ہے۔ میں تم دونوں کے لیے دعاگو رہوں گا۔''

''چاؤفان! یہ مادام نہیں میری بیوی ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''ماسٹر! تمہیں عورت کہنے پر اعتراض تھا' مادام تو عزت کا لفظ ہے۔ کیا تم اسے بھی برا سمجھتے ہو؟'' اس نے معصومانہ حیرت سے سوال کیا۔

''یقیناً عزت کا لفظ ہے لیکن تم نے اسے لی کے لیے استعمال کرکے مشکوک بنادیا ہے۔''

وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا اور پیچھے مڑے بغیر بولا ''صدف! تمہارا شوہر بہت دلچسپ اور دلیر آدمی ہے۔ ہر وقت حاضر دماغ رہتا ہے۔''

''بجیرد میں گاڑی کے کاغذات موجود ہیں؟'' میں نے غزالہ کے کچھ بولنے سے پہلے بات کا رخ یکایک تبدیل کردیا۔

''رنگ اور نمبر پلیٹ بدلی ہوئی ہے۔ اس کے مطابق کاغذات کی جعلی فوٹو کاپیاں بھی رکھ دی ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ تم کو ان کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ تھائی پولیس قیمتی اور نئی گاڑیوں کو کہیں نہیں روکتی۔ میں نے یہی سوچ کر نئی بجیرد کا بندوبست کیا ہے۔ گاڑی کی سج دھج کمزور ہوتی تو راستے میں تم کہیں بھی مشکل میں پڑ سکتے تھے۔''

مجھے اس کی زبان سے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تھائی پولیس کی ذہنی سطح ہماری پولیس سے بلند نہیں تھی۔ جاہ وحشمت اور ثروت وامارت سے وہ بھی فی الفور مرعوب ہوجانے کے عادی تھے۔ خوش پوش مجرم واردات کا ارتکاب کرکے بیش قیمت گاڑی میں آسانی سے فرار ہوسکتے تھے۔ خستہ حال گاڑیوں میں سفر کرنے والے بلاتکلف کہیں بھی روکے جاسکتے تھے اور ضرورت پیش آنے پر مشتبہ قرار دے کر بند کیے جاسکتے تھے۔

وہ ضمنی خوشی تھی۔ اہم تر بات یہ تھی کہ چاؤفان نے ہمارے فرار کے منصوبے پر خاصی باریکی کے ساتھ کام کیا تھا۔ بجیرد کا بندوبست دیگ کے ایک چاول کی طرح اس کی نیک نیتی کی غمازی کررہا تھا۔ میں نے سارے منفی خیالات اسی لمحے اپنے ذہن سے جھٹک دیے۔ چاؤفان کے بارے میں اندیشے دور ہوتے ہی مجھے تقویت اور توانائی کا احساس ہونے لگا۔

''چاؤفان! میں تمہارا ممنون ہوں۔'' میں نے پُرخلوص لہجے میں کہا ''میں زندگی بھر تمہارے اس تعاون کو فراموش نہیں کرسکوں گا۔''

''ماسٹر! مجھے شرمندہ نہ کرو۔ تمہارے بھاگ جانے میں تمہارے ساتھ میرا بھی فائدہ ہے۔ تم نے مجھے یہ رخ نہ سمجھایا ہوتا تو میں مرکر بھی ڈان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاتا۔''

..... آخری سفر میں صاف گوئی سے کام لے کر اس نے مجھ سے زیادہ غزالہ کو حیران کردیا۔

''اس کے باوجود تم ہمارے محسن ہو۔'' غزالہ بولی ''تمہارے تعاون کے بغیر ہم یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔''

''اب بھی یہ مرحلہ آسان نہیں ہے۔'' چاؤفان متانت سے بولا ''گاڑی میں اس علاقے کا ایک بڑا نقشہ رکھا ہوا ہے۔ میں نے سرخ قلم سے تمہارے راستے کی نشان دہی کردی ہے۔ بنکاک سے نکلنے کے بعد راستہ کچا پکا اور خراب ہے۔ تم بھٹک گئے تو پھر اللہ ہی تمہارا محافظ ہوگا۔''

''تم نے اپنی سی ہر کوشش کرلی ہے۔ اب کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو وہ ہمارا مقدر ہوگا۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا ''بنکاک سے نکلنے کے بعد تم قدم قدم پر یاد آتے رہوگے۔''

''تمہارا سفر درست سمت میں جاری رہا تو تم سورج نکلنے سے پہلے کمبوڈیا میں سیسوپھون کے سرحدی قصبے میں داخل ہوجاؤ گے۔'' وہ پُرخیال آواز میں بولا۔

''وہاں تمہاری کمی بری طرح محسوس ہوگی۔'' میں نے

سوچے سمجھے انداز میں گفتگو کا رخ بدلا ''کمبوڈیا کی زبان سے ناواقفیت ہمارے لیے عذاب بن سکتی ہے۔''

''وہ پس ماندہ ملک ہے' غربت اور جہالت عام ہے۔ وہاں نوم پنہہ سے باہر انگریزی جاننے والے بہت کم ملیں گے۔ کوئی بھی مشکل درپیش ہو تو بے دریغ ڈالر یا مقامی کرنسی استعمال کرنا۔ غربت کی وجہ سے لوگ خاصے لالچی ہیں۔'' چاؤفان نے اپنے تجربات کا نچوڑ بتایا۔

''تم وہاں آتے جاتے رہتے ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمیں کسی کارآمد آدمی کا پتا وغیرہ دے دو۔ ہم اس کو منہ مانگا معاوضہ دیں گے۔''

''ماسٹر! کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ خوف زدہ آواز میں بولا ''یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکے گی کہ میں نے دو غیر ملکیوں کو وہاں کسی کے پاس بھیجا تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے ڈان کے اعتماد کو دھوکا دے رہا ہوں لیکن اس کے غیظ وغضب کا سامنا نہیں کرسکتا۔ اس علاقے میں میرے دسیوں شناسا ہیں مگر میں تم کو کسی کے پاس نہیں بھیج سکتا۔''

''تم نہ بھیجو' مجھے صرف نام' پتا اور فون نمبر دے دو۔'' میں نے لجاجت سے کہا ''میں تمہارا نام لیے بغیر اس سے رابطہ کروں گا۔ اسے رقم ملے گی تو وہ زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرے گا۔''

''ماسٹر! تم کیوں اس طرح بات کررہے ہو' میں زمین میں گڑا جارہا ہوں۔''

''اس وقت تم زمین پر نہیں' اپنی کار میں ہو۔ تم نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے تو تھوڑی سی ہمت اور کرڈالو۔ یقین رکھو کہ تمہارا نام درمیان میں نہیں آئے گا۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' اس نے اٹل لہجے میں کہا ''تم ان علاقوں کے رواج سے ناواقف ہو۔ وہاں حوالے کے بغیر کوئی تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ جونہی ملے گا' سب سے پہلے یہ جاننا چاہے گا کہ تمہیں کس نے اس کے پاس بھیجا ہے۔ نام شناسا ہوا تو وہ تمہارا خادم ثابت ہوگا ورنہ وہ رکھائی سے تمہاری ساری جمع پونجی لوٹنے کا منصوبہ بنانے میں مصروف ہوجائے گا۔''

''یہ اور بھی آسان ہے۔'' میرے ذہن میں برمحل ایک تجویز آگئی ''تم اپنے کسی حریف کا نام بتادو جو اس علاقے میں پہچانا جاتا ہو۔ بات کھلے گی تو تمہارے بجائے وہ ڈان کے عتاب میں آجائے گا۔ تم کو اپنے ایک دشمن سے نجات مل جائے گی۔''

''ماسٹر! تم نے نہایت اعلیٰ درجے کا حرام مغز پایا ہے۔'' اس نے بے ساختہ کہا اور میں بھونچکا رہ گیا۔

''میرے حرام مغز کا کیا ذکر نکل آیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے لڑکپن میں اپنے گاؤں کے حکیم سے سنا تھا کہ انسان کی ریڑھ کی ہڈی میں چھپا ہوا حرام مغز ساری ذہنی صلاحیتوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ تم اتنی پھرتی سے ہر مشکل کا حل پیش کردیتے ہو کہ مجھے تمہارے حرام مغز پر رشک آنے لگتا ہے۔''

''اب کبھی اپنے گاؤں کی طرف جانا ہو تو اس حکیم کو گولی مار دینا۔ حرام مغز دماغ کا حاکم نہیں' تابع مہمل ہوتا ہے۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ''ایسے نیم حکیم اپنے الو کھے نقوں سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ میری تجویز کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''میرے ذہن میں پھوم فاٹ کا نام آرہا تھا۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''وہی' لی کا مال دار عاشق جو تمہارے ہاتھوں پٹا تھا؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''وہ چھوٹا راجن کا حاشیہ بردار تھا۔ ابھی اس کے کس بل باقی ہیں۔ نشے میں ڈوب جاتا ہے تو مادام کو بار بار فون پر تنگ کرتا ہے۔'' میں نے محسوس کیا کہ گاڑی میں غزالہ کی موجودگی کی وجہ سے چاؤفان نے سنبھل سنبھل کر وہ وضاحت پیش کی تھی۔

''پرسوں تم لی سے بیزار تھے کیونکہ اب وہ تمہارے پیچھے لگی رہتی ہے۔ اب کیوں اس سے ہمدردی کررہے ہو۔ وہ خود پھوم فاٹ سے نمٹ لے گی۔'' میں نے کہا۔

''ماسٹر! تمہاری بیوی کی وجہ سے میری زبان بند ہے۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کمینہ کیسا بلیک میلر ہے۔ دھمکیاں دیتا ہے کہ مادام کے قابلِ اعتراض پوسٹر شہر کی ساری دیواروں پر لگوادے گا۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ بھونکنے والے کتے کاٹا نہیں کرتے۔''

''ماسٹر! یہ نہ کہو۔ اب کبھی کبھی کاٹ لیتے ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے' محاورے غلط ثابت ہوتے جارہے ہیں۔'' وہ حسرت زدہ آواز میں بولا۔

''اب تمہارا وقت آگیا ہے' کسی بھی وقت اسے گھیر لو۔''

''اب وہ چھپتا پھر رہا ہے۔ میں نے بتایا نا کہ مادام کے گھر کے چکر لگانے کے بجائے وہ فون کرنے لگا ہے۔ میں اسے کہاں پکڑوں..... بس تمہاری تجویز درست ہے۔ اس کا

نام استعمال کر ڈالو۔ میری شکایت پر ڈان کان نہیں دھرے گا۔ تمہارے چکر میں اس کا نام سامنے آئے گا تو ڈان غضب ناک ہو کر اس کا خون پی جائے گا۔'' چاؤفان نے میری مرضی کا فیصلہ سنا دیا'' یہ عجیب بات ہو رہی ہے کہ میرے فائدے میں تمہارا فائدہ ہو رہا ہے۔ تم کو کمبوڈیا میں مدد گار مل جائے گا۔ پھوم فاٹ سے مادام کی جان چھوٹ جائے گی۔ چند دنوں میں اس خبیث نے مادام کو زچ کر دیا ہے۔''

''تم مجھے سیسو پھون والے آدمی کا نام پتا دے دو۔ میں پھوم فاٹ کے کریا کرم کا پورا بندوبست کر دوں گا۔'' میں نے اسے دلاسا دیا۔

گاڑی شہر کی حدود سے باہر آ کر کشادہ سڑک پر بہت تیزی سے رواں تھی۔ بنکاک میں وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد کہیں راز و نیاز کی باتیں کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ چاؤفان نے رفتہ رفتہ گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے اسے سڑک کے کنارے روک دیا۔

گاڑی کی کیبن لائٹ جلا کر اس نے ڈیش بورڈ کے خانے سے ایک مڑی تڑی جیبی ڈائری نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے کے بعد اسی میں سے ایک صفحہ پھاڑ کر اس پر انگریزی میں اپنے کمبوڈین شناسا کا نام اور فون نمبر لکھ کر وہ کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔

''اسے احتیاط سے رکھ لو۔ یہ یاد رکھنا کہ وہ تھوڑی بہت انگریزی جانتا ہے۔ دھیمی اور آسان زبان میں بات کرو گے تو وہ سب سمجھ جائے گا ورنہ مشکل ہو گی۔''

''بے فکر رہو۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔'' میں نے اس کا دیا ہوا کاغذ تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے تعاون سے میرے مسائل ایک ایک کر کے حل ہوتے نظر آ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ہوا میں مخصوص سمندری بو کے گہرے رچاؤ سے اندازہ ہوا کہ ہم ساحلی علاقے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا لیکن مجھے بندرگاہ کی تیز روشنیاں اور اس روشنی میں حرکت کرتے ہوئے' کرینوں کے بلند فولادی ڈھانچے کہیں نظر نہیں آئے۔

''ماسٹر! اندھیرے میں کسے تلاش کر رہے ہو؟'' چاؤفان نے میری بے چینی بھانپ کر پوچھا۔

''شاید ہم سمندر کے قریب پہنچ چکے ہیں لیکن بندرگاہ کہیں نظر نہیں آ رہی۔''

''میں نے دوسرا راستہ لیا ہے۔ بندرگاہ پیچھے رہ گئی ہے۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ڈان کی پارٹی ایک ساحلی ویرانے میں ہو گی' ہم اسی طرف جا رہے ہیں۔''

''کھلے ساحل پر کسی پُرتکلف ضیافت کا بندوبست بہت مشکل ثابت ہوا ہو گا۔''

''ماسٹر! تمہارا خادم ناممکن کو ممکن بنانے میں ماہر ہے۔'' اس نے شیخی بگھاری'' سارا بندوبست مثالی ہے۔ ذرا سی دیر میں تم کو جنگل میں منگل ہوتا ہوا نظر آئے گا۔''

ہماری گاڑی غالباً ساحل کے متوازی دوڑتی رہی۔ پہاڑیوں اور ٹیلوں کی وجہ سے سمندر ہماری نظروں سے اوجھل تھا لیکن فضا سمندر سے قرب کی چغلی کھا رہی تھی۔ چند منٹ کے بعد ہمیں تاریک فضا میں اوپر تک روشن غبار سا پھیلا ہوا نظر آنے لگا جو تیزی سے واضح ہوتا جا رہا تھا۔

''ماسٹر! یہ آسمان تک چمکتی ہوئی روشنی دیکھ رہے ہو نا۔ آج کی پارٹی لوگوں کو مدتوں یاد رہے گی۔ دو دیوہیکل موبائل جنریٹروں نے اس وقت ساحلی پٹی کو بقعۂ نور بنایا ہوا ہو گا۔ کھانے پینے کا سارا تیار سامان ریفریجریٹیڈ ٹرکوں میں منگوایا گیا ہے۔ شرابیں یخ بستہ اور کھانے بھاپ اڑاتے ہوئے سرو کیے جا رہے ہیں گے' جیسے ابھی چولھوں اور تندوروں سے اتارے گئے ہوں۔ ڈیڑھ دو سو مہمانوں کی خدمت کے لیے اکیاسی لڑکیاں بلائی گئی ہیں۔ ریت پر جما ہوا پنڈال پرستان کا سماں پیش کر رہا ہو گا۔''

اس دوران میں تقریب گاہ کا نقشہ واضح ہونا شروع ہو گیا۔ ہماری داہنی سمت میں سمندر کی سرپٹکتی ہوئی موجوں سے کچھ دور خیمے نما بڑا سا پنڈال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اس سے کچھ پیچھے' سڑک کے کنارے کئی بند ٹرک جیسے کارواں ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ قرب و جوار میں پھیلی ہوئی تیز روشنی میں وہ منظر بہت خواب ناک نظر آ رہا تھا۔

چاؤفان پنڈال کے قریب سے تیزی سے گزرتا چلا گیا۔ پنڈال کے بعد ہی ریت کو ہموار کر کے گاڑیاں پارک کرنے کی جگہ بنائی گئی تھی جہاں ہم سے پہلے متعدد گاڑیاں موجود تھیں۔

''پہلی قطار میں چوتھی گاڑی غور سے دیکھ لو۔'' چاؤفان نے پارکنگ کے لیے گاڑی گھماتے ہوئے کہا'' تم کو اسی پجیرو میں نکلنا ہے۔''

''کیا ابھی سے اتنے مہمان آ گئے ہیں؟'' میں نے وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں کی تعداد دیکھ کر حیرت سے سوال کیا

''پجیرو ہر طرف سے گاڑیوں میں گھری ہوئی ہے۔''

''اسے میں نے دانستہ ایسی جگہ پارک کیا ہے جہاں روشنی کم ہے تاکہ گاڑی غیر ضروری طور پر کسی کی نظروں میں نہ

1 سکے۔'' اس نے اپنی گاڑی ایک جگہ روک کر کہا'' یہ گاڑیاں یہاں کے کام کرنے والوں اور ہمارے آدمیوں کی ہیں۔ کچھ لڑکیاں بھی اپنی گاڑیوں میں آئی ہوئی ہیں۔ سارے میزبانوں کو مہمانوں کی آمد سے پہلے یہاں جمع ہونا ہے۔''

''ڈان کب آئے گا؟'' میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ ٹھیک نو بجے پہنچے گا..... کوئی بات رہ گئی ہے تو پوچھ لو۔ تم کو اندر پہنچانے کے بعد میں مصروف ہوجاؤں گا۔ تمہاری طرف آنا ہوا تو کوئی خاص بات نہیں ہو سکے گی۔''

پارٹی شروع ہونے میں دیر تھی لیکن فضا میں مترنم قہقہے گونج رہے تھے۔ ریتیلے پارکنگ لاٹ سے نکلتے ہوئے چاؤفان دانستہ سیاہ مرسیڈیز کے قریب سے گزرا اور میں نے اندازہ لگالیا کہ پارکنگ میں کسی بے ترتیبی کے باوجود مرسیڈیز دوسری سمت سے بہ آسانی نکالی جاسکے گی۔

وسیع پنڈال سڑک اور دونوں پہلوؤں سے پوری طرح بند تھا۔ اس کا طول وعرض دیکھ کر میں حیران تھا کہ ڈیڑھ دو سو مہمانوں کے لیے اتنے رقبے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

چاؤفان جوں ہی سڑک پر آیا' مختلف سمتوں سے مرد اور عورتیں نمودار ہوکر اسے تعظیم دینے لگیں۔ بعض کا انداز بہت زیادہ بے تکلفانہ تھا مگر ان کی بے تکلفی میں بھی چاؤفان کی بالادستی کا اعتراف جھلک رہا تھا۔ وہ ان سب سے ہنستا بولتا' کسی کسی کے ساتھ دست درازی کرتا' ہمارے ساتھ بڑھتا رہا۔

کھانے کی دو گاڑیاں سڑک پر' پنڈال کے عقبی حصے کے ساتھ کھڑی ہوئی تھیں۔ دونوں جنریٹر کچھ فاصلے پر کھڑے کیے گئے تھے تاکہ ان کا شور محفل کے شرکا کی سماعت پر بوجھ نہ بنے۔ ایک جنریٹر چل رہا تھا۔ چاؤفان نے بتایا کہ اس کی کسی غیر متوقع خرابی کے اندیشے سے دوسرا جنریٹر تیار کیا گیا تھا تاکہ محفل میں کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو۔

اس ویران ساحلی علاقے میں نظر آنے والی لڑکیوں کے لباس اشتعال انگیز حد تک مختصر تھے اور وہ چلتے پھرتے ہوئے شوخی سے اپنے جسمانی خدوخال کو مزید واضح کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ جن لڑکیوں نے پورا لباس پہنا ہوا تھا انہوں نے بہ طور خاص یہ اہتمام کیا تھا کہ لباس ان کے بدن کے کسی زاویے کو شکنوں میں معدوم نہ کرنے پائے۔

ہم دونوں چاؤفان کی معیت میں پنڈال کے سرے پر پہنچے کر سڑک سے اترے تو قدموں میں ریت کی جگہ دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ قالینوں کی اس روش سے ہم سامنے پہنچے تو وسیع وعریض پنڈال کا وہ حصہ پورا کھلا ہوا تھا یعنی اس پارٹی کے شرکا اپنی جگہوں پر بیٹھے بیٹھے کھلے سمندر کا بھرپور نظارہ کرسکتے تھے۔

ریت میں گڑے ہوئے اونچے پائپوں پر سرچ لائٹوں کی پوری قطار لگی ہوئی تھی جس کا رخ سمندر کی جانب تھا۔ ان روشنیوں میں جھاگ اڑاتی اور پھر دم توڑتی ہوئی سمندری لہریں سفید وسیاہ رنگوں میں ہولناک شبیہیں بنا رہی تھیں۔

اس سمت میں پنڈال کے باہر تک قالین بچھے ہوئے تھے۔ اندر کا فرش بھی ان قالینوں سے مرصع تھا۔ پنڈال میں کوئی اسٹیج نہیں تھا۔ قناتوں کے ساتھ نیم دائرے کی صورت میں سجی سجائی میزیں اور آرام دہ کرسیاں بہت قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ درمیانی جگہ کو خالی چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس خالی جگہ کی تین سمتوں میں میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ چوتھی سمت میں نہ جانے کیا کچھ جوڑ کر ایک بار کھڑا کردیا گیا تھا جہاں مختصر لباسوں والی کئی لڑکیاں گلاس اور پیمانوں کو رگڑ رگڑ کر چمکانے میں مصروف تھیں۔

چاؤفان ہمیں فخریہ انداز میں وہ سب دکھاتا اور بتاتا ہوا پنڈال میں لے گیا جہاں جوان' خوب رو اور بے باک تھائی لڑکیوں کا ایک پورا غول بے مقصد کاموں میں مصروف تھا۔ سب میزیں خالی تھیں۔ ہم وہاں پہنچنے والے پہلے مہمان تھے۔

ڈان کو روایتی طور پر اس نیم دائرے کی وسطی میز پر بیٹھنا تھا۔ چاؤفان نے ہمیں اس کی قریبی میز پر بٹھانا چاہا لیکن میں نے دور کی ایک میز منتخب کرلی۔ ڈان کی نظروں سے دور رہ کر میں آسانی سے فرار کی راہ اختیار کرسکتا تھا۔

''تمہارا بندوبست بے مثال ہے۔'' میں نے اس کا دل بڑھانے کے لیے کہا'' کوئی من چلا پاکستانی یہ منظر دیکھ لے تو کراچی کا ساحل روز اسی طرح آباد ہونے لگے۔''

''سمندر کو آلودگی سے بچانے کے لیے یہاں ایسی پارٹیوں پر پابندی ہے۔'' اس نے جلدی سے کہا'' یہ ڈان کا معاملہ ہے۔ اس لیے چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ میں نے دل کھول کر ساری حسرتیں نکالی ہیں۔''

''خرچ بھی تم کو اٹھانا پڑے گا۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''اس کی پروا نہیں۔'' وہ بائیں آنکھ دبا کر مکاری سے بولا'' ماسٹر! یہ سرمایہ کاری ہے۔ چند دنوں میں ایک کے سو بلکہ ہزار یا لاکھ تک لوٹ آئیں گے۔ چھوٹا راجن اپنے باپ کا خزانہ ساتھ نہیں لایا تھا۔ وہ یہیں سے کما کر کروڑپتی بنا تھا۔''

بات ختم کرتے ہی وہ چونک کر پلٹا۔ بار پر کوئی اسے بلا رہا تھا۔ وہ ہم سے مزید کچھ کہے بغیر ادھر ہولیا۔

اس کے جاتے ہی ایک طرح دار لڑکی ہماری میز پر آ گئی۔ لباس کی مفلسی اس کے پورے وجود سے عیاں تھی۔ اس نے جھک کر بڑی ادا سے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ میں نے فریش لائم کی فرمایش کی تو اس نے حیرت سے یوں میری طرف دیکھا جیسے میں نے کوئی ناشائستہ بات کہہ دی ہو۔ وہ گئی اور چند لمحوں میں میرے مطلوبہ مشروب کے دو ٹھنڈے گلاس میز پر لے آئی۔

''یہ تقریب سمندر کی کھلی فضا میں نہ ہوتی تو میرے لیے یہاں بیٹھنا دشوار ہو جاتا۔'' غزالہ نے اپنے گلاس سے پہلا گھونٹ لے کر کہا ''لڑکیاں ابھی سے بے لگام ہو رہی ہیں۔ میں شرط لگا سکتی ہوں کہ آپ کے سوا یہاں کوئی بھی اپنی بیوی کے ساتھ نہیں آئے گا۔''

''یہ تھائی شرفا کی معاشرت کا ایک رخ ہے۔ ان کا میزبان ایک ڈان ہے۔ وہ سب یہاں آ کر فخر محسوس کریں گے۔ عورت اور شراب کی کشش بے پناہ ہوتی ہے۔ اس گرگو آزما کراس قوم نے سیاحوں سے اربوں ڈالر بٹورے ہیں۔ ان کی اشرافیہ بھی اس لت میں مبتلا ہے۔''

تقریب گاہ کا بندوبست اس ڈھب سے کیا گیا تھا کہ پروگرام واضح تھا۔ بار اور میزوں کے درمیان چھوڑی ہوئی خالی جگہ یقینی طور پر رقاص جوڑوں کے لیے چھوڑی گئی تھی۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے فریش لائم کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے۔ میں نے وقت گزارنے کے لیے سگریٹ سلگالی۔ اس اثنا میں ایک شوخ و چنچل لڑکی مسکراتی ہوئی ہماری طرف آئی۔ اس نے توتلی انگریزی میں اپنا تعارف کراتے ہوئے انکشاف کیا کہ ہماری دیکھ بھال اس کے سپرد کی گئی تھی۔ مجھ سے اجازت لے کر وہ ہمارے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کی شرارت سے چمکتی ہوئی روشن آنکھیں بار بار میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

اس کے براجمان ہوتے ہی اکیاسی لڑکیوں کا مصرف میری سمجھ میں آ گیا۔ ہر میز کے لیے ان میں سے ایک لڑکی مخصوص تھی۔ جو وہ جاتیں وہ اوپر کی بھاگ دوڑ میں لگی رہتیں۔ آنے والے باذوق مہمان بعد میں ان کا بھی کوئی نہ کوئی مصرف تلاش کر لیتے۔

ہمارے لیے فریش لائم لانے والی لڑکی انگریزی سے نابلد نظر آتی تھی۔ یہ چاؤفان کی مہربانی تھی کہ اسے انگریزی جاننے والی مختصر پوش سے بدل دیا گیا تھا۔

لڑکی باتیں کرنے کا فن جانتی تھی۔ وہ اپنی ادائیں دکھا کر بے تکلفی سے باتیں کرتی رہی۔ غزالہ نے اس سے جب یہ کہا کہ اس لمبی تقریب میں صرف واش رومز کی کمی تھی تو لڑکی نے ہنستے ہوئے بتایا کہ مے نوش مہمانوں کی اس ضرورت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ سڑک پر جنریٹروں سے پہلے چار کارواں کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر کارواں میں جملہ سہولیات سے آراستہ تین تین واش روم بنے ہوئے تھے۔ میں نے چاؤفان کے ساتھ ادھر آتے ہوئے وہ کارواں دیکھے تھے۔ لڑکی نے ان کا مصرف بھی واضح کر دیا۔

پنڈال میں لگے ہوئے طاقت ور اسپیکرز پر اچانک دھیمی مغربی موسیقی گونجنی شروع ہو گئی۔ موسیقی کی لے پر لڑکی کے ہاتھ پیر تھرکنے لگے۔

میز کے نیچے یکا یک اس لڑکی کے گھٹنے میرے گھٹنوں سے ٹکرائے۔ میں نے سٹپٹا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ پُرشوق انداز میں میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ میرے اضطراری ردِعمل سے غزالہ کی چھٹی حس جاگ اٹھی۔ اس نے لمحے بھر کے لیے اشتباہ آمیز نظروں سے لڑکی کو گھورا پھر اس کے شانے پر ہلکی سی تھپکی دے کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''تم بہت اچھی اور خوبصورت لڑکی ہو۔'' غزالہ نے سپاٹ لہجے میں کہا ''بدقسمتی یہ ہے کہ اپنی ضروریات کے معاملے میں ہم دونوں خود کفیل ہیں۔ ہمارے درمیان کسی اور کی شمولیت کا امکان نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم خالی بیٹھنے کے بجائے گھومتی پھرتی رہو تاکہ ہم تخلیے میں یہاں کے رومان انگیز ماحول سے کچھ فیض حاصل کر سکیں۔ جب بھی ضرورت ہوئی ہم تمہیں بلا لیں گے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔'' لڑکی نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور کرسی چھوڑ دی ''یہ یاد رکھنا کہ اب میں تمہاری میزبان ہوں۔''

وہ ہوش ربا انداز میں لچکتی اور مٹکتی ہوئی بار کی طرف چل دی۔

''تم نے بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔'' میں نے غزالہ سے کہا ''وہ عذاب کی طرح ہمارے سروں پر مسلط ہو گئی تھی۔ اب اس کو بھی ذہن میں رکھنا پڑے گا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی ''میں نے اس کی چوری پکڑ لی تھی اس لیے وہ جھٹ سے چل دی۔ میں نے آپ دونوں کے درمیان اپنے پیر پھیلائے ہوئے تھے۔''

''بیوی ہر حال میں بیوی ہوتی ہے۔ شوہر کے معاملے میں اس کا ریڈار بہت مستعدی سے کام کرتا ہے۔'' میں نے

سر ہلاتے ہوئے کہا ''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ اسی طرح ہمارے سروں پر مسلط رہی تو ایک بجے کیا ہوگا۔ مجھے یہ میزبانی سے زیادہ نگرانی نظر آرہی ہے۔''

''وہ شوقین اور کھلنڈری لڑکی ہے۔ اسے اکسا کر اتنی پلادیں کہ وہ مدہوش ہوجائے۔ اس صورت میں ہم خاموشی سے نکل سکیں گے۔'' اس نے میرے ذہن میں کلبلانے والی تجویز کو بلاتوقف الفاظ کا جامہ پہنادیا ''مجھے اس مسئلے کا پہلے سے اندازہ ہوتا تو میں اس کی چوری پکڑنے کے بجائے اس کی حرکتوں کو نظرانداز کردیتی' اب آپ کو اسے بہلانا ہوگا۔''

وہاں کھلا بار لگا ہوا تھا۔ کئی لڑکے لڑکیاں اس کے آس پاس منڈلا رہے تھے لیکن میں نے ان میں سے کسی کو کچھ پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ شاید انہیں صرف اپنے مہمانوں کے ساتھ پینے کی اجازت دی گئی تھی۔ وہ احتیاط نہ کی گئی ہوتی تو ہیروئین کی آمد سے پہلے چاؤفان کا سارا عملہ کیف وسرور کی اجنبی دنیاؤں کی سیر کررہا ہوتا۔ وہاں کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوتا۔

آٹھ بجے مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے دو سفید فام مرد آئے جو اپنے اطوار سے امریکی معلوم ہورہے تھے۔ چاؤفان باہر سے انہیں اپنے ساتھ پنڈال میں لایا۔ وہ ان دونوں کے ساتھ جس انداز سے بچھا جارہا تھا' اس سے مجھے گمان ہوا کہ ان میں سے ایک کرنل گیری ہوگا۔ میرے شبہے کو اس بات سے بھی تقویت ملی کہ چاؤفان نے انہیں مرکزی میز کے قریب بٹھایا تھا۔

ان دونوں کے بیٹھنے سے پہلے دو لڑکیاں لپک کر اس میز پر پہنچ گئیں۔ چاؤفان نے ان کی طرف اشارے کرکے کچھ کلمات ادا کیے اور امریکیوں نے بڑی ڈھٹائی سے ان لڑکیوں کی کمر میں ہاتھ ڈال کر انہیں اپنے ساتھ بٹھالیا۔

چاؤفان دوبارہ باہر چلا گیا۔ اس نے ہماری طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی۔

میں کن انکھیوں سے امریکیوں کی میز کا جائزہ لیتا رہا۔ لڑکیوں کے اشارے پر ایک تیسری لڑکی نے بار سے مے نوشی کے لوازم ایک ٹرے میں سمیٹ کر ان کی میز پر سجادیے تھے۔ ذرا سی دیر میں وہ چاروں اپنے پیمانے ایک دوسرے سے ٹکرا کر مے نوشی کا آغاز کرچکے تھے۔

اگلی کھیپ میں کئی مہمان ایک ساتھ پنڈال میں آئے۔ اس بار چاؤفان ان کے ساتھ نہیں تھا۔ لمحہ بھر کے بعد اس کا سبب بھی سامنے آگیا۔ مہمان تیزی سے آرہے تھے۔ ان کے استقبال کے لیے چاؤفان باہر رکا ہوا تھا۔ مہمانوں کو ان کی نشستوں تک پہنچانے کی ذمے داری لڑکیوں نے سنبھال لی تھی۔

اس وقت تک غزالہ کی پیش گوئی درست ثابت ہورہی تھی۔ آنے والوں میں کسی خاتون کا وجود نہیں تھا۔

ہماری میزبان اِدھر اُدھر سے بھٹکتی ہوئی ہمارے قریب آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے التجائیہ انداز میں کہا ''اجازت ہو تو میں تمہارے ساتھ بیٹھ جاؤں؟''

میں نے فوراً اسے اجازت دے دی۔ ہم مہمانوں کے ناموں اور مراتب سے بے خبر تھے۔ وہ دور سے ہمیں ان کے بارے میں بہت کچھ بتاسکتی تھی۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی آزردگی سے بتایا کہ رفتہ رفتہ سب لڑکیاں آنے والوں کے ساتھ مصروف ہوتی جارہی تھیں۔ اسے ہمارے رویے کی وجہ سے اپنی ہم جولیوں میں سبکی کا سامنا کرنا پڑرہا تھا۔ چاؤفان نے اسے ہماری خدمت پر مامور کیا تھا اس لیے وہ کسی اور مہمان کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتی تھی۔ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح پنڈال میں بھٹکتے ہوئے اسے دوسری لڑکیوں کے طنز اور آوازوں کا سامنا کرنا پڑرہا تھا۔

میں نے اسے اپنی میز پر شراب نوشی کی اجازت دی تو خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک لڑکی کی ٹرے سے اسکاچ کا لارج پیگ اٹھالیا۔

''یہاں بیٹھ کر جو چاہو کرتی رہو لیکن میز پوش کی آڑ میں اپنی ٹانگوں پر ذرا قابو رکھنا۔'' غزالہ نے وضاحت کی ''گڑبڑ کی تو میں دوبارہ اٹھادوں گی۔''

وہ غزالہ کی براہِ راست الزام تراشی کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ بوکھلاہٹ میں اس نے تیز اسکاچ کا ایک بڑا گھونٹ اپنے حلق سے اتارلیا۔

''ہمیں یہاں آنے والوں کے بارے میں بتاتی رہو۔ ہم تمہارے شہر میں نئے وارد ہوئے ہیں۔'' میں نے اس لڑکی کو خفت سے بچاتے ہوئے اپنا مدعا بھی بیان کردیا۔

اس وقت تک دس بارہ افراد وہاں آچکے تھے۔ ان میں سے بیشتر ایک دوسرے سے یوں گھلے ملے ہوئے تھے جیسے ان میں پرانی شناسائی رہی ہو۔

گومی نامی وہ لڑکی ان سب لوگوں سے واقف نہیں تھی۔ جنہیں جانتی تھی' ان کے بارے میں دھیرے دھیرے ہمیں بتانا شروع کردیا۔

سفید فاموں کے بارے میں اس نے میرے اندازے کی تائید کردی۔ پختہ عمر والا امریکی کرنل گیری تھا۔ اس کا

نوجوان ساتھی کیپٹن کک تھا۔ وہ دونوں شہر کی رنگین مزاج خواتین میں بے حد مقبول تھے۔ عورت اور شراب کی کسی بھی ضیافت سے انکار ان کے مسلک میں شامل نہیں تھا۔

مقامیوں میں سب ہی معروف چہرے تھے۔ تجارت، صنعت، بنکاری، وزارت اور دیگر سرکاری شعبوں کے کلیدی عہدے دار اور شہری وہاں چلے آرہے تھے۔ ان میں بنکاک کا پولیس کمشنر بھی شامل تھا جو پہلے راجن کا نمک خوار ہوا کرتا تھا۔

کچھ لوگ ڈان کے لیے پھول اور تحائف لے کر آئے تھے جو مرکزی میز کے قریب قرینے سے قالین پر سجا دیے گئے تھے۔

پونے نو بجے آنے والوں میں تھائی لینڈ کے دو امیر ترین افراد نمایاں تھے۔ ان کی آمد پر موسیقی روک کر تھائی زبان میں کچھ اعلان کیا گیا۔ اعلان ختم ہوتے ہی تالیوں کی زبردست گونج میں موسیقی کا سلسلہ دوبارہ چل پڑا۔

گومی نے بتایا کہ ان میں سے ایک نے ڈان کے لیے مرسیڈیز سکس ہنڈریڈ کی چابی پیش کی تھی، دوسرے نے ڈان کے رفاہی کاموں کے لیے دس لاکھ بھات کا چیک دیا تھا۔

ان غیر معمولی نذرانوں کا ذکر سن کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ دنیا جانتی تھی کہ ڈان کا رفاہی کاموں سے دور کا بھی سروکار نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے حاشیہ برداروں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتا تھا اور وہ سب شہر کے چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔

وہ ان دونوں کی طرف سے اپنے کاروبار اور جان و مال کے تحفظ کے لیے پیشگی ادا کیا جانے والا تاوان تھا جسے تحفے کا نام دے دیا گیا۔ ان دونوں نے ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے پورے اجتماع کے سامنے تحائف پیش کر کے سب کو بتا دیا تھا کہ وہ ڈان کو اس کا حصہ دے رہے ہیں، اس کے بعد ڈان یا اس کے آدمیوں کو ان کے ساتھ کوئی زیادتی کرنے کا حق نہیں تھا۔

میں پڑھتا اور فلموں میں دیکھتا رہا تھا کہ ڈان گلے تک جرم و گناہ کی دلدل میں غرق ہونے کے باوجود کس طرح سوسائٹی میں معصوم اور معزز بن کر زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے ستم کا شکار ہونے والے کس طرح ان ہی کے پاس اپنی فریاد لے کر آتے ہیں۔ اس اجتماع میں، میں وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

مجھے بے اختیار چاؤ فان کے الفاظ یاد آگئے۔ اس نے ڈان کی دعوتِ عیش و طرب کو سرمایہ کاری کا نام دے کر یہ توقع ظاہر کی تھی کہ ایک کے سو بلکہ ہزار یا لاکھ تک مل سکتے ہیں۔ اس کی توقع پوری ہو رہی تھی۔ اسے کچھ دینا یا نہ دینا ڈان کی صوابدید پر منحصر تھا۔

پنڈال کی تقریباً ساری میزیں آباد ہو چکی تھیں۔ ہر طرف رنگ و بو کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔ زندگی کی رونقیں اور رعنائیاں اپنے جوبن پر آتی جا رہی تھیں۔ جام و سبو لیے ہوئے لڑکیاں پھرکیوں کی طرح پورے پنڈال میں چکراتی پھر رہی تھیں۔ مترنم اور رسیلے قہقہے، ملی جلی آوازیں اور کبھی کبھی کہیں سے ابھرنے والی تحیر زدہ سریلی چیخ خلیج سیام کے اس ساحلی گوشے کو خوابناک آرزوؤں کے ایک جوالا مکھی میں تبدیل کرتی جا رہی تھیں۔

نو بجے یکایک موسیقی تھم گئی۔ ساؤنڈ سسٹم پر ڈان کی آمد کا اعلان ہوا اور پنڈال میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ سب کی نگاہیں ساحل کی طرف تھیں جدھر سے گھوم کر ڈان کو پنڈال میں آنا تھا۔

ڈان کے نمودار ہوتے ہی سب لوگ کرسیاں چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ پنڈال تالیوں کے شور سے گونجنے لگا۔ ڈان نفیس تراش کے سیاہ سوٹ اور بے داغ سفید قمیص میں بہت وجیہ اور باوقار نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہ چاروں موٹے بھی تھے جو دن رات سیلرز بار کی اوپری منزل پر مفت کی کھا کر پل رہے تھے۔ وہ بھی سوٹ پہنے ہوئے تھے مگر ان کے شانوں سے خودکار رائفلیں اور ان کے میگزین جھول رہے تھے۔ وہ چاروں ڈان کے دائیں بائیں تھے، اس کے پیچھے چاؤ فان کسی روبوٹ کی طرح اکڑ کر چل رہا تھا۔

پنڈال کے سرے پر رک کر ڈان نے مہمانوں کی طرف ہاتھ لہرا کر سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تالیوں کی گونج دھیمی ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔ چند لمحوں میں سب مہمان اپنی جگہوں پر بیٹھ چکے تھے مگر ان کی نگاہیں ڈان کی مسحور کن شخصیت پر مرکوز تھیں۔

ڈان نے ہاتھ ہلا کر اپنے آدمیوں سے کچھ کہا۔ پانچوں وہاں سے واپس ہو لیے۔ ڈان بائیں طرف پہلی میز پر بیٹھے ہوئے مہمانوں کی طرف بڑھ گیا۔ ڈان کی وہ حرکت سب کے لیے غیر متوقع تھی۔ اس میز کے گرد بیٹھے ہوئے چھ نفوس گھبرا کر اٹھے۔ وہ تین مرد اور تین میزبان لڑکیاں تھیں۔ ڈان نے وہاں رک کر سب سے باری باری ہاتھ ملایا، کچھ باتیں کیں اور دوسری میز کی طرف ہو لیا۔

''اوہ...... ڈان یہاں بھی آئے گا...... میں کیا کروں؟'' گومی بوکھلا کر بولی۔

''سکون سے بیٹھی رہو، وہ تمہیں کھا نہیں جائے گا۔'' میں

نے سرد لہجے میں کہا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور ایک گھونٹ میں اپنا بقیہ گلاس خالی کر ڈالا۔

ہر میز پر لوگوں سے فرداً فرداً ملنے کے بعد وہ ہماری میز پر آیا تو پُرتپاک انداز میں مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا ''علی! تم مجھ سے اتنی دور کیوں بیٹھے ہو؟''

''ڈان! میری عورت ذرا شرمیلی ہے۔'' میں نے اسے خوش کرنے کے لیے غزالہ کے لیے دانستہ عورت کا لفظ استعمال کیا ''بھیڑ بھاڑ سے گھبراتی ہے۔ تمہاری میز کے قریب بہت سے لوگ ہوں گے.....''

''خوب صورت عورتیں شرمیلی ہوتی ہیں۔'' ڈان نے مربیانہ ہنسی کے ساتھ غزالہ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بہت نرمی سے مصافحہ کر کے چھوڑ دیا۔

''علی خوش نصیب ہے کہ اسے تم جیسی حسین بیوی ملی ہے۔'' ڈان کے ان الفاظ پر غزالہ کا چہرہ حیا سے تمتما اٹھا۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی غیر مرد کی زبان سے اپنی اتنی بے باکانہ تعریف سنی تھی۔ ڈان اس کے ردِعمل سے بے پروا ہو کر کہتا رہا ''عورت اچھی نہ ملے تو مرد کی زندگی جہنم ہو جاتی ہے۔ تم دونوں میرے پیارے ہو، تمہارا مستقبل بہت تابناک ہوگا۔''

ڈان کے الفاظ میں طنز یا تضحیک کا دور دور تک شائبہ نہیں تھا۔ غزالہ نے سر جھکا کر خاموشی سے ڈان کی باتیں سن لیں، زبان سے کچھ نہ بولی۔

''میرے قریب بیٹھتے تو میں تمہیں بہت کام کے لوگوں سے ملواتا۔'' ڈان میری طرف متوجہ ہو گیا ''یہ موقع بار بار نہیں آئے گا۔ میں سب سے مل لوں تو میرے پاس آنا۔ میں تمہیں کرنل گیری سے ملواؤں گا۔ وہ اتنا برا نہیں ہے جتنا تم سمجھتے ہو۔''

ڈان کے مزاج میں عجیب شاہانہ بے نیازی تھی۔ اپنی بات کہہ کر اس نے میرا جواب سننے کی ضرورت نہیں سمجھی، گومی سے رسمی انداز میں ہاتھ ملا کر اگلی میز کی طرف چلا گیا۔

جب تک ڈان اپنے مہمانوں سے ان کی میزوں پر ملتا رہا، سروس معطل رہی۔ ساری لڑکیاں سمٹ کر بار کے قریب جمع ہو گئیں۔ جوں ہی ڈان اپنی وسطی میز پر پہنچا، ساغر و مینا ایک مرتبہ پھر گردش میں آ گئے۔ اس بار سروس بہت تیز اور مستعد نظر آ رہی تھی۔ شاید لوگوں کی مے نوشی کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ بنکاک میں ہمارے قیام کے آخری چند گھنٹے تھے۔ اس وقت ڈان سے کوئی بگاڑ مول لینا حماقت کے مترادف ہوتا۔ میں نے غزالہ اور گومی کو ہر حال میں اسی جگہ بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود ڈان کی طرف چل دیا۔

ڈان کی میز بڑی تھی۔ اس کے گرد کئی خوشامدی جمع تھے جن میں پولیس کمشنر پیش پیش تھا۔ گیری، ڈان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ڈان نے پُرتپاک انداز میں گیری سے کہا ''لو، میں ابھی ذکر کر رہا تھا، علی آ گیا۔ بہت شیر دل سورما ہے یہ میرا۔''

گیری نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ایک لڑکی نے اسی لمحے میرے لیے جگہ خالی کر دی۔ ڈان کے اشارے پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔

''ابھی ڈان تمہاری دلیری اور تمہاری بیوی کے حسن کی تعریف کر رہا تھا۔'' گیری ہنستے ہوئے بولا۔

''میں اپنی بیوی کو یوں موضوعِ سخن بنانا پسند نہیں کرتا۔'' میں نے گیری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ''جہاں تک میری دلیری کا تعلق ہے تو میں صرف ڈان کے حکم پر عمل کرتا ہوں۔ ڈوریاں ڈان کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ صحیح وقت پر صحیح فیصلے کرنا ڈان کی خوبی ہے۔''

ڈان نے پسندیدگی کے اظہار میں اپنا سر ہلایا اور بولا ''دلیری اور وفاداری..... یہ دو خوبیاں بہت کم لوگوں میں یکجا ہو پاتی ہیں۔ علی ان کا مرقع ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ڈان نے دوسروں کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ اسی لمحے میز خالی ہو گئی۔ وہاں صرف تین نفوس رہ گئے۔ گیری، ڈان اور میں۔

''علی پاکستانی ہے۔'' اس بار ڈان نے ذرا دھیمے لہجے میں اپنی بات جاری رکھی ''یہ واپس جانا چاہتا ہے مگر میں نے اسے روکا ہوا ہے۔ تم اس سے کیا پوچھنا چاہ رہے تھے؟''

''پاکستان کے حوالے سے آج کل ہمارے ذہنوں میں صرف ایک نام آتا ہے..... کیا تم ڈینی کو جانتے ہو؟'' گیری نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''صرف نام سنا ہے۔'' میں نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''راجن ذہین آدمی تھا!'' گیری نے یکایک ڈان کی طرف متوجہ ہو کر تائیدِ طلب لہجے میں کہا۔

''الو کا پٹھا تھا۔'' ڈان نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا ''ذہین ہوتا تو یوں کتے کی موت نہ مارا جاتا۔''

گیری نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا ''اس کا اصرار تھا کہ ڈینی بنکاک میں ہے اور اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اس نے بھارتی انڈر ورلڈ کے پانچ بڑوں کو یہاں بلایا تھا۔ کل منٹھار سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ راجن نے اکبر نامی

کسی گواہ کو ان پانچوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس سے باز پرس کی نوبت آنے سے پہلے موتی محل پر باہر سے خوفناک حملہ ہوگیا اور سب کو بھاگنا پڑا.....''

''سب بکواس ہے۔'' ڈان نے بیزاری سے اس کی بات کاٹ دی ''پتا نہیں تم لوگ گڑے مردے کیوں اکھاڑ رہے ہو۔ وہ ڈینی نوبیا میں مبتلا تھا۔ میں نے خود چھان بین کی ہے۔ کراچی میں دو آدمی پکڑے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک ڈینی ہے۔ چھوٹا راجن کو ہر جگہ وہ نظر آرہا تھا۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ موتی محل پر وہ حملہ میرے آدمیوں نے کیا تھا۔''

میری جان میں جان آئی کہ ڈان نے برہم ہوکر مجھے ایک کڑی آزمایش سے بچالیا۔

''یہ سب مجھے معلوم ہے۔'' گیری بولا ''ان پانچ بڑوں کی یہ رائے ہے اور میں اس سے متفق ہوں کہ ڈینی یہاں نہیں آیا۔ راجن کے اعصاب پر اس کی دہشت سوار تھی۔''

''پھر اس خبیث کا ذکر کیوں کررہے ہو؟''

''میں علی کو صورتِ حال سمجھا رہا تھا تاکہ یہ بھی اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کرے کہ ایک آدمی بہ یک وقت دو دور دراز شہروں میں کیسے ہوسکتا ہے؟''

''گیری! یوں وقت برباد کرنا ہے تو یہ معما بھی حل کرو کہ پانی میں آگ کیسے لگ سکتی ہے؟ بھینس انڈے کیسے دے گی..... ناممکنات کے بارے میں سوچنا وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔'' ڈان کا موڈ بہ دستور خراب تھا۔ اسی لہجے میں وہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولا ''تم اپنی میز پر جاؤ' جوڑے فلور پر آرہے ہیں۔ لوگ تمہاری بیوی کے ساتھ بھی رقص کرنا چاہیں گے' تمہاری موجودگی میں کوئی اس میز کا رخ نہیں کرے گا۔''

وہ ڈان کی نہایت ہمدردانہ ہدایت تھی۔ میں پلٹا تو موسیقی کی دُھن پر متعدد جوڑے پنڈال کی خالی جگہ پر تھرک رہے تھے۔ ہر مرد نے اپنی شریکِ رقص کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔

میں اپنی میز کی طرف چلا تو وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا ہوا تھا۔ غزالہ کے بشرے کی ترشی مجھے دور سے نظر آگئی۔ غنیمت یہ ہوا کہ میرے پہنچنے سے پہلے وہ شخص ساقی گری کرنے والی ایک لڑکی کا ہاتھ تھام کر رقاصوں کی بھیڑ میں شامل ہوگیا۔

میری عدم موجودگی میں تین افراد غزالہ کے پاس آچکے تھے۔ اس نے اردو میں کہا کہ وہ انہیں ایسا نچاتی کی چھٹی کا دودھ یاد آجاتا لیکن مصلحت سے کام لے کر وہ معذرت پر اکتفا کرتی رہی۔

پتا نہیں پہل کس نے کی تھی' رفتہ رفتہ ساری میزیں خالی ہوگئیں۔ ہر مرد کسی نہ کسی لڑکی کو اپنی بانہوں میں سمیٹے قالین پر موجود تھا۔ ڈان بھی اٹھ کر اس بھیڑ میں شامل ہوچکا تھا۔ سرو کرنے والی لڑکیاں کسی نہ کسی کے ساتھ ناچ میں شامل ہوگئی تھیں۔

میں غزالہ کو ساتھ لے کر ایک گوشے میں جا کھڑا ہوا۔ گومی اپنے گلاس سمیت ہمارے ساتھ تھی۔

وہ کوئی باقاعدہ رقص نہیں تھا۔ سب اوندھے سیدھے پیر چلا رہے تھے۔ جوڑوں کی حرکات دسکنات میں کوئی تسلسل تھا نہ ہم آہنگی۔ سب اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق ہل جل رہے تھے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ بے ہنگم رقص صرف صنفِ نازک سے قرب کا ایک بہانہ تھا۔

لوگ رقص کے دوران میں بھی مے نوشی میں مصروف تھے۔ کئی جوڑے قالین پر ہلکورے لیتے ہوئے خاموشی سے ریتیلے ساحل کی طرف نکل گئے۔ اندازہ ہورہا تھا کہ چاؤ فان نے میزبان لڑکیوں کی تعداد کم بتائی تھی۔

اس وقت مجھے گیری کا ساتھی نظر آیا۔ وہ ایک میز پر کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا جام دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تھاما ہوا تھا اور میز پر آگے جھک کر کچھ بول رہا تھا۔ جب میں ڈان سے ملنے کے لیے گیا تب بھی وہ وہیں نظر آیا تھا۔ دور سے محسوس ہورہا تھا کہ بسیار نوشی کی وجہ سے وہ خاصے نشے میں تھا۔ گیری کی جگہ خالی تھی۔

وہ محفل پونے گیارہ بجے تک یوں ہی چلتی رہی۔ جوڑے تھک کر میزوں پر آئے اور دوبارہ رقص میں شریک ہوتے رہے۔ آخر کار ساؤنڈ سسٹم پر دھیمی موسیقی کے دوران میں کھانے کا اعلان ہوا اور رفتہ رفتہ ویران میزیں ایک مرتبہ پھر آباد ہونے لگیں۔

ٹھیک گیارہ بجے پنڈال اشتہا انگیز خوشبوؤں سے مہک اٹھا۔ بھانت بھانت کے گرم کھانوں کی قابیں اٹھائے لڑکیاں میزوں کے درمیان چکراتی پھر رہی تھیں۔ مجھے ہوٹل میں قیام کے دوران میں تجربہ ہوچکا تھا کہ سچے تھائی باشندے سمندری پیداوار میں گھاس سے مگرمچھ تک نہیں چھوڑتے۔ یہی حال خشکی پر پائے جانے والے جانوروں کا تھا۔ ان میں سبزی خور وقت کے ساتھ عنقا ہوتے جارہے تھے۔ میں نے گومی کو واضح طور پر بتادیا کہ ہم مچھلی اور مرغی کے سوا کچھ استعمال نہیں کریں گے۔ اس کی ہدایت پر ہمارے لیے پسندیدہ ڈشیں فراہم کردی گئیں۔ گومی نے اپنے لیے عجیب وغریب سوپ

کے بعد سانپ کا سالن منگوایا تھا۔

جب تک میزوں پر کھانا فراہم کیا جاتا رہا' پنڈال میں ہلچل رہی۔ میدان صاف ہوتے ہی سامنے سے رقاص لڑکیوں کی ایک قطار اندر آئی اور انہوں نے پیشہ ورانہ انداز میں خوب صورت رقص پیش کرنا شروع کر دیا۔ مسئلہ صرف اتنا تھا کہ ان لڑکیوں نے جو کچھ زیب تن کیا ہوا تھا' اس پر لباس کا نام ایک تہمت معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کچھ آرائشی چیتھڑے ضرور کہے جاسکتے تھے جن پر بلاسبب نگاہیں مرکوز ہو رہی تھیں۔

کھانے کا دور توقع سے زیادہ طویل ثابت ہوا۔ اس دوران میں گیری کہیں سے بھٹکتا ہوا ہماری میز کی طرف آ نکلا۔ اس نے اپنی بھری ہوئی پلیٹ ہاتھ میں تھامی ہوئی تھی۔

اس نے اپنی جیب سے اپنا ڈیٹنگ کارڈ نکال کر میرے سامنے ڈالا اور جھک کر میرے کان میں سرگوشیانہ لہجے میں بولا ''یہاں بات نہیں ہوسکتی' میں ایک بجے نکل جاؤں گا۔ ایک دو روز میں وقت نکال کر مجھے فون ضرور کرنا' تم سے اہم باتیں کرنی ہیں۔''

اس کے دہانے سے آنے والی الکحل اور کھانوں کی ملی جلی بو بہت ناگوار لگ رہی تھی مگر اس کے سنسنی خیز پیغام نے مجھے وہ بدبو برداشت کرنے پر مجبور کر دیا۔

مجھے کب بنکاک میں رکنا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہ آگے چل دیا۔

اس نے ایک بجے اپنی روانگی کا پروگرام بتا کر مجھے پریشان کر دیا۔ وہی ہماری روانگی کا طے شدہ وقت تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ مدہوشوں کی اس محفل میں ایک بجے تک کسی کو دوسروں کی سدھ بدھ نہیں رہے گی۔ لیکن روانگی کے وقت پارکنگ لاٹ میں گیری سے ہماری مڈبھیڑ ہو جاتی تو بہت سی مشکلات پیدا ہوسکتی تھیں۔ مشکل یہ تھی کہ ہمیں ڈیڑھ اور دو بجے کے درمیان ویرا اور سلطان شاہ کو بھی اپنے ساتھ لینا تھا۔ وہ ڈیڑھ بجے مقررہ مقام پر ہمارا انتظار کرتے۔ ہماری طرف سے زیادہ تاخیر کے نتیجے میں وہ دونوں کسی سنگین مسئلے سے دوچار ہوسکتے تھے۔

کھانے کے بعد رنگِ محفل بدل گیا۔ تکلفات کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں۔ بنے سنورے لباس جسموں پر ڈھلکے ہوئے نظر آنے لگے۔ ناچنے والی پیشہ ور لڑکیاں دھیمے اور خوبصورت رقص سے ہیجان انگیز ناچ پر مائل ہوگئیں۔ مرد نہیں دیکھ کر بے پروایانہ انداز میں فقرے چست کر رہے تھے۔ ایک آدھ اٹھ کر ان کے درمیان پہنچا ہوا تھا۔

بنکاک کے نام نہاد شرفا کا وہ اجتماع ماحول اور روایتوں کے لحاظ سے بازاری لفنگوں کے اجتماع کا منظر پیش کرنے لگا۔

غزالہ کے لیے وہ بہت تکلیف دہ تجربہ تھا۔ اس نے کبھی مردوں کے اتنے بڑے غول کو خود فراموشی میں مبتلا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی زبان پر کوئی حرفِ شکایت لائے بغیر' خندہ پیشانی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ ذہنی کوفت کے اس مرحلے کے بعد ہمیں ڈان کی غیر علانیہ قید سے آخر کار رہائی ملنے والی تھی۔

چاؤفان گاہے گاہے پنڈال میں نظر آ رہا تھا۔ جب سے ڈان وہاں پہنچا تھا' وہ زیادہ تر اسی کے آس پاس منڈلاتا رہا۔ بھول کر بھی اس نے ہمارا رخ نہیں کیا۔

گومی کھانے کے بعد بھی ندیدے پن سے پیتی رہی۔ نشے کے باعث اس کی زبان پر لکنت طاری ہوگئی تھی۔ اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکائیں اور دونوں ہتھیلیوں میں سر تھام کر کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا۔ وہ ہمارے لیے بے ضرر ہو چکی تھی۔ اسے دنیا و مافیہا کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ہم اٹھ کر چلے جاتے تو اسے کانوں کان علم نہ ہوتا کہ وہ میز پر اکیلی رہ گئی ہے۔

میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں گومی کو کسی اور لڑکی کے حوالے کر دوں مگر اس خوف سے خاموش بیٹھا رہا کہ کہیں اس کی جگہ کوئی ہوش مند لڑکی ہمارے سروں پر مسلط نہ ہو جائے۔

میری نظریں بار بار اپنی رسٹ واچ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بارہ بجے کے بعد میری گھڑی کی رفتا سست ہوگئی ہو۔

''گیری کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟'' غزالہ نے گومی پر ایک نظر ڈال کر پوچھا۔

''ہم دس منٹ کی تاخیر سے نکلیں گے۔'' میں نے اسے بتایا ''پنڈال سے نکل کر پہلے ہم واش روم جائیں گے۔ وہاں سے سڑک پر ٹہلتے ہوئے پارکنگ میں جا نکلیں گے۔ امید ہے کہ اس وقت تک وہ یہاں سے روانہ ہو چکا ہوگا۔''

میری نظریں گیری کی تلاش میں بار بار بھٹکتی رہیں۔ ایک بجنے سے چند منٹ پہلے مجھے بھیڑ میں اس کی صورت نظر آئی پھر وہ غائب ہوگیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ پنڈال میں بھیڑ بڑھ گئی تھی۔ کھانا وغیرہ سرو کیا جا چکا تھا۔ مہمانوں اور میزبانوں کو صرف پینے اور ناچ گانے سے غرض رہ گئی تھی۔ ان کے وہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر بیرونی کاموں پر مامور عملہ بھی دھیرے دھیرے اندر گھس آیا تھا اور

تماش بینی کے ساتھ شرابوں پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

وہ ساحلی ویرانہ اتنا دورافتادہ تھا اور باہر موجود ساز و سامان اتنا محفوظ تھا کہ کسی کو چوری چکاری کا ڈر نہیں تھا۔ سب بے فکر ہو کر اس محفل کے مزے لوٹ رہے تھے۔

ایک بجے میں نے قریب سے گزرنے والی ایک لڑکی کی توجہ گومی کی طرف مبذول کرائی جو میز پر اپنا سر ٹکائے فرصت سے اونگھ رہی تھی۔

اس لڑکی نے فوری طور پر اپنے ایک ساتھی کو بلایا اور وہ دونوں گومی کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اس کے قدموں پر زبردستی چلاتے ہوئے لے گئے۔ وہ حال صرف گومی کا نہیں' ناچ گانے کے شور شرابے میں اور بھی کئی مہمان اور میزبان اسی طرح بے سدھ نظر آ رہے تھے۔ انہیں کوئی نہیں چھیڑ رہا تھا۔ جو جس حال میں تھا' مست اور خوش تھا۔

ایک بج کر دس منٹ پر میں نے غزالہ کو اشارہ کیا اور ہم دونوں نے سرسری انداز میں کرسیاں چھوڑ دیں۔ میں نے عقابی نظروں سے پنڈال کا جائزہ لیا تو ڈان مہمانوں کی بھیڑ میں گھرا ہوا تھا۔ کئی رقاص لڑکیاں اس کی میز کے سامنے مرغِ بسمل کی طرح تڑپ تڑپ کر عجیب انداز میں ناچ رہی تھیں۔ اس ہجوم میں گیری کا پتا تھا نہ چاؤفان کہیں نظر آ رہا تھا۔

ہم پنڈال کی بغل میں بچھے ہوئے قالینوں پر سے گزرتے ہوئے روشن سڑک پر آ گئے جہاں دور تک سناٹے کا راج تھا۔ کیٹرنگ کا عملہ بھی اپنی گاڑیوں کو مقفل کر کے شاید اندر پہنچا ہوا تھا۔

آگے لمبا سفر درپیش تھا۔ میں مثانے کا دباؤ ہلکا کرنے کے لیے ایک کارواں میں داخل ہوا تو مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔

کاروان کی پتلی سی راہ داری میں ایک قطار سے سات واش روم بنے ہوئے تھے جن میں سے بیشتر آباد تھے۔ اندر کی محدود فضا میں گونجنے والی دھیمی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کچھ لوگ اس بندوبست کو خلوت کدے کے طور پر مصرف میں لا رہے تھے۔

میں ایک خالی باتھ روم میں گھسا تو اس کی عمدہ بناوٹ کسی طیارے کے باتھ روم سے مشابہ نظر آئی۔ وہاں غسل کے سوا تمام حوائجِ ضروریہ کا اہتمام موجود تھا۔ غزالہ کاروان کے باہر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی' میں عجلت میں باہر آ گیا۔ میری دانست میں یہ اچھا ہی ہوا کہ غزالہ نے میرے ساتھ کارواں میں داخل ہونے کا فیصلہ نہیں کیا۔

ہم ویران سڑک پر چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ فضا ملے جلے انسانی شور اور موسیقی سے گونج رہی تھی۔ اس ساحلی ویرانے میں رات گہری ہونے کے ساتھ محفل پر رنگ آتا جا رہا تھا۔ ہمیں پارکنگ لاٹ تک کوئی متنفس نظر نہیں آیا۔

ہم تناتوں کے ساتھ پارکنگ لاٹ کے اس حصے میں اتر گئے جو نسبتاً اندھیرے میں تھا۔

وہاں کسی کی مداخلت کا امکان نہیں تھا پھر بھی ہم بہت محتاط انداز میں بڑھتے ہوئے سیاہ' بیجیرو تک پہنچے۔ اگلے چند ثانیوں میں ہم گاڑی میں موجود تھے۔

انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنیں یک بہ یک تیز ہو گئیں۔ مجھے توقع تھی کہ انجن چلنے کی آواز ساؤنڈ سسٹم سے ابلنے والے شور میں دب جائے گی۔ یہی ہوا' ہم گاڑی میں سست روی سے سڑک پر نکل آئے۔ میں نے اس وقت تک ہیڈ لیمپس روشن نہیں کیے تھے۔

گاڑی کا انجن طاقت ور اور کم آواز تھا۔ ہم سبک رفتاری کے ساتھ پنڈال کی عقبی سڑک سے گزرتے چلے گئے۔ دور تک پھیلی ہوئی روشنی میں دوسرے کارواں کے قریب ہمیں ایک نفس گزیدہ جوڑا نظر آیا جو اپنی دُھن میں مگن تھا۔ میں نے بیجیرو کی رفتار بڑھانے کے ساتھ ہیڈ لیمپس روشن کر دیے۔

''اللہ کا شکر ہے کہ اس حیوانی جنگل سے صحیح سلامت نکل آئے۔'' غزالہ نے فرطِ جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ''اب آگے ہمارا مقدر ہو گا۔''

''جلدی سے گاڑی میں موجود سامان کا جائزہ لے ڈالو۔ نقشہ ملنا بہت ضروری ہے۔'' میں نے اپنی نشست میں پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

اگلے پائیدانوں میں کچھ نہیں تھا۔ غزالہ کسی بندر کی سی پھرتی سے پیچھے کود گئی اور وہاں اسے پائیدان میں رکھا ہوا بیگ مل گیا۔ جو ایک بڑی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔

تھیلے میں نقشے کے ساتھ سفری ضروریات کا سامان اور فاضل میگزین کے ساتھ ایک چھوٹی خودکار رائفل بھی موجود تھی۔

میں غزالہ سے وہ تفصیل سن رہا تھا کہ مجھے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سڑک کے وسط میں ایک شخص اچھلتا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ فضا میں لہرا کر ہمیں رکنے کے بے تابانہ اشارے کر رہا تھا۔

ہمارا درمیانی فاصلہ بہت تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں گاڑی کی تیز روشنی میں' میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ بلاشبہ کرنل گیری تھا۔ اس کی گاڑی سڑک کے کنارے

جیک پر ایک طرف سے اٹھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔
''یہ یہاں کیا کر رہا ہے......'' میں نے تشویش زدہ آواز میں کہا۔
''وہ راستے سے نہ ہٹے تو اسے کچلتے ہوئے آگے نکل جائیں۔'' غزالہ خوف زدہ بلکہ ہذیانی سی آواز میں بولی۔ وہ بیگ سنبھالے عقبی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے تبصرے سے پہلے وہ سڑک پر آئے ہوئے گیری کو دیکھ چکی تھی۔ اپنا جملہ پورا کرتے ہی وہ دوبارہ آگے آ گئی۔
میں نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ میرے پاس فیصلہ کرنے کے لیے چند سیکنڈ سے بھی کم وقت تھا۔ میں نے گیری کو نظر انداز کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن اس کا برا وقت آ گیا تھا۔ اس کی موت نے گاڑی میں کسی خرابی کی صورت میں اسے بری طرح گھیر لیا تھا۔
میں چاہتا تو کسی طرح اسے بچا کر تیزی سے آگے نکل سکتا تھا۔ اس تدبیر میں یہ خرابی تھی کہ وہ ہماری ایک جھلک دیکھ کر ہمیں پہچانتا یا نہ پہچانتا' اس امر کا گواہ ضرور بن جاتا کہ تقریب گاہ کی طرف سے سیاہ بجیرو واپس گئی تھی۔ اس کی گاڑی میں یقیناً کوئی ایسی خرابی رونما ہوئی تھی جو فوری طور پر دور ہونے والی نہیں تھی۔ وہ تقریب گاہ سے کئی میل دور لق و دق ویرانے میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ لامحالہ وہیں رک کر تقریب سے لوٹنے والی کسی اور گاڑی کا انتظار کرتا۔ وہ پہلی ملاقات میں ڈان کا چہیتا بن چکا تھا۔ ڈان کو اس کی پریشانی کا علم ہوتا تو وہ اس سے رابطہ کرتا اور سیاہ بجیرو کے بد دماغ مالک کا ذکر سامنے آ جاتا۔ یوں ہمارے کمبوڈیا پہنچنے سے پہلے پورے زور و شور سے اس گاڑی کی تلاش شروع ہو جاتی۔ معاملہ ایک اہم امریکی سفارت کار سے بد اخلاقی کا ہوتا اس لیے شبہ یہ تھا کہ ملک گیر پیمانے پر کالی بجیرو کی تلاش کی مہم شروع ہو سکتی تھی۔
غزالہ کے مشورے کو روبہ کار لانے میں کئی پیچیدگیاں تھیں۔ دھیمی ٹکر سے گراں ڈیل گیری کو جہنم واصل کرنا ناممکن تھا۔ تیز رفتاری سے گاڑی ٹکرانے میں خدشہ تھا کہ گاڑی کے کسی حساس حصے کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ ہمیں لمبا سفر درپیش تھا۔ میں ایسا سنگین خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔
سڑک پر ہاتھ لہراتے ہوئے کرنل گیری کی طرف گاڑی دوڑاتے ہوئے شاید میرے اندیشوں نے بدترین صورت اختیار کر لی تھی مگر اس وقت کی حقیقت یہ تھی کہ میرے ذہن نے پلک جھپکتے میں وہ تجزیہ کر کے گاڑی روکنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں نے بریک لگا کر گیری سے چند میٹر کے فاصلے پر گاڑی روکی اور دروازہ کھول کر سڑک پر اتر گیا۔
''اوہ گاڈ! شکر ہے کہ تم آ گئے۔ میرا ہر حال میں اپنے دفتر پہنچنا ضروری ہے۔ دو بجے واشنگٹن سے میرے لیے ایک اہم ترین کال آنے والی ہے۔'' وہ اپنی پیشانی مسلتے ہوئے تشکر آمیز لہجے میں بولا۔
''تمہاری گاڑی کو کیا ہوا؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔
''یکایک پچھلے بریک جام ہو گئے۔ سڑک پر تیزی سے رگڑنے سے ایک ٹائر پھٹ چکا ہے۔ گاڑی جہنم میں جائے' تم مجھے شہر پہنچا دو...... میں نے آج ہی تم سے تخلیے میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی' اتفاق دیکھو کہ کن حالات میں یہ تخلیہ میسر آیا ہے۔''
وہ بجیرو کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ غزالہ پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر پھرتی سے نیچے آ گئی۔ ''تم یہاں بیٹھ جاؤ' میں پیچھے چلی جاتی ہوں۔''
غزالہ کی اس پیش کش میں اخلاق کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اسے جاؤ فان کے فراہم کیے ہوئے اس بیگ کی فکر لاحق ہو گئی تھی جو پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔
گیری کو اس وقت غزالہ کے حسن کی ستائش کا دھیان نہیں آیا۔ اس نے بہت شائستگی سے اس کا شکریہ ادا کیا اور پسنجر سیٹ پر سوار ہو گیا۔
''تم اکیلے ہو؟ کیپٹن کک کہاں رہ گیا؟'' میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
''ڈان کی پارٹی زبردست ہے۔ کام نہ ہوتا تو میں بھی وہاں رکتا۔ یہ جوان افسر ذرا رنگین مزاج ہوتے ہیں۔ کک وہیں رک گیا۔ پارٹی ختم ہو گی تو کسی سے لفٹ لے کر لوٹ آئے گا۔''
جاؤ فان کے فراہم کیے ہوئے بیگ کے ساتھ ہماری اہم اشیا بھی اس وقت غزالہ کے پاس تھیں۔ ان میں ایک بھرا ہوا پستول بھی شامل تھا۔ اس لمحے مجھے افسوس ہوا کہ گیری تک پہنچنے سے پہلے میں نے غزالہ کو کوئی ہدایت کیوں نہ دی کہ ضرورت پیش آنے پر اسے کون سا ہتھیار استعمال کرنا ہوگا۔
بیم گن کے بارے میں جلال کی واضح تاکید غزالہ کے علم میں تھی لیکن اس وقت وہ بوکھلائی ہوئی تھی۔ اضطرار کے عالم میں غلطی بھی کر سکتی تھی۔
''مارنا ہے۔'' میں نے اردو میں کہا۔
''کیا کہا تم نے؟'' گیری نے چونک کر مجھ سے پوچھا۔

''کک کے لیے اپنی مادری زبان میں شاندار متبادل لفظ استعمال کیا تھا۔'' میں نے زیرلب ہنستے ہوئے کہا ''تم کو ڈینی کے بارے میں تجسس تھا۔ قدرت کے کھیل بہت ہی نرالے ہوتے ہیں۔ یہ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ اس وقت تم ڈینی کے ہم سفر ہو۔''

میرے آخری فقرے پر وہ ایک گالی بک کر بری طرح سیٹ میں اچھلا۔ اس سے پہلے کہ وہ میری ڈرائیونگ میں حارج ہوتا' غزالہ نے اس کی کنپٹی پر پستول سے فائر کردیا۔

قریب کے فائر کے باوجود گولی اس کے دماغ میں پیوست ہوکر رہ گئی۔ اس کے جسم نے روح کو لرزا دینے والا ایک شدید جھٹکا لیا اور اس نے بیٹھے بیٹھے اسی لمحے دم توڑ دیا۔

وہ گیری سے قدرت کا انصاف تھا۔ میں اس سے کسی تصادم سے بچنے کی بھرپور کوششوں کے باوجود اسے راستے سے ہٹانے پر مجبور ہوگیا تھا۔

''تم نے پستول استعمال کرنے کے زبردست عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔'' میں نے اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کے کہا۔

''جلال نے بیم گن کو شجر ممنوعہ قرار نہ دے دیا ہوتا تو میں اسی کو آزماتی۔ اب اس لاش کو یہیں چلتی گاڑی سے لڑھکا دیں۔''

''مجھے خوشی ہے کہ آج تم نے بھی ایک ملک دشمن کو ٹھکانے لگا دیا۔ پارٹی سے لوٹنے والے سڑک پر اس کی لاش دیکھیں گے تو شہر میں ایک کہرام برپا ہوجائے گا۔ یہ انکشاف ہمارے حق میں نہیں ہوگا.....''

''گاڑی کو نورد جھیل میں ڈال کر سڑک سے اتار دیں۔ ٹیلوں کے درمیان کسی کو کچھ نظر نہیں آئے گا۔'' اس نے میری بات کاٹ کر متبادل تجویز پیش کردی۔

''ہمارے پیچھے پارٹی سے کوئی اور بھی لوٹ سکتا ہے۔ اس نے ہماری گاڑی کو کچے میں جاتے یا وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تو مشکلات کھڑی ہوجائیں گی۔ گیری کی لاش کو چند روز تک غائب رہنا چاہیے تاکہ ہم کمبوڈیا میں سکون سے کوئی ٹھکانا تلاش کرسکیں۔ تم کو اندازہ نہیں ہے' گیری کا قتل ہر طرف ایک آگ سی لگا دے گا۔''

''ان ویران ٹیلوں کے پیچھے کون جائے گا۔ لاش وہیں گلتی سڑتی رہے گی۔'' وہ اپنی تجویز پر مصر رہی۔

''مردار خور پرندوں پر شاید کوئی توجہ نہ دے لیکن معاملہ امریکی افسر کا ہوگا۔ اس کی گاڑی سڑک پر ملے گی۔ وہ پورے علاقے کا فضائی جائزہ ضرور لیں گے اور لاش دریافت کرلیں گے۔''

''کیا آپ اسے اپنے ساتھ کمبوڈیا لے جانا چاہ رہے ہیں؟''

''چڑنے کی ضرورت نہیں۔ بنکاک سے نکلنے کے بعد اسے کسی نالے یا کنوئیں میں پھینک دیں گے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا ''ابھی لاش گرم ہے' جوڑ نرم ہوں گے۔ اسے ماردیا ہے تو اتنی مہربانی اور کردو کہ اسے سیٹ سے پائیدان میں دھکیل دو۔''

''میں پہاڑ جیسا یہ بوجھ نہیں دھکیل سکوں گی۔'' وہ عجیب سے انداز میں منمنائی۔

''میں نے یہ کام کرنے کے لیے گاڑی روکی اور پیچھے سے کوئی سر پر پہنچ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ''ذرا سی ہمت سے کام لو' یہ اتنا بھاری نہیں ہے' جتنا نظر آرہا ہے۔''

''آپ بات ہی نہیں سمجھتے۔'' وہ جھنجلا گئی ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''اب تم بہانہ کررہی ہو۔ اچانک تمہاری طبیعت کو کیا ہوگیا؟'' میں نے ذرا تشی سے سوال کیا۔ اس کے نکتے پر مجھے غصہ آگیا تھا۔

''میں آپ کے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہ رہی تھی۔ میری خواہش تھی کہ آپ ہر طرف سے بے فکر ہوکر اپنا کام کرتے رہیں۔ آپ ناراض ہورہے ہیں تو سن لیں کہ میں آپ کی ہونے والی اولاد کے تحفظ کے لیے یہ احتیاط کررہی ہوں۔''

غزالہ کے وہ الفاظ میرے لیے اس قدر خوشی کا سبب بنے کہ فرطِ مسرت سے چند لمحوں کے لیے میری زبان گنگ ہوگئی۔ دل چاہا کہ گاڑی روک کر والہانہ انداز میں غزالہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں۔ اس خبر کا مجھے ایک مدت سے انتظار تھا۔ اس تاخیر میں ہمارے کسی ارادے یا کوشش کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس بارے میں ویرا اور سلمٰی نے کئی بار ٹوکا لیکن میں نے ہمیشہ کوئی دوٹوک جواب دینے کے بجائے ایسا مبہم رویہ اختیار کیا کہ تمسخر و استہزا کرنے والوں کو یہ گمان ہونے لگا کہ ہم دونوں جان بوجھ کر اس التوا کا سبب بن رہے ہیں۔

غزالہ نے وہ خبر اچانک اور مجبور ہوکر جس انداز میں سنائی' وہ میرے لیے بہت عجیب بلکہ خیال انگیز تھا۔ غزالہ خوب جانتی تھی کہ اسے ماں کے روپ میں دیکھنا میرا پرانا خواب تھا۔ اس بارے میں ہمارے درمیان دیر تک باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس ذکر پر غزالہ کے

حسین چہرے پر آزردگی کے سائے تیرتے نظر آنے لگے تو میں نے اس ذکر سے کنارہ کرلیا۔ میں نے رضا کارانہ طور پر اپنی زبان ضرور بند کرلی لیکن وہ خواہش میرے لاشعور سے یوں چپکی ہوئی تھی کہ ہر ماہ وسال مجھے غزالہ کی طرف سے کسی خبر کا انتظار رہتا تھا۔

وہ مبارک گھڑی آئی تو ایسے وقت میں آئی جب میں غریب الوطن ہوکر اپنے الجھاووں میں پھنسا ہوا تھا۔ غزالہ کو احساس تھا کہ اس نے مجھے اپنے راز میں شریک کیا تو میری توجہ بٹ جائے گی' ذہن اپنے مسائل کے ساتھ اس کی فکر میں بھی الجھ جائے گا لیکن گیری کے ناگہانی ظہور اور پھر اس کی موت نے وہ گرہ دور کردی۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا وجود ہلکا' بہت ہلکا ہوکر فضاؤں میں تیر رہا ہو۔ صرف وہ ماں نہیں بننے والی تھی' میں بھی باپ کے درجے پر فائز ہونے والا تھا۔ وہ پُرگداز احساس ایسا انوکھا تھا جسے میں صرف محسوس کر رہا تھا' اسے الفاظ کے قالب میں ڈھالنا ممکن ہی نہیں تھا۔

یہ بہت مبارک شگون تھا کہ وہ خبر میرے ایک حریف کی موت کے موقع پر سامنے آئی تھی۔ حریف بھی ایسا جس سے میرا کوئی مقابلہ ہوا نہ مجادلہ۔ وہ اپنی سازشی حرکتوں میں مصروف تھا۔ اس کی فتنہ انگیزیوں کی کہانیاں ثبوتوں کے ساتھ میرے علم میں آچکی تھیں لیکن میرے پاس اس سے الجھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تو میری شہ رگ کے گرد ڈان کا پھندا تنگ ہوتا چلا جاتا۔ میں نے اس سے کنی کاٹ کر نکل جانا چاہا لیکن قدرت نے مکافاتِ عمل کے آفاقی اصول کے تحت اسے دھکیل کر میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ شاید انسانی مقدر پر حکمرانی کرنے والی غیبی طاقت نے ہی غزالہ کے دماغ میں یہ خیال ڈالا کہ وہ اپنے وجود میں پنپنے والے ایک نئے وجود کے بارے میں اپنی زبان بند رکھے تاکہ ایک خاص موقع پر مجھے وہ نوید سنا سکے۔

میرا دل اپنے رب کے لیے تشکر اور ممنونیت کے جذبات سے یوں لبریز ہوا کہ غزالہ سے کوئی مکالمہ ہوئے بغیر میرے وجود کی گہرائیوں میں رقت کا ایک طوفان امڈ پڑا اور میری بصارت ایک آبی پردے سے دھندلانے لگی۔

ان چند لمحوں کی کیفیت ناقابلِ بیان تھی۔ میں سب کچھ فراموش کرچکا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میرے برابر والی نشست پر ایک تازہ لاش رکھی ہوئی ہے۔ میں اس وقت چونکا جب گاڑی کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں نے غیر ارادی طور پر ایک ہاتھ سے پاور اسٹیئرنگ کاٹ کر پجیرو کو سنبھالا' دوسرے ہاتھ کی آستین سے آنکھوں کی نمی صاف کی تو اندازہ ہوا کہ ہماری گاڑی اس لمحے ایک خطرناک کھڈ میں اترتے اترتے بچی تھی۔

غزالہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی میرے اس جذباتی ابال کو محسوس کر رہی تھی۔ اس نے نرمی سے میری پشت سہلائی' کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے ہونٹوں سے چند بے معنی آوازیں نکل کر رہ گئیں۔ اس کی حالت مجھ سے مختلف نہیں تھی۔

گاڑی کے جھٹکے سے گیری کا بدن پشت گاہ سے لڑھک کر بند دروازے سے ٹک گیا تھا۔ میں نے عقب نما آئینے میں دور تک پھیلے ہوئے گھور اندھیرے سے مطمئن ہوکر گاڑی کی رفتار دھیمی کی اور ایک ہاتھ سے زور لگا کر گیری کے بھاری وجود کو کسی نہ کسی طرح گاڑی کے کشادہ پائیدان میں گرانے میں کامیاب ہوگیا۔ ناگہانی جھٹکے نے اس کام کو خاصا آسان بنادیا تھا۔

غزالہ اسی لمحے اگلی نشست پر آگئی۔ گیری کی لاش اس کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی۔

ہم دونوں کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے جیسے دونوں کی قوتِ گویائی سلب ہوگئی ہو۔ اس تاریک ویرانے سے نیم روشن سڑک پر آنے کے بعد میں نے غزالہ کو چلتی گاڑی میں بار بار نشستوں کی تبدیلی کے حوالے سے چھیڑا تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر نے اسے وزن اٹھانے سے منع کیا ہوا تھا۔ ہلکی پھلکی اچھل کود اس کے لیے بے ضرر تھی۔

ڈاکٹر کے ذکر نے مجھے پھر چونکا دیا۔ بنکاک میں اس کے شب و روز میرے سامنے تھے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے کس ڈاکٹر سے رجوع کرنے کا موقع کب مل گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ خریداری کے بہانے دوبار ایک تھائی گائنا کولوجسٹ سے ملی تھی۔

جو ڈوٹ گیا' باتیں چل نکلیں تو پتا چلا کہ ویرا اس کی ہم راز بنی ہوئی تھی۔ سیام پارک میں غزالہ نے اسے تخلیے میں لے جاکر اپنے دل کی بات بتادی تھی۔ اس وقت تک ہم میں سے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ ہم کب تک بنکاک میں رکے رہیں گے۔ ویرا خود بھی ماں بننے کے تجربے سے نہیں گزری تھی لیکن اس نے غزالہ کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ ان ابتدائی ایام میں محتاط رہنے کے ساتھ باقاعدگی سے اپنی معالجہ سے رجوع کرتی رہے۔

مجھے یاد آرہا تھا کہ غزالہ ایک سے زائد بار سیام پارک کے گوشے میں ویرا سے ہونے والی باتوں کے بارے میں کچھ بتاتے بتاتے خاموش ہوگئی تھی۔ اس نے ویرا کے ساتھ مل کر

بہت کامیابی سے اپنی رازداری برقرار رکھی تھی۔
ویرا بے لگام منہ پھٹ اور موڈی خاتون تھی۔ اسے اس کی مرضی کے خلاف بولنے یا خاموش رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ غزالہ کے معاملے میں وہ بہت پکی نکلی۔ مجھ سے غیر معمولی بے تکلفی ہونے کے باوجود اس نے مجھے اس امر کی ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ غزالہ تبدیلی کے کسی نازک دور سے گزر رہی تھی۔

''یہ باتیں ہوتی رہیں گی۔ ان میں پڑ کر آپ یہ کیوں بھول گئے ہیں کہ میرے قدموں میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔'' غزالہ نے شوخی سے کہا۔

''آنے والے نے گیری کی بھینٹ لی ہے۔ فی الحال اس کے لیے وہی جگہ بہتر ہے جہاں وہ پڑا ہوا ہے۔'' میں نے سرور کے عالم میں جواب میں دیا ''ان دونوں کو لینے کے بعد اس کے بارے میں کچھ سوچا جائے گا۔''

''میں مشورہ دوں گی کہ پہلی فرصت میں اس سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ رات کے گہرے اندھیرے میں کوئی نالا یا کنواں تلاش کرنا ناممکن ہوگا۔''

''وہ میری ابتدائی تجویز تھی۔ کہیں نرم زمین مل گئی تو رک کر اسے دفن بھی کیا جاسکتا ہے۔''

''آپ اس کے لیے ان بکھیڑوں میں کیوں پڑنا چاہ رہے ہیں؟'' اس نے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا ''اس چکر میں ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔''

''اس کی لاش کا چند روز تک غائب رہنا ہمارے مفاد میں ہوگا۔'' میں نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھایا ''لاش دستیاب ہوتے ہی اس کے اعلیٰ افسران ایک قیامت کھڑی کردیں گے۔''

''لاش چھپا کر آپ اس قیامت کو نہیں ٹال سکتے۔''

''اس کی نوعیت دوسری ہوگی۔ لاش ملنے کے بعد اس کے قتل کا الزام ہمارے سر آئے گا کیونکہ کسی کو ہمارا سراغ نہیں مل سکے گا۔ اگر یہ بکھیڑو کسی کی نظروں میں نہیں آئی تو وہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ ہم گیری کو اغوا کر کے کہیں چھپ گئے ہیں۔ وہ یہ اندازہ لگائیں گے کہ سواری نہ ہونے کی وجہ سے ہم وہاں سے زیادہ دور نہیں جاسکے ہوں گے۔ وہ اپنا کافی وقت ان اطراف میں برباد کریں گے۔ ناکامی کے بعد ان کی ساری توجہ بنکاک کو کھنگالنے پر مرکوز رہے گی۔ ہوسکتا ہے کہ ہم اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر کمبوڈیا سے بھی نکلنے میں کامیاب ہوجائیں۔ ہمارے لیے وقت بہت اہم ہے۔ لاش چھپا کر ہم یہ وقت خرید سکتے ہیں۔ کئی دن برباد کرنے کے بعد شاید وہ گیری کے قتل کے امکان پر غور کرسکیں گے۔''

''ہم اس ملعون کی وجہ سے بہت گمبھیر صورتِ حال سے دوچار ہوگئے ہیں۔''

''سامنے آجانے کے بعد اسے مارنا ناگزیر تھا۔ مارنے کے بعد لاش کو چھپانا ہماری ضرورت بن گیا ہے۔ وہ جتنی دیر تذبذب اور بے یقینی کا شکار رہیں گے' ہم ان کی دسترس سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔'' اس سے گفتگو کرتے ہوئے میرے ذہن میں آنے والے وقت کا ایک واضح خاکہ بنتا جارہا تھا۔

''ہر دو صورتوں میں ہم دونوں ہی ان کے شکوک وشبہات کا مرکز رہیں گے۔''

''یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے لیے واشنگٹن سے آج ہی فون آنا تھا۔''

''رات کے دو بجے کس کا فون آتا...... وہ بہانے بازی کررہا تھا' کسی اور چکر میں رہا ہوگا۔''

''تم وقت کے فرق کو فراموش کررہی ہو۔ بنکاک اور واشنگٹن کے وقت میں کم وبیش آدھے دن کا فرق ہے۔ وہاں اس وقت دوپہر ہوگی۔ چہرے مہرے سے یہ بھی ادباش اور تفریحات کا رسیا نظر آتا تھا۔ سرکاری کام نہ ہوتا تو یہ بھی روشنیاں گل ہونے کے انتظار میں وہاں رکا رہتا۔''

''کیا وہ پارٹی سورج طلوع ہونے تک چلتی رہے گی؟'' غزالہ نے حیرت سے پوچھا۔

میں دھیرے سے ہنس دیا ''کبھی کبھی تم احمقانہ بات کہہ جاتی ہو۔ چاؤفان نے بتایا تھا کہ مہمانوں کا خمار گہرا ہونے کے بعد صرف ساحل کی طرف جلنے والی سرچ لائٹس روشن رہیں گی۔ باقی تمام روشنیاں ڈان کے ایک اشارے پر بجھادی جائیں گی۔''

''لعنت ہو ڈان اور اس کے مہمانوں پر۔'' وہ تیزی سے بولی ''کاش' سمندر کی کوئی اونچی لہر ان سب کو اپنے ساتھ بہا کر لے جائے۔ ان سیاہ کرتوتوں کی پردہ داری کے لیے اس دور افتادہ ویرانے کا انتخاب کیا گیا ہوگا ورنہ یہ تقریب کہیں اور بھی ہوسکتی تھی۔''

''ڈان کے دماغ میں راجن کی وائٹ ہاک گھسی ہوئی ہے۔''

وہ میرے لیے بنکاک میں ڈرائیونگ کا پہلا تجربہ تھا۔ ہم گھور اندھیرے کو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ میرے سامنے شہر کے روشن اور کشادہ راستے پھیلے ہوئے تھے۔ ان علاقوں میں لوگوں کی دل بستگی کے لیے شبینہ تفریحات کے ٹھکانے نہیں

پائے جاتے تھے اس لیے ہر طرف خاموشی اور ویرانی کا گہرا راج تھا۔ اسٹریٹ کیمپس کے روشن قمقمے بھی تھکے تھکے اور خوابیدہ سے نظر آرہے تھے۔ مجھے وہ سب بالکل نیا نظر آرہا تھا۔ کہیں بھی کوئی ایسی نشانی نظر نہیں آرہی تھی کہ جس کے سہارے میں صحیح راستے کا تعین کرسکوں۔

بس سمت کا ادراک ذہن میں موجود تھا۔ اس کے سہارے میں رکے بغیر بڑھتا جارہا تھا۔ بہ ظاہر میں غزالہ سے باتوں میں مصروف تھا مگر مجھے راستے کی فکر دامن گیر تھی۔ چاؤفان سے سب کچھ طے ہوگیا تھا۔ بس وہی ایک مسئلہ میں نے معمولی سمجھ کر نظرانداز کردیا تھا۔

ہمارے لیے وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میرے ایما پر غزالہ نے چاؤفان کے فراہم کیے ہوئے بیگ میں سے تہ کیا ہوا نقشہ نکال کر اپنی گود میں پھیلا لیا۔

کیبن لائٹ کی روشنی میں مجھے محسوس ہوا کہ چاؤفان اپنے قول کے مطابق واقعی اتنا بے وقوف نہیں تھا جتنا مجھے نظر آتا تھا۔ اس نے ہمیں کوئی لمبا چوڑا نقشہ دینے کے بجائے ایک بڑے نقشے سے صرف وہ حصہ کاٹ لیا تھا جس پر سفر کرکے ہمیں کمبوڈیا کی سرحد میں داخل ہونا تھا۔ بڑے اسکیل پر چھپے ہوئے اس نقشے میں چاؤفان کی لگائی ہوئی سرخ لکیر بہت نمایاں تھی۔ اس راستے کے قرب و جوار میں چھوٹی بڑی سڑکیں اور آبادیاں بھی بہت واضح تھیں۔

مجھے پہلے سے اس راستے کا علم نہیں تھا لیکن غزالہ سے یہ سن کر کہ ہمیں پنچ بری روڈ سے ہی شمال کی طرف ایکسپریس وے پر جانا تھا' خوشی ہوئی کہ میں نے ویرا اور سلطان شاہ کو صحیح مقام پر پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔

کچھ دیر بعد مجھے جانی پہچانی عمارات نظر آنے لگیں۔ میں بنکاک کے راستوں سے زیادہ واقف نہیں تھا مگر چاؤفان کے ساتھ شہر کی کوچہ نوردی کرتے ہوئے میں نے ہر ممتاز عمارت اور نمایاں مقامات کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی تھی جو اس آڑے وقت میں میرے کام آئی۔

ہم شہر کے مرکزی حصے میں داخل ہوئے تو میری رسٹ واچ رات کے پونے دو بجا رہی تھی۔ پارٹی سے قدرے تاخیر سے روانگی اور کرنل گیری سے مڈبھیڑ ہونے کے باوجود ہمارا وقت خراب نہیں ہوا تھا۔ اس رات ہمارے ستارے یاوری کررہے تھے۔ گیری جیسا چالاک اور خطرناک آدمی حالات کی بے بسی کا شکار ہوکر غزالہ کے ہاتھوں کسی مینمے کی طرح مارا گیا۔ راستوں کا علم نہ ہونے کے باوجود میں اپنی چھٹی حس کے سہارے صحیح سمت میں گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ خوش نصیبی اس سفر میں آگے بھی ہمارا ساتھ دے گی اور ہم عافیت کے ساتھ ڈان اور تھائی قانون کی گرفت سے دور نکل جائیں گے۔

چاؤفان کے ساتھ اپنے فرار کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے میرے ذہن پر صرف اور صرف ڈان کی بدنیتی کا خوف سوار تھا۔ وہ اپنے مکارانہ حربوں سے مجھے بنکاک میں روک کر مجھ سے کام لینا اور میرے بارے میں مزید چھان بین کرنا چاہ رہا تھا۔ بنکاک میں قانون کی بہت سی سنگین خلاف ورزیاں کرنے کے باوجود مجھے قانون کے محافظوں کی طرف سے کوئی تشویش لاحق نہیں تھی کیونکہ وہ میری درپردہ کارروائیوں سے بے خبر تھے۔ گیری کی ہلاکت نے وہ صورتِ حال یکا یک بدل دی تھی۔ اس کی گمشدگی کے بارے میں ہمارے خلاف کوئی ثبوت نہ ہونے کے باوجود مقامی پولیس واتفاقی شہادتوں کی روشنی میں ہماری تلاش شروع کردیتی۔

پیٹ پونگ سے پنچ بری تک' شہر کے قلب میں شب بیدار رندوں کی مشتبہ سرگرمیاں پورے زوروشور سے جاری تھیں۔ ان میں ہر ملک اور ہر قوم کے مردوزن نظر آرہے تھے۔ سب کھوئے کھوئے اور خواب زدہ انداز میں سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر رواں دواں تھے۔ ان کے لیے رات اترنے کے بعد دن طلوع ہوتا تھا۔

گاڑی میں ایک اہم امریکی سفارت کار کی تازہ لاش لے کر بنکاک کے اس شب بیدار علاقے سے گزرنا آسان کام نہیں' میرا دوران خون تیز ہوچکا تھا' دل کی دھڑکنیں کنپٹیوں میں محسوس ہورہی تھیں اور نگاہیں تیزی سے گردوپیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔

میں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ وہ دونوں کاؤبوائے کلب کے قریب کسی آوارہ گرد جوڑے کی طرح بے پروائی سے ایک دیوار سے لگے ہوئے تھے۔ کاؤبوائے کلب میں رات اپنے ہنگامہ خیز شباب پر تھی' فٹ پاتھ پر بھی کافی لوگ موجود تھے لیکن کوئی ان دونوں کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

انہیں یہ علم نہیں تھا کہ میں کس گاڑی میں انہیں لینے کے لیے آؤں گا۔ جوں ہی میں نے گاڑی کنارے سے لگا کر روکی' انہوں نے ہماری ایک جھلک دیکھی اور تیر کی طرح ہماری طرف چلے آئے۔ کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ان دونوں کے شانوں پر ہلکے پھلکے سفری تھیلے جھول رہے تھے جو قلاش سیاح عام طور پر اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ وہ دونوں ایک ہی سمت کا دروازہ کھول کر پھرتی سے عقبی نشست پر سوار ہوگئے اور میں نے گاڑی آگے

بڑھادی۔

''فرار کے لیے اس سے بہتر گاڑی ملنی مشکل تھی۔'' ویرا نے بیٹھتے ہی ستایشی لہجے میں تبصرہ کیا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ چاؤفان کو اُلّو کا گوشت کھلا کر تم نے اپنا مطیع بنالیا ہے۔''

''تم لوگوں کا بقیہ سامان کہاں ہے.....؟ کراچی میں تو تم دونوں نے سفر کے لیے اچھے خاصے سوٹ کیس تیار کیے تھے۔'' میں نے اس کے تبصرے کو نظر انداز کر کے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''یوں سمجھ لو کہ ایک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے' کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔'' خطرناک مہم درپیش ہونے کے باوجود ویرا شگفتہ موڈ میں تھی۔ اس کی بات جاری رہی ''کچھ نیویارک میں رہ گیا' چند جوڑے ٹورنٹو میں پھینک دیے' ایک تھیلا راستے میں کوڑے دان میں پھینکتے ہوئے آئے ہیں۔ بس کچھ چیزیں ہیں' جن کے بغیر گزارہ مشکل تھا۔''

یکا یک اس نے چند گہرے سانس لیے پھر تشویش زدہ انداز میں بولی ''گاڑی میں جلے ہوئے بارود کی بو کیوں آرہی ہے؟''

میں دل ہی دل میں ویرا کے تیز مشاہدے کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ گاڑی میں میلوں پیچھے فائر کیا گیا تھا۔ ساری بو تیز ہوائیں اڑا لے گئی تھیں مگر اس کی حساس ناک نے گیری کے دماغ میں گھسی ہوئی گولی کی بارود کی بو سونگھ لی تھی۔

''جس طرح دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے اسی طرح بارود انسانی خون میں نہا کر اپنی افادیت ثابت کرتا ہے۔'' میں نے پُرمزاح لہجے میں جواب دیا ''غزالہ کی چلائی ہوئی گولی ایک دشمن کی کھوپڑی میں پیوست ہے اور وہ اگلے پائیدان میں موجود ہے۔''

''نہیں!'' ان دونوں کے دہانوں سے گھٹی گھٹی تحیر زدہ آوازیں آئیں اور وہ ایک ساتھ اگلی نشستوں کے درمیان آگے جھک آئے۔

گاڑی میں اندھیرا تھا لیکن ایکسپریس وے کی تیز روشنیوں کا انعکاس اتنا کافی تھا کہ دونوں نے ہی غزالہ کے قدموں میں پڑی ہوئی گٹھڑی نما لاش دیکھ لی۔

''یہ کون ہے..... تم اسے اپنے ساتھ کیوں لیے پھر رہے ہو؟'' سلطان شاہ کے ہونٹوں سے دبی دبی مگر تیز سرگوشیانہ آواز برآمد ہوئی۔

''یہ امریکیوں کا گیری دی گریٹ ہے۔ تم دونوں کی تلاش میں لگا ہوا دشمن نمبر ایک۔'' میں نے کہا ''یوں سمجھ لو کہ یہ صرف مرنے کے لیے دست بستہ ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔''

''تم اب بھی ان دنگلوں میں لگے ہوئے ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ غزالہ آج کل کس حال سے گزر رہی ہے؟'' ویرا نے بے ساختگی سے ترش لہجے میں اپنی تشویش ظاہر کی۔

''گیری کے آنجہانی ہونے کے بعد معلوم ہوا ہے..... تمہیں متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ غزالہ نے صرف پستول کا ٹریگر دبایا ہے۔ محنت کا کام میں نے خود کیا ہے۔'' میں نے اسے آگاہ کیا ''مجھے سخت شکایت ہے کہ تم دونوں نے اپنی زبانیں بند رکھ کر میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔''

''کیا ہوا..... غزالہ کو کیا ہو گیا؟'' سلطان شاہ کی آواز کی پریشانی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ویرا نے اسے بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

''غزالہ تمہاری منہ بولی بہن ہے۔ یوں سمجھ لو کہ سات آٹھ مہینوں کے بعد تم کسی کے منہ بولے ماموں بننے والے ہو۔ آئی بات سمجھ میں!'' ویرا نے منہ توڑ انداز میں جواب دیا۔

میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ ویرا کے ذہن سے میری پچھلی ملاقات کے اثرات زائل ہو چکے تھے۔ اس میں ذرا بھی دھیما پن نہیں آیا تھا۔

''بہت خوشی کی بات ہے کہ آج یہ خبر مل رہی ہے۔ یہ واقعہ تو آج سے بہت پہلے رونما ہو جانا چاہیے تھا۔'' سلطان شاہ کی آواز سے بے پناہ مسرت جھلک رہی تھی ''مبارک ہو..... میری طرف سے تم سب کو مبارک ہو۔ اب ہم اپنی گود میں ڈینی کے بچے کو کھلائیں گے۔''

''ڈینی کا بچہ کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔'' ویرا کھلکھلا کر ہنس دی ''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بچی بھی ہو سکتی ہے۔''

''تم لوگوں نے کیا خرافات شروع کر دیں۔'' غزالہ جھنجلائی ہوئی آواز میں بولی ''کیا ہم اس لاش کو یوں ہی اپنے سینے سے لگائے پھرتے رہیں گے؟''

''ہاں' اس کی کہانی سناؤ۔'' ویرا بولی ''اس جیسا مکار اور موذی شخص کسی دھوم دھڑکے کے بغیر اتنی آسانی سے تمہارے چنگل میں کیسے آ پھنسا؟''

وہ بہت مختصر سا واقعہ تھا۔ میں نے پوری جزئیات کے ساتھ ان دونوں کے سامنے دہرا دیا۔ ساتھ ہی انہیں اپنے تحفظات اور اندیشوں سے بھی آگاہ کر دیا۔

''فی الوقت تمہارا اندیشہ بے بنیاد ہے۔'' ویرا نے پوری بات سن کر فیصلہ کن انداز میں اپنی رائے دی۔ ''اس ویران سڑک پر گیری کی خراب گاڑی دریافت ہوگی اور اس کا کہیں پتا

نہیں چلے گا تو ہر طرف بھونچال ضرور آئے گا لیکن کسی کو بھول کر بھی تمہارا خیال نہیں آئے گا۔ تم بتا رہے ہو کہ پارٹی میں ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ ڈان سمیت سب لوگ نشے کے خمار میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ گیری کی گاڑی دریافت ہونے تک سب ہوش وخرد سے بے گانہ ہو چکے ہوں گے۔ ہر شخص گیری سے ہمدردی ظاہر کرتا ہوا اپنے گھر جا کر سو جائے گا۔ تم دونوں کے فرار کا راز اس وقت کھلے گا جب ڈان ہوش وحواس میں آنے کے بعد کسی ضرورت کے تحت تم سے رابطہ کرنا چاہے گا اور تم کہیں دستیاب نہ ہو گے۔ دونوں الگ الگ واقعات تصور کیے جائیں گے۔ ڈان تمہیں تلاش کرے گا۔ ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ گیری تم دونوں کو اغوا کر کے کہیں غائب ہو گیا۔ گاڑی خراب ہونے پر اس نے کوئی متبادل تلاش کر لیا ہوگا۔ تمہاری ذات میں گیری کی دلچسپی ڈان کے علم میں آ چکی تھی۔ منفی سمت میں مت سوچو۔ ڈان کو صحیح نتیجے پر پہنچنے میں کئی دن بھی لگ سکتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ مہلت غنیمت ثابت ہوگی۔ اصل نکتہ وہی ہے جو تمہارے ذہن میں جما ہوا ہے۔ کسی کو گیری کی لاش کی بھنک نہیں ملنی چاہیے۔ لاش سامنے آنے سے پورا کھیل بگڑ جائے گا۔''

تعداد میں دو سے چار ہوتے ہی صورتِ حال حوصلہ افزا نظر آنے لگی۔ سب کچھ جوں کا توں تھا لیکن میرے ذہن سے دباؤ دور ہو گیا۔ ہم چاروں ایک مدت کے بعد بے تکلفانہ فضا میں یکجا ہوئے تھے۔ ماحول میں عجیب جوش اور گرم جوشی پائی جا رہی تھی۔

بیچ بری سے ایکسپریس وے سیدھی جا رہی تھی۔ اس پر لاش کو کسی محفوظ مقام پر ٹھکانے لگانے کا موقع ملنا محال تھا۔ بنکاک کے مضافاتی رہائشی علاقے میں سڑک کے کنارے تھائی اور انگریزی زبانوں میں لگے ہوئے بورڈ سے علم ہوا کہ وہاں سے آگے اس سپر ہائی وے کا نام شاہ راہِ دوستی ہو گیا تھا۔ وہ علامات دیکھتے ہی ویرا نے غزالہ سے نقشہ لے لیا اور پورے انہماک سے ہمارے سفر کے مجوزہ راستے کے مطالعے میں جٹ گئی۔

سلطان شاہ نے غزالہ سے باتیں شروع کر دیں۔ ہم سب چار جان ایک قالب تھے۔ ہمارے درمیان کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی تھی۔ غزالہ اسے جلال کی کمبوڈیا میں متوقع آمد اور اس کے دیے ہوئے نئے ناموں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ویرا بہ ظاہر اپنے کام میں لگی ہوئی تھی لیکن درمیان میں لقمے دیتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر کی دماغ سوزی کے بعد ویرا نے بتایا کہ اس وقت ہم لوپ بوری کی سمت میں جا رہے تھے۔ جہاں سوبھراج کی زندگی کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہوا تھا۔ لوپ بوری سے کافی پہلے پھرانا خون (PHIRA NAKHON) نامی قصبے سے ہمیں سپر ہائی وے سے اتر جانا تھا۔ اس نئی سڑک کا نام شاہ راہ دوستی تھا جو متعدد شہروں اور قصبوں سے ہوتی ہوئی کمبوڈیا میں داخل ہو جاتی تھی۔

سپر ہائی وے پر لگے ہوئے سائن بورڈ کے بارے میں غلط فہمی دور ہونے سے مجھے اطمینان ہوا کہ پھرانا خون کے بعد ہم گیری کے ناپسندیدہ بوجھ سے نجات حاصل کرنے کی کوئی راہ نکال سکیں گے۔

تقریباً ایک گھنٹے کی آرام دہ اور تیز رفتار مسافت کے بعد ہمیں پھرانا خون کے نشانات نظر آنے شروع ہو گئے۔ اس دوران میں ویرا اور سلطان شاہ نے ٹارچ کی روشنی میں باری باری گیری کی لاش کا دیدار کر لیا تھا۔

اس کی کنپٹی پر چھوٹے سے زخم کے گرد خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ فوری طور پر اس کی موت واقع ہونے کی وجہ سے زخم سے خون بہنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اسے مرے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اس لیے لاش کے جوڑ بہ دستور نرم تھے۔

سپر ہائی وے پر رات گہری ہو جانے کے باوجود مال بردار ٹرکوں اور ٹریلروں کی خاصی آمد و رفت جاری تھی۔ اس دوران میں ہمیں گنتی کی چند گاڑیاں آتی جاتی نظر آئیں۔ ان میں لوگ شاید کسی ہنگامی ضرورت کے تحت سفر پر نکلے تھے۔

پھرانا خون کی آبادی خاصی وسیع تھی۔ ہائی وے کی بلندی سے شہر کی خواب ناک روشنیاں دور تک پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ ہم سپر ہائی وے سے بائیں طرف شاہ راہ دوستی پر اترے تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔ ہمارے سفر کا ایک مرحلہ خیر و خوبی سے مکمل ہو گیا تھا۔

ہم آبادی کے بیرونی سرے کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ وہ سڑک بھی کشادہ اور ہموار تھی۔ دوسری خاص بات یہ تھی کہ سپر ہائی وے کے مقابلے میں اس روٹ پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔

پھرانا خون کی آبادی سے آگے نکل جانے کے بعد میں نے گاڑی کی رفتار کم کر لی۔ میری نگاہیں کوئی مناسب مقام تلاش کر رہی تھیں جہاں گیری کی لاش کو ٹھکانے لگایا جا سکے۔

''تمہیں اپنے چاؤ چان پر پورا بھروسا ہے؟'' اچانک ویرا سوال کر بیٹھی۔ غزالہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''اس کا نام چاؤ چان نہیں چاؤ فان ہے۔ ابھی تک وہ اپنے قول کا دھنی ثابت ہوا ہے۔'' میں نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا ''اس پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔''

''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ڈان کا ایک پرانا نمک خوار یکا یک تمہارا ہمدرد کیوں بن گیا؟''

وہ بہت سی باتوں سے بے خبر تھی۔ جب میں نے اسے سمجھایا کہ بنکاک میں میری موجودگی اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ میری مدد کر کے اس نے وہ رکاوٹ دور کرنے کی ایک بے ضرر کوشش کی تھی تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی ورنہ وہ کمبوڈیا جانے کے بجائے کہیں اور روپوش ہو جانے کی تجویز لیے بیٹھی تھی تاکہ چاؤ فان کو بھی ہماری اگلی منزل کا سراغ نہ مل سکے۔

پھر انا خون سے کافی دور آنے کے بعد مجھے سڑک کے دونوں طرف چھدرے درختوں سے گھرا ہوا ویرانہ نظر آیا۔ اس وقت ہمارے آگے پیچھے' دور تک کوئی گاڑی نہیں تھی۔ میں نے ان تینوں کو ہوشیار کیا اور گاڑی دھیمی کر کے سڑک سے نیچے اتار دی۔

ویرا اور سلطان شاہ کے شامل ہونے کے بعد مجھے جو اطمینان حاصل ہوا تھا' وہ وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ دوبارہ اعصابی دباؤ میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ راستے اجنبی تھے۔ آگے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا کہ ہمیں کہاں موقع میسر آ سکے گا۔ بہتر یہی تھا کہ پہلی فرصت میں گیری کی لاش سے نجات حاصل کر لی جائے۔

''اس ویران جنگل میں اترتو رہے ہو' واپسی کا خیال بھی رکھنا۔'' ویرا نے تفکر آمیز لہجے میں مجھے ٹوکا ''ایسا نہ ہو کہ ہم بھٹک کر واپس لوٹ جائیں۔''

''یہ تمہاری بھی برابر کی ذمے داری ہے' ذرا سستوں کا خیال رکھنا۔''

''اس جنگل میں کیا گیری کی لاش کو کسی پیڑ پر لٹکانے کا ارادہ ہے؟''

''اور کچھ نہ ہو سکا تو یہی کرنا پڑے گا۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''ابھی لمبا سفر باقی ہے۔ کہیں نہ کہیں بہتر موقع مل جاتا۔ غزالہ کا پیر بھاری ہو چکا ہے۔ گیری نکل کر کہیں نہیں بھاگ سکے گا۔ یہاں دور تک سپاٹ میدان نظر آ رہا ہے۔ گاڑی یہیں سے سڑک کی طرف موڑ لو۔'' اس نے تمسخرانہ انداز میں رائے زنی کی۔

''اس چکر میں ہم سرحد تک پہنچ جائیں گے اور کچھ نہیں ہو سکے گا۔''

کچھ زمین ناہموار تھی' بے ترتیبی سے اگے ہوئے درختوں کے درمیان راستہ بنانے کے لیے تھوڑی سی دشواری ہو رہی تھی۔ گاڑی ہچکولے کھاتی آگے بڑھتی رہی۔

''روکو..... گاڑی روک دو!'' یکا یک سلطان شاہ چلایا اور میں نے گھبرا کر بریک لگا دیے۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور سسپنشن پر جھول کر رہ گئی۔

''کیا تمہیں اپنے گاؤں کی کوئی بدروح نظر آ گئی؟'' ویرا نے اس سے پوچھا۔

''میرے گاؤں کی نہیں' امریکی ہے۔'' اس نے بے رخی سے جواب دیا اور اپنی سمت کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

میری ساری توجہ گاڑی کے راستے پر مرکوز تھی۔ سلطان شاہ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں دونوں اطراف کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ زمین میں ایک تازہ گڑھا دیکھ کر اس نے گاڑی رکوائی تھی۔

میں نے گاڑی کا انجن بند کیا۔ ہیڈ لیمپس روشن رہنے دیے اور سلطان شاہ کے ساتھ ہو لیا۔ ویرا بھی ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔

میں نے دور ہی سے وہ گڑھا دیکھ لیا جس پر نظر پڑتے ہی سلطان شاہ نے گاڑی رکوائی تھی۔ وہ کوئی لمبا سا گڑھا تھا جس کے کناروں پر مٹی کا خاصا ڈھیر جمع تھا۔ میں نے بے اختیار سلطان شاہ کو شاباش دی اور لپک کر گڑھے کے کنارے پہنچ گیا۔

وہ زمین پر نیم گولائی میں خاصا بڑا گڑھا تھا جو کسی قدرے بڑے چوپائے نے اپنے آرام کے لیے زمین میں کھودا تھا۔ مٹی کے ڈھیر سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک دو دن سے زیادہ پرانا نہیں تھا۔

''یہ تو گیری کی بنی بنائی قبر ہے۔'' وہ جگہ دیکھتے ہی ویرا بے ساختہ بولی ''ذرا سی محنت سے اسے گہرا اور چورس کر لیا جائے تو وہ آسانی سے یہاں سما جائے گا۔''

ہمارے پاس زمین کھودنے کا کوئی اوزار نہیں تھا مگر میں وہ موقع ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے گاڑی وہیں گھما لی۔ ہیڈ لیمپس کا جلتے رہنا خطرناک تھا۔ وہ مشکوک روشنی سڑک سے دیکھی جا سکتی تھی۔ ہیڈ لیمپس گل کرنے کے بعد تاروں کی روشنی ناکافی محسوس ہوئی۔ چاؤ فان کے فراہم کیے ہوئے تھیلے کو ٹٹولا گیا تو اس میں جیبی ٹارچ کے ساتھ ایک طاقتور سرچ لائٹ اور مضبوط رسی بھی موجود تھی۔

ہم نے گیری کی نرم لاش پائیدان سے وہیں گرا کر سیدھی کی۔ رات کے پُرہول اندھیرے میں اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں خوف آور انداز میں ہماری طرف نگراں تھیں۔ ویرا نے پھریری لے کر اس کے بے نور چہرے پر اپنا اسکارف ڈال دیا۔

ہاتھوں کی مدد سے اس گڑھے کو لمبا اور ہموار کرنے کے کام شروع کیا گیا تو غزالہ بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ویرا نے سختی سے اسے روک دیا۔ اس کا کام صرف روشنی دکھانا تھا۔

سطح ٹوٹ جانے کے سبب اندر کی زمین قدرے نرم تھی مگر اتنی بھی نرم نہیں تھی کہ ہم کسی جنگلی درندے کی طرح اسے تیزی سے کھرچ لیتے۔ سلطان شاہ ابتدا میں ٹرانسپورٹ لائن سے وابستہ رہا تھا۔ وہاں اس کا پرانا تجربہ کام آیا۔ وہ پجیرو کے ٹول بکس میں سے جیک راڈ اور پیچ کس نکال لایا۔ ان اوزاروں کی مدد سے کام کی رفتار تیز ہوگئی۔

ویرا کی سفاکانہ تجویز تھی کہ گڑھے کو لمبا کرنے کے بجائے لاش کی ٹانگیں کاٹ کر اسے گڑھے میں ٹھونس دیا جائے۔ ہم میں سے کوئی اس کام پر آمادہ نہ ہوا۔ جب تک گیری زندہ تھا' میرا ناپسندیدہ شخص تھا لیکن ہلاکت کے بعد اس کی لاش کی بے حرمتی کرنا مناسب نہ ہوتا۔

سرسری طور پر وہ کام جتنا آسان نظر آرہا تھا' عملی طور پر اس سے کہیں زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ تقریباً پون گھنٹے کی کڑی محنت کے بعد جب ہم تینوں تھک کر پسینوں میں نہا گئے تب وہ گڑھا اس قابل ہوا کہ اس میں لاش اتاری جاسکے۔

انسان جب تک زندہ رہتا ہے' اپنی ذات کے فسوں میں ایسا گرفتار رہتا ہے کہ دنیا کی کسی شے کو خاطر میں نہیں لاتا۔ مال وزر اور آرام و آسایش کے حصول کی دوڑ میں جائز و ناجائز کی پروا نہیں کرتا۔ اپنی راہ میں آنے والوں کو کچل کر آگے بڑھنے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے۔ اس زندگی کا آخری انجام ہمارے سامنے تھا۔ گیری کا رسوخ اس کے کام آیا تھا نہ شہ زوری اسے بے بسی کی موت سے بچا سکی تھی۔ زندگی بھر اس نے جو کچھ کمایا تھا' وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ اس منزل پر اتنا تہی دست اور تہی دامن تھا کہ اسے ڈھنگ کی تدفین بھی نصیب نہیں ہوسکی تھی۔

لاش کو گڑھے میں ڈال کر میں نے ویرا کے اسکارف کا غور سے معائنہ کیا۔ اس پر ایسا کوئی نشان نہیں تھا جو اس کا سراغ ثابت ہوسکے۔ لاش گڑھے میں اس طرح پھنس گئی تھی کہ اسے ہلانا جلانا مشکل تھا۔ اسے پہلو کے بل لٹانے کے لیے گڑھے کو مزید کئی انچ گہرا کرنا پڑتا جو ہم تینوں کے بس سے باہر تھا۔ میں نے اسی حالت میں گیری کے چہرے پر ویرا کا اسکارف ڈالا اور اس پر مٹی گرانی شروع کردی۔

مٹی ڈالتے ہوئے ہم محتاط تھے کہ ہمارے چہرے اور کپڑے زیادہ گرد آلود نہ ہوں۔ ساری مٹی پھیلانے کی کوشش میں اس مقام پر ایک نمایاں ابھار پیدا ہو چکا تھا۔ اس وقت ویرا نہ جانے کس رو میں تھی کہ اس نے پجیرو کے ٹائروں سے اس مقام کو ہموار کرنے کا مشورہ پیش کردیا۔ اس بربریت کے لیے کوئی آمادہ نہ ہوا۔ ہر ایک کی بس اتنی سی خواہش تھی کہ جنگلی درندے دو تین روز تک اس نرم زمین کو ادھیڑ کر گیری کی لاش باہر نہ کھینچیں۔

گاڑی میں موجود کولر کے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھونے میں غزالہ نے ہماری مدد کی۔ وہاں سے تازہ دم ہوکر ہم گاڑی میں سوار ہوئے تو ویرا نے واپسی کے راستے کا مسئلہ کھڑا کردیا۔ لاش کی جبری تدفین کے کام میں الجھ کر کسی کو ہوش نہیں رہا تھا کہ ہم کدھر سے آئے تھے۔

اس مرحلے پر غزالہ نے گاڑی سے اتر کر ٹائروں کے نشانات دیکھے اور ان کے سہارے ہمارا قافلہ سڑک کی طرف روانہ ہوگیا۔ چند منٹ میں ہم دوبارہ سڑک پر محوِ سفر تھے۔

راستے میں چھوٹی موٹی آبادیاں آتی اور گزرتی رہیں۔ ہر جگہ خواب ناک سناٹا نظر آیا۔ راستے میں کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں رک کر ستایا جاسکے۔ کچے پکے مکانات' جھونپڑیوں اور ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اصل تھائی لینڈ وہی ہے۔ بنکاک اور دوسرے مشہور تفریحی مقامات کا سجا سجایا چہرہ سیاحوں کی دل بستگی کے لیے تیار کیا گیا تھا' جس کی اس ملک کی حقیقی معاشرت اور معیشت سے دور کی بھی نسبت نہیں تھی۔ یہ اور بات تھی کہ ان تفریحی مقامات کے لیے زندہ خام مال ان قریبی آبادیوں سے ہی فراہم کیا جاتا تھا۔

بسکٹوں کے پیکٹ کھول کر تھرموس سے گرم گرم چائے پیتے ہوئے ہم سب کے دلوں سے چاؤفان کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں جس نے اس اکتا دینے والے سفر کے لیے ہماری ہر ضرورت کا پورا پورا خیال رکھا تھا۔

چائے نوشی کے بعد میں نے سگریٹ سلگالی۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ ہمارے ساتھ شامل ہونے کے بعد ویرا نے ایک بار بھی سگریٹ نہیں سلگائی تھی جبکہ اپنی عادت کے مطابق اسے اتنی دیر میں چار پانچ سگریٹیں پھونک دینی چاہیے تھیں۔ مجھے علم تھا کہ سلطان شاہ کو سگریٹ پیتی ہوئی عورتیں زہر لگتی تھیں۔ وہ انہیں مرد مار بلکہ مرد خور تصور کرتا تھا۔ مجھے

ہورہا تھا کہ اس کی سخت ناپسندیدگی کی وجہ سے شاید ویرا نے اپنی وہ عادت ترک کردی تھی۔ وہ مسئلہ اتنا نازک تھا کہ اسے مذاق کا ہدف نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ میں شدید خواہش ہونے کے باوجود اس بارے میں ویرا سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کرسکا۔

سفر کی ابتدا سے ہی میرا ذہن مسائل میں الجھا رہا۔ سکون میسر آیا تو مجھے یاد آیا کہ ویرا مسلمان ہوچکی تھی اور اس نے مجھے اپنا سرپرست تسلیم کرلیا تھا۔ سلطان شاہ ان تبدیلیوں سے بے خبر تھا۔ ویرا کی موجودگی میں سلطان شاہ سے اس بارے میں بات کرنا مناسب نہیں تھی۔ وہ کوئی تلخ بات کہہ جاتا تو بات بگڑ سکتی تھی۔ بہتر یہی تھا کہ ویرا کی طرح اس سے بھی علیحدگی میں بات کی جاتی۔ اس کے لیے ہمارا سفر ختم ہونے کا انتظار ضروری تھا۔

ویرا نے ہمارا سفری نقشہ غزالہ سے لیا تو لوٹانے کے بجائے اس پر قبضہ کرکے بیٹھ گئی۔ وہ وقفے وقفے سے اس کا جائزہ لے کر اعلان کررہی تھی کہ ہمارا سفر صحیح سمت میں جاری تھا۔ ہم جن نشانات یا آبادیوں سے آگے نکل آئے تھے' وہ انہیں نقشے پر کاٹتی جارہی تھی تاکہ ایک نظر میں بقیہ مسافت کا اندازہ ہوسکے۔

نقشے کے مطابق آخری منزل میں ہمیں مشرق کی طرف بڑھتے چلے جانا تھا۔ رفتہ رفتہ سامنے پوپھٹنے کے آثار نظر آنے لگے۔ صبح ہونے والی تھی اور ہم بہ دستور تھائی لینڈ کی حدود میں تھے۔ اس وقت ویرا کو اچانک موبائل فون کا خیال آیا۔ میں نے بٹن دبا کر اس کی اسکرین روشن کی تو سگنل کا اشارہ غائب تھا۔

بنکاک میں دنیا کی ہر سہولت اور آسایش میسر تھی لیکن تھائی لینڈ کا وہ دور افتادہ سرحدی علاقہ اس وقت بھی موبائل فون جیسی سہولت سے محروم تھا۔ اس وقت ڈان یا چاؤفان کا نمبر ملانے کی کوشش خطرناک ثابت ہوسکتی تھی' لے دے کر طارق ہی ایسا شخص تھا جس کی نیند میں خلل ڈال کر ذرا سی معذرت کرلی جاتی تو کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوتا۔

میں نے طارق کا نمبر ملایا لیکن لائن پر سکوت چھایا رہا۔ وہاں آنے کے بعد ہمارا مقامی موبائل فون ناکارہ ہوچکا تھا۔ اوّل خان کے دیے ہوئے فون کے بارے میں مجھے امید تھی کہ تھائی لینڈ کے لیے رومنگ موجود ہونے کی وجہ سے وہ شاید کمبوڈیا میں بھی کارآمد رہے۔

سات بجے سورج کی تیز روشنی میں ہم ساکیو نامی آخری قصبے کے قریب سے گزرے تو اندازہ ہوا کہ ہم گیری کی لاش کو ٹھکانے لگانے کی افتاد میں مبتلا نہ ہوئے ہوتے تو ہمارا سفر سورج نکلنے سے پہلے ختم ہوجاتا۔

کچھ دیر بعد ہمیں لکڑی کے ٹیڑھے میڑھے کھمبوں سے لگی ہوئی خاردار تاروں کی باڑ نظر آنے لگی جہاں تھائی لینڈ کی سرحد ختم ہورہی تھی۔ اس باڑ کے درمیان ایک رسمی سی عارضی رکاوٹ موجود تھی۔ اس سرحدی شان وشوکت کا دور دور تک کوئی شائبہ نہیں تھا جو واہگہ پر سرحد کے دونوں طرف نظر آتی ہے۔

سرحدی باڑ سے کچھ پہلے ٹین کی چھت والا ایک پختہ کمرا بنا ہوا تھا جس پر تھائی زبان میں لکھا ہوا ایک بورڈ آویزاں تھا۔ دور سے وہاں کوئی متنفس نظر نہیں آرہا تھا۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ڈھیلی ڈھالی وردی میں ملبوس ایک مدقوق سا آدمی باہر نکل آیا۔

غزالہ نے اسے دیکھتے ہی سو سو ڈالر کے چند نوٹ مجھے تھمادیے۔

صورت سے نظر آرہا تھا کہ سرحدی ویرا نے میں دنیا سے کٹ کر ڈیوٹی سرانجام دینے والا وہ شخص اپنی زندگی سے بے زار تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ میں اس سے پہلے رفتار کم کرچکا تھا۔

اس کے پاس گاڑی روک کر میں نے ادب سے اپنے سر کو ذرا سا خم دیا اور تین نوٹ مٹھی میں دبا کر اس کی طرف بڑھادیے۔ اس نے نوٹوں کی مالیت پر ایک نظر ڈالی اور گننے کی زحمت کیے بغیر انہیں اپنی جیب میں اڑس لیا۔ ہمارے چہروں سے اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ تھائی زبان میں کہا جانے والا ہر کلام نرم ونازک ہم پر بے اثر رہے گا۔ وہ زبان ہلائے بغیر مست خرامی سے رکاوٹ کی طرف چل دیا۔ میں گاڑی روکے اس کی ہدایت کا انتظار کرتا رہا۔

اس نے رسی سے بندھا ہوا بانس کا سرا کھولا تو وہ دوسرے سرے پر بندھے ہوئے بھاری پتھر کے بوجھ سے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ بانس کو دوبارہ نیچے لانے کے لیے اس نے رسی کا سرا اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ گاڑی کے انجن کی آواز کے باوجود اس نام نہاد امیگریشن چیک پوسٹ سے کوئی اور شخص باہر نہیں آیا تھا۔ یوں معلوم ہورہا تھا جیسے تھائی لینڈ کے حکمرانوں نے اس اکلوتے شخص کو جملہ اختیارات سونپے ہوئے تھے۔

اس نے اشارہ کیا اور اگلے لمحے میں ہم تھائی لینڈ کی سرزمین کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ تین سو ڈالر میں وہ سودا برا نہیں تھا۔

مجھے خیال تھا کہ رکاوٹ سے گزر کر ہم اس غیر جانب دار سرحدی پٹی سے گزریں گے جس پر دونوں میں سے کسی ملک کا دعویٰ نہیں ہوتا۔

جب آگے بنے ہوئے زیادہ خستہ حال کمرے کی اوٹ سے ایک شخص کچھ چباتا ہوا نمودار ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ وہاں نومینز لینڈ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ رسی سے بندھے ہوئے بانس نے اس خطۂ زمین کو دو الگ الگ ملکوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔

میں نے اس کے قریب گاڑی روکی تو اس نے کھڑکی سے ہاتھ اندر ڈال کر پھرتی سے انجن بند کیا اور چابی اپنی تحویل میں لے لی۔ میں نے پچھلے تجربے کے مطابق سو ڈالر کے تین نوٹ اس کی طرف بڑھائے تو اس نے اپنے منہ میں موجود خوراک کو نگلتے ہوئے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ میں بے بسی سے سر ہلا کر رہ گیا۔ میرا ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہوا تھا لیکن اس نے نوٹوں کو ہاتھ لگانا گوارا نہیں کیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور دماغ پر یہ وحشت سوار ہو گئی کہ شاید ہمارا واسطہ کسی ایمان دار کمبوڈین اہلکار سے پڑ گیا تھا۔

وہ کوشش کے باوجود اپنا دہانہ پوری طرح خالی کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میری بے چارگی کا اندازہ کرتے ہوئے اس نے ہاؤ مچ کہا تو میری جان میں جان آئی۔

میں نے اسے تین سو ڈالر بتائے تو اس کا منہ بن گیا۔ انگریزی کے معاملے میں وہ بے چارہ بالکل یتیم تھا۔ اسے لین دین میں استعمال ہونے والے گنے چنے الفاظ اور گنتی کے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں جملہ الفاظ اور متعدد ہندسوں کو یک جا کر کے تقریر کرنے کے انداز میں ایک مختصر سی تقریر کر ڈالی جس کا کوئی مفہوم میرے پلے نہیں پڑ سکا۔

میں اس سے اپنی کم علمی بلکہ جہالت کا اعتراف کرنے والا تھا کہ پیچھے سے ویرا بول پڑی۔ اس نے جلدی جلدی بتایا کہ وہ ایک ہزار ڈالر فی کس کے حساب سے مبلغ چار ہزار ڈالر کا طلب گار تھا۔ ویرا کا مشورہ تھا کہ میں مطلوبہ رقم دے کر اس کا منہ کالا کروں۔ ڈالر کم ہوں تو اس سے لے لوں۔ وہ مول تول سے چڑ کر قانونی موشگافیوں پر اتر آیا تو ہم لبِ سرحد ہی درگور ہو جائیں گے۔

چاؤ فان نے مجھے کمبوڈیا میں داخلے کی رشوت کی شرح سو ڈالر فی کس بتائی تھی۔ وہ شاید دونوں طرف کے مقامیوں کے لیے رعایتی شرح تھی۔ ہم چاروں واضح طور پر بیرونی مخلوق نظر آ رہے تھے۔ دکان دار سے سرکاری اہلکار تک باہر سے آنے والوں کی کھال ادھیڑنا اور اپنا حق طلب کرنا اپنا اخلاقی اور قومی فرض تصور کرتے ہوں گے۔ ہمارے لیے وہ شرح یکایک دس گنا بڑھا دی گئی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم کسی خستہ حال گاڑی کے بجائے شاندار پجیرو میں سفر کر رہے تھے۔

ویرا نے مشورہ دینے پر اکتفا نہ کرتے ہوئے ڈالر گننا شروع کر دیے تھے۔ کمبوڈین اہلکار کی حریصانہ نظریں میرے چہرے سے ہٹ کر ویرا کے ڈالروں پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

اس نے گنتی کرنے کے بعد نوٹ میری طرف بڑھائے۔ وہ پچھلی سیٹ پر تھی۔ میرے متوجہ ہونے سے پہلے کمبوڈین نے وہ گڈی جھپٹ لی۔ ساتھ ہی اس نے میری چٹکی سے تین سو ڈالر بھی اچک لیے اور چابی میرے حوالے کر کے ہمیں اپنے ملک کے طول و عرض میں گھومنے پھرنے کی اجازت عطا کر دی۔

تھائی اہل کار کی طرح اس نے بھی نوٹ گنے بغیر اپنی جیب میں رکھ لیے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ تاروں کی ایک معمولی باڑ کے آر پار نرخوں میں ایسا زمین آسمان کا فرق تھا۔ ترقی یافتہ شہروں کے مقابلے میں دور دراز اور پس ماندہ سرحدی علاقوں کے وہ طور طریقے میرے لیے حیران کن تھے۔

''تیزی سے نکل چلو۔'' ویرا نے میری پشت پر ٹھوکا دیتے ہوئے کہا ''میں نے اس مردود کو صرف ہزار ڈالر دیے ہیں۔ اس نے گن لیے تو تمہیں روک لے گا۔''

میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

سرحد پار کرنے کے چکر میں ہم مجموعی طور پر ایک ہزار چھ سو ڈالر کے خسارے سے دوچار ہو چکے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک بڑی رقم تھی۔ ہم حالات کے چنگل میں اس بری طرح پھنسے ہوئے تھے کہ وہ اس سے زیادہ رقم کا مطالبہ کرتا تو ہم وہ بھی ادا کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

یہ بڑی بات تھی کہ اس رشوت کے عوض ہم سے ہمارے کاغذات کے بارے میں کوئی سوال کیا گیا تھا نہ مسروقہ گاڑی کی ملکیت کا ثبوت طلب کیا گیا۔ ہم اپنے ساتھ چوری کی ایک بیش قیمت گاڑی کمبوڈیا میں لے آئے تھے جسے سرحدی چور بازار میں بیچ کر ہم آسانی سے اپنا نقصان پورا کر سکتے تھے۔

انسانیت کے دشمنوں کے خلاف جاری اس جنگ کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

انتظارِ قیامت کا

ش صغیر ادیب

جب حصار مضبوط ہو، بلند و بالا فصیلیں ہوں اور نگہداری کا نظام بھی بہترین انداز میں کام کر رہا ہو تو بیرونی مداخلت کا خدشہ نہایت خفیف رہ جاتا ہے۔ ایسے میں اگر نقب زن سیندھ لگائے تو اسے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملتا تاہم اگر اندر والے ہی بد دیانتی پر اور بے ایمانی پر اتر آئیں و پھر بیرونی بلند و بالا فصیلیں اور مضبوط دیواریں بھی تباہی کو روک نہیں سکتیں۔ اور جب فساد اندرونی ہو تو اسے ختم کرنے کا فریضہ بھی اندر والوں کو ہی انجام دینا ہوتا ہے۔ ایثار و قربانی کے بے مثل و لازوال جذبوں کی یہ خوب صورت داستان سات سمندر پار سے ش صغیر ادیب نے سسپنس کے قارئین کے لیے خصوصی طور پر تحریر کی ہے۔

ایک ایسے فیصلے کی کہانی جو قیامت کے انتظار کا نقطۂ آغاز تھا

شام کا بھیگا بھیگا سرمئی، ریشمی دھند لکا شالیمار کے درد دیوار پر آہستہ آہستہ اتر رہا ہے۔ آسمان پر مغربی کنارے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی سرخی رفتہ رفتہ ماند پڑ رہی ہے۔ کچھ دیر میں یہ سرخی اور اجالے کی لکیر غائب ہو جائے گی اور آسمان کا مغربی کنارہ بھی تاریکی میں ڈوب جائے گا۔ شالیمار کے عقبی باغیچے میں کھڑے درخت مدھم ہوا میں آہستہ آہستہ جھوم رہے ہیں۔ ہوا اتنی نرم اور سبک ہے کہ لگتا ہے، کوئی حسینہ آہستہ آہستہ انگڑائی لے رہی ہے۔ سامنے والی دیوار پر ابھی ابھی بلبلوں کا ایک جوڑا آ کر بیٹھا ہے۔ ایک بلبل نے اونچے سر میں ایک مدھم لے کا الاپ کیا ہے اور اس الاپ کی ریشمی گونج فضا میں تیرتی چلی گئی ہے۔ اندر لاؤنج میں دو ایک بتیاں جلا دی گئی ہیں اور لاؤنج میں موجود مسکراتے چہروں کی جگمگاہٹ میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ میں گردن گھما کر دریچے سے اندر نظر ڈالتا ہوں اور ان روشن اور پُرمسرت چہروں کو دیکھتا ہوں تو دل میں ایک کسک سی اٹھتی محسوس کرتا ہوں۔

کوئی اور وقت ہوتا تو اس شام کا حسن اور رعنائی مجھے بھی خوشی سے سرشار کرتی۔ دل میں امنگوں کو جگاتی اور..... اور شاید مجھے شعر کہنے پر اکساتی کیونکہ یہ ایسی ہی شام ہے جب آدمی دل میں گہری نشاط انگیز سرخوشی اور طرب ناکی محسوس کرتا ہے۔ اس کے من میں ایک روح پرور اور سرور آمیز ہالیدگی آہستہ آہستہ سرایت کرتی ہے۔ اسے دنیا بے حد خوبصورت نظر آتی ہے اور اس کا دل چاہتا ہے کہ محبوب سے..... اپنے محبوب سے رات کی رانی کے سائے میں بیٹھ کر باتیں کرے اور اسے اپنے وہ شعر سنائے جو اس نے اپنے محبوب کی چاہت میں کہے ہیں اور جن میں اس نے اپنے محبوب کے اپسرائی حسن کا ذکر کیا ہے۔ وہ حسن جو دنیا میں لامثال ہے اور اپنے محبوب کو بتائے کہ اس جیسا اس کائنات میں اور کوئی نہیں ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس شام کا طرب ناک حسن میرے دل میں کوئی امنگ پیدا نہیں کرتا۔ مجھے شعر کہنے پر نہیں اکساتا۔ شام کا یہ اندھیرا جو در و دیوار پر اتر رہا ہے۔ میرے اندر، دل کے نہاں خانوں میں بھی دور تک پھیلتا چلا جا رہا ہے اور میری اداسی کو دوچند کر رہا ہے۔ اس سے میرے من میں صرف اداسی ہے اور شکستِ دل کا درد اور انتظار اور کچھ بھی نہیں۔ میں شالیمار کے عقبی دراندے میں تنہا بیٹھا ہوں۔ رمضان نے میری پسندیدہ کافی کا ایک کپ مجھے دے دیا ہے۔ میں کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا ہوں اور

دریچے سے اندر لاؤنج میں جھانکتے چہروں کو دیکھتا ہوں۔ میرے دل میں بار بار کسک اٹھتی ہے۔ کوئی شے ہولے سے ٹوٹتی ہے لیکن پھر بھی میں باوجود خواہش کے اندر جانے کی جرأت نہیں کر پاتا ہوں حالانکہ مسز جمیل نے کہا بھی تھا۔

''ارے عالم، یہاں اکیلے بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ اندر آؤ، ترائین اپنی نئی غزل سنا رہی ہے۔ سنو تو ظالم نے کیسے پیارے پیارے شعر نکالے ہیں۔'' مگر میں مسکرا کر ٹال گیا۔ ''ابھی آتا ہوں۔'' میں نے خود کو مسز جمیل اور بیگم قادری کے سامنے ان سے باتیں کرتے ہوئے بہت پُرسکون ظاہر کیا تھا۔ ایک کامیاب اداکار کی طرح چہرے پر تصنع کا پُرفریب نقاب چڑھا لیا تھا کیونکہ میرے لیے یہی بہتر ہے۔ میرا دکھ میرا اپنا ہے اور میں جانتا ہوں کہ کوئی بھی میرا دکھ بانٹ نہیں سکتا۔ اس آگ میں مجھے خود ہی جلنا ہے جو میرے اندر جل رہی ہے اور جسے میں نے خود ہی لگایا ہے۔ یہ سارے لوگ، خوش باش اور بشاش لوگ ہیں جو اس وقت اندر لاؤنج میں موجود ہیں۔ بالکل نہیں جانتے کہ میں نے پچھلے تین ماہ کہاں اور کیسے گزارے ہیں؟ کلب کیوں نہیں آیا؟ اور اب آیا ہوں تو دل میں کتنے طوفان لیے ہوئے، کتنے زخم چھپائے ہوئے اور باہر ورانڈے میں تنہا کیوں بیٹھا ہوں۔ یہ بات تو صرف میں جانتا ہوں کہ یہاں میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس ظالم لمحے کا انتظار کر رہا ہوں جب میں اپنی پہلی اور آخری تمنا کا سامنا کروں گا۔ وہ تمنا جس کے سہارے میں جیتا تھا اور جسے میں آج خود ہی قتل کرنے والا ہوں۔

کلب میں اس وقت بھی لوگ موجود ہیں۔ میرے کرم فرما، میرے عزیز ترین دوست جن کے درمیان میں نے زندگی کے بہترین لمحات گزارے ہیں۔ جن سے میں نے جینے، خوش رہنے اور زندگی میں آگے بڑھنے کا ہنر سیکھا ہے۔ جن کی رفاقت اور محبت میری رگوں میں خون بن کر دوڑتی ہے۔ مسز جمیل ہیں جو ہمیشہ مجھے خوش رہنے کی دعا دیتی ہیں اور پھر بیگم عابدہ ہیں جو ہمیشہ مجھ سے کہتی ہیں۔ ''زندگی میں کچھ ایسا کرو جو اچھا ہو، منفرد ہو اور کسی نے نہ کیا ہو اور نہ کوئی کر سکے۔'' اور پھر میرے دوست ہیں۔ علیم، آصف، شاہد اور ربانی وغیرہ۔ میں دریچے سے ایک بار پھر اندر نظر ڈالتا ہوں۔ مسز جمیل، بیگم عابدہ وغیرہ اپنی مخصوص میز پر ہیں اور گو میں سن نہیں سکتا لیکن جانتا ہوں کہ گفتگو حسبِ معمول ادب پر ہو رہی ہوگی۔ مجاز، فیض اور کیٹس وغیرہ۔ صوفیہ، ناہید اور ان کی سہیلیاں لاؤنج سے ملحق میوزک روم میں ہیں جہاں انہوں نے حسبِ عادت دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ اردو اور انگریزی کے ریکارڈ ایک کے بعد ایک بجائے جا رہے ہیں۔ آواز اتنی اونچی ہے کہ برآمدے تک آ رہی ہے۔ ابھی ابھی ایک پرانا انگریزی گیت ختم ہوا ہے مگر اس کی گونج بدستور میرے کانوں میں موجود ہے۔

''اٹس اے بے بی لاسٹ ٹائم۔''

ہاں شاید یہ آخری وقت ہے۔ آخری شام ہے۔ یہ شام گزرے گی۔ رات بیتے گی اور صبح کا سورج طلوع ہوگا تو سب کچھ بدل چکا ہوگا۔ میری زندگی ایک نئی ڈگر پر چلے گی۔ شالیمار کے در و دیوار شاید پھر مجھے نہیں دیکھیں گے۔ مچھڑنے کی اذیت سے میں واقف ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت اس برآمدے میں تنہا بیٹھا ہوں تاکہ اس اذیت کو جس کا سامنا میں کرنے والا ہوں، کسی پر ظاہر نہ ہونے دوں۔ سارا درد چپکے چپکے، اندر ہی اندر خود ہی پی جاؤں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس وقت میں بھی کھیل کے کمرے میں ہوتا اور آصف، اجمل اور ربانی وغیرہ کے ساتھ رمی کی بازی جماتا اور ربانی سے وہ سات روپے اور پچپن پیسے واپس حاصل کرنے کی کوشش کرتا جو تین ماہ پہلے میں اس سے ہارا تھا مگر میں جان بوجھ کر اس کمرے میں نہیں گیا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ ہار سے ڈرتا ہوں۔ زندگی کی جوبازی میں خود جان کر ہار رہا ہوں، اس کے سامنے رمی کی ہار کیا معنی رکھتی ہے۔ میں صرف اس لیے وہاں نہیں گیا ہوں کیونکہ ابھی کچھ دیر بعد میں زندگی کی آخری بازی ہار دوں گا اور یہ بازی میں سب کے سامنے نہیں بالکل تنہائی میں ہارنا چاہتا ہوں۔ اپنی شکست کی نمائش بھلا کسے اچھی لگتی ہے۔

آج مجھے وہ انمول اور ناقابلِ فراموش لمحہ بار بار یاد آ رہا ہے جب بیگم قادری نے پہلی بار اپنی .... مخصوص مہربان آواز کے ساتھ اس سے میرا تعارف کرایا تھا۔

''عالم ان سے ملو۔ یہ برجیس ہیں۔ برجیس قیصر.....''

یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے۔

☆.....☆

لمحات انسان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لمحے دکھ کے ہوں یا سکھ کے، کامیابی کے ہوں یا ناکامی کے، ہمارے لیے ناگزیر ہوتے ہیں۔ لمحے ہماری زندگی کے تغیر و تبدل کی بنیاد ہوتے ہیں۔ کبھی ایک لمحہ آتا ہے اور ہماری زندگیوں کو روشنی سے بھر دیتا ہے اور کبھی ایک لمحہ آتا ہے، جس کے دامن میں ہمارے لیے اندھیرے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ میری زندگی میں بھی ایسے ہی دو غیر معمولی لمحے آئے، جنہوں نے میری زندگی کا دھارا بدل دیا لیکن پہلے میں اس لمحے کی

بات کروں گا جو برجیس سے منسوب ہے۔ وہ خواب جیسا لمحہ کوئی ایک سال پہلے آیا تھا جب میں برجیس سے متعارف ہوا تھا۔ وہ بھی ایسی ہی ایک شام تھی۔ سانولی سلونی، ریشمی مدہوشی سے سرشار ایسی شام جب آدمی کا دل چاہتا ہے کہ شعر کہے لیکن میں شعر نہیں کہہ رہا تھا بلکہ کھیلوں کے کمرے میں رمی کھیلنے میں مصروف تھا اور سخت جھلایا ہوا تھا۔ جھلاہٹ اور غصے کا سبب یہ تھا کہ ایک گھنٹے کے کھیل میں' میں پورے چھ روپے اور تراسی پیسے ہار گیا تھا۔ یہ رقم معمولی نہیں تھی۔ میری جیب کا وزن نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اس سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ربانی میرا صدیوں پرانا دشمن ہے۔ صدیوں پہلے بھی اس نے مجھ سے بار بار بدلہ لیا تھا اور اب بھی شالیمار کے گیمز روم میں بیٹھ کر مجھ سے انتقام لے رہا تھا کیونکہ وہ ہی کم بخت بار بار جیت رہا تھا اور میں من ہی من میں اس کا خون پی جانے یا اس کی گردن مار دینے کے امکان کا جائزہ لے رہا تھا لیکن ہائے بدنصیبی، وائے بدقسمتی کہ دونوں ہی صورتیں قابلِ عمل نظر نہیں آتی تھیں۔

اور یہ اسی لمحے کی بات ہے کہ میری نگاہ کھلے دروازے سے لاؤنج میں گئی اور وہیں منجمد ہو کر رہ گئی۔ وہاں مسز جمیل، بیگم عابدہ اور فہمیدہ کے ساتھ ایک نیا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔

ارے یہ کون ہے؟

کہیں یہ چودھویں کا تابناک چاند تو نہیں جو آج شام چپکے سے دھرتی پر اتر کر شالیمار میں آ گیا ہے یا پھر یہ دھنک کے رنگ ہیں جنہوں نے سمٹ کر انسانی پیکر اختیار کر لیا ہے نہیں، یہ تو کوئی اپسرا معلوم ہوتی ہے جو چہل قدمی کرتی ہوئی یہاں آ گئی ہے۔ نہیں..... نہیں..... یہ تو عمر خیام کی رباعی ہے یا پھر غالب کا شعر ہے جو انسانی پیکر میں ڈھل گیا ہے۔ غالب کے شعر کی ساری رعنائی اور لطافت اس کے سراپے میں یکجا ہو گئی تھی۔ میں نے اتنا حسین، اتنا روشن اور ایسا بے مثال چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور شاید یہی سبب ہے کہ میری نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہیں کی وہیں ٹھہر کر رہ گئی۔

دفعتاً ربانی نے کہا۔ ''ارے میاں، کہاں غائب ہو گئے۔ چال چلو، تم بازی ہار رہے ہو۔''

میں زور سے چونکا۔ ''یار، میں تو بازی ہار بھی گیا۔'' میرے لبوں سے مدھم آواز میں نکلا۔

''کیا؟''

''کچھ نہیں۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر پتے کھول کر میز پھیلا دیے اور پتوں کی بازی بھی ہار گیا۔

کچھ دیر بعد وہ مسز جمیل کے ساتھ کھیلوں کے کمرے میں آئی۔ چھوٹے چھوٹے قدم شاہانہ انداز میں اٹھاتی ہوئی ہونٹوں پر ایک نفیس مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایک ایسی چمک جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ اپنی شخصیت کے باکپن سے پوری طرح واقف ہے۔ مسز جمیل نے اس کا تعارف ربانی وغیرہ سے کرایا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئیں۔

''عالم! ان سے ملو۔ یہ برجیس ہیں۔ برجیس قیصر.....''

نگاہیں ملیں۔ میں ہونٹوں کی طرح مسکرایا اور کچھ رسمی الفاظ کہے۔ جواب میں برجیس نے بھی کچھ کہا لیکن میں الفاظ نہیں سمجھ سکا۔ بس یوں لگا جیسے چاندی کی گھنٹی کی مدھر آواز کانوں میں رس گھولتی چلی گئی ہے۔ پھر میں نے کچھ کہا جسے سن کر برجیس خوش دلی سے ہنسی۔ اس کے موتیوں جیسے دانت ستاروں کے مانند دمکے اور ایک بار پھر اس کی آواز نے کانوں میں رس گھولا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

بعد ازاں شاید دوسرے یا تیسرے دن' برجیس کے بارے میں چند اور باتیں معلوم ہوئیں۔ مسز جمیل نے بتایا۔ ''برجیس کے ابا محکمۂ جنگلات میں افسر تھے۔ ساری عمر جنگلوں میں گزری۔''

''جنگلوں میں؟'' میں نے ذرا حیرت سے کہا۔ ''مگر برجیس تو بہت مہذب اور شائستہ ہیں۔ جنگلی تو کہیں سے بھی نظر نہیں آتیں۔''

''سنو تو!'' مسز جمیل نے سنی اَن سنی کر کے کہا۔ ''برجیس کے ابا قیصر علی صاحب کی عمر کا بڑا حصہ جنگلوں میں گزرا۔ ایک کے بعد دوسرا تبادلہ اور دوسرے کے بعد تیسرا لیکن شہر سے کبھی رابطہ نہیں ٹوٹا۔ ان کی مستقل رہائش اسی شہر میں رہی۔ اب وہ ریٹائر ہو گئے ہیں اور واپس اپنے گھر آ گئے ہیں۔''

''تو گویا اب وہ یہیں رہیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، یہاں وہ کسی قسم کا کاروبار شروع کرنے والے ہیں۔''

میں نے دل ہی دل میں اطمینان کی سانس لی۔

میں کیا تھا اور میری زندگی کیا تھی۔ صبح کا ہونا، شام کا آنا میرے لیے ایک بے معنی معمول تھا۔ لاابالی پن' بے پروائی اور بے فکری سے میرے روز و شب عبارت تھے۔ بڑی بے ترتیب زندگی تھی میری۔ کرائسٹ چرچ کالج میں میرا آخری سال تھا اور میں بڑی باقاعدگی اور پابندی سے کالج جایا کرتا

تھا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے تعلیم سے دلچسپی تھی بلکہ اس بنا پر کہ میں کلاس میں بیٹھ کر اپنی پروفیسر عطیہ احمد کی صورت کو تکا کرتا تھا۔ کتابوں سے زیادہ مجھے بیگم عطیہ احمد کے چہرے سے دلچسپی تھی۔ ان کا خوبصورت، پُرتمکنت چہرہ جس پر ہمیشہ ایک عجیب سی شفقت کا پرتو موجود رہتا تھا اور ان کی بڑی بڑی روشن آنکھیں جن سے حد درجہ ذہانت کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی اور یقین کا عکس بھی چھلکتا محسوس ہوتا تھا اور پھر ان کی آوازِ نرم، میٹھی اور مہربان آواز جسے سن کر میں اپنے سارے دکھ بھول جایا کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بیگم عطیہ احمد میرے لیے ایک آدرش کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جس طرح ایک شفیق اور ذہین ماں اپنے بچے کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے بالکل اسی طرح وہ میرے احساسات و خیالات پر چھا گئی تھیں۔ اس حد تک کہ لاشعوری طور پر میں اُن گنت کام ان کی پسند کے مطابق کرنے لگا تھا۔ انہیں سفید رنگ پسند تھا چنانچہ میرے زیادہ تر کپڑے بھی سفید ہی ہوا کرتے تھے۔ وہ لکھنے کے لیے ہمیشہ نیلا پیڈ استعمال کرتی تھیں۔ میں نے بھی نیلے کاغذ کو اپنا دوست بنالیا۔ ایک بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ ان کے ڈرائنگ روم میں مغل آرٹ کی تین تصویریں لگی ہیں۔ اب اگرچہ آرٹ کی الف بے کا شعور بھی مجھے نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں نے بہ ہزار کوشش مغل آرٹ کی ایک تصویر حاصل کی اور اپنے کمرے میں آویزاں کرلی۔

لیکن میں بیگم عطیہ احمد کی شخصیت سے اتنا متاثر کیوں تھا؟ میرے دل میں کیا تھا؟ کیا صرف احترام تھا اور عزت اور یا پھر اس میں چاہت کا کچھ عنصر بھی تھا۔ ہاں شاید یہ ٹھیک ہے کہ میرے دل میں ان کے لیے محبت بھی تھی۔ میں نے اپنے دل کو مزید کریدا۔ اپنے جذبات کو مزید سمجھنے کی کوشش کی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں انہیں چاہتا ہوں مگر اس چاہت میں انہیں پانے کا کوئی خیال، کوئی آرزو کارفرما نہیں ہے بلکہ میرے دل کے کسی گوشے میں کہیں یہ جذبہ موجزن ہے کہ ان جیسی ہی کسی ہستی کو اپنے جیون ساتھی کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسا ہو جو شخصیت اور سراپے کے ساتھ ساتھ مزاج اور کردار کے لحاظ سے بھی ان سے بالکل مماثل ہو لیکن کیا کہیں کوئی ایسی ہستی ہے جس میں ان کی شخصیت کا ہر روپ موجود ہو؟ یہ خیال بڑا دہشت ناک تھا..... ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے..... ہاں، تجھ سا کہیں جسے..... اور اگر ایسا کوئی نہ ملا جسے میں ان جیسا کہہ سکوں تو پھر کیا ہوگا۔ ساری زندگی ایک ملال، ایک پچھتاوا میرے دل میں جاگزیں رہے گا۔

لیکن جب برجیس سے پہلی ملاقات ہوئی تو میرے دل میں فوراً بیگم عطیہ احمد کا خیال آیا اور ساتھ ہی ایک گہری، ناقابلِ بیان تسکین بھی کہ برجیس بلاشبہ ایسی ہے کہ اسے میں ''ان'' جیسا کہہ سکتا ہوں لیکن یہ احساس ایک اور خوف بھی اپنے دامن میں ساتھ لایا۔ بیگم عطیہ احمد تو میری پہنچ سے بہت دور ہیں۔ کیا میں برجیس کے قریب پہنچ سکتا ہوں؟

ان دنوں شالیمار کلب میں میری آمد و رفت کچھ زیادہ نہیں ہوتی تھی مگر برجیس سے ملاقات کے بعد میں نے قریب قریب ہر روز حاضری دینا اپنا فرض بنالیا۔ اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ بس یوں ہوتا کہ شام ہوتے ہی میرے قدم خود بخود شالیمار کی طرف اٹھنے لگتے اور پھر وہاں پہنچتے ہی میری نگاہیں برجیس کو تلاش کرنے لگتیں۔ جب تک وہ نظر نہ آتی، مجھ پر ایک وحشت اور بے کلی طاری رہتی اور جب دکھائی دیتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے ساری دنیا کی دولت ہاتھ آگئی ہے۔

برجیس ہر دوسرے تیسرے دن ضرور آتی تھی۔ ہمیشہ شہزادیوں کی سی شان سے، باوقار، پُرتمکنت اور پُراعتماد جیسے جانتی ہو کہ وہ کون ہے اور یہ کہ سارے شہر میں اس جیسا اور کوئی نہیں لیکن خود آگہی کے اس انداز میں گھمنڈ کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں تھا بلکہ ایک شائستگی تھی اور وضع داری۔ شالیمار میں وہ بہت جلد بہت زیادہ مقبول ہوگئی۔ یعنی جو مقام اپنے گمان کے مطابق مجھے حاصل تھا اس پر وہ براجمان ہوگئی۔ ان دنوں مجھے اپنے بارے میں خاصی خوش فہمیاں تھیں۔ اپنی ذہانت، خیالات و نظریات پر میں بہت اترا تا تھا لیکن منکشف ہوا کہ برجیس مجھ سے آگے ہے۔ میں نے مجاز اور کیٹس کو پڑھا تھا جبکہ وہ دنیا کے ادبیاتِ عالیہ پر گہرا عبور رکھتی تھی۔ تاریخ سے اسے گہرا شغف تھا اور میرا یہ حال تھا کہ اکثر اکبر کی تاریخ پیدائش تک بھول جایا کرتا تھا۔ بیت بازی کے مقابلوں میں پانچ دس منٹ کے بعد ہی میری پٹاری خالی ہو جاتی تھی لیکن برجیس کے ہونٹوں سے شعر اس طرح برآمد ہوتے رہتے کہ لگتا گویا اس کے دماغ میں کوئی مشین فٹ ہے جو دھڑ ادھڑ شعر ڈھال رہی ہے۔

تب میں ڈرنے لگا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اپنے دیوانے دل کو سمجھانے کی سعی کی۔ اے عزیز! مت سوچ ایسا، وہ محض ایک خواب ہے جسے صرف دیکھا جاتا ہے لیکن جس کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ چنانچہ اے ہمدم! ترک کردے اس راہ پر چلنے کی ضد کہ یہ راہ بڑی پُرخار ہے۔ یاد کر مجنوں کو جس نے

صحرا کی خاک چھانی اور اپنا آپ گنوایا اور یاد کر فرہاد کو جس نے دودھ کی نہر کھودی کہ اس کے پاس تیشہ تھا جبکہ تو خالی ہاتھ ہے اور یاد کر رانجھا کو جو تھل کے ریگزاروں میں جوگی بن کر بھٹکا۔ تو بھی باز آ اس راہ پر چلنے سے ورنہ رسوا ہوگا اور خوار بھی۔ گلیوں میں بھٹکے گا اور لوگ تجھ پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ دیکھو وہ جا رہا ہے دیوانہ اور کوئی عجب نہیں کہ بچے تجھ پر پتھر پھینکیں اور قہقہے لگائیں لیکن وہ دل ہی کیا جو مان جائے۔ دل تو پھر دل ہے۔ اس کی مملکت میں ہوش و خرد کا گزر نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے قانون ہیں۔ اپنے اصول ہیں۔ وہ کسی کی نہیں سنتا۔ جو کرنا چاہتا ہے، کر گزرتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ساری دنیا کی بادشاہت کو بھی ٹھکرانا پڑے تو پائے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے۔

چنانچہ میرے دل نے شوریدہ سر دل نے میری بھی ایک نہیں سنی۔ اپنی من مانی کر گزرا اور یوں ہوا کہ برجیس ایک خواہش، ایک چاہت بن کر دل میں سماتی چلی گئی۔ دھیرے دھیرے، غیر محسوس طور پر جیسے کسی ناقابل گزر ویرانے میں، کسی دور افتادہ گھاٹی میں اگنے والی گھاس آہستہ آہستہ بڑھتی رہتی ہے اور کسی کو پتا نہیں چلتا۔ ویسے ہی برجیس کی محبت میرے دل میں بڑھتی رہی اور مجھے پوری طرح احساس اس وقت ہوا جب اس کی چاہت کی جڑیں بہت مضبوط ہو چکی تھیں۔

اور تب میں مزید ڈرا۔ ''اگر مجھے برجیس نہ ملی تو کیا ہوگا؟''

کلب کی رونقیں حسبِ معمول عروج پر تھیں۔ یہ شالیمار کلب بھی عجیب جگہ ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ایک چھوٹے سے تعلقے کے نواب صاحب نے اسے قائم کیا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ طبقہ اشرافیہ کے وہ لوگ جو نواب صاحب کے ہم مشرب تھے، شام کو کلب میں مل بیٹھیں اور کچھ وقت خوش فکری میں گزر جائے۔ اب نواب صاحب تو رہے نہیں تھے۔ ان کا تعلقہ بھی ختم ہوا اور وہ خود بھی قصۂ پارینہ ہو گئے مگر کلب اب بھی قائم تھا اور اس کی نجی حیثیت بھی برقرار تھی اور اب بھی وہی لوگ اس کے ممبر تھے جو کسی نہ کسی طور ایک دوسرے سے مراسم رکھتے تھے اور وہ روایت بھی قائم تھی کہ ممبران شام کے وقت شالیمار آتے اور دنیا کے فکرو آرام اور مسائل امروز سے بے نیاز ہو کر کچھ وقت خوش فکری میں گزارتے۔ مزید دلچسپی کے حصول کے لیے کئی طرح کے فنکشن اور مقابلے بھی منعقد کیے جاتے۔ اِن ڈور بھی اور آؤٹ ڈور بھی۔ پکنک سے لے کر فینسی ڈریس اور کرکٹ کے میچ تک سبھی کچھ۔ ان دنوں بھی یہ تقریبات ایک کے بعد ایک منعقد ہو رہی تھیں۔ مسز شیخ جو فینسی ڈریس میں گزشتہ تین سال سے مسلسل چیمپئن چلی آ رہی تھیں، اس بار برجیس سے بری طرح ہاریں۔ مس خورشید انجینئر کو پچھلے پانچ سال میں بیڈمنٹن میں کوئی نہیں ہرا سکا تھا لیکن اس بار برجیس کے سامنے ان کا چراغ بھی نہیں جل سکا اور پھر آیا کرکٹ کا میچ۔

شہر میں دو تین کلب ہیں اور چند ایک کالجوں کی ٹیمیں بھی ہیں جن سے شالیمار کلب کی کرکٹ ٹیم کے میچ ہر سال باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔ ان میچوں میں شالیمار کرکٹ ٹیم کا ریکارڈ بس یونہی سا ہے۔ کبھی کبھار اتفاق سے کوئی مقابلہ جیت لیا تو اگلے کئی ہفتوں تک سارے کھلاڑی یوں (جن میں، میں بھی شامل ہوں) اتراتے پھرتے ہیں گویا عالمی کپ جیت لیا ہو لیکن اس بار صورتِ حال کچھ مختلف رہی۔ حیران کن حد تک مختلف۔ ہم نے پہلا میچ جیتا، پھر دوسرا اور اس کے بعد تیسرا حتیٰ کہ ہم فائنل میں پہنچ گئے۔

فائنل میں ہمارا سامنا ڈی اے وی کالج کی ٹیم سے تھا جو شہر کی سب سے مضبوط اور بہتر ٹیم ہے۔ کھیل شروع ہونے سے کل ہی یہ بات تقریباً طے ہو گئی تھی کہ ہم بری طرح ہاریں گے لیکن پھر بھی کھیلنا تو تھا ہی۔ چنانچہ کھیل کا آغاز ہوا۔ میں آل راؤنڈر ہوں۔ فاسٹ بالر ہوں اور پانچویں نمبر پر بیٹنگ کرتا ہوں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ میری بولنگ دنیا کے کسی بھی فاسٹ بالر سے کم نہیں لیکن افسوس کہ ڈی اے وی کالج کے بیٹس مین مجھ سے متفق نہیں اور وہ مجھے غلط ثابت کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ سابق کی طرح اس بار بھی انہوں نے جم کر میری گیندوں کی پٹائی کی اور صرف چھبیس گیندوں پر اسی رنز بنا ڈالے۔ اننگ کے اختتام پر ان کا مجموعی اسکور دو سو پندرہ رنز رہا۔

پھر ہماری اننگ شروع ہوئی۔

دو سو پندرہ رنز کچھ ایسا بڑا اسکور نہیں۔ ہماری ٹیم بھی اکثر اس سے زیادہ اسکور کر چکی ہے لیکن ڈی اے وی کالج کے خلاف دو سو پندرہ رنز بنانا ہماری ٹیم کے لیے ایسا ہی تھا جیسے آندھی میں چراغ جلانا۔ جی ہاں، ان کے تیز گیند بازوں کی بولنگ ایسی ہی طوفانی ہے۔ گیند کم بخت نظر ہی نہیں آتی اور وکٹ اڑ جاتی ہے۔ ہمارے چار ابتدائی بلے بازوں کا چراغ بھی ان کی تیز گیندوں کے سامنے جل نہیں سکا۔ صرف چھبیس رنز پر چاروں واپس آ گئے۔ رضی نے تو آؤٹ ہونے میں اس قدر عجلت کا مظاہرہ کیا کہ جب وہ واپس آیا تو اس کی چھوٹی ہوئی نصف کپ چائے ابھی گرم ہی تھی۔ اس نے پیالی

اٹھا کر چسکی لی اور خجالت سے میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔
''سوری، اصل میں میرا دھیان چائے کی طرف لگا ہوا تھا۔''
''چائے دوسری بھی بن سکتی تھی۔'' میں نے غصے سے کہا۔
''بے شک!'' اس نے گردن ہلائی۔ ''مگر کھانے پینے کی چیزوں کو فضول میں ضائع کرنا بری بات ہے۔'' اس نے ایک اور چسکی لی۔
''لعنت ہے۔'' میں نے جھلا کر بیٹ اٹھایا۔
میری اننگ کا آغاز بھی کچھ اچھا نہیں ہوا۔ پہلی ہی گیند پر کیچ نکلا لیکن سلپ پر کھڑا ہوا فیلڈر پوری طرح ہوشیار اور مستعد نہیں تھا۔ اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ ممکن ہے شامیانوں کے نیچے براجمان کسی خوبصورت چہرے کو تاک رہا ہو۔ اس غفلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ گیند اس کے ہاتھ میں آتے آتے رہ گئی۔ یوں میں بال بال بچ گیا۔ پھر دوسری گیند آئی جو ایک تیز ترین باؤنسر تھا۔ اگر میں سرعت سے جھکائی نہ دیتا تو یقیناً میرے سر میں سورج ابھر آتا۔ پھر تیسری گیند آئی جو زیادہ سچ یہ ہے کہ مجھے نظر ہی نہیں آئی اور سیدھے وکٹ کیپر کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ چوتھی اور پانچویں گیند کا بھی یہی حشر ہوا۔ اب اوور کی آخری گیند باقی تھی۔ میں نے بالر کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے اس وقت اپنا صدیوں پرانا اور بدترین دشمن نظر آرہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے دو چار نہیں بلکہ دس بیس بدترین گالیاں دینے کا ارادہ کیا مگر پھر ترک کر دیا کہ شائستہ اور مہذب لوگ گالی گلوچ کو معیوب سمجھتے ہیں۔ پھر میں نے بیٹ کریز پر رکھا۔ بالر کی طرف دیکھا۔ دانت پیسے۔ تھری ناٹ تھری کی گولی کے مانند گیند آئی۔ ان سوئنگ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور گیند روکنے کی کوشش کی۔ گیند بیٹ سے ٹکرائی اور مڈ آف پر نکلی۔ یہ شاٹ میں نے قصداً نہیں کھیلی تھی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی علم نہیں تھا کہ کیا ہوا لیکن جب میں نے گیند کو مڈ آف پر جاتے دیکھا تو دماغ کے کسی گوشے سے آواز آئی ''دوڑو'' چنانچہ میں بھاگ کھڑا ہوا اور پھر اس سے پہلے کہ فیلڈر گیند وکٹ کی جانب پھینکتا، میں کریز پر پہنچ گیا۔ ایک رن بن گیا۔ شامیانوں کے نیچے سے ایک دم شور برپا ہوا۔ تالیوں سے سارا گراؤنڈ گونج گیا۔ چوڑیوں بھرے اَن گنت ہاتھ اور کتنے ہی رنگین دوپٹے فضا میں لہرائے۔ چیخ پکار ایسی کہ لگتا تھا شور قیامت برپا ہو گیا ہے اور یہ ساری داد و تحسین صرف ایک رن کے لیے تھی۔ ایک رن...... جو میں نے اتفاق سے بنا لیا تھا۔ گویا ایک رن نہیں بنایا تھا کوئی جنگی مورچہ فتح کر لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری باچھیں کھلی ہوئی ہیں اور سینہ غرور سے لبالب بھر گیا ہے۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ شامیانوں کے اندر لہراتے ہاتھوں اور چمکتے دمکتے چہروں میں سب سے نمایاں چہرہ برجیس کا تھا۔
کہتے ہیں کہ معجزوں کا زمانہ ختم ہوا۔ اب معجزے نہیں ہوتے لیکن یہ بات پوری طرح سچ نہیں ہے۔ چھوٹے موٹے اور بظاہر غیر اہم معجزے اب بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس دن کرکٹ کے میچ کے دوران بھی ایک چھوٹا سا معجزہ وقوع پذیر ہوا۔ اس طرح کہ میں تین بار آؤٹ ہونے سے بال بال بچا۔ ایک بار گیند میرے پیڈ پر لگی۔ بولر نے ''ہاؤ از دیٹ'' کا نعرہ لگایا۔ وکٹ کیپر اور دوسرے فیلڈر بھی حلق پھاڑ کر چیخے اور میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ میں صریحاً آؤٹ تھا لیکن امپائر نے مجھے آؤٹ قرار دینے سے صاف انکار کر دیا (شاید اسے مجھ پر ترس آ گیا تھا) دوسری بار مڈ آف پر کیچ نکلا۔ فیلڈر نے چھلانگ لگائی۔ گیند اس کے ہاتھ میں آئی لیکن چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر نکل گئی۔ یقیناً وہ جو اوپر بیٹھا تھا، اس وقت مجھ سے بہت خوش تھا کیونکہ دو بار بچنے کے بعد تیسری بار بھی ایمپائر کا فیصلہ میرے حق میں رہا حالانکہ میں بھاگا تھا۔ جسم و جان کی پوری قوت سے بھاگا تھا۔ میں نے باؤنڈری کے قریب سے گیند کو گولی کی طرح آتے دیکھا تھا۔ پھر میں نے چھلانگ لگائی تھی اور پیچ پر سینے کے بل گر کر بیٹ آگے بڑھایا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے وکٹ کیپر نے بیلز اڑائی تھیں۔ شاید نصف انچ یا ایک انچ کا فرق رہ گیا ہوگا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ بیٹ کریز سے ایک انچ پیچھے ہی رہ گیا تھا مگر یہ پورا عمل اتنی سرعت اور برق رفتاری سے وقوع پذیر ہوا کہ ایمپائر کے لیے یہ طے کرنا ناممکن ہو گیا کہ بیٹ کریز پر پہنچا تھا یا نہیں۔ چنانچہ اس نے شک کا فائدہ مجھے دیا یعنی انگلی اٹھانے کے بجائے گردن نفی میں زور سے ہلائی اور میرے اردگرد چلاتے چیختے فیلڈروں کی آوازیں حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔
لیکن معجزہ یہ نہیں ہے کہ میں تین مرتبہ آؤٹ ہونے سے بچ گیا بلکہ معجزہ یہ ہے کہ ایک بار میری نظر اسکور بورڈ پر پڑی تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ کیا واقعی؟ ارے نہیں، کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ شاید میری آنکھوں میں کوئی کنکر پڑ گیا ہے۔ میں نے زور سے آنکھیں ملیں اور پھر غور سے دیکھا۔ اسکور بورڈ پر میرے نام کے ساتھ ستانوے کا ہندسہ نظر آرہا تھا۔ ستانوے رنز! حیرت ہے۔ کیا واقعی میں نے ستانوے رنز بنا لیے ہیں؟ شک

پہلے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے واقعی ستانوے رنز بنا لیے تھے۔ دھیان دیا تو یاد آیا کہ اس اسکور میں دس چوکے اور تین چھکے بھی شامل تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک اور خوفناک بلکہ دہشت انگیز حقیقت کا بھی احساس ہوا۔ یہ کہ ہماری نو وکٹیں گر چکی ہیں۔ اسکور بورڈ بتا رہا ہے کہ ہماری ٹیم کا مجموعی اسکور دو سو بارہ رنز ہے یعنی مخالف ٹیم کے اسکور سے صرف تین رنز کم ہیں۔ گویا میچ جیتنے کے لیے ہمیں مزید چار رنز مزید درکار ہیں۔ ایک اور لرزہ خیز سچائی یہ تھی کہ ہماری اننگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ آخری اوور کی آخری گیند باقی تھی جس کا سامنا مجھے کرنا تھا۔ آخری گیند، آخری شاٹ! اگر اس آخری گیند پر میں چار رنز بنالوں تو نہ صرف زندگی میں پہلی بار میں سیکڑا بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گا بلکہ ڈی اے وی کے خلاف ہم پہلی بار میچ بھی جیت جائیں گے۔ نہ صرف یہی بلکہ فائنل جیتنے کے طفیل پہلی بار ڈسٹرکٹ ٹرافی پر ہمارا قبضہ ہوگا اور یہ سب کچھ مجھ پر منحصر تھا۔ آخری گیند، آخری شاٹ..... ہلایا! کیا میں آخری گیند پر چار رنز بنا پاؤں گا۔ فرض کرو میں ناکام ہوا۔ فرض کرو میں آؤٹ ہو گیا تو کیا ہوگا؟

یہ خیال اتنا دہشت انگیز اور دہشت ناک تھا کہ میرے دل کی دھڑکن معاً کئی سو گنا بڑھ گئی۔ پورے بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ میں نے بے حد بے چارگی کے عالم میں گراؤنڈ میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ کہیں کوئی جائے فرار ہے مگر بے سود! فرار کا کوئی موقع، کوئی راستہ نہیں تھا۔ شامیانوں کے نیچے براجمان خواتین و حضرات کی نظریں مجھ پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ مسز جمیل، مسز شیخ، شازیہ، کوکب اور دوسرے اور برجیس..... سب کی آنکھوں میں ایک جوش تھا، ایک شوق تھا اور ایک توقع..... توقع کہ آخری گیند پر میں ایک خوبصورت شاٹ کھیلوں گا۔ گیند گولی کی طرح باؤنڈری لائن پار کرے گی۔ چار رنز بن جائیں گے اور انہونی ہو جائے گی یعنی ہم میچ جیت جائیں گے لیکن فرض کرو ایسا نہ ہوا تو؟ ایک بار پھر میرا دل کانپا کیونکہ چشم تصور سے یہ دیکھنا میرے لیے کچھ زیادہ دشوار نہیں تھا کہ پھر کیا ہوگا۔ شالیمار میں میری حیثیت کچھ عرصے کے لیے ہی سہی، ایک اچھوت کی سی ہو کر رہ جائے گی۔ بات کرنا تو درکنار، کوئی میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھے گا بھی نہیں اور کسی کی نظر اتفاقاً میری نظر سے مل بھی گئی تو وہ عالم طیش میں منہ پھیر لے گا۔ میری حالت بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے کسی زمانے میں جنوبی افریقہ میں سیاہ فام باشندوں کی ہوا کرتی تھی۔ ''اس میز پر کالوں کا بیٹھنا جرم ہے۔'' رمضان میری پسندیدہ کافی بنانے سے صاف انکار کر دے گا۔ ربانی ایک گلاس میں چلّو بھر پانی لے کے آئے گا۔ گلاس میرے سامنے رکھے گا اور بے حد حقارت سے کہے گا۔

''ڈوب مرو۔''

یہ تصور ایسا تھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل کی دھڑکن اور بھی تیز ہو گئی اور میں نے پسینے کی بوندوں کو پیشانی اور گردن پر رینگتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے بے چارگی کے ساتھ ایک بار پھر چاروں طرف نظر ڈالی اور اپنے آپ کو سنبھالنے اور دل کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اے عزیز! گھبرا مت۔ حوصلہ کر، حوصلہ کر۔ یاد کر ان لوگوں کو جنہوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ جنہوں نے آسمان کی بلندیاں سر کیں اور پاتال میں اترے۔ یاد کر شر پاتن سنگ کو جو ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچا اور یاد کر اس انگریز خاتون کو جس نے ایک موٹر بوٹ میں تن تنہا پوری دنیا کا سفر کیا اور یاد کر ان بازی گروں کو جو پچاس فٹ کی بلندی سے کپڑوں میں آگ لگا کر موت کے کنویں میں چھلانگ لگاتے ہیں۔ اگر وہ لوگ ایسے کارنامے انجام دے سکتے ہیں تو اے عزیز! تو ایک چوکا کیوں نہیں مار سکتا۔ ضرور مار سکتا ہے۔ بس ذرا حوصلہ رکھ..... حوصلہ رکھ..... اور یاد رکھ کہ برجیس تجھے دیکھ رہی ہے اور یہ ایک چوکا نہ صرف میچ جیتنے میں ہی مدد کرے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ تیری تقدیر بھی بدل دے۔

ذرا ہمت بندھی۔ دل کی دھڑکن اور بدن کی سنسناہٹ کم ہوئی۔ میں نے برجیس کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ اشتیاق اور جوش کے عالم میں اس کا ہاتھ فضا میں لہرا رہا تھا جیسے میرا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں مسکرایا۔ پھر میں نے بالر کی طرف دیکھا۔ وہ لحیم شحیم نوجوان تھا۔ قد چھ فٹ چار انچ، اس کی گیند کی رفتار نوے میل سے کم نہیں تھی۔ وہ وکٹ سے تقریباً بیس قدم دور کھڑا تھا اور مجھے کچا چبا جانے والے انداز میں گھور رہا تھا۔ جواب میں، میں نے بھی اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔ پھر میں نے پوزیشن لی، بیٹ کریز پر رکھا اور مستعد ہو گیا۔ بالر نے دوڑنا شروع کیا۔ آندھی طوفان کی طرح وہ وکٹ تک آیا۔ میں نے اس کا بازو گھومتے اور گیند کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ پھر میں نے آنکھیں بند کیں اور بیٹ گھما دیا۔

دوسرے لمحے ایسا شور برپا ہوا کہ سارا گراؤنڈ گونج کر رہ گیا۔ چیخ و پکار ایسی کہ لگتا تھا قیامت برپا ہو گئی ہے۔ شامیانوں کے نیچے ان گنت چوڑیوں بھرے ہاتھ فضا میں لہرا رہے تھے اور رنگین آنچل ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کافی لوگ

گراؤنڈ میں آ گئے تھے اور چاروں طرف دوڑتے پھر رہے تھے۔ کوئی بیلز لے بھاگا تو کسی کے ہاتھ وکٹ لگ گئی تھی۔ کچھ لوگ میری پیٹھ ٹھونک رہے تھے تو کچھ مجھے کندھوں پر اٹھانے کی کوشش کررہے تھے۔ چند ایک افراد نے تو زندہ باد کا نعرہ بھی لگایا اور یہ سب کچھ صرف اس لیے ہوا تھا کیونکہ اتفاق سے چوکا لگ گیا تھا اور اب اس بات کا کوئی امکان نہیں رہا تھا کہ ربانی میرے سامنے گلاس رکھے گا جس میں چلّو بھر پانی ہو اور مجھ سے کہے گا۔

''ڈوب مرو۔''

کچھ دیر بعد جب جوش اور ہنگامے میں کمی آئی اور برجیس سے سامنا ہوا تو اس نے کہا۔

''بھئی آپ تو بہت اچھا کھیلے۔''

''وہ میں نہیں تھا۔'' میں نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

''پھر کون تھا؟'' اس نے مسکرا کر شوخی سے پوچھا۔

''پتا نہیں لیکن وہ یقیناً کوئی اور تھا۔ میں نے تو کبھی پندرہ رن بھی نہیں بنائے۔''

''لیکن آج تو پورے سو رن بنے اور میچ بھی جیتا۔'' وہ مسکرائی۔ ''جیت مبارک ہو۔''

''شکریہ!''

☆......☆

بعد ازاں کلب میں شطرنج اور بیت بازی کے مقابلے ہوئے۔ شطرنج کا مقابلہ تو خیر میں نے اتفاقاً جیت لیا لیکن بیت بازی میں لڑکوں کو لڑکیوں کی ٹیم نے بڑی عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔ لڑکیوں کی ٹیم کی لیڈر برجیس تھی اور اسے بے شمار شعر ازبر تھے۔ خاص طور پر میر اور غالب کے اشعار تو اس کی زبان کی نوک پر تھے۔ ظالم نے کتنے ہی شعر ایسے بھی پڑھے جو میں نے پہلے کبھی سنے ہی نہیں تھے۔ مقابلوں اور تقریبات کا سلسلہ ختم ہوا تو ایک نئی لہر شروع ہوئی۔ یہ کہ کلب میں تقریباً ہر لڑکا غالب کے رنگ میں شاعری کرنے پر تلا نظر آنے لگا کیونکہ غالب اور میر برجیس کے پسندیدہ شاعر تھے۔ غیر ارادی یا شاید ارادی طور پر میں نے بھی قلم اور کاغذ سے دوستی کی۔ میر اور غالب کے دیوان خریدے اور اپنے آپ پر دیوانگی طاری کرنے کی کوشش کی مگر مقابلہ سخت تھا۔ میرے لیے یوں بھی ایک مصرع تک موزوں کرنا کار دارد تھا۔ غالب کے رنگ میں شاعری کیا کرتا لیکن فاعلاتن فاعلاتن کا گورکھ دھندا سمجھ نہ پانے کے باوصف مجھے ایک اطمینان ضرور تھا یہ کہ برجیس دوسرے لڑکوں کی نسبت مجھ سے زیادہ بے تکلف ہے۔ کلب میں کافی وقت میرے ساتھ گزارتی ہے۔ ممکن ہے شاعری کے میدان میں صریحاً ناکام ہوجانے کے باوجود برجیس کا التفات حاصل کرنے کے معاملے میں میری غزل کے سارے مصرعے موزوں ہوجائیں۔

لیکن برجیس کے من میں کیا ہے۔ اس کی پسند، ناپسند کیا ہے۔ زندگی کے سفر میں وہ کیسے ساتھی کو ترجیح دے گی، نیز یہ کہ میرے بارے میں اس کے احساسات کیا ہیں۔ مجھ سے اس کی بے تکلفی محض خوش اخلاقی اور خوش مزاجی کی بنا پر ہے یا یہ کہ اس کے دل میں میرے لیے کچھ پسندیدگی بھی ہے۔ یہ اندازہ کرنا آسان نہ تھا۔ اس سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی شخصیت اتنی پُروقار اور پُرتمکنت ہے کہ جب بھی میں کچھ کہنے، اپنے احساسات بیان کرنے کے بارے میں سوچتا، میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے حالانکہ میں اپنے دل کو سمجھانے، اس کا حوصلہ بڑھانے کی پوری کوشش کرتا...... اے عزیز! حوصلہ کر، حوصلہ کر، اک ذرا سی زبان ہی تو کھولنی ہے تو پھر اس قدر گھبرانے کی کیا بات ہے۔ یاد کر فرہاد کو جس نے دودھ کی نہر نکالی اور یاد کر وامق کو جس نے...... جس نے...... خیر اس نے بھی کچھ کیا تھا۔ تیرے پاس بے شک تیشہ نہیں مگر زبان تو ہے اور اک ذرا زبان کو جنبش ہی تو دینی ہے۔ کیا تو اتنا بھی نہیں کرسکتا مگر بات نہیں بنی۔ مجھے صاف محسوس ہوتا کہ اگر میں نے اپنے احساسات کا اظہار کیا تو خواہ میں کتنے ہی خوبصورت اور شائستہ الفاظ استعمال کروں، بوکھلاہٹ میں کچھ نہ کچھ حماقت ضرور کر بیٹھوں گا اور برجیس مجھے سخت بدتمیز اور احمق تصور کرے گی۔

لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جہاں بات بنائی نہ جاسکے، وہاں خود بخود بن جاتی ہے۔ خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر ہی دیتا ہے۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ ہوا۔ وہ ایک خوشگوار سہ پہر تھی۔ میں اپنے کمرے میں پلنگ پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ ہاتھ میں میر کی ایک غزل تھی اور میں توڑ پھوڑ کر اس کی شکل بدلنے کی کوشش کررہا تھا تاکہ دعویٰ کرسکوں کہ میری کاوش ہے۔ سخت مشکل کام تھا۔ جھلاہٹ کے عالم میں کبھی میں قبلہ میر صاحب کی شان میں گستاخی کرنے لگتا اور کبھی برجیس کو برا بھلا کہنے لگتا۔ اسی دوران نہ جانے کیسے میری آواز آپ سے آپ بلند ہوگئی...... ''کیا مصیبت ہے محترمہ! آپ نے بھی کس کو پسند کیا ہے۔ میر صاحب کا ایک مصرع تک تو پلے پڑتا نہیں، غزل کیا کہوں گا۔ آپ کو اگر پسند کرنا ہی تھا تو فلمی گانے پسند کرتیں...... تو میرا چاند میں تیری چاندنی وغیرہ...... فلمی

آسان بات ہے۔ مطلب کی ادائیگی میں کتنی آسانی رہتی ہے۔ ہنگ لگتی ہے، نہ پھٹکری اور رنگ ہے کہ بے حد چوکھا آتا ہے مگر نہیں صاحب، آپ کو تو میر صاحب اور غالب پسند ہیں جو ہم دل والوں کا قافیہ تنگ کرنے کا بھرپور سامان رکھتے ہیں۔''

''تو آپ شاعری کر رہے ہیں؟''

دفعتاً کانوں میں آواز آئی۔ میں گھبرا کر اچھلا، گھوم کر دیکھا۔ دروازے میں برجیس کھڑی تھی۔ سرو قد، ایک شانِ تمکنت سے، ہونٹوں پر ایک شوخ سی مسکراہٹ سجائے۔ میں بوکھلاہٹ میں پلنگ سے نیچے اترا اور سٹپٹا کر بولا۔

''ارے برجیس! تم یہاں؟''

''ہاں، کیا کر رہے تھے؟'' برجیس نے مسکرا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں..... بس وہ..... کیا ہے کہ..... یعنی.....'' میں سٹپٹا کر چپ ہو گیا۔

''شاعری کر رہے تھے تم؟'' اس کی آواز میں شوخی تھی۔

''بس یونہی.....'' میں جھینپ کر ہنسا۔ ''مگر تم نے بتایا نہیں۔ یہ اچانک کیسے آ گئیں؟''

برجیس نے کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی پھر مسکرا کر بولی۔ ''ادھر سے گزر رہی تھی۔ سوچا ملتی چلوں۔ تمہارے گھر پہلے بھی تو آ چکی ہوں۔ صحن میں تمہاری اماں سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ تم اپنے کمرے میں ہو۔''

''بیٹھو!'' میں نے کرسی گھسیٹی۔ ''میں چائے بنواتا ہوں۔''

''نہیں رہنے دو۔ چائے کا وقت نہیں ہے۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گئی پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''تو تم شعر کہہ رہے تھے؟''

''کوشش کر رہا تھا۔'' میں نے رواداری میں جواب دیا۔

''کیوں؟''

اور یہی وہ لمحہ تھا جب خود بخود میری زبان سے نکل گیا۔

''آج کل تو سب ہی میر اور غالب کے رنگ میں شاعری کر رہے ہیں۔''

اسے میرا مطلب سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ایک بار میری طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر اٹھ کر دریچے تک گئی۔ میری کنپٹی پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں کیونکہ اب اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ شاید میں نے غلط لمحے کا انتخاب کیا ہے۔ کہیں میری جسارت اسے بارِ خاطر نہ ہو۔ میں شش و پنج کے عالم میں کھڑا رہا اس مجرم کی طرح جو کٹہرے میں کھڑا جج کا فیصلہ سننے منتظر ہو۔ چند لمحے گزرے بوجھل اور اذیت رساں۔ پھر اس نے گھوم کر مجھے دیکھا اور ہولے سے مسکرائی۔

''لیکن تم دوسروں کے نقشِ قدم پر کیوں چل رہے ہو؟''

میں نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ معنی تھے بھی اور نہیں بھی تھے لیکن اس کی آواز میں برہمی کا کوئی پہلو نہ تھا۔ ہمیشہ کی طرح مہربان اور پُرسکون آواز تھی۔

میرے دل نے کہا۔ عالم! آگے بڑھو، ہمت کرو اور جو کچھ کہنا ہے، کہہ دو۔ یوں کب تک خیالات کے صنم خانے میں برجیس کے بت بنا کر سجاتے اور پوجتے رہو گے۔ اب خاموش رہنا ٹھیک نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دل کی بات دل ہی میں رہ جائے اور برجیس تم سے دور چلی جائے اور انجام کار تم کو ایک دن ان ہی بتوں سے سر ٹکرا کر مر جانا پڑے۔

میں چند لمحے گومگو کی حالت میں کھڑا رہا اور ہمت کے آوارہ پرندے کو پکڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''برجیس! کیا میں کوئی غلطی کر رہا ہوں؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس نے رسانیت سے پوچھا۔

''مجھے..... مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''کیوں؟''

''پتا نہیں، بس ڈر لگتا ہے۔'' میں نے ایک بار پھر ہونٹوں کو زبان سے تر کیا۔ ''میرے پاس کچھ نہیں، بس ایک خواب ہے۔ میرا یہ خواب ٹوٹ تو نہیں جائے گا۔''

اس نے گردن موڑ کر چھوٹے سے عقبی باغیچے میں لگے پودوں کو دیکھا پھر صاف آواز میں کہا۔ ''نہیں۔''

☆.....☆

اس روز میں دیوانوں کی طرح شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا۔ سرخوشی اور سرمستی کے مدہوش کر دینے والے نشے سے چور۔ اپنے دکھوں سے بے نیاز، ایک خوبصورت سی، پیاری سی جنت اپنے دل میں چھپائے ہوئے۔ اس دن یہ دنیا مجھے بے حد اچھی لگی۔ یہ شہر بھی بہت پیارا محسوس ہوا۔ سڑکیں، گلیاں، درخت، پودے، پھول ہر شے حسین لگی اور مسرت سے سرشار۔ ہوا کے آوارہ خرام جھونکے بے حد فرحت افزا تھے۔ میں اپنے آپ سے بے خبر سڑکوں پر گھومتا رہا اور ہر

گزرتے لمحے سے مسرت اور نشہ نچوڑتا رہا۔ بھٹکتا بھٹکتا میں پارک میں جا پہنچا جہاں بے شمار پھول کھلے تھے اور سہ پہر کے آخری لمحات کے دھندلکے میں ہیروں کے مانند دمکتے نظر آرہے تھے اور سارا باغ خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ باغ سے نکلا تو دریا کنارے جا پہنچا اور ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ سامنے دریا تھا۔ اس کی ہلکورے لیتی موجیں پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہولے ہولے بہہ رہی تھیں۔ ہوا کے نرم جھونکے نغمہ سرا تھے۔ شام کا طلسمی دھندلکا دھیرے دھیرے اتر رہا تھا اور چاروں اور پھیل رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی اور سکون، ایسا سکون جو دل کو اور روح کو اطمینان اور طمانیت سے بھر دیتا ہے۔ سامنے بہت دور جہاں آسمان دھرتی سے گلے ملتا ہے، چاند ابھر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اوپر اٹھ رہا تھا اور اس کی چاندنی..... خواب ناک، رومانی چاندنی دھیرے دھیرے دھرتی پر پھیل رہی تھی۔ پھیلتی ہی جارہی تھی۔

خدایا! تیری یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے۔

☆.....☆

شالیمار میں یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہ رہ سکی کہ برجیس میری جانب ملتفت ہے اور تب ان سب لڑکوں نے جن پر شاعری کا بھوت سوار تھا اور جو رگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے کی جستجو میں جٹے ہوئے تھے، اپنے اپنے شعری مجموعے اور قلم، کاپیاں الماری میں بند کیں اور شاعری مستقل طور پر ترک کردی کیونکہ ان کی شاعری کا چراغ نہیں جل سکا تھا جبکہ ایک میں تھا کہ ایک بھی مصرع موزوں کیے بغیر میر اور غالب کی شاعری کی تمام حدیں پار کر گیا تھا۔

اس کے بعد ہم دونوں کا وقت زیادہ تر اکٹھے ہی گزرنے لگا۔ شالیمار میں تو خیر ملاقات ہوتی ہی تھی، ساتھ ہی باہر کے پروگرام بھی بنتے۔ کبھی سینما، کبھی دریا میں بوٹنگ اور کبھی چڑیا گھر کی سیر۔ میں چند ایک بار اس کے گھر بھی گیا۔ شہر کے پرانے علاقے میں اس کا قدیم طرز کا آبائی مکان تھا۔ مکان کیا تھا، اچھی خاصی حویلی تھی۔ کتنے ہی کمرے، دالان، وسیع آنگن، بیٹھک، لائبریری اور نہ جانے کیا کیا۔ مکان سے متصل ایک وسیع باغیچہ بھی تھا۔ برجیس کے ابا اماں مجھ سے بڑی شفقت سے ملے، تاہم انہیں یہ علم بالکل نہیں تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔

ایک دن برجیس نے کہا۔ ''مناسب وقت آنے پر تم اپنی اماں کو ہمارے گھر بھیجنا۔''

''اور وہ مناسب وقت کب آئے گا؟''

''جلدی ہی۔ میں خود ہی تمہیں بتادوں گی۔''

یہ گفتگو شالیمار میں ہی ہوئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ ہم دونوں ورانڈے میں بیٹھے تھے اور کافی سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ برجیس کی بات سن کر پہلے میں نے باغیچے میں نظر ڈالی اور مدھم ہوتے ہوئے اندھیرے کو دیکھا۔ پھر گردن گھما کر اندر لاؤنج میں نگاہ دوڑائی۔ مسز جمیل چند ایک خواتین کے ساتھ صوفے پر براجمان زور وشور سے کسی مسئلے پر اظہار خیال میں مصروف تھیں۔ ربانی وغیرہ کھیلوں کے کمرے میں شور شرابا کرنے میں جٹے ہوئے تھے۔ میں چند لمحے بے دھیانی سے اندر دیکھتا رہا۔ پھر زور سے سانس لی اور برجیس کی طرف دیکھا۔

''مگر برجیس.....'' آخرکار میں نے لب کھولے۔

''مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''کس بات کا ڈر ہے تمہیں؟'' برجیس نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''برجیس! میرے پاس کچھ نہیں ہے ماسوا ایک خواب کے اور یہ خواب مجھے بہت عزیز ہے۔ یہ خواب میری کل متاع، میرا زادِ سفر ہے اور اگر یہ خواب ٹوٹ گیا تو.....؟'' میں سٹپٹا کر چپ ہوگیا۔

''مگر تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟'' برجیس کی حیرت بدستور برقرار تھی۔

''میں نے تمہارا گھر دیکھا ہے۔'' یہ چند الفاظ میں نے ڈرتے ڈرتے ادا کیے۔

برجیس مسکرائی اور چند لمحے مجھے دھیان سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے صاف اور تیقن آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہارے خوف کو میں سمجھ سکتی ہوں مگر اطمینان رکھو، تمہارا خواب نہیں ٹوٹے گا۔''

برجیس کے الفاظ نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ تقویت بخشی۔ مجھے یقین ہوا۔ برجیس کو اگر پورا اطمینان نہ ہوتا تو اس کے لہجے میں پس وپیش اور بے یقینی کی جھلک ضرور ہوتی۔ اس کے بعد میں انتظار کرنے لگا مگر بڑا ہی جان لیوا انتظار تھا۔ ایک ایک دن گویا ایک ایک سال کی طوالت اختیار کر گیا تھا، تاہم مجھے اطمینان تھا کہ بالآخر یہ انتظار..... قیامت کا انتظار ختم ہوگا اور میں اپنی زندگی کا ایک نیا سفر شروع کروں گا۔ برجیس کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہوگا۔ آج تک میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ محرومی اور تنہائی کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا رہا ہوں مگر اب اس اندھیرے کا خاتمہ ہوگا اور میرے شب و روز برجیس کے چہرے کی تابانی سے منور

ہو جائیں گے۔
مگر وہ دن کب آئے گا؟

☆☆☆

اپنے گھر میں، میں پہلے ہی اجنبیوں کی طرح رہتا تھا۔ صبح نکلتا تو شام کو آتا۔ ہوا کے اس بے منزل جھونکے کے مانند جو ایک دروازے سے داخل ہوتا اور دوسرے دروازے سے نکل جاتا ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ اس گھر میں میری پروا کرنے والا ماسوا رضیہ کے اور کوئی نہیں ہے۔ ہر چند کہ گھر میں میرے بڑے بھائی عاصم ہیں، بھابی غزالہ ہیں اور اماں ہیں مگر اماں اپنے کمرے تک محدود رہتی ہیں اور عاصم بھائی کو مجھ سے یا میرے معاملات زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ چار ماہ قبل ان کی شادی ہوئی تھی اور وہ نئی نویلی بیوی میں اس طرح ڈوب گئے تھے کہ انہیں پتا ہی نہ چلتا تھا کہ سورج آج کل مشرق سے نکلتا ہے یا مغرب سے۔ میرے ساتھ ان کا رویہ ایسا ہی تھا جیسے میں ان کا بھائی اور جائداد میں نصف کا حصہ دار نہیں بلکہ محض ایک شناسا ہوں۔ کبھی اتفاق سے سامنا ہو گیا تو خیر خیریت پوچھ لی اور بس۔ رہ گئیں بھابی تو انہیں اس دنیا میں جو آدمی قطعی ناپسند ہے وہ میں ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ میں ایک ناکارہ اور نااہل آدمی ہوں۔ کام کاج کی طرف میری کوئی توجہ نہیں۔ مفت کی روٹیاں توڑتا ہوں اور پڑھائی کے نام پر پیسا الگ برباد کر رہا ہوں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ میں زندگی بھر کچھ نہیں کروں گا۔ بس بھائی کے سر پر ڈار ہوں گا اور ہر چند کہ وہ صرف چار ماہ پہلے ہی اس گھر میں آئی ہیں مگر چند ایک بار واضح اشارہ دے چکی ہیں کہ وہ مجھے زیادہ دیر برداشت نہیں کریں گی اور جلد ہی اپنا علیحدہ گھر بنالیں گی۔

رضیہ اس گھر میں اس وقت آئی تھی جب اس کی عمر نو دس سال رہی ہوگی۔ اس کے ابا جو ہمارے دور کے رشتے دار تھے، گاؤں میں رہتے تھے اور ہمارے آم اور امرود کے باغوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ محدود آمدنی اور چھوٹا سا کرائے کا گھر ان کی کل کائنات تھی اور وہ اس میں خوش اور قانع تھے مگر پھر بری گھڑی نے ان کے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔ ایک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ رضیہ کی اماں نے بھی رختِ سفر باندھ لیا۔ رضیہ اکیلی رہ گئی۔ نو دس سال کی بچی اور بے آسرا۔ گاؤں میں دو چار رشتے دار تھے مگر بوجوہ وہ رضیہ کی ذمے داری اٹھانے پر تیار نہیں تھے۔ تو پھر رضیہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟ کسی نے تجویز پیش کی کہ اسے یتیم خانے کے سپرد کر دیا جائے۔ اس موقع پر ابا بھی موجود تھے۔ انہوں نے سخت غصے کے عالم میں کہا۔

''جب تک میں زندہ ہوں یہ بچی یتیم خانے نہیں جائے گی۔''

یوں رضیہ ہمارے گھر کی ایک فرد بنی۔

اس کی پرورش ہمارے گھر میں بالکل اولاد کی طرح ہوئی تھی۔ ابا اور اماں نے کبھی بھی اس کے اور اپنے دونوں بچوں کے بیچ کوئی فرق نہیں کیا تھا۔ وہی تمام لوازمات اس کے لیے بھی مہیا کیے جاتے جو عاصم بھائی اور میرے لیے۔ حتیٰ کہ اسے اسکول بھی بھیجا گیا اور میٹرک تک تعلیم بھی دلائی گئی۔ اس کے سامنے بھی کوئی ایسی بات نہیں کی جاتی تھی جو اسے احساس دلاتی کہ وہ یتیم و یسیر ہے۔ وقت گزرا۔ پھر ابا چلے گئے۔ اماں نے رفتہ رفتہ گھریلو معاملات سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ساری ذمے داری خود بخود رضیہ کے سپرد ہو گئی اور وہ نہایت سلیقے اور ہوشیاری سے گھر کے سارے امور انجام دینے لگی۔

مگر یہ صورتِ حال چار ماہ قبل بدل گئی جب بھابی غزالہ اس گھر میں بہو کی حیثیت سے وارد ہوئیں۔ وہ ''بڑے باپ'' کی ''بڑی بٹیا'' ہیں اور ''بڑے گھر'' سے آئی ہیں جہاں ''چھوٹے لوگوں'' کو منہ لگانے کا رواج نہیں چنانچہ انہوں نے گھر کا نظام سنبھالتے ہی رضیہ کو وہی حیثیت دے دی جو ان کے خیال میں ہونی چاہیے تھی یعنی ملازمہ اور اسے اچھی طرح احساس بھی دلا دیا کہ وہ محض ایک نوکرانی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اگر اس کی پرورش اس گھر میں ہوئی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی اوقات ہی بھول جائے۔ عاصم بھائی پہلے ہی رضیہ کی کچھ زیادہ پروا نہیں کرتے تھے چنانچہ انہوں نے بھی بھابی کی سوچ اور طرزِ عمل پر کوئی تعرض نہیں کیا۔ رہ گئیں اماں تو وہ مصلے اور کمرے تک محدود ہو گئی تھیں۔ انہیں شاید ان تبدیلیوں کا احساس ہی نہیں ہوا۔ رضیہ نے اس صورتِ حال سے یوں سمجھوتا کیا کہ دھیرے دھیرے واقعی اپنے آپ کو نوکرانی کے روپ میں ڈھال لیا۔ بڑے کمرے کو چھوڑ کر چھوٹے کمرے میں منتقل ہو گئی۔ سارے ریشمی کپڑے اور زیور وغیرہ مقفل کر دیے۔ سادہ کپڑے پہننے لگی اور سارا دن کام میں جتے رہنا اپنا شعار بنالیا اور بلا ضرورت اپنے کمرے سے نکلنا قریب قریب ترک ہی کر دیا۔

مجھے ان تبدیلیوں اور نئی صورتِ حال کا پورا احساس تھا لیکن بھابی غزالہ اور عاصم بھائی سے کچھ کہنا سننا بالکل فضول ہوتا۔ جانتا تھا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ان دونوں کو جب میری کوئی پروا نہیں تھی تو پھر میرے کہنے سے وہ رضیہ کے ساتھ

اپنے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی کریں گے اس کا امکان قطعی نہیں تھا، تاہم رضیہ کے تئیں میں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ میں نے پہلے بھی بھی اسے نوکرانی نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی اب سمجھنا چاہتا تھا۔ میرے نزدیک وہ اس گھر کی ایک فرد تھی اور اس کا مرتبہ ہم دونوں کے برابر ہی تھا۔ میں حتی المقدور اس کا خیال رکھتا اور رضیہ بھی معمول کے مطابق میرا پورا دھیان رکھتی۔ میرے کپڑے سنبھالتی، کمرے کی صفائی کرتی، مجھے کھانا دینے کے لیے رات گئے تک جاگتی رہتی۔ اگر کبھی اتفاق سے بیمار پڑ جاتا تو جی جان سے تیمارداری کرتی۔ میں اکثر محسوس کرتا کہ اس گھر میں اگر وہ نہ ہوتی تو میں کچھ زیادہ ہی بے سروسامان، تنہا اور بے آسرا ہو جاتا۔

میں نے دل ہی دل میں یہ بھی طے کر رکھا تھا کہ رضیہ کو اس دکھ سے زیادہ عرصہ دوچار نہیں رہنے دوں گا۔ جلد ہی شادی کر دوں گا۔ اپنا گھر بناؤں گا اور اماں اور رضیہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ عاصم بھائی کو تو شاید خیال بھی نہیں ہے لیکن ابا کی خواہش جسے انہوں نے عاصم بھائی سے ایک درخواست کی صورت میں بیان کیا تھا، میں پوری کروں گا یعنی ایک اچھا سا رشتہ ڈھونڈ کر رضیہ کی شادی کروں گا اور اس کا گھر بساؤں گا۔

☆.....☆

دن اپنی ہموار رفتار سے گزرتے چلے گئے۔ برسات رخصت ہوئی تو سردیوں نے ہر طرف اپنا ڈیرا جمایا۔ باریک کپڑوں کی جگہ گرم کپڑوں نے لی اور سول لائنز کے بنگلوں کی چمنیوں سے صبح صبح دھواں نکلتا دکھائی دینے لگا۔

ایک رات میں حسبِ عادت دیر سے گھر لوٹا۔ فضا اچھی خاص سرد تھی۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادلوں کا شامیانہ تنا ہوا تھا اور سارے میں ایسا اندھیرا چھایا ہوا تھا جیسے کسی حسینہ کی آنکھ کا کاجل پوری کائنات پر پھیل گیا ہو۔ جب میں گنگناتا ہوا گھر کی طرف بڑھ رہا تھا بہت خوش تھا اور سب خوشی کا یہ تھا کہ برجیس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے اپنے دل کی بات اپنی اماں کے کانوں تک پہنچا دی ہے اور یہ کہ اس کی اماں اس کے ابا سے بات کر کے چند دن میں اپنے فیصلے سے اسے آگاہ کر دیں گی۔

''اور تمہیں یقین ہے کہ ان کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

''ہاں، مجھے یقین ہے۔''

''لیکن فرض کرو۔''

''بھئی تم فرض بہت کرتے ہو۔'' اس نے ہنس کر بات کاٹی تھی۔ ''خواہ مخواہ فضول باتیں مت فرض کیا کرو۔ خدشے کی کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، سمجھے۔''

میں جھینپ کر ہنسا تھا۔ ''تم کہتی ہو تو ٹھیک ہے لیکن یہ بتاؤ انتظار کب تک کرنا ہوگا؟''

''اب اتنے اتاولے مت بنو۔ ایسی باتوں میں ہفتہ عشرہ تو لگ ہی جاتا ہے۔''

تو اس رات میں بہت خوش تھا۔ دل امنگوں سے بھرا ہوا تھا۔ تصور میں مستقبل کی رنگین، روشن تصویریں ناچ رہی تھیں۔ ایک خوبصورت گھر، اماں، رضیہ اور برجیس کا ساتھ۔ اور کیا چاہیے مجھے۔ نہیں اور کچھ نہیں۔ میرا دامن دل بالکل بھر جائے گا۔ کسی اور شے کی نہ گنجایش ہوگی نہ خواہش..... میں مسرت کے نشے سے سرشار گھر میں داخل ہوا۔ توقع کے مطابق گھر میں سناٹا ہی تھا۔ عاصم بھائی کے کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ رضیہ کے کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی بھی تاریک نظر آئی۔ یہ بات خلافِ معمول تھی۔ وہ تو مجھے کھانا کھلائے بغیر نہیں سوتی تھی۔ پھر کیا بات ہے؟ میں نے چند منٹ انتظار کیا۔ پھر اپنے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کیے اور سوچنا شروع کیا کہ اب کیا کروں۔ ارادہ کیا کہ کھانا کھائے بغیر ہی سو جاؤں مگر خالی پیٹ سونا مشکل تھا۔ پھر خیال آیا کہ خود ہی یہ مہم سر کرلوں۔ کون سی بڑی بات ہے۔ ایک پلیٹ میں تھوڑا سا سالن ہی تو نکالنا ہے۔ اب اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں کہ اتنا سا کام بھی نہ کر سکوں مگر چاول؟ میری عادت ہے کہ جب تک دو چار لقمے چاول کے نہ ہوں، کھانا ادھورا محسوس ہوتا ہے تو پھر کیا کروں؟ چاول بھی پلیٹ میں نکال سکتا ہوں مگر ٹھنڈے چاول؟ انہیں گرم کرنا ایک کار دشوار ہے۔ نہیں بھئی، یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔ رضیہ کو ہی تکلیف دینا ہوگی مگر یہ رضیہ اب تک آئی کیوں نہیں۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں؟

میں نے دروازے پر دستک دے کر ذرا اونچی آواز میں کہا۔ ''رضیہ!''

پہلی بار کوئی جواب نہ ملا۔ دوسری بار پکارنے پر اس کی کمزور سی آواز سنائی دی۔ ''کیا ہے؟''

''کیا بات ہے رضیہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دروازے پر تھوڑا سا دباؤ ڈالا تو ایک پٹ کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے اندر قدم رکھا۔ ہاتھ بڑھا کر سوئچ تلاش کیا۔ چٹ کی آواز کے ساتھ بٹن دبا تو کمرا ایک دم

روشن ہوگیا۔ میں نے دیکھا رضیہ ایک کونے میں زمین پر اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔ گھٹنوں پر سر رکھے ہوئے۔ اس کے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے ہولے سے سر اٹھایا اور مجھے دیکھا اور چند لمحے تک یوں دیکھتی رہی جیسے اسے علم نہ ہو کہ کیا دیکھ رہی ہے یہ کہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے چہرے پر شدید اندوہ کے آثار تھے۔ ساتھ ہی خوف کی پرچھائیں بھی۔ ایسا لگتا تھا وہ کسی بات سے بہت زیادہ خوفزدہ ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے گالوں پر آنسوؤں کے خشک نشان تھے۔ شاید وہ دیر تک روتی رہی تھی اور اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے ہی فرش پر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے رضو! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

اس نے نفی میں سر کو جنبش دی مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

''پھر تم اتنی اداس کیوں ہو؟ کیا بھابی نے کچھ کہا ہے؟''

اس نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے انتظار کے بعد میں نے کہا۔ ''آخر تم اس طرح یہاں کیوں بیٹھی ہو۔ بتی بھی نہیں جلائی اور مجھے کھانا دینے بھی نہیں آئیں۔ کوئی بات تو ضرور ہے۔ بتاؤ نا کیا ہوا ہے؟''

رضیہ نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے۔ پھر اس کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ ''تم جاؤ یہاں سے، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

''مگر کیوں؟ اور یہ تم رو کیوں رہی ہو؟'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کیا بھابی نے کچھ کہا ہے۔ دیکھو رضو! میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ بھابی کی باتوں کی پروا مت کیا کرو۔ رہے عاصم بھائی تو انہیں بھی گولی مارو۔ بس کچھ ہی دن کی بات اور ہے پھر اپنی شادی کے بعد میں اپنا گھر بناؤں گا اور تمہیں اور اماں کو اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ تب تک ذرا صبر سے کام لو۔ ٹھیک ہے نا، چلو اب اٹھو، مجھے کھانا دو۔ بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کا ہاتھ تھاما۔ ارادہ تھا کہ اسے گھسیٹ کر اٹھاؤں گا لیکن جونہی میں نے اس کا ہاتھ تھاما وہ یکلخت اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جیسے دریا پر بندھا بند ٹوٹ گیا ہو۔ میں ششدر اور پریشان اس کی شکل دیکھتا رہا۔ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا؟ رضیہ پہلے تو کبھی اس طرح نہ روئی تھی۔ وہ بہت ہمت والی تھی۔ صبر اور برداشت کا مادہ بھی اس میں کچھ زیادہ ہی تھا تو پھر آج وہ صبر کہاں گیا؟ کیوں وہ اس طرح رو رہی ہے؟ میں کئی منٹ تک کشمکش میں مبتلا اسے دیکھتا رہا۔ پھر ذرا پرزور لہجے میں کہا۔

''رضو! بتاتیں کیوں نہیں۔ آخر بات کیا ہے؟''

''مجھ سے مت پوچھو۔ میں کچھ نہیں بتا سکتی.....'' اس نے یہ دو جملے اس طرح کہے جیسے ہذیان بک رہی ہو۔

میرے ذہن میں ایک بار پھر بھابی کا خیال ابھرا۔ یقیناً انہوں نے ہی اپنی عادت اور سرشت سے مجبور ہو کر کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جو رضیہ کی دل شکستگی کا باعث بنی ہے۔ ٹھیک ہے، اب مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا۔ میں نے دل ہی دل میں طے کیا۔ بھابی سے دو دو باتیں کرنا ہی ہوں گی۔ آخر کیا سمجھتی ہیں وہ اپنے آپ کو۔ بڑے گھر کی ہیں تو ہوا کریں۔ انہیں رضیہ کی دل آزاری اور تضحیک کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر انہیں رضیہ سے بہت زیادہ پرخاش ہے تو بے شک اپنا چولھا الگ کرلیں۔ اپنے لیے الگ ملازمہ رکھ لیں۔ ایک گھر میں دو چولہے بھی جل سکتے ہیں۔ رضیہ میری اور اماں کی ذمے داری سنبھال لے گی اور آئندہ اگر انہوں نے رضیہ سے کوئی سروکار رکھا یا اسے بے وقعت کرنے کی کوشش کی تو میں برداشت نہیں کروں گا۔ یہ سوچ کر میں نے رضیہ سے کہا۔

''رضو! زیادہ پریشان مت ہو۔ صبح میں بھابی سے بات کروں گا اور سختی سے انہیں تاکید کروں گا کہ آئندہ وہ تم سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔''

''بھابی نہیں ہیں۔'' رضیہ کی کمزور سی آواز سنائی دی۔

''کیا مطلب؟ کہاں گئیں بھابی.....؟''

''وہ اپنے گھر چلی گئی ہیں۔''

''اپنے گھر..... کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

رضیہ نے سلگتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بدستور آنسو تھے۔ لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے پست آواز میں کہا۔ ''دونوں میں کچھ چخ چخ ہوئی تھی۔ بھابی بہت غصے میں تھیں۔ عاصم بھائی انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ نہیں مانیں اور اپنے گھر چلی گئیں۔''

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اگر بھابی اور عاصم بھائی کے درمیان کسی بات پر لڑائی ہوئی ہے تو یہ کون سی نئی بات ہے۔ بھابی تنک مزاج بھی ہیں اور بات کا بتنگڑ بنانے میں بھی ان کا کوئی جواب نہیں۔ ان دونوں کے درمیان اکثر تلخ کلامی ہوتی رہتی ہے اور بھابی نے اکثر پہلے بھی میکے چلے جانے کی دھمکی دی ہے اور اب اگر انہوں نے اس دھمکی پر عمل کر ڈالا ہے تو کیا۔ عاصم بھائی جانیں اور وہ جانیں۔ وہ دونوں لڑتے جھگڑتے رہیں گے اور منتے مناتے رہیں گے۔ رضیہ کو ان

کے آپس کے جھگڑے سے کیا لینا دینا ہے۔

چند لمحے بعد میں نے کہا۔ ''اور عاصم بھائی کہاں ہیں؟''

''وہ بھی وہیں گئے ہیں۔''

''غالباً انہیں منانے کے لیے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''کیا اماں کو ان کے جھگڑے کا علم ہے؟''

''نہیں، وہ اپنے کمرے میں تھیں۔ انہیں کچھ نہیں معلوم ہے۔''

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد نرم لہجے میں کہا۔ ''دیکھو رضو! ان دونوں کے درمیان تو اکثر لڑائی ہوتی رہتی ہے اور بھابی کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ سلسلہ ساری زندگی چلتا رہے گا لیکن ان کے جھگڑے کا تم سے کیا تعلق ہے۔ تم اتنی پریشان اور دکھی کیوں ہو۔ تمہاری تو غلطی نہیں۔ پھر تم کیوں رو رہی ہو؟''

رضیہ نے آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا لیکن چپ رہی۔

میں نے پھر کہا۔ ''ان کے بیچ لڑائی کس بات پر ہوئی تھی؟''

''میں نہیں بتا سکتی۔''

''کیوں آخر ایسی کیا بات ہے۔ تم کیوں نہیں بتا سکتیں؟'' میں نے جرح کی۔

رضیہ نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ ایک بار پھر اس کے آنسو چھلکے۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو کانپتے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی اور یکا یک ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆.....☆

رضیہ نے اس وقت مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتی تھی کہ بات ہی ایسی تھی لیکن دوسرے دن ساری بات خود بخود مجھ پر آشکارا ہوگئی۔ شام ہو رہی تھی جب میں گھر آیا۔ آنگن طے کر کے میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ یکا یک ٹھٹک کر رک گیا۔ کانوں میں اماں کی آواز آئی تھی۔ آواز سے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ تجسس نے خود بخود قدموں کو راہ دکھائی۔ اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن کھڑکی کا ایک پٹ تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ میں نے احتیاط سے اندر جھانکا۔ سب سے پہلی نظر اماں پر پڑی۔ وہ اپنے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ چہرے پر غصے اور برہمی کے آثار تھے۔ ان کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر رضیہ کھڑی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور دوپٹا گردن میں پھانسی کے پھندے کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ چونکہ اس کی پیٹھ میری طرف تھی اس لیے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اس سے کچھ دور عاصم بھائی کھڑے تھے، سٹپٹائے ہوئے۔ ان کا چہرہ ستا ہوا نظر آرہا تھا۔ پھیکا اور بے روح البتہ ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی کیفیت نظر آئی جسے کوئی معنی دینا میرے لیے مشکل تھا۔ شاید وہ کچھ پریشان تھے اور شاید کچھ رنجیدہ اور فکرمند بھی۔ وہ کبھی اماں کو دیکھتے تھے اور کبھی ان کی نظر رضیہ کے چہرے پر بھٹکتی تھی۔ کمرے کی فضا بے حد بوجھل تھی۔ اتنا تناؤ تھا کہ میں اسے چھو کر محسوس کرسکتا تھا مگر یہ تناؤ اور بوجھل پن کس لیے تھا۔ اماں اتنی غصے میں کیوں ہیں۔ ابھی میں صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ معاً اماں کی آواز کمرے میں گونجی۔

''ارے کم بخت! چپ کیوں ہے، بولتی کیوں نہیں؟''

رضیہ چپ رہی۔

اماں نے پھر کہا۔ ''ارے جنم جلی، کچھ تو بول! کیسے ہوا یہ سب کچھ؟''

رضیہ نے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔

اماں بھی خاموش رہیں اور چند لمحے پر طیش نظروں سے رضیہ کو دیکھتی رہیں۔ پھر آبدیدہ ہو کر بولیں۔ ''کلیجے سے لگا کر پالا تھا تجھے۔ کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ تو اس عمر میں مجھے اس طرح رسوا کرے گی۔ تو تو ایسی نہیں تھی۔ بڑا ناز تھا مجھے تجھ پر۔ ہمیشہ اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہا تھا تجھے۔ پھر تو نے ایسی گری ہوئی حرکت کیوں کی۔ کچھ تو سوچا ہوتا کہ اگر دنیا کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا۔ کیسی تھو تھو ہوگی۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے اور بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی۔ اب تو ہی بتا میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟ کیسے اس ذلت سے بچوں۔ کچھ تو بول کم بخت!''

رضیہ نے پھر بھی لب نہیں کھولے۔

اماں نے پھر کہا۔ ''چپ رہنے سے کیا ہوگا۔ کیا بدنامی سے بچ سکیں گے ہم لوگ۔ ارے کچھ تو بول! کہاں منہ کالا کیا ہے۔''

دفعتاً عاصم بھائی نے کہا۔ ''اماں! ذرا دھیرج سے کام لیں۔ بے چاری بہت پریشان ہے۔ میں..... میں بعد میں اسے سمجھاؤں گا۔''

''ارے بیٹا! کیا دھیرج سے کام لوں۔'' اماں کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ ''ابھی تو خیر کوئی کچھ نہیں جانتا لیکن کب تک؟ ایک دن تو سب ہی کو علم ہو جائے گا۔ تب کیا ہوگا۔ کہیں منہ

دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ یا اللہ بڑھاپے میں یہ کیسا دن دیکھنا پڑا ہے مجھے۔'' اماں نے روہانسی آواز میں بات ختم کی۔

''تو ٹھیک ہے اماں!'' عاصم بھائی نے کہا۔ ''بڑی رسوائی ہوگی لیکن کچھ سوچیں گے۔ کوئی نہ کوئی صورت نکالیں گے۔ آپ ذرا حوصلہ رکھیں اور صبر سے کام لیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بیٹا!'' اماں نے بے حد رنج کے عالم میں کہا۔ ''لیکن یہ کم بخت بولتی کیوں نہیں۔ جنم جلی اگر اس آدمی کا نام بتادے تو ہم اسی کے ساتھ اس کی شادی کردیں گے لیکن یہ کچھ بولے تو سہی۔''

میں نے یکا یک محسوس کیا کہ میرا دل بیٹھ رہا ہے۔ سینے کے اندر گھٹن ہورہی ہے۔ شدید گھٹن ہورہی ہے۔ میں نے غیر ارادی طور پر زور زور سے کئی سانسیں لیں پھر وحشت بھری نظروں سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جو کانپ رہے تھے۔ پھر میں نے پاؤں اٹھایا لیکن یہ آسان نہ تھا۔ پیروں میں منوں وزنی غیر مرئی زنجیریں پڑی تھیں۔ ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھانا حد درجہ دشوار امر تھا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اپنے کانپتے قدموں سے اپنا وزنی جسم گھسیٹا اور چپ چاپ گھر سے باہر نکل گیا۔

اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔

سارے گھر میں موت کا سا سکوت طاری تھا۔ اماں اپنے کمرے میں تھیں۔ رضیہ بھی اپنے کمرے میں تھی اور مجھے یقین تھا کہ رو رہی ہوگی۔ عاصم بھائی بھی اپنے کمرے میں تھے۔ گزشتہ رات بھابی کے پیچھے پیچھے وہ بھی ان کے گھر گئے تھے اور نصف رات کے بعد بے نیل ومرام واپس آئے تھے۔ بھابی نے ان کی بات سننے اور ماننے سے صاف انکار کردیا تھا۔ دونوں کے درمیان جھگڑے کا سبب کیا تھا، اس سے ہنوز میں ناواقف تھا۔ رضیہ نے کچھ بتانے سے صاف انکار کردیا تھا اور عاصم بھائی سے میرا سامنا ہی نہیں ہوا تھا کہ ان سے رنجش کی بابت کچھ معلوم کرسکتا۔

میں نے شاید دسویں سگریٹ سلگائی اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ بارش ہورہی تھی۔ سارے گھر میں ایک المناک خاموشی مسلط تھی۔ میں کھڑکی کی چوکھٹ پر گرتی بارش کی بوندوں کو دیکھتا رہا اور ہلکے ہلکے کش لیتا رہا۔ ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔ تصویریں بن رہی تھیں اور مٹ رہی تھیں۔ رضیہ کا غم اور خوف سے مرجھایا ہوا چہرہ، گالوں پر خشک آنسوؤں کے نشانات، بکھرے پریشان بال اور اس کے کانپتے ہونٹ جن سے کوئی آواز نہیں نکلتی ہے۔ وہ ہونٹ کسی سوال کا جواب نہیں دیتے ہیں۔ گویا بولنے کی سکت ہی کھو بیٹھے ہوں مگر اس کے ہونٹ کانپتے تو ہیں۔ شاید کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کیا کہنا چاہتے ہیں اور کیوں نہیں کہہ پاتے؟ بے کسی کا قفل کس نے ڈالا ہے اس کے ہونٹوں پر؟

یکا یک بادل گرجے۔ ان کی گڑگڑاہٹ اتنی بلند اور جگر شگاف تھی کہ لگتا تھا ساری کائنات گونج کر تھرا اٹھی ہو۔ پھر بجلی کڑکی، تڑپتی ہوئی تیز روشنی کی ایک لکیر بادلوں کے درمیان دور تک لہرائی چلی گئی۔ پھر بارش یکا یک تیز ہوگئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے بادل رو رہے ہیں، بین کررہے ہیں مگر وہ کس کے حال پر رو رہے ہیں۔ میں نے سگریٹ کا ایک کش لیا۔ کیا میرے گھر پر؟ میرے چھوٹے سے پرسکون، پرامن گھر پر آنے والی بربادی کا ماتم کررہے ہیں۔ مجھے اماں کا خیال آیا۔ انہوں نے کہا تھا۔ ابھی تو خیر کوئی کچھ نہیں جانتا لیکن کب تک؟ ایک دن تو سب ہی کو علم ہوجائے گا۔ تب کیا ہوگا؟ ہاں تب کیا ہوگا؟ میرے ابا نہایت ہی وضع دار، متین اور باصول انسان تھے۔ انہوں نے ساری زندگی صرف نیکی کمائی تھی اور میرے چھوٹے سے پرسکون، پرامن گھر کے لیے نیک نامی حاصل کی تھی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس گھر پر کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع ملا ہو مگر اب میں چشم تصور سے دیکھ سکتا تھا کہ اس چھوٹے سے پرسکون، پرامن اور نیک نام گھر پر انگلیاں اٹھ رہی ہیں۔ نگاہوں میں طعن وتشنیع کی چنگاریاں ہیں اور ہونٹوں پر تحقیر آمیز مسکراہٹ اور یہ سب کچھ صرف اس لیے ہوگا کیونکہ رضیہ ایک لغزش کی مرتکب ہوئی ہے۔ میرے ذہن میں سوالات کے بھنور بن رہے تھے۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ رضیہ کو اس گھر میں کیا کچھ نہیں ملا۔ محبت، شفقت، اپنائیت اور چاہر دیواری کا تحفظ! وہ اپنے ماں باپ کے سائے سے محروم ہوگئی تھی۔ کوئی بھی اس کا بوجھ اٹھانے پر تیار نہیں تھا لیکن ابا نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ یتیم خانے جائے۔ انہوں نے اس کی ذمے داری اپنے سر لی اور اس گھر میں لائے۔ انہوں نے اسے وہ سب کچھ دیا جو وہ اپنے بچوں کو دیتے تھے۔ اماں نے غلط تو نہیں کہا کہ اسے اس گھر میں سب سے زیادہ چاہا گیا۔ اماں نے تو اس کے لیے ڈھیر سارا جہیز بھی تیار کرلیا تھا۔ اکثر کہتی تھیں کہ وہ اپنی بیٹی کو بڑی دھوم دھام سے رخصت کریں گی لیکن اس تمام محبت اور عنایات کا صلہ رضیہ نے کیا دیا؟ ذلت اور بدنامی کا داغ! کم بخت نے ایسا قدم اٹھانے سے پہلے یہ تو سوچا ہوتا کہ اماں کے دل پر کیا گزرے گی۔ ہم لوگ تو شاید اس قیامت کو جھیل جائیں لیکن اماں تو برداشت نہیں

کرسکیں گی تو پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟

میرے ذہن میں کئی خیال گونجے۔ ذلیل، کمینی، کم ذات! لیکن یہ کیا بات ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میرا دل ایسے کسی بھی گرے ہوئے، گھناؤنے لفظ کو اس کے لیے استعمال کرنے پر آمادہ نہیں ہے حالانکہ مجھے اس سے نفرت کرنی چاہیے، شدید نفرت کرنی چاہیے۔ وہ بدذات اور کم ظرف نہ ہوتی تو ایسی کریہہ حرکت کیوں کرتی لیکن عجیب بات ہے، بڑی عجیب بات ہے۔ نا قابلِ تو جیہہ اور نا قابل فہم کہ میرے دل میں کوئی نفرت نہیں ہے۔ کوئی غصہ نہیں ہے بلکہ ایک بے نام ہمدردی سی محسوس ہوتی ہے۔ معصوم اور بے قصور نظر آتی ہے وہ، آخر کیوں؟ مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ گناہگار ہونے کے باوجود وہ گناہگار نہیں ہے۔

میں نے گھوم کر کمرے میں نظر ڈالی۔ پتا نہیں کیوں ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی کمرے میں ہے حالانکہ کمرے میں اندھیرا تھا اور دروازہ بھی بند تھا۔ پھر بھی مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن دھیرے دھیرے بڑھنے لگی۔ خوف کی ایک ان دیکھی لہر آئی اور میرے وجود میں سرایت کرتی چلی گئی۔ کون ہے؟ کیا واقعی کوئی ہے؟ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اطراف میں دیکھا۔ ایک ہیولا میرے سامنے موجود تھا۔ دودھ کی طرح سفید انسانی خاکہ مگر بے حد مدھم اور مبہم کہ بڑے غور سے دیکھنے پر اس کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ماتھے پر شاید پسینے کی نمی بھی ابھر آئی اور ہونٹوں سے خود بخود ایک مرتعش آواز نکلی۔

''ابا.....!''

میں نے محسوس کیا کہ ہیولے کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی پژمردہ مسکراہٹ ابھری۔ ''ہاں۔''

پتا نہیں وہ آواز واقعی ہونٹوں سے ابھری تھی یا محض میرا واہمہ تھا۔ میں چند لمحے سکتے کی حالت میں کھڑا رہا پھر ہونٹوں سے آپ ہی آپ تین الفاظ خارج ہوئے۔ ''ابا آپ ہیں؟''

''ہاں۔''

میرے جسم میں دوڑنے والی سنسناہٹ کچھ اور تیز ہوگئی۔ دہشت بھی بڑھ گئی۔ کیا واقعی وہ ابا ہیں یا میرے پراگندہ وجدان اور میرے اندر پنپنے والے اضطراب، پریشانی، بے کسی نے، کسی سہارے اور رہنمائی کی جستجو نے ان کی موجودگی کو تخلیق کیا ہے۔ میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سہما ہوا، پریشان، سمجھنے سے قاصر کہ اب کیا کروں، کیا کہوں۔ چند لمحے یونہی گومگو میں گزرے پھر ابا کی آواز سنائی دی یا میری کسی اندرونی حس نے محسوس کیا۔

''بہت پریشان ہو؟''

''ہاں ابا!'' خود بخود میرے لبوں سے نکلا۔

''ہونا بھی چاہیے۔'' مجھے ابا کی آواز محسوس ہوئی۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تاریکیاں اس گھر کی طرف بڑھ رہی ہیں آہستہ آہستہ تاکہ اس گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیں اور گھر میں داخل ہو جائیں اور وہ شمع بجھا دیں جو میں نے بڑے جتن اور لگن سے روشن کی تھی اور میں ہمیشہ ساری کھڑکیاں اور دروازے بہت احتیاط سے بند کیا کرتا تھا۔ تم لوگوں نے انہیں کھلا کیوں چھوڑ دیا؟''

''کھڑکیاں اور دروازے بند تو ہم بھی کرتے تھے ابا۔'' میں نے سرسراتی ہوئی افسردہ آواز میں کہا۔ ''پھر بھی نہ جانے کب اور کیسے بھول چوک ہوگئی۔''

میں نے دیکھا یا محسوس کیا کہ ابا کا ہیولا آہستہ آہستہ چل کر دیوار کے پاس گیا جہاں میں نے اماں کی اور ان کی فریم شدہ تصویریں لگا رکھی تھیں۔ قریب پہنچ کر وہ رک گئے اور بہت غور سے تصویروں کو دیکھنے لگے۔ پھر پلٹ کر انہوں نے میری طرف دیکھا۔

''اس تصویر کو غور سے دیکھو۔ اس میں میرے چہرے پر کتنی خوشی اور روشنی ہے اور آنکھوں میں کتنی طمانیت اور افتخار ہے نا۔''

''ہاں ابا۔''

''اور تمہاری اماں کے چہرے پر کیسا جگمگاتا نور ہے۔ اطمینان اور آسودگی اور مسرت کا نور کہ انہوں نے ایک باوقار اور بے داغ زندگی اب تک گزاری ہے اور ایک ایسا گھر بنایا ہے جس کی جانب آج تک کوئی انگلی نہیں اٹھی۔''

''ہاں ابا۔''

''تو کیا اب میرے چہرے کی روشنی بجھ جائے گی.....؟''

میں نے اپنے جسم میں ایک شدید، جسم و جان کو بے جان کر دینے والی سنسنی محسوس کی۔ ''ابا.....''

''اور کیا تمہاری اماں کی جانب اب اس عمر میں انگلیاں اٹھیں گی؟''

''نہیں..... نہیں ابا!'' میں نے گھبرا کر کہا۔ ''ہرگز نہیں۔''

ابا نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ''وہ چھوٹی سی تھی۔ ماں باپ سے محروم ہوگئی تھی۔ میں ہمدردی، انسانیت اور خدا ترسی کے

جذبے سے اسے اس گھر میں لایا تھا مگر میں نے اسے کبھی پرائی اولاد نہیں سمجھا تھا۔ اسے وہ سب کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو۔ میرے بعد اس کے تحفظ کی ذمے داری تم لوگوں پر تھی۔ پھر تم لوگوں نے دروازے اور کھڑکیاں کھلی کیسے چھوڑ دیں؟''

''ہاں ابا! کوتاہی تو شاید ہوئی۔ شاید بھول چوک میں کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی اور چور.....'' میں سٹپٹا کر چپ ہوگیا۔

''اور چور اندر گھس آیا۔'' ابا نے مسکرائے۔

میں نے پشیمانی سے ابا کی طرف دیکھا اور گردن جھکالی۔

''اب کیا کرو گے؟'' ابا نے مدھم آواز میں پوچھا۔

میں نے خوب سوچ کر احتیاط سے ایک ایک لفظ چنا۔

''ابا! ابھی آپ نے کہا تھا کہ اس گھر میں اسے وہ سب کچھ ملا جو اپنی اولاد کو ملتا ہے تو پھر کیا یہ اس کا بھی فرض نہیں تھا کہ بھول چوک میں کھلی رہ جانے والی کھڑکی وہ خود بند کرتی اور چور کو اندر آنے سے روکتی۔''

''میں تمہارے دل میں جھانک کر دیکھ سکتا ہوں۔'' ابا کی مدھم آواز محسوس ہوئی۔ ''اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اس میں اس بچی کے خلاف کوئی نفرت نہیں ہے۔ کوئی غصہ نہیں ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے ابا!''

''کیوں؟''

''پتا نہیں۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔ ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ بالکل قصوروار نہیں ہے۔ شاید کوئی ایسی بات ہے جو ہمیں نہیں معلوم ہے۔ شاید کوئی کڑی گم ہے۔''

''کوئی کڑی گم ہے؟''

''ہاں ابا! مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔''

''تو پھر اب کیا کرو گے؟'' ابا نے پوچھا۔

''وہ کھڑکی جو کھلی رہ گئی تھی اسے بند کرنے کی کوشش کروں گا۔''

اسی پل ایک بار پھر بادل زور سے گرجے۔ ایک بار پھر ساری دھرتی زور سے لرزی۔ میں نے گھبرا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مینہ کا زور یکا یک بے حد شدید ہوگیا تھا۔ بجلی آسمان پر بار بار کڑک رہی تھی اور بارش یوں ہو رہی تھی گویا آج کے بعد پھر کبھی نہ ہوگی۔ میں چند لمحے باہر گرتی بارش کو دیکھتا رہا پھر کمرے میں نظر ڈالی۔

''ابا.....!''

لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے گہری توجہ سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ابا کہاں ہیں؟ ابھی تو یہیں تھے، کہاں گئے؟ لیکن کمرے میں تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ دھندلا سا وجود ہیولا جس کی موجودگی کا احساس مجھے ہوا تھا، اب نہیں تھا۔ ابا چلے گئے تھے۔ میں خود فراموشی کے عالم میں ساکت کھڑا رہا اور دہشت بھری نظروں سے اردگرد دیکھتا رہا۔ متوحش اور شک و یقین میں الجھا ہوا۔ کیا جو کچھ میں نے دیکھا، واقعی دیکھا تھا۔ کیا سچ مچ ابا آئے تھے یا میرے پریشان ذہن کی کوئی متجسس رو تھی جس نے ان کی موجودگی کا احساس بھی پیدا کیا تھا اور ان سے گفتگو بھی کروائی تھی لیکن ذہن میں اتنی الجھن تھی کہ میرے لیے کچھ بھی سمجھنا اور طے کرنا ممکن نہ تھا۔ چند لمحے بعد میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور کھڑکی سے ٹک کر کھڑا ہوگیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور میرا ذہن ایک بار پھر خیالات میں الجھ گیا تھا۔ میں نے ابا سے کہا تھا وہ کھڑکی جو کھلی رہ گئی تھی، اسے بند کرنے کی کوشش کروں گا مگر اس کھڑکی کو تب ہی بند کرسکوں گا جب یہ علم ہو کہ وہ کھڑکی کہاں ہے اور کیسے کھلی رہ گئی تھی۔

کون ہوسکتا ہے وہ؟

میں نے ان سارے افراد کے بارے میں سوچنا شروع کیا جن سے گھریلو مراسم تھے اور جو گھر میں آتے جاتے تھے۔ رشتے دار، دو ایک پڑوسی اور دو تین ایسے افراد جن سے گھریلو تعلقات تھے۔ ذہن پر زور دینے پر پانچ چھ چہرے تصور میں ابھرے۔ کیا ان میں سے کوئی ہوسکتا ہے لیکن کسی بھی چہرے پر میرا دل نہیں جما۔ نہیں، ان میں سے کوئی بھی نہیں ہوسکتا اور رضیہ بھی ان میں سے کسی سے بے تکلف نہیں تھی۔ نہ کسی کی جانب ملتفت، ویسے بھی وہ بہت گھریلو مزاج کی لڑکی ہے۔ پڑوسیوں کے یہاں بھی کم ہی جاتی ہے تو پھر کون ہوسکتا ہے وہ؟

کیا کوئی ایسا فرد ہے جس سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں۔

لیکن اس خیال کو میرے ذہن نے فوراً مسترد کردیا۔ کوئی اجنبی، انجان فرد کیسے ہوسکتا ہے۔ رضیہ تو کہیں آتی جاتی ہی نہیں تھی تو پھر کوئی ایسا ہی فرد ہوسکتا ہے جو ہمارے اردگرد موجود ہے۔ گھر میں آتا جاتا ہے اور جس سے ہم لوگ یقیناً واقف ہوں گے مگر کون ہوسکتا ہے وہ۔ میں سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتا رہا اور سوچتا رہا۔ رضیہ آخر زبان کیوں نہیں کھولتی۔ وہ کچھ کہتی کیوں نہیں۔ اماں نے کہا تھا۔ ''یہ جنم جلی اس آدمی کا نام بتادے تو ہم اسی کے ساتھ اس کی شادی کردیں گے لیکن یہ کچھ بولے تو سہی۔'' اس آدمی کا نام..... اماں کو اس آدمی کا نام چاہیے۔ ہاں، یہ ایک صورت ہے۔ گو

ناپسند یدہ ہے۔ اس پر عمل کرنے سے کسی کو دلی مسرت حاصل نہیں ہوگی۔ اماں کے سارے ارمان دھرے کے دھرے رہ جائیں گے مگر رسوائی کو ٹالنے کا بہر حال ایک جواز بن جائے گا۔ جھوٹی ہی سہی، دل کو تھوڑی تسلی بھی مل جائے گی مگر یہ تب ہی ممکن ہے جب وہ زبان کھولے اور اس آدمی کا نام بتائے۔

لیکن وہ زبان کیوں نہیں کھولتی۔

مجبوری؟ لیکن کیا مجبوری ہوسکتی ہے؟ کوئی نہ کوئی ایسی بات تو ضرور ہے جس نے اس کی زبان پر تالا ڈال رکھا ہے۔

میرے تصور میں کمرے کا پورا منظر ابھرا۔ اماں پلنگ پر بیٹھی ہیں۔ چہرے پر دکھ اور برہمی کے آثار ہیں۔ ان کے سامنے چند قدم دور رضیہ کھڑی ہے۔ بال کھلے ہوئے، دوپٹا پھانسی کے پھندے کی طرح گلے میں لپٹا ہوا، گردن جھکی ہوئی۔ اس سے کچھ دور عاصم بھائی کھڑے ہیں۔ ان کا چہرہ ستا ہوا نظر آرہا ہے۔ پھیکا اور بے روح اور اس پر رنج اور پریشانی کے ساتھ ساتھ تفکر کا عکس بھی ہے۔ پھر ان کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

''اماں! دھیرج سے کام لیں۔ بے چاری بہت پریشان ہے۔ میں اسے بعد میں سمجھاؤں گا۔''

چہرے کی طرح ان کی آواز میں بھی رنج اور فکر کا عنصر ہے اور..... اور..... مگر نہیں، ٹھہرو، ان کے چہرے پر صرف فکر اور پریشانی ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے۔ کیا ہے؟ ہاں ان کے چہرے پر ڈر ہے اور یہ ڈر ان کی آواز میں بھی موجود ہے۔ کس بات کا ڈر ہے انہیں اور کس بات کا خوف ہے رضیہ کو؟ میں سوچتا رہا اور میرے جسم میں سنسناہٹ بڑھتی گئی۔ کیا واقعی؟ کہیں یہی بات تو نہیں۔ کڑی سے کڑی ملے تو زنجیر بنتی ہے۔ بھائی اور عاصم بھائی کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا۔ بھابی اپنے گھر چلی گئیں اور اب عاصم بھائی خوفزدہ ہیں۔ کیا یہی وہ گمشدہ کڑی ہے؟

میں چپ چاپ کھڑا رہا اور میرا دل ہولے ہولے کانپتا رہا۔

☆.....☆

اگلے دن میں نے عاصم بھائی کو پکڑ لیا۔

وہ دفتر سے آئے تھے اور کپڑے تبدیل کر کے جوتے پہن رہے تھے، جب میں نے کمرے میں قدم رکھا۔ مجھے دیکھ کر پھیکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آئی، بولے۔ ''کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے مدھم آواز میں کہا۔

پھر میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے پر بدستور فکر و پریشانی کے آثار تھے۔ آنکھوں سے تھکاوٹ اور بے آرامی کا اظہار ہو رہا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ شاید گزشتہ دو تین راتوں سے وہ بے خواب رہے ہیں جو غالباً ذہنی اضطراب و تردد کا نتیجہ ہوسکتا تھا لیکن ان کی پریشانی کا سبب کیا ہوسکتا ہے؟ میں چند لمحے ان کا جائزہ لیتا رہا۔ انہوں نے تسمے باندھے پھر میری طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے۔ کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

میں نے ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔ ''بھابی کی طرف جا رہے ہیں؟''

انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہاں یار، خواہ مخواہ ناراض ہوگئی ہیں۔''

''ان کی ناراضگی کا سبب کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے وہ کچھ ہیں، بس یونہی خواہ مخواہ.....'' انہوں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تم تو جانتے ہی ہو۔ ان کا مزاج ہی ایسا ہے۔''

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ تحمل سے کام لوں اور مناسب و موزوں الفاظ استعمال کروں۔ جانتا تھا ان سے اعتراف کرانا آسان نہیں ہوگا۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد میں نے نرم آواز میں کہا۔

''گھر میں اس وقت عجیب صورت ہے۔ تناؤ ہے۔ پریشانی ہے۔ بھابی اپنے گھر چلی گئی ہیں۔ رضیہ تین دن سے اپنے کمرے سے نہیں نکلی اور اماں بھی بہت پریشان دکھائی دیتی ہیں۔''

''ہاں یار، اس گھر پر نہ جانے کس کا سایہ پڑ گیا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا تمہیں کچھ نہیں معلوم ہے؟''

''جانتا ہوں۔'' میں نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کل میں نے آپ لوگوں کی باتیں سن لی تھیں۔''

''اچھا تو تمہیں علم ہو چکا ہے۔'' عاصم بھائی چونک کر بولے۔ چند لمحے مجھے غور سے دیکھتے رہے پھر اضافہ کیا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔ بڑا پریشان کن مسئلہ ہے۔ اماں بہت پریشان ہیں اور ان کی پریشانی بجا ہے۔ ابھی تک تو یہ معاملہ چھپا ہوا ہے لیکن کب تک؟ ایک دن تو ساری بات کھل جائے گی تب کیا ہوگا۔ سوچو کیسی رسوائی ہوگی۔ اماں تو شاید برداشت ہی نہ کرسکیں۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''رضیہ کے اوپر بھی ترس آتا ہے۔''

''ہاں، ترس کھانے کی تو بات ہی ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

عاصم بھائی نے چونک کر مجھے دیکھا مگر کچھ بولے نہیں۔
میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''اور وہ زبان کھولنے پر بھی آمادہ نہیں ہے۔''
''ہاں۔'' انہوں نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی۔
''آپ کے خیال میں اس کی خاموشی کا سبب کیا ہوسکتا ہے؟'' میں نے ٹٹولنے والی نظروں سے انہیں دیکھا۔
''کیا کہہ سکتا ہوں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''
''ہوسکتا ہے وہ کسی کو بچانے کی کوشش کررہی ہو۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔
وہ زور سے چونکے اور تجسس آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگے پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر پست آواز میں بولے۔ ''میں سمجھا نہیں۔ بھلا ایسا کون ہوسکتا ہے جسے بچانے کی کوشش وہ کررہی ہو۔''
میں چند لمحے چپ رہا پھر یکا یک میں نے کہا۔ ''ابا نے کہا تھا کہ کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی جو چور کے اندر آنے کا ذریعہ بنی۔ میں خود بھی یہی سمجھتا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ کھڑکیاں، دروازے سب احتیاط سے بند تھے اور چور اندر ہی موجود تھا۔ ہے نا.....''
''کیا فضول باتیں کررہے ہو یار!'' انہوں نے جھلا کر کہا۔ ''ابا نے کہا تھا۔ کھڑکیاں، دروازے، یہ سب کیا ہے۔''
میں نے سنی اَن سنی کی۔ ''اور بے چاری رضیہ بھی کیا کرے۔ کیسے زبان کھولے۔ وہ غالباً چور سے ڈرتی نہیں لیکن اماں کو صدمہ نہیں پہنچانا چاہتی لہٰذا خاموش ہے۔''
''یہ تم گھما پھرا کر کیوں بات کررہے ہو۔ صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟'' انہوں نے چڑ کر کہا۔
''بات تو کچھ ایسی زیادہ پیچیدہ نہیں اور غالباً آپ سمجھ بھی رہے ہیں۔ وہ چور کون ہوسکتا ہے جسے رضیہ بچانے کی کوشش کررہی ہے۔''
''میں کیا جانوں۔ کون ہے وہ، اتنے لوگ آتے جاتے ہیں اس گھر میں اور.....'' وہ اچانک جھٹکے سے رکے۔ گھور کر مجھے دیکھا پھر درشت لہجے میں بولے۔ ''اے ٹھہرو! کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟''
''آپ سمجھ رہے ہیں۔'' میری آواز بے حد سرد تھی۔
ان کی آنکھوں میں دفعتاً برہمی کی چمک نظر آئی۔ ''کہیں تمہارا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ چور.....'' وہ جملہ پورا کیے بغیر ہی رک گئے۔
''ہاں۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا اور پلک جھپکائے بغیر انہیں گھورتا رہا۔
''بکواس ہے یہ۔'' وہ ایک دم طیش میں آگئے۔ ''ایسی بے ہودہ بات سوچنے کی تمہیں ہمت کیسے ہوئی۔ شرم نہیں آتی۔ میں..... میں تمہارا بڑا بھائی ہوں اور تم ایسی گھناؤنی تہمت مجھ پر لگا رہے ہو۔ ہوش میں تو ہو تم.....''
''میں بالکل ہوش میں ہوں۔'' میں نے ان کے غصے کی پروا کیے بغیر کہا۔ ''یہ معاملہ بہت گمبھیر ہے۔ گھر کی عزت اور سکون اور مستقبل داؤ پر لگے ہیں اور ایک ایسی لڑکی کی زندگی بھی جسے اس گھر نے پناہ دی تھی۔ چنانچہ میں نے اس پر بہت غور کیا ہے۔ ابھی آپ نے کہا تھا کہ اتنے لوگ اس گھر میں آتے جاتے ہیں۔ میں نے بھی بالکل یہی بات سوچی تھی مگر آنے جانے والوں میں سے ایک بھی ایسا نظر نہیں آتا جس پر شک کیا جاسکے۔''
''تو پھر اس سے یہ کہاں پتا چلتا ہے کہ جو بے ہودہ شک تم مجھ پر کررہے ہو، اس میں کچھ جان ہے۔'' وہ بدستور طیش میں تھے۔
''بھابی سے کس بات پر جھگڑا ہوا ہے اور وہ کیوں اپنے گھر چلی گئی ہیں؟'' میں نے اچانک سوال کیا۔
''میں نے بتایا تو ہے کہ جھگڑے کا سبب ایک معمولی سی بات ہے۔''
''لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' میں نے جرح کی۔
''بھابی سے آپ کا جھگڑا ہوا۔ بھابی اپنے گھر چلی گئیں۔ رضیہ اپنی زبان کھولنے پر آمادہ نہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ خوفزدہ ہیں۔ یہ خوف آپ کے چہرے پر موجود ہے۔ کس بات سے خوفزدہ ہیں آپ؟''
عاصم بھائی زیادہ دیر مزاحمت نہیں کرسکے۔ ان کے چہرے سے برہمی کے آثار دھیرے دھیرے رخصت ہوگئے۔ چند منٹ پہلے جو آدمی مجھے طیش میں بھرا ہوا نظر آرہا تھا، یکا یک بے حد ٹوٹا ہوا دکھائی دینے لگا۔ انہوں نے بڑی بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر زبان پھیری اور شاید کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکے۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں پشیمانی ہے اور لاچاری بھی۔
کچھ دیر گہری، پُرعذاب خاموشی میں گزرے پھر میں نے آہستہ سے کہا۔
''کیا بھابی کو اس بات کا علم ہوگیا ہے؟''
''نہیں۔'' ان کے ہونٹوں سے نیم مردہ آواز نکلی۔
''تو پھر لڑائی کس بات پر ہوئی ہے؟''
''اسے صرف شک ہے۔'' انہوں نے پست اور شکست

خوردہ آواز میں جواب دیا۔ ''میں نے بہت کوشش کی لیکن تم تو جانتے ہی ہو وہ کتنی شکی مزاج ہے۔ کسی صورت ماننے پر آمادہ نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟''

میں کچھ دیر چپ رہا اور ان کی جھکی ہوئی گردن کو دیکھتا رہا پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن یہ سب ہوا کیسے تھا؟''

وہ یکلخت زور سے چونکے۔ دہشت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا پھر گردن جھکالی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ ان کے اندر اس سوال کا جواب دینے کا یارا نہیں ہے مگر خاموش رہتے بھی کیسے۔ خاموشی ہزار بلاؤں کو بھلے ہی ٹالتی ہو مگر یہ بلا خاموشی سے ٹلنے والی نہیں تھی۔ چنانچہ کچھ دیر بعد انہوں نے پژمردہ آواز میں کہا۔ ''بس یار کیا کہوں۔ ایک کمزور لمحے کا شاخسانہ ہے یہ۔ ایک لمحہ ہماری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس ایک لمحے کی اہمیت اور طاقت کا جب ہمیں ادراک ہوتا ہے تو اکثر بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو ہر آدمی کے اندر ایک شیطان ہوتا ہے اور اس شیطان پر قابو پانا ہی آدمیت کی معراج ہوتی ہے اور وہ بھی ایسا ہی ایک لمحہ تھا جب میرے اندر کا شیطان مجھ پر حاوی ہو گیا اور مجھے احساس تک نہ ہو سکا۔'' وہ رکے، لمحہ بھر سوچتے رہے پھر بولے۔ ''تم تو جانتے ہی ہو میں چوری چھپے کبھی کبھار تھوڑی سی پی لیتا ہوں۔ اس رات جب میں گھر آیا تھا تو تھوڑا سا نشے میں تھا اور گھر میں اتفاق سے رضیہ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اماں اور تم کہیں گئے ہوئے تھے۔ رضیہ کھانے کے بارے میں پوچھنے کے لیے میرے کمرے میں آئی۔ اس نے زرد رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور بس..... وہ ایک لمحہ..... اور اب ساری زندگی کا داغ، پشیمانی اور احساسِ گناہ.....'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گئے۔

''رضیہ نے مزاحمت تو ضرور کی ہوگی؟'' میں نے پست آواز میں پوچھا۔

''بہت زیادہ۔''

میں نے تحمل سے پوچھا۔ ''اور یہ غالباً شادی سے قبل کی بات ہے۔''

انہوں نے احساسِ جرم سے بوجھل نظروں سے مجھے دیکھا اور گردن کو آہستہ سے جنبش دی۔

میں نے یکایک زور سے سانس لے کر اندر کی گھٹن نکالنے کی ناکام کوشش کی پھر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دور تک ساکت اور ویران آسمان پھیلا ہوا تھا اور سارے میں ایک عجیب سی بوجھل افسردگی طاری تھی۔ میری نظریں خلا کے ویرانے میں بھٹکتی رہیں اور ذہن میں ایک لفظ گونجتا رہا۔

لمحہ..... عاصم بھائی نے کہا تھا۔ ''ایک لمحہ ہماری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہاں ایک لمحہ..... وقت لمحات کا مجموعہ ہے۔ لمحے گزرتے رہتے ہیں۔ غیر اہم اور ہمیں ان کی اہمیت کا کبھی کوئی احساس نہیں ہوتا لیکن ان ہی بے وقعت اور بے بضاعت لمحوں کے بیچ ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جو بہت غیر معمولی ہوتا ہے۔ اس ایک لمحے نے کیا کچھ کیا ہے اس دنیا میں۔ آدمی ایک لمحے میں ارادہ اور فیصلہ کرتا ہے اور ایک جان بچانے کی جستجو میں اپنی جان دے دیتا ہے۔ اس ایک لمحے میں جب آدمی اپنے آپ میں نہیں ہوتا، یکایک خنجر اٹھاتا ہے اور کسی کی جان لے لیتا ہے۔ سارے بڑے فیصلے جنہوں نے تاریخ کا دھارا بدل دیا، آدمی نے اس ایک لمحے کے زیر اثر کیے ہیں اور ایسا ہی ایک لمحہ عاصم بھائی کی زندگی میں بھی آیا تھا جب انہوں نے ایک ایسے فعل کا ارتکاب کیا تھا جس کے بارے میں شاید عام حالات میں وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اس ایک لمحے کو پہچاننا اور شیطان پر قابو پانا ہی آدمیت کی معراج ہے لیکن عاصم بھائی اس ایک لمحے کو فتح نہیں کر سکے تھے بلکہ خود ہار گئے تھے۔

کچھ دیر بعد میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ''صرف ایک لمحہ اور ایک معصوم کی زندگی برباد ہو گئی۔''

عاصم بھائی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گردن جھکائے فرش کو گھورتے رہے۔

قدرے توقف کے بعد میں نے پھر کہا۔ ''تو اب کیا ہوگا؟''

انہوں نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا اور بدقت تمام ان کے ہونٹوں سے صرف چند لفظ نکلے۔ ''میں نہیں جانتا۔ میں تو بہت پریشان ہو گیا ہوں۔''

''فرض کیجیے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ بات بھابی کو معلوم ہو جائے یعنی کوئی شک وشبہ ان کے ذہن میں باقی نہ رہے تو؟''

انہوں نے یکایک گھبرا کر مجھے دیکھا۔ ''نہیں..... نہیں یار، ایسا مت کہو۔ غزالہ کو ہرگز ہرگز معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔ تم جانتے ہو اس کے والد بہت بڑے آدمی ہیں۔ بڑے رسوخ ہیں ان کے اور تم ان کی فطرت سے بھی شاید واقف ہو گے۔ جس سے برہم ہو جائیں اسے کبھی معاف نہیں کرتے۔ وہ..... وہ مجھے..... ہم سب کو برباد کر دیں گے۔'' وہ پل بھر کے لیے رکے پھر بے حد شکستہ آواز میں بولے۔ ''اور پھر یہ بھی ہے کہ میں اپنے بچے سے

محروم نہیں ہونا چاہتا۔''

''کیا؟'' میں بھونچکا ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگا۔

''ہاں، غزالہ امید سے ہے۔'' ان کی مری ہوئی آواز بہ مشکل میرے کانوں تک پہنچی۔

بھابی امید سے ہیں۔ یہ انتہائی مسرت انگیز اطلاع تھی اور ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے دل میں خوشی کی ایک لہر ابھرتی محسوس بھی ہوئی لیکن دوسرے پل وہ لہر ڈوب گئی۔ برسوں سے اس گھر میں سناٹا ہے۔ کسی ننھے سے بچے کی کلکاریاں کسی نے نہیں سنیں۔ ننھے ننھے گلابی پیروں کو صحن اور آنگن میں بھاگتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ اب ایک ننھا سا خوبصورت، معصوم فرشتہ آئے گا تو یہ گھر..... برسوں سے خاموشی اور اداسی میں ڈوبا ہوا یہ گھر یکا یک جی اٹھے گا۔ میں جانتا ہوں اور کسی کو ہو نہ ہو، اماں کو اس معصوم فرشتے کا بہت بے قراری سے انتظار ہے لیکن عاصم بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر ان کی اس ایک لمحے کی بھول کا علم بھابی کو ہو جائے تو نتائج بہت تلخ اور اذیت ناک ہوں گے۔ میں ان کے والد کو جانتا ہوں۔ دولت مند ہیں۔ بارسوخ ہیں لیکن ان کے بارے میں یہ بھی سنا گیا ہے کہ بہت تنگ دل ہیں۔ کسی سے رنجش باندھ لیں تو اسے کبھی معاف نہیں کرتے۔ اس کے خلاف ہر وہ کارروائی کر گزرتے ہیں جو ان کے اختیار میں ہوتی ہے۔ عاصم بھائی کا خوف بے بنیاد نہیں۔ وہ ہم سب کو بہت زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ایسے حالات پیدا کر سکتے ہیں کہ ہمارے لیے اس شہر میں رہنا مشکل ہو جائے۔ رہ گئیں بھابی تو وہ بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتی ہیں۔ وہ طلاق لینے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کریں گی۔ پھر کیا ہوگا؟ یہ گھر کلکاریوں کی موسیقی ریز ترنم سے محروم ہی رہ جائے گا اور پھر اماں کا کیا ہوگا۔ وہ تو جیتے جی ہی مر جائیں گی۔

لیکن ایک ننھا فرشتہ رضیہ کے بطن میں بھی تو پل رہا ہے۔ اس کا کیا ہوگا؟

کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ ''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔'' میری آواز میں خوف کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ ''لیکن اس سے یہ پورا مسئلہ تو اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے۔'' عاصم بھائی نے پژمردہ نظروں سے مجھے دیکھا مگر چپ رہے۔

قدرے توقف کے بعد میں نے پھر کہا۔ ''فرض کیجیے آپ بھابی کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور وہ واپس آ جاتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ پھر رضیہ کا کیا ہوگا؟''

عاصم بھائی نے یکا یک میری طرف لجاجت سے دیکھا۔ ''اسی سوال پر میں غور کرتا رہا ہوں۔ صرف ایک ہی صورت نظر آتی ہے۔ ہم کسی طرح رضیہ کو راضی کر لیں گے۔ پھر کسی کو کچھ دے دلا کر اس سے رضیہ کی شادی کر دیں گے اور اسے کہیں دور بھیج دیں گے تاکہ کسی کو علم نہ ہونے پائے اور..... اور ہماری عزت بچ جائے۔''

میرے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ ''عزت ..... ہماری عزت تو اسی دن خاک میں مل گئی تھی جب آپ نے یہ بھول کی تھی۔''

''یار، اب اور شرمندہ نہ کرو مجھے۔'' انہوں نے بڑی عاجزی سے کہا۔

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس چپ چاپ عاصم بھائی کو دیکھتا رہا۔ اس سے یہ شخص جو میرے سامنے بیٹھا تھا اور میرا بڑا بھائی تھا، مجھے بے حد حقیر، چھوٹا اور کمینہ نظر آیا۔ ساتھ ہی بے حد کم ظرف اور بے ضمیر بھی۔ اسے اپنے بچے کی فکر تھی۔ وہ اس سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن دوسری طرف اسے اپنے اس بچے کی مطلق پروا نہیں تھی جسے رضیہ جنم دینے والی تھی۔ اس نے کتنے کمینے پن سے کہہ دیا تھا کہ رضیہ کی شادی کچھ رقم دے دلا کر کسی شخص سے کر دیں گے اور اسے کہیں دور بھیج دیں گے۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ پھر اس بچے کا کیا ہوگا۔ وہ بھی اسی گھر کا چراغ ہے۔ اسی خاندان کا تسلسل ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اتنی بے مہری، بے حسی اور سنگدلی کے ساتھ اپنے ہی وجود کے ایک جز سے منحرف ہو جائے۔ میرے اندرون میں ایک لاوا پک رہا تھا۔ غصے اور نفرت کا لاوا۔ دل میں بار بار خواہش ابھر رہی تھی مگر میں نے اس خواہش کو دبا دیا۔ غصے کو دبا رہنے دیا۔ عاصم بھائی سے کچھ کہنا، اس بچے کے بارے میں کوئی سوال کرنا بیکار ہی ہوتا۔ مجھے یقین تھا وہ جواب میں کوئی فضول سی، بے ہودہ تاویل پیش کریں گے جو مجھے اور بھی آزردہ کر دے گی۔

میرے ذہن میں ابھی بھی کئی الجھنیں تھیں۔ کئی سوال تھے لیکن میں نے انہیں ٹال دیا۔ جانتا تھا کہ عاصم بھائی کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہوگا۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ ''خیر آپ جائیے۔ بھابی کو سمجھانے کی کوشش کیجیے۔ رہ گیا یہ مسئلہ تو اس پر بعد میں بات کریں گے۔''

''ویسے تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟'' انہوں نے ذرا عاجزی کے ساتھ مگر امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کس بارے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی رضیہ کی شادی کہیں اور کرنے کے بارے میں۔''

میں تلخی سے مسکرایا۔ ''تجویز بری نہیں مگر یہ اتنا آسان

نہیں۔ کئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اماں اور رضیہ کو راضی کرنا، بھائی کو سمجھانا یہ مشکل مرحلے ہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ ایسا آدمی ہم کہاں سے لائیں گے جو رضیہ سے شادی پر رضامند ہوجائے۔''

''ہم کوشش کریں گے تو ضرور ایسا آدمی مل جائے گا۔ کوئی غریب، اکیلا اور.....''

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ''ابھی آپ جایئے۔ اس پر بعد میں بات کریں گے۔''

عاصم بھائی چلے گئے۔ میں شکستہ قدموں سے کمرے سے باہر آیا اور آنگن کے وسط میں رک گیا۔ اداس، گم صم اور پریشان۔ عاصم بھائی نے کہا تھا۔ ''ہم کچھ رقم دے دلا کر اس سے رضیہ کی شادی کردیں گے اور اسے دور کہیں بھیج دیں گے۔ بے شک ایسا آدمی مل سکتا تھا۔ غریب، اکیلا، بھلے ہی زیادہ عمر کا ہو۔ وہ رقم کے لالچ میں ضرور رضیہ سے شادی کرلے گا لیکن کیا یہ مسئلے کا حل ہے، نہیں۔ یہ مسئلے کا حل نہیں۔ اصل سوال بھابی غزالہ کے ذہن سے اس شک کو کھرچنے اور نکال پھینکنے کا ہے کہ رضیہ کی اس حالت کے ذمے دار عاصم بھائی نہیں ہیں۔ رضیہ کی شادی کہیں اور کردینے سے ان کے اس شک کا ازالہ تو نہیں ہوگا تو پھر کیا کیا جائے۔ میری نظریں گھر کے در و دیوار پر بھٹکتی رہیں۔ ہر طرف ویرانی تھی، اداسی تھی اور بے کیفی تھی۔ ایسا لگتا تھا گھر کا چپہ چپہ افسردہ ہے، سہما ہوا ہے۔ خدایا! کیسے ہوگا اور کب ہوگا۔ کب وہ گھڑی آئے گی کہ اس گھر کے در و دیوار ایک بار پھر جگمگا اٹھیں گے اور خوشی صحن و آنگن میں بکھر جائے گی۔ کب اور کیسے؟

میں نے اماں کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا اور اندر داخل ہوا۔ اماں جاء نماز پر بیٹھی تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور وہ دعا مانگنے میں مصروف تھیں۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کیا دعا مانگ رہی ہوں گی۔ میں چپ چاپ انتظار کرتا رہا۔ دعا ختم کرنے کے بعد انہوں نے میری طرف دیکھا اور ہولے سے مسکرائیں۔

''کیا بات ہے چندا؟''

'اماں، مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''آؤ بیٹھو!'' انہوں نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔

☆.....☆

جب میں گھر سے نکلا تو سورج مغرب میں جھک گیا تھا اور سہ پہر کی دھوپ ماند پڑ رہی تھی۔ زرد اور پھیکی! میں شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا۔ اداسی کی چادر لپیٹے ہوئے، گمشدہ، اپنے آپ سے بے خبر۔ میرے ارد گرد لوگ چل پھر رہے تھے مگر وہ سب چپ تھے اور اپنے اپنے دکھوں کی چادریں اوڑھے ہوئے تھے اور سارا شہر بھی چپ تھا اور افسردہ تھا۔ سڑکیں، گلیاں، پھول، پودے، ہر شے شام کے پچھتاوے اور زیاں کے غلاف میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکوں میں دل کے ٹوٹنے کی صدائیں تھیں۔ بھٹکتا بھٹکتا میں پارک میں جا پہنچا جہاں بے شمار پھول کھلے تھے مگر سب کے سب مرجھائے ہوئے تھے اور سہ پہر کے آخری لمحات کے دھندلکے میں ان پر بجھتے ہوئے چراغوں کا گماں ہوتا تھا اور ان کی مہک مرچکی تھی۔ میں باغ سے نکلا تو دریا کے کنارے جا پہنچا اور ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ سامنے دریا تھا جو یوں چپکے چپکے بہہ رہا تھا جیسے اسے علم نہ ہو کہ کہاں سے آیا ہے اور اسے کہاں جانا ہے۔ شام کا دھندلکا چپکے چپکے آسمان سے اتر رہا تھا اور چاروں اور پھیل رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی اور ایک تھکا ہوا سکوت جو دل میں اور روح میں بے ثباتی اور بے سہارے پن کا احساس پیدا کررہا تھا۔ سامنے بہت دور جہاں آسمان دھرتی سے گلے ملتا ہے، سورج ڈوبنے کے بعد کی روشنی دم توڑ رہی تھی اور اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ پھیل رہا تھا..... پھیلتا ہی جارہا تھا۔

خدایا! تیری یہ دنیا.....

☆.....☆

شام کا دھندلکا اب پوری طرح معدوم ہوچکا ہے۔ آسمان کے مغربی کنارے پر پھیلی سرخی اندھیرے میں گم ہوچکی ہے اور اب مغربی اُفق پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک گہری تاریکی محیط ہے۔ شالیمار کے عقبی باغیچے میں بھی اندھیرا پوری طرح اتر آیا ہے اور بلبلوں کا وہ جوڑا ابھی اڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ شاید اپنے آشیانے میں۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ کہ ان کے پاس ایک آشیانہ ہے اور ایک دوسرے کی چاہت اور رفاقت بھی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر سوچتا ہوں اور کافی کی پیالی میں نظر ڈالتا ہوں مگر کافی ختم ہوچکی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ رمضان کو بلا کر ایک کافی کی درخواست اور کروں۔ یہ کافی جو رمضان بناتا ہے، مجھے بہت پسند ہے چنانچہ ایک کپ اور پی لوں تو کیا حرج ہے کیونکہ آج کے بعد تو پھر یہ کافی مجھے نصیب نہیں ہوگی مگر میں ارادہ بدل دیتا ہوں۔ رمضان کو مزید زحمت دینا مناسب نہیں۔

میں ایک سگریٹ سلگاتا ہوں۔ ایک نظر پائیں باغ کے اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے پیڑوں پر ڈالتا ہوں اور پھر دریچے سے اندر دیکھتا ہوں جہاں رونق کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ کچھ اور لوگ آگئے ہیں لیکن ابھی برجیس نہیں آئی ہے،

تاہم میں جانتا ہوں کہ وہ آئے گی ضرور اور جب وہ آئے گی اور اسے میرے بارے میں بتایا جائے گا تو یہ عجلت عقبی برآمدے میں آئے گی اور میں اس لمحے کا..... قیامت کے اس لمحے کا سامنا کروں گا جس کا میں انتظار کر رہا ہوں اور جب میں اپنی پہلی اور آخری تمنا کے قتل کا سامان کروں گا۔

میرا دل دھیرے دھیرے بے ترتیب انداز میں دھڑکتا ہے۔ جسم کے اندر رگ و ریشے میں سنسناہٹ سی ہوتی ہے۔ میں دروازے کی طرف دیکھتا ہوں۔ ابھی کچھ دیر میں برجیس اس دروازے سے برآمدے میں داخل ہوگی۔ میں جانتا ہوں وہ بہت برہم ہوگی۔ اس کے پاس شکایات اور سوالات کا دفتر ہوگا۔ میں کہاں تھا؟ تین ماہ تک کہاں غائب رہا؟ اسے اطلاع کیوں نہیں دی۔ وہ یہ بھی بتائے گی کہ وہ میرے گھر بھی گئی تھی مگر وہاں بھی اسے کچھ نہیں بتایا گیا اور یہ کہ وہ بہت پریشان تھی۔ میں مسکرا کر ان تمام سوالات کو سنوں گا مگر اس درد کو چھپائے رکھوں گا جو اس مسکراہٹ میں شامل ہوگا۔ پھر میں اسے اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھاؤں گا اور اس سے بے حد خلوص اور پشیمانی کے ساتھ معافی مانگوں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں اتنی اچھی اداکاری کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا کہ وہ میرے اندر، دل میں اور روح میں جلتے ہوئے زخموں کو نہ دیکھ سکے۔ پھر میں اسے بتاؤں گا کہ وہ میرے لیے کتنی انمول ہے۔ وہ بالکل ویسی ہی ہے جس کے بارے میں کہہ سکیں کہ..... ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے..... اور یہ کہ وہ میری پہلی اور آخری تمنا ہے۔ میں نے اسے اس طرح چاہا ہے کہ اب شاید زندگی میں کسی اور کو نہیں چاہ سکوں گا لیکن اس کے باوجود میں اس کی زندگی سے دور جانے پر مجبور ہوں اور یہ مجبوری خود اختیار کردہ ہے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ ہم دونوں خزاں اور بہار کے موسموں کی طرح ہیں جو صدیوں سے گردش میں ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ وہ میری مجبوری کو مان لے گی کیونکہ وہ بہت سمجھ دار ہے اور فراخ دل بھی۔ وہ معاف کر دینے کے ہنر سے بہ خوبی آگاہ ہے۔

لیکن میں اسے اپنی زندگی کے اس دوسرے لمحے کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا جب میں نے اماں کے کمرے میں قدم رکھا تھا اور ان سے گفتگو کی تھی اور میری زندگی کا ایک نیا رخ متعین ہو گیا تھا۔ اماں نے میری بات پر یقین کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا، تاہم میری تجویز کے سامنے انہیں بہرحال سپر انداز ہونا پڑا تھا کہ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سیلاب کے آگے بند باندھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ سب کچھ خس و خاشاک کی مانند بہہ جاتا ہے اور میں نے یہ بند یوں باندھا تھا کہ فوراً ہی رضیہ کو لے کر ایک ہل اسٹیشن پر چلا گیا تھا جہاں میں نے ایک کاٹیج کرائے پر حاصل کیا۔ ایک مجرّبہ کارنرس کی خدمات حاصل کیں جس نے دن رات رضیہ کی دیکھ بھال کی۔ ڈھائی ماہ گزرے پھر رضیہ نے ایک ننھے سے گل گوتھنے سے بچے کو جنم دیا جو اتنا پیارا ہے کہ لگتا ہے کوئی ننھا سا فرشتہ آسمان سے اتر کر دھرتی پر آ گیا ہے۔ ننھے منے معصوم بچے فرشتے ہی ہوتے ہیں۔ وہ صرف خوشیاں لاتے ہیں اور زندگی کا اعتبار اور کچھ بھی نہیں۔

تاہم میں ان سب باتوں کا ذکر برجیس سے نہیں کروں گا۔ کچھ غم، کچھ زخم اور کچھ درد ایسے ہوتے ہیں جن کی تشہیر نہیں کی جاتی۔ ان میں کسی کو شریک بھی نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ بہت ذاتی ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی ذات کے نہاں خانوں میں چھپا کر رکھا جاتا ہے اور ان کی حفاظت کی جاتی ہے اس طرح کہ وہ متاعِ زندگی بن جاتے ہیں۔ میں بھی برجیس کو اپنے اس درد میں شامل نہیں کروں گا اور نہ ہی اس راز میں اسے یا کسی اور کو بھی شریک کروں گا جس سے رضیہ اور عاصم بھائی کے سوا اور کوئی واقف نہیں، حتیٰ کہ اماں اور بھابی غزالہ بھی لاعلم ہیں۔ صرف ہم تین اس راز سے آگاہ ہیں کہ بھائی کا گناہ میں نے اپنے سر لے لیا ہے۔ وہ کھڑکی جو کھلی رہ گئی تھی اسے بند کرنے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔

لیکن اگر ان سب باتوں کا ذکر نہیں کروں گا تو پھر کیا کہوں گا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ میں ایک معصوم سا، بے ضرر سا جھوٹ بولوں گا۔ میں برجیس کو بتاؤں گا کہ اماں اور ابا کی دیرینہ خواہش کے احترام میں، میں رضیہ سے شادی کر رہا ہوں اور یہ کہ شادی کے بعد میں نے گاؤں میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ وہاں میری ضرورت ہے۔ آنے والے دنوں میں میرا شہر میں آنا جانا تو ہوگا مگر شالیمار میں پھر کبھی شاید قدم نہیں رکھوں گا اور برجیس سے بھی شاید پھر کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں سے اسے بہت زیادہ دکھ پہنچے گا، تاہم میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انجام کار وہ مجھے معاف کر دے گی۔

میں ایک اور سگریٹ جلاتا ہوں اور دریچے سے اندر لاؤنج میں دیکھتا ہوں اور ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہوں۔

جانے ابھی اس جان لیوا انتظار کے اور کتنے صبر آزما لمحات باقی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

(جادوگروں کے بعد قارون)

ضیاء تسنیم بلگرامی

فرعون دربار میں تو حضرت موسیٰؑ کے سامنے بے بس ہوگیا کیونکہ ایک پیغمبر جن دلائل کے ساتھ فرعون سے ہمکلام تھا اس سے فرعون محروم تھا۔ ذرا ڈیڑھ سال قبل مسیح کا تصور کریں جب انسان خداوند کہلوانے والے بادشاہ کے سامنے مجبور اور بے بس تھے اور لوگ اس بادشاہ کی آنکھ بند کرکے عبادت کرتے تھے۔ اس کے سامنے حضرت موسیٰؑ کا ان دیکھے رب العالمین کا نام لینا اور فرعون کو بھرے دربار میں جھٹلا دینا انتہائی خطرناک بات تھی۔ حضرت موسیٰؑ کو ایک حیرت انگیز عصا مل چکا تھا، اس عصا نے فرعون اور اس کے درباریوں کو خوفزدہ کردیا تھا۔ اور فرعون کو یہ وہم ہوگیا کہ حضرت موسیٰؑ جادوگر ہیں۔ اس دور میں جادوگری عام تھی اور مصر اس کے لیے بہت مشہور تھا۔ خوفزدہ فرعون نے پورے ملک سے چار ہزار جادوگر حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں جمع کردیے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح حضرت موسیٰؑ بے بس ہوجائیں گے اور فرعون اپنے درباریوں اور رعایا کے سامنے سرخرو ہوجائے گا۔ ان جادوگروں نے ایک خاص دن پہلے تو حضرت موسیٰؑ کو سمجھایا کہ وہ ان نسلی جادوگروں کا مقابلہ نہ کریں کیونکہ حضرت موسیٰؑ کا جادو ان جادوگروں کے مقابلے میں ناکام رہے گا۔ جواب میں حضرت موسیٰؑ نے جادوگروں کو سمجھایا کہ وہ جادوگر نہیں ہیں بلکہ رب العالمین نے ان کو نبوت اور رسالت بخشی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ لوگ اسی رب العالمین کی عبادت کریں اور فرعون کی خدائی سے انکار کردیں۔ اس وقت چار ہزار جادوگر، فرعون، اس کے درباری اور ہزاروں شہریوں کا ہجوم ایک طرف تھا اور حضرت موسیٰؑ اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کے ساتھ رب العالمین پر ایمان رکھے ہوئے دوسری طرف تھے۔ مقابلے کا نتیجہ جادوگروں کے خلاف نکلا اور وہ سب حضرت موسیٰؑ کی نبوت اور رسالت پر ایمان لے آئے۔ یہ صبح کافر تھے لیکن بعد میں یہی کافر شہید کہلائے۔ عہدِ حضرت موسیٰؑ کا یہ مشہور ترین دلچسپ واقعہ اس طرح لکھا گیا ہے کہ آپ بھی خود کو اسی ماحول میں محسوس کریں گے۔ جادوگروں کے بعد قارون نمودار ہوتا ہے۔

خدا پرستوں اور ملحدوں کے مابین مناقشے کی ایمان افروز روداد

جادوگر ابھی تک حضرت موسیٰ کو بھی ساحر سمجھ رہے تھے اور ان دونوں بھائیوں کو اپنے جادو کے ذریعے زیر کرنے آئے تھے۔

اس موقع پر بھی حضرت موسیٰ نے جادوگروں، فرعون، اس کے درباریوں اور جملہ حاضرین کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا ''اے لوگو! تمہاری حالت پر سخت افسوس ہے، تم کیا کررہے ہو؟ تم ہمیں جادوگر کہتے ہو تو خدا کے لیے، ہمیں جادوگر کہہ کر خدا پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ۔ اگر تم اپنے اس عقیدے پر قائم رہے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں خدا اس بہتان طرازی کی سزا میں عذاب دے کر تم کو جڑ سے اکھاڑ نہ پھینک دے۔ اے لوگو! یاد رکھو کہ جس کسی نے بھی بہتان باندھا وہ نامراد رہا۔''

حضرت موسیٰ کی اس چھوٹی سی تقریر نے سننے والوں میں ہلچل پیدا کردی اور ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں۔

جادوگروں نے فرعون کی طرف دیکھا، وہ بہت مطمئن نظر آرہا تھا۔

کئی جادوگر حضرت موسیٰ کے قریب گئے اور کہا ''اے موسیٰ! لوگ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں، اس پر دھیان دیے بغیر ہمیں یہ بتاؤ کہ تم نے یہ جادو کہاں سے سیکھا ہے۔''

حضرت موسیٰ نے جادوگروں کو یقین دلایا کہ ''ہم جادوگر نہیں ہیں بلکہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے نبی اور رسول ہیں۔ تم لوگ البتہ جادوگر ہو اور یاد رکھو کہ تم کتنے ہی بڑے جادوگر کیوں نہ ہو، ہمارے مقابلے میں تم کامیاب نہیں ہوسکتے۔''

نابینا جادوگر نے جادوگروں کو حکم دیا ''تم لوگ اپنا وقت نہ ضائع کرو اور ان دونوں بھائیوں کا مقابلہ کرو۔''

ایک جادوگر نے باآواز بلند اعلان کیا ''اے موسیٰ! باتوں کا سلسلہ ختم، اب مقابلے کا سلسلہ شروع ہوجانا چاہیے اور ہمیں یہ بتاؤ کہ ابتدا تمہاری طرف سے ہوگی یا ہماری جانب سے۔''

حضرت موسیٰ کو تکلیف پہنچ رہی تھی کہ ساحروں پر ان کی حق گوئی کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔

حضرت موسیٰ نے جواب دیا ''اے ساحرو! ابتدا تم ہی کرو اور اپنے کمالِ فن کی حسرت نکال لو۔''

دونوں بھائیوں نے یہ بھی دیکھا کہ ان جادوگروں کے ہاتھوں میں نہ صرف رسیوں کے ٹکڑے تھے بلکہ چمڑے کی رسی جیسی رنگین پٹیاں بھی ان کے ہاتھوں میں تھیں۔

یہ جادوگر معلوم نہیں زیرِلب کیا پڑھ رہے تھے' ان کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح کانوں میں پڑ تو رہی تھیں مگر الفاظ سمجھ نہیں آرہے تھے۔

پڑھنے کے بعد انہوں نے اپنی رسیاں حضرت موسیٰ کی طرف اچھال دیں۔ زمین پر گرتے ہی یہ رسیاں سانپ کی طرح لہراتی ہوئی زمین پر حرکت کرنے لگیں۔

دوسرے جادوگروں نے بھی یہی حرکت کی اور پورے میدان میں ہر طرف سانپ ہی سانپ نظر آنے لگے۔

جن جادوگروں کے سامنے کنکر پتھر جمع تھے' انہوں نے ان کنکروں پتھروں پر پڑھ کر پھونکا اور انہیں زمین پر بکھیرا تو وہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے حشرات الارض میں تبدیل ہوگئے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں ایک لمحے کے لیے اس منظر سے خوف زدہ ہوگئے۔ فوری طور پر حضرت موسیٰ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔ انہیں سب سے زیادہ یہ احساس پریشان کرنے لگا کہ کہیں لوگ اس مظاہرے سے اتنے متاثر نہ ہوجائیں کہ ساحروں کے سحر کو حقیقت سمجھ لیں۔

یکایک حضرت موسیٰ کو وحی کے ذریعے مطلع کیا گیا کہ ''اے موسیٰ! خوف نہ کھا۔ یہ ہمارا وعدہ ہے کہ تم دونوں بھائی غالب رہو گے کیونکہ یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو' یہ محض جادوگری ہے اور حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ فریبِ نظر ہے' جادوگر اپنے جادو کے ذریعے لوگوں کو جو کچھ دکھانا چاہتے ہیں' وہی کچھ سب کو نظر آرہا ہے' یہ فریبِ نظر ہے۔''

جادوگروں میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا کیونکہ حضرت موسیٰ کی باتوں نے ان میں سے بہتوں کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ حضرت موسیٰ جادوگروں جیسی باتیں نہیں کررہے اور نہ انہیں اپنے جادوگر ہونے کا خیال ہے۔

حضرت موسیٰ کو خدا کی طرف سے حکم دیا گیا کہ ''اے موسیٰ! تم بھی اپنی لاٹھی ان سانپوں کی طرف پھینک دو۔''

حضرت موسیٰ نے اپنی لاٹھی سانپوں اور حشرات الارض کی طرف پھینک دی اور یہ لاٹھی دیکھتے ہی دیکھتے اژدہے کی شکل اختیار کرکے ان سانپوں اور حشرات الارض کو نگلنے لگی۔

جو تماشائی حشرات الارض اور سانپوں کے خوفناک مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور یقین کررہے تھے کہ اب ان دونوں بھائیوں کا بھی یہ سانپ کام تمام کردیں گے اور جادوگر اس معرکے کو سر کرلیں گے۔

بہت کم تماشائیوں نے حضرت موسیٰ کو اپنا عصا پھینکتے ہوئے دیکھا۔ کیونکہ اس وسیع و عریض میدان میں ایک عصا کی حیثیت ہی کیا تھی لیکن جب انہوں نے ایک بہت بڑے اژدہے کو حشرات الارض اور سانپوں کو نگلتے ہوئے دیکھا تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

فرعون اور اس کے درباری بھی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

جادوگروں کا بہت برا حال تھا۔ انہوں نے اپنے جادو کو اتنا بے اثر ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ہامان نے اس موقع پر بھی اپنی شرارت برقرار رکھی اور فرعون سے کہا ''خداوند! مجھے تو موسیٰ بہت بڑا جادوگر معلوم ہوتا ہے کیونکہ موسیٰ کا جادو ہمارے جادوگروں پر حاوی آگیا۔''

فرعون نے بھی ہامان سے اتفاق کیا اور کہا ''میرا تو کچھ اور ہی خیال ہے' ہمارے جادوگر موسیٰ کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں اور موسیٰ نے جہاں سے بھی جادوگری کا یہ علم حاصل کیا ہے' وہ دنیا کا باکمال اور سب سے بڑا جادوگر ہوگا۔''

ادھر یہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اور ادھر سارے جادوگر اپنے جادوگری کے کمالات کو زائل ہوتا دیکھ رہے تھے۔ جن جادوگروں نے حضرت موسیٰ کی باتیں سننے کے بعد یہ رائے قائم کرلی تھی کہ حضرت موسیٰ کی باتوں سے انہیں وہ جادوگر نہیں لگتے تو اب ان لوگوں نے اپنے دوسرے جادوگر ساتھیوں سے کہا ''ہم نے موسیٰ کا مقابلہ کرکے غلطی کی کیونکہ موسیٰ جادوگر نہیں ہیں اور یہ بار بار اپنے رب کا نام لیتے ہیں اور اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔''

دیکھتے ہی دیکھتے تمام جادوگر حضرت موسیٰ کی نبوت اور رسالت پر ایمان لے آئے اور ان میں سے کئی سجدے میں گر گئے اور حضرت موسیٰ سے کہا ''اے موسیٰ! ہم رب العالمین پر ایمان لائے' موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔''

میدان میں یہ جو کچھ ہو رہا تھا' فرعون کو اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

ہامان نے جادوگروں کو زمین پر سربسجود دیکھا تو حیرت سے پوچھا'' ہمارے جادوگر' یہ کیا کر رہے ہیں اور کسے سجدہ کر رہے ہیں؟ موسیٰ کو یا موسیٰ کے رب کو؟''

کچھ ہی دیر بعد فرعون کو یہ خبر مل گئی کہ جادوگروں نے حضرت موسیٰ کے مقابلے سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے اور وہ حضرت موسیٰ کے رب پر ایمان لا چکے ہیں۔

تماشائیوں پر بھی جادوگروں کی شکست کا بہت برا اثر پڑا۔ وہ ابھی تک جادوگروں اور ان دونوں بھائیوں کے مقابلے کو جادوگری کا سب سے بڑا مقابلہ سمجھ رہے تھے اور ان کی سمجھ میں صرف یہ بات آئی تھی کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے جادوگروں کو شکست دے دی ہے اور جادو کے زور سے اژدہا بن جانے والی لاٹھی جادوگروں کے حشرات الارض اور سانپوں کو نگل گئی ہے۔

فرعون نے ہامان کو حکم دیا'' جادوگروں کے سرداروں کو میرے پاس لایا جائے۔''

اور ہامان نے شاہی خدام اور نقیبوں کو حکم دیا کہ'' بڑے بڑے جادوگر خداوند فرعون کی خدمت میں حاضر ہوں۔''

جادوگروں کا ایک بڑا فرعون کے سامنے حاضر ہو گیا۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون بھی یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

فرعون نے ان جادوگروں سے پوچھا'' اے جادوگرو! ہم تین سو سال سے تمہاری پرورش کر رہے ہیں ہمارا یہ خیال تھا کہ تم جادوگری کے علم میں طاق ہو اور تمہارا کوئی ثانی نہیں لیکن مدین سے آیا ہوا موسیٰ تم سب پر غالب آ گیا تو اب تم سب ہمیں یہ بتاؤ کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور موسیٰ کی معمولی لاٹھی تمہارے جادو پر کیوں غالب آ گئی؟''

ہامان نے کہا'' خداوند! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ مدین میں مصر سے زیادہ بڑے بڑے اور ماہر جادوگر موجود ہیں اور موسیٰ نے انہی سے جادوگری کا علم حاصل کیا ہے کہ ان کی صرف لاٹھی تمام جادوگروں کے سحر پر غالب آ گئی۔''

ایک جادوگر نے نہایت دلیری سے اقرار کیا'' اے فرعون اور ہامان! تم دونوں نہیں تو جادوگر کہہ سکتے ہو مگر موسیٰ کو جادوگر نہ کہو' یہ جادوگر نہیں' اللہ کے نبی اور رسول ہیں اسی لیے ہمارا جادو ان کے مقابلے میں ناکام رہا۔ ان کی باتیں بھی جادوگروں جیسی نہیں ہیں۔''

فرعون کے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا' کہا'' یہ موسیٰ تم سب کا استاد معلوم ہوتا ہے اور تم نے اسی سے جادو سیکھا ہے۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ تمہیں واقعی شکست ہو گئی ہے۔ تم سب نے میرے خلاف سازش کی ہے اور چاہتے ہو کہ مصریوں کو بے دخل کر کے ان غیر ملکیوں کو ہم پر مسلط کر دو لیکن جب تک مصر میں' میں موجود ہوں تم لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔''

جو جادوگر حضرت موسیٰ کی باتوں پر ایمان لے آئے تھے۔ ان کے دلوں سے خوف نکل چکا تھا اور وہ اس وقت مصریوں کے خداوند فرعون سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھے۔ ان سب نے بیک آواز کہا'' اے فرعون! تو جو چاہے کہے مگر تیرے شبہات اور تیری قیاس آرائی کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ موسیٰ ہمارے استاد ہیں اور نہ ہی ہم نے ان سے کوئی جادو سیکھا ہے۔ ہم نے موسیٰ کی باتیں سننے کے بعد مقابلے سے پہلے ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ موسیٰ جادوگروں جیسی باتیں نہیں کرتے۔ یہ تو ایک خدا پر ایمان لانے کی تلقین کر رہے تھے جو اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اب ہم اپنی شکست کے بعد موسیٰ کی نبوت و رسالت اور خدا کے ایک ہونے پر ایمان لائے۔''

فرعون غصے سے تھر تھر کانپنے لگا اور اس نے منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے کہا'' اے ساحرو! یہ آج تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو' کیا تم اپنے آباؤ اجداد کا دین چھوڑ دو گے' تم سب موسیٰ کی باتوں میں آ گئے اور اس پر ایمان لے آئے لیکن یاد رکھو' میں تم کو اس کی اجازت نہیں دوں گا۔''

جادوگروں نے کہا'' اے فرعون! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہم تجھ سے اجازت لے کر موسیٰ کی نبوت و رسالت اور رب العالمین پر ایمان لائیں گے؟ سن لے کہ ہم نے تیرا دین چھوڑ دیا اور اب ہم سب موسیٰ کے دین کو اختیار کر چکے ہیں اور ہمیں نہیں معلوم کہ تو ہمیں اس کی کیا سزا دے گا؟''

فرعون نے کہا'' اگر تمہیں ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ تمہیں تمہاری اس بغاوت اور اس سرکشی کی کیا سزا دی جائے گی تو سن لو' میں تم سب کے ہاتھ پاؤں کٹوا دوں گا اور تمہیں کھجور کے درخت پر مصلوب کر دیا جائے گا۔''

جادوگروں نے کہا'' اے فرعون! ہم تیری طرح اشتعال میں نہیں آئیں گے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تجھے ہم سب سے دشمنی نہیں ہے اور تجھے ہماری یہ بات گراں گزری ہے کہ ہم اپنے رب کی آیتوں پر ایمان لے آئے ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ جن آیاتِ

بینات نے ہمیں ربّ العالمین پر ایمان لانے پر مجبور کیا' ان کا تجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا؟ تو ہمیں دھمکی دیتا ہے کہ تو ہمارے ہاتھ پاؤں کٹوا کر کھجور کے تنے پر مصلوب کر دے گا' ہم کسی سزا سے بھی نہیں ڈرتے اور تو غور سے سن لے کہ جس ہستی نے ہم سب کو بنایا ہے' تجھ کو اس پر ہرگز ترجیح نہ دیں گے۔ تو ہمارے خلاف جو فیصلہ بھی کرنا چاہے' کر دے۔ ہم ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہیں کیونکہ تیرا اختیار اس دنیا کی زندگی پر ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ خدا ہماری خطائیں معاف کر دے گا کیونکہ اس ملک مصر میں ایمان لانے والوں میں ہم اوّل ہیں۔''

فرعون بالکل بے بس ہو چکا تھا کیونکہ جادوگر اس کے رعب میں نہیں آ رہے تھے اور جن لوگوں میں کچھ دیر پہلے تک فرعون سے آنکھیں ملانے تک کی ہمت نہیں تھی' اس وقت وہ فرعون سے دو بدو دلیری سے باتیں کر رہے تھے اور فرعون کی کسی بھی دھمکی سے خوف زدہ نہیں تھے۔

درباریوں پر فرعون کی مکالمہ بازی الٹا اثر کر رہی تھی۔ وہ ابھی تک یہی امید لگائے ہوئے تھے کہ بالآخر فرعون تنگ آ کر ان سب کو قتل کروا دے گا اور اگر جادوگروں کو کسی وجہ سے معاف بھی کر دیا گیا تو ان دونوں بھائیوں کو معاف نہیں کیا جائے گا۔

لیکن اب فرعون حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے الجھنے کے بجائے صرف جادوگروں سے مخاطب تھا اور انہیں مسلسل دھمکیاں دے رہا تھا کہ شاید وہ اس طرح اس کے ڈر سے حضرت موسیٰؑ پر ایمان نہ لائیں اور تائب ہو کر فرعون کے قدموں میں بیٹھ جائیں۔

ہامان نے کافی دیر انتظار کیا کہ ان کا خدا فرعون حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے کس قسم کا جابرانہ سلوک کرتا ہے مگر اس وقت تو فرعون کو جادوگروں کے علاوہ کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ شاید وہ جادوگروں سے اس لیے بھی خوف زدہ تھا کہ کہیں یہ جادوگر خود فرعون اور اس کے درباریوں کے خلاف کارروائی نہ شروع کر دیں۔

ہامان نے فرعون سے پوچھا'' اے خداوند! یہ آپ نے موسیٰ اور ہارون کو یکسر کیوں نظر انداز کر دیا ہے؟ کیونکہ یہاں جو فتنہ نظر آ رہا ہے' وہ انہی دونوں بھائیوں کا پھیلایا ہوا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کو اسی وقت قتل کروا دیں تو یہ موسیٰؑ کی نبوت اور رسالت اور ایک ربّ العالمین پر ایمان لانے والے جادوگر بھی سہم کر اپنے آباؤ اجداد کے دین میں واپس آ جائیں گے۔''

فرعون نے ہامان کو ڈانٹ دیا'' تو بالکل ناقص العقل ہے' تو نے موسیٰ کے جادو کو نہیں دیکھا کہ اس نے ہمارے سارے جادوگروں کو شکست دے دی ہے۔ اب اگر میں ان دونوں کے خلاف اپنے جلاد کو حکم دوں گا کہ وہ انہیں قتل کر دیں تو کیا میرے معمولی جلاد' موسیٰ کے جادو کا مقابلہ کر لیں گے؟ وہ انہیں قطعی قتل نہیں کر سکیں گے اور یہ جو تو پورے شہر کو اپنے سامنے جمع دیکھ رہا ہے' یہ سب پہلے ہی موسیٰ کی جادوگری کے قائل ہو چکے ہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ جادوگروں کی طرح موسیٰ کی نبوت و رسالت اور اس کے ربّ العالمین پر ایمان لے آئیں گے۔ میں اپنے جلادکو ناکام ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ موسیٰ بلاشبہ دنیا کا بہت بڑا جادوگر ہے اور اس کے جادو سے ہمیں بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

رخِ نسوا ابھی تک بالکل خاموش تھا لیکن اپنے خداوند فرعون کی بے بسی اس کو بھی حیرت زدہ کیے ہوئے تھی چنانچہ اس نے کہا ''اے خداوند! اگر موسیٰ بہت بڑا جادوگر ہے اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا جلاد بھی ان دونوں بھائیوں کو قتل نہیں کر سکتا تو ان شہری تماشائیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے جادوگروں کو ہی کوئی ایسی سزا دیں جس کا اثر آپ کے ان شہری تماشائیوں پر خوشگوار پڑے اور آپ کی خداوندی بھی ان کے دل و دماغ میں موجود رہے۔''

لیکن حضرت موسیٰؑ کے عصا نے جادوگری کے میدان میں اژدہا بن کر جو کارنامہ دکھا دیا تھا' اس کی ہیبت سب ہی پر طاری تھی۔ پورا میدان حشرات الارض اور سانپوں سے خالی ہو چکا تھا۔ فرعون کی اس عبرت ناک شکست سے وہاں موجود لوگوں کا یہ شبہ یقین میں بدل رہا تھا کہ فرعون ان کا خدا نہیں ہے اور حضرت موسیٰؑ کا خدا ان سب پر غالب آ چکا ہے۔

جن لوگوں نے فرعون اور جادوگروں کے مکالمات سن لیے تھے انہوں نے یہ مکالمات دوسروں تک پہنچا دیے اور تماشائیوں میں بے چینی پھیل گئی۔

ہامان تماشائیوں کے احساسات کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے انتہائی زور دے کر فرعون سے کہا'' اے خداوند! یہ بہت ہی نازک وقت ہے' آپ ان دونوں بھائیوں اور جادوگروں کے خلاف کوئی ایسا اہم فیصلہ کریں کہ شہری ان دونوں بھائیوں کے دین کی طرف راغب نہ ہوں۔''

لیکن فرعون حقیقتاً حضرت موسیٰؑ سے ڈر گیا تھا۔ وہ دونوں بھائیوں کے خلاف کوئی فیصلہ سناتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔

ہامان کو یہ فکر لاحق ہوگئی تھی کہ اگر اس وقت فرعون نے شہر بھر کے تماشائیوں کے سامنے اپنے بھرپور غیظ وغضب کا مظاہرہ نہ کیا تو جادوگروں کی طرح بہت سے شہری بھی حضرت موسیٰ کی نبوت ورسالت اور ان کے ربّ العالمین پر ایمان لے آئیں گے۔ اسی لیے ہامان کے خیال کے مطابق پہلے تو جادوگروں کو قابو میں لانے کی پوری کوشش کی جائے اور جب یہ جادوگر اپنے آبا واجداد کے دین میں واپس آجائیں تو اس کے بعد ان دونوں بھائیوں سے نمٹا جائے۔ چنانچہ ہامان نے فرعون کو سمجھایا ''خداوند! آپ ان معاملات میں عجلت سے کام نہ لیں اور کوشش کریں کہ جادوگر اپنا فیصلہ بدل دیں آپ انہیں دوبارہ دھمکیاں دیں' شاید دھمکیوں سے کام چل جائے۔''

فرعون نے ہامان کے مشورے کو مان لیا اور اس نے جادوگروں کے بڑوں کو اپنے سامنے کھڑا کر کے گفتگو شروع کردی اور ان سے کہا ''اے میرے ملک اور قوم کے بڑے بڑے ساحرو! تم نے میری اجازت کے بغیر موسیٰ کی نبوت ورسالت اور ان کے ربّ العالمین پر ایمان لا کر میری خداوندی کی تحقیر کی ہے۔ میں تمہیں ایک بار پھر سمجھاتا ہوں کہ تم اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کرو اور مجھے سچ سچ بتادو کہ کیا موسیٰ جادوگری میں تم سب کا استاد ہے؟ اور کیا تم لوگ موسیٰ کی اس خواہش کو پورا کرنا چاہتے ہو کہ مجھ سے حکومت چھین کر موسیٰ کے حوالے کردی جائے اور تمام مصری بنی اسرائیلیوں کے غلام بنادیے جائیں؟''

جادوگروں نے انتہائی مختصر جواب دیا ''موسیٰ جادوگر نہیں ہیں کہ ہم ان کی جادوگری میں شاگرد کہلائیں' یہ نبی اور رسول ہیں اور ان کا ربّ العالمین واقعی تمام جہانوں کا رب ہے۔''

فرعون کے غیظ وغضب میں اضافہ ہوا اور اس نے کہا ''کیا تم جانتے ہو کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو' تمہیں اس کی کیا سزا دی جائے گی؟''

جادوگروں نے جواب دیا ''تو سزا کا اعلان کر چکا ہے لیکن ہم اس سزا سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہیں۔''

فرعون نے اپنی سزا کی تفصیل دوبارہ بیان کردی ''میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوادوں گا اور کھجور کے تنوں پر سولی چڑھوادوں گا۔ اس وقت تم کو معلوم ہوگا کہ موسیٰ کے ربّ العالمین کے عذاب کے مقابلے میں میرا عذاب زیادہ سخت اور باقی رہنے والا ہوگا۔''

جادوگر اس دھمکی سے بھی ذرا خوف زدہ نہ ہوئے اور فرعون کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر جواب دیا ''ہم تیرا عذاب برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کوئی حرج نہیں' تو ہمیں کھجور کے تنوں پر سولی پر چڑھوادے۔ اس طرح ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے اور ہمیں امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے پچھلے گناہ معاف کردے گا کیونکہ ہم یہاں موجود لوگوں کے مقابلے میں اوّل ایمان لانے والے لوگ ہیں۔''

ہامان نے ان جادوگروں کو بہت سمجھایا اور جب یہ کسی طرح قائل نہ ہوئے تو ہامان نے پوچھا ''اے ساحرو! اب تم سچ سچ یہ بتاؤ کہ موسیٰ کی کن باتوں نے تم سب کو اتنا متاثر کرلیا ہے کہ تم اپنی جانیں تک قربان کردینے کو تیار ہوگئے ہو؟''

جادوگروں نے جواب دیا ''اے ہامان! اے فرعون اور اے فرعون کے مصاحبو اور ہم نشینو! ہمیں حیرت ہے کہ ہم نے موسیٰ کی تقریر اور موسیٰ کی لاٹھی میں پروردگارِ عالم کی نشانیاں دیکھ لیں اور ہم ان پر ایمان لے آئے مگر تم لوگ ابھی تک گمراہ ہو اور تم پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا؟''

فرعون نے گویا جادوگروں کی کوئی دلیل سنی ہی نہیں اور کہا ''دیکھو! مجھے اپنی خاندانی نوازشوں کا خیال آرہا ہے کہ ہم نے تم سب کی تین سو سالوں سے سرپرستی اختیار کر رکھی ہے اور تمہاری نسلوں کی پرورش کرتے رہے ہیں۔ اب اگر آج تم پر ہمارا عذاب نازل ہوگا تو اس سے مجھے اور میرے ہم نشینوں کو بھی افسوس ہوگا اس لیے اپنی ضد سے باز آجاؤ اور موسیٰ کی نبوت ورسالت اور اس کے ربّ العالمین پر ایمان لانے کے بجائے مجھے اپنا خدا مان لو تاکہ تمہیں انتہائی اذیت ناک عذاب سے بچایا جاسکے۔''

جادوگروں پر فرعون کی دھمکیاں ذرا بھی کارگر نہ ہوئیں اور وہ انتہائی مستقل مزاجی اور پُرعزیمت اور پُراستقامت لہجے میں کہنے لگے ''اے گمراہ فرعون! ہماری باتیں توجہ سے سنو' جو دلائل اور جو نشانیاں ہمارے پاس آگئی ہیں' ان پر اور جس نے ہمیں پیدا کیا ہے' اس پر ہم تجھ کو ہرگز ترجیح نہ دیں گے۔ اب تجھے اختیار ہے کہ تجھ کو جو بھی حکم دینا ہو' دے دے کیونکہ ہمیں اپنی ایمانی سوجھ بوجھ سے معلوم ہوچکا ہے کہ تو ہمیں جو سزا دے گا اس کا تعلق اس دنیا کی زندگی سے ہوگا۔ ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے ہیں تاکہ وہ ہمارے پچھلے گناہوں کو معاف کردے تو نے ہم سب سے جادو کروایا' ہمیں اس پر بھی بے حد شرمندگی ہے۔''

فرعون کے غیظ وغضب میں انتہائی اضافہ ہوگیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے اپنے ساحروں سے جو باتیں ہو رہی تھیں اور ساحروں نے جو بے باکانہ لہجہ اور رویہ اختیار کر رکھا تھا' اس کا اثر اس کے مصاحبین اور شہریوں پر پڑ رہا تھا۔

میری تین سو سالہ نوازشوں کا احسان ہے اور مجھے رہ رہ کر تمہارے آبا و اجداد یاد آ رہے ہیں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میں ایمان داری سے یہ سمجھ رہا ہوں کہ موسیٰ تم سب سے بڑا جادوگر ہے اس نے اسے تمہاری جادوئی قوتیں اور صلاحیتیں اپنے غیر معمولی جادو کے زور سے سلب کر لی ہیں اور میں تمہیں موسیٰ کے مقابلے میں بے بس اور مجبور دیکھ رہا ہوں۔ اس لیے تمہاری اسی بے بسی اور مجبوری کے پیش نظر میں تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں۔ تم سب یا تم میں سے وہ لوگ جو توبہ کر کے میری پناہ میں آنا چاہیں وہ فوراً آ جائیں' میں انہیں معاف کر دوں گا اور ان پر زیادہ مہربانیاں اور نوازشیں ہوں گی۔ مجھ پر اور میری خدائی پر ایمان لانے والوں کے لیے معافیاں بھی ہیں اور غیر معمولی نوازشیں بھی جاری کر دی جائیں گی۔''

اس کے بعد فرعون اور اس کے ہم نشینوں نے جادوگروں پر نظریں گاڑ دیں اور ان کا خیال تھا کہ اگر یہ سب فرعون کی پناہ میں نہ آئے تو ان کی اکثریت اس رعایتی اعلان سے ضرور فائدہ اٹھائے گی لیکن ان میں سے ایک بھی فرعون کے پاس نہیں گیا اور ان سارے جادوگروں کی نظریں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ پر تھیں جبکہ حضرت موسیٰ نے ان سے ابھی تک ایک بات بھی نہیں کہی تھی۔

دونوں بھائیوں کو حیرت تھی کہ اللہ نے ان جادوگروں کے دلوں میں اچانک کتنا راسخ اور مضبوط ایمان پیدا کر دیا تھا اور وہ فرعون کے عذاب سے بھی ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھے۔

ہامان اب بھی یہی چاہتا تھا کہ اگر جادوگروں کو سزا دی جائے تو ان دونوں بھائیوں کو بھی ان کے ساتھ ہی سولی پر چڑھا دیا جائے۔

فرعون نے اپنے نقیبوں سے کہا ''میرا خیال ہے کہ میری بخشش اور نوازش کے اعلان کی آوازیں سارے جادوگروں تک نہیں پہنچیں اس لیے اب ان کو شاہی نقیب اپنی بلند و بالا آوازوں سے آگاہ کر دیں کہ جو جادوگر خداوند فرعون کی پناہ میں آنا چاہیں' وہ فوراً آ جائیں' ان کو معاف کر دیا جائے گا۔''

یہ شاہی نقیب با آواز بلند فرعون کا اعلان دہراتے رہے اور فرعون' ہامان' رخ نسو اور دوسرے ہم نشین جادوگروں کی واپسی کا انتظار کرتے رہے مگر ایک بھی جادوگر فرعون کی طرف نہیں پلٹا۔

اس حیرت انگیز نتیجے نے فرعون کو اس وہم میں مبتلا کر دیا تھا کہ حضرت موسیٰ نے ان سب کو اپنے غیر معمولی جادو کے اثر میں لے رکھا ہے اور اب کوئی ایک بھی جادوگر فرعون کی پناہ میں نہیں آئے گا۔

فرعون حد درجہ مشتعل ہو چکا تھا اس نے ہامان سے کہا ''اے ہامان! اب وقت گزر گیا اس لیے اب تو جلادوں کو حکم دے کہ وہ چار ہزار جادوگروں کو کھجور کے تنوں پر سولی چڑھانے کا بندوبست کریں اور شہریوں کو بتا دیا جائے کہ جو لوگ میری خدائی کا انکار کریں گے' انہیں بھی یہی سزا دی جائے گی اور شہریوں کو یہ بھی حکم دیا جائے کہ وہ جادوگروں کو سولی پر چڑھانے کے منظر کو تماشے کی طرح دیکھیں۔''

ہامان نے اسی وقت نقیبوں کو حکم دیا کہ وہ جادوگروں سے متعلق سزا کا اعلان شہر بھر میں کروا دیں اور شاہی ڈھنڈورچی ڈھول پیٹ پیٹ کر اعلان کریں کہ بے دین جادوگروں کو کھجور کے تنوں پر سولیاں دی جائیں گی۔ تمام شہری یہ عبرت ناک منظر دیکھنے کے لیے میدان جشن کے قریب کھجور کے درختوں کے سامنے جمع ہو جائیں۔

جلادوں کو حکم دیا گیا کہ وہ چار ہزار جادوگروں کو ایک ہی دن میں سولی پر چڑھانے کا بندوبست کریں۔

اتنا غیر معمولی کام اس دن انجام نہیں دیا جا سکتا تھا اس لیے سزا کے لیے دوسرا دن مقرر کیا گیا۔

جادوگروں کو فوج کی حراست میں دے دیا گیا۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کو جادوگروں کے ایمان پر حیرت اور خوشی تھی کہ وہ ابھی تک ثابت قدم تھے اور اس بات کا دکھ بھی کہ دوسرے دن ان سب کو سولیوں پر چڑھا دیا جائے گا۔

فرعون کے کارندے اسی وقت سے کھجور کے تنوں پر ایمان لانے والے ساحروں کو سولیوں پر چڑھانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

دوسرے دن فرعون اور اس کے حاشیہ نشین کھجوروں کے تنوں کے سامنے پہنچ گئے جہاں شہریوں کا بھی بہت بڑا ہجوم تھا۔

فرعون نے ان ایمان لانے والے ساحروں سے کہا ''تم لوگوں کو ایک موقع اور دیا جا رہا ہے کہ تم اب بھی توبہ کر لو اور موسیٰ کی دعوت کو ٹھکرا دو۔''

لیکن ان ایمان قبول کرنے والوں کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ دینِ حق کو چھوڑ کر ملعون فرعون کو خدا نہیں مانیں گے اور اپنے اس

ایمان کے لیے وہ ہر سزا جھیلنے کے لیے تیار ہیں۔''

فرعون نے غصے میں جلادوں کو حکم دیا کہ وہ فرعون کی خدائی کے منکرین کے لیے جو سزا مقرر کر چکا ہے وہ سزا ان سب کو دی جائے۔

عبداللہ ابن عباس کے بقول فرعون کی طرف سے ایسے لوگوں کی سزا یہ تھی کہ ان کا داہنا ہاتھ اور بائیں ٹانگ کاٹ دی جاتی تھی اور اس کے بعد کھجور کے تنوں پر سولی دے دی جاتی تھی۔ چنانچہ جلادوں نے اپنا کام شروع کر دیا اور ایک اللہ پر ایمان لانے والوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جانے لگے۔

اس منظر نے دیکھنے والوں کو دہلا دیا اور جن لوگوں کے دلوں میں حضرت موسیٰ کی نبوت و رسالت اور ایک خدا پر ایمان لانے کا خیال جم گیا تھا' ان کا بھی خوف سے برا حال ہو گیا۔

کھجوروں کے تنوں پر انسانی خون بہہ رہا تھا اور ایمان والوں کو کھجور کے تنوں سے کھڑے ہونے کے انداز میں میخوں سے ٹھونک دیا گیا۔

فرعون اور اس کے حاشیہ نشین بہت خوش تھے کہ فرعون کی خدائی کا دبدبہ دیکھنے والوں پر طاری ہو چکا تھا اور ہامان فرعون کو خوش کرنے کے لیے شہریوں سے کہہ رہا تھا ''لوگو! دیکھو' ہم نے موسیٰ کے خدا کا عذاب تو نہیں دیکھا کہ وہ کیسا ہوگا مگر تم سب نے اپنے خدا فرعون کے عذاب کو دیکھ لیا اور یاد رکھو کہ اگر تم میں سے کسی نے خداوند فرعون کی خدائی سے انکار کیا اور موسیٰ کے خدا پر ایمان لایا تو اسے بھی یہی سزا دی جائے گی۔''

جبکہ حضرت موسیٰ لوگوں کو صبر کی تلقین فرما رہے تھے اور اسی سولیوں کے میدان میں کسی طرف سے یہ آواز گونجی ''اے لوگو! دیکھو' غور کرو کہ کل تک جو فرعون کے بے دین جادوگر کہلاتے تھے آج انہیں شہید کیا جائے گا اور یہ بلند مرتبہ ہر کسی کو نہیں ملتا۔''

ایمان والوں کی لاشیں کھجور کے تنوں سے پیوست تھیں اور فرعون نے پورے شہر کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ یہ منظر ضرور دیکھیں۔

لیکن اس بہت بڑے سانحے کے بعد بھی فرعون کے درباریوں کو چین نہیں آیا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ جس شخص کی وجہ سے اتنا بڑا خوفناک واقعہ وقوع پذیر ہوا یعنی حضرت موسیٰ تو وہ ابھی تک محفوظ اور آپ کا مدمقابل ہے اور یہ شخص اسی طرح لوگوں کو آپ کی خدائی کے خلاف ورغلاتا رہے گا اسی لیے اسے بھی سزا ملنی چاہیے۔''

لیکن فرعون پر حضرت موسیٰ کی دہشت طاری تھی اور اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے حضرت موسیٰ پر کسی قسم کی سختی کی تو حضرت موسیٰ کا کوئی جادو فرعون کو ایسا نقصان پہنچا دے گا کہ اس کی خدائی کا دبدبہ خاک میں مل جائے گا۔

فرعون نے کہا ''میں چاہتا ہوں کہ موسیٰ کو میں خود کوئی سزا نہ دوں بلکہ خود اس کی قوم کے ذریعے اسے سنگسار کروا دوں۔''

فرعون کا یہ جواب درباریوں کو پسند آیا اور ہامان نے کہا ''یہ تجویز تو بہت معقول ہے کیونکہ اگر موسیٰ کی قوم کے لوگ ہی ان کو آپ کے حکم سے سنگسار کریں گے تو موسیٰ کا جادو بھی انہی پر اثر کرے گا۔''

فرعون کے دربار میں یہ مشورت ہو رہی تھی' ان میں فرعون ہی کے خاندان کا ایک شخص ایسا بھی موجود تھا جو حضرت موسیٰ کی نبوت و رسالت اور ان کے رب العالمین پر ایمان لا چکا تھا۔ قصص الانبیاء میں اس شخص کا نام حزقیل بتایا گیا ہے' اس موحد نے فرعون کی مخالفت کی اور کہا ''تم لوگ موسیٰ کو سنگسار کیوں کرنا چاہتے ہو؟ کیونکہ موسیٰ نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے' اے فرعون! اگر تو نے موسیٰ کو سنگسار کیا یا قتل کروایا تو اس کا عذاب بھی تجھ پر نازل ہوگا' خدا کے عتاب سے ڈر۔''

فرعون نے اس سے پوچھا ''کیا تو بھی موسیٰ کو نبی اور رسول مانتا ہے اور موسیٰ کے خدا پر ایمان لا چکا ہے؟''

حزقیل نے جواب دیا ''میں تجھے اس عذاب سے آگاہ کرتا ہوں جو انہی حالات میں منکرین خدا پر اس سے پہلے نازل ہوتا رہا ہے۔ یعنی نوح کی قوم' عاد اور ثمود اور جو لوگ ان کے بعد ہوئے' مجھے ڈر ہے کہ انہی جیسا تمہارا حال بھی نہ ہو جائے۔ اے فرعون اور اس کے حاشیہ نشینو! موسیٰ (علیہ السلام) کا رب العالمین اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ آج جو تم ظلم کر رہے ہو قیامت کے دن جب تم سے اس ظلم کے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے لیکن یاد رکھو کہ اس دن تمہیں کوئی خدا کے عذاب سے بچانے والا نہ ہوگا۔''

یہ شخص فرعون کا قریبی عزیز تھا۔ وہ حزقیل کی ساری باتیں غور سے سنتا رہا۔ اس کے بعد حزقیل کا مذاق اڑایا اور اپنے درباریوں سے کہا ''لوگو! اس دنیا میں تو میں تمہارا اپنے سوا کوئی اور خدا نہیں دیکھتا۔ البتہ موسیٰ اپنے خدا کی جو صفاتِ علوی بیان کرتا

ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آسمان پر ہو تو ہو زمین پر کہیں نہیں ملے گا۔''

اس کے بعد فرعون نے ہامان سے کہا ''اے ہامان! میں نے تجھ کو پہلے بھی یہ حکم دیا تھا کہ تو میرے لیے ایک انتہائی بلند و بالا محل تعمیر کروا تاکہ میں اس کی بلندی پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو تلاش کروں۔''

ہامان کو ایک بلند و بالا عمارت یا مینارے کی تعمیر کا دوسری بار حکم دیا گیا تھا۔ اس نے اپنی مجبوری بیان کی ''اے خداوند! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، بالکل بجا۔ میں اس کی تعمیل کے لیے مستعد اور تیار ہوں مگر یہ کام کچھ دنوں یا چند مہینوں کا نہیں ہے۔ اس کی تعمیر میں کئی سال لگ جائیں گے اور جب تک یہ بلند و بالا عمارت یا مینارہ تعمیر ہوگا' اس وقت تک نہ جانے موسیٰ ہم میں موجود بھی ہوں گے یا نہیں' اس لیے بہتر تو یہی ہے کہ آپ موسیٰ کے خدا کی جستجو میں نہ پڑیں بلکہ خود موسیٰ کو اپنے عذاب میں مبتلا کر دیں۔''

اسی موقع پر ہامان نے فرعون سے ایک عجیب و غریب بات کہی ''خداوند! حزقیل کی موجودگی میں' میں آپ کو کوئی مشورہ نہیں دوں گا مگر بعد میں ایک ایسے شخص کا نام لوں گا جس کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے اور وہ موسیٰ کا رشتے دار بھی ہے' اس شخص کا بنی اسرائیل پر بہت اثر ہے تو اب آپ اسے بھی شریک مشورہ کر لیں' اس کا مشورہ اس کی قوم بھی مانے گی اور اس طرح آپ موسیٰ کے جادو سے بھی محفوظ رہیں گے۔''

یہ سن کر حزقیل دربار سے اٹھ گیا کیونکہ دربار میں حضرت موسیٰ کو سنگسار کر دینے کی باتیں ہو رہی تھیں اور یہ شخص حضرت موسیٰ کو اس خطرے سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

حزقیل سیدھا حضرت موسیٰ کے پاس پہنچا اور کہا ''اے موسیٰ! گیارہ بارہ سال پہلے میں نے آپ کو مصر سے فرار ہو جانے کا مشورہ دیا تھا اور آپ نے اس مشورے پر عمل کر کے خود کو ہلاکت سے بچا لیا تھا۔ اب آپ پر پھر ایک برا وقت آنے والا ہے۔ فرعون کے دربار میں آپ کے خلاف باتیں ہوتی رہتی ہیں اور فرعون کے حاشیہ نشین فرعون کو آپ کے خلاف مشورے دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ آج جب دربار میں آپ کو سنگسار کر دینے کی باتیں کی جا رہی تھیں تو میں نے فرعون کو منع کیا کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے ربّ العالمین کی قدرت کو جوش آ جائے اور تم سب عذاب الٰہی میں مبتلا کر دیے جاؤ تو اے موسیٰ! اس وقت ہامان نے ایک عجیب سی بات کہہ دی۔ وہ بنی اسرائیل کے کسی ایسے شخص کا ذکر کر رہا تھا جس کا آپ کی قوم پر گہرا اثر ہے۔ اب فرعون بنی اسرائیل کے اس شخص کے ذریعے آپ کے خلاف کوئی کارروائی کرے گا تاکہ اگر ان منکرینِ خدا کے عقیدے اور خیال کے مطابق آپ ان پر اپنے کسی جادو (نعوذ باللہ) کے ذریعے توڑ کریں اور انہیں نقصان پہنچائیں تو وہ توڑ اور وہ جادو آپ کی قوم کو نقصان پہنچائے۔''

حضرت موسیٰ کی پیغمبرانہ بصیرت نے بنی اسرائیل کے اس شخص کا نام معلوم کر لیا جس کا ذکر اس مردِ مومن نے کیا تھا۔ حضرت موسیٰ کے والد عمران کے ایک بھائی اظہار تھے۔ ان کا نام توریت میں مصہر بیان کیا گیا ہے' اس کا ایک بیٹا قارون تھا اور یہ شخص مذکور حضرت موسیٰ کا چچازاد بھائی قارون تھا۔ قارون انتہائی مال دار اور کنجوس ہونے کی وجہ سے اپنے رشتے داروں سے دور دور رہتا تھا اور بنی اسرائیل بھی قارون سے اس لیے خوش نہ تھے کہ یہ انتہائی بے فیض تھا اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کی تعلیمات کا اس شخص پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

قارون نے حضرت موسیٰ اور فرعون کے مقابلے کی روداد سنی تھی۔ وہ حضرت موسیٰ کو اس لائق نہیں سمجھتا تھا کہ انہیں براہِ راست سمجھائے کہ اگر مصر میں رہنا ہے تو فرعون کی خدائی کو مان لو اور اس کے مقابلے کا خیال تک دل میں نہ لاؤ۔ البتہ دوسرے بنی اسرائیلیوں کے ذریعے وہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کو سمجھا چکا تھا کہ دونوں بھائی پُرسکون رہیں۔ فرعون سے جھگڑا نہ کریں کیونکہ ان دونوں کی وجہ سے بنی اسرائیلیوں کو اور زیادہ مصیبتیں جھیلنا پڑیں گی۔

فرعون کے رشتے دار حزقیل نے جب اشارتاً قارون کا ذکر کیا تو حضرت موسیٰ نے اس کو جواب دیا ''اب ہامان بنی اسرائیلیوں میں میرے چچازاد بھائی قارون کے ذریعے انتشار اور افتراق پھیلائے گا۔'' پھر حضرت موسیٰ نے اپنے اس ہمدرد کو سمجھایا ''تم پریشان نہ ہو۔ اب فرعون میرے چچازاد بھائی قارون کی مدد سے ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرے گا مگر بزعم خود خدا ہونے کے باوجود اسے نہیں معلوم کہ قارون کو میری قوم کے لوگ بھی اچھا نہیں سمجھتے۔ خدا نے اس کو بے انتہا مال و زر سے نوازا ہے مگر میری قوم اور اللہ کی حاجت مند مخلوق قارون سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔''

اس مردِ مومن نے حضرت موسیٰ کو مشورہ دیا ''اے موسیٰ! قبل اس کے کہ ہامان قارون کو فرعون سے ملوائے اور فرعون قارون سے مل کر آپ دونوں بھائیوں کے خلاف کوئی منصوبہ بنائے' آپ دونوں بھائی اپنے چچا کے بیٹے قارون سے ملیں۔ ان کو راہِ حق پر

لائیں اور اس کو روک دیں کہ وہ ہامان کو سازشوں کا موقع نہ دے اور وہ فرعون سے بالکل نہ ملے۔''

حضرت موسیٰ نے جواب دیا ''اے شخص! اب میں تجھ کو کیا بتاؤں' میری تعلیمات تو سبھی کے لیے ہیں اور میں نے اپنی قوم کو بھی بہت سمجھایا اور جب میں نے ان سے کہا کہ میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا نبی اور رسول ہوں اور ایک ربّ العالمین کی عبادت کی تلقین کرتا ہوں تو قارون پر میری ان باتوں کا کوئی اثر اس لیے نہیں ہوا کہ میں اور میرا بھائی ہارون' ہم دونوں مال و زر کے اعتبار سے قارون کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں اور قارون ہمیں حقیر سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے باپ عمران نے زندگی بھر فرعون کی خواب گاہ کی پہرے داری کی ہے چنانچہ اب قارون ہمیں اپنا عزیز یا رشتے دار بتاتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس کرتا ہے تو اب ہم دونوں قارون کو کیا سمجھائیں گے اور اس کے دل پر ہماری باتوں کا کیا اثر ہوگا۔''

حزقیل نے اصرار کیا ''اے موسیٰ! آپ میرے کہنے سے قارون کو ایک بار پھر سمجھائیں کہ وہ فرعون کا آلۂ کار نہ بنے' میں تو اس وقت سے بہت ڈرتا ہوں جب قارون گمراہی کی حالت میں آپ کی قوم کو آپ کے خلاف درغلا رہا ہو اور آپ کی قوم بھی اس کی باتوں میں آجائے۔''

حضرت موسیٰ نے کہا ''تو کہتا ہے تو میں قارون سے مل لوں گا مگر مجھے یقین ہے کہ اس کے دل پر میری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوگا اور وہ وہی کرے گا جو فرعون اس سے کہے گا۔''

اس شخص نے کہا ''اے موسیٰ! اگر آپ اجازت دیں تو میں قارون سے ایک ملاقات کرلوں اور اس کو سمجھاؤں کہ وہ فرعون کی باتوں میں نہ آئے۔''

حضرت موسیٰ نے کہا ''میں خود بھی اس کو سمجھاؤں گا اور تو بھی سمجھا کر دیکھ لے۔''

حزقیل حضرت موسیٰ کے پاس سے اٹھ کر قارون کی طرف چلا گیا۔

بنی اسرائیلیوں کی اس مفلوک الحال نادار بستی میں قارون کا ایک عظیم الشان محل کھڑا ہوا تھا۔ یہ شخص اپنے خزانوں کو مقفل کر کے ان کی کنجیاں اونٹوں پر لاد کر حرکت میں رہتا تھا۔ چنانچہ یہ مردِ مومن جب قارون کے محل کے سامنے پہنچا تو اونٹوں کی ایک لمبی قطار قارون کے خزانوں کی کنجیوں سے لدی ہوئی محل کی طرف چلی آرہی تھی اور قارون خود اونٹ کے کجاوے میں بیٹھا سفر کر رہا تھا۔

محل میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس شخص نے اشارے سے قارون کو روکا۔

قارون نے فرعون کے اس رشتے دار کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اس لیے فوراً اترا اور نیچے آگیا اور پوچھا ''کیا بات ہے' یہ آج تم پیدل کیوں نظر آرہے ہو؟''

اس شخص نے جواب دیا ''اے قارون! اگر تیرے پاس مجھ سے باتیں کرنے کا کچھ وقت ہو تو یہیں محل سے باہر ہی ٹھہر جا۔''

قارون نے اونٹ کے کجاوے سے نیچے اترتے ہوئے پوچھا ''کیا فرعون نے مجھے اپنے دربار میں طلب کیا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا ''طلبی کا بلاوا آنے والا ہے اور میں اس سے پہلے اس لیے آگیا ہوں کہ میں تجھ کو سمجھا دوں کہ فرعون اور ہامان تجھ سے موسیٰ اور ہارون کے خلاف کوئی کام لینا چاہیں گے مگر تو وہ کام نہیں کرے گا۔''

قارون نے کہا ''اے شخص! سچ سچ بتا' کیا تو بھی موسیٰ کے خدا پر ایمان لے آیا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا ''ہاں' میں دونوں بھائیوں کی نبوت و رسالت کا اقرار کرنے کے ساتھ ہی ان کے ربّ العالمین پر بھی ایمان لے آیا ہوں۔''

قارون ہنسی آگئی' کہنے لگا ''تو تو شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور تو موسیٰ سے شاہی محل سے ہی واقف ہوگا۔ اب معلوم نہیں تو موسیٰ جیسے بے زر اور خانماں برباد شخص اور اس کے ربّ العالمین پر کیوں ایمان لے آیا اور اپنا شاہی محل میں مذاق اڑوا رہا ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ موسیٰ مدین سے جادو سیکھ کر آیا ہے تو کیا موسیٰ کا جادو تجھ پر بھی اثر کر گیا؟''

اس موحد نے نہایت تحمل سے قارون کو سمجھایا ''اے قارون! تو' تو خود بھی بنی اسرائیلی ہے اور موسیٰ و ہارون تیرے چچا کے بیٹے ہیں۔ وہ خدا کے نبی اور رسول ہیں۔ بڑے بڑے جادوگروں نے موسیٰ کو اللہ کا نبی اور رسول مان لیا اور وہ اپنے ایمان میں اتنے راسخ اور مستقل مزاج رہے کہ اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک فرعون کو اپنا خدا نہیں کہا۔ یہاں تک کہ فرعون نے ان سب کو سولی چڑھا دیا۔ ہزاروں شہریوں نے ان کے جوشِ ایمانی اور دینِ حق کی استقامت کا منظر دیکھا' جب ان کے داہنے ہاتھ اور بائیں ٹانگیں کاٹی جارہی تھیں تو وہ اس وقت بھی اپنے ربّ العالمین کی احدیت کا اقرار کر رہے تھے۔ پھر انہیں کھجور کے تنوں سے ٹکا کر ان کے جسم میں میخیں ٹھونک دی گئیں' ان کے جسموں کا خون تو پہلے ہی بہت خارج ہو چکا تھا' رہا سہا خون میخوں کے ٹھونکنے

جانے کے بعد نکل گیا اور وہ سب شہید کر دیے گئے۔ تو اے قارون! مجھے نہیں معلوم کہ تو نے بھی وہ دل دوز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا نہیں دیکھا' تو کیا یہ ساری کرشمہ سازیاں موسیٰ کے جادو کے زیر اثر تھیں؟ ہرگز نہیں' تو اے قارون! جب ان جادوگروں نے تمہارے چچا کے دونوں بیٹوں کو نبی اور رسول مان لیا تھا تو قرابت دار کی حیثیت سے تجھ کو تو ان دونوں پر سب سے پہلے ایمان لانا چاہیے تھا۔''

قارون اس مردِ مومن کی باتیں بے توجہی سے سنتا رہا اور جواب میں حقارت سے کہا ''اے شاہی خاندان کے گمراہ انسان! پورے شاہی محل اور شاہی خاندان میں کیا صرف تو ہی عقل مند ہے کہ تو نے تو ان دونوں بھائیوں کو پہچان لیا اور باقی موسیٰ اور ہارون کی نبوت و رسالت اور ان کے ربّ العالمین کے منکر ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ تجھ پر بھی موسیٰ کا جادو اثر کر گیا۔ کیا خداوند فرعون کو تیری اس گمراہی کا علم نہیں ہے کہ اس نے تجھے موسیٰ کے دین کی تبلیغ کے لیے آزاد اور زندہ چھوڑ رکھا ہے؟''

اس مردِ مومن نے فرعون کی اور شاہی قوانین کی تعریف کرتے ہوئے کہا ''شاہی قوانین اور آداب کے مطابق مجھے فرعون کے سامنے آزادی سے بولنے کا حق حاصل ہے۔ وہ مجھے حق بات کہنے سے روک سکتا ہے اور نہ ہی مجھے سزا دے سکتا ہے۔''

قارون کو محل کے باہر کھڑے کھڑے باتیں کرنے میں اپنی بے عزتی محسوس ہوئی' پوچھا ''اے شخص! تجھ کو جو کچھ کہنا تھا' کہہ چکا یا ابھی کچھ باقی ہے۔''

مردِ مومن نے جواب دیا ''ہاں' ابھی کچھ باقی ہے۔''

قارون نے کہا ''تو اسے بھی جلدی جلدی کہہ ڈال کیونکہ میرے کنجی بردار اونٹ بھی اس وقت تک محل کے باہر ہی کھڑے رہیں گے جب تک میں خود اندر نہیں جاؤں گا۔''

مردِ حق نے کہا ''فرعون' ہامان' رخ نسو اور دیگر فرعونی حاشیہ نشینوں میں مشورے ہو رہے تھے۔ وہ سب موسیٰ اور ہارون کو تیری قوم ہی کے ذریعے سنگسار کروانے کے حق میں ہیں اور تو بنی اسرائیلیوں میں سب سے زیادہ دولت مند اور ذی وقار ہے۔ اس لیے یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ تجھے بھی فرعون کے درباریوں میں شامل کر لیا جائے اور موسیٰ و ہارون کے سلسلے میں تجھ سے بھی پوچھا جائے کہ ان دونوں کے خلاف کیا سلوک کیا جائے۔''

قارون نے بے جھجک کہہ دیا ''جب فرعون موسیٰ و ہارون کو میری قوم کے ذریعے سنگسار کروا دینا چاہتا ہے تو خداوند فرعون کے اس فیصلے کو میں کس طرح بدل سکتا ہوں؟ تو میری طرف سے خداوند فرعون کو آگاہ کر دے کہ میں ان دونوں بھائیوں کے معاملے میں خاموش رہوں گا۔''

اس مردِ حق نے کہا ''افسوس کہ تو ضرورت سے زیادہ مغرور اور متکبر ہے اور تیری باتوں سے تیری گمراہی اور تیری سرکشی ظاہر ہو رہی ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ تو اگر اپنے چچازاد دونوں بھائیوں پر ایمان نہیں لاتا تو ان کے خلاف کسی کارروائی میں حصہ بھی نہ لے۔''

قارون کو اس مردِ حق کی یہ ساری باتیں فضول اور بے معنی لگ رہی تھیں' غصے میں کہنے لگا ''میرا راستہ چھوڑ اور مجھے محل میں جانے دے۔''

اس مردِ حق نے قارون کے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا ''تیرے پاس فرعون کے کارندے آنے والے ہیں تو اس وقت میں تیرے ہمدرد اور مصلح کی حیثیت سے یہ مشورہ دوں گا کہ تو فرعون کے دربار میں نہیں آئے گا۔''

قارون نے کہا ''یہ تو ممکن ہی نہیں کہ مجھے خداوند فرعون طلب کریں اور میں اس کے دربار میں حاضری نہ دوں۔''

اس مردِ حق نے قارون کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد حضرت موسیٰ سے دوبارہ ملاقات کی اور ان کو بتایا کہ آج دربار میں آپ دونوں بھائیوں کے خلاف بہت دیر تک بحث و مباحثہ جاری رہا اور فرعون نے فیصلہ کیا کہ آپ دونوں بھائیوں کو سنگسار کر دیا جائے لیکن ابھی اس سلسلے میں فرعون آپ کے چچا کے بیٹے قارون سے بھی مشورہ کرنا چاہتا ہے اور غالباً سنگساری کا شاہی فریضہ قارون ہی کے سپرد کر دیا جائے گا۔''

حضرت موسیٰ نے نہایت بے نیازی اور بے باکی سے جواب دیا ''اے شخص! میں نے تجھ کو شاہی محل میں بار بار دیکھا ہے اور تو مجھے پہلے بھی خطرات سے آگاہ کرتا رہا ہے۔ اب اگر فرعون اور اس کے حاشیہ نشین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مجھے قارون اور میری قوم کے ذریعے سنگسار کروا دیں گے تو وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہم دونوں بھائی اپنے خدا پر یقین رکھتے ہیں' اسی نے ہمیں یہاں فرعون اور اس کی قوم کی اصلاح اور رہنمائی کے لیے بھیجا ہے اور وہی ہماری حفاظت بھی کرے گا۔''

اس مردِ مومن نے بتایا ''اس وقت تو میں آپ کو خطرات سے آگاہ کرنے آیا تھا اور آپ سے پہلے میں نے قارون سے بھی ملاقات کرلی ہے میں نے اس کو بہت سمجھایا کہ وہ فرعون کی طلبی پر اس کے پاس ہرگز نہ جائے مگر وہ تو اپنے شاندار محل' مال و زر سے بریز خزانوں کے نشے میں مبتلا ہے' اس نے آپ کو بے زر اور خانماں برباد کہا' وہ آپ دونوں بھائیوں کو جادوگر سمجھتا ہے اور اس نے میرا مشورہ نہیں مانا اور کہہ رہا تھا کہ اگر خداوند فرعون نے اس کو بلوایا تو وہ ضرور جائے گا۔''

حضرت موسیٰ نے جواب دیا ''تو ابھی قارون سے واقف نہیں ہے لیکن میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ انتہائی عیّار' چالاک مگر ذہین انسان ہے۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے اتنا دولت مند کس طرح بن گیا' اس راز سے میرے سوا دو افراد اور واقف ہیں۔''

اس مردِ مومن نے پوچھا ''کیا قارون پہلے کبھی اتنا دولت مند نہیں تھا؟ اور اگر نہیں تھا تو اب اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی؟''

حضرت موسیٰ نے جواب دیا ''اے شخص! تو صاحب ایمان ہے اس لیے میں تجھے میں جو کچھ بتاؤں گا تو اس پر ایمان لے آئے گا مگر دوسرے لوگ سنیں گے تو ان باتوں کو ہنسی میں اڑا دیں گے۔''

اس مردِ حق نے حضرت موسیٰ سے کہا ''اے موسیٰ! آپ کے کہنے سے میں نے قارون کے حالات پر خوب غور کیا تو مجھے یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ اس شخص کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی؟''

حضرت موسیٰ نے جواب دیا ''قارون کے پاس سونے کا بڑا ذخیرہ ہے اور سونے کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سونے کے ہی ذریعے خریدا گیا ہے۔ اب تو یہ پوچھے گا کہ قارون کے پاس اتنا زیادہ سونا کہاں سے آگیا؟''

واقعی یہ مردِ حق یہی سوچ رہا تھا کہ اگر قارون کے پاس سونے کے ذخائر ہیں اور سونے کے علاوہ جو ہیرے جواہرات ہیں تو وہ بھی سونے کے ہی ذریعے خریدے گئے ہیں تو آخر قارون کو اتنا سونا کہاں سے ملا۔ اس نے حضرت موسیٰ سے پوچھا ''اب اگر آپ اس راز سے بھی پردہ اٹھا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

حضرت موسیٰ نے اس مردِ مومن کو بتایا ''اے شخص! تو' تو یہ جانتا ہے کہ ہم بنی اسرائیلی ابراہیم (علیہ السلام) کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابراہیم (علیہ السلام) کے پوتے یعقوب (علیہ السلام) کے بارہ بیٹے تھے۔ ان بیٹوں کی نسل تیرے سامنے ہے اور یہ لاکھوں کی تعداد میں بنی اسرائیلی انہی بارہ بیٹوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ خدا نے ان میں پیغمبر پیدا کیے اور ان پیغمبروں کو خدا کی طرف سے صحائف موصول ہوتے رہے۔ اللہ نے ہدایات' توانین اور بشارتیں اپنے نبیوں پر وقتاً فوقتاً نازل کیں۔ کتاب توریت بھی خدا ہی کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے حکم ملا کہ میں خدائی فرامین اور توریت کو قیمتی اور خوبصورت تختیوں پر لکھ کر محفوظ کردوں تاکہ میری قوم اس پر عمل کرتی رہے اور یہ کتاب معدوم نہ ہوجائے'' حضرت موسیٰ نے اسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا ''میرے دل میں خیال آیا کہ اے موسیٰ' تیری قوم تو بہت نادار اور مفلس ہے تو اب اگر توریت اور آسمانی صحائف کو قیمتی اور مدتوں محفوظ رہنے والی تختیوں پر نقل کروایا جائے تو اس کے لیے سونے سے بہتر کوئی دھات نہیں ہوسکتی تھی۔ سونے کی چمک دمک ہمیشہ برقرار رہتی ہے اور اسے زنگ بھی نہیں لگتا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے خدا کو یاد کیا اور دل ہی دل میں کہا کہ خدایا' ہم بنی اسرائیلی دولت مند نہیں ہیں مگر ہم توریت اور آسمانی صحائف کو زیب و زینت سے سونے کی تختیوں پر نقل کروا دینا چاہتے ہیں اور اس کے اتنے نسخے تیار کروانے کا ارادہ رکھتے ہیں کہ یہ کبھی معدوم نہ ہوں تو خدایا' ہم اتنی بہت ساری سونے کی تختیاں کہاں سے لائیں؟ اب تو ہی ہماری مدد فرما۔''

''خدا کو ہماری یہ گزارش پسند آئی اور اسے شرفِ قبولیت بخشا گیا اور مجھے ایک فرشتے کے ذریعے ایک نسخہ مرحمت ہوا۔ ایک مخصوص قسم کی گھاس سے مجھے آگاہ کیا گیا۔ میں نے اپنے بھانجے یوشع کو اس گھاس کا نام' حلیہ' اس شکل اور اس کی خوشبو یہ سب تفصیل سے لکھ کر دے دی کہ مجھے اس کا بہت بڑا ذخیرہ درکار ہے' اسی دوران میں مجھ پر ایک دوسری گھاس کا القا ہوا اور میں نے اس دوسری گھاس کی تفصیل اپنے دوسرے عزیز کالوت کو لکھ کر دے دی کہ وہ مجھے یہ گھاس جہاں سے بھی ملے' وافر مقدار میں مہیا کردے۔

''اس کے بعد مجھ پر ایک تیسری گھاس کا القا ہوا اور میں نے اس کی تفصیل اپنے چچا کے بیٹے قارون کو لکھ کر دے دی کہ یہ تیسری گھاس وافر مقدار میں قارون فراہم کردے مجھے حکم دیا گیا تھا کہ جب یہ تینوں گھاس مل جائیں تو ان تینوں کے ذخیرے میں بچھڑے کو رکھ کر اس کے ساتھ پیتل اور تانبے کی بہت بڑی مقدار رکھ دینا اور پھر انہیں جلا دینا اور اسی طرح تم ان ذخیروں میں پیتل رکھ کر بھی جلا سکتے ہو' جب آگ سرد پڑ جائے گی تو سارا تانبا سونا بن چکا ہوگا اور پیتل والے حصے میں چاندی بن چکی ہوگی' مجھے اس

ترکیب کے ساتھ ہی حکم دیا گیا کہ اس طرح اے موسیٰ تم بہت زیادہ سونا اور چاندی تیار کرلو گے اور پھر اس کی تختیوں پر توریت اور آسمانی صحائف نقل کرواؤ' تو اس طرح تمہیں اپنی بے زری اور ناداری کا احساس نہیں رہے گا۔''

''اس وقت قارون نے مجھ سے پوچھا کہ ان تینوں گھاسوں سے آپ کیا کام لیں گے' تو میں نے اسے ساری تفصیل بتادی اور کہا کہ اے قارون! اس طرح ہم توریت اور آسمانی صحائف کو ان کی بہت ساری نقلیں کروا کے محفوظ کردیں گے۔''

''اس وقت تک مجھے قارون کی چالاکیوں اور اس کی حرص وطمع کا علم نہیں تھا۔ قارون نے یوشع اور کالوت سے گھاس والے پرچے لے لیے اور کہا تم دونوں انہیں کہاں تلاش کرتے پھرو گے' مجھے دو میں انہیں اپنے کئی آدمیوں کی مدد سے تلاش کر کے منگوالوں گا اور تم دونوں بھاگ دوڑ اور جستجو سے نجات حاصل کرلو گے۔ چنانچہ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ قارون نے اس نسخے کی مدد سے سونا اور چاندی تیار کرنا شروع کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مالدار ہوتا چلا گیا۔ وہ جب بھی سونا اور چاندی تیار کرنا چاہتا ہے' تو اس نسخے کی مدد سے تیار کرلیتا ہے تو خود غور کرو اور قارون کے معاملات کا جائزہ لے تو تجھے اس کا کوئی کاروبار نظر نہیں آئے گا' اس کے خاندان کے لوگ بھی دولت مند نہیں ہیں کہ ورثے میں اسے بہت کچھ مل گیا ہو' میرے ہی نسخے سے سونے' چاندی کے ذخائر پیدا کرلینے والا قارون ہمیں بے زر اور خانماں برباد کہتا ہے تو اے حزقیل قارون کی دولت مندی کے پیچھے یہ واقعات ہیں اب اگر وہ دولت کے نشے میں اپنی قوم کے خلاف ہم دونوں بھائیوں کے خلاف فرعون کی ہاں میں ہاں ملائے گا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ قارون تو چالاک' حریص' بخیل اور موقع پرست ہے وہ زمانے اور وقت کے خلاف کبھی کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔''

اس مردِ حق نے کہا ''اے موسیٰ! آپ نے مجھے جو کچھ بتایا تو اس سے مجھے معلوم ہوا کہ قارون کے پاس جو کچھ بھی ہے' وہ آپ ہی کا دیا ہوا ہے مگر آپ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور وہ اپنے سونے اور چاندی کے ذخائر سے خود ہی دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہوتا رہتا ہے اور غالباً اس نے سونے' چاندیوں کی تختیوں پر توریت اور آسمانی صحائف بھی نقل نہیں کروائے ہوں گے۔ آپ اس سے ملیں اور اس کو یاد دلائیں کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ آپ ہی کا دیا ہوا ہے اس لیے وہ آپ کا کہا مانے اور فرعون کے پاس ہرگز نہ جائے۔''

یہ مردِ حق حضرت موسیٰ سے یہ گفتگو کر کے چلا گیا اور حضرت موسیٰ نے اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو بلا کر انہیں ساری تفصیل بتائی اور کہا ''فرعون کے دربار میں ہم دونوں کو سنگسار کردینے کے منصوبے بنائے جارہے ہیں اور فرعون یہ کام میری قوم کے لوگوں سے لینا چاہتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ بنی اسرائیلیوں سے قارون کے ذریعے اپنے سنگساری کے منصوبے پر عمل کروائے گا تو بھائی ہارون' ہم دونوں قارون کے پاس چلتے ہیں اور ہم بھی اس کو سمجھائیں گے کہ وہ فرعون کا آلۂ کار نہ بنے۔''

یہ دونوں بھائی قارون کے شاہی محل جیسے قصر میں پہنچے۔ باہر پھاٹک پر کئی دربان پہرے داری کررہے تھے۔

حضرت موسیٰ نے ان دربانوں سے کہا ''قارون کو بتاؤ کہ اس کے دونوں بھائی ہارون اور موسیٰ ملنا چاہتے ہیں۔''

دربانوں نے ان دونوں بھائیوں کی آمد کی اطلاع قارون تک پہنچادی۔

قارون اس وقت بھی سونے اور چاندی کے ذخیرے تیار کررہا تھا۔ اس نے بے پروائی سے جواب دیا ''دونوں بھائیوں سے کہو کہ اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔ وہ شام کو مجھ سے ملاقات کریں۔''

حضرت موسیٰ نے اصرار کیا اور دربان سے کہا ''قارون کو بتاؤ کہ کچھ دیر بعد فرعون کی طرف سے بھی بلاوا آسکتا ہے اور ہم دونوں بھائی اس سے پہلے ہی ملنا چاہتے ہیں۔''

کچھ دیر بعد اندر سے دربان واپس آیا اور کہا ''ٹھیک ہے' آپ دونوں کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔''

اور ان دونوں بھائیوں کو محل کے اندر مہمان خانے میں بٹھادیا گیا۔

کافی دیر بیٹھے رہنے کے بعد بھی جب قارون ان دونوں سے نہ ملا تو اسے دوبارہ پیغام پہنچایا گیا کہ وہ مزید وقت نہ ضائع کرے اور فوراً ان دونوں بھائیوں سے مل لے۔

اور ٹھیک اسی وقت باہر سے دوسرا دربان آیا اور قارون کو بتایا گیا کہ شاہی کارندہ قارون کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے باہر منتظر ہے۔

اب تو قارون گھبرا گیا لیکن اس گھبراہٹ میں بھی اس نے اپنا تیار کیا ہوا سونا اور چاندی اندر ذخیرے میں رکھوایا اور پہلے ان دونوں بھائیوں سے ملا اور دریافت کیا کہ وہ کہیں اپنے دینِ حق کی تبلیغ کرنے تو نہیں آئے ہیں اور انہیں جو کچھ بھی کہنا ہو' جلدی جلدی کہہ ڈالیں کیونکہ قارون کو اس وقت فرعون کے ہرکارے کے ساتھ شاہی دربار میں بھی حاضری دینا ہے۔

حضرت موسیٰ نے کہا ''افسوس کہ ہم دونوں بھائی بھی اس وقت اسی سلسلے میں آئے تھے کہ تجھے فرعون طلب کرنے والا ہے اور وہ تجھ سے ہم دونوں بھائیوں کے خلاف کوئی کام لے گا تو اب تجھے اپنی قوم کا خیال کرنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ فرعون پر جو خدائی عذاب نازل ہونے والا ہے' تو وہ عذاب تجھ پر بھی نازل ہو جائے۔''

قارون نے حقارت سے جواب دیا ''اے موسیٰ و ہارون! تم دونوں اپنی پوری قوم کو ورغلا سکتے ہو مگر میں اتنا کم عقل نہیں ہوں کہ تمہاری باتوں میں آ جاؤں اور خدا و ندِ فرعون کے غیظ و غضب کا نشانہ بنوں۔''

حضرت موسیٰ نے کہا ''اے قارون! تو اس سے تو انکار نہیں کرے گا کہ اس وقت تجھے جو کچھ بھی حاصل ہے' وہ ہمارا ہی دیا ہوا ہے۔ تو نے یوشع اور کالوت کو بھی دھوکا دیا لیکن ہمیں اس پر بھی افسوس نہ ہوتا اگر تو نے سونے اور چاندی کی تختیوں پر توریت اور آسمانی صحائف کو نقل کروا دیا ہوتا' تو نے یہ بھی نہیں کیا۔ بنی اسرائیلی بہت غریب ہیں' انہیں کام تو ملتا ہے مگر محنت کا صحیح معاوضہ نہیں ملتا۔ قبطی ان سے بیگار میں بھی کام لیتے ہیں۔ ہماری عورتیں قبطیوں کے امیر گھرانوں میں کام کر رہی ہیں' ان کی عزت و آبرو بھی محفوظ نہیں ہے تو اگر اپنے سونے چاندی سے ان کی مدد کرتا رہے تو بہت سے بنی اسرائیلی گھرانے بھی سکھ چین کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔''

قارون نے حضرت موسیٰ سے پوچھا ''اے موسیٰ! تم دونوں بھائی اپنی قوم کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو۔ تم مدین میں رہے' بنی اسرائیلی بہت آرام سے رہے' انہیں کسی قسم کی ذہنی پریشانی نہیں تھی مگر تمہارے آتے ہی اور تمہاری تبلیغی باتوں کی وجہ سے بنی اسرائیلیوں کو جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے' تم ابھی تک اس کا اندازہ نہیں لگا سکے' خدا کے لیے اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ اور مجھ پر اور میری قوم پر رحم کرو۔''

حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ فرعون کے کارندے قارون کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے بے چین ہیں تو آپ نے قارون کو سمجھایا ''اب اس وقت تیرے پاس ہم سے باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے کیونکہ تجھے اسی وقت فرعون کے دربار میں حاضری دینا ہے۔ تو جا مگر فرعون سے گفتگو کے دوران میں ایک بات کا خاص خیال رہے۔ وہ تم سے میرے خلاف کوئی کام لینا چاہے گا تو' تو اس سے اپنی قوم کو نقصان پہنچانے کا کوئی وعدہ نہیں کرے گا۔''

قارون نے دونوں بھائیوں کو عجیب مغائرانہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا ''کیا تم دونوں بھائی مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ تم دونوں جس قوم سے تعلق رکھتے ہو اسی قوم سے میرا تعلق بھی ہے اور میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے مجھے اور میری قوم کو نقصان پہنچے اور اے موسیٰ و ہارون! تم دونوں بھائی مجھے تو سمجھانے آ گئے ہو کہ میں فرعون سے مل کر کوئی ایسا وعدہ نہ کر دوں جس سے میری قوم کو نقصان پہنچے' جب کہ میں اور میری قوم دیکھ رہی ہے کہ تم دونوں بھائی جو کچھ کر رہے ہو' اس سے میری قوم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ تو اے دونوں بھائیو! تم بھی اب فرعون کا مقابلہ کرنے کا خیال دل سے نکال دو' اس سے تمہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا بلکہ خود بھی پریشانیاں اٹھاؤ گے اور میری قوم کو بھی مصیبت میں ڈال دو گے۔''

حضرت موسیٰ نے کہا ''اے قارون! اس وقت ہم دونوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ دونوں تفصیلی باتیں کریں' ہم دونوں تجھ سے پھر ملیں گے' فی الحال تو فرعون سے مل لے اور دیکھ کہ وہ تجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے؟''

یہ دونوں بھائی قارون کو چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے۔

قارون شاہی کارندوں کے ساتھ فرعون کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت وہ بڑے خدشات محسوس کر رہا تھا۔ وہ بہت دولت مند تھا اور اس کی قوم کے دونوں بھائی فرعون سے ٹکر لے رہے تھے تو قارون کو اندیشہ ہوا کہ فرعون' حضرت موسیٰ و حضرت ہارون کی کوششوں کا جواب اس سے طلب کرے گا اور غالباً یہ کہے گا کہ تو اپنی قوم کا امیر ترین آدمی ہے پھر تو ان دونوں بھائیوں کو سمجھاتا کیوں نہیں کہ وہ فرعون کی خدائی میں دخل نہ دیں اور مصر کا جو نظام صدیوں سے رائج ہے' اسے اسی حال میں رہنے دیں۔ قارون کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں فرعون غیظ و غضب کی کیفیت میں اس کے خزانوں پر قبضہ ہی نہ کر لے۔

انہی اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا قارون شاہی محل پہنچ گیا۔ شاہی محل کے دربانوں نے قارون کا جس شاندار طریقے سے استقبال کیا اس سے قارون کو باہر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ فرعون قارون کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔

فرعون قارون سے مل کر بہت خوش ہوا اور اسے اپنے سامنے بالکل قریب ہی نشست پر بیٹھنے کی اجازت دی۔

قارون کے بیٹھ جانے کے بعد فرعون نے پہلے تو قارون کی مزاج پرسی کی اور بعد میں پوچھا ''اے قارون! کیا یہ درست ہے کہ موسیٰ و ہارون تیرے چچا کے بیٹے ہیں؟''

قارون نے جواب دیا ''جی خداوند! افسوس کہ وہ دونوں واقعی میرے چچا کے بیٹے ہیں لیکن اپنی پوری قوم بنی اسرائیل کی طرح میں بھی ان دونوں بھائیوں سے خوش نہیں ہوں۔''

فرعون نے پوچھا ''ابھی کچھ دن پہلے ان دونوں بھائیوں نے میرے دربار میں حاضر ہو کر جو گستاخیاں کی تھیں' میں نے انہیں اس لیے نظر انداز کر دیا کہ میں ان دونوں بھائیوں کے ساتھ ناانصافی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان دونوں کو بھی دربار میں آزادی سے باتیں کرنے کا موقع دیا گیا لیکن افسوس کہ ان دونوں نے میری خدائی کا بھی خیال نہیں کیا اور اس سے مسلسل انکار کرتے رہے۔ اے قارون! اب تو سچ سچ بتا کہ اس وقت پورے مصر میں خدا کون ہے؟''

قارون نے جواب دیا ''آپ ہیں۔''

فرعون نے کہا ''تیرا بھائی موسیٰ' کسی اَن دیکھے رب العالمین کا ذکر کرتا ہے اور وہ مجھے کسی طرح بھی خدا ماننے کو تیار نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے مدین میں کس بہت بڑے جادوگر سے سحری علوم حاصل کیے ہیں۔ جب اس نے پہلی بار میرے دربار میں اپنی دوشاخہ لاٹھی پھینکی تھی تو وہ سانپ بن گئی تھی۔ اس سے میرے درباری بھی خوف زدہ ہو گئے تھے اور دربار میں ایک ہلچل مچ گئی تھی' پھر میں نے موسیٰ کو منع کیا کہ وہ یہاں ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس سے میرے درباریوں کو خطرہ یا خوف محسوس ہو' تو جناب موسیٰ نے سانپ کو اس کے پھن والے حصے سے پکڑ لیا تو وہ دوبارہ لاٹھی بن گیا۔ میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر موسیٰ جادوگر ہیں تو اس کا مقابلہ بھی جادوگروں کے ذریعے کیا جانا چاہیے۔''

اتنا کہہ کر فرعون نے پوچھا ''اے قارون! زیب وزینت والے دن شہر کے باہر میدان میں میرے جادوگروں سے دونوں بھائیوں کا مقابلہ ہوا تھا اور اسی روز اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے پورا شہر اُمڈ آیا تھا مگر اس ہجوم میں' میں نے تجھ کو نہیں دیکھا تھا' اس دن تو کہاں تھا؟ اور وہ مقابلہ دیکھنے کے لیے تجھے تو ضرور آنا چاہیے تھا۔''

قارون نے بڑا فخر محسوس کیا کہ فرعون نے اس کو اپنے سامنے قریبی نشست بیٹھنے کے لیے دی تھی اور اب وہ قارون سے براہِ راست مخاطب تھا۔ چنانچہ قارون نے جواب دیا ''خداوند! میں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ دونوں بھائی آپ کے چار ہزار جادوگروں کا کیا مقابلہ کریں گے تو سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنے دونوں چچازاد بھائیوں کی ناکامی دیکھتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی' بس اسی لیے میں اس دن مذکورہ میدان میں نہیں پہنچا تھا۔''

فرعون نے پوچھا ''اے قارون! تجھے کچھ پتا ہے کہ اس مقابلے کا انجام کیا ہوا؟''

قارون نے جواب دیا ''مجھے تو لوگوں نے یہی بتایا کہ موسیٰ ان جادوگروں کے استاد نکلے اور جادوگر بھی موسیٰ سے ملے ہوئے تھے۔ وہ سب موسیٰ کی نبوت و رسالت اور اس کے رب العالمین پر ایمان لے آئے اور آپ نے ان سب کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد سولی دلوا دی۔''

فرعون نے کہا ''مجھے تو حیرت ہے کہ وہ سارے جادوگر موسیٰ کی نبوت و رسالت کے علاوہ اس کے اَن دیکھے رب العالمین پر بھی ایمان لے آئے۔ تو اب تو سچ سچ بتا کہ موسیٰ تیری قوم کا بہت بڑا جادوگر نہیں ہے؟''

قارون نے جواب دیا ''اگر آپ نے موسیٰ کو جادوگر سمجھ لیا ہے تو میں آپ کی تردید کر کے خود کو مجرم اور گناہ گار کیوں کروں گا؟''

فرعون نے ہامان کی طرف دیکھا اور کہا ''اب تو قارون کو بتا دے کہ ہم اس سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟''

ہامان نے کہا ''اے قارون! تو اپنی قوم کا معزز ترین شخص ہے اور تمام بنی اسرائیلی تجھ سے مرعوب رہتے ہیں تو کیا اب تیرا یہ فرض نہیں ہے کہ ان دونوں بھائیوں کو خداوند فرعون کے مقابلے پر آنے سے روکے۔ تو انہیں سمجھا کہ اگر وہ دونوں باز نہ آئے تو اس سے نہ صرف ان دونوں کو بلکہ تجھ کو بھی بہت نقصان پہنچے گا۔''

قارون نے خوف زدہ لہجے میں کہا ''میرا ان دونوں سے چچیرے بھائی کا رشتہ تو ہے مگر اس رشتے کے علاوہ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں اس لیے میرا ذکر ان دونوں بھائیوں کے حوالے سے نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔''

ہامان نے کہا ''دیکھ قارون! تیری قوم کے کسی بھی فرد کو آج تک یہ عزت نہیں دی گئی کہ اسے خداوند فرعون کے روبرو قریبی نشست پر بٹھایا جائے لیکن تجھ کو یہ اعزازی جگہ بھی دی گئی اور خداوند فرعون سے ہم کلامی کا شرف بھی بخشا گیا تو اب تیرا یہ فرض ہے کہ ان دونوں بھائیوں کی مصیبت کو اس دربار سے دور رکھ' ان دونوں کو راہِ راست پر لا اور اپنی قوم کو بھی سمجھا کہ وہ موسیٰ اور ہارون کی پیروی نہ کریں اور خداوند فرعون کی خدائی میں دخل دینا چھوڑ دیں۔''

ہامان ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کر سکا تھا کہ فرعون نے قارون کو بتایا ''اے قارون! میرے درباری مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں نے چار ہزار جادوگروں کو تو سولی پر چڑھا دیا مگر ان دونوں بھائیوں کو ابھی تک آزاد چھوڑ رکھا ہے' میں ان دونوں کو کوئی سزا کیوں نہیں دیتا۔''

قارون نے بھی حیرت کا اظہار کیا ''بے شک یہ بات تو ہر کوئی سوچ سکتا ہے کہ جب خداوند نے چار ہزار جادوگر ہلاک کروا دیے تو آپ کے دبدبے اور خدائی کے سامنے ان دونوں بھائیوں کی کیا حقیقت ہے اور آپ نے ان دونوں کو اب تک زندہ کیوں چھوڑ رکھا ہے؟''

فرعون نے اعتراف کیا ''میں ان دونوں کی ساحرانہ قوت سے ڈرتا ہوں۔ معلوم نہیں مدین میں اتنا بڑا جادوگر کون ہے جس نے موسیٰ کو ایسا زبردست جادو سکھا دیا ہے کہ میرے ملک بھر کے جادوگر اس کے سامنے بے بس ہو گئے تو اے قارون! اب تو خود بھی سمجھ سکتا ہے کہ اتنا بڑا جادوگر موسیٰ مجھے بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اب میں ان دونوں بھائیوں کا براہِ راست مقابلہ نہیں کرنا چاہتا اور تجھ کو اسی لیے بلوایا گیا ہے کہ تو اپنی قوم کے ذریعے ان دونوں بھائیوں کو قابو میں رکھ اور بہت بہتر یہ ہوگا کہ تو صرف موسیٰ کو اپنی قوم کے ذریعے سنگسار کروا دے۔ یہ فتنہ اسی طرح قابو میں کیا جا سکتا ہے' موسیٰ کے بعد ہارون رہ جائے گا تو میرا خیال ہے کہ ہارون مدین کبھی نہیں گیا اور اپنی پیدائش سے لے کر آج تک اسی شہر میں رہا ہے تو اسے موسیٰ جیسی جادوگری نہیں آتی ہوگی اور اگر موسیٰ کو تیری قوم سنگسار کر دے گی تو تنہا ہارون خاموش بیٹھ جائے گا۔''

قارون نے فرعون کو بتایا ''خداوند! کچھ دیر پہلے جب آپ کے کارندے مجھ کو دربار میں لانے کے لیے میرے محل میں پہنچے تھے تو اس سے ذرا پہلے موسیٰ و ہارون بھی مجھ سے ملے تھے اور وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ خداوند کا فرمان طلبی اے قارون! تیرے پاس پہنچنے والا ہے تو اسی وقت جب میں نے شاہی کارندوں کو دیکھا اور یہ معلوم ہوا کہ مجھے آپ نے دربار میں طلب فرمایا ہے تو میں بے حد حیرت زدہ ہوا کہ واقعی موسیٰ کو جادوگری میں کمال حاصل ہے۔ موسیٰ کو غیب کا علم بھی حاصل ہے ورنہ اسے میری خداوند کے دربار میں طلبی کا علم کیونکر ہوتا؟''

فرعون اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا اور قارون سے کہا ''تو اب تو اپنی قوم کو موسیٰ کے فتنوں سے بچانے کی کوشش کر' اگر تیری قوم موسیٰ کو سنگسار کر دے تو یہ مسئلہ فوراً حل ہو جائے گا اور ان دونوں بھائیوں کا مقابلہ مجھے نہیں تیری قوم کو کرنا پڑے گا اور تیری قوم بھی سکھ چین سے مصر میں رہے گی۔''

قارون نے پوچھا ''اے خداوند! یہ تو معلوم ہوا کہ وہ دونوں بھائی اپنی نبوت و رسالت کا اعلان کرتے پھر رہے ہیں اور ایک اَن دیکھے رب العالمین پر ایمان لانے کی تلقین کرتے ہیں مگر مجھے ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ وہ دونوں بھائی اس کے علاوہ کیا چاہتے ہیں۔''

فرعون نے جواب دیا ''اس کے علاوہ وہ دونوں بھائی اپنی قوم کے لاکھوں افراد کو مصر سے کہیں اور لے جانا چاہتے ہیں اور جب وہ یہاں سے جائیں گے تو یہاں بسنے والی دوسری قومیں بھی بنی اسرائیلیوں کا ساتھ دیں گی' کیونکہ یہاں تو عبرانی اور آریہ نسل کے لوگ بھی آباد ہیں تو ان بے وقوفوں سے یہ پوچھا جائے کہ اتنی بڑی تعداد میں دوسرا کوئی ملک کیوں قبول کرے گا اور اگر کوئی ملک انہیں قبول کرنے کی غلطی کرے گا تو ان تارکینِ مصر سے یہ پوچھا جائے کہ انہیں دوسرے ملک میں روزی' معاشی اور رہائشی سہولتیں فوراً تو میسر نہیں ہوں گی۔ کئی نسلیں تباہ و برباد ہو جائیں گی اور معاشی پریشانی انسانی زندگی کا سب سے بڑا دکھ ہوتا ہے اور یہ دونوں بھائی اپنی قوم کو اسی دکھ میں مبتلا کر دینا چاہتے ہیں' اے قارون! تو نہایت مؤثر لفظوں میں اپنی قوم کو سمجھا کہ وہ دونوں بھائیوں کے کہنے میں نہ آئیں اور جس طرح مصر میں رہتے ہیں' اسی طرح رہتے رہیں۔ یہاں انہیں دو وقت کا کھانا تو مل جاتا ہے اور رہنے کے لیے ان کے پاس اپنے مکانات بھی ہیں۔''

قارون نے کہا ''خداوند! میں خود حیران ہوں کہ یہ دونوں بھائی اپنی اور دوسری قوموں کے لوگوں کو یہاں سے کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟ انہیں تو سوچنا چاہیے کہ صدیوں کی محنت اس ملک کو چھوڑنے کے ساتھ ہی اکارت جائے گی اور جناب' میں اپنی قوم کے دوسرے لوگوں کی کوئی بات نہیں کروں گا۔ مجھے تو اپنے بارے میں بھی یہ سوچنا ہے کہ اگر موسیٰ و ہارون کے ساتھ مجھے بھی بدرجۂ مجبوری یہ ملک چھوڑنا پڑ جائے تو میرے خزانوں کا کیا ہوگا؟ ان کے لیے کتنے اونٹ درکار ہوں گے؟ اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ دورانِ سفر میرے خزانے لوٹ نہ لیے جائیں۔ تو جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں ان دونوں بھائیوں کا کبھی بھی ساتھ نہ دوں گا اور اپنی قوم کو ترکِ وطن کی مصیبتوں سے آگاہ کروں گا اور میرا خیال ہے کہ میری قوم میں اتنے عقل مند لوگ موجود ہیں جو میرے

ہم خیال ہوں گے اور میرا ساتھ دیں گے۔''

فرعون نے سنگساری پر زور دیا ''اے قارون! تیری قوم میں سنگساری کی سزا موجود ہے اس لیے تو کوشش کر کے کسی ایسے الزام سے موسیٰ کو متہم کر دے کہ جس کی سزا سنگساری ہو اس طرح تو ذاتی طور پر موسیٰ کے جادو سے بھی بچا رہے گا اور موسیٰ اپنی قوم پر تو جادو کرنے سے رہا۔''

قارون نے فرعون کے اس مشورے کے دوران میں ہی سوچ لیا کہ اس کی قوم میں زانی کو سنگسار کر دینے کی سزا موجود ہے اور اگر یہ الزام حضرت موسیٰؑ پر ثابت کر دیا جائے تو ان کو سنگساری کی سزا دی جا سکتی ہے۔

ہامان کو بھی معلوم تھا کہ بنی اسرائیلیوں میں زانی کو سنگسار کر دینے کی سزا موجود ہے۔ اس نے قارون کو مشورہ دیا ''اے قارون! تیرے پاس بڑی دولت ہے اور لوگ تیری دولت سے مرعوب بھی رہتے ہیں تو کسی ایسی عورت کو تلاش کر جسے تو اپنی دولت کے زور پر موسیٰ پر تہمت لگانے پر آمادہ کر لے تو اپنی قوم کو کسی ایک جگہ جمع کرے گا اور اسے بتائے گا کہ موسیٰ نے فلاں عورت سے تعلقات قائم کر رکھے ہیں اور اس عورت کے کہنے سے موسیٰ کو بھی بلوا لیا جائے گا۔ موسیٰ اپنی قوم کے سامنے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے لیکن جب ان کے سامنے ایک جیتی جاگتی عورت موسیٰ کے خلاف گواہی دے گی تو کوئی وجہ نہیں کہ تیرے مذہب کے احبار اور قاضی انہیں عورت کی گواہی پر معاف کر دیں اور تو ان احبار اور قاضیوں کو بھی پہلے سے خرید لے گا اور اس طرح موسیٰ سے ہم سب کی جان چھوٹ جائے گی۔''

قارون نے خود بھی یہی سوچا تھا' اس نے بطورِ خاص فرعون کو یقین دلایا ''خداوند! آپ بالکل فکر نہ کریں' میں آپ کا ان دونوں بھائیوں سے پیچھا چھڑا دوں گا۔ آپ لوگ موسیٰ کے جادو سے ڈرتے ہیں حالانکہ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ موسیٰ کو جادوگری آتی ہوگی۔ میرے احبار اور قاضی اس کی جادوگری کے کس بل بھی نکال دیں گے۔''

اس درباری فیصلے سے فرعون کو بھی سکون محسوس ہوا اور ہامان اور دوسرے حاشیہ نشین بھی بہت خوش ہوئے کہ ان دونوں بھائیوں سے نجات حاصل کرنے کا اس سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔

قارون نے دربار سے اٹھنا چاہا مگر اجازت لینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

ہامان نے اس کی بے چینی محسوس کر لی اور فرعون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''خداوند! اب اس شخص کی یہاں نہیں اپنی قوم میں پہنچنے کی ضرورت ہے' اسے جانے کی اجازت دی جائے تا کہ یہ ابھی سے اپنے اس منصوبے پر عمل شروع کر دے۔''

فرعون نے قارون سے کہا ''اب تو جا سکتا ہے۔''

اجازت ملتے ہی قارون اپنی نشست سے اٹھ کر الٹے قدموں چلنے لگا۔ وہ فرعون کی طرف پشت کر کے اس کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب دربار سے نکل گیا تو وہ بے حد خوش تھا کیونکہ اسے اب تک یہ خوف پریشان کرتا رہتا تھا کہ کہیں اس کی دولت مندی کو فرعون کی طرف سے نقصان نہ پہنچ جائے لیکن آج جب فرعون نے ایک بہت بڑا کام قارون سے لینا چاہا تو اسے اطمینان ہوا کہ اگر وہ کسی طرح اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہو گیا اور حضرت موسیٰؑ کو سنگساری کی سزا دلوا سکا تو قارون بھی فرعون کے دربار میں عزت و وقعت دوچند ہو جائے گی اور ایک طرح سے وہ اپنی قوم کا حکمران بن جائے گا۔

قارون نے شاہی محل سے نکلنے کے بعد اپنے گھوڑے پر سفر کرتے ہوئے منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ اس وقت اس کے ذہن اور حافظے میں ایسی کئی عورتیں آ رہی تھیں جو یہ کام کر سکتی تھیں اور قارون ان کو معقول معاوضے پر خرید سکتا تھا۔

اس موقع پر اس کے نفس نے سمجھایا بھی کہ اے قارون! یہ دونوں بھائی اپنی قوم کے دو باعزت اور طاقت ور فرد ہیں اور ان دونوں کی اس ہمت اور حوصلے کی داد دینی چاہیے' جس کے ذریعے وہ خداوند فرعون کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

نفس تو قارون کو سمجھا رہا تھا اور قارون ابھی نفسِ مطمئنہ تک نہیں پہنچا تھا کہ نفسِ امارہ نے قارون کو دبوچ لیا اور اس نے قارون کو بڑے سبز باغ دکھائے' اپنی قوم کی بادشاہت' اپنے خزانوں کی حفاظت اور فرعون کے دربار میں انتہائی عزت و وقعت۔

اب یہی نفسِ امارہ قارون کو ان عورتوں کے پاس لے جا رہا تھا جو مال و زر کے عوض قارون کی مدد کر سکتی تھیں اور ان کے اقرار اور گواہی پر حضرت موسیٰؑ کو سنگسار کیا جا سکتا تھا۔

(جاری ہے)

مضمون کے ماخذ

قدیم مصری ادب	ہزاروں سال پہلے	کتاب الہدیٰ	ترجمان القرآن	قصص القرآن	قصص القرآن	قصص الانبیا
ابن حنیف	ابن حنیف	یعقوب حسن	مولانا آزاد	مولانا حفظ الرحمن	عبدالصمد صارم	مولانا عبدالمنان

میں آئی اے ایس کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ ایک طرف سرلا کی ضد تھی کہ محبت اپنی جگہ مگر وہ شادی ایک آئی اے ایس آفیسر سے ہی کرے گی۔ جج باپ کی حسین اور مغرور بیٹی خود بھی آئی اے ایس کے امتحان کی تیاری میں جتی ہوئی تھی۔ وہ کامیاب ہوتی یا ناکام..... مگر اسے اپنی کامیابی کا صد فیصد یقین تھا۔ دوسری طرف مجھے یہ خدشہ تھا کہ اگر میں فیل ہوگیا تو اسے کھو بیٹھوں گا۔

دوسری طرف والد صاحب یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ میں فیل ہو جاؤں تو وہ مجھے اپنی اچار کی دکان پر بٹھائیں۔ شملہ سے بیرون ملک جانے والے کچھ لوگ ان کے اچار کے سمپل اپنے ساتھ لے گئے تھے اور اب ان کے پاس ایکسپورٹ کے چھوٹے موٹے آرڈر آنے شروع ہو گئے تھے۔

سرلا نے ملاقاتوں پر بھی سخت پابندی لگا رکھی تھی۔ وہ چوتھے پانچویں دن چند منٹ کے لیے آتی اور مختلف مضامین پر کتابوں کا ڈھیر چھوڑ جاتی۔ بقول اس کے، ان کتابوں سے مجھے امتحان کی تیاری میں بہت مدد مل سکتی تھی۔ میں کتابوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا۔ انہیں پڑھنے کی کوشش بھی کرتا لیکن دو چار صفحوں کے بعد ہی الفاظ میری نظروں کے سامنے ناچنے لگتے۔ مجھے اپنے آپ پر ترس اور فرہاد پر رشک آنے لگتا۔ مجھے پہاڑ کاٹنا اس امتحان سے آسان معلوم ہوتا۔

اپاہج

سورج منیم / محمد ابراھیم جمالی

کہا جاتا ہے کہ ماں بن کر ہی کوئی عورت اپنی تکمیل کی منزل کو پہنچتی ہے، شاید اس لیے کہ اسی صورت نسل انسانی کو مزید آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اسی خیال کو اس کہانی میں ذرا مختلف بلکہ نہایت اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ان کہانیوں میں سے ایک جنھیں لازوال کہا جاتا ہے، ادب عالیہ سے خصوصی انتخاب

.....اور ان ہی دنوں میری بھوشن سے ملاقات ہوئی۔

میں ہر ہفتے مقامی ڈی اے وی ہائی اسکول میں ڈرائنگ کی کلاس لیتا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی پردیپ بھی وہیں نویں کلاس میں پڑھتا تھا اور ڈرائنگ کا طالب علم تھا۔ ایک بار میں پرچے مارک کررہا تھا اور پردیپ پیچھے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی ڈرائنگ پر ناز بھی تھا اور میرا بھائی ہونے کے ناتے اپنے آپ کو رعایت کا حقدار بھی سمجھتا تھا اسی لیے جب میں نے اسے دس میں سے صرف چھ نمبر دیے اور بھوشن نامی اسٹوڈنٹ کے بنائے ہوئے اسکیچ کو ساڑھے نو نمبر دیے تو وہ روٹھ گیا۔

''اس اسکیچ میں کیا خوبی ہے؟'' پردیپ نے کہا۔ ''اسے بنانے کے لیے بھوشن نے صحیح پنسل کا استعمال بھی نہیں کیا، سخت پنسل سے بنایا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر صحیح پنسل کا استعمال کیا ہوتا تو نہ جانے یہ اسکیچ کیا ہوتا۔ مجھے تو اس لڑکے میں ایک اچھا مصور بننے کے سارے آثار نظر آتے ہیں۔''

''یہ کیا خاک مصور بنے گا۔ کاغذ پنسل تو خرید نہیں سکتا۔'' پردیپ نے ایسے لہجے میں کہا جیسے آدمی کی قوتِ خرید ہی ذہانت اور صلاحیت کی ضمانت ہو۔

میں نے پردیپ سے بھوشن کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ بہت غریب لڑکا ہے۔ اسکول آنے سے پہلے صبح سویرے اخبار بانٹنے جاتا ہے۔ اکثر اسکول پہنچنے میں اسے دیر ہوجاتی ہے تو پہلا یا دوسرا پیریڈ بینچ پر کھڑے ہوکر گزارتا ہے۔ شام کو پھر اخبار اور رسالوں کو بیچنے چلا جاتا ہے۔ پورے اسکول میں اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔ دوست بنانے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں اور کوئی دوسرا اس کا دوست بننا نہیں چاہتا۔ نہ جانے کیسے ہر سال جیسے تیسے پاس ہوجاتا ہے۔

مجھے قسمت کے ماروں سے کوئی خاص ہمدردی نہیں۔ ہمارے ہندوستان میں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آدمی کمزوری کے کسی لمحے میں ہمدردی کرنے کی سوچ بھی لے تو ان کا بھلا کرتے کرتے تو رہا، ہاں..... اپنی بربادی یقینی ہے۔

اگر میں نے بھوشن سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو صرف اس لیے کہ مجھے اس سے دلچسپی ہوگئی تھی۔

اگلے دن پردیپ اسے لے آیا۔

دبلا پتلا، سر جھکا کر چلنے والا، ہاتھوں میں اخباروں اور رسالوں کا پلندا، ننگے کھردرے پاؤں، آنکھوں میں ذہانت کی چمک، رک رک کر باتیں کرنے کا شرمیلا انداز..... یہ تھا بھوشن!

ہم لوگ پہلی ہی ملاقات میں دوست بن گئے۔ بارہ تیرہ برس کے اس لڑکے نے میرے ہاتھ میں ''داس کیپٹل'' کتاب دیکھی تو کہنے لگا۔ ''اگر پچیس سال سے کم عمر کا آدمی کمیونزم میں یقین نہ رکھتا ہو تو کہنا پڑے گا کہ اس کے پاس دل نہیں اور اگر پچیس سال کے بعد کمیونزم میں یقین رکھتا ہے تو سمجھو کے اس کے پاس دماغ نہیں۔''

''تم کمیونسٹ ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''باضابطہ تو نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن بات سننے میں اچھی ضرور لگتی ہے کہ دنیا کے ذرائع ہم سب میں برابر تقسیم کیے جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایسا ممکن نہیں۔''

''اگر میں پوچھوں کہ ایسا کیوں ممکن نہیں تو.....؟''

''تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی بندر نے روٹی برابر بانٹنے کی ذمے داری سنبھالی ہے، روٹی بندر خود کھا گیا ہے۔''

رفتہ رفتہ مجھے پتا چلا کہ یہ لڑکا نہ صرف ہر موضوع پر بات کرسکتا ہے بلکہ ہر مسئلے پر اپنی ذاتی رائے بھی رکھتا ہے۔ اس کا باپ مرچکا تھا۔ ماں، دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے گھر کے ہر فرد کو محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی۔ اس کی ماں کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے۔

''دوست! تم بڑے آدمی بنو گے نہیں..... تم آج بھی بڑے آدمی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں، اس بات کا احساس دنیا کو ابھی نہیں ہوا۔''

''دنیا کے بازار میں قیمت اس چیز کی لگتی ہے جس کا کوئی خریدار ہو۔'' وہ بولا۔

وہ شام کو ہر روز آنے لگا۔ میں اس کا انتظار کرتا۔ کسی دن وہ نہ آتا تو میں پردیپ کو اسے ڈھونڈنے کے لیے بھیجتا۔ شروع شروع میں پردیپ کو اس کا آنا جانا اچھا نہ لگا لیکن جب پردیپ کو مفت میں فلمی رسالے پڑھنے کو ملنے لگے تو اس نے بھی بھوشن کا خوش دلی سے استقبال کرنا شروع کردیا۔

☆☆☆

بھوشن نے کم عمری میں ہی ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ اس کا حافظہ کیمرے کی طرح تھا۔ جو کتاب اس کی نظر سے گزر جاتی، وہ اس کے ذہن پر نقش ہوجاتی۔ وہ آتا تو میں جس مضمون سے الجھ رہا ہوتا اسی پر اس سے گفتگو کرنے لگتا اور یوں آسانی سے بحث میں شامل ہوجاتا جیسے اسی بات پر سوچتا آرہا ہو۔

ایک بار ارتقا کے موضوع پر بولتے ہوئے اس نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں..... مرد اور عورت ایک دوسرے میں

کشش کیوں محسوس کرتے ہیں؟''

یکایک سرلا کا چہرہ میرے تصور میں ابھر آیا۔ میں نے پوری طرح انجان بنتے ہوئے کہا۔ ''بھوشن صاحب! آج آپ اس راز سے پردہ اٹھا ہی دیجیے کہ میں سرلا پر کیوں مرتا ہوں؟''

وہ نظریں جھکا کر دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔ ''اس لیے کہ آپ اور ہم میں سے ہر شخص قدرت کے تخلیقی عمل کا ثمر ہے۔ تخلیقی عمل جو لاکھوں سال سے چل رہا ہے۔ کڑی در کڑی بنتی ہوئی زنجیر جس کا آخری سرا ہم اور آپ ہیں۔ ہر شخص اپنے آپ میں قدرت کا تراشا ہوا انمول شاہکار ہے۔ اگر ہم، آپ اس زنجیر کو آگے نہ بڑھائیں، نئی نسل نہ تراشیں تو یہ قدرت کی لاکھوں برسوں کی محنت پر پانی پھیرنے کے مترادف ہوگا۔ اسی لیے ہندو کہتے ہیں کہ اگر چتا کو آگ دینے کے لیے اولاد نہ ہو تو آدمی کی مکتی (نجات) نہیں ہوتی۔ ایسا آدمی بہت گناہ گار سمجھا جاتا ہے۔''

''آخر قدرت تراشنا کیا چاہتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید ایک ایسی ہستی جو ہر لحاظ سے مکمل ہوگی۔ جس میں کوئی کمی نہیں ہوگی، جو......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا میں وہی سمجھ رہا ہوں جو تم کہہ رہے ہو؟'' میں نے سرگوشی کی۔

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا اور ہم دونوں ہنسنے لگے۔

وہ چلا جاتا تو میں زیرِ بحث موضوع کی کتاب اٹھاتا اور پھر مجھے بور کتاب بھی اس کی باتوں کے بعد دلچسپ لگتی۔

میں نے اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کی۔ پہلے میری زندگی بہت محدود تھی۔ ناک صرف مختلف قسم کے اچاروں کی خوشبو سے مانوس تھی جو والد صاحب اپنے ساتھ گھر لے آتے تھے۔ نظارہ صرف سرلا کا چہرہ تھا اور رنگوں سے میں جیسے واقف نہیں تھا۔ بھوشن سے ملنے کے بعد مجھے کھڑکی سے باہر کا پیڑ، اس کی ہریالی دکھائی دینے لگی۔ سڑک پر چلتا تو لوگوں کے رنگے برنگے کپڑے دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی۔ قدم قدم پر مجھے مختلف قسم کی خوشبوؤں کا احساس ہوتا۔ میری دنیا اچانک وسیع ہوگئی۔ وقت سیکڑوں سال پیچھے اور ہزاروں سال آگے تک پھیل گیا۔

مجھے ایسا لگتا جیسے میں ہر چیز کا مرکز ہوں۔ مجھے اپنے ہونے کا احساس ہوا...... اپنے ہونے کی اہمیت کا احساس ہوا۔

میری اس تبدیلی کو سرلا نے بھی محسوس کیا۔ اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔ ''تمہارے پیار میں اب وہ پہلے جیسی گرم جوشی نہیں رہی۔''

''میں اب بھی تم سے پیار کرتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور تمہیں پانا چاہتا ہوں۔ تمہیں پانے کے لیے آئی اے ایس کے امتحان میں پاس ہونا چاہتا ہوں...... لیکن اگر میں پاس نہ ہوا اور تم مجھے نہ ملیں تو کچھ بھی بدل نہیں جائے گا۔ پھول پھر بھی کھلیں گے، چاند نکلے گا، فضا میں دھنک کے رنگ بکھریں گے...... اور قدرت نے مجھے جس عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے پیدا کیا ہے، اسے میں پورا کردوں گا۔''

سرلا نے ایک لمحے کے لیے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا پھر بولی۔ ''جب تم بول رہے تھے تو مجھے ایسا لگا جیسے تم کمرے سے باہر نکل گئے ہو اور میرے ساتھ کمرے میں کوئی ایسا آدمی ہے جسے میں بالکل نہیں جانتی۔''

''کچھ دن پہلے تک میں بھی اپنے اندر کے اس آدمی کو نہیں جانتا تھا۔''

ایک دن میں نے بھوشن سے پوچھا۔ ''تمہاری غیر معمولی یادداشت کا راز کیا ہے؟''

اس نے حسبِ معمول آنکھیں ملائے بغیر کہا۔ ''آج کل MEDITATION یعنی دھیان کا بہت چرچا ہے۔ آپ

جانتے ہیں یہ کیا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے دیانت داری سے جواب دیا۔

''میں نے کبھی دھیان کیا ہی نہیں۔''

''غلط۔'' وہ بولا۔ ''جب کبھی سرلا آپ کے ساتھ ہوتی ہے، آپ دھیان کر رہے ہوتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' اس نے اسکول ماسٹر کی طرح کہا۔ ''جب وہ آپ کے پاس ہوتی ہے تو آپ کی آنکھوں کو صرف وہی دکھائی دیتی ہے۔ آپ کے کانوں کو صرف اسی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کا لمس اور اس کی خوشبو..... باقی ہر چیز، ہر خیال بیچ میں سے غائب ہو جاتا ہے۔''

''لیکن جناب! میرے عشق سے آپ کی یادداشت کا کیا تعلق ہے؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔ وہ اس وقت مجھے واقعی کوئی اسی سال کا مہارشی لگ رہا تھا۔

اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''جب نظر اور نظارے کے درمیان کوئی خیال نہ آئے، اسے دھیان کہتے ہیں۔ یادداشت تو بہت معمولی چیز ہے۔ ایسے میں جس سرور، جس سکھ کا احساس ہوتا ہے اس کے سامنے عورت سے ملن کی لذت بھی کچھ نہیں۔''

مجھے غصہ آنے لگا۔ میں نے سوچا، آخر یہ چھوکرا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ میں نے کہا۔ ''تم جانتے ہو.....؟ کیا تم نے جانا ہے کہ عورت سے ملن کا سکھ کیا ہوتا ہے؟''

''نہیں.....'' اس نے جواب دیا۔ ''جانا تو نہیں لیکن جب ساری دنیا اس سکھ کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہے تو کچھ کچھ اندازہ ضرور ہے۔''

''تو پھر میری بات غور سے سنو۔ تجرباتی اور کتابی علم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمہاری دنیا کی ساری کتابیں مل کر بھی بتا نہیں سکتیں کہ رس گلے کا ذائقہ کیا ہے۔ لائبریری سے کتابیں ادھار لے کر کوئی عالم فاضل نہیں ہو جاتا۔'' آج میں اس کو بتا دینا چاہتا تھا کہ اس کا مقام کیا ہے اور میرا مقام کیا۔

اس نے اپنے اخبار اور رسالے سمیٹے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے پر پہنچ کر مڑے بغیر اس نے کہا۔ ''صاحب! آپ سچ کہتے ہیں۔ یہ تو بہت پہلے طے ہو چکا ہے کہ عالم فاضل وہ ہوتا ہے جو کتابیں خرید سکے۔''

وہ چلا گیا تو میں بہت خوش ہوا۔ یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میں اس کو بتاؤں کہ میں اس اخبار فروش کو اپنے برابر بٹھا کر اس پر احسان کر رہا تھا۔ حد ہو گئی۔ وہ سچ مچ اپنے آپ کو میرے برابر کا سمجھ بیٹھا تھا۔ بے وقوف کہیں کا!

وہ کئی دن تک ہمارے ہاں نہیں آیا۔ اس کی کمی میں نے ہی نہیں، پردیپ اور والد صاحب نے بھی محسوس کی۔ والد صاحب کے ''مستانہ جوگی'' اور پردیپ کے ''فلم فیئر، اسٹار ڈسٹ، ریڈرز ڈائجسٹ'' کی مفت سپلائی بند ہو گئی تھی۔ اب کے میں خود اسے تلاش کرتا ہوا نجومی پہنچا۔ دروازے پر دستک دی تو بھوشن ہی باہر آیا۔

''ارے صاحب آپ!'' وہ مجھے دیکھتے ہی گھبرا گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر قریبی چائے خانے پر لے گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اپنا گھر دکھاتے ہوئے شرما رہا ہے۔

چائے پیتے ہوئے میں نے اس سے معافی مانگی۔ اس نے کہا۔ ''اندھے کو سورداس کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اپنی غربت کا احساس چوبیس گھنٹے رہتا ہے لیکن میں نے مدد کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ کبھی نہیں پھیلایا اسی لیے.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''اندھے کو شاید اس کی آنکھیں واپس نہیں مل سکتیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن غریب تو اپنی غربت سے پیچھا چھڑا ہی سکتا ہے۔''

''اسی امید پر تو جی رہا ہوں اور پڑھ رہا ہوں۔''

اس کے بعد اس کا آنا جانا دوبارہ شروع ہو گیا۔

ایک روز ادب میں فحاشی کا ذکر چھڑ گیا۔ بھوشن نے اس مقدمے کی تفصیل بتائی جو لاہور میں سعادت حسن منٹو پر چلایا گیا تھا۔ مقدمے کے دوران میں منٹو نے سرکاری گواہ نانک چند ناز سے پوچھا۔ ''آپ کو کون سا لفظ فحش لگتا ہے؟''

ناز نے جواب دیا۔ ''چھاتیاں۔''

منٹو نے کہا۔ ''اب میں چھاتیوں کو مونگ پھلی اور سنگترے تو کہہ نہیں سکتا۔''

اردو ادب سے ہم ڈی ایچ لارنس کی تحریر LADY CHATTERLEY'S LOVER تک پہنچے جس پر فحاشی کے الزام میں ان دنوں انگلینڈ میں پابندی لگی ہوئی تھی۔

وہ کون سا موضوع تھا جس پر میں نے ان دنوں بھوشن سے گفتگو نہ کی ہو۔ ہر موضوع پر وہ عالمانہ انداز میں بحث کرتا اور شرماتے، جھجکتے بولتا۔ میں نے اس کے منہ پر تو نہیں کہا لیکن دل ہی دل میں سوچا کہ یہ فقند ایک دن ضرور کوئی قیامت ڈھائے گا۔

آئی اے ایس کے امتحان شروع ہوئے تو میں بھوشن سے جدا ہو گیا۔ پرچوں کے دوران میں ایک عجیب سی کیفیت مجھ پر چھائی رہتی۔ میں سوال پڑھتا اور مجھے ایسا لگتا جیسے بھوشن مجھے جواب لکھوا رہا ہے۔ اقتصادیات، تاریخ،

ادب..... سب ہی باتیں تو اس نے کی تھیں۔

آخر کار امتحان ختم ہوئے۔ مجھے اپنی کامیابی کا یقین تھا اور ہوا بھی وہی۔ میں پاس ہوگیا۔ سرلا اور میں ایک دوسرے کے لیے چن لیے گئے۔ اس کے فوراً بعد ہمیں ٹریننگ کے لیے مسوری جانا پڑا۔ وہیں ہم دونوں نے شادی بھی کرلی۔ مسوری میں میری بھوشن سے خط کتابت ہوتی رہی۔ پھر یہاں وہاں پوسٹنگ ہوتی رہی اور آہستہ آہستہ اس سے میرا تعلق ٹوٹ گیا۔

☆☆☆

گزشتہ آٹھ برسوں کے دوران سرلا اور میں مسلسل کوشش کرتے رہے کہ ہم دونوں کی پوسٹنگ ایک جگہ ہوجائے لیکن لاکھ کوشش کے باوجود ایسا نہ ہوسکا۔ میں نے شروع کے دنوں میں بہت جتن کیے کہ میں اپنے طریقے سے اپنے علاقے کے حالات کو بدل سکوں، سماجی انصاف اور امن کی فضا پیدا کرسکوں لیکن سیاست دانوں کی آمد و رفت کے سلسلے میں انتظامات اور ان کی چمچہ گیری سے ہی فرصت نہیں ملی تو میں بھی نمک کی کان میں نمک ہوگیا۔ سارے آدرشوں کو بھول کر پیسا کمانے لگا اور رشوت خوری میں طاق ہوگیا۔

اتنے سال بعد اب کہیں جا کر میری اور سرلا کی پوسٹنگ ایک مقام پر ممکن ہوسکی اور وہ بھی ہمارے شہر شملہ میں۔ واپس شملہ آنا ہوا تو میں نے بھوشن کی تلاش شروع کی لیکن اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔ اس کے گھر میں اب کوئی اور رہتا تھا۔ میرا بھائی پردیپ اچار کی ایکسپورٹ کے سلسلے میں اکثر لندن میں رہتا تھا اس لیے اس سے بھی کوئی مدد ملنے کی امید نہیں تھی۔

شاید بھوشن شملہ چھوڑ گیا تھا۔

ایک دن مقامی کلب میں پارٹی تھی۔ کبھی اس کلب میں ہم ہندوستانیوں کا داخلہ بند تھا اور جب کھلا تب بھی میرے جیسوں کا داخلہ یہاں ممنوع تھا۔ میں باہر سے ہی کلب کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتا تھا..... اور آج میں یہاں مہمانِ خصوصی تھا۔ شراب نوشی کا دور چل رہا تھا۔ فضا میں موسیقی تیر رہی تھی اور شہر کے ممتاز رئیس میری توجہ حاصل کرنے کی کوشش کررہے تھے۔

سرلا بار بار آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے اور پینے سے باز رہنے کی تاکید کررہی تھی۔ میں نے سرکشی کے انداز میں اپنا گلاس ایک ہی گھونٹ میں ختم کیا اور قریب سے گزرتے ہوئے بیرے کی ٹرے سے ایک اور جام اٹھالیا۔ ایک لمحے کے لیے میری نظریں بیرے کے چہرے پر رک گئیں۔ ادھیڑ عمر کا بیرا میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا تو مجھے اس کی شرمیلی مسکراہٹ جانی پہچانی لگی۔ میں نے حیرت سے کہا۔

''بھوشن.....! تم.....؟''

''ہاں صاحب! جب آپ کا اور میم صاحب کا تبادلہ یہاں ہوا تھا تو میں نے اخبار میں پڑھ لیا تھا۔''

''تو پھر..... اب تک ملنے کیوں نہیں آئے؟''

''میں سمجھا تھا آپ اب تک مجھے بھول گئے ہوں گے۔''

''نان سینس!'' اتنے میں مجھے کچھ تاجروں نے گھیر لیا تو میں نے بھوشن کو آواز دی۔ ''کل گھر آنا، تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''

☆☆☆

اگلے دن بھوشن میرے گھر آیا۔ میں اس سے گرم جوشی سے ملا۔ اس کا سرلا سے تعارف کرایا۔ ''سرلا! یہ بھوشن ہے، میرا دوست۔ دراصل یہی تمہاری اور میری شادی کا ذمے دار ہے۔''

سرلا نک چڑھی ہے۔ اسے ایک معمولی بیرے کے ساتھ میرا بے تکلفانہ انداز پسند نہیں آیا۔ وہ بہانے سے کھسک گئی۔

''اب بتاؤ۔'' میں نے پوچھا۔ ''یہ تم آٹھ برسوں میں بیس سال بڑے کیسے ہوگئے؟''

اس نے کہا۔ ''میرے جیسے پس منظر کے لوگ بچپن سے سیدھا بڑھاپے میں قدم رکھتے ہیں۔''

''اور یہ کلب میں کیسے پہنچے؟''

''میٹرک کے داخلے کے لیے پیسے نہیں تھے اس لیے امتحان میں نہیں بیٹھ سکا۔ بے کار گھوم رہا تھا۔ کلب کے سیکریٹری نے مہربانی کی۔ تین مہینے کی تنخواہ کے عوض مجھے یہ نوکری دے دی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''شادی ہوئی؟''

''نہیں، اور نہ ہی کروں گا۔''

''کیوں؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہر شخص قدرت کا تراشا ہوا ایک انمول شاہکار ہے..... اور شادی نہ کرنا قدرت کی لاکھوں سال کی محنت پر پانی پھیرنے کے برابر ہے۔''

اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ بات صحیح ہے لیکن اگر مالی پودے کی حفاظت نہیں کرسکتا تو اسے پودا لگانا ہی نہیں چاہیے۔ میرے جیسے کسی اپاہج کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی وجود کو اس دنیا میں لانے کا سبب بنے۔''

☆☆

دو معاشروں کی حقیقی تصویر جن کے درمیان ہزاروں میل کے فاصلے حائل تھے

احمد اقبال

اناڑی

ہمارے اطراف دو اقسام کے کردار و اشخاص پائے جاتے ہیں، ایک وہ جو اپنے شعبے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، کوئی بھی مشکل ان کے لیے مشکل نہیں ہوتی، ہر رکاوٹ ان کے سامنے سرنگوں دکھائی دیتی ہے، انہیں ان کے شعبے کا کھلاڑی کہا جاتا ہے اور کچھ ایک وہ ہوتے ہیں جو سب کچھ ہوسکتے ہیں مگر کھلاڑی نہیں ہوسکتے ..... وہ اناڑی ہوتے ہیں۔ یہ ایسے اناڑی ہوتے ہیں جو کبھی کبھار اپنے اناڑی پن میں وہ کر گزرتے ہیں جو شاید کوئی کھلاڑی بھی نہ کرسکے۔ سسپنس کے آخری صفحات کے لیے دلچسپ اور پرمزاح تحریریں لکھنے والے مقبول اور معروف مصنف احمد اقبال کے قلم سے ایک خوب صورت دلکش اور قہقہہ بار بے مثل کہانی۔

تلخ حقائق کو شیریں انداز میں پیش کرنے والے منفرد مصنف کی تازہ کاوش

لندن میں وہ میری آخری صبح تھی۔

اپنے بیڈروم کی کھڑکی کے پردے ہٹا کے میں نے باہر کی دنیا کو دیکھا تو صبح مجھے اداس لگی۔ غم زدہ سورج نے بادلوں کی نقاب میں چہرہ چھپا رکھا تھا۔ بارش کے قطرے آسمان سے ٹپکنے والے آنسو بن گئے تھے۔ ٹریفک کا سیل رواں ایک سوگوار خاموشی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ افسردہ چہروں والے لندن کے باسی سرگوشی میں باتیں کرتے اور افسوس سے سر ہلاتے نظر آتے تھے۔

سارا لندن گویا سوگ میں ڈوبا ہوا تھا کیونکہ اس بار میں واقعی واپس جا رہا تھا۔ مجھے جانا پڑ رہا تھا۔

حقیقت کا اس منظر نامے سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف میرے احساس کا کرشمہ تھا کہ ساری کائنات پر مجھے اداسی پھیلی نظر آ رہی تھی۔ ورنہ کیا فرق پڑتا ہے کسی کو کہ جناب آپ لندن سے واپس تشریف لے جا رہے ہیں یا اس عالم فانی سے رخصت ہو رہے ہیں۔ میں نے حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے کی کوشش کی۔ بقول شاعر ترک دنیا کا سماں ختم ملاقات کا وقت اور بے وفائی کی گھڑی۔ یہ سب ملول کرنے والے تجربات تو ہر شخص کی زندگی میں ایسے ہی آتے ہیں۔

پھر بھی کیا حرج تھا' میں نے کافی بنانے کے لیے کیتلی کا پلگ لگاتے ہوئے آہ بھری۔ اگر آج میرے اعزاز میں کوئی الوداعی تقریب ہوتی۔ لندن کے شہری مجھے سپاسنامہ پیش کرتے کہ چھ سال قیام فرما کے آپ نے ہماری سات پشتوں پر احسان کیا۔ برطانوی اخبارات اداریوں میں مجھے خراج تحسین پیش کرتے' بکنگھم پیلس پر پرچم سرنگوں ہوتا۔ مگر یہاں تو کسی کو پروا بھی نہیں۔

کافی ختم ہونے تک قنوطیت کے جذبات کا یہ ریلا گزر گیا تو میں نے خود کو قائل کرنے کے لیے اپنی مراجعت کے مثبت پہلوؤں پر غور کیا۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ میری جلاوطنی کا زمانہ ختم ہوا۔ میں پاکستان جا رہا ہوں جو میرا وطن ہے۔ جہاں میرا گھر ہے اور میرے والدین ہیں اور وہ سب ہیں جو مجھ سے چاہت کا رشتہ رکھتے ہیں۔ لعنت اس گوری چمڑی والوں کے دیس پر جہاں نسلی تعصب ہے اور منافرت ہے۔ اپنے مستقبل سے ناامیدی آخر کیوں؟ زندگی کے سفر میں بہت سی خوشیاں اور کامرانیاں بھی آئیں گی۔ اجلے خوابوں والے روشن دن بھی ملیں گے۔ دلدار راتوں میں حسین چہروں کا مہرباں اجالا وہاں بھی ہوگا۔

مگر خوشی پر مجھے اختیار حاصل نہ تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے چھ سال کے لیے مجھے پیرول پر عارضی رہائی عطا کی گئی تھی کہ جاؤ' دنیا کی جتنی خوبصورتی کو اپنے احساس میں سمیٹ سکتے ہو' سمیٹ لو۔ مسرتوں کے جتنے خوابوں کو سچ کر سکتے ہو کر لو۔ لوٹ کر تو تمہیں پھر وہیں آنا ہے جہاں سے چلے تھے کیونکہ دنیا گول ہے۔ چھانگا مانگا یا پنجیوں کی ملیاں سے ناک کی سیدھ میں سفر کرتے ہوئے تم لندن' پیرس سے گزر دیا نیویارک اور ٹوکیو سے' پہنچو گے پھر وہیں' جتھے دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی۔

یہ چھ سال کیسے پلک جھپکتے بیت گئے۔ میں نے ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔ بے فکری اور آزادی کے کیسے ہنگامہ پرور شب و روز تھے' کیا خوبصورت اور خواب صورت زمانہ تھا۔ حسن درعنائی اور کیف و طرب کے کیسے کیسے عنوان تھے۔

مایوسی کے تاریک پردے پر عہد رفتہ کا ہر شوخ لمحہ' ہر نظر نواز چہرہ اور ہر یاد کا رنگین نقش کسی تصویر کی طرح روشن ہوتا تھا اور اپنی آخری جھلک دکھا کے رخصت طلب کرتا تھا کہ رفیق صاحب! یہاں کتاب زندگی کا ایک دلچسپ باب ختم ہوا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور جوزف اندر آ گیا۔ پاکستان میں وہ محمد یوسف صدیقی تھا۔ جب ہم نے ایک ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بہانے پاکستان سے روانگی اختیار کی تو وہ ایم وائی صدیقی ہو گیا تھا مگر امریکا میں اسے جوزف بنا دیا گیا تو اس نے قطعی اعتراض نہیں کیا۔

اس نے اپنی بھیگی ہوئی برساتی اتار کے بڑی بدتمیزی سے صوفے پر ڈالی' اوور کوٹ کو بیڈ پر پھینکنے کے بعد اس نے ہیٹر کے سامنے ہاتھوں کو گھماتے ہوئے کہا ''فیکے پتر! کیا حال ہے تیرا؟''

میں نے کہا ''تو نیویارک سے کب آیا؟''

''بس ابھی ایئرپورٹ سے سیدھا آ رہا ہوں۔ سوچا تیرے جنازے کو ایئرپورٹ تک کندھا دے دوں۔ تیری صورت سے تو واقعی لگتا ہے کہ تجھ پر نزع کا عالم طاری ہے۔''

میں نے کہا ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔''

اس نے ہمدردی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ''یار! ابھی وقت ہے' ہمت سے کام لے اور خودکشی کر لے میرے سامنے۔''

''بکواس مت کر۔ یہ بتا' ناشتا کیا ہے تو نے؟''

''یار! کیا تو تھا..... مگر میں اسے بھول جاتا ہوں' تیرے

ساتھ الوداعی ناشتا کرنا میری اخلاقی ذمے داری ہے۔ میں نے تیری خالہ سے بھی کہہ دیا تھا۔''

خالہ وہ مارتھا کو کہتا تھا جو میری لینڈ لیڈی تھی۔ جب ہم نیچے پہنچے تو وہ موجود نہیں تھی۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے کام سے جا چکے تھے۔ ناشتا مجھے خود بنانا پڑا۔

''کل سے تیری پھر وہی زندگی ہوگی'' یوسف ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

''زندگی.....! میرے لیے وہ عمر قید کی باقی سزا ہے۔''

''اور ایسا صرف اس لیے ہے کہ تو بزدل ہے۔ تجھ میں ہمت نہیں ہے کچھ کرنے کی۔''

میں نے انڈے پر وار کرنے سے پہلے چھری کو شمشیر آبدار کی طرح لہرایا

''یار! میں کیا کروں.....؟''

''پھر وہی فضول سوال..... ابے انکار کردے۔ بغاوت کردے ان سارے بزرگوں کے خلاف جو زبردستی تیرے اخلاق و کردار کے ٹھیکے دار بنے بیٹھے ہیں۔ جو گزشتہ صدی کی روایات اور وضع داری کا بوجھ اب تجھ پر لادنا چاہتے ہیں۔ اب بھی وقت ہے' ان سے صاف کہہ دے کہ میں بالکل ہی بھٹک گیا ہوں صراط مستقیم سے۔ اپنی عاقبت خراب کر چکا ہوں۔ بہتر ہے آپ لوگ مجھے بھول جائیں۔ توڑ دے ساری غلامی کی زنجیریں۔ بھاگ جا بچے! کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ' ناخلف کہلائے گا؟''

میں نے ناشتا میز پر رکھا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا

''دیکھ یار! تو یہ سب پہلے بھی کہہ چکا ہے اور میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ بزدلی نہیں مجبوری ہے۔ تو اپنے حالات کا موازنہ میرے حالات سے کیوں کرتا ہے؟ ایک تو تیرا گھرانا تعلیم یافتہ ہی نہیں روشن خیال بھی ہے۔ میرے خاندان میں قدامت پرستی کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ پھر تو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد نہیں ہے۔ تیرے دو بھائی تجھ سے پہلے باہر جا کے سیٹل ہو چکے تھے۔ ایک آسٹریلیا میں تھا دوسرا کینیڈا میں۔ جب تو امریکا گیا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں سمجھی گئی۔ لاہور میں تیرے دو بھائی فیملی بزنس کو چلا رہے ہیں اور سب ٹھیک ہے۔ نہ کوئی معاشی مسئلہ ہے نہ جذباتی۔''

''نہیں' تو ایک بات بتا مجھے..... کیا ہوگا اگر تو نہ گیا.....؟ کیا وہ تجھے اٹھا کے لے جائیں گے؟''

میں نے کہا ''بالکل ایسا ہی ہوگا۔ خاندانی پولیس فورس کی سربراہ ہے میری دادی۔ وہ کہے گی کہ تم سب ٹھہرو' میں خود جا کے لاتی ہوں اس نمونے کو۔ اور وہ سچ مچ آ جائے گی۔ اپنا آلۂ سماعت وہیں چھوڑ دے گی تاکہ میری ایک نہ سنے۔''

''اور تجھے کان سے پکڑ کے لے جائے گی..... کسی معصوم مینے کی طرح؟'' تو اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

میں نے کہا ''ہاں' تجھے یاد نہیں' جب ہم نے ایک ساتھ پڑھنے کے لیے امریکا جانے کا پروگرام بنایا تھا تو کیا ہوا تھا؟''

اس نے سر ہلایا اور جوتوں سمیت اپنے پیر دوسری کرسی پر رکھ کے بیٹھ گیا۔ ''وہ تو یاد ہے مجھے۔''

''اپنے پیر نیچے رکھ۔ مارتھا آ گئی تو ایسی بے عزتی کرے گی۔''

اس نے بے پروائی سے کہا ''آدمی محسوس نہ کرے تو کوئی بے عزتی نہیں ہوتی۔ اپنا تو یہی اصول ہے۔ جب وہ دس منٹ بک بک کر لے گی تو میں مسکرا کے دس سیکنڈ میں پیر ہٹا لوں گا۔ خیر' تو یہ بتا کہ تو کرے گا کیا وہاں جا کے؟''

میں نے تلخی سے کہا ''اپنی ہارورڈ کی ڈگری کو لگا دوں گا اس فائل میں جس میں میٹرک سے ایم اے تک کی اسناد اور میرے اسکول کالج سے یونیورسٹی کے زمانے تک شاندار کارکردگی پر ملنے والے سارے سرٹیفکیٹ لگے ہوئے ہیں۔ پھر اس فائل کو گوٹے کناروں والے کسی مخملیں غلاف میں لپیٹ کر طاق پر رکھ دوں گا۔ جیسے ہم قرآن کو رکھتے ہیں۔ بڑی عزت احترام کے ساتھ۔ مگر عملی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔''

''آخر ایسا تک ایسی کیا بات ہوگئی؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''کچھ پتا نہیں۔ جب انہوں نے مجھے پڑھنے کے لیے امریکا بھیجا تھا تو میرے سامنے کچھ اور مقاصد تھے۔ اگر وہ مجبور نہ ہوتے تو میری ہر دلیل رائیگاں جاتی۔ اس وقت مجھے اور میرے مستقبل کو محفوظ بنانے کا انہیں اور کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس لیے وہ مان گئے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ مجھے لندن سے بڑی اچھی آفر ملی ہے تو انہوں نے کہا کہ بھئی' اس بارے میں صحیح فیصلہ تم خود ہی کر سکتے ہو۔ یہ بات تجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ امریکا چھوڑ کے میں لندن کیوں آیا تھا' جبکہ مواقع وہاں زیادہ اچھے تھے۔''

''مگر فریال یہاں تھی..... تیرے فیصلے میں دماغ کو نہیں' دل کو فوقیت حاصل تھی۔''

''اس وقت ابا کے خیالات کچھ اور تھے۔ وہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ پاکستان میں ترقی کے مواقع بہت محدود ہیں۔ بڑے بڑے قابل لوگ اس کرپٹ نظام میں ترقی کا مطلب

لندن میں وہ میری آخری صبح تھی۔

اپنے بیڈروم کی کھڑکی کے پردے ہٹا کے میں نے باہر کی دنیا کو دیکھا تو صبح مجھے اداس لگی۔ غم زدہ سورج نے بادلوں کی نقاب میں چہرہ چھپا رکھا تھا۔ بارش کے قطرے آسمان سے ٹپکنے والے آنسو بن گئے تھے۔ ٹریفک کا سیل رواں ایک سوگوار خاموشی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ افسردہ چہروں والے لندن کے باسی سرگوشی میں باتیں کرتے اور افسوس سے سر ہلاتے نظر آتے تھے۔

سارا لندن گویا سوگ میں ڈوبا ہوا تھا کیونکہ اس بار میں واقعی واپس جا رہا تھا۔ مجھے جانا پڑ رہا تھا۔

حقیقت کا اس منظر نامے سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف میرے احساس کا کرشمہ تھا کہ ساری کائنات پر مجھے اداسی پھیلی نظر آ رہی تھی۔ ورنہ کیا فرق پڑتا ہے کسی کو کہ جناب آپ لندن سے واپس تشریف لے جا رہے ہیں یا اس عالم فانی سے رخصت ہو رہے ہیں۔ میں نے حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے کی کوشش کی۔ بقول شاعر ترک دنیا کا سماں ختم ملاقات کا وقت اور بے وفائی کی گھڑی۔ یہ سب طول کرنے والے تجربات تو ہر شخص کی زندگی میں ایسے ہی آتے ہیں۔

پھر بھی کیا حرج تھا' میں نے کافی بنانے کے لیے کیتلی کا پلگ لگاتے ہوئے آہ بھری۔ اگر آج میرے اعزاز میں کوئی الوداعی تقریب ہوتی۔ لندن کے شہری مجھے سپاسنامہ پیش کرتے کہ چھ سال قیام فرما کے آپ نے ہماری سات پشتوں پر احسان کیا۔ برطانوی اخبارات اداریوں میں مجھے خراج تحسین پیش کرتے' بکنگھم پیلس پر پرچم سرنگوں ہوتا۔ مگر یہاں تو کسی کو پروا بھی نہیں۔

کافی ختم ہونے تک قنوطیت کے جذبات کا یہ ریلا گزر گیا تو میں نے خود کو قائل کرنے کے لیے اپنی مراجعت کے مثبت پہلوؤں پر غور کیا۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ میری جلاوطنی کا زمانہ ختم ہوا۔ میں پاکستان جا رہا ہوں جو میرا وطن ہے۔ جہاں میرا گھر ہے اور میرے والدین ہیں اور وہ سب ہیں جو مجھ سے چاہت کا رشتہ رکھتے ہیں۔ لعنت اس گوری چمڑی والوں کے دیس پر جہاں نسلی تعصب ہے اور منافرت ہے۔ اپنے مستقبل سے ناامیدی آخر کیوں؟ زندگی کے سفر میں بہت سی خوشیاں اور کامرانیاں بھی آئیں گی۔ اجلے خوابوں والے روشن دن بھی ملیں گے۔ دلدار راتوں میں حسین چہروں کا مہرباں اجالا وہاں بھی ہوگا۔

مگر خوشی پر مجھے اختیار حاصل نہ تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے چھ سال کے لیے مجھے پیرول پر عارضی رہائی عطا کی گئی تھی کہ جاؤ' دنیا کی جتنی خوبصورتی کو اپنے احساس میں سمیٹ سکتے ہو' سمیٹ لو۔ مسرتوں کے جتنے خوابوں کو بچ کر سکتے ہو کر لو۔ لوٹ کر تو تمہیں پھر وہیں آنا ہے جہاں سے چلے تھے کیونکہ دنیا گول ہے۔ چھانگا مانگا یا چیچوں کی ملیاں سے ناک کی سیدھ میں سفر کرتے ہوئے تم لندن' پیرس سے گزر و یا نیویارک اور ٹوکیو سے' پہنچو گے پھر وہیں' جنتے دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی۔

یہ چھ سال کیسے پلک جھپکتے بیت گئے۔ میں نے ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔ بے فکری اور آزادی کے کیسے ہنگامہ پرور شب و روز تھے' کیا خوبصورت اور خواب صورت زمانہ تھا۔ حسن و رعنائی اور کیف و طرب کے کیسے کیسے عنوان تھے۔

مایوسی کے تاریک پردے پر عہد رفتہ کا ہر شوخ لمحہ' ہر نظر نواز چہرہ اور ہر یادگار رنگین نقش کسی تصویر کی طرح روشن ہوتا تھا اور اپنی آخری جھلک دکھا کے رخصت طلب کرتا تھا کہ رفیق صاحب! یہاں کتاب زندگی کا ایک دلچسپ باب ختم ہوا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور جوزف اندر آ گیا۔ پاکستان میں وہ محمد یوسف صدیقی تھا۔ جب ہم نے ایک ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بہانے پاکستان سے روانگی اختیار کی تو وہ ایم وائی صدیقی ہو گیا تھا مگر امریکا میں اسے جوزف بنا دیا گیا تو اس نے قطعی اعتراض نہیں کیا۔

اس نے اپنی بھیگی ہوئی برساتی اتار کے بڑی بدتمیزی سے صوفے پر ڈالی' اوور کوٹ کو بیڈ پر پھینکنے کے بعد اس نے ہیٹر کے سامنے ہاتھوں کو گھماتے ہوئے کہا ''فیکے پتر! کیا حال ہے تیرا؟''

میں نے کہا ''تو نیویارک سے کب آیا؟''

''بس ابھی ایئرپورٹ سے سیدھا آ رہا ہوں۔ سوچا تیرے جنازے کو ایئرپورٹ تک کندھا دے دوں۔ تیری صورت سے تو واقعی لگتا ہے کہ تجھ پر نزع کا عالم طاری ہے۔''

میں نے کہا ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔''

اس نے ہمدردی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ''یار! ابھی وقت ہے' ہمت سے کام لے اور خودکشی کر لے میرے سامنے۔''

''بکواس مت کر۔ یہ بتا' نا شتا کیا ہے تو نے؟''

''یار! کیا تو تھا..... مگر میں اسے بھول جاتا ہوں' تیرے

ساتھ الوداعی ناشتا کرنا میری اخلاقی ذمے داری ہے۔ میں نے تیری خالہ سے بھی کہہ دیا تھا۔''

خالہ وہ مارتھا کو کہتا تھا جو میری لینڈ لیڈی تھی۔ جب ہم نیچے پہنچے تو وہ موجود نہیں تھی۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے کام سے جا چکے تھے۔ ناشتا مجھے خود بنانا پڑا۔

''کل سے تیری پھر وہی زندگی ہوگی'' یوسف ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

''زندگی.....! میرے لیے وہ عمر قید کی باقی سزا ہے۔''

''اور ایسا صرف اس لیے ہے کہ تو بزدل ہے۔ تجھ میں ہمت نہیں ہے کچھ کرنے کی۔''

میں نے انڈے پر وار کرنے سے پہلے چھری کو شمشیر آبدار کی طرح لہرایا

''یار! میں کیا کروں.....؟''

''پھر وہی فضول سوال..... اب انکار کردے۔ بغاوت کردے ان سارے بزرگوں کے خلاف جو زبردستی تیرے اخلاق و کردار کے ٹھیکے دار بنے بیٹھے ہیں۔ جو گزشتہ صدی کی روایات اور وضع داری کا بوجھ اب تجھ پر لادنا چاہتے ہیں۔ اب بھی وقت ہے' ان سے صاف کہہ دے کہ میں بالکل ہی بھٹک گیا ہوں صراط مستقیم سے۔ اپنی عاقبت خراب کر چکا ہوں۔ بہتر ہے آپ لوگ مجھے بھول جائیں۔ توڑ دے ساری غلامی کی زنجیریں۔ بھاگ جا بچے! کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ' ناخلف کہلائے گا؟''

میں نے ناشتا میز پر رکھا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا ''دیکھ یار! تو یہ سب پہلے بھی کہہ چکا ہے اور میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ بزدلی نہیں مجبوری ہے۔ تو اپنے حالات کا موازنہ میرے حالات سے کیوں کرتا ہے؟ ایک تو تیرا گھرانا تعلیم یافتہ ہی نہیں روشن خیال بھی ہے۔ میرے خاندان میں قدامت پرستی کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ پھر تو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد نہیں ہے۔ تیرے دو بھائی تجھ سے پہلے باہر جا کے سیٹل ہو چکے تھے۔ ایک آسٹریلیا میں تھا دوسرا کینیڈا میں۔ جب تو امریکا گیا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں سمجھی گئی۔ لاہور میں تیرے دو بھائی فیملی بزنس کو چلا رہے ہیں اور سب ٹھیک ہے۔ نہ کوئی معاشی مسئلہ ہے نہ جذباتی۔''

''نہیں' تو ایک بات بتا مجھے..... کیا ہوگا اگر تو نہ گیا.....؟ کیا وہ تجھے اٹھا کے لے جائیں گے؟''

میں نے کہا ''بالکل ایسا ہی ہوگا۔ خاندانی پولیس فورس کی سربراہ ہے میری دادی۔ وہ کہے گی کہ تم سب ٹھہرو' میں خود جا کے لاتی ہوں اس نمونے کو۔ اور وہ سچ مچ آ جائے گی۔ اپنا آلۂ سماعت وہیں چھوڑ دے گی تاکہ میری ایک نہ سنے۔''

''اور تجھے کان سے پکڑ کے لے جائے گی..... کسی معصوم مینے کی طرح؟'' تو اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

میں نے کہا ''ہاں' تجھے یاد نہیں' جب ہم نے ایک ساتھ پڑھنے کے لیے امریکا جانے کا پروگرام بنایا تھا تو کیا ہوا تھا؟''

اس نے سر ہلایا اور جوتوں سمیت اپنے پیر دوسری کرسی پر رکھ کے بیٹھ گیا۔ ''وہ تو یاد ہے مجھے۔''

''اپنے پیر نیچے رکھ۔ مارتھا آ گئی تو ایسی بے عزتی کرے گی۔''

اس نے بے پروائی سے کہا ''آدمی محسوس نہ کرے تو کوئی بے عزتی نہیں ہوتی۔ اپنا تو یہی اصول ہے۔ جب وہ دس منٹ بک بک کر لے گی تو میں مسکرا کے دس سیکنڈ میں پیر ہٹا لوں گا۔ خیر' تو یہ بتا کہ تو کرے گا کیا وہاں جا کے؟''

میں نے تحمل سے کہا ''اپنی ہارورڈ کی ڈگری کو لگا دوں گا اس فائل میں جس میں میٹرک سے ایم اے تک کی اسناد اور میرے اسکول کالج سے یونیورسٹی کے زمانے تک شاندار کارکردگی پر ملنے والے سارے سرٹیفکیٹ لگے ہوئے ہیں۔ پھر اس فائل کو گوٹے کناروں والے کسی مخملیں غلاف میں لپیٹ کر طاق پر رکھ دوں گا۔ جیسے ہم قرآن کو رکھتے ہیں۔ بڑی عزت احترام کے ساتھ۔ مگر عملی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔''

''آخر اچانک ایسی کیا بات ہوگئی؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''کچھ پتا نہیں۔ جب انہوں نے مجھے پڑھنے کے لیے امریکا بھیجا تھا تو میرے سامنے کچھ اور مقاصد تھے۔ اگر وہ مجبور نہ ہوتے تو میری ہر دلیل رائیگاں جاتی۔ اس وقت مجھے اور میرے مستقبل کو محفوظ بنانے کا انہیں اور کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس لیے وہ مان گئے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ مجھے لندن سے بڑی اچھی آفر ملی ہے تو انہوں نے کہا کہ بھئی' اس بارے میں صحیح فیصلہ تم خود ہی کر سکتے ہو۔ یہ بات تجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ امریکا چھوڑ کے میں لندن کیوں آیا تھا' جبکہ مواقع وہاں زیادہ اچھے تھے۔''

''مگر فریال یہاں تھی..... تیرے فیصلے میں دماغ کو نہیں' دل کو فوقیت حاصل تھی۔''

''اس وقت ابا کے خیالات کچھ اور تھے۔ وہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ پاکستان میں ترقی کے مواقع بہت محدود ہیں۔ بڑے بڑے قابل لوگ اس کرپٹ نظام میں ترقی کا مطلب

سمجھ لیتے ہیں دولت مندی اور کام صرف ایک قابلِ عزت مانا جاتا ہے' پیسا کمانا۔ اور پیسے کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس لیے بہتر ہے کہ جہاں قابلیت کی قدر کے مطابق پیسا ملے وہیں کام کرو۔''

''اب ان کے نظریات بدل گئے ہیں؟''

''ایسا ہی لگتا ہے۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہے ہیں میرے لیے؟''

یوسف نے کہا ''یار! اچھا ہی سوچ رہے ہوں گے۔ کیا پتا تجھے سیاسی لیڈر بنانا چاہتے ہوں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے دوست ...... کہ وزیراعظم کے عہدے کے لیے امیدوار نہیں ملے گا' جس سے کہا جائے گا وہ ہاتھ جوڑے گا کہ مجھے تو معاف کرو۔ اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے' اپنی عزت اور جان و مال کو داؤ پر لگانے کی کیا ضرورت ہے مجھے۔ تیرا کیا اندازہ ہے آخر؟''

''وہ ایک شاندار مستقبل کے بجائے مجھے ایک شاندار ماضی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں'' میں نے تلخی سے کہا۔

یوسف ہنسنے لگا ''ابے تمہارا کون سا شاندار ماضی تھا...... خاندانِ غلاماں کے ہونہار سپوت۔ آباؤاجداد سب انگریز کے غلام تھے اور جورو کے غلام تھے۔ یہ تو نے خود بتایا ہے کئی بار۔''

میں نے کہا ''یار! ہماری خاندانی تاریخ بدل گئی ہے۔''

''یہ ہو رہا ہے دنیا میں فکیے پتر! ہر جگہ تاریخ ازسرِنو لکھی جارہی ہے۔ لکھوائی جارہی ہے۔''

''تاریخ ہمیشہ لکھوائی جاتی ہے۔''

''اب کیا ثابت ہوا ہے...... یہ کہ تم خاندانی مغل ہو...... پدرم سلطان بود۔ یا یہ کہ اکبر بادشاہ کا درباری مسخر ملا دو پیازہ تیرا لکڑ بگڑ دادا تھا......؟''

میں نے کہا ''معلوم یہ ہوا ہے کہ ہماری ایک جدی پشتی محل نما حویلی تھی...... اور خاصی بڑی جاگیر۔ انیسویں صدی کے آخر میں میرے ابا کے پردادا اس کے پہلے مالک تھے۔''

وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا ''ویری انٹرسٹنگ...... تیرے ابا کے پردادا نے یقیناً غداری کا انعام پایا ہوگا۔ فرنگی آقاؤں سے۔ بڑے شرم کی بات ہے تیرے لیے۔''

میں نے اپنی خودی کو بلند رکھا ''اُلّو کے پٹھے! یہ جو ہمارے پیارے وطن اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سیاسی وڈیرے ہیں' جو آج اسمبلی میں اور سینیٹ میں بیٹھے ہیں۔ یہ ایسے ہی لوگوں کی اولادیں نہیں ہیں کیا...... خان بہادر' رائے بہادر اور سر کے خطابات کیسے ملتے تھے؟ انہی کی حکومت ہے آج بھی۔''

''او کے ...... او کے! اچانک کلرکی کرنے والوں کے طبقے سے نکل کر تو اشرافیہ میں شامل ہو گیا ہے۔ میں مان لیتا ہوں ...... مگر یہ سب کیسے ہوا؟''

''اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہمارا تعلق ہوتا کسی شاہی خاندان سے تو ہمارے پاس ہوتا ایک شجرۂ نسب جسے ہمارے بزرگ بڑے غرور سے گلے میں لٹکائے پھرتے۔ ہم تو کسی علاقے کے صوبے دار وغیرہ بھی نہیں تھے اور نہ کوتوال۔ کبھی ذکر بھی نہیں ہوا میرے سامنے۔''

''یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ اچانک یہ خاندانی حویلی اور جاگیر کہاں سے آگئی۔ اب تک کہاں تھی......؟''

''تھی تو وہیں جہاں ہے۔ ملتان اور لاہور کے درمیان کوئی جگہ ہے' ست بدھائی۔ اب مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ پانچ دریا تھے تو پنجاب بنا...... ست بدھائی کیسے بنا؟''

یوسف نے کسی دانش ور کی طرح سر ہلایا ''میں فرض کرسکتا ہوں کہ وہاں سات بھائی ہوں گے۔ ان کی بیویاں سات بہنیں ہوں گی اور ان سب کے سات سات بچے ہوئے تو سب نے سات سات بار بدھائی دی یعنی مبارک باد۔''

''بجا ارشاد...... صحیح لوکیشن کا مجھے کوئی علم نہیں کیونکہ دیکھنا تو دور کی بات ہے' میں نے کبھی اس جگہ کے بارے میں کسی خاندانی مؤرخ سے کچھ سنا بھی نہیں تھا۔ تو خالو عنایت کو جانتا ہے؟''

''ہاں...... جو آلو عنایت کہلاتے ہیں حالانکہ صرف ان کا سر آلو جیسا ہے۔''

''ابا نے تو کہا کہ جب تم آؤ گے تو پھر تفصیل سے بات ہوگی۔ خالو عنایت سے ایک دن فون پر بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ میاں' اب نوکری کریں تمہارے دشمن۔ واپس آ کے اپنا راج پاٹ سنبھالو۔ میں نے کریدا تو انہوں نے تاریخ پر اپنی تحقیق کا خلاصہ یوں پیش کیا کہ اس حویلی اور جاگیر پر پہلے دو بھائیوں کے درمیان عداوت ہوئی اور قانونی جنگ چلتی رہی۔ پھر ایک ہار گیا اور دوسرے کو ہارنے والوں نے جنت الفردوس میں جگہ دلوادی۔ وہ حج کی سعادت حاصل کر کے بحری جہاز سے بمبئی آرہے تھے کہ سمندر میں گر گئے۔ نہ کہیں جنازہ اٹھا نہ کوئی مزار بنا۔ اب ہارنے والا قانونی وارث ٹھہرا کیونکہ حاجی صاحب بے اولاد تھے اور اس کی ذمے داری تین بیویوں پر عائد کرتے تھے جن کو وہ طلاق دے چکے تھے۔ خیر و عافیت سے لوٹ آتے تو چوتھی تلاش

کرتے۔ پھر غالباً میرے پردادا اور ان کے بھائی کی اسٹوری ہے۔ تین چار نسلوں میں پھر وراثت کی جنگ چلی۔ اب خاندانی روایت میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی نے اولاد پیدا کی تو زیادہ سے زیادہ ایک۔ مثلاً یہ ناچیز جو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔''

یوسف نے سر کھجایا ''یار! وہ جو تیرا بڑا بھائی تھا...... مرحوم......''

میں نے کہا ''وہ الگ کہانی ہے۔ یہ سمجھ لے کہ وہ میرا سگا بھائی نہیں تھا۔ مجھے بھی یہ بات اس کی وفات کے بعد پتا چلی۔ وہ زندہ رہتا تو شاید مجھے کوئی نہ بتاتا۔ میرے دادا پردادا کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ کبھی کسی کی اولاد نہیں تھی یا ایک بیٹا تھا تو مرگیا......اور معلوم نہیں کیا ہوا کیسے ہوا کہ اچانک اس جاگیر اور حویلی کا کوئی وارث نہیں بچا۔ کسی دعوے کے بغیر ابا اس کے مالک قرار دے گئے۔''

''ابے واہ...... !!لاٹری نکل آئی تیری تو...... مالیت کیا ہوگی اس پراپرٹی کی؟ مجھے سخت حسد محسوس ہورہا ہے۔''

''مجھے کیا معلوم یار! مجھے تو یہ سوچ سوچ کے وحشت ہورہی ہے کہ آخر مجھے لندن سے واپس کیوں بلایا گیا ہے؟''

''یار! عیش کرنے کے لیے اور کس لیے...... حویلی اور جاگیر جس کے پاس ہو وہ کہلاتا ہے جاگیردار یا وڈیرا۔ کام کرتی ہے اس کی رعیت۔ اس کے کھیتوں میں اصطبل اور باغات میں، وہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے، ڈاکو اور کتے پالتا ہے۔ شکار کرتا ہے، غریب ہاریوں کی بہو بیٹیوں کی عزت سے کھیلتا ہے۔ الیکشن لڑتا ہے، اتنے کام ہیں......''

''ابے ہم مڈل کلاس ذہنیت والے لوگ...... شرافت اور اخلاقی قدروں کا بوجھ لاد کر پھرنے والے...... ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ تین نسلوں نے شہروں میں زندگی گزاری۔ ہم نے گاؤں دیہات صرف فلموں میں دیکھے ہیں۔ ہمارا اعلیٰ ترین خواب رہا ہے سول سروس۔ ہم بیوروکریٹ بننے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ کاروبار کی سوجھے تو زیادہ سے زیادہ ایک بہت بڑا جنرل اسٹور ہوتا ہے ہمارے ذہن میں۔ ہم صنعت کاروں کی صف میں شامل ہونے کی ہمت نہیں رکھتے۔''

''تو ہمت کر۔''

میں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا ''اس فرسودہ روایات دقیانوسی خیالات اور قدامت پرستی کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے خاندان میں رہ کے کوئی کیا کرسکتا ہے۔ ڈیری فارمنگ آج کل ایک صنعت ہے۔ دادی اماں واویلا مچادیں گی کہ ہائے ہائے، ولایت میں پڑھ کے یہاں دودھ بیچے گا؟

گھر صحرا سے بدتر ہے

جو اولاد نہیں ہے

آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ نقص چاہے خاتون میں ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس ایجاد کیا ہے جس کے استعمال سے آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں آپ کے ہاں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے آج ہی گھر بیٹھے ہم سے فون پر رابطہ کریں اور بذریعہ ڈاک وی پی (V.P) بے اولادی کورس منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ

ضلع وشہر حافظ آباد ـــــ پاکستان

0300-6526061
0547-521787
0547-522468

اوقات فون
صبح 9 بجے سے دوپہر 2 بجے تک
عصر 4 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں۔ بے اولادی کورس آپ تک پہنچانا ہمارا کام ہے۔

ارے' یہ تو گوجروں کا کام ہے۔ پولٹری فارم یا فش فارم کا مطلب ہے مرغیاں بیچنا اور مچھلی بیچنے والے تو ہوتے ہیں مچھیرے۔ ہم تو اشراف ہیں۔ دادا کی روح فوراً تڑپ کر قبر سے نکلے گی اور وہ خواب میں آ کے دادی کے سامنے دہائی دیں گے۔ ورنہ تو جانتا ہے' آج کل کریڈٹ فائننگ کا دور ہے۔ انوسٹمنٹ کے لیے ہر بینک لون دینے پر تیار ہوگا۔ مگر ہم قرض لیں اور وہ بھی سود پر.....؟ توبہ توبہ..... چچا کے فتوے کے آگے کس کی چل سکتی ہے۔ ہوگا بالآخر یہی کہ زمین اور حویلی وغیرہ سب کو فروخت کر دیا جائے گا۔ کوٹھیاں بنیں گی اور کاریں آئیں گی۔ عورتیں خوب زیور پہنیں گی' شادیوں پر لاکھوں لٹائے جائیں گے۔''

''یار! پھر تو نوکری چھوڑ کے مت جا۔ پہلے جا کے دیکھ کہ سب لوگوں نے کیا سوچا ہے؟''

''میں کوئی پاگل ہوں یار! کہ ان کی باتوں میں آ جاؤں اور ہمیشہ کے لیے بوریا بستر سمیٹ کر چلا جاؤں۔ میں ایک مہینے کے لیے جا رہا ہوں۔ ارادہ تو یہی ہے کہ اس کے بعد واپس آ جاؤں گا مگر سچی بات یہ ہے کہ ابا سے بات کرنے کے بعد مجھے اپنے ارادے پر اعتبار بہت کم ہے۔''

''کچھ بتا بھی ان سے بات کیا ہوئی تھی؟''

میں نے کہا ''چل باہر کہیں لنچ کرتے ہیں۔ باتیں بھی کریں گے' رات کو میں نے فریال کو بلایا ہے ڈنر کے لیے۔''

''پھر وہی فریال.....! ابے کیوں دشمن ہوا ہے اپنی جان کا۔ عقل کے دشمن' جان چھڑا اس سے مجنوں کے بچے! ورنہ کہیں کا نہیں رہے گا۔ وہ صحرا کی خاک چھاننے اور دودھ کی نہر نکالنے والا صدیوں پرانا عشق اب کون کرتا ہے؟ یہ اکیسویں صدی ہے فیکے پتر! سپر کمپیوٹرز اور سیٹلائٹ کمیونی کیشن۔ پاپ میوزک اور فاسٹ فوڈ کا زمانہ ہے۔ شارٹ ٹرم کنٹریکٹ پر تعلق رکھتے ہیں پیار کرنے والے۔ ایک ہفتے' ایک مہینے یا زیادہ سے زیادہ سال بھر کے لیے.....'' وہ سارا راستہ بولتا گیا۔

میں اس سے کیا کہتا..... یہ اس کی سمجھ میں آنے والی بات ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

مجھے واپس بلانے کی تحریک کا آغاز صوفی چچا نے کیا۔ نام تو ان کا نذیر احمد تھا' جوانی میں بڑے انقلابی اور دل پھینک قسم کے نوجوان تھے۔ دادی ان کے کارناموں کو ''کرتوت'' کے نام سے نشر کرتی تھیں تو بہت جز بز ہوتے تھے۔ ایک بار اندرون بھاٹی گیٹ کسی سے دل لگا بیٹھے' کچھ دن چوری چھپے پیار کا کھیل چلا۔ کچھ خط کتابت بھی ہوئی۔ پھر راز فاش ہوگیا اور ظالم سماج کی دیوار بیچ میں آ گئی۔ ملاقات تو کیا اس کی دید کو بھی ترس گئے تو عین اس کے گھر کے سامنے والے گھر میں کسی سے دوستی کی۔ پرانے شہر کی پتلی پتلی گلیاں تھیں۔ اوپر چوبارے اتنے آگے بڑھے ہوئے تھے کہ درمیانی فاصلہ چھ آٹھ فٹ اور کہیں اس سے بھی کم رہ جاتا تھا۔ انہوں نے تیسری منزل کی ایک کھڑکی سے براہِ راست محبوبۂ دلنواز کی خواب گاہ تک فلائی اوور بنانے کا سوچا۔ دس فٹ لمبا اور دو فٹ چوڑا تختہ اپنی کھڑکی سے سامنے والی کھڑکی تک لگایا۔ تختہ دونوں طرف کی چوکھٹ پر بڑی مہارت سے سیٹ کیا۔ سرکس کے بازیگر کی طرح جان ہتھیلی پر رکھ کے اس پل صراط پر سے گزرے اور رات کے آخری پہر میں شادماں دکامراں لوٹ آئے۔ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ زمین پر راستے بند کرنے والے فضائی رابطے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ اسی راستے سے لڑکی کو نکالنے اور دنیا کی نظروں میں دھول جھونک کر فرار ہونے کا پلان فائنل تھا مگر لڑکی پر اس پل کو پار کرنے کے تصور ہی سے لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ چچا اس کا حوصلہ بلند کرنے میں ناکام رہے مگر عشق میں ناکامی ان کو منظور نہ تھی۔ وہ فرہاد جیسے انجینئر نہ تھے کہ دودھ کی نہر نکال لی اور پھر تیشہ مار کے خودکشی فرمالی۔ انہوں نے مسئلے کے مختلف حل تجویز کیے جس میں ایک یہ بھی تھا کہ ان کی محبوبہ اپنی کمر میں ایک رسی باندھ لے اور پل پر چل پڑے۔ رسی کا دوسرا کنارہ چچا کے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ اسے یوں کھینچ لیں گے جیسے ڈور سے بندھی پتنگ کو اتارتے تھے۔ خدانخواستہ اس کے قدم دو فٹ چل کے لڑکھڑا گئے تب بھی وہ نیچے نہیں گرے گی۔ چھ فٹ پر معلق ہو جائے گی اور چچا اسے اوپر اٹھالیں گے۔ لڑکی پھر بھی ڈرتی رہی تو انہوں نے پل کے دونوں جانب رسی کی ریلنگ باندھنے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے یہ خاصا محفوظ طریقہ تھا۔ لڑکی نے اس کی منظوری دے دی مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شب فرار سے ایک روز قبل وہ صبح دم محبت سے بھرپور مستقبل کے پلان کو حتمی شکل دے کر مراجعت فرما رہے تھے کہ تختہ درمیان سے ٹوٹ گیا۔ چچا خلا میں ٹانگیں چلاتے بیس فٹ کی بلندی سے محبوبہ کے ابا پر یوں گرے جیسے پیراشوٹ سے جمپ لگانے والا شومئی قسمت سے دشمن کی توپ پر جا اترے۔ مذکورہ ابا نماز فجر مسجد میں ادا کرنے کے لیے عین اسی وقت گھر کے صدر دروازے سے برآمد ہوا تھا۔ بس ٹائمنگ ایسی ہوگئی کہ چچا کی ٹانگ ٹوٹی۔ جو راہِ عشق میں کوئی عظیم قربانی نہ تھی لیکن اس کے ابا کی دو پسلیاں ٹوٹنے کو

اس کے سوا کیا کہا جا سکتا تھا کہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

ایسے ہی کسی خانۂ خراب عشق میں چچا تارک الدنیا ہوئے۔ دلیپ کمار کی طرح ماتھے پر گرنے والے بال کسی روڈ سائیڈ ہیئر اسٹائلسٹ سے صاف کرادیے۔ شوخ رنگ شرٹس اور بیل باٹم پتلونوں کا اسٹاک کوڑیوں کے مول نیلام کردیا۔ کھدر کا کرتا اور شرعی سائز کا ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہن کے داڑھی بڑھانے کے لیے وہ ہیئر ٹانک منہ پر ملنے لگے جو بالوں میں لگاتے تھے۔ فی زمانہ ان کی ایک بالشت سے بھی زیادہ لمبی لہلہاتی گولڈن داڑھی تھی۔ وہ مہندی نہ لگاتے تو اجلی سفید ہوتی اور وہ سانتا کلاز نظر آتے۔ ان کی صورت جڑواں بھائی کی طرح ملتی تھی۔

میں انہیں صوفی چچا کہتا تھا۔ وہ ایک کوالیفائیڈ پیر تھے۔ دادی کے معاملے میں یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ دروغ برگردن راوی۔ وہ ہمیشہ سچ بولتی تھیں۔ ایک دن وہ صوفی چچا سے کسی بات پر اتنی خفا تھیں کہ انہوں نے صوفی چچا کے ظاہر و باطن کے انقلاب کے اصل حقائق بھی جاری کردیے۔ اس وائٹ پیپر کے مطابق چچا کو انہی جیسے کسی گرو گھنٹال نے خوار کیا تھا۔ اس کے اشتہارات شہر کی ہر دیواروں پر تھے کہ ''محبوب آپ کے قدموں میں'' اس نے نقش اور تعویذ وغیرہ کے نام پر چچا کو خوب لوٹا اور بالآخر کوئی وظیفہ بتادیا کہ فلاں قبرستان میں چالیس رات ایک ٹانگ پر کھڑے ہوکے کرنا ہے یا پتا نہیں سر کے بل کھڑے رہ کر۔ چچا چلہ کاٹ کے لوٹے تو حلیہ بدلا ہوا تھا۔ جب یہ روح فرسا اطلاع ملی کہ جس کی خاطر سارے پاپڑ بیلے تھے' وہ تو دو ہفتے ہوئے پیا کے گھر سدھار گئی تو چچا کی نگاہوں میں دنیا تیرہ و تار ہوگئی۔ خنجر آبدار لے کر وظیفہ بتانے والے پیر کو قتل کرنے نکلے تو گھر کے ایک ملازم نے قدم پکڑ لیے۔ اس کا نام محبوب تھا۔ چچا کو غلطی کا احساس ہوا۔ محبوب واقعی ان کے قدموں میں تھا۔ پیر و مرشد برحق تھے۔ یہ دعویٰ انہوں نے کیا ہی نہیں تھا کہ محبوبہ آپ کے قدموں میں۔ شاید خواتین کے دل کی مراد بر آتی ہو۔

چچا کی دنیا تو بدل گئی تھی۔ حلیہ بھی بدل گیا تھا۔ انہوں نے پیشہ بھی بدل لیا۔ پہلے خدمت خلق کے ایک محکمے میں کلرک تھے' رشوت ہن کی طرح برستی تھی۔ جب چلہ کاٹ رہے تھے تو کچھ عقل کے اندھوں نے ان کی ریاضت دیکھی۔ کسی کو کیا معلوم وہ ایک لڑکی کے چکر میں یہ سب کر رہے ہیں۔ لوگ مرادیں اور نذرانے لے کر حاضر ہونے لگے۔ چلہ پورا ہونے تک خاصی شہرت ہوگئی۔ انہیں اندازہ ہوا کہ کام دلچسپ' آسان اور نوکری سے زیادہ فائدہ مند ہے۔ اب ان کے آستانۂ مبارک پر عقیدت مندوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ عزت' دولت' شہرت کی کمی نہ تھی۔ اب وہ سچ مچ خود کو پیر سمجھنے لگے تھے مگر خاندان والے حقیقت جانتے تھے۔ وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

سب سے پہلے ان کا فون موصول ہوا۔ ''بھتیجے' گزشتہ رات ہم نے ایک بہت برا خواب دیکھا۔''

میں نے کہا ''صوفی چچا! کیا نیلا خواب تھا؟''

انہوں نے گڑبڑا کے کہا ''نیلا خواب......یعنی......؟''

میں نے کہا ''میرا مطلب......کوئی مخرب اخلاق مناظر والا خواب تھا تو...... مجھے شرم آتی ہے۔''

انہوں نے بڑی خفگی کا اظہار کیا ''لاحول ولاقوۃ۔ خواب میں پیر و مرشد تشریف لائے تھے۔''

''یہ تو واقعی برا خواب تھا۔ وہی ہوں گے جن کو دادی کہتی ہیں گرو گھنٹال۔''

''بھتیجے۔ تمہاری عاقبت ہمیں تم سے زیادہ عزیز ہے۔ اس لیے تمہاری گستاخی کو درگزر کرتے ہیں۔ پیر و مرشد نے فرمایا کہ نذیر! سات سمندر پار لحم خنزیر اور ام الخبائث کو حلال سمجھنے والے فرنگی کا فردوں کے ملک میں ایک نجیب الطرفین فرزند اسلام کے قلب کو منور رکھنے والی ایمان کی روشنی پر الحاد و گمراہی کی تاریکی غالب آرہی ہے۔''

میں نے گھبرا کے کہا ''صوفی چچا! آپ کے پیر و مرشد یہ بات اردو میں کہتے تو شاید میری سمجھ میں آتی۔''

انہوں نے کہا ''نامعقول! یہ اردو نہیں تو کیا فرنچ ہے؟''

اس کے بعد انہوں نے سخت تشویش کے ساتھ تفتیش کی اور مجھ سے بیان حلفی لیا کہ میں روم میں وہ سب نہیں کرتا جو رومن کرتے ہیں۔ اور میں نے ہمیشہ کی طرح انہیں یقین دلایا کہ میں بڑی استقامت کے ساتھ صراط مستقیم پر چل رہا ہوں۔ ایسی گائے بکری بلکہ مرغی تک سے پرہیز کرتا ہوں جس کا کردار مشکوک ہو اور یہ پتا چل جائے کہ ایک بھی فارم پر کسی خنزیر سے دوستی رکھتی تھی۔ پانی میں بھی صرف وہ پیتا ہوں جو ایک برادر اسلامی ملک سے امپورٹ ہوتا ہے۔ میموں کا تو مجھ پر سایہ بھی پڑے تو غسل کو فرض سمجھتا ہوں' وغیرہ وغیرہ۔

لیکن بھتیجے سے زیادہ عیار چچا ایسی باتوں سے قائل ہونے والے نہیں تھے۔ انہوں نے کہا ''برخوردار! عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ ہم سمجھ گئے ہیں کہ پیر و مرشد کا اشارہ کیا

تھا۔ تم کو فوراً لوٹ کر پاکستان آ جانا چاہیے ورنہ کسی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ جس سے دنیا و عقبیٰ میں تمہاری اور ہماری رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔''

میں نے کہا ''صوفی چچا! وہاں آ کے میں کیا کروں؟ آپ کی طرح پیر بن جاؤں؟ پاکستان کا پہلا فارن کوالیفائیڈ ایم بی اے پیر' نعوذ باللہ۔ خدا کا ایجنٹ بن کے گارنٹی دینے لگوں' رزق کی' اولاد نرینہ کی' گھر بسنے کی' شفا کی..... ان سادہ لوح کمزور عقیدے والے مجبور انسانوں کو لوٹوں جن کو ہر قسم کے ڈاکو پہلے ہی لوٹ رہے ہیں؟''

معلوم نہیں کیسے میں بے قابو ہو کے اتنا زیادہ بول گیا۔ صوفی چچا ہمیشہ ہی ایسی باتیں کرتے تھے اور میں انہیں بڑی شرافت اور سعادت مندی سے سن لیتا تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف تھے چنانچہ یہ خوش فہمی کسی کو نہیں ہو سکتی تھی کہ دوسرا وہی کہہ رہا ہے جس پر صدق دل سے یقین بھی فرض ہے۔

صوفی چچا باقاعدہ ناراض ہو گئے۔ اسی شام ابا کا فون موصول ہوا۔ ''تم نے چچا سے بدتمیزی کی؟''

میں نے کہا ''ویسے تو میں نے صرف سچ بولا تھا لیکن میں ان سے معافی مانگ لوں گا۔''

''وہ تمہیں کچھ سمجھانا چاہتے تھے۔''

میں نے کہا ''ابا! وہ تو کہہ رہے تھے کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے واپس پاکستان آ جاؤں۔''

''ہاں۔ ان کا بات کہنے کا اپنا انداز ہے۔ تم نے انہیں موقع دیا ہوتا پوری بات کرنے کا تو وہ وضاحت کرتے کہ یہ ہم سب کی خواہش ہے۔''

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا ''اوہ نو ابا جی! ڈونٹ ٹیل می کہ آپ بھی ان کے مرید بن گئے ہیں۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ تمہیں اب واپس آنا ہے۔''

میں نے کہا ''مگر کیوں..... سب خیریت تو ہے ناں ابا جی!''

''ہاں ہاں۔ سب خیریت ہے۔ بس مجھے تمہاری ضرورت ہے یہاں۔'' ابا نے کہا۔

میں تشویش میں مبتلا ہونے لگا ''آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔ چچا نے بھی گھما پھرا کے بات کی تھی۔''

''بیٹا! فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں اور تمہاری امی بالکل ٹھیک ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم کب آ سکتے ہو؟''

میں نے کہا ''اگر ضروری کام ہے تو جو پہلی فلائٹ ملے گی میں پکڑ لوں گا۔''

انہوں نے کہا ''میرا مطلب تھا وہاں کے معاملات نمٹانے میں کتنا وقت لگے گا؟ ظاہر ہے تمہارا کمپنی سے کوئی ایگریمنٹ ہوگا۔ تم کو پہلے سے نوٹس دینا ہوگا۔ اس میں کتنا ٹائم لگے گا اندازاً.....؟''

میں نے حیرانی سے کہا ''یعنی آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ میں اپنی نوکری چھوڑ کے ہمیشہ کے لیے پاکستان آ جاؤں؟''

''بالکل یہی کہہ رہا ہوں۔''

''لیکن کیوں ابا جی! ابھی تو میرا کیریر شروع ہوا ہے۔ بہت محنت کی تھی میں نے۔ دن رات ایک کر دیے تھے اپنی قابلیت کو تسلیم کرانے میں' مستقبل میرے لیے ایک چیلنج تھا۔''

''ایک بہت بڑا چیلنج یہاں بھی تمہارے لیے منتظر ہے۔''

''کیسا چیلنج.....؟ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ پاکستان میں ترقی کے مواقع نہیں ہیں۔ اچھے جاب نہیں ہیں۔''

''اس وقت حالات مختلف تھے۔''

''یہاں میں پاکستان کے حالات سے زیادہ باخبر ہوں۔ میری معلومات کے مطابق حالات بہتری کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ کرپشن' سیاسی عدم استحکام اور اداروں کی تباہی کی وجہ سے سرمایہ کاری رک گئی ہے۔ بے روزگاری بڑھ گئی ہے۔''

''دیکھو۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ابھی میں نے کہا تھا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں خود کچھ کر سکتا تو تمہیں کبھی نہ بلاتا لیکن بیٹا! اب میرے ارادے کی راہ میں میری عمر حائل ہو گئی ہے۔''

میں نے کہا ''ابا جی! اب کیا کرنا ہے آپ کو؟ بہت کام کر لیا آپ نے چالیس سال..... اب آرام کریں' لائف کو انجوائے کریں۔''

''وہ تو میں کر رہا ہوں۔ میں نے اور تمہاری امی نے حج کی سعادت بھی حاصل کر لی گزشتہ سال۔ بڑی بے فکری ہے' اللہ کا بڑا احسان ہے۔ سوچا تو ہم نے یہی تھا کہ تمہارے کیریر کو ڈسٹرب نہیں کریں گے۔ لندن میں ہمارا رہنا مشکل تو ہوگا لیکن ہم تمہیں مشکل میں نہیں ڈالیں گے۔ یہاں نہ رہ سکے تمہارے بغیر تو وہاں آ جائیں گے۔ کچھ دن یہاں کچھ دن وہاں۔ اسی طرح گزارا کریں گے جب تک زندگی ہے۔ جو یہاں ہیں انہیں بھی تو نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن اب اللہ کا بڑا احسان ہے' ایسے اسباب پیدا کر دیے ہیں کہ نہ تمہیں جلاوطن رہنے کی ضرورت ہے اور نہ ہمیں کسی سے دوری کا دکھ جھیلنے

ماہنامہ سسپنس کے علاوہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے 4 اور ماہنامے

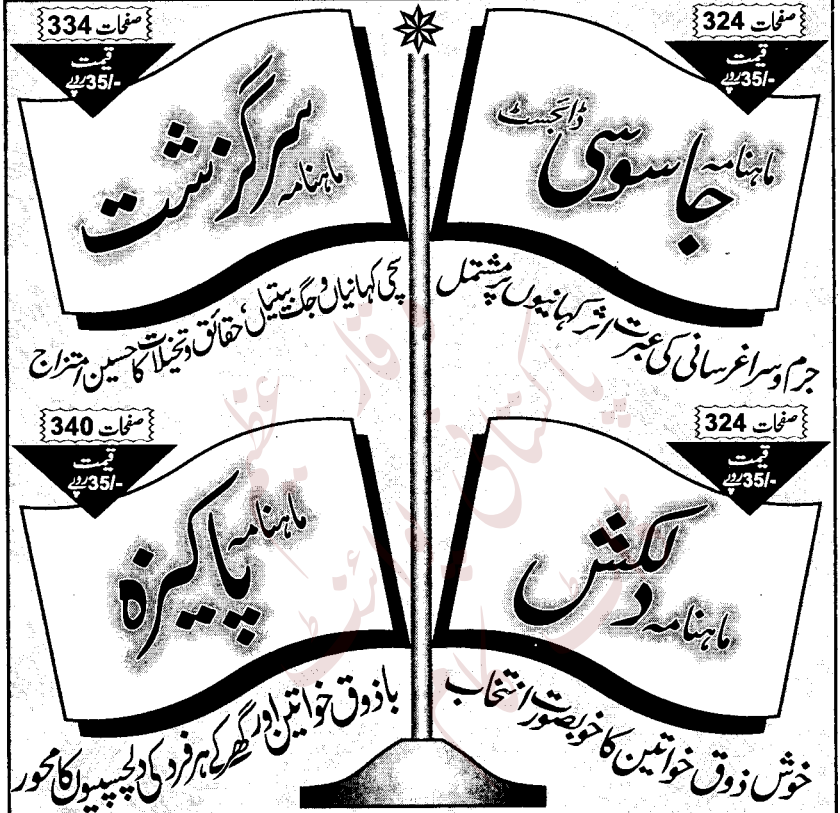

ان تمام ڈائجسٹوں میں ملک کے صف اول کے قلم کاروں کی تحریریں شامل ہوتی ہیں

تازہ شمارہ اپنے نزدیکی بک اسٹال یا ہاکر سے آج ہی طلب فرمائیں

رابطے کے لیے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکس ٹینشن، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-5386783، فیکس: 021-5802551، ای میل: jasoosi@attglobal.net

کی۔''

میں نے کہا ''ایسی کیا بات ہوگئی ہے ابا جی!''

انہوں نے اپنی بات جاری رکھی ''آدمی اتنی جدوجہد کیوں کرتا ہے رفیق بیٹا! پہلے کسی قابل بننے کے لیے دن رات ایک کر دیتا ہے' اس کے بعد اپنی محنت کو کیش کرانے میں جت جاتا ہے۔ لوگ گھربار اور سارے رشتوں کی قربانی دے کر باہر جاتے ہیں۔ گھر والوں سے دور رہنے کا دکھ اٹھاتے ہیں۔ وطن سے جلاوطن ہوتے ہیں اور اکیلے پن کا عذاب برداشت کرتے ہیں' صرف ریال اور ڈالروں کے چکر میں۔ جتنی دولت وہ کمانا چاہتے ہیں یہاں رہ کے نہیں کما سکتے۔''

میں نے مؤدبانہ عرض کی ''ابا جی! کیا دولت کمانا اور اس کے لیے دن رات ایک کر دینا بری بات ہے؟ کم سے کم یہاں رشوت کی ناجائز آمدنی پر تو انحصار نہیں ہے۔ محنت سے حق حلال کی کمائی کرتے ہیں یہاں آنے والے۔''

''نہیں' یہ بات نہیں۔ میں مواقع کی بات کر رہا تھا۔ جن کے لیے یہاں مواقع نہیں' انہیں باہر ضرور جانا چاہیے۔ اپنے اور خاندان کے خوشحال مستقبل کے لیے محنت بھی کرنی چاہیے۔ جلاوطنی کی سختی بھی جھیلنی چاہیے لیکن سب کچھ اپنے گھر اور اپنے وطن میں رہ کر ملے تو پھر سارے جذبات کے رشتوں کا خون کرنے اور دیارِ غیر میں اکیلے پن کا عذاب جھیلنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے بتاؤ' تم وہاں رہ کے کتنا کما لیتے؟ فرض کرو تم لکھ پتی' کروڑ پتی ہو جاتے۔ وہ اللہ کے فضل سے تم ویسے ہی بن گئے ہو۔''

میں نے حیرانی سے کہا ''وہ کیسے ابا جی!''

وہ ہنسے ''پتا چل جائے گا تمہیں جب تم آؤ گے۔''

میں نے کہا ''نہیں ابا جی! مجھے صاف صاف بتائیں کہ معاملہ کیا ہے۔ ایسی کون سی لاٹری نکل آئی ہے ہماری۔ کوئی مدفون خزانہ مل گیا ہے؟''

''بس کچھ ایسا ہی سمجھو رفیق بیٹا! یہ لگتی تو کچھ قصے کہانیوں کی بات ہے مگر سب قدرت کے کھیل ہیں۔ وہ دیتا ہے تو ایسے ہی چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔ ہماری زندگی تو گزر گئی۔ تمہارے نصیب کی بات ہے۔ حق بہ حقدار رسید۔ فون پر میں تمہیں ساری خاندانی تاریخ نہیں بتا سکتا۔ یہ سلسلہ تو کوئی سال بھر سے چل رہا تھا۔''

پھر انہوں نے مجھے محل اور جاگیر کے بارے میں بتایا۔

میری عقل خبط ہوگئی ''ابا جی! آپ کی بات پر میں شک کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ جیسا آپ نے فرمایا' ویسا ہی ہے اگر...... تب بھی میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے وہاں آ جاؤں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

انہوں نے کہا ''مجھے معلوم ہے تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ ہمت' صلاحیت' ذہانت' مستقل مزاجی اور خود اعتمادی۔ اسی لیے تو میں تمہیں بلا رہا ہوں۔ وہاں تم اپنی صلاحیت کا استعمال کر کے منافع کماؤ گے دوسروں کے لیے۔ تمہیں وہی مقررہ معاوضہ ملے گا۔ تم انہیں اپنی محنت سے ایک کے دس اور دس کے ہزار بنا کر دو گے۔ ترقی وہ کریں گے' فائدہ ان کے ملک کو ہوگا' کیا یہ معاشی غلامی۔''

''ابا! آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔''

''ہرگز نہیں بیٹا! میں بہت پریکٹیکل آدمی رہا ہوں ہمیشہ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں کبھی تمہیں باہر نہ جانے دیتا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ جذباتی قربانی دینا ہمارے لیے کتنا مشکل تھا۔ تم اکلوتے بیٹے ہو ہمارے۔ اب یہاں ایک کام ہے جو صرف تم کر سکتے ہو اور ایک چیلنج سمجھ کے۔ خود تمہاری ذات کو تو جو فائدہ ہوگا اس کی کوئی حد نہیں' مگر اس کے ساتھ تمہاری صلاحیت اور توانائی تمہارے وطن کے کام آئے گی۔ آخر پاکستان کے نوجوان کیوں باہر جا رہے ہیں؟ اس لیے کہ یہاں ان کا ہر جگہ استحصال ہوتا ہے خصوصاً نچلی سطح پر۔ ان کے پاس جذبہ ہے' لگن ہے اور صلاحیت ہے مگر وہ مجبور ہیں۔ ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹیں آ جاتی ہیں۔ سرخ فیتہ' اقربا پروری' تعصب' بدعنوانی' تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں مجبوری کی دیواریں گرا کے اپنے ہی وطن میں رہتے ہوئے کامیابی کے راستے پر چلنے کا موقع ملا ہے۔ خود اپنے وسائل سے...... اب تم واپس آ سکتے ہو۔ اپنے وطن' اپنے گھر......''

میں ان کی باتیں سنتا رہا کیونکہ وہ میری سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ جب بالآخر ان کو احساس ہوا کہ وہ صرف فون کے ریسیور سے باتیں کر رہے ہیں تو وہ اچانک چپ ہوگئے۔

میں نے کہا ''ابا جی! میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔ فرض کریں ہمیں کوئی جاگیر اور ایک خاندانی محل مل گئے ہیں...... پھر؟ ہم کیا کریں ان کا......' آپ نے کچھ سوچ کے ہی فیصلہ کیا ہوگا کہ مجھے واپس آ جانا چاہیے۔''

''ہم سب نے بہت سوچا۔''

''باقی سب کی بات تو رہنے دیں' آلو عنایت...... میرا مطلب ہے خالو عنایت' صوفی چچا...... دادی' یہ سب پچھلی صدی کے لوگ ہیں۔ شاید اس سے بھی پہلے کی دنیا کے۔''

''چلو تم یوں سمجھ لو کہ میرے ذہن میں ایک پلان ہے تمہارے لیے۔''

''یعنی یہاں لندن کے اس بین الاقوامی ..... میرا مطلب ہے ملٹی نیشنل کاروباری ادارے میں جو کام میں کر رہا ہوں' وہ زیادہ بڑے پیمانے پر اور بہتر طور پر وہاں کیا جا سکتا ہے؟ میری عقل میں نہیں آتی یہ بات۔''

انہوں نے برہمی سے کہا ''مجھے لگتا ہے چھ سال میں تمہاری عقل پر اس معاشرے کی سوچ غالب آ گئی ہے۔ تم نے جذبات کو اور رشتوں کو غیر اہم سمجھ لیا ہے۔ ترجیح رکھتے ہیں تمہارے ذاتی مفادات۔ وہاں آتے تو تم ہمیں چھوڑ آتے کسی اولڈ ہوم میں۔ اب یہاں ہم اپنے ہی گھر کو اولڈ ہوم سمجھ لیں۔ یہی چاہتے ہو نا تم..... بس اخراجات پورے ہوتے رہیں گے ہمارے۔ اتنا پیسا ہے ہمارے پاس تو اور کیا چاہیے۔'' انہوں نے فون بند کر دیا۔

زندگی میں پہلی بار مجھے یوں لگا جیسے ابا رو نے لگے تھے۔ اچانک میرے منطقی دلائل کے غبار کی ساری ہوا نکل گئی۔ ایک احساس جرم و گناہ کی خلش نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں نے پھر فون ملایا اور کہا ''ابا جی! آپ کی یہی خوشی ہے تو میں آ رہا ہوں'' اور ریسیور رکھ دیا۔

لیکن اس کے باوجود یہ فیصلہ آسان نہ تھا۔ میں رات بھر سوچتا رہا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ اپنے کسی دوست سے یہاں تک کہ عائشہ سے یا فریال سے بھی اس مسئلے پر بات کر سکوں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی زنانہ عقل کو جذبات سے الگ رکھ ہی نہیں سکتیں۔ وہ کہیں گی کہ رفیق! واٹ نان سنس! یہ کیا الف لیلہ کی داستان ہے۔ کیسی جاگیر' کیسی حویلی۔ تم اب لندن کو چھوڑ کے گاؤں کی اس آسیب زدہ حویلی میں رہو گے؟ کمپنی نے تمہیں جو ٹویوٹا لیکسس دے رکھی ہے۔ اس کی جگہ چار گھوڑوں والی بگھی میں پھرو گے اور اپنا حرم آباد کرو گے۔ کنیزیں رکھو گے۔ مجرے کراؤ گے ہر نومولود کی رسم مسلمانی پر..... اور تمہاری یہ ڈگری.....!

صبح میں نے کمپنی کے نائب صدر سے بات کی کہ مجھے لمبی چھٹی چاہیے۔ کم سے کم تین مہینے کی۔

اس نے صاف انکار کر دیا ''لوو ے..... تم چھوڑ کے جا سکتے ہو لیکن تم مجھے پرابلم بتاؤ تو شاید میں چیئرمین کو قائل کر لوں کہ تمہاری جگہ عارضی طور پر کسی کو رکھ لیا جائے۔ تم یقیناً ہمارے لیے قابل قدر رہے۔ تم نے ثابت کر دیا تھا۔''

میں نے کہا ''میرا موقف شاید تمہیں غیر عملی لگے۔ لیکن یہ ہماری پرابلم ہے کہ ہم جذباتی ہیں۔ والدین کے لیے' اولاد کے لیے' وطن اور دین کے لیے۔ یہاں تک کہ گلی محلے کے لیے۔''

میری بات سن کے وہ بہت حیران ہوا ''یقین نہیں آتا کہ تم جیسا تعلیم یافتہ اور ذہین نوجوان اپنی سوچ میں اتنا مجبور ہو سکتا ہے۔ خیر' میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ ایک مشورہ ہے' جاؤ اور دیکھو کہ وہ تمہارے لیے کیا پلان رکھتے ہیں۔ مستقبل تمہارا ہے تو فیصلہ بھی تمہارا ہی ہونا چاہیے۔ ایک ہفتہ اس کے لیے کافی ہوگا۔ اگر تم واپس آنا چاہو تو ہم ویلکم کریں گے..... ورنہ.....''

میں نے سوچ کے کہا ''دو ہفتے نہیں ہو سکتے؟''

تھوڑی سی بحث کے بعد وہ مان گیا۔ ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ پندرہ دن وہ کام چلائیں گے مگر سولہویں دن میری جگہ کوئی اور بیٹھا ہوگا۔ ظاہر ہے اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ ایک دوستانہ مفاہمت کا عمل تھا۔ مجبوری نہیں تھی۔ نہ انہیں کام کرنے والوں کی کمی تھی اور مجھے جابز کی۔ سوچتا میں بھی یہی تھا کہ اپنے مستقبل کے بارے میں ہر فیصلے کا اختیار میرے پاس ہونا چاہیے لیکن یہ فقط آرزو کی بات نہیں تھی۔ ایک اندر کی آواز مجھے یقین دلاتی تھی کہ لیکے پتر! تم اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ خیر سے ولایت کو خیر باد کہو' تمہاری واپسی کے بعد کوئی واپسی نہیں۔

اس رات میں نے فون پر صوفی چچا سے معافی مانگی۔ ''میں اپنی گستاخی پر شرمندہ ہوں'' میں نے منافقانہ لہجے میں کہا' یہ حقیقت نہیں تھا' صرف ابا کی رنجیدگی کا خیال تھا۔ صوفی چچا ان کے حقیقی بھائی نہیں کزن تھے۔ تایا کے بیٹے لیکن' ایک حیرت انگیز اتفاق کے باعث دنیا میں ایک ساتھ ایک ہی دن آئے تھے۔ فرق صرف ایک گھنٹے کا تھا۔ صوفی چچا تو لد ہوئے تو تاریخ بدل گئی۔ انہیں ایک دن چھوٹا قرار دے دیا گیا۔

صوفی چچا نے کہا ''گویا اب تم نے حتمی مراجعت کا عزم صمیم کر لیا ہے۔''

میں نے کہا ''جی.....! کیا کر لیا ہے؟''

وہ بولے ''تم واپس آ رہے ہو ہمیشہ کے لیے۔ فہم و تدبر کے تقاضوں کی پاسداری نے تمہیں نا قابلِ تصور... پُرخطر عواقب سے تحفظ فراہم کر دیا ہے۔''

''اف!'' میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا ''کس نے کیا کر دیا ہے چچا!''

''مطلب یہ کہ بال بال بچ گئے تم..... ورنہ ہم نے اپنے موکلوں کو اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ تمہیں بیک بینی و دو گوش ہماری خدمت میں حاضر کر دیں۔''

میں نے کہا ''موکل یعنی جنات! آپ اپنے احکامات منسوخ نہ کریں صوفی چچا! مقصد تو وہاں پہنچنا ہے۔ پی آئی

اسے لے جائے یا جنات لے جائیں۔ میرے ٹکٹ کے پیسے بچ جائیں گے۔''

صوفی چچا پھر خفا ہو گئے۔ ''اس انداز تمسخر سے صیہونیت کے ملحدانہ طرز فکر سے مسموم ذہن کی خُوعیاں ہے۔''

میں پھر چکرا گیا ''جی...... بجا ارشاد!''

''کیا؟'' انہوں نے گرج کے کہا ''اس درجہ دیدہ دلیری...... گویا تم اعتراف جرم کرتے ہوئے انفعال کے جذبات سے لاتعلقی کی روش پر گامزن ہو۔''

میں نے گھبرا کے کہا ''صوفی چچا! چھ سال امریکا برطانیہ میں رہ کے میں تو اردو بھی بھول گیا ہوں۔ آپ فارسی بول رہے ہیں۔ مجھے تو صرف یہ عرض کرنا تھی کہ اسی ہفتے میں لاہور پہنچ رہا ہوں، اللہ حافظ!''

اگلے چند دنوں میں خالو عنایت نے فون پر مجھے وہ نظم سنائی جو انہوں نے بطور خاص میرے استقبال کے لیے کہی تھی۔ اس کا آخری شعر نماز فجر کے وقت نازل ہوا تھا۔ پاکستان کے معیاری دقت کا حساب کیے بغیر انہوں نے فوراً کال بک کرائی اور میں نے رات دو بجے سوتے سے جاگ کر پہلے چند اشعار پر اونگھتے ہوئے کہا ''واہ خالو عنایت!'' مگر اس کے بعد پھر نیند غالب آ گئی۔ صبح میں نے ریسیور کو اپنے سینے پر رکھا دیکھا۔ غالباً اپنی عاقبت نااندیشی کے باعث میں خاندان کے ایک اور بزرگ کی دل آزاری کا مرتکب ہو چکا تھا۔

دادی کا فون میں نے چند منٹ سنا۔ پھر مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے کان میں آلۂ سماعت نہیں لگا رکھا ہے چنانچہ میں نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور آرام سے ایک فلم دیکھتا رہا۔ دادی کو سنانے سے غرض تھی، سننے سے نہیں۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے پھر ریسیور کان سے لگایا تو وہ حویلی کی تاریخ کا نہ جانے کون سا باب سنا رہی تھیں۔ اچانک لائن کٹ گئی تو میں نے خوشی سے بغلیں بجائیں اور ریسیور کو ایسے ہی پڑا رہنے دیا۔

☆☆☆

یوسف نے ایک آہ بھر کے کہا ''فیکے پتر! ایک آئس کریم اور منگوا...... پھر میں چلتا ہوں۔''

میں نے کہا ''تو نے کہا تھا مجھے سی آف کرے گا۔''

''ہمیشہ کی طرح بکواس کی تھی میں نے۔ میں نے سوچا آخری بار تیرا چہرہ دیکھ لوں۔ لندن آنا تو آسان تھا۔ ست بدھائی آنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں جہاں تیری دکھ بھری زندگی کے باقی دن ان جانوروں کی طرح بسر ہوں گے جن کا حوالہ عبرت کے لیے دیا جاتا ہے۔ کولھو کا بیل، دھوبی کا کتا، گھر کی مرغی، مجھے شام کی فلائٹ سے واپس جانا ہے۔''

میں نے کہا ''نہیں جائے گا تو کیا ہوگا؟''

اس نے ادھر ادھر دیکھ کے بڑی رازداری سے انکشاف کیا ''یار! کل میری منگنی ہے، مجھے انگوٹھی پہنانی ہے کسی کو۔''

میں نے کسی خوشی یا حیرت کا اظہار نہیں کیا ''انگوٹھی وہی ہے؟''

اس نے شرمندہ ہوئے بغیر اعتراف میں سر ہلایا ''یہ تو آپ ہی سے سیکھا تھا اس ناچیز نے۔ استاد محترم!...... کہ بیٹا' نقلی ہیرے کی انگوٹھی خرید و ہمیشہ۔ ننانوے فیصد لڑکیاں اصل اور نقل میں فرق کو سمجھ ہی نہیں سکتیں۔''

میں نے کہا ''رائٹ۔ باقی ایک فیصد کسی جوہری کی بیٹی ہوتی ہیں۔''

''مزید یہ کہ انگوٹھی واپس نہ ملے تو نقصان نہیں ہوتا۔ اللہ معاف کرے، ہم بڑے گنہگار ہیں۔ کتنے دل توڑے ہیں ہم نے۔''

میں نے بڑی حسرت سے اپنے ماضی قریب کو یاد کیا ''واقعی یار! پہلے یہ سب کتنا اچھا لگتا تھا۔ فتوحات میں ایک اور اضافہ۔ سرخاب کا ایک اور پر، ڈیٹ...... ڈبل ڈیٹ۔ اور اعتماد حاصل کرنے کے لیے انہیں پرپوز کرنا۔ جذباتی استحصال کا کھیل۔''

''جسمانی استحصال کا گناہ تو جیسے آپ نے کبھی کیا ہی نہیں۔ اور یہ کھیل تھا تو کیا ہم اکیلے کھیل رہے تھے؟ ہمارا استحصال نہیں ہوا، بس یہ عورتیں معصوم اور مظلوم ہونے کا ڈراما زیادہ اچھا کر لیتی ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''نہیں یار! یہ ہوتی ہیں بے وقوف! یا یہ سمجھ لے کہ جذباتی طور پر کمزور، فطری طور پر رفاقت میں تحفظ کی چھتری تلاش کرنے والی۔ انہیں لائف ٹائم گارنٹی ملے اعتماد اور تحفظ کی تو وہ ہر قربانی دینے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ مرد کبھی خود کو اتنا INSECURE محسوس نہیں کرتے۔ سہارا انہیں ڈھونڈتے پھرتے۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر ہنس پڑا ''ایشا نے تجھے یہ فلسفہ دیا ہے؟ ایشا عرف عائشہ!''

میں نے کہا ''کیا تو اس سے انکار کر سکتا ہے؟''

''اور فریال...... !اس نے کیا' کیا تیرے ساتھ؟'' وہ تلخی سے بولا ''قربانی کا بکرا بنا رکھا ہے تجھے۔ مسلسل چھری تلے رکھتی ہے۔''

میں نے بہتر سمجھا کہ فوراً ہتھیار ڈال دوں ''اب تو میں

جارہا ہوں یار! سارا قصہ ہی ختم۔''

اس نے کہا ''یار یقین نہیں آتا کہ اتنی آسانی سے تو نے گوٹرن لے لیا ہے۔ جیسے بچے جمورے سے کوئی مداری کہتا ہے گھوم جا۔ تو وہ کہتا ہے گھوم گیا۔ آگے بڑھتے بڑھتے تو اچانک پیچھے چل پڑا ہے۔ کسی پریشانی یا مزاحمت۔ غصے یا پچھتاوے کے بغیر۔''

میں نے کندھے ہلا کے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا ''پتا نہیں تو اسے میری خوبی سمجھتا ہے یا خامی۔ ہم سب زندگی کو ایسے ہی جیتے ہیں۔ جیسی ہے جہاں ہے کی بنیاد پر۔''

''یعنی اب سے دس بیس برس بعد کبھی میں آ گیا موضع ست بدھائی تو میری ملاقات ہوگی ایک زمیندار سے۔ ایک قدیم حویلی میں جہاں زنان خانہ ہوگا۔ بیویوں کا اصطبل..... اور گھوڑوں کا اصطبل۔ تو مجھے اعلیٰ نسل کی بھینسیں دکھائے گا۔ یہ بتائے گا کہ کون سی بھینس کتنا دودھ دیتی ہے اور کون سی بیوی کتنے بچے دے چکی ہے۔ اس سال کتنی کپاس ہوئی اور کتنی گندم۔''

میں نے خفگی سے کہا ''اور تو خود کیا دیکھتا ہے اپنے لیے؟ کیسی ہوگی تیری فیملی؟ اس فیملی میں تیرا مرتبہ کیا ہوگا؟ امریکی معاشرے میں بالآخر تجھے اپنی آئیڈیل عورت مل جائے گی جو زندگی کے تیس چالیس سال تیرے ساتھ اپنی قربانیوں سے تجھے خوش رکھتے گزار دے۔ جیسے کبھی کوئی تجھ سے بہتر نہ لگے اور وہ تجھے چھوڑ کے نہ جائے۔ اور یہ تیری اولاد..... بیٹے بیٹیاں' پوتے نواسے۔ کوئی پوچھنے والا ہوگا تجھے؟ کیا ہوگی تیری ENOTIONAL سیکورٹی کسی اولڈ ہوم میں۔ سوشل سیکورٹی کافی ہے تجھے۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا ''فیکے پتر! تو چاہتا ہے میں ڈپریشن میں مبتلا ہو جاؤں۔''

میں نے کہا ''ہوگیا تو کیا..... سب کی طرح تو بھی پروزیک کھانا شروع کر دینا۔ چل ابھی وقت ہے' میں تیرے ساتھ ایرپورٹ چلتا ہوں۔''

میں تیرے دوستانہ جذبات پر مبنی پُرخلوص کوٹھکرانے پر مجبور ہوں فیکے پتر! کیونکہ میں نے پھر جھوٹ بولا تھا تجھ سے' میری فلائٹ رات کو ہے' ابھی میں جاؤں گا کرس کے پاس'' اس نے کہا۔

میں نے کہا ''کون کرس؟''

''کرسٹینا ہڈسن! کیا اس کا پتا اور فون نمبر بتاؤں میں؟'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا ''الو کے پٹھے۔ شرم نہیں آتی تجھے؟''

''نو سر! کیونکہ اسے بھی شرم نہیں آتی۔ ہم دونوں اتنے ہی بے شرم ہیں جتنا یہاں ہونا چاہیے۔ وہ کچھ عرصہ نیویارک میں میرے ساتھ بھی رہی۔ اس کے علاوہ دوست! کیا ہم ایک دوسرے کے کپڑے نہیں پہنتے رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے پیسے نہیں چراتے رہے ہیں..... پھر ایک لڑکی کے لیے اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔''

جب یوسف گلے مل کر رخصت ہوگیا تو مجھے بہت سے کام یاد آئے۔ کچھ لوگ اب بھی باقی تھے جن سے مجھے الوداعی ملاقات کرنی تھی۔ کچھ لوگوں سے میں نے قرض لیا تھا اور لوٹایا نہیں تھا۔ کچھ میرے مقروض تھے۔ شاید لینے دینے کا حساب کیا جاتا تو برابر ہی نکلتا۔ پھر تردد کیسا؟ کچھ لوگوں کے چہرے میں نے مدت سے نہیں دیکھے۔ کچھ شاید آج بھی میرا چہرہ دیکھ کر خوش نہ ہوں۔ بہتر ہے میں خاموشی سے نکل جاؤں۔ اگر پھر واپس آنا ہوا تو کبھی نہ کبھی ملاقات ہو ہی جائے گی۔

آج کی شام کو میں نے ان کے لیے وقف کر دیا تھا جن کے ساتھ میرے تعلق کی حیثیت جذباتی وابستگی اور کاروباری جان پہچان سے کہیں زیادہ تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود میں نے فریال کو فون کر دیا تھا اور مجھے یقین نہ آیا جب اس نے کہا کہ ڈنر تو خیر ناممکن ہے مگر میں چائے پینے ضرور آؤں گی۔

ایک ہفتے تک میں سوچتا رہا۔ ارادے باندھتا رہا اور توڑتا رہا۔ کبھی ہاں' کبھی نا..... لیکن بالآخر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ عقل کی ساری منطق مزاحمت اور ناراضی پر دل کی ایک ضد غالب آئی۔

میں نے اسے فون کیا۔ ایک پبلک کال آفس سے اور اپنی آواز بدل کے۔

وہ ہنسنے لگی ''کیسے ہو؟''

میں نے کہا ''ویسا ہی جیسا تھا۔ بدلنا چاہتا ہوں تمہاری طرح مگر نہیں بدل سکتا' کیا کروں؟''

''اچھا..... طعنہ دے رہے ہو۔ کوئی بات نہیں' میں طعنہ پروف ہوگئی ہوں چھ سال میں۔''

میں نے اسے بتایا ''میں جا رہا ہوں پاکستان!''

''کتنے دن کے لیے' خیریت تو ہے نا؟''

میں نے کہا ''شاید واپس نہ آؤں میں۔''

''کوئی بڑی زبردست آفر ہوئی ہے.....؟ وزیر سفیر تو نہیں بن رہے ہو؟''

میں نے کہا ''میری شادی ہو رہی ہے۔''

وہ ہنسی ''مبارک ہو۔ فی الحال گزارا کرد جو بھی ملے۔

اگر بالکل ہی صبر نہیں ہوتا۔''

میں نے جل کے کہا ''بعد میں کیا ہوگا؟''

''ہونے کو کیا نہیں ہوسکتا۔ تم ایک کے بعد دوسری پھر تیسری کرلو۔ بس میری جگہ خالی رکھنا۔ کیونکہ بالآخر میں سب سے چھین لوں گی تمہیں۔''

''پلیز شٹ اپ فریال! پتا نہیں کیوں میں نے تمہیں فون کردیا۔ میں کل صبح جارہا ہوں۔''

''اتنی ایمرجنسی میں کس سے شادی کررہے ہو اور کیوں؟''

میں نے خود کو پرسکون رکھا ''ابا نے کہا ہے کہ نوکری چھوڑو اور واپس آجاؤ۔''

''شادی کے لیے نوکری چھوڑنے کی کیا تک ہے؟ اسے لے آنا یہاں۔''

میں نے چلا کے کہا ''کون اُلو کا پٹھا کررہا ہے شادی؟ نہیں کروں گا میں کسی سے بھی شادی..... بھی نہیں کروں گا۔''

''سوائے میرے..... اوہ رونی! آئی لو یو!'' اس نے فون پر چٹاخ سے چومنے کی آواز پیدا کی ''مجھے معلوم تھا۔''

''دیکھو فریال! میں ملنا چاہتا ہوں تم سے..... آخری بار۔''

''بکومت۔ یہ آخری بار کیا ہوتا ہے..... ہمیں ملنے سے کون روک سکتا ہے؟''

''ہاں' تمہارا وہ نامرد مجازی خدا..... میرا رقیب روسیاہ!''

''اتنے جذباتی کیوں ہورہے ہو آج! میں نے انکار تو نہیں کیا' اچھا یہ بتاؤ کہاں ملو گے؟''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''وہیں.....''

''او کے! ٹائم بتاؤ..... میں آتی ہوں۔''

''چھ بجے ہیں ابھی..... میں وہاں جاکے بیٹھ جاتا ہوں اور بیٹھا رہوں گا رات آٹھ بجے تک۔''

''کیوں' رات بھر کیوں نہیں..... اچھے چاہنے والے ہو تم!'' اس نے شوخی سے کہا اور فون بند کردیا۔

اگرچہ مجھے اس کے وعدے پر ذرا بھی یقین نہیں تھا مگر میں ٹاور برج کے اس ریسٹورنٹ میں جاکے بیٹھ گیا جہاں سے میں اس راستے پر نظر رکھ سکتا تھا جدھر سے اسے آنا تھا۔ اس وقت چھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ خود مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ یہاں میں کب تک انتظار کروں گا۔

آٹھ بجے کی بات تو میں نے ایسے ہی کہہ دی تھی۔

نوعمر ویٹریس نئی تھی۔ آرڈر لینے سے زیادہ عندیہ لینے والی مُرتبسم ادا کے ساتھ وہ میری طرف آئی تو میں نے اسے بڑی رکھائی کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ ''ابھی میں کسی کا انتظار کررہا ہوں'' میں نے کہا۔ فوری طور پر میرا چائے یا کافی پینے کا موڈ نہ تھا۔

یوسف کا آنا مجھے اچھا لگا تھا۔ اس کے جانے سے میں اداس ہوگیا تھا۔ اس کا اور میرا ساتھ پرائمری اسکول سے شروع ہوا اور میٹرک پاس کرنے تک رہا۔ بلحاظ فطرت ہم بیشتر معاملات میں اختلاف رکھتے تھے۔ میں پڑھا کو تھا اور اسے مجبوراً پڑھنا پڑرہا تھا۔ چنانچہ میں اپنا ہوم ورک کرنے کے بعد اس کی مدد کرتا تھا۔ ہر امتحان سے پہلے اپنے ساتھ اس کی تیاری بھی کراتا تھا۔ میں ڈویژن کے اور فرسٹ آنے کے چکر میں رہتا تھا۔ اسے صرف پاس ہونے سے غرض تھی۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ ایک تہائی نمبر حاصل کرنے کے لیے صرف ایک تہائی نصاب پر محنت کرے اور وہ بھی تعلیمی سال کے ایک تہائی دنوں میں۔ یعنی اسکول میں اگر چھ مہینے پڑھائی ہوتی تھی تو وہ دو مہینے پڑھ کے پاس ہونا چاہتا تھا۔ باقی چار مہینے اس کی ساری توجہ غیر نصابی سرگرمیوں کی طرف رہتی تھی مثلاً کرکٹ اور آوارہ گردی۔ ہر امتحان سے پہلے میں نصاب کا نچوڑ دس سوالات کی صورت میں نکالتا تھا اور اسے یقین دلاتا تھا کہ پرچے میں سات ضرور آئیں گے اور چوائس کا مطلب ہے پرچا سو فیصد یہی ہوگا۔ پھر وہ اطمینان سے پانچ سوالات کاٹ دیتا تھا۔ ''یار فیکے! مروا مت دینا۔ بس پانچ سوال پکے پکے ہوجائیں تو سمجھ لے بیڑا پار۔ پچاس فیصد میں سے تینتیس فیصد نمبر تو ملیں گے نا۔''

میں اسے پانچ سوال کی تیاری کراتا تھا۔ عام طور پر میرا گیس صحیح ہوتا تھا مگر اس کے باوجود نقل میں مجھے اس کی مدد کرنا پڑتی تھی۔ اس کام میں وہ جینیئس تھا اور ایسے ایسے طریقے ایجاد کرلیتا تھا کہ ماہرین بھی دم بخود رہ جاتے تھے۔ اس کے باوجود کبھی وہ ایک پرچے میں بھی فیل ہوجاتا تھا تو مجھ سے لڑتا تھا۔ ''یار فیکے! اچھی دوستی نبھائی تو نے۔ مروادیا نا' بڑا قابل بنتا تھا۔''

''یار یوسف! میرا کیا قصور.....''

''اور کیا میرا قصور ہے' میں نے وہی لکھا جو تو نے بتایا۔ پھر نمبر کیوں نہیں آئے؟''

''لکھنے والا تو خود تھا۔ پتا نہیں کیا لکھا تو نے؟''

''اب ایسا بھی نہیں کہ مجھے پڑھنا نہیں آتا تو لکھنا بھی نہیں آتا۔ اب ایک ہفتے تک مصیبت رہے گی گھر میں۔ شودروں والا سلوک ہوگا میرے ساتھ۔ جوتے الگ پڑیں

گئے' صرف تیری وجہ سے۔''

''مجھے کیوں الزام دے رہا ہے' کاپی نکلوالے۔''

وہ آہ بھرتا ''کاپی تو نکلوالوں..... مگر جواب غلط نکلے تو کیا ہوگا؟ بڑا رسک ہے اس میں فیکے! گھر جا کے دگنے جوتے پڑیں گے۔''

میں مار پیٹ میں کمزور تھا۔ ایسے متعدد مواقع آئے جب بزدلی سے کام لینے کے باوجود کوئی زبردستی گلے پڑ گیا۔ میری سوجی ہوئی ناک یا پھٹے کپڑے دیکھ کر یوسف پہلے تو بڑی لعن طعن کرتا تھا۔ اب پھر مار کھا کے آیا ہے سالے' شرم سے ڈوب مر۔ تیرے ساتھ میری بے عزتی ہوتی ہے کہ ایسے..... دوست ہیں اس کے۔ جو لفظ وہ استعمال کرتا تھا وہ بہت عام فہم تھا۔ آج بھی انہی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

اگلے دن وہ میری حمایت میں فوج کشی کرتا تھا اور ''دوست'' کے دشمنوں کا حشر نشر کر دیتا تھا۔ یہ دوستی ایسے ہی جڑ پکڑتی گئی لیکن دوستی کے اس شجر کا سایہ میرے اور اس کے خاندانوں تک نہ پھیلا حالانکہ ہم رہتے بھی ایک ہی گلی میں تھے۔ اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔ یوسف کے ابا کا تعلق قریش برادری سے تھا۔ ان کی گوشت کی دکان پہلے گلی کے موڑ پر تھی۔ پھر وہ مین مارکیٹ میں چلے گئے۔ اگلے دس برسوں میں انہوں نے اپنے بھائیوں کی مدد سے شہر کے دیگر علاقوں تک کاروبار کو پھیلایا۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ بچے کاروبار میں ان کے توسیع پسندانہ عزائم کا ساتھ دیں لیکن بیوی کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ ماں نے صاف کہہ دیا کہ تم خود کو لاکھ قریشی صاحب کہو' لاکھوں کما لو مگر یہاں ہاتھ سے کام کرنے والے کو نہ عزت ملی ہے نہ ملے گی۔ زبانی باتیں لوگ جتنی چاہیں کر لیں مگر بچے ان پڑھ اور اسی پیشے میں رہے تو ہمیشہ قصائی کہلائیں گے اور کسی تعلیم یافتہ مہذب اور اچھے گھر میں انہیں قبول نہیں کیا جائے گا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ بیٹی کوئی نہیں ورنہ جاتی ہمارے جیسے ہی کسی گھر میں۔

اس کی سوچ غلط نہیں تھی۔ یہ منافق معاشرہ کسی حق حلال کی روزی کمانے والے کو نام کی عزت تو دیتا ہے' دل سے عزت دار تسلیم نہیں کرتا۔ نائی کو باربر' حجام' خلیفہ' ہیئر ڈریسر' ہیئر اسٹائلسٹ یا کلپر کچھ بھی کہئے' ایک رشوت خور قسم کا کلرک بھی بڑی حقارت سے کہتا ہے' میں آمدنی کو کیا دیکھوں' ہے تو وہ نائی کی اولاد۔

ماں کی وجہ سے بچوں نے پڑھا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ظاہر ہے پھر وہ دکان پر باپ کے شریک کار نہ بن سکے۔ جب ہم نے میٹرک کر لیا تو یوسف کے والد ایک دن فریادی بن کے ابا سے ملے۔

ابا نے میٹرک کے امتحان میں یوسف کی کامیابی پر انہیں مبارک باد پیش کی۔ ''ماشاءاللہ اچھے نمبر لیے ہیں۔''

وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئے ''اجی رشید صاحب! کیا کریں ہم اچھے نمبروں کا' ہمیں تو فکر پڑ گئی ہے آگے کی۔''

''کیوں قریشی صاحب' کیا ہو گیا؟''

''اولاد کس لیے ہوتی ہے رشید صاحب!'' وہ بولنے لگے ''اس لیے کہ بڑھاپے میں ماں باپ کا سہارا بنے۔''

''وہ تو انشاءاللہ ہوں گے۔''

''اجی کیا خاک ہوں گے۔ ہم نے سوچا تھا کہ بچے بڑے ہوں گے تو ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔ کاروبار ترقی کرے گا مگر ماں نے ڈال دیا انہیں پڑھنے لکھنے کے راستے پر۔ یوسف بھی ضد کر رہا ہے کالج میں جانے کے لیے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''کیا اچھی بات ہے رشید صاحب! پڑھ لکھ کے کیا کرتا ہے آدمی! وہی نوکری..... آپ نے بھی تو بہت پڑھا تھا۔ خیر سے وہ امتحان پاس کر لیا تھا' مقابلے کا۔ کلاس ون افسر بنے' بڑی ترقی کی مگر پیسا کتنا ملا ساری عمر نوکری کر کے؟''

''قریشی صاحب! پیسا ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔''

''چھوڑو جی رشید صاحب! زمانے کو آپ بھی دیکھ رہے ہو۔ عزت کس کی ہے۔ پروفیسر کی یا اسمگلر کی۔ ٹی وی اور اسٹیج پر ناچنے گانے والے لڑکے لڑکیاں کتنا کما رہے ہیں اور کتنی عزت ہے ان کی۔ پیسے کے بغیر خالی عزت کس کام کی۔ آدمی جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔ ہم نے تو سوچا تھا ائرکنڈیشنڈ دکانیں ہوں گی کلفٹن میں' ڈیفنس میں..... وہیں رہیں گے'' اس نے سخت ملال سے سر ہلایا۔

''اللہ نے چاہا تو پڑھ لکھ کے بھی بچے آپ کے خواب پورے کر دیں گے'' ابا نے کہا۔

''یہ بھی خواب کی باتیں ہیں رشید صاحب! پڑھ لکھ کے وہ نکل جاتے ہیں امریکا اور کینیڈا..... اور لوٹ کے نہیں آتے۔ بھول جاتے ہیں کہ ہمیں پیدا کرنے والے ماں باپ بھی تھے۔''

ابا نے انہیں ٹالنے کی بہت کوشش کی ''دیکھیے نا قریشی صاحب! زمانہ بدل گیا ہے' فکرِ معاش میں پہلے لوگ گاؤں سے شہر آتے تھے۔''

''اجی یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ فکرِ معاش تو ہوتی ہے مجبوری۔ آدمی کو ہاتھ بھی پھیلانا پڑ جاتا ہے۔ مگر ان لونڈوں

کے لیے کمائی کرنا کوئی مسئلہ نہیں' بڑی گنجایش ہے یہاں مگر یہ باہر جا کے دوسروں کے لیے سب کچھ بیچ لیں گے اور سیلز مین یا سیلز منیجر بن کے اینٹھ جائیں گے۔ کوئی برگر بیچے وہاں سور کے گوشت والے تو منظور' یہاں حلال جانور کا گوشت بیچنا نامنظور۔ یہاں دودھ نہیں بیچ سکتے' وہاں شراب بیچ لیں گے۔''

تنگ آ کے ابا نے کہا ''قریشی صاحب! آپ بتایئے میں کیا کرسکتا ہوں' یہ آپ کے گھر کا مسئلہ ہے۔''

''آپ فیکے پتر سے کہیں' یوسف کو سمجھائے۔ وہ اس کی مانتا ہے۔''

مجھے فیکے پتر کا خطاب دینے والے قریشی صاحب ہی تھے۔ بعد میں یوسف نے میرے چڑنے پر مجھے اسی نام سے پکارنا شروع کردیا۔ یوسف کے ابا کی بات پر میرے ابا اس کے سوا کیا کہہ سکتے تھے کہ اچھا' میں کہوں گا رفیق سے۔ مگر بعد میں وہ بہت خفا ہوئے کہ کیسا جاہل باپ ہے۔ بچوں کو پڑھنے نہیں دینا چاہتا۔ خود میں نے یوسف کو اکسایا کہ وہ بغاوت کا علم بلند رکھے۔ دنیا میں سری پائے اور گردے کپورے بیچنے کے خاندانی پیشے کے علاوہ بھی کام ہیں جن سے پیسا کمایا جاسکتا ہے۔

انجام یہ ہوا کہ قریشی صاحب نے بھی بغاوت کردی مگر ان کی بغاوت اس معاشرتی سوچ کے خلاف تھی جس نے انہیں دولت مند تو مان لیا تھا مگر عزت دار تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہ عجیب المیہ تھا' جو عزت دار تھے ان کا مسئلہ دولت مندی تھی جو انہیں کار' کوٹھی اور اسٹیٹس دلا سکتی تھی اور جو دولت کما چکے تھے' انہیں عزت کا کمپلیکس تھا۔

قریشی صاحب نے اپنی بیف اینڈ مٹن شاپ فروخت کی۔ وہ بہترین جائے وقوع پر بہت چلنے والی دکان تھی۔ اس کے انہیں بہت اچھے پیسے ملے۔ انہوں نے اپنا سہ منزلہ رہایشی گھر اور ڈیفنس کا پلاٹ بھی بیچ دیا اور سارا نقد سرمایہ سمیٹ کر لاہور ہجرت کرگئے۔ وہاں انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے متوسط طبقے کی آبادی میں گھر خرید لیا۔ اچھرہ کی مارکیٹ میں ''صدیقی اینڈ سنز'' کا آفس قائم کیا کیونکہ انہوں نے کسی قانونی کارروائی کے بغیر اپنا نام محمد یونس صدیقی کرلیا تھا۔ دولڑکے باہر تھے۔ وہاں ان کے قریشی یا صدیقی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یوسف کا نام بھی انہوں نے اعلان عام اور قانون کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے یوسف صدیقی کردیا۔ اس کے دو چھوٹے بھائی بھی الیاس صدیقی اور انعام صدیقی ہوگئے۔ یوسف کا کہنا تھا کہ وہ تو انتہائی ردِعمل کے طور پر نام کے ساتھ چوہدری یا سید اور شاہ وغیرہ بھی لگانا چاہتے تھے مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کے رہ گئے۔

صدیقی اینڈ سنز پہلے پراپرٹی کنسلٹنٹ تھے۔ یوسف کے ابا نے نئے نام کے ساتھ نیا کام شروع کیا تو ان کا تجربہ صفر تھا مگر پلاٹ' مکان اور دکانیں خریدنا بیچنا یا کرائے پر اٹھانا کیا مشکل تھا۔ پراپرٹی دوسروں کی تھی' کمیشن اپنا۔ یوسف کی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانے تک صدیقی اینڈ سنز بلڈر بن گئے تھے۔ یوسف کے دونوں بھائی اس کام میں لگ گئے۔ ایک نے کاروں کا شوروم کھول لیا اور دوسروں کی گاڑیاں بیچ کے کمیشن سمیٹنے لگا۔ دوسرے نے کنسٹرکشن کی۔ ابا جنرل منیجر اور ڈائریکٹر فنانس رہے۔ اشتعال میں اٹھائے جانے والے ایک انقلابی قدم اور تائید ایزدی سے خوشحالی' ترقی اور سوشل اسٹیٹس سب کچھ مل گیا۔ یوسف کے ابا نے تو دوسرے بھائیوں سے بھی کہا تھا کہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قریشی برادری چھوڑ دیں مگر انہوں نے ہمت نہ کی۔

آج یہ سب یاد کرتے ہوئے مجھے ایک بات کا شدت سے احساس ہوا کہ سب والدین کی جذباتی مجبوریاں ایک ہی ہوتی ہیں خواہ وہ یوسف کے ابا کی طرح قسائی ہوں یا میرے ابا کی طرح سی ایس ایس افسر۔ وہ اپنے بچوں کو اپنے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یوسف کے ابا تعلیم کے اس لیے خلاف تھے کہ بچے خاندانی پیشہ ہی نہیں' انہیں بھی چھوڑ دیں گے۔ ایسا ہوا تھا اور اب پہلے سے زیادہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے دو بچوں کو روک لیا ورنہ یہ بات یقینی تھی کہ یوسف کے دونوں چھوٹے بھائی بھی باہر چلے جاتے۔ میرے ابا نے بہت لبرل ہو کے اپنے جذبات کو میرے مستقبل پر قربان کیا تھا مگر بالآخر انہوں نے بھی مجبوری کے آگے اپنی ہار مان لی تھی۔ خاندانی جاگیر اور زمین تو بہانہ بن گئی تھی۔ ان کا مجھے واپس بلانے کا فیصلہ خالص جذباتی بنیادوں پر تھا۔

ایک بار پھر میں نے گھڑی دیکھی اور پھر اس راستے کو دیکھا جس پر گاڑیاں مسلسل رینگ رہی تھیں۔ میرون کلر کی ایک سیڈان گھوم کے اندر آئی اور پارکنگ لاٹ میں ٹھہر گئی۔ پھر میں نے اس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھی اور مایوسی کا سارا غبار ایک دم چھٹ گیا۔ کسی ضرورت کے بغیر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا' ٹائی کی ناٹ درست کی اور اس کے استقبال کے لیے شیشے کے خودکار دروازے کی طرف گیا جو بڑی خاموشی سے ہر آنے جانے والے کو راستہ دیتا تھا۔

وہ اپنی نازک اور اجلی' ریشمی لمس والی کمر کے خم کو ہلکا سا

بل دے کے کار سے اتری۔ اس نے شوفر سے کچھ کہا اور پھر متلاشی نظروں سے ہر طرف دیکھتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کی ساڑی کا رنگ زرد تھا۔ کسی حد تک شوخ بسنتی رنگ جو نیلے بادلوں کے پس منظر میں اور بھی نکھرا ہوا لگتا تھا۔ کاسنی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھولوں کی ایک بیل تھی جو ساڑی کے ساتھ ساتھ بل کھاتی اس کے قوس در قوس جسم کے گرد لپٹتی جاتی تھی۔ خاصے کشادہ گلے کا سلیولیس بلاؤز اس کے کسے ہوئے پیٹ اور کمر کے ایک بالشت سے زیادہ حصے کی سنہری جلد کو بڑی دلکشی سے نمایاں کر رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ زرد رنگ اس کے مدوّر شانوں اور چہرے کے نیچے گردن سے شروع ہونے والے اور پشت کی جانب پھیلے ہوئے جلد کے شفاف رنگ میں کیسا سنہرا پن جگا دیتا ہے اور مجھے کتنا مسحور کرتا ہے۔

شاید میں اس میں کچھ کمال ایک وقت سے نسبت کا بھی تھا۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ ہمارے ہی خاندان کی تقریب تھی جہاں مایوں کے روایتی زرد لباس میں اور بھی بہت سی لڑکیاں تھیں اور میری عمر ایسی تھی کہ مجھے سب ہی اچھی لگ رہی تھیں لیکن جب وہ سامنے آئی تو میری نظر میں سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ بقول شاعر پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ اس میں میری نظر کا ذرا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ تھی ہی کچھ ایسی..... آج بھی ہے۔

فریال کو یہ ساڑی میں نے انڈیا سے منگوا کے اس کی منگنی پر تحفے میں دی تھی۔ دس کنال پر محیط لاہور میں کیولری گراؤنڈ کے ایک قصر عالی شان میں وہ اپنے منگیتر صفدر سلطان مرزا کے ساتھ بڑی تمکنت اور شان دلربائی کے ساتھ کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میں سخت حسد محسوس کرتا تھا اور احساس کمتری میں مبتلا ہو کے اسے قتل کرنے کے خطرناک منصوبے بنانے لگتا تھا۔ وہ میری طرح ہینڈسم ہیرو تو خیر نہیں تھا' اس کی تعلیم بھی واجبی تھی مگر وہ ذہین تھا اور دولت مند تھا۔ وہ جدی پشتی وڈیرا تھا۔ شہر کی طرف آنے کے لیے وہ زمیندار سے صنعت کار بن گیا۔ اس نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا مگر سیاسی اور حکومتی حلقوں سے رابطے خوب استوار کیے اور ایلیٹ کلاس کو حاصل ہونے والی تمام مراعات اسے خود بخود حاصل ہوتی رہیں۔ زندگی میں رنگینی اور دلکشی کا راستہ اس نے ایک فلم کا اعلان کر کے نکالا۔ چند سالوں میں وہ فلمساز سے ہدایت کار بھی ہو گیا۔ فریال جیسی نہ جانے کتنی حسینا ؤں کو وہ ایک گلیمر سے بھرپور زندگی کے خواب دکھا کے میرے جیسے عاشقان صادق سے چھین چکا تھا۔ بڑی تحقیق کے بعد میں نے فریال کے سامنے تین لڑکیوں کے نام پیش کیے تھے جن سے صفدر سلطان مرزا گزشتہ سات برسوں میں منگنی کا ڈراما کر چکا تھا مگر فریال نے میرے سنسنی خیز انکشافات کو ہنس کے ٹال دیا تھا اور میری ناک پکڑ کے کہا تھا ''یار! ایک ڈراما مجھے بھی تو کرنے دو۔ ایسی رونی شکل مت بناؤ۔''

اپنی ذہنی کیفیت کے باعث میں حال سے نکل کے یوں ماضی میں بھٹکنے لگا تھا کہ جب فریال میرے سامنے آ گئی تب بھی میں اسے یوں دیکھتا رہا جیسے ہم لندن کے ریسٹورنٹ میں نہیں' صفدر سلطان مرزا کے اسی لان پر کھڑے ہیں۔ اسے میری یہ سحر زدہ محویت اچھی لگی۔ اس کے رخسار پر شفق سی پھوٹی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں لہرا کے ہنسی اور اس نے میری آنکھوں میں جھانک کے اور میرے سامنے چٹکی بجا کے کہا ''اے رومیو! آئی ایم ہیئر۔''

میں نے مسکرا کے اس کا ہاتھ تھام لیا ''مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا۔''

اس نے میرے شانے پر اپنا سر رکھا اور میرے سہارے پر چلنے لگی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیا ''کب سے کھڑے تھے یہاں؟''

''پتا نہیں۔ شاید ہمیشہ سے۔''

اس نے کہا ''مجھے کچھ دیر ہو گئی۔''

''NOTHING UNUSUAL.....''

''تم خفا ہو نا.....؟''

میں نے کہا ''بالکل بھی نہیں۔ انتظار کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اگر تم پہلے سے یہاں موجود ہوتیں تو یہ خوشی مجھے کہاں ملتی جو تمہیں گاڑی سے اترتا دیکھ کے ہوئی تھی۔''

کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کا آنچل نیچے گر گیا ''تمہیں یقین تھا کہ میں آؤں گی؟''

''ذرا بھی نہیں۔ لندن میں چھ سال ہو گئے مجھے۔ سو بار وعدہ کیا ہو گا تم نے۔ ملی ہو گیارہ مرتبہ..... کہو تو تاریخیں اور دن بتاؤں؟''

اس نے عادت کے مطابق چہرے پر آ جانے والے بالوں کو بڑی نزاکت سے پیچھے کیا ''تم ملنے کی بات کرتے ہو' فون پر تم سے بات کرتے ہوئے مجھے اتنا محتاط رہنا پڑتا ہے۔''

''معلوم ہے۔ جب تم نے کہا تھا کہ میں آؤں گی تو میں نے سوچا تھا کہ میرے ساتھ پھر وہی ہو گا۔ جو اکثر ہوتا ہے..... گھنٹا بھر جھک مار کے میں نامراد واپس جاؤں گا۔''

''آئی ایم سوری رومیو! لیکن یہ ضروری ہے۔ صفدر ایک شکی مزاج شخص ہے۔''

''بس کرو فریال! میرے ضبط کا حوصلہ جواب دے چکا ہے۔ یہ بھی سوچا تھا میں نے کہ آج آخری موقع ہے تم سے بدلہ لینے کا۔ میں نہ جاؤں' ایک بار تو تمہیں بھی مایوں لوٹنا پڑے۔ پھر تمہیں احساس ہوگا کہ اس مایوسی میں کتنا دکھ' کتنا غصہ اور شکست کی کتنی جھنجلاہٹ شامل ہوتی ہے۔''

''پھر..... کیوں آ گئے؟'' اس نے مجھے جما کے دیکھا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''آئی جسٹ ڈونٹ نو۔ شاید اس لیے میں الو کا پٹھا ہوں۔ میری بے چارگی کا احساس یقیناً تمہیں بہت خوشی دیتا ہوگا۔''

''ایسا مت کہو..... پلیز!''

میں نے کہا ''تم نہ بزدل ہو نہ بے وقوف۔ بزدل میں ہوں کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں کر سکا سوائے بے وقوف بننے کے۔''

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ''کتنی بار اپنی مجبوری بتا چکی ہوں میں' تم سمجھتے ہوا چھی طرح۔''

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ''نہیں فری! میرا ذہن یہ بات بالکل قبول نہیں کرتا کہ کوئی لڑکی جو تمہاری طرح پڑھی لکھی ہو' ذہین ہو اور لندن میں رہتی ہو' وہ اتنی بے بس ہو سکتی ہے جتنی وہ عورت جو کسی وڈیرے کی نجی جیل میں ہو۔ کیا کر سکتا ہے آخر وہ حرام زادہ.....!''

''وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ مرد اسکتا ہے مجھے اور تمہیں۔''

''رہنے دو فریال! ایسا ہوتا تو وہ مجھے کب کا مروا چکا ہوتا..... اور کیا فائدہ ایسے جینے کا۔ روز روز کے مرنے سے ایک بار مرنا اچھا۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ ہم کیوں مریں آخر.....؟ میری یہ احتیاط صرف تمہیں بچانے کے لیے تھی۔''

میں نے کہا ''تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔ آخر چھ سال سے میں یہاں ہوں؟''

''اگر اسے ذرا بھی شک ہوتا..... تو نتیجہ اب تک سامنے آ جاتا۔ اس کے جاسوس اور مخبر پہلے دن رات مجھ پر نظر رکھتے تھے۔ تمہارے بارے میں اسے رپورٹ ملتی رہتی تھی کہ تم امریکا میں ہو۔ پھر یہ پتا چلا تھا کہ تم نے وہیں ملازمت کر لی ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلتا تھا ان رپورٹوں کا؟''

''یہ رپورٹیں میرا شوفر دیتا تھا۔''

میں نے کہا ''شوفر کو اس نے رکھوایا تھا۔''

''نہیں۔ رکھا تو خود میں نے تھا۔ اس نے پیسا دے کر خرید لیا۔ آدمی بے وقوف ہے' میرے ہی گھر کے فون پر صفدر کو ہر بات بتاتا تھا۔ میرے بیڈ روم کا فون الگ ہے۔ وہ لاؤنج کے فون پر بات کرتا تھا۔ وہ بھی رات ایک دو بجے۔ جب پاکستان میں شام کے سات آٹھ بجے کا وقت ہوتا تھا۔ میں نے باہر والے فون کا کنکشن لیا مگر ایسے کہ پتا نہ چلے اور ایک کیسٹ ریکارڈ اپنے کمرے میں لگا لیا۔ روز صبح اٹھ کے گزشتہ رات کی گفتگو سن لیتی تھی۔''

''اور اگر یہ راز فاش ہو جاتا..... پھر.....؟''

''کیسے فاش ہو جاتا۔ میرے بیڈ روم میں جا سکتا ہے کوئی؟ تمہارے سوا.....'' وہ مسکرائی۔

ویٹریس نے ہمارے درمیان کافی اور سینڈوچ رکھ دیے۔ غور سے فریال کو دیکھا اور ستایش کے انداز میں سر ہلا کے چلی گئی۔

میں نے کہا ''اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہے نا..... کہ تم نے کتنی بڑی حماقت کی تھی۔ بہت چالاک سمجھتی تھیں نا خود کو۔ کتنا مہنگا پڑا یہ ڈراما!''

وہ کافی پیتے ہوئے باہر دیکھتی رہی۔ ''اس نے دھوکا دیا مجھے۔''

میں نے کہا ''فارسی میں کہتے ہیں' چاہ کن را چاہ درپیش۔ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودے خود اس میں گر جاتا ہے۔''

''گڑھا اس نے کھود اخود اپنے لیے۔''

میں نے کہا ''کیا فائدہ خود کو دھوکا دینے کا فری! اس نے تم کو اپنی فلم میں ہیروئن بنانے کا وعدہ کیا تھا۔''

''لیکن اس کی قیمت وہ مجھ سے پہلے وصول کرنا چاہتا تھا۔''

''ایسا تو ہوتا ہے۔ ہر جگہ اور سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ چانس کیا صرف خوبصورتی اور اداکاری کی صلاحیت پر ملتا ہے؟ یہ جو بڑی بڑی نامور ہیروئنیں ہیں آج' انہوں نے معمولی لائٹ مین سے ہدایت کار تک سب کی ہر شرط بلا چوں وچرا منظور کی۔ پردے پر نظر آنے سے پہلے کس کس کے ساتھ نظر آئیں۔ تم اتنی بھولی تو نہیں تھیں کہ یہ سب تمہیں معلوم نہ ہو؟''

''ایگریمنٹ میرے والد نے سائن کیا تھا۔''

میں نے برہمی سے کہا ''تمہاری رضامندی سے..... بہت خوش تھیں تم.....''

''میں انکار نہیں کر سکتی تھی۔''

میں نے چلا کے کہا ''بکواس مت کرو میرے سامنے۔ کیا ہوتا اگر تم انکار کر دیتیں؟ وہ جان سے مار ڈالتا تمہیں؟ تم تو سمجھ رہی تھیں کہ پہلی فلم کی ریلیز کے ساتھ ہی تم فلمی آسمان کا سب سے روشن ستارہ بن جاؤ گی۔ ایشوریا رائے آف پاکستان کہلاؤ گی۔''

وہ خاموشی سے سینڈوچ کترتی رہی۔ اس کی خاموشی اعترافِ جرم تھی۔ ''میری ایک غلطی کو معاف نہیں کر سکتے.....''

میں نے کہا ''ایک غلطی..... جب اس نے اپنی دوستی کا جال پھینکا تھا تو میں نے تمہیں خبردار کیا تھا یا نہیں..... منگنی کا ڈراما رچا کے وہ پہلے بھی نہ جانے کتنی لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا چکا تھا۔ تم نے میری نہیں سنی' اپنی عقل اور ہوشیاری پر بڑا ناز تھا تمہیں۔ تم نے کہا کہ میں بھی تو ڈراما کر رہی ہوں۔ ادھر فلم مکمل ہوئی ادھر ڈراما ختم۔ بے وقوف پاگل لڑکی! باپ ایک لاکھ روپے ایڈوانس لے کر شراب پی گیا اور تمہیں کنوئیں میں دھکا دے کر خود قبر میں جا لیٹا۔ نہ فلم بنی نہ تمہاری جان چھوٹی۔''

''مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنا ضدی اور سر پھرا ہے..... اتنا منتقم مزاج ہے۔''

''بابا! ایسے ہی ہوتے ہیں یہ عیاش وڈیرے۔ ایک عورت ان کی انا کی شکست کا سبب بن جائے..... ناممکن۔ ان کی دولت اور ان کی طاقت کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔ عورت ان کے نزدیک پاؤں کی جوتی ہے۔ خواہ وہ مس یونیورس ہو۔ اسے وہ سر پر نہیں چڑھنے دیتے۔ تم اس کے لیے چیلنج بن گئی ہو۔ اب تمہارے لیے نجات آسان نہیں ہے فریال! یہ منگنی کیسے توڑ دو گی تم؟''

اس نے آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو ٹشو پیپر سے صاف کیا ''میں سب ٹھیک کر لوں گی رومیو! مجھے تھوڑا سا وقت اور دو۔ اتنی جلدی مت کرو۔''

''جلدی..... چار سال گزر گئے ہیں اور تم کہتی ہو جلدی!'' میں نے تلخی سے کہا ''میرے پاس اب بالکل وقت نہیں ہے۔ میں نے تمہیں بلانے کے لیے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں صبح واپس جا رہا ہوں اور میرے واپس آنے کا بھی کوئی امکان نہیں۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔''

وہ مجھے دیکھتی رہی ''مجھے اسی لیے آنا پڑا کہ فون پر تم بہت سیریس لگ رہے تھے۔''

میں نے چلا کے کہا ''فریال! میں سیریس ہوں۔''

''نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم ایسے مجھے چھوڑ کے نہیں جا سکتے..... میں..... آئی ول کل یو.....'' اس نے میز پر آگے جھک کر میرا کالر پکڑ لیا۔

میں نے کہا ''ڈونٹ بی میڈ۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔''

''دیکھتے رہیں۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ مجھے بتاؤ' تم ایسا کیوں کر رہے ہو آخر!'' اس پر ہسٹریا طاری ہونے لگا۔

''او کے..... او کے! میں بتاتا ہوں' ذرا آرام سے بیٹھو پلیز!'' میں نے اس کے گالوں پر تھپکی دی۔ اسے بٹھانے کے لیے مجھے اٹھنا پڑا۔

''نہیں۔ پہلے کہو کہ تم نہیں جاؤ گے'' اس نے مجھے ایک جھٹکا دیا اور پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

لندن میں کوئی جذباتی منظر کسی کے لیے بھی باعث تشویش نہیں ہوتا۔ خصوصاً عشق کی وارفتگی کا۔ نوجوان گردوپیش سے بے خبر یک جان دو قالب ہو کے بوس و کنار میں مصروف رہیں' کوئی مخل نہیں ہوتا۔ میں نے بھی فریال کو چوما اور اسے کھینچ کے اپنے ساتھ ٹیرس پر لے گیا کیونکہ وہ زار و قطار رونے لگی تھی۔

جب بالآخر اس کے آنسو تھمے تو میں نے اسے ریسٹ روم میں بھیج دیا جو لیڈیز کے لیے مخصوص تھا۔ وہ دس منٹ بعد اپنا میک اپ ٹھیک کر کے نکلی تو خاصی سنبھل چکی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے کہیں اور لے جاؤں۔

دریا کے کنارے کی طرف چلتے ہوئے میں نے کہا ''یہ گاڑی کس کی تھی..... میرون!''

''ڈاکٹر شائستہ کی'' اس نے بے خیالی میں جواب دیا ''میری گاڑی اس کے کلینک کے باہر کھڑی ہے۔''

میں نے افسوس اور جھنجلاہٹ میں سر ہلایا مگر فریال کو کچھ کہنے سے گریز کیا۔ وہ خاصی تھکی ہوئی لگ رہی تھی اور کچھ ڈپریشن کا شکار تھی۔

ہم دریا کے کنارے خوبصورت باغ کی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ وہیں ہم جیسے نوجوان تھے یا پھر بوڑھے۔ نوجوان اس منظر کا حصہ ہونے کے باوجود یہ منظر نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنے خواب دیکھ رہے تھے۔ بوڑھے اس دنیا پر الوداعی نظریں ڈالتے محسوس ہوتے تھے جو رفتہ رفتہ ان سے چھوٹتی جا رہی تھی۔

''تم کچھ دن تو ٹھہر سکتے ہو..... میری خاطر!'' فریال نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا ''کل علی الصباح میری فلائٹ ہے۔''

اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا ''رنی! جہاں اتنے دن گزرے ہیں' وہاں چند روز.....''

میں نے اس کی بات کاٹ دی ''کیا ہوگا چند روز بعد فری! کچھ بھی نہیں' تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے باپ نے مجھے سات سمندر پار کیوں بھیج دیا تھا۔ حالانکہ میں اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پاکستان میں میری جان کو ایک نہیں دو جان لیوا بلائیں چمٹ گئی تھیں۔ ایک گروہی سیاست.....اور دوسری تم۔''

''کیا میں بلا ہوں؟''

''بڑی خوبصورت قاتل بلا۔ ایسی حسین ناگن کہ جس کا کاٹا پانی بھی نہ مانگے۔ مجھے تم نے بھری جوانی میں ڈس لیا تھا۔ آج چھ سال بعد تمہارے عشق کا زہر میرے خون میں اور جسم کے ہر مسام میں ایسے رچ بس گیا ہے کہ نہ میں مر سکتا ہوں اور نہ جی سکتا ہوں۔ پتا نہیں میری زندگی کیسے گزرے گی۔''

اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ''ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہو۔''

میں نے کہا ''پھر کیا کروں' جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا رہوں۔''

اس نے کہا ''ہمیں کوئی انتہائی قدم اٹھانا ہی ہوگا۔''

میں نے کہا ''مثلاً.....؟''

وہ سوچتے ہوئے بولی ''چلو ہم شادی کر لیں۔''

میں نے کہا ''اچھا.....وہ کیسے؟''

''یار! جیسے سب کرتے ہیں۔ نکاح مسجد میں ہی ہو جاتا ہے دو گواہوں کے سامنے ورنہ تم آ جاؤ' برات لے کر میرے گھر۔''

''اور اس کے بعد.....؟'' میں نے کہا۔

''اس کے بعد کیا.....؟''

میں نے کہا ''شادی کر کے جائیں گے کہاں؟ کہاں رہیں گے.....؟''

اس نے کہا ''اتنی بڑی دنیا ہے۔''

میں نے کہا ''ہاں' چلے جائیں گے تمہارے ماموں کے گھر امریکا۔''

''ماموں.....کون سے ماموں؟''

''جارج بش! وہ ہمیں گلے لگا کے کہیں گے کہ میرے بچو! آرام سے رہو یہاں' آدھا وائٹ ہاؤس خالی کرا دیا ہے تمہارے لیے.....فکر کی کوئی بات نہیں۔''

''تم مذاق کیوں اڑاتے ہو ہر بات کا؟''

''اس لیے کہ تم پاگل ہو۔ اپنے ساتھ مجھے بھی پاگل بنا رکھا ہے۔ تم پر فلمی عشق سوار ہے۔ تم سمجھتی ہو ہم بھی ہیرو ہیروئن کی طرح اس شہرہ آفاق گانے سے فلاح پا سکتے ہیں جس میں ہیروئن نے کہا کہ چل چلیے دنیا دے اس نکرے جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے اور ہیرو نے کہا فنہا۔ اور وہ جا بیٹھے قطب شمالی یا ماؤنٹ ایورسٹ پر۔''

فریال ہنسنے لگی ''میں نے ایسا تو نہیں کہا۔''

''دنیا بہت بڑی ہے.....اور کیا مطلب ہے اس احمقانہ بات کا۔ ہم بھاگ کے کہاں جا سکتے ہیں فری! ہمارے پاس شہریت ہوتی امریکا' برطانیہ کی.....یا کسی یورپی ملک کی تو وہ پاٹے خان کا سالا ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اب تو جینوئن گراؤنڈز پر بھی سیاسی پناہ نہیں ملتی۔ پہلے بہت لوگ جرمنی میں سیٹل ہو گئے کہ ہم مذہبی اقلیت ہیں اور پاکستان میں انتہا پسند ہمیں مار دیں گے۔ برطانیہ اور فرانس سب کے دروازے تو سب کے لیے کھلے ہوئے تھے لیکن وہ زمانے اب نہیں رہے۔ اب مسلمان دہشت گرد ہیں۔ خصوصاً پاکستانی۔ ہمیں تو واپس جانا ہی پڑے گا اور مرنا ہی پڑے گا۔''

''تم مرنے سے ڈرتے ہو؟''

میں اسے دیکھتا رہا ''اگر میں یہ کہوں فری کہ تم سے مجھے اتنی محبت نہیں ہے کہ تمہاری خاطر فلم مغل اعظم کا گانا ''اے محبت زندہ باد'' گاتا ہوا جان دے دوں۔''

''تو میں نہیں مانوں گی۔''

''تم اس خیال میں بڑا غرور محسوس کر سکتی ہو مس فریال کہ تمہارے بہت سے چاہنے والوں میں ایک ایسا بھی ہے' اتنا وفا شعار' ایسا جانثار۔ زبردست الو کا پٹھا کہ تم نے منگنی کر لی' اس کا عشق وہی رہا۔ چھ سال سے تمہارے خیال میں جیتا ہے تمہارے نام پر مرتا ہے۔ دیوانگی کی ایسی انتہا دیکھی تم نے کہیں۔ وہ جو فرہاد صاحب تھے' دودھ کی نہر نکال لائے مگر شیریں کی شادی کی خبر ملی تو فوراً ہی خودکشی فرما لی۔ میرا حوصلہ دیکھو کہ میں جیتا رہا' جھوٹی آس پر۔''

''جھوٹی آس.....؟'' اس نے روہانسا ہو کے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ''اتنے ظالم تو نہ بنو رومیو!''

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ''بھاڑ میں گیا رومیو اور اب جہنم میں جائے جیولیٹ۔ میں مزید بے وقوف بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ابا نے مجھے فوراً واپس بلایا ہے کہ لعنت بھیجو اس نوکری پر اور پاکستان آ جاؤ۔''

''مگر کیوں.....پاکستان میں کیا ہے؟''

میں نے کہا ''تمہارے لیے واقعی کچھ نہیں ہے۔ منافقت بھرے ڈائیلاگ تو میں بول نہیں سکتا کہ مجھے وطن کی مٹی سے بہت پیار ہے اس لیے میں جارہا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہاں میرے والدین ہیں۔ گیارہ ستمبر والے واقعے کے بعد یہ ممکن نہیں رہا کہ میں انہیں بھی امریکا اور برطانیہ لے جاؤں اور ہم وہاں ہنسی خوشی سیٹل ہوجائیں۔ جب میں گیا تھا تو حالات کچھ اور تھے۔ انہیں میری زندگی کی فکر تھی۔ مجھے بھی ایک محفوظ مستقبل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے مجھ سے جدائی کا عذاب قبول کرلیا۔ وہ خود اس عمر میں جلاوطنی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ میرے اصرار پر وہ صرف ایک بار امریکا آئے تھے۔ ایک مہینا انہوں نے بڑی مشکل سے گزارا۔ نہ وہ وہاں کے ماحول کو قبول کرسکے اور نہ اس ماحول نے انہیں قبول کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں پاکستان جاؤں تو پھر انہی پرانے سیاست پیشہ دوستوں اور دشمنوں کے چنگل میں پھنس جاؤں۔ تم جانتی ہو منشیات فروشی کی طرح وہاں ضمیر فروشی بھی ایک انتہائی منافع بخش پیشہ ہے جسے جمہوریت کا نام دے دیا گیا ہے زبردستی.....''

''پھر اب ایسی کیا بات ہوگئی ہے.....؟''

میں نے اسے بتادیا' جس حد تک مجھے معلوم تھا۔ میری نظر گھڑی پر بھی تھی۔ اب نو بج رہے تھے۔ فریال کو توقع ہوگی کہ اب میں اسے کسی اچھی سی جگہ ڈنر کے لیے لے جاؤں گا مگر میں نے اسے بتادیا کہ آج رات میرے سب دوست ایک الوداعی دعوت میں شریک ہوں گے چنانچہ دس بجے تک مجھے واپس جانا ہوگا۔

''کچھ عجیب سی کہانی ہے'' اس نے کہا ''ناقابل یقین۔''

میں نے کہا ''ہاں' میری اور تمہاری کہانی بھی ایسی ہی ہے۔''

''کیا کرو گے تم واپس جاکے؟'' وہ ہیرے کی انگوٹھی کو انگلی میں گھماتی رہی۔

''وہی جو میرے والدین چاہیں گے۔''

''گڈ بوائے! فرض کردانہوں نے کہا کہ برخوردار نورچشم ہم نے تمہارا رشتہ تمہاری عم زاد سے طے کردیا ہے۔ وہی جسے تم اللہ میاں کی بھینس قرار دیتے ہو.....'' وہ ہنسی۔

میں نے کندھے اچکائے ''میں کہوں گا جیسی آپ کی مرضی۔ میں انکار نہیں کرسکتا۔''

''جھوٹ..... بکواس..... مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں کرسکتے۔''

''کیوں نہیں کرسکتا مس فریال! اگر تم نہیں تو پھر کیا فرق پڑتا ہے' کوئی بھی ہو۔ اگر میری پسند نہیں تو پھر ان کی پسند سہی۔ وہ تو خوش ہوجائیں۔ دس سال پہلے میری ماں نے خواب دیکھنے شروع کیے تھے۔ میرے سر پر سہرا سجانے کے' چاندسی بہو لانے کے۔ اپنے پوتے نواسوں کے ساتھ کھیلنے کے اور انہیں لاڈ سے بگاڑنے کے۔ دو آرزو میں کٹ گئے' دو انتظار میں۔ باقی جو تم نے چھین لیے۔''

''مجھے الزام مت دو۔''

میں نے رکھائی سے کہا ''اوکے۔ یہ ظلم میں نے کیا ان پر۔ اب میں اس کی تلافی کرنے جارہا ہوں' کوئی اعتراض؟''

اس نے اعلانیہ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اظہار عشق میں مصروف ایک جوڑے کو دلچسپی سے دیکھا ''تمہاری گرل فرینڈز کا کیا ہوگا؟''

میں نے بھنا کے کہا ''وہی جو تمہارے بوائے فرینڈز کا ہوتا تمہاری شادی کے بعد۔''

وہ مسکرائی ''رومیو! اگر تم کسی میم کو شادی کے بعد اپنے ساتھ لے جاتے تو کیا ہوتا۔ مثلاً وہ لارڈ کی بیٹی..... عائشہ!''

میں نے پورے یقین سے کہا ''وہ اسے بھی گلے لگاتے۔ والدین بڑے مجبور لوگ ہوتے ہیں فری! خصوصاً وہ جن کا ایک ہی بیٹا ہو۔ بہت قابل رحم ہوتے ہیں۔ وہ انہیں جتنا بلیک میل کرنا چاہے کرسکتا ہے۔ کئی بار خود انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آخر تم چاہتے کیا ہو؟ اور کوئی لڑکی نہیں ہے دنیا میں۔ ولایت میں بھی کوئی پسند نہیں آئی تمہیں۔''

''یعنی میرے سوا' مجھے وہ قبول نہیں کرسکتے۔''

''پلیز شٹ اَپ فریال! تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تم الزام انہیں دے رہی ہو۔ خرابی کا ذمے دار تھا تمہارا باپ۔ اب وہ اس دنیا میں ہی نہیں ہے تو میں اسے کیا کہوں؟ میری خاطر وہ سب کچھ کرسکتے تھے۔ اگر میں کسی چڑیل کا بھی کہتا تو وہ انکار نہ کرتے۔ پھر تمہیں کیسے قبول نہ کرتے؟ مگر تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ سوائے مجھے بے وقوف بنانے کے میری زندگی خراب کرنے کے۔ مجھے خواب دکھانے کے' جھوٹے وعدوں سے بہلانے کے..... اور مجھے دھوکا دینے کے۔''

وہ چلائی ''ایسا مت کہو رفی! میں تھپڑ ماردوں گی۔''

میں نے آگے جھک کے کہا ''کس کے منہ پر..... بولو' میرے یا اپنے؟''

وہ رونے لگی۔ اس کا خیال ہوگا کہ میں اس کی خوبصورت آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں

سے پی لوں گا۔ اسے آغوش میں لے کر کہوں گا کہ فریال! یہ ظلم نہ کرو مجھ پر۔ تمہیں روتا دیکھتا ہوں تو میرے دل میں انگارے بھر جاتے ہیں۔ لیکن میں خود پر جبر کر کے کامل بے حسی کا اظہار کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد وہ خود ہی چپ ہوگئی۔ اظہار ہمدردی کے طور پر کسی بھی لڑکی کو رومال پیش کر دینا اس سوسائٹی کے آداب مردانگی میں شامل تھا جو کہ شیولری کہلاتا تھا۔ دو بوڑھے انگریزوں نے مجھے پر ملامت اور شرمسار کرنے والی نگاہوں سے گھورا مگر میں نے پروانہ کی۔ میں اپنے رویے سے فریال پر واضح کر دینا چاہتا تھا کہ اب میرا دل بھی پتھر ہوگیا ہے۔

اس نے وینٹی بیگ سے اپنا سنہرے فریم والا نازک سا آئینہ نکالا اور اس میں اپنا چہرہ دیکھ کے میک اپ ٹھیک کرنے لگی۔

میں نے کہا ''کچھ کھاؤ گی تم؟''

''کہاں لے جاؤ گے تم مجھے؟'' اس نے رکھائی سے کہا۔

''کہیں بھی نہیں۔ جہاں میں رہتا ہوں وہاں آج سب لوگ جمع ہوں گے۔ میرے دفتر کے ساتھی..... اور دوست!''

''وہ بھی ہوگی..... ایلشا..... جو تمہارے لیے عائشہ بن گئی؟''

''سب ہوں گے سوائے تمہارے۔''

''مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس ڈرامے سے۔ میں تمہیں الوداع کیوں کہوں؟ تمہارے پیچھے پیچھے آ رہی ہوں میں بھی۔''

''ابھی تمہارا کورس ختم ہونے میں چار مہینے باقی ہیں۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ ابھی مت جاؤ' سولہ ہفتے کی توبات ہے۔''

میں نے کہا ''فری' کوئی اور بات کرو۔''

اس نے کہا ''پلیز..... چلو دو ہفتے۔ اب کیا میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑوں؟''

میں نے جھلا کے کہا ''کیا ہوگا دو ہفتوں میں؟''

''وہی جو تم چاہتے ہو۔ مجھے تھوڑی سی مہلت دو۔ ایک آخری موقع..... تمہیں میری قسم۔''

''فری! خدا کے لیے.....'' مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی ''مجھے یہ بتاؤ کہ ایسا کون سا معجزہ رونما ہوسکتا ہے دو ہفتوں میں۔ کوئی جادو' کوئی روحانی وظیفہ' سفلی عمل یا نقش اعظم ہے جس سے کایا کلپ ہو جائے گی۔ حالات پلٹا کھا کے ہمارے حق میں سازگار ہو جائیں گے۔ تمہارا وہ ہونے والا مجازی خدا! تمہارا آقا و مالک' سرتاج اچانک تمہارے جذبۂ عشق کے سامنے سر تسلیم خم کر دے گا۔ اتنا بڑا سیاسی وڈیرا' جدی پشتی فیوڈل لارڈ۔ کینہ پرور اور کمینہ۔ وہ انتہائی شرمسار ہو کے دست بستہ تمہاری خدمت میں حاضر ہوگا اور کہے گا کہ مجھے معاف کر دو' زور زبردستی سے تمہاری محبت جیتنے کی کوشش کرنا میری بے وقوفی تھی۔ میں تمہارا گنہگار ہوں۔ میری طرف سے تم آزاد ہو اور پھر خود تمہیں میرے پاس لا کے تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے گا اور کہے گا کہ چاندنی بتو اب تیرے حوالے۔''

اس نے اپنا ہینڈ بیگ مجھ پر دے مارا ''بکواس فرما چکے آپ یا کچھ اور کہنا باقی ہے؟''

میں نے کہا ''نہیں۔ اب تم بتاؤ کہ ناممکن کو ممکن کیسے بناؤ گی۔''

اس نے کہا ''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ جا کے میرے لیے آئس کریم لاؤ۔''

میں کچھ فاصلے پر نظر آنے والے پارلر تک گیا اور پھر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آدھا لیٹر کا ایک ڈبا میں نے اسے تھما دیا۔

''چاکلیٹ ہے نا'' اس نے بچوں کی طرح پوچھا۔

''ہاں بابا چاکلیٹ ہی ہے۔''

''بابا جی ناراض کیوں ہوتے ہو'' اس نے پلاسٹک کے چمچے کو آئس کریم سے بھر کے منہ میں رکھا ''اچھی ہے۔''

''اتنی چاکلیٹ کھاتی ہو تم اور آئس کریم..... جنک فوڈ تمہیں کچھ نہیں ہوتا۔''

اس نے اوپر دیکھا ''اللہ کا کرم ہے۔ جلنے والے جلتے رہیں۔ دیکھو رومیو! یہ میرا آخری سمسٹر ہے۔ سولہ ہفتے باقی ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے میرے پاس شادی نہ کرنے کا بہانہ کوئی نہیں رہے گا۔ اس ضدی آدمی نے میرے حصول کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں مجھے بتادیا تھا کہ وہ مجھے مہلت دیتا رہے گا۔ جتنی میں چاہوں گی' یہاں تک کہ میرے پاس سارے بہانے ختم ہو جائیں گے۔ بالآخر مجھے اس کو قبول کرنا پڑے گا۔ بات صرف وقت اور حوصلے کی ہے۔''

''یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ دس بیس پچاس سال ایسے ہی گزر جائیں مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کی منگیتر سے کوئی اور شادی کر سکے۔''

''اس کی فطرت کا یہ پہلو بعد میں سامنے آیا۔ وہ انتہائی

خطرناک آدمی ہے اور اسی لیے میں نے تمہارے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیا۔ اس کے لیے مجھے خود پر بھی بہت جبر کرنا پڑا۔''

''میں جانتا ہوں فریال! اور اسی لیے ذہنی طور پر میں بہت پہلے تمہارے عشق سے تائب ہوگیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم زندہ رہو۔ اور خود مجھے بھی مرنے کا شوق نہیں تھا۔ صورت حال آج بھی وہی ہے۔''

''ہاں..... مگر اب ہمیں صورت حال کو بدلنا ہوگا۔ سنا تم نے؟''

''ہاں سنا'' میں نے کہا ''لیکن تم بھی سن لو کہ میں بہت کم ہمت اور بزدل ہوں۔ میں ذرا بھی ہیرو نہیں ہوں۔ مجھے محبت میں جان کا سودا قطعی منظور نہیں۔ تم مجھے کم عقل اور بے وقوف بھی سمجھ سکتی ہو کہ مجھے انتقال پر ملال کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔''

اس نے آئس کریم کے خالی کپ کو حسرت سے دیکھا ''آخر ہم ہی کیوں مریں رومیو!''

''اس لیے کہ عاشقی کی روایات ایسی ہی ہیں۔ محبت کرنے والے ہی مرتے ہیں۔ آج تک کسی فلمی داستان عشق کے ہیرو نے اپنے رقیب روسیاہ کا مرڈر نہیں کیا۔''

''یہ اکیسویں صدی ہے ڈارلنگ! اب چراغ تلے نہیں چراغ کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے۔ محبت کی روایات بھی بدل گئی ہیں۔ یہ کام تم کر سکتے ہو۔''

میں نے چونک کے کہا ''کون سا کام؟''

''کِل دیٹ باسٹرڈ!'' اس نے سکون سے کہا اور آئس کریم کے کپ کو بیچ کی سائیڈ میں رکھے ڈسٹ بن میں ڈال دیا ''اس کے سوا چارہ نہیں۔''

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ بالکل سنجیدہ تھی ''واٹ نان سنس!''

''رنی! ہمارے ملنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اسے درمیان سے ہٹا دیا جائے۔ اس کو قتل کر دیا جائے یا کرا دیا جائے۔ آخر وہ بھی تو یہی کرے گا۔ جیت کے لیے پہل ضروری ہے۔ چار حیت ہی سب سے مؤثر دفاع ہے۔ اس سے پہلے کہ سانپ تمہیں ڈسے' اس کو مار ڈالو۔''

میں نے آسمان کو دیکھا ''ہاں' اس طرح ہماری ارواح کا عالم بالا میں ملن ہو سکتا ہے۔ وعدہ کرو کہ مجھے پھانسی ہوتے ہی تم بھی زہر کھا کے فوراً جان دے دو گی۔ صحیح وقت پر۔''

''رنی! فار ہیون سیک۔ سیریس ہوں میں۔ کیوں ہوگی تمہیں پھانسی؟''

میں نے کہا ''چلو عمر قید ہو جائے گی۔''

''ایسا کیوں سوچتے ہو؟ پاکستان میں کسی کو مروانا کتنا آسان ہے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ بس ہمت ہونی چاہیے' ایک واضح پلان ہونا چاہیے۔ ذہانت اور پیسا ہونا چاہیے۔ کیا چیز نہیں ہے تمہارے پاس۔ پولیس خود تمہاری مدد کرے گی۔''

''اسٹاپ اِٹ فری!'' میں نے دھاڑ کے کہا۔

''چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ قربانی عشق کے دعوؤں کا وقت گزر گیا۔ اب کچھ کرنے کا وقت آیا ہے۔''

میں نے بے بسی سے کہا ''تم پاگل ہوگئی ہو سچ مچ!''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ''میری بات غور سے سنو رومیو! میں تم سے اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم مرد ہو۔ تم یہ کام بہتر طریقے پر اور آسانی سے کر سکتے ہو۔''

''آخر یہ کیسے فرض کر لیا ہے تم نے؟''

''تم انکار نہیں کر سکتے رنی! تم کرتے رہے ہو یہ کام۔ تم جانتے ہو یہ کام کون لوگ کرتے تھے یا کراتے تھے۔ اس وقت کسی کو راستے سے ہٹانے والوں کی منزل تھی سیاست۔ ان کا جذبہ اتنا قوی تھا۔ وہ اپنی خواہش اور طلب کی شدت میں کسی بھی انتہا تک جانے کو ضروری سمجھتے تھے۔ تم ان کے مقصد سے اختلاف کر سکتے ہو۔ کہہ سکتے ہو کہ سیاست میں جمہوریت کا اصول چلنا چاہیے۔ مگر محبت میں سب جائز ہے۔ آل از فیئر ان لو اینڈ وار۔ کیا یہ غلط ہے..... بولو؟''

''میری مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ فریال کے دلائل مجھے اپیل کر رہے تھے'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''دیکھو رومیو! زر' زن اور زمین کے لیے ہی دنیا کی تاریخ میں سارے قتل ہوئے۔ ہیلن آف ٹرائے کے لیے ایک جنگ لڑی گئی۔ نور جہاں کے لیے جہانگیر نے کیا نہیں کیا۔ اس کے شوہر کو شیر افگن کا خطاب دیا اور مروا دیا۔ آج زمانہ لیلیٰ مجنوں کے عشق کا نہیں ہے کہ تم جنگل اور صحرا میں لیلیٰ لیلیٰ پکارتے پھرو اور جان دے دو۔ لوگ ہنسیں گے کہ کیسا بے وقوف آدمی تھا۔ ابے نکال کے لے جاتا اسے اگر اتنی ہی محبت تھی تو..... سارے پرانے قصے اب مضحکہ خیز لگتے ہیں۔ پرتھوی راج کیسے نکال کے لے گیا تھا ''سنجوگتا کو۔''

میں نے کہا ''یہ سب اتنا آسان نہیں ہے فری!''

''کیوں؟ تم کیا اتنے گئے گزرے ہو صفدر سلطان مرزا کے مقابلے میں۔ وہ تمہیں مار سکتا ہے۔ تمہاری محبوبہ کو قتل کر سکتا ہے اور تم صرف ڈر سکتے ہو۔ مقابلے کا نہیں سوچ سکتے۔ کیا ہے اس کے پاس جو تمہارے پاس نہیں ہے۔

تمہارے پاس تو زیادہ مضبوط اور معقول وجہ ہے۔ محبت' آج کی دنیا میں مانگنے سے کیا ملتا ہے' نہ آزادی نہ انصاف اور نہ اپنا حق۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو.....'' میں نے کہا۔

''وہ کیا شعر پڑھتے تھے تم اکثر وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں۔ واقعی' اس کے لیے آرزو سے زیادہ ..... بہت زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ محض آرزو کرنے سے کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔ کوئی چیمپئن نہیں بنا۔ کسی کو کامیابی نہیں ملی۔ سوچو کہ یہ کانٹا درمیان سے کیسے نکالا جاسکتا ہے۔ ایسے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ تم کہو گے کہ یہ کیسی عورت ہے جو قتل پر اکسا رہی ہے۔ بالکل یہی بات ہے۔ میں تمہیں اکسا رہی ہوں۔ تمہارا حوصلہ بڑھا رہی ہوں۔ اپنے دشمن کا خاتمہ کردو۔ یہی شرط ہے کامیابی کی اور اگر تم نے پھر بھی بزدلی دکھائی تو میں کروں گی یہ کام۔''

''فریال! مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع دو۔''

''میرے پاس نہ عقل ہے نہ تجربہ۔ میں پلان تو کرسکتی ہوں مگر تمہاری طرح نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ کرائے کے قاتل بھی ہوتے ہیں اسلحہ بھی کرائے پر ملتا ہے مگر مجھے معلوم نہیں کہاں؟ اگر تم پاکستان جارہے ہو تو سمجھو میدان جنگ ہے جہاں تمہیں چار مہینے میں دشمن کو نیست و نابود کرنا ہے۔ اس طرح کہ تم پکڑے نہ جاؤ۔ یہ واحد راستہ ہے ہمارے سامنے۔ تم مرد ہو' تم نے چوڑیاں پہن لیں تو مجھے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ میں ایسے نہیں مروں گی رومیو! میں اسے مار کے مروں گی۔ انجام سے میں نہیں ڈرتی' یا تم یا موت۔''

''ایسا مت کہو فری!'' میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھرلیا ''تم کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم میری ہو' تمہیں مجھ سے کون چھین سکتا ہے۔ کوئی نہیں کوئی نہیں۔'' میں اسے چومتا رہا۔

''اتنا عرصہ بعد مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ میں کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ یہ بات ابھی صفدر سلطان مرزا نہیں جانتا۔ لیکن تم جانتے ہو کہ میں کس انتہا تک جاسکتی ہوں۔ جانتے ہو نا؟'' اس نے مجھے جھنجوڑ کے سوال کیا ''چار مہینے ہیں تمہارے پاس' پھر میں کچھ کروں گی۔''

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ لندن میں اس سے آخری ملاقات نے میری محبت کو میرے لیے مقصد حیات بنادیا تھا۔ آرزو کو یقین میں بدل دیا تھا۔ اب میں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔

جو مقصد میرے والدین نے میرے سامنے رکھا تھا اس کے اسباب اچانک پیدا ہوئے تھے۔ بظاہر ایسا ہی لگتا تھا۔ لیکن میری واپسی بھی بے سبب نہیں تھی۔ اسباب قدرت نے بہت پہلے طے کردیے تھے۔ ایک وقت پر وہ سامنے آگئے۔

میں نے کہا ''چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔''

اس نے مسکرا کے میرے گال کو چوما ''میں چلی جاؤں گی۔''

اس نے مجھے شب بخیر کہا۔ جیسے ہمیشہ کہتی تھی۔ خدا حافظ یا الوداع نہیں کہا ''ہم جدا کب ہوتے ہیں۔ تم سامنے نہیں ہوتے تو خیالوں میں ہوتے ہو۔ خوابوں میں ہوتے ہو۔ عجیب پاگل لڑکی تھی..... اور اس نے اپنے پاگل پن میں مجھے بھی اسیر کررکھا تھا۔

میں اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ میرے دل میں اب کوئی پچھتاوے کی خلش نہیں تھی۔ کوئی ملال نہیں تھا۔ میں مطمئن اور پراعتماد تھا کیونکہ میرے پاس چار مہینے تھے۔

☆☆☆

ٹیکسی رک گئی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کے مجھے یاد دلایا ''آپ نے یہی پتا بتایا تھا سر!''

میں چونک کے نیچے اترا ''تھینک یو سردار جی!'' میں نے اسے ایک نوٹ تھماتے ہوئے کہا۔

''اوئے بادشاہو!'' اس نے کہا ''کھلا نہیں ہے؟''

اگر میں اس کی تلاشی لیتا تو اس کی جیب میں سے ایسے دس نوٹوں کی چینج برآمد ہوتی مگر یہ بہت سے ڈرائیوروں کا مخصوص انداز تھا۔ داؤ چل جائے تو وارے نیارے۔ جب میں نے کہا کہ پلیز کیپ دی چینج تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ جو رقم میں نے چھوڑ دی تھی وہ تقریباً کرائے کے برابر تھی۔ ایسی فیاضی کا مظاہرہ عموماً وہی کرتے تھے جو نشے میں ہوں یا جوئے میں سیکڑوں پاؤنڈز جیت گئے ہوں۔

''اللہ آپ کو خوش رکھے جی!'' اس نے سلیوٹ کے انداز میں اپنی پگڑی کو چھوا اور فرار ہوگیا جیسے اسے ڈر ہو کہ میرا ارادہ نہ بدل جائے۔ میں نوٹ واپس لے کر کہوں کہ ایک منٹ ٹھہرو' میں کسی سے چینج لیتا ہوں۔

میری لینڈ لیڈی نے دروازہ کھولتے ہی بڑی ناراضی کا اظہار کیا ''اتنی دیر سے آرہے ہو۔ پتا ہے وقت کیا ہوا ہے؟''

''مارتھا..... ابھی دس بجے ہیں۔ ابھی تو کوئی بھی نہیں آیا ہوگا۔''

''سب آتے ہی ہوں گے'' اس نے کچن کی طرف

واپس جاتے ہوئے کہا۔

''تم ابھی تک پکانے میں لگی ہوئی ہو؟'' میں نے کہا۔

''رفیق! ذرا دیکھو یہ پلاؤ کیسا بنا ہے اب تم کسی کو بتانا نہیں..... میں نے دوبارہ تیار کیا ہے۔ پہلی دفعہ خراب ہو گیا تھا۔''

میں نے ہنس کے کہا ''وہ کیسے.....؟ اب تو بہت پریکٹس ہے تمہیں۔ تم دوسروں کو پکانا سکھا سکتی ہو۔''

''تم واقعی ایسا سمجھتے ہو یا مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو؟'' اس نے ایک کوکنگ پاٹ کا ڈھکنا ہٹایا۔ کچن پلاؤ کی خوشبو سے بھر گیا۔

میں نے کہا ''کیا زبردست خوشبو ہے۔ مارتھا' تمہارے پلاؤ کو انٹرنیشنل کوالٹی سرٹیفکیٹ مل سکتا ہے۔''

''ایسے نہیں' چکھ کے دیکھو۔ کیا یہ کھانے کے قابل ہے؟'' اس نے خوش ہو کے مجھے ایک چمچہ دیا ''ایسا نہ ہو تمہارے دوست بھوکے رہ جائیں میری وجہ سے۔''

میں نے ایک چمچہ چاول نکال کے چکھے ''دس از ونڈرفل مارتھا! کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ بازار سے نہیں آیا ہے۔ کیا باقی چیزیں آ گئی ہیں؟''

اس نے کھانے کی میز کی طرف اشارہ کیا ''سب کچھ آ گیا ہے۔ میرا خیال ہے یہ سب بہت زیادہ ہو گا۔''

''مجھے بتاؤ' کون لوگ آ رہے ہیں۔ کل کتنے لوگ ہوں گے۔''

میں نے اسے گن کے بتایا ''تم سب کو جانتی ہو؟''

''اس کا مطلب ہے وہ نک چڑھی لڑکی نہیں آ رہی ہے۔ لارڈ ارنسٹ کی بیٹی ای شا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ نہ آتی۔ پہلے وہ ایشا تھی۔ اب وہ عائشہ ہے اور وہ نک چڑھی ہرگز نہیں ہے۔''

مارتھا نے اصرار کیا ''وہ نک چڑھی ہے' لیکن وہ خوبصورت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اس نے اپنے باپ دادا کا مذہب ترک کر دیا تمہارے لیے۔ بے شک یہ بہت گناہ کی بات ہے لیکن خداوند مسیح اسے معاف کرے گا۔ افسوس کہ تم نے پھر بھی اس سے شادی نہیں کی۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

میں نے کہا ''مارتھا۔ کیا تم جانتی ہو کہ ہم چار شادیاں کر سکتے ہیں۔ اس کی اجازت کیوں ہے۔ کیونکہ دل کے چار خانے ہوتے ہیں' میں ایک اس کے لیے ہمیشہ خالی رکھوں گا۔''

''او گاڈ! کیا واقعی تمہاری چار بیویاں ہوں گی رفیق!'' یہ تصور کرنا بہت مشکل ہے میرے لیے۔''

میں نے کہا ''کیوں ..... تمہارے بھی تو چار شوہر تھے۔''

اس نے میری کمر پر چمچہ مارا ''ایک وقت میں نہیں بدمعاش! تمہیں ہمدردی ہونی چاہیے ایسی عورت سے جو تین بار بیوگی کا صدمہ جھیل چکی ہے اور اب دیکھو دن رات آسٹن کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ کیا پتا کب اسے مارتھا کی یاد آئے اور وہ واپس آ جائے۔ تم جانتے ہو میں کٹر رومن کیتھولک ہوں ورنہ طلاق لے کر اب تک اپنی تنہائی دور کر سکتی تھی۔''

میں نے کہا ''مارتھا۔ اب تو سچ بتا دو' میں جا رہا ہوں۔''

''ایسا کیا سچ ہے.....؟''

میں نے کہا ''تم قسم لے لو مجھ سے' میں پولیس کو بالکل نہیں بتاؤں گا۔ آسٹن کو تم نے کہاں غائب کر دیا۔ قتل تو خیر پہلے بھی تین کو کیا تھا۔''

''یور اسکل! اس نے پھر چمچہ گھمایا مگر میں غوطہ مار کے نکل گیا۔ ''میں بتاتی ہوں تمہیں۔ بھیج دیتی ہوں آسٹن کے پاس۔ تم کبھی پاکستان نہیں پہنچو گے۔''

آسٹن اس کا چوتھا شوہر تھا جس نے صرف چھ مہینے مارتھا کے ساتھ گزارے اور پھر فرار ہو گیا۔ اب پتا نہیں یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ میری۔ وہ ہم سب کو ہنس ہنس کے بتاتی تھی۔ ''دراصل وہ بڑا ہی کنجوس تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کا سارا خرچہ اٹھاؤں میں نے کہا کہ آسٹن یہ تمہاری ذمے داری ہے کیونکہ شوہر تم ہو۔ اس کے پاس کچھ پیسا تھا۔ پتا نہیں کتنا۔ لیکن وہ خرچ نہیں کرتا تھا۔ بیمار ہو جاتے تو دو اتک نہیں لاتا تھا۔ ایک دن میں نے اسے نوٹس دے دیا کہ تم ایسے نہیں رہ سکتے۔ یہ کوئی یتیم خانہ نہیں ہے۔ اپنا خرچ تو تمہیں دینا ہی پڑے گا اور تم جانتے ہو میں کیا چارج کرتی ہوں۔ ایک اضافی سہولت تمہیں ملے گی کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ سو سکتے ہو۔ اگر وہ تمہاری درخواست منظور کرے۔ بس اس کے بعد وہ چلا گیا کچھ بتائے بغیر۔''

مارتھا کے پہلے شوہر نے اس کے ساتھ چار سال گزارے۔ دوسرے نے سات سال۔ تیسرا نو سال زندہ رہا۔ مارتھا ان سب کو یاد کرتی تھی اور سب کی ازدواجی رفاقت کے واقعات ایسے سناتی تھی کہ ہم سب جو اس کے پیئنگ گیسٹ تھے' مارتھا کو چھیڑتے تھے ''بڑی ہی الم ناک کہانی ہے مارتھا۔ تمہیں گلے لگانے کے بجائے انہوں نے موت کو گلے لگا لیا۔ ہم ان کی جگہ ہوتے تو یہی کرتے۔''

ویسے تو ہر شوہر اس کے لیے کچھ نہ کچھ چھوڑ کے راہی

ملک عدم ہوا تھا مگر اس کے کہنے کے مطابق دوسرے شوہر کی موت تو ایک لاٹری کے ٹکٹ پر دو انعام جیسی تھی۔ یہ مکان اسی کا تھا جو میرے لیے سر چھپانے کا ٹھکانا بنا۔ وہ حادثے میں مارا گیا تھا چنانچہ انشورنس کی رقم بھی مجھے دگنی ہو کے ملی۔''

ہم میں سے کوئی شرارت سے پوچھتا ''ایکسی ڈنٹ تم نے کیسے پلان کیا تھا مارتھا؟''

وہ ہنستی ''تم سے پہلے پولیس کے سراغ رساں بہت سر کھپا چکے ہیں۔ بالآخر یہی ثابت ہوا کہ ان کی قضا آ گئی تھی۔ میرا بالکل کوئی قصور نہیں تھا۔ ایک اخبار نے آسٹن سے میری شادی کے وقت خبر لگا دی تھی۔ اب چوتھے کی باری ہے۔ میرے وکیل نے اسے نوٹس بھیج دیا۔ بیس ہزار پاؤنڈز ہرجانے کا کیس تھا۔ اس نے عدالت کے باہر پانچ ہزار پاؤنڈز دے کر اپنی جان چھڑائی اور معافی شائع کی۔''

ہر وقت ہنسنے اور ہنسانے والی مسز آسٹن اندر سے واقعی ایک دکھی عورت تھی۔ اس کا اندازہ ہر نئے پے انگ گیسٹ کو اس کے گھر میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد ہوتا تھا۔ چالیس سال کی عمر میں وہ گوشت کا چلتا پھرتا پہاڑ بن گئی تھی اور اس کا وزن دو سو پچاس پاؤنڈ ہو چکا تھا۔ اس کی عمر کی لاکھوں عورتیں فٹ اور سلم رہ کے اور حسن و شباب کی حفاظت کے اصولوں پر عمل کر کے چوبیس سال کی جوان لڑکی نظر آنے میں کامیاب تھیں اور ایک آزاد معاشرے میں خوش رہنے کے تمام مواقع سے مستفید ہو کے لائف کو انجوائے کر رہی تھیں۔ ایکسرسائز تو دور کی بات تھی' وہ گھر کے اندر بھی کم سے کم نقل و حرکت کی قائل تھی۔ اشد ضرورت کے سوا کہیں آتی جاتی نہیں تھی اور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی تھی۔

مسز آسٹن کے بجائے مارتھا کہلوانا اسے زیادہ پسند تھا۔ آمدنی کا اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا اسے حکومت کی طرف سے الاؤنس ملتا تھا۔ ایک شوہر کی انشورنس کی رقم کو اس نے بچت کی ایک منافع بخش اسکیم میں لگا رکھا تھا اور گھر کو اس نے گیسٹ ہوم بنا لیا تھا۔ آمدنی کے مقابلے میں اس کے اخراجات بہت کم تھے۔ سب ایک ساتھ بیٹھتے تھے تو کھانے کی میز جھولتی تھی اور فریاد کرتی تھی لیکن وہ کارپینٹر کو نہیں بلاتی تھی۔ ہمیں شرمندہ کرتی تھی کہ تم کیسے نوجوان لوگ ہو۔ کسی دن وقت نکال کے اس میں چار کیلیں نہیں ٹھونک سکتے۔ کرسیاں بھی پرانی تھیں۔ ایک گیسٹ کو کرسی پیچھے کر کے جھولنے کی عادت تھی۔ کرسی دو ٹانگوں پر کب تک ظلم سہتی۔ ایک دن کرسی ٹوٹی تو جھولنے والا پیچھے گرا اور اس کا سر دیوار پر لگا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ بے ہوش ہو گیا۔ ہم سب اسے اسپتال لے جانے کے لیے دوڑے جہاں ڈاکٹرز نے اسے چوبیس گھنٹے آبزرویشن پر رکھ کے واپس بھیج دیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ مارتھا نے فوراً اسے نوٹس دے دیا کہ کرسی تمہاری بے ہودہ عادت کی وجہ سے ٹوٹی۔ اسے پھر قابل استعمال بنانے کی ذمے داری بھی تمہاری ہے۔ میرے باتھ روم کا نلکا مسلسل بہتا تھا۔ مارتھا نے اس کا یہ علاج کیا کہ ٹونٹی میں ایک ربر کا پلگ لگا دیا۔ جب ضرورت ہو ربر نکال لو۔ ٹونٹی بدلنے کی فضول خرچی غیر ضروری ہے۔

کفایت شعاری اور کنجوسی میں اس کے نزدیک چنداں فرق نہ تھا۔ وہ ہم سب کو وقت بہ وقت لیکچر دیتی رہتی تھی۔ پیسا بچاؤ ینگ مین! دنیا میں اب رشتے کام نہیں آتے پیسا کام کرتا ہے۔ پیسا مشکل سے آتا ہے اور آسانی سے جاتا ہے۔ دیر سے آتا ہے اور ٹھہرتا نہیں ہے۔ جب یہ آئے تو اسے پکڑ لو قید کر لو' اپنا غلام بنا لو۔

مارتھا کے بچے نہیں تھے۔ اس کی ساری ذمے داری وہ اپنے چار شوہروں پر عائد کرتی تھی۔ ''سوچو ذرا' جب چار مرد کچھ نہیں کر سکے تو میں اکیلی عورت کیا کر سکتی تھی۔ میں نے تو بہت ٹائم دیا انہیں۔ ایک کو چار سال' دوسرے کو سات سال' تیسرا گیارہ سال کوشش کرتا رہا۔ آسٹن کو بھی چھ مہینے بہر حال ملے۔ میری ماں کہتی تھی وہ شادی کے دوسرے دن حاملہ ہو گئی تھی۔ صرف ایک شوہر تھا میری دادی کا' گیارہ بچے پیدا کیے اس نے۔ اب کسی چیز کا معیار ہی نہیں رہا۔ ہر چیز کی کارکردگی خراب ہو گئی ہے۔ اب تم اس ریڈیو کو دیکھو' دوسری جنگ عظیم کے زمانے کا ہے اور صرف ایک بار خراب ہوا تھا۔ چرچل تقریر کر رہا تھا۔ اچانک اس کی جگہ چوہے کی آواز آنے لگی۔ پھر وہ بھی بند ہو گئی۔ میں تو خوف سے تھر تھر کانپنے لگی کہ ضرور جاپانیوں نے کچھ کیا ہے۔ برطانوی وزیراعظم کو چوہا بنا دیا ہے یا اس کی آواز بدل دی ہے۔ مگر میرا دوسرا شوہر بہت بہادر تھا۔ اس نے ریڈیو کو پیچھے سے کھولا اور ایک اچھا خاصا بڑا چوہا دم سے پکڑ کے نکال لیا۔ بے شک اسے چوہے نے کرنٹ بھی مارا۔''

اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے مارتھا نے گھر میں چار پے انگ گیسٹ رکھ لیے تھے۔ اس دو منزلہ گھر کے اوپر والے حصے میں تین کمرے تھے۔ کچن اور لاؤنج ملا کے اس نے چوتھا کمرا بنایا۔ اوپر دو باتھ روم تھے۔ ایک کو اس نے ٹائلٹ بنا دیا اور دوسرے کو داش روم ''آخر کیا ضرورت ہے سب کو ایک ساتھ ٹائلٹ استعمال کرنے کی۔ اپنی عادتیں درست کرو۔ جو پہلے اٹھتا ہے یا جسے پہلے جانا ہوا اسے پہلے

موقع دو۔ ورنہ آدھا گھنٹا پہلے اٹھ جاؤ۔‘‘

نیچے وہ خود رہتی تھی۔ ایک لونگ روم تھا جہاں تھوڑا بہت وقت سب ہی گزار لیتے تھے۔ وہاں ٹی وی نہیں تھا۔ وہ کہتی تھی کہ ٹی وی دیکھنا ہے تو اپنے کمرے میں رکھو۔ ایک ٹی وی پر سب اپنی پسند کے پروگرام نہیں دیکھ سکتے۔ اخبار پڑھنا ہے' میوزک سننا ہے۔ سب اپنے کمرے میں۔ یہاں بیٹھو تو گپ شپ کرو۔

گیسٹ ہوم کے مستقل باسی چار تھے جو عام طور پر نوجوان طالب علم ہوتے تھے۔ انڈین اور پاکستانی طلبہ اکثر اس کے پاس پرانے حوالوں سے آتے تھے اور مایوس جاتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ صرف سو پاؤنڈز میں وہ جتنی سہولتیں دیتی تھی اتنی اس زمانے میں لندن جیسے شہر میں ڈیڑھ سو پاؤنڈز میں بھی نہیں مل سکتی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے گیسٹ ہاؤس کو فیملی ہوم کہتی تھی اور اس میں ایک گھر جیسا ماحول رکھنے کی قائل تھی۔ وہ پیسے کی نہیں محبت کی بھوکی تھی۔ وہ سب نوجوانوں کا خیال کسی ماں کی طرح رکھتی تھی اور بدلے میں یہ چاہتی تھی کہ اسے ماں جیسی عزت اور توجہ ملے۔ کوئی اس سے جھوٹ نہ بولے۔ اسے بے وقوف نہ بنائے۔ کبھی کبھار اس کی ڈانٹ ڈپٹ بھی سن لے اور شرافت سے رہے۔ ظاہر ہے ایسی سوچ صرف انڈیا پاکستان کے عام گھروں سے آنے والے لڑکوں کی ہوسکتی تھی۔ یورپی ممالک سے آنے والے ایسی خاندانی اقدار کو سمجھتے ہی نہیں تھے' جس میں بزرگ انہیں بالغ مانتے ہوئے انہیں کھلی چھٹی دے دیں اور ان کے اخلاق و کردار کی نگرانی سے دستبردار ہو جائیں۔

مارتھا لڑکیوں کو بھی جگہ نہیں دیتی تھی۔ ’’نہیں بھئی' میں مشکل میں پڑنا نہیں چاہتی۔ ایک لڑکی ہوگی تو اس کے تین عاشق تو یہیں موجود ہوں گے۔ میں کس کس پر نظر رکھوں گی۔ ان کی آپس میں رقابت ہوگی تو جھگڑا ہوگا۔ خون خرابا بھی ہوسکتا ہے۔ پھر وہ باہر سے کسی کا بچہ لے آئی پیٹ میں تو میں کیا مڈوائف بنوں گی اس کی؟ ایک ایرانی نوجوان صالح نے ایک بار بڑی کوشش کی کہ خالی ہونے والا ایک کمرا اس کی بہن کو مل جائے۔ وہ اس کی نیک چلنی کی ضمانت دینے اور اس کی نگرانی کی ذمے داری بھی قبول کرنے کو تیار تھا مگر مارتھا کے اصول بہت سخت تھے۔ وہ تمہاری بہن ہے' باقی سب کی بہن نہیں ہے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ اس نے صاف انکار کردیا۔ صالح سخت مایوس ہوا۔ اس کے باپ نے شاہ ایران کے خلاف انقلاب میں خمینی کا ساتھ دیا تھا مگر وہ بھائی بہن اب خمینی کا تختہ الٹ کے تہران کو پھر پیرس بنانا چاہتے تھے۔ وہ سابق شاہ پرستوں کی کسی تحریک کے سرگرم رکن تھے جو سب مغرب پرستی کے علمبردار تھے۔ اس تحریک کو یورپ اور امریکا سے حمایت اور مالی امداد بھی فراہم ہوتی تھی مگر انہیں پاسداران انقلاب کے ڈر سے چھپ کر رہنا پڑتا تھا۔

میں اس کے ساتھ دو سال سے تھا۔ جب میں آیا تو اس نے میرا بہت سخت انٹرویو لیا تھا ’’کس نے بھیجا ہے تمہیں۔‘‘

میں نے کہا ’’شاہ محمد نے۔ جب وہ طالب علم تھا تو دو سال یہاں رہا تھا۔ امریکا میں وہ میرا روم میٹ تھا۔‘‘

’’تمہارے پاس اتنا اچھا جاب ہے۔ تم زیادہ پیسے خرچ کرنے کسی ہوٹل یا کرائے کے اپارٹمنٹ میں بھی رہ سکتے ہو۔ اگر تم کفایت شعار ہو تو اچھی بات ہے مگر مارتھا کا گیسٹ ہوم تمہیں کیوں پسند ہے؟‘‘

میں نے کہا ’’کیونکہ یہاں سب ایک فیملی کی طرح رہتے ہیں اور میں اپنی فیملی کو بہت مس کرتا ہوں۔ خصوصاً اپنی ماں کو۔‘‘

یہ آخری جملہ کارگر ہوگا۔ مجھے پہلے ہی بتادیا گیا تھا۔ اب مارتھا نے گیسٹ ہوم کے قواعد وضوابط بتانا شروع کیے ’’میں کٹر رومن کیتھولک اور مذہبی ہوں۔‘‘

’’میں بھی پانچوں وقت نماز پڑھتا ہوں۔‘‘

’’شراب تو نہیں پیتے؟‘‘

میں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا ’’توبہ...... توبہ!‘‘

’’راتوں کو غائب تو نہیں رہتے۔‘‘

’’نہ میں جادوگر ہوں اور نہ بھوت۔‘‘

اس نے مجھے ڈانٹا ’’میں آدھی رات کے بعد کسی کے لیے دروازہ نہیں کھولتی۔‘‘

’’کوئی بات نہیں۔ میں کھڑکی کے راستے آجاؤں گا۔ پائپ سے چڑھ کے۔ دوسری چابی بنوالوں گا۔ میرا مطلب ہے کبھی ایسا ہوا تو۔ ویسے میں دس بجے سوجاتا ہوں۔‘‘

’’کبھی کبھار کی کوئی بات نہیں‘‘ اس نے اطمینان کا سانس لیا ’’یہاں تم جوا نہیں کھیل سکتے۔ گرل فرینڈز آسکتی ہیں مگر صرف ویک اینڈ پر۔ ان سے تم صرف لونگ روم میں مل سکتے ہو۔ انہیں کمرے میں نہیں لے جاسکتے۔ رات کو کمرے میں کوئی مہمان نہیں ٹھہر سکتا۔ سوائے تمہارے ماں باپ کے۔ اگر کبھی وہ لندن آئیں تو تم مجھے پہلے سے بتاؤ گے...... سگریٹ پیو مگر باہر۔‘‘

ظاہر ہے' اتنی پابندیوں کے ساتھ رہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ عام طور پر ایشیائی مسلمان اس ٹیسٹ میں

پاس ہوجاتے تھے لیکن جو کمرا ملا اس میں چار سال تک ایک بنگلا دیشی راجن چکرورتی رہا تھا۔ مارتھا اسے بہت یاد کرتی تھی۔ ہی وازاے پرفیکٹ جنٹلمین۔ اب یہ بات مذاق بن گئی تھی۔ ہرنا معقولیت کے مظاہرے پر ہم ایک دوسرے کو یاد دلاتے رہتے تھے کہ تم ایک پرفیکٹ جنٹلمین نہیں ہو۔

میرے علاوہ وہاں حیدرآباد دکن کا عباس حیدر تھا۔ جو بی بی سی میں ملازم تھا۔ وہ ذہین اور انقلابی سوچ رکھنے والا شخص ملک وقوم رنگ ونسل اور مذہب وملت کی کسی حد بندی کو عملاً قبول نہیں کرتا تھا۔ کیا یہ کافی نہیں کہ ہم ایک ہی وقت میں جینے والے انسان ہیں جو ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور مانتے ہیں۔ مگر اس روشن خیال روشن ضمیر کے ساتھ جو ہوا ایسا ہی تھا جیسے خوشبوؤں کا سوداگر کسی گٹر میں ڈوب کے مرجائے۔ وہ رات کو پروگرام کرکے لوٹ رہا تھا کہ اسے نشے میں دھت چار نسل پرست گنجوں یعنی اسکن ہیڈز نے گھیر لیا۔ اس صلح پسند اور نرم خو آدمی نے جان چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ ایک اور چار کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ ان کے پاس فولادی زنجیریں تھیں اور بازوؤں کی ورزش میں کام آنے والے اسپرنگ دار ڈنڈے تھے۔ انہوں نے مار مار کے اسے پلپلا کردیا۔ مارتھا آج بھی اسے یاد کرکے روتی تھی۔ ایرانی نژاد صالح نے بڑی کوشش کی کہ خالی ہونے والا کمرا اس کی بہن کو مل جائے مگر اس میں بالآخر دہلی کا کمپیوٹر انجینئر مرشد آیا۔ ذہنی طور پر وہ خود بھی ایک کمپیوٹر تھا۔ اس کی کسی سے دوستی نہیں تھی اور وہ کمرے میں اپنا سارا وقت کمپیوٹر کے سامنے گزارتا تھا۔ ہم سب اسے کمپیوٹر صاحب کہتے تھے۔

میری زیادہ دوستی پاکستانی ڈاکٹر بشیر چوہدری سے رہی جو میری طرح لاہور کا رہنے والا تھا۔ وہ نیورو سرجری میں اسپیشلائز کرنے آیا تھا لیکن وہ طبعاً رنگین مزاج تھا اور لندن کے رومان پرور ماحول میں ایسا گم ہوگیا تھا کہ نہ اسے ڈگری لینے کی فکر تھی اور نہ واپس جانے کی۔ وہ یار باش ہر وقت خوش رہنے والا زور زور سے قہقہے لگانے والا شوقین مزاج آدمی تھا اور بیک وقت ایک درجن عشق چلاتا تھا تو ان میں سے نصف نوجوان طرح دار لڑکیاں ہوتی تھیں۔ ان کے لنچ ڈنر اور تحائف کے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ کچھ عشق خود سے دگنی عمر کی یا بدصورت عورتوں سے بھی کرتا تھا جو دولت مند ہوں۔

جب میں نے اپنی روانگی کا اعلان کیا تو ہمیشہ کی طرح مارتھا کا صدمے سے برا حال ہوگیا۔ وہ طبعاً اتنی نیک دل اور ہمدرد عورت تھی کہ سوائے کمپیوٹر صاحب کے ہم سب اسے اپنی ہر بات اسی طرح بتا دیتے تھے جیسے اپنی ماں کو بتاتے۔ اس میں ایک خوبی رازداری کی بھی تھی چنانچہ وہ میرے تمام حالات سے باخبر تھی۔ وہ میرے اور فریال کے سارے معاملات جانتی تھی۔ گیسٹ ہوم کے کسی بھی ساتھی کے سامنے میں نے کبھی فریال کا نام بھی نہیں لیا تھا چنانچہ وہ سمجھتے تھے کہ دل لگی کے لیے میں بھی موسم کے حساب سے گرل فرینڈز بدلتا رہتا ہوں۔ لیکن لارڈ ارنسٹ کی دولت مند مغرور اور انتہائی حسین بیٹی ایشا کے ساتھ میرا بڑا جان لیوا قسم کا افیئر ہے ورنہ وہ اتنا بڑا قدم کیسے اٹھاتی۔ میری خاطر وہ ماں باپ کا گھر، عیش وعشرت کی زندگی، اپنا مذہب اور ملک سب چھوڑنے پر تیار تھی۔

پہلے تو مارتھا نے مجھے روکنے کے لیے جذباتی دلائل کا سہارا لیا ''تم بہت بڑی غلطی کررہے ہو رفیق!''

''ایک فلسفی کا قول ہے کہ ہم پیدا ہو کے سب سے بڑی غلطی کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مذاق مت کرو۔ جس حویلی اور جاگیر کی خاطر تم واپس جارہے ہو۔''

میں نے کہا ''اس بیان میں تصحیح ضروری ہے۔ میں والدین کے حکم پر واپس جارہا ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان دونوں کا کیا ہوگا؟''

''کون دونوں؟''

''رفیق! واپس جاکے تم فریال سے شادی نہیں کرسکتے۔ وہ جو تمہارا دشمن ہے..... مرزا، وہ تمہیں مرڈر کردے گا۔''

''ایسا ہی کرنا چاہیے اسے..... اصولاً۔'' میں نے کہا۔

''فریال سے تم یہاں شادی کرسکتے تھے۔ لندن میں اس کی بدمعاشی نہیں چل سکتی تھی۔''

''ہم یہاں ہمیشہ نہیں رہ سکتے۔''

''کیوں نہیں رہ سکتے؟ لاکھوں پاکستانی ایسے ہی رہتے ہیں۔ لیکن فرض کرو تم کو شہریت کا مسئلہ درپیش ہو۔ تو سب سے آسان حل ہے کہ اس لارڈ کی بیٹی عائشہ سے شادی کرلو۔''

''اور برطانوی شہری ہونے کے بعد فریال سے شادی کرلوں۔ ایک چین ری ایکشن کے طور پر اسے بھی برطانیہ کی شہریت حاصل ہوجائے۔ تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔''

''جب تمہارے مذہب میں ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہے.....''

''ایسا کرنا ہوتا مارتھا ڈارلنگ تو دو سال پہلے کرچکا

ہوتا۔ جب میں نے تمہیں دیکھا تھا اور پہلی نظر میں تم پر فریفتہ ہوگیا تھا۔''

اس نے ایک دم میرا کان پکڑ لیا ''میں سیریس بات کررہی ہوں اور تو مذاق کررہا ہے.....''

میں نے واویلا کیا ''ارے' میرا کان نکل جائے گا۔ اسی سے سنتا تھا میں' دوسرا تو سن کے اڑانے کے لیے تھا۔''

اس نے میرا کان چھوڑ دیا۔ ''میں تمہارا بھلا چاہتی ہوں رفیق! مجھے تمہارے فادر سے بات کرنی ہوگی۔''

میں نے کان ہلا کے کہا ''کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بہرے ہیں' صرف اپنے مطلب کی بات سنتے ہیں۔''

''ان کو سوچنا چاہیے۔ تم کو جس مجرموں کے گروہ سے نکال کے باہر بھیجا تھا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ طاقتور ہیں۔ یہ تم نے ہی بتایا تھا مجھے۔ پرانے آسیب کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم خوش قسمت تھے کہ جان بچانے میں کامیاب رہے تھے۔ کیا گارنٹی ہے اس کی کہ جب تم واپس جاؤ گے تو وہ پھر تمہیں استعمال نہیں کریں گے۔''

''وہ بات پرانی ہوگئی۔ پرانے لوگ مرکھپ گئے۔ میرا اب ان سے کوئی تعلق نہیں۔ رسک نہ ہونے کے برابر ہے۔''

''مگر ہے..... کیا ضرورت ہے رسک لینے کی۔ تمہارے والدین کو یہاں آ کے سیٹل ہوجانا چاہیے۔ یہ جو حویلی اور جاگیر ملی ہے انہیں۔ اسے بیچ دیں اور سارا پیسا لے کر یہاں آ جائیں۔ جہاں ایک شاندار مستقبل ہے..... اگر وہ تمہاری نہیں سنتے تو میں بات کروں گی ان سے۔''

اس نے بات کی۔ ہر حوالے اور دلیل سے۔ ''یہ سات سمندر پار کی کال اسے میرے تین ماہ کے کرائے سے زیادہ مہنگی پڑی اور رائیگاں گئی۔ جذبات کے آگے دلیل ویلے کبھی کون سنتا ہے۔''

فون رکھ کے وہ رونے لگی ''کوئی نہیں سنتا میری۔ میں ہوتی بھی کون ہوں تمہیں رد کرنے والی۔ کیا حق ہے میرا تم پر۔''

میں نے اسے گلے لگا کے بہت تسلی دی ''ایسا مت کہو مارتھا۔ یہاں تم نے مجھے ماں جیسی محبت دی حالانکہ میں ایک اجنبی تھا۔''

''رفیق! مائی سن! یور مارتھا کو بھلا مت دینا۔ مجھے خط لکھتے رہنا اور فون ضرور کرنا۔ کرسمس پر اور نئے سال پر مجھے وش ضرور کرنا۔ میری برتھ ڈے یاد ہے نا تمہیں۔ کارڈ بھیجنا مت بھولنا۔ یہ ای میل وغیرہ میں نہیں جانتی۔ خوبصورت کارڈ بھیجنا۔ میں انہیں سنبھال کے رکھوں گی..... اور ہاں' میرے مرنے سے پہلے ایک بار مجھ سے ملنے ضرور آنا۔''

میں نے کہا ''مارتھا..... ایسی باتیں مت کرو' میں ضرور آؤں گا۔''

''سب ایسا ہی کہتے تھے' جو چلے گئے۔ صرف راجن چکرورتی وعدے کا پکا ثابت ہوا۔ ہی واز اے پرفیکٹ جنٹلمین! تم بھی اچھے لڑکے ہو رفیق۔ اپنی شادی کی تصویریں ضرور بھیجنا مجھے۔ بلکہ وڈیو فلم۔ شادی کے بعد اپنی بیوی کو مجھ سے ملوانے ضرور لانا۔ ہو سکے تو بعد میں اپنے بچوں کو بھی۔''

میں نے کہا ''میں تمہیں اپنی شادی میں ضرور بلاؤں گا۔''

''فریال بہت پیاری لڑکی ہے۔ میں ہر روز تمہارے لیے دعا کروں گی۔ خداوند یسوع مسیح تمہاری مشکلات دور کرے گا۔ خیر' بہت دل چاہتا ہے کسی دھوم دھام والی شادی میں شرکت کروں۔ اسے دیکھوں وہ لال برائیڈل ڈریس میں ہاتھوں پر مہندی لگا کے اور ڈھیر سارا زیور پہن کے کیسی لگتی ہے لیکن میں کیسے جا سکتی ہوں اپنے دوسرے بچوں کو چھوڑ کے۔ وہ کیا کریں گے میرے بغیر۔ کون خیال رکھے گا ان کا۔''

اب میری روانگی کا وقت آ گیا تھا۔ مارتھا سخت اداس تھی لیکن پہلے کی طرح اس نے مجھے بھی خوش دلی سے رخصت کرنے کے لیے ایک الوداعی پارٹی کا بندوبست کیا تھا۔ اس کے ساتھ رہنے والے کبھی کبھی شوقیہ اپنے علاقے کی کوئی روایتی ڈش تیار کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی ماہر نہ تھا مگر لندن آ کے سب پکانے لگتے تھے۔

لاہور کا چوہدری بشیر مچھلی فرائی کرتا تھا تو کہتا تھا ''لے بھئی ماسی اپنے لہور کا پتا ہے نا' جارج بش نے اور کوفی عنان نے بھی ادھر مچھلی کھائی ادھر مزنگ چونگی میں تو کہا کہ واقعی لہور لہور ہے۔ اپنا ایک ہمنام ہے ادھر بشیر۔ کیا مچھلی بناتا ہے ماسی! بندے کو لائن میں لگنا پڑتا ہے۔ تمہارا شہزادہ چارلس جائے تو اسے بھی باری سے ملے گی اور لائن پتا ہے کدھر تک جاتی ہے' اپنے نیلے گنبد تک۔ نیلے گنبد کا پتا ہے نا' بلیو ڈوم..... تو ماسی مارتھا میں نے استاد بشیر آف دارالماہی کے گوڈے پکڑ لیے۔ گوڈے یعنی گھٹنے ..... اس طرح..... میں نے کہا استاد' جب تک مچھلی کے مسالے کا نسخہ نہیں بتاؤ گے' نسخہ وہ نہیں جو ہم جیسے ڈاکٹر لکھتے ہیں' فارمولا..... تب تک چھوڑوں گا نہیں۔ میں بھی ادھر بیٹھا ہوں آپ کے ساتھ۔ لو جی گوڈے چھڑاتا تو وہ خود گھر کیسے جاتا۔ اس نے کہا کہ اچھا' ادھر لا اپنا کان..... پھر میرے کان میں

نسخہ بتا کے مجھے قسم دی بہت بڑی' ایک یہ کہ مرتے دم تک نسخہ کسی پر ظاہر نہیں کروں گا' اپنی گھر والی پر بھی نہیں۔ عورت ذات جیسے حمل نہیں چھپا سکتی ایسے ہی بات نہیں چھپا سکتی۔ میں نے کہا استاد جی' اپنے پیو دا پتر نہیں میں جو پولیس بھی مجھ سے کچھ پوچھ سکے۔ بے شک تیرہ نمبر سے وہ روز صبح شام چھترول کریں' چھترول کا پتا ہے نا......؟''

عباس حیدر سے ہر شخص کہتا تھا کہ حیدر آبادی بینگن کھلاؤ کسی روز۔ اسے انڈا ابالنا بھی نہیں آتا تھا۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ لندن میں ہی اس کا ایک حیدر آبادی خاتون سے افیئر ہوگیا۔ انہوں نے اور کچھ سکھایا یا نہیں مگر حیدر آبادی بینگن پکانا سکھا دیے۔ وہ بار بار کی پریکٹس کے بعد عباس حیدر نے اپنا شمار ماہرین میں کرنا شروع کر دیا اور فوراً ایک بنگالن پھانس لی۔ وہ رس گلے بھی اچھے بنانے لگا۔ زندگی نے وفا نہ کی ورنہ کسی دلی والے سے قورمہ اور کراچی والی سے سندھی بریانی کے علاوہ بہت کچھ سیکھنا اس کے پروگرام میں شامل تھا۔ کہتا تھا یار خواہ مخواہ علم کے چکر میں پڑ کے صحافی بنے۔ دولت کے چکر میں باورچی بننا آسان تھا۔ آج لندن میں اپنا کوئی ریسٹورنٹ ہوتا۔

مرشد نے صرف ایک بار غضب کا قورمہ بنایا اور پھر کہہ دیا تھا کہ آئندہ جسے بنانا ہو نسخہ اور طریقہ کمپیوٹر پر دیکھ لے۔ پہلے امریکا اور اب لندن میں مجھے چکن پلاؤ میں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ لندن میں سب کچھ اسی طرح ملتا تھا جیسے لاہور' دہلی یا کراچی میں بلکہ کوالٹی میں بھی بہتر لیکن اس کے باوجود اپنے ہاتھ سے پکا کے کھانے کا شوق سب کو تھا۔ شاید اس طرح وہ گھر کے پکے کھانے سے وابستہ اپنائیت کے احساس کو تازہ کرتے تھے۔ ہوٹلوں میں کھانا ہم سب کی معاشرت میں آج بھی اپنے گھر کے نہ ہونے کی خلش جگاتا تھا۔ ذائقے سے زیادہ یہ سکون غرور اور اعتماد و اطمینان کی بات تھی جو اپنی کار میں بیٹھنے والے کو ملتا ہے۔ ٹیکسی میں سفر کرنے والے کو نہیں۔

صرف ایرانی نوجوان صالح بالکل نکما تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں پکا سکتا تھا مگر کھانے میں سب سے آگے رہتا تھا۔ معاملات کام و دہن میں وہ شرعی حدود کو بہت پہلے عبور کر چکا تھا۔ ظاہر ہے اس کا آج کے ایران میں گزارا ممکن نہ تھا اور مجھے اس کے خوابوں کا انقلاب محض خود فریبی نظر آتا تھا۔

مارتھا نے ہم سب سے کچھ نہ کچھ سیکھا تھا اور الوداعی دعوت میں وہ خود انڈین کھانے بناتی تھی۔ ہم انہیں پاکستانی قرار دیتے تھے۔ بہت سی دوسری باتوں کی طرح یہ بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ تم لوگوں کی زبان ایک' لباس ایک' کھانے وہی' موسیقی وہی' صرف مذہب الگ ہے تو تم لوگ لڑتے کیوں ہو؟ یہاں تو نہیں لڑتے۔ ظاہر ہے یہ بات آسانی سے اس کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی چنانچہ ہم مذاق میں ٹال دیتے تھے۔

میں نے اپنے سات دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ ان میں سے تین لڑکیاں تھیں۔ اتنے لوگوں کے لیے کھانا بنانا اکیلی مارتھا کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ صرف چکن پلاؤ بنا رہی تھی باقی چیزیں میں نے ایک مشہور پاکستانی ریسٹورنٹ سے منگوالی تھیں۔

کچن سے نکل کے اس نے کرسی پر گرتے ہوئے اپنا پسینہ صاف کیا ''او گاڈ! میں کتنی تھک گئی ہوں لیکن خدا کا شکر ہے' سب تیار ہے۔''

میں نے کہا ''مارتھا ڈارلنگ! جاؤ اب تم خود تیار ہو جاؤ۔''

''او بوائے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں وہ مضحکہ خیز لباس کیسے پہنوں گی'' اس نے فریاد کی۔

میں نے کہا ''آخر تم ساڑی باندھنا جانتی ہو۔''

''وہ تو بس چھ گز سیدھا کپڑا ہے۔ میں لپیٹ لیتی تھی کسی نہ کسی طرح۔ اس کا ٹاپ تو ٹھیک ہے لیکن نیچے کا حصہ...... کیا بولتے ہیں اس کو...... گریگری۔''

میں نے ہنس کے کہا ''غراری......!''

''وہ تو عجیب چیز ہے۔ جیسے دو اسکرٹ جوڑ دیے جائیں۔ ایک دائیں ٹانگ کے لیے۔ ایک بائیں ٹانگ کے لیے...... ہاؤ سلی!''

میں نے کہا ''مارتھا یہ برائیڈل ڈریس ہے۔ ہماری دلہنیں پہنتی ہیں۔ میری شادی ہوگی تو دلہن پہنے گی۔ میری ماں نے اور اس سے پہلے دادی نے بھی یہی پہنا تھا۔ ڈونٹ کال اٹ سلی! کتنی اچھی لگتی ہیں ہماری دلہنیں۔ تم نے ویڈیو فلمیں دیکھی ہیں۔''

''یہ اتنا لمبا کیوں ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے میں قینچی لے کر اسے نیچے سے کاٹ نہ دوں۔ مجھے ڈر ہے کہیں پیر الجھ گیا تو میں منہ کے بل گروں گی۔''

میں نے کہا ''جو عروسی لباس تمہاری دلہنیں پہنتی ہیں اور تم نے بھی پہنا ہوگا۔ وہ کتنا لمبا ہوتا ہے۔ وہ مضحکہ خیز نہیں لگتا تمہیں' ڈائنا کا ڈریس دیکھا تھا...... وہ خود پادری کے پاس پہنچ گئی تھی' اس کے ڈریس کا پچھلا حصہ چرچ کے وسط میں تھا۔''

''رفیق! میں دلہن نہیں ہوں۔ ذرا اس کا شوخ لال رنگ دیکھو لوگ مجھ پر ہنسیں گے۔''

''لوگ خوش ہوں گے۔ سب بچے ہیں تمہارے۔ پھر تمہارے ساتھ تصویریں بنوائیں گے۔ میں پاکستان جاؤں گا تو سب کو دکھاؤں گا۔ میں نے سب کو بتادیا ہے کہ میری فرمائش پر تم یہ لباس پہن رہی ہو۔ تم نے میری ماں کی شادی والی تصویر دیکھی ہے نا۔ جس میں میرے فادر بھی گلے میں پھول ڈالے کھڑے ہیں۔''

''ان کے چہرے کہاں نظر آرہے تھے۔ سر کے سامنے پھولوں کی چادر لٹکی ہوئی تھی۔''

میں نے کہا ''اسے ہم سہرا کہتے ہیں۔ انہوں نے شادی کے پچیس سال بعد اپنی شادی کی سلور جوبلی پر وہی لباس پھر پہنا تھا۔''

''کیسے پہنا تھا'' مارتھا نے اعتراض کیا ''وہ تو بہت چھوٹا پڑا ہوگا۔''

میں نے کہا ''یہ واقعی عجیب بات ہوئی۔ میری ماں شادی کے وقت کچھ موٹی تھی۔ اب سلم ہے۔ ابا تھوڑا سا پھیلے تھے۔ شیروانی میں پھنس گئے۔ تقریب کے مہمان جتنے خوش تھے اتنے حیران۔ بعد میں ابا کو شیروانی سے رہائی ملی تو انہوں نے کہا کہ میرا سانس بند ہو چکا تھا' ناؤ گو۔''

''او کے' او کے..... سنی!'' وہ ہمت کر کے اٹھی۔

''تمہارا ہیئر اسٹائل میں بناؤں گا اور پھر دوپٹا سیٹ کروں گا۔''

اس نے بے بسی سے ہاتھ ہلائے کہ اب جو ہو سو ہو۔

میں اپنے کپڑے بدل چکا تھا۔ جب گھنٹی بجی اور میں اپنے پہلے مہمان جوڑے کو اندر لے آیا۔ وہ میرے ساتھ کام کرنے والے مسز اور مسز ایلیٹ تھے۔ جب ان کا عشق چل رہا تھا تو وہ مسٹر اور مسز ایڈیٹ کہلاتے تھے۔ بظاہر محبت کے سوا ان میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ جاپانی نژاد سوشی دیکھنے میں ایک سیدھی سادی نازک اندام لڑکی تھی مگر اس کے پاس مارکیٹنگ کے شعبے کا شاندار تجربہ تھا۔ جاپانی اپنی اصل عمر سے بہت کم کے نظر آتے ہیں۔ سوشی اگر خود کو بائیس چوبیس کا بتاتی تو لوگ یقین کرتے مگر اس کی عمر چونتیس سال تھی جو اس نے کبھی نہیں چھپائی۔ اس کے پاس فرانس کی سوبورن یونیورسٹی کی ڈاکٹریٹ تھی۔ دو سال اس نے ایک ریسرچ آرگنائزیشن کے لیے کام کیا۔ پھر الیکٹرانک ہوم اپلائنس بنانے والی ایک کمپنی کے ساتھ چھ سال گزارے۔ اصولی اختلاف کی بنا پر استعفیٰ دیا لیکن حریف کمپنی میں دگنی تنخواہ پر اچھا عہدہ بھی اصول پرستی کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔ اب وہ اسی کمپنی میں مارکیٹنگ کے شعبے کی ڈائریکٹر تھی جہاں میں دو سال گزار چکا تھا۔ میں اس کا ماتحت تھا اور مسٹر ایلیٹ میرے ماتحت تھے۔ مسٹر ایلیٹ بھی خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والے آدمی تھے۔ ان کے عشق کی کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ آفس سے باہر لوگوں کو ایک ساتھ لنچ اور ڈنر کرتے نظر آئے تو بات کھلی۔ انہوں نے بڑی سادگی سے اعتراف کرلیا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور بہت جلد شادی کرنے والے ہیں۔ ایک دن انہوں نے کسی کو بتائے بغیر شادی کرلی اور اس سے اگلے دن معمول کے مطابق آفس آئے۔ مجھے اس کی سادگی اور صاف گوئی بہت پسند تھی۔ وہ خوبصورت بھی تھی اور خوش اخلاق بھی۔ ایسی صلاحیت اور اتنے اچھے عہدے کی مالک کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس کا دماغ خراب ہو جاتا۔ وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی۔ میں بہت سی انڈین اور پاکستانی لڑکیوں کو جانتا تھا جو معمولی عہدوں پر ترقی کرنے کے بعد کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے ایسے خاموشی سے شادی کیوں کی تو اس نے کہا کہ اس میں ڈھول پیٹنے والی کون سی بات تھی۔ بنی مون کے سوال پر اس نے کہا کہ وہ کام چھوڑ کے تو نہیں جاسکتے۔ جب ان کی سالانہ چھٹیاں ملیں تو چلے جائیں گے طبعاً مسٹر ایلیٹ ایک درویش تھے۔ قناعت پسند' پرسکون' ایماندار اور سب کے خیر خواہ۔ ان کی بیوی میں مجھے ایک مثالی مشرقی عورت کے تمام اوصاف نظر آتے تھے۔

میں نے انہیں بٹھا کے درمیان میں ڈرنکس رکھے ''میں کچھ مارتھا کی مدد کرنا چاہتا ہوں'' میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

اسی وقت اندر سے مارتھا کے چلانے کی آواز آنے لگی۔ وہ نہ جانے کس پر خفا ہو رہی تھی۔ ''کیا مطلب ہے آخر تمہارا اس فضول بات سے۔ کیا چاہتے ہو تم' دیکھو یہاں کوئی ڈرنے والا نہیں ہے تم سے بدمعاش۔ میں ابھی بتاتی ہوں پولیس کو۔''

جب میں گیا تو اس نے فون کا ریسیور رکھ دیا۔ وہ غرارہ سوٹ پہن چکی تھی۔ کچھ اس لباس کا اثر تھا کہ مارتھا کے چہرے پر لالی دکھائی دیتی تھی تو کچھ غصے کا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں فکر و تردد کے ساتھ خوف کی پرچھائیاں بھی نظر آئیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بالکل ٹھنڈا تھا۔ ''واٹ

از رانگ مارتھا! کیا تم نے پھر آسٹن کا بھوت دیکھ لیا ہے؟ یہ کال کس نے کی تھی' تمہارے کسی سابقہ شوہر نے.....؟''

''اوہ ڈیئر!'' وہ کانپتی آواز میں بولی ''کوئی میرے ساتھ ایسا بے ہودہ مذاق نہیں کرسکتا۔ وہ بہت سیریس تھا۔ یہ واقعی بڑی پریشانی کی بات ہے۔''

میں نے کہا ''کیا ہوا..... مجھے بتاؤ..... کس نے فون کیا تھا؟''

''معلوم نہیں' ڈیٹ ہاسٹرڈ..... اس نے نام نہیں بتایا اپنا۔''

میں نے فون کا بٹن دبا کے دیکھا۔ اس پر کال کرنے والے کا نمبر موجود تھا۔ ''یہ تو کسی فون بوتھ کا نمبر ہے غالباً؟''

مارتھا نے سر ہلایا ''جب میں نے اسے پولیس کو بتانے کی دھمکی دی تو وہ ہنسا تھا۔ اسے کال ٹریس ہونے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔''

''کیا کہا اس نے تم سے؟''

''وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا..... راسکل' دھمکی دے رہا تھا۔''

میں نے کہا ''پرسکون ہو جاؤ مارتھا! مجھے بتاؤ کیا دھمکی دی تھی اس نے۔''

''اس نے مجھ سے پوچھا کہ رفیق آج کس سے ملنے گیا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم باہر کون کس سے ملتا ہے؟ نہ کوئی مجھے بتا کے جاتا ہے' تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''صحیح جواب دیا تم نے۔''

''اس نے پوچھا کہ کیا وہ کسی لڑکی کے ساتھ گیا تھا۔ اور کیا وہ ایک پاکستانی لڑکی تھی؟ میں نے کہا کہ یہاں سے وہ اکیلا گیا تھا لیکن ان سوالات کا مقصد کیا ہے؟ اس نے کہا کہ جھوٹ مت بول قاتل بڑھیا' ہم سب جانتے ہیں۔''

''اوہ گاڈ! ایسا کہا اس نے تم سے؟''

''میں نے کہا کہ تم کو شرم آنی چاہیے۔ فون پر مجھے گالیاں اور دھمکیاں دے رہے ہو۔ میں تمہاری ماں کے برابر ہوں..... اور تم جانتے ہو تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو' مارتھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے اس کے سر کو سینے سے لگا کے تھپکا ''وہ بدمعاش نشے میں ہوں گے مارتھا۔ ان کی بات کو اہمیت مت دو' فیک اٹ ایزی!''

''نہیں رفیق! وہ نشے میں بالکل نہیں تھے۔ اور دو تھے۔ پیچھے سے دوسرا مسلسل بکواس کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اس چڑیل سے پوچھو کہ کیا وہ کسی لڑکی کے ساتھ نہیں گیا تھا؟''

''اس کا مطلب ہے انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔''

''میں نے پوچھا کہ کون لڑکی! یہاں سے وہ اکیلا گیا تھا لیکن وہ اصرار کرتا رہا کہ رفیق کے ساتھ ایک پاکستانی لڑکی تھی۔ ضرور وہ تمہاری اور فریال کی بات کر رہا تھا' کیا تم اس کے ساتھ تھے؟''

میں نے اقرار میں سر ہلایا ''لیکن وہ میرے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ ٹاور برج پر مجھ سے ملنے آئی تھی اور وہاں اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی ہوتا تو میں ضرور دیکھتا۔ میں وہاں ایک گھنٹے پہلے سے موجود تھا۔ میں ریسٹورنٹ کے اندر تھا اور میں نے شیشوں میں سے دیکھا تھا۔ وہ اپنی گاڑی بھی نہیں لائی تھی۔''

''وہ اس کی ٹیکسی کے تعاقب میں ہوں گے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''وہ گھر سے اپنی پاکستانی دوست ڈاکٹر شائستہ کے کلینک گئی تھی۔ اگر کوئی اس کے پیچھے جاتا تو یہی سمجھتا کہ وہ مشورے کے لیے آئی ہے۔ ڈاکٹر شائستہ سے اس نے گاڑی لی اور اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دی۔''

''پھر کسی نے اسے ڈاکٹر کی گاڑی میں بیٹھتے دیکھا ہوگا۔''

''نہیں۔ اس کی کار اپنے گھر کے گیراج میں ہوتی ہے۔ اور اس کے سیاہ شیشے ہیں۔ کوئی اندازہ نہیں کرسکتا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے۔''

''وہ خود تو اس وقت مریضوں کو دیکھتی ہے۔''

''ہاں۔ مگر کار اس کے شوہر یا اس کے بچوں میں سے کوئی لے سکتا ہے۔ یہ کسی کو شک نہیں ہوسکتا کہ ایک مریضہ گاڑی لے گئی۔''

''اور معلوم ہے' اس نے کیا کہا؟'' مارتھا بے حد خوف زدہ تھی اور کانپ رہی تھی ''اس نے پوچھا کہ تمہارا وہ پے انگ گیسٹ کب واپس جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ صبح' تو وہ بولا کہ اسے کہنا۔ صبح ضرور واپس پاکستان چلا جائے' اپنے پیروں پر چل کے ورنہ..... ورنہ ہم اسے تابوت میں روانہ کریں گے۔ اس کا سائز ہمارے پاس ہے۔ او مائی گاڈ! وہ سیریس تھا۔''

''پھر تو ہمیں ضرور پولیس کو بتانا چاہیے' یہ قتل کی دھمکی ہے۔''

اس نے کہا ''ٹھہر جاؤ رفیق! ابھی تمہارے دوست آ رہے ہیں۔ وہ بھی آپ سیٹ ہوں گے۔ ڈونٹ اسپائل دی فن۔ پولیس آئے گی تو پھر ضابطے کی پوری کارروائی ہوگی۔ وہ سب کا بیان لے گی۔ الوداعی تقریب غارت ہو جائے

گی۔ اگر اس نے پھر فون کیا تو ہم ضرور رپورٹ کردیں گے۔''

میں نے کہا ''اس کے علاوہ صبح میں جا ہی رہا ہوں۔ اس کی دھمکی کو بے مقصد بکواس سمجھنا چاہیے۔''

''لیکن میں نے اس باسٹرڈ کو ایسا نہیں کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ کوئی تم سے ڈرتا نہیں ہے۔ وہ جب چاہے گا' جائے گا۔''

میں نے اسے تسلی دی'' حالانکہ فریال نے مجھے بہت روکا کہ میں چھ ہفتے کے لیے رک جاؤں۔ پھر وہ دو ہفتے تک میری روانگی ملتوی کرانا چاہتی تھی مگر میں نے کہا کہ میرا فیصلہ فائنل ہے۔ کیا دھمکی دینے والا کوئی پاکستانی تھا؟''

''نہیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے لہجے پر غور کیا تھا۔ وہ لندن کا رہنے والا نہیں ہوسکتا۔ وہ لوفروں کی زبان بول رہا تھا۔ وہ یقیناً اسکاٹ تھا۔ میں لہجے کا فرق بہت اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ خیر' پولیس معلوم کرلے گی'' اس نے پھر ریسیور اٹھایا۔

میں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا'' کوئی فائدہ نہیں مارتھا بات کو بڑھانے کا۔ صبح تو میں جا رہا ہوں۔ اگر اس خیال سے وہ مطمئن ہوجاتا ہے کہ میں اس کی دھمکی سے ڈر کے بھاگ گیا۔ تو چلو اسے خوش ہونے دو۔''

''یہ بہت سیریس بات ہے سنی!''

''جب میں خوف زدہ نہیں ہوا تو تم کیوں پریشان ہو۔ ناؤ کم آن! مہمان آرہے ہیں۔ لاؤ میں تمہارے بال بنادوں۔''

اس نے کہا'' رفیق! کیا تمہیں اس کا خیال نہیں آتا۔ وہ جو فریال کا منگیتر ہے..... مرزا.....!''

''وہ ایسی حرکت کیوں کرے گا؟''

''رفیق! وہی دے سکتا ہے ایسی دھمکی۔ آفٹر آل وہ تمہارا جانی دشمن ہے۔ اس نے تمہیں فریال کے ساتھ دیکھ لیا ہوگا۔''

''وہ لندن میں نہیں ہے۔''

''سات گھنٹے میں کوئی بھی لندن آسکتا ہے۔''

میں نے کہا'' او کے۔ میں دعوت کے بعد معلوم کرلوں گا۔''

''کیسے معلوم کرلو گے؟''

میں نے کہا'' اگر وہ یہاں ہوتا تو کیا فریال کے علم میں نہ ہوتا۔ وہ بتا سکتی ہے مجھے۔ ورنہ پاکستان میں میرا ایک دوست اخباری رپورٹر ہے۔ اسے سب کے بارے میں علم ہوتا ہے کہ کون کہاں ہے؟ وہ اسلام آباد میں بیٹھا ہے' جہاں سارے سیاست داں ہوتے ہیں۔''

''اچھا تو پھر اسے ابھی فون کرو۔''

''پہلے فریال سے پوچھ لوں۔''

''نہیں' یہ رسک کیوں لیتے ہو۔ کہیں وہ مشکل میں نہ پڑ جائے۔ پاکستان میں اپنے دوست سے معلوم کرلو۔''

میں نے کہا'' مارتھا دیر ہو رہی ہے' سب انتظار کر رہے ہیں۔''

''پانچ منٹ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

میں نے کہا'' مجھے تمہارے بال اور دوپٹا سیٹ کرنا تھا۔''

وہ بگڑنے لگی'' بھاڑ میں گئے بال اور دوپٹا۔''

پاکستان میں شام کے چھ بجنے والے تھے۔ میں نے راجا کے اخبار کے دفتر فون کیا۔ نیوز روم میں رپورٹر بھی سات بجے کے بعد ہی آتے تھے۔ گھنٹی بہت دیر بجتی رہی پھر کسی نے ریسیور اٹھایا اور میری بات سنتے ہی'' راجا ابھی نہیں آیا'' کہہ کے رکھ دیا۔ میں نے اس کے گھر فون کیا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا لیکن اس وقت راجا کے گھر پر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آخری چانس کے طور پر میں نے پریس کلب میں کوشش کی۔ کوئی اسے تلاش کرنے گیا۔ اس نے راجا کو دیکھا تھا۔

راجا کی آواز پانچ منٹ بعد آئی'' لیکے پتر! خیر تو ہے۔'' یوسف کی وجہ سے اب ہر دوست مجھے اسی طرح مخاطب کرتا تھا۔ میں نے کہا'' مہاراجا! ایک بات پوچھنی تھی تجھ سے۔''

''پوچھ۔ پوچھ!''

''تجھے کچھ معلوم ہے' میرا وہ کالے کرتوت اور کالے منہ والا دشمن کہاں ہے؟''

وہ ہنسا'' سالے گورے! ویسے تو میں بھی اس تعریف پر پورا اترتا ہوں۔''

میں نے کہا'' ابے..... تجھے صفدر سلطان مرزا کا کچھ پتا ہے؟''

''ہاں' پتا ہے..... مگر بات کیا ہے؟ اس نے قتل کردیا ہے تجھے بالآخر!''

میں نے کہا'' ابھی تک تو نہیں کیا مگر کردے گا۔''

''انشاءاللہ'' راجا نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا۔

میں نے کہا'' اسے کب دیکھا تھا تو نے' آخری بار؟''

''ابے وہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے؟ ابھی گزشتہ ہفتے

اس نے صحافیوں کو افطار پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ اب رمضان شریف میں ہم ننگے بھوکوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ سب زکوۃ خیرات دینے کے لیے بلا لیتے ہیں۔ روزہ ایک' افطاریاں تین چار بھی ہو جاتی ہیں۔''

میں نے کہا ''تیرے باپ نے بھی روزہ رکھا ہے کبھی؟''

وہ بے شرمی سے ہنسا ''جو بلاتے ہیں وہ اور جو آتے ہیں سب سالے ڈراما کرتے ہیں جیسے بھوک پیاس سے دم نکلنے والا ہو۔ دراصل افطاریاں سیاسی ڈنر ہوتی ہیں۔ پریس کانفرنس تو بڑی رسمی چیز ہے۔ افطار پارٹی میں بڑا دوستانہ' روحانی اور غیر رسمی سا ماحول ہوتا ہے۔ جس سے جو کہنا ہو رازداری سے کہہ دیا۔''

''تو گیا تھا اس کی پارٹی میں' ملا تھا اس سے؟''

''نہیں یار! اسی دن گورنر صاحب نے بھی مدعو کر لیا تھا۔ ظاہر ہے' میں نے اسے ترجیح دی۔ کچھ کام کرانے تھے لوگوں کے اور اپنی جیب بھی خالی تھی۔ اچھا خاصا بھاری لفافہ ملا عیدی میں۔''

میں نے کہا ''مہاراجا! اتنی بے غیرتی سے تو اعتراف کر رہا ہے۔ سالے ضمیر کہاں گیا تیرا جس پر تجھے اتنا غرور تھا؟''

اس نے ایک آہ بھری ''ضمیر صاحب' تو اب پاکستان میں کہیں بھی نہیں۔ کچھ کہتے ہیں ان کی یہاں کوئی سنتا نہیں تھا۔ وہ چلے گئے امریکا جہاں امریکا کو اٹھتے بیٹھتے گالیاں دینے والوں کی اولادیں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جاتی ہیں۔ مگر تو بتا' صفدر سلطان مرزا کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے؟''

''تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا۔ یہ بتا وہ لندن میں ہے یا نہیں' آج کی تاریخ میں؟''

''یار' میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔''

''دیکھ' یہ معلوم کرنا میرے لیے بہت ضروری ہے۔ کسی سے پوچھ کے بتا'' میں نے کہا۔

''پرابلم تو یہی ہے' کسی اور کو معلوم ہوتا تو مجھے بھی ہوتا۔''

میں نے کہا ''کیوں' وہ روپوش یا مفرور ہے؟''

''کچھ ایسا ہی سمجھ لے۔ تو جانتا ہے اس کی ایک خاندانی بیوی تھی۔ جیسے کہ ان سب فیوڈل لارڈز کی ہوتی ہے۔ کوئی عم زاد!''

''ہاں۔ کیا ہوا اسے؟''

''وہی جو ہوتا ہے..... اگر اپنے مجازی خدا کی عیش وعشرت اور بدکرداری ان کی قوت برداشت سے باہر ہو جائے۔ بدقسمتی سے وہ ایک پڑھی لکھی عورت تھی۔ وہی کہتی ہوگی جو کل کو مجھے بھی میری بیوی کہے گی کہ مصروفیت کا تو بہانہ ہے۔ مجھے پتا ہے تمہاری راتیں کہاں گزرتی ہیں اور کس کے ساتھ۔ میں بیوی ہوں تمہاری یا کنیز جسے تم نے گھر میں قید کر رکھا ہے اور خود باہر رنگ رلیاں مناتے پھرتے ہو۔''

''یار فضول بکواس پھر کبھی کرنا۔ میرے گھر میں مہمان بیٹھے ہیں۔ کام کی بات بتا۔''

''اس خاندانی بیوی نے خودکشی کر لی۔ کہا تو یہی گیا کہ وہ بیمار ہوگئی تھی..... لیکن اس اچانک ہونے والا جان لیوا بیماری کی تفصیلات میں بہت تضاد ہے۔ گاؤں میں مشہور تھا کہ اس پر جن آتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہ نفسیاتی مریض تھی اور اس نے خودکشی کر لی۔ کسی نے اس پر سفلی علم کرا دیا' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اصل بات وہی ہے کہ اسے قتل کر دیا صفدر سلطان نے۔ وہ بھی خاندان کی لڑکی تھی۔ باپ نے تو کچھ نہیں کہا۔ ماں کو بھی خاموش کر دیا ہوگا۔ مگر اس کا ایک بھائی امریکا میں رہتا ہے۔ وہاں پڑھنے گیا تھا دستور کے مطابق اور لوٹ کے نہیں آیا تھا۔ وہ پاکستان میں تھا' ایسے ہی آیا ہوا تھا۔ اس نے ہنگامہ کر دیا' پوسٹ مارٹم کے لیے اصرار کیا۔ آئی جی اور گورنر تک کو لکھ دیا۔ اس کے کہنے کے مطابق صفدر سلطان نازنین سے شادی کرنا چاہتا تھا۔''

میں نے کہا ''یہ نازنین کون ہے؟''

''تو نہیں جانتا..... مگر کیسے جانے گا؟ لندن میں بیٹھا ہے نا۔ یہ بڑی سنسنی خیز چیز ہے۔ نووارد ہے لیکن کچھ ہی دن میں ہر طرف تہلکہ مچا دیا ہے۔ پہلے ماڈل تھی' انڈیا کے اشتہاروں میں نمودار ہوئی کیونکہ یہاں تو زنانہ چیزوں کے اشتہار میں بھی کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ وہاں خاصی جمہوری آزادی ہے۔ ڈانسر بہت اچھی ہے۔ اس کا ایک ویڈیو کیسٹ دیکھا تھا میں نے۔ کسی پرائیویٹ فنکشن کی پرفارمنس تھی' چیز تو ویسی ہی ہے شاہی محلے جیسی مگر لیبل ماڈرن ہے۔ اپر کلاس کی محفلوں میں نظر آتی ہے۔ سنا ہے لندن سے پڑھی ہوئی ہے..... خیر' اپنے صفدر سلطان مرزا نے اس کے لیے ایک فلم فوراً اناؤنس کر دی تھی' نازنین اس کی ہیروئن تھی۔ اس کا مہورت بھی ہوا تھا تین مہینے پہلے مگر اس کے بعد شروع ہوگئی دوسری لو اسٹوری۔ اور اس کا انجام بہت زیادہ غیر متوقع نہیں سمجھا جا سکتا۔''

''بیوی کا قتل تو فیوڈل سیٹ اپ میں ہو جاتا ہے۔ کوئی

نازنین بھی بعض اوقات اتنی ذہین ثابت ہوتی ہے کہ داشتہ سے بڑھ کر زوجہ کے باعزت سمجھے جانے والے مرتبے پر فائز ہوجاتی ہے مگر ایک تو خاندانی بیوی ان معاملات سے بے نیاز اپنے گھر میں راج کرنے کی پالیسی میں خوش رہتی ہے۔ دوسرے شوہر فرار نہیں ہوتے۔''

اس نے کہا ''خرابی غالباً اس لیے ہوئی کہ نازنین نے نصف جائیداد اپنے نام کرنے کا مطالبہ کیا اور صفدر سلطان کی آنکھوں پر اس نے ایسی پٹی باندھ دی تھی کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ آدھی خاندانی جائیداد دے کر نازنین کو حاصل کرنے کا سودا اسے سستا لگا۔ اس پر جائیداد کے مالکوں کو اعتراض ہوا۔ قائد حزبِ اختلاف ہوگئی' خاندانی بیوی...... نتیجہ یہ کہ اپنی جان سے گئی مگر اس کے بھائی نے خاموش رہنے سے انکار کردیا۔ وہ اب صفدر سلطان کے خلاف قتلِ عمد کا مقدمہ درج کرانے کی پوری کوشش کررہا ہے۔ ظاہر ہے اسے مخالفت کا سامنا ہے۔ یعنی کہ سسرال سے بھی اور خود پولیس سے بھی۔ عام آدمی ہوتا تو اب تک اسے چپ کرادیا جاتا یا غائب کردیا جاتا۔ مگر وہ ہے امریکن' دنیا کی سپر پاور کا نمائندہ۔ اس نے امریکی کونسلیٹ کو بھی بتادیا ہوگا کہ وہ غیر محفوظ ہے اور اب حکومت کی مشنری خود اس کی حفاظت پر مجبور ہوگئی۔''

''مطلب یہ کہ اس کا کچھ پتا نہیں کہاں ہے؟ پاکستان میں یا ترکمانستان میں...... یا انگلستان میں......''

''آف کورس۔ وہ انگلستان میں بھی ہوسکتا ہے...... اکیلا' کیونکہ نازنین بہرحال اب اس کے ساتھ نہیں ہے۔ نہ خدا ملا نہ وصالِ صنم۔ تو ذرا محتاط ہوجا۔''

لونگ روم سے سنائی دینے والے باتوں کے شور سے اندازہ ہوتا تھا کہ سب مہمان آچکے ہیں۔ مارتھا نے کہا ''ایک تو تم بھی عورتوں کی طرح بہت لمبی بات کرتے ہو۔ کیا پتا چلا' یہ لو چوڑیاں...... یہ بھی پہناتے جاؤ۔''

میں نے اسے مختصراً بتادیا ''وہ پاکستان سے بھاگا ہوا ہے یا وہیں روپوش ہے۔ اس نے ایک عورت کے چکر میں بیوی کو قتل کردیا تھا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ لندن میں ہو۔''

جب میں لونگ روم میں گیا تو میرے دوستوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کیا۔ ''یہ کیا...... تم ابھی تک کھانا پکار ہے ہو؟''

میں نے کہا ''سوری فرینڈز! پاکستان سے ایک ارجنٹ کال آگئی تھی۔ کھانا تو بالکل تیار ہے' بس عائشہ آجائے۔''

''ہاں...... کھانا اسی سے مشروط ہے۔ وہ نہ آئی تو کیا ہمیں بھوکا واپس جانا پڑے گا۔'' مسز بریڈلے نے احتجاج کیا۔

اس کی صومالیہ کی رہنے والی سیاہ فام گرل فرینڈ نے مسکرا کے کہا ''اگر میں نہ آتی تو کیا تم کھانا کھالیتے؟''

''میں تمہارے حصے کا بھی کھاتا...... محبت میں۔'' بریڈلے بولا۔

اسی وقت عائشہ آگئی۔ میں ہی نہیں' اسے دیکھ کر سب کچھ دیر کے لیے مسحور اور مبہوت رہ گئے۔ اس خصوصی تقریب کے لیے اس نے پاکستانی لباس کا انتخاب کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ میری خاطر تھا مگر شلوار قمیص اور دوپٹے میں وہ بالکل ایک پاکستانی لڑکی نظر آرہی تھی اور اس کے حسن کا تاثر قیامت خیز تھا۔

''سوری فرینڈز!'' اس نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ پھولوں کا گلدستہ مجھے دیا ''مجھے کچھ دیر ہوگئی۔''

''میرا خیال ہے کہ اب کھانے میں مزید دیر مناسب نہیں۔ کیا خیال ہے لڑکو اور لڑکیو!'' مارتھا نے بھی اسی وقت ایک ڈرامائی انٹری دی۔

اس کے لباسِ عروسی پر بہت شور مچا۔ خواتین نے چیخیں ماریں اور حضرات نے تالیاں اور سیٹیاں۔ مارتھا شرم سے لال ہوئی تو زیادہ مضحکہ خیز نظر آنے لگی مگر وہاں موجود لوگ آداب اور شائستگی کے قائل تھے۔ سب کو اندازہ تھا کہ مارتھا کے اس بہروپ کا ذمے دار میں ہوں اور مارتھا کی یہ جذباتی حرکت میری خوشی کے لیے ہے۔ پاکستان میں ہونے والی بہت سی پوتیوں کی شادی میں ستر اسی سال عمر کے دادا دادی کو کانپتی ٹانگوں کے ساتھ ڈانس کرتے میں نے خود دیکھا تھا۔

سب نے مارتھا کے گلے لگ کر اس کے گالوں پر پیار ماتھے پر عقیدت سے بوسا دیا اور اسے یقین دلایا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ وقتی طور پر الوداعی تقریب کی اداسی ختم ہوگئی۔ وہ بہت خوش نظر آنے لگی۔ میری اسٹینو ایک انڈین چندرا تھی۔ اس نے کہہ دیا۔

''ایک تمہاری ماں لگ رہی ہے' دوسری اس کی بہو۔''

یہ تبصرہ ایک عام خواہش کی ترجمانی کرتا تھا کہ کاش ایسا ہوتا۔ اس نے عائشہ کو خفت میں مبتلا کردیا تو مجھے ندامت میں۔

عائشہ سال بھر پہلے ایشا ارنسٹ تھی۔ اس کا باپ لارڈ ارنسٹ اسی کمپنی کا منیجنگ ڈائریکٹر تھا جہاں میری ملازمت کو دو سال پورے ہوچکے تھے۔ وہ کاروباری طور پر کامیاب اور سیاسی حلقوں میں خاص اثر رسوخ رکھنے والا آدمی تھا۔ اپنی بیوی کے مقابلے میں وہ فراخ دل اور خاصا غیر متعصب شخص

تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی کمپنی میں گورے کالے اور ہر ملک کے باشندے ایک باعزت ماحول میں کام کر کے مطمئن تھے۔ وہ بیک وقت ایک اچھا منتظم' باصلاحیت ٹیم لیڈر' بے تکلف دوست اور شفیق و ہمدرد انسان تھا۔ انٹرویو کے وقت میں اس کے مثبت اور حوصلہ افزا رویے سے متاثر ہوا تھا۔ انٹرویو کے فوراً بعد اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ میں مطلوبہ معیار پر پورا اترتا ہوں اور مجھے وہی تنخواہ دی جائے گی جس کا میں نے اپنی سی وی میں مطالبہ کیا تھا۔ تاہم آنے والے تین ماہ میں مجھے اپنی کارکردگی کا عملی مظاہرہ کرنا ہوگا۔

عائشہ اپنے باپ کی کمپنی میں ایکسٹرنل ریلیشن کے شعبے کی ڈائریکٹر تھی لیکن اس میں سفارش یا باپ کے اثر رسوخ کو قطعی دخل نہ تھا۔ اس نے سوئیز رلینڈ سے پبلک ریلیشن کے ساتھ ہیومن ریسورسس میں ڈگری لی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے وہ تین مختلف اداروں میں بہترین پرفارمنس دے چکی تھی اور دو سال کے مختصر عرصے میں اپنی ذہانت سے ثابت کر چکی تھی کہ وہ کس باپ کی بیٹی ہے۔ باپ کے بڑے نام کی رعایت اسے کہیں نہیں ملی تھی۔ وہاں کام اور کاروباری خاندانی حوالے کا تصور ہی نہیں۔ جب بالآخر باپ نے اسے دگنے معاوضے پر ڈائریکٹر کی پوسٹ آفر کی تو نہ باپ نے بیٹی پر احسان کیا اور نہ بیٹی نے باپ پر۔ دونوں طرف سے یہ قطعی غیر جذباتی قسم کا کاروباری فیصلہ تھا۔

عائشہ کو خدا نے حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی نوازا تھا۔ حسب نسب پر غرور کا زمانہ اب انگلستان میں بھی نہیں رہا۔ خود شاہی خاندان میں روایات کی پامالی نے قدامت پسندوں کو خاصا مایوس کیا۔ دنیا کو گلوبل ویلج بنانے کی حامی سل نے ہر قسم کے تفرقات اور تکلفات کو طاق نسیاں پر رکھ دیا۔ اس کے باوجود عائشہ اپنے حسن' اعلیٰ تعلیم یا عہدے کے باعث احساس برتری میں مبتلا ہو سکتی تھی لیکن وہ طبعاً منکسر مزاج اور ملنسار لڑکی تھی۔ اس حد تک کہ اس کی دوستانہ مسکراہٹ اور بے تکلفی عموماً غلط فہمیاں پیدا کر دیتی تھی۔ بقول شاعر میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں۔ یہ تبسم' یہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو۔

ابتدا میں یہ غلط فہمی مجھے بھی ہوئی مگر کچھ عرصے میں جب میں نے عائشہ کی فطرت کو سمجھ لیا تو میرے اور اس کے درمیان ایک بہت اچھی ورکنگ ریلیشن شپ بن گئی۔ کمپنی کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہی تھی۔ وہاں ایک جیسی ذہنی سطح رکھنے والے لوگ تھے جو اشتراک جانتے تھے۔ ان کے درمیان مقابلہ نہ تھا۔ وہ اپنے کام کے ماہر تھے۔ تنخواہوں سے اور مالکوں کے رویے سے مطمئن تھے۔ چنانچہ کمپنی ایسے آگے بڑھ رہی تھی جیسے ایک اچھی کار آگے بڑھتی ہے تو اس کی کارکردگی میں تمام پرزے برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

عائشہ اپنے مزاج اور فطرت میں اپنے باپ کی ساری صفات رکھتی تھی۔ حسن صورت میں اس نے ماں کی میراث حاصل کی تھی اور نتیجے میں پرفیکشن حاصل کر لی تھی۔ طبعاً اس کی ماں جہالت کی حد تک سیل پرست اور مغرور تھی۔ وہ خود خطاب یافتہ باپ کی بیٹی تھی اور اسے دعویٰ تھا کہ شاہی خاندان کے وارثوں کی لمبی فہرست میں اس کا نام بھی شامل ہے۔ دروغ بر گردن راوی۔ یہ فہرست سو افراد پر مشتمل تھی۔ عائشہ مذاق میں کہتی تھی کہ اگر پہلے نانو بے وارث نہ رہیں تو میرا نانا ایڈورڈ نہم کے نام سے بادشاہ انگلستان ہو سکتا ہے۔

عائشہ سے میری دوستی کب شروع ہوئی اور کب در پردہ مراحل طے کرتی محبت بن گئی اس کا مجھے پتا ہی نہ چلا اور جب حقیقت مجھ پر عیاں ہوئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ شاید ایک میں ہی تھا جو بے خبر رہا۔ باقی سب لوگ دیکھ رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے اور پیش گوئیاں کر کے شرطیں لگا رہے تھے۔ ایک وقت ایسا آیا جب میں نے محسوس کیا کہ میں محصور ہو گیا ہوں اور میرے لیے نہ بچ کر نکلنا ممکن ہے اور نہ پیچھے ہٹنا۔

میں اس کی محبت سے انکار نہیں کر سکتا تھا لیکن میرے جذبات کی کمان ہنوز عقل کے ہاتھوں میں تھی۔ میں نے جب خود سے سوال کیا کہ یہ محبت ہے یا جنسی کشش تو جواب ہمیشہ ایک ہی ملا کہ یہ محبت ہے۔ یہ ہوس کی آگ ہوتی تو بہت پہلے شعلہ بن کر ہمارے جذبات کو خاکستر کر چکی ہوتی اور اب تک سرد پڑ جاتی۔ لندن جیسے شہر میں ہمارے تعلق کی راہ میں کسی اخلاقی' سماجی یا مذہبی حد کی دیوار حائل نہ تھی۔ قانون تو ہمارے تعلق کو تحفظ فراہم کرتا تھا کہ ایک بالغ مرد اور عورت آپس کی رضامندی سے جیسے تعلقات چاہیں استوار کریں' وہ شادی کیے بغیر ساتھ رہیں' بچے پیدا کریں' مشترکہ خاندان بنا لیں۔ کسی ہم جنس سے شادی کر لیں۔ یہ اسی طرح ان کا ذاتی معاملہ ہے جیسے اپنی مرضی کے کپڑے پہننا یا اپنی پسند کے گانے سننا۔ سوسائٹی کو بھی ذاتی فیصلوں سے کیا۔ شخصی آزادی کا تقدس سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

شاید میری یہی ادا عائشہ کو بھا گئی کہ میں رشتوں کے تقدس میں مشرق کی روایات پر کاربند تھا۔ جب ہم آفس کے باہر ملنے لگے تو خلوت میں ایسے ان گنت مواقع آئے جب وہ میرے بہت قریب آ گئی۔ کئی بار لنچ یا ڈنر کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ میں نے اسے اپنے گھر مدعو کیا۔ ہم نے

ایک ساتھ سفر کیا۔ کبھی دوسرے شہر اور کبھی دوسرے ملک کے کسی ہوٹل میں قیام کیا لیکن ہمارے کمرے ہمیشہ الگ رہے اور کبھی جذبات عشق کی وارفتگی نے عائشہ کو خود سپردگی کے مرحلے تک پہنچا دیا تو میں نے اعتماد کی دیوار کو گرنے نہ دیا۔ عائشہ حیران بھی ہوئی اور مایوس بھی لیکن جب میں نے اسے اپنی ذہنی تربیت کے مطابق یہ سمجھا دیا کہ میرے نزدیک محبت کی آبرو کیا ہے اور بے آبروئی کیا تو وہ میرے کردار کی عظمت سے مسحور ہوگئی۔ محبت میں جسمانی تعلق سے گریز اس ماحول میں ابنارمل ہونے کی دلیل تھی۔ میں نے اگر عائشہ کی قربت سے فائدہ نہیں اٹھایا تو یہ شرقی روایات کی ایک احمقانہ ''شرافت'' تھی جس کا مغرب میں کوئی تصور نہ تھا۔ اسے نامرد ہونے کے مترادف قرار دیا جاتا تھا۔

عائشہ کو میری یہ غیر مردانہ صفت ہی میرے فرشتہ سیرت ہونے کا وہ ثبوت لگی جس نے اس کے لیے میرے حصول کو مقصد حیات بنا دیا حالانکہ میں ایک عام خطاکار انسان تھا جس کا دامن گناہوں کے داغوں سے پاک نہ تھا۔ جب میں امریکا پہنچا تھا تو میری حالت اس فاقہ زدہ قیدی جیسی تھی جس پر آزادی کے ساتھ دنیا کی ہر نعمت کے دروازے کھول دیے گئے ہوں اور وہ سب کچھ بھول کر ان پر ٹوٹ پڑے۔

میں نے عائشہ کو بہت سمجھایا کہ ہم زندگی ساتھ نہیں گزار سکتے۔

''کیوں ساتھ نہیں گزار سکتے؟ تم کیا سمجھتے ہو' میں جذبات کی رو میں بہہ جانے والی کم عمر اور کم عقل لڑکی ہوں؟''

''یس..... میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ تمہاری ذہانت اور قابلیت کا معترف ہونے کے باوجود۔''

''تم ایک دقیانوسی ذہن سے سوچ رہے ہو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہونے کے باوجود؟''

''ایشا۔ زمینی حقائق کبھی نہیں بدلتے۔''

''کون سے زمینی حقائق۔ زمین سب ایک ہوگئی ہے۔ اور ہمارے حقائق بھی ایک ہیں جو زندگی کی ضرورت ہوتے ہیں۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟ میری ذات میں کوئی خامی ہے؟ تمہیں اعتماد نہیں ہے مجھ پر یا خود پر' یہ ڈر ہے کہ کل کو میں نہ بدل جاؤں؟''

''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔''

''پھر کیا بات ہے؟ تم فریال سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا ''ہاں' مگر میرے چاہنے سے کچھ ہو نہیں سکتا۔ وہ مجھے نہیں ملے گی..... میں جانتا ہوں۔''

''پھر بھی امید سے دامن باندھے رکھنا چاہتے ہو۔ یہ کتنی غیر عملی بات ہے'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''ایشا ڈارلنگ! عقل کے فیصلے کو سامنے رکھوں تو تم اس سے لاکھ درجے بہتر ہو۔ وہ نہ ملی ہوتی تو تمہیں پا کے میں یقیناً خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی سمجھتا۔ مگر وہ میری زندگی میں شامل ہے اور میں اس سے کیے ہوئے عہد وفا کو خود کیسے توڑ سکتا ہوں..... امید کو ابھی سے کیسے ختم کر سکتا ہوں۔''

''یعنی مجھے انتظار کرنا ہوگا' امید کے ساتھ۔ قطار میں میرا نمبر اس کے بعد ہے۔''

میں نے کہا ''ایسا کیوں سمجھتی ہو' میری نظر میں اور بھی مسائل ہیں۔ مشرق اور مغرب کی دوری ہے۔''

''وہ صرف سات آٹھ گھنٹے کی دوری ہوگئی ہے۔''

میں نے کہا ''کیا میں رڈیارڈ کپلنگ کا قول دہراؤں..... کہ شرقی مشرق ہے اور مغرب مغرب یہ دونوں کبھی ملے ہیں اور نہ ملیں گے۔''

''وہ پچھلی صدی میں کہا تھا اس نے۔ اب تم لندن میں رہتے ہو اور میں بھی لاہور میں رہ سکتی ہوں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''ناممکن۔ ہمارے درمیان ماحول کا فرق ہے۔ طبقاتی خلیج ہے' ہمارے خاندانوں کی سوچ الگ ہے۔''

''لیکن یہ زندگی ہماری ہے۔ صرف میری اور تمہاری۔ یہ سارے فرق اس پر اثر انداز نہیں ہوتے۔''

''ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا ''ہم سب سے کٹ کر اکیلے نہیں رہ سکتے اور نہ اپنے بچوں کے ساتھ مریخ پر نئی دنیا آباد کر سکتے ہیں۔''

''یعنی فریال تمہیں نہ ملے' اس کے بعد بھی تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے' تمہیں صرف فرق نظر آ رہے ہیں' میری محبت محسوس نہیں ہوتی؟''

''ایلیشا' زندگی فلم نہیں ہے جو دو گھنٹے میں ختم ہو جاتی ہے۔ ایک طویل مدت ہے' مجھے بتاؤ یہ شادی ہو جائے تو ہمارے بچے کیا سمجھیں گے خود کو؟ گورا یا کالا؟ پاکستانی یا برطانوی' کرسچن یا مسلمان۔ کتنے کمپلیکس ہوں گے انہیں۔''

''مذہب میرے لیے ذاتی معاملہ ہے۔ میں مسلمان ہو جاؤں گی اور یہ مت سمجھنا میں بحث ہار گئی تو میں نے ہار مان لی۔''

اگلے دن وہ مسلمان ہوگئی۔ اس نے اسلامک سینٹر میں

کسی سے رابطہ کیا اور سارے قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد مجھے مطلع کیا کہ میرا اسلامی نام عائشہ رکھا گیا ہے۔ میں بھونچکا رہ گیا۔

میں نے فریال کو بتایا تو وہ خفا ہونے لگی ''اس کے دین اور دنیا کی خرابی کے ذمے دار تم ہو۔''

''کیوں..... میں نے تو صاف انکار کردیا تھا۔''

''بات کو اتنا بڑھانے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر تمہاری مردانہ انا کو بہت تسکین مل رہی ہوگی نا کہ یک نہ شد دو شد۔ پہلے ایک پاگل تھی' اب دو ہیں..... اور لڑکی بھی ایسی.....''

میں نے کہا ''فریال! میں ہاتھ ماردوں گا۔ مجھے بتاؤ' میں کیا کروں؟''

''وہی جو میں کہتی رہتی ہوں۔ ابھی اس سے شادی کرلو۔ پھر مجھ سے کرلینا۔ دو کی گنجائش رکھنا' زندگی بڑی لمبی ہے..... اور تم ماشاءاللہ ایسے ہینڈسم ہیرو اور شہزاد گلفام ہو کہ ایشوریا رائے بھی آئے گی کچے دھاگے سے بندھی' انجیلینا جولی بھی.....''

اگلے دن ایشا یعنی عائشہ کی ماں کا فون آ گیا ''میں تم سے فوراً ملنا چاہتی ہوں' گاڑی بھیج رہی ہوں۔''

میں نے کہا ''لیڈی ارنسٹ! گاڑی ہے میرے پاس..... اور نہ ہوتی تو لندن میں ٹیکسی مل جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس وقت ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔ آپ نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ مجھے کسی بھی وقت طلب کیا جاسکتا ہے؟''

''اوکے! کب آسکتے ہو تم؟'' اس کی نخوت کچھ کم ہوئی۔

میں نے کہا ''اگر مقصد ملاقات..... عائشہ.....''

''اس کا نام ایشا ہے۔''

''آپ ماضی میں رہنا پسند کرتی ہیں تو آپ کی مرضی۔ میں عائشہ ہی کہوں گا اسے جو کہ وہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتی ہیں یا کوئی وضاحت مقصود ہے؟ تو میں معذرت چاہتا ہوں' آپ اپنی بیٹی سے پوچھیں جو پوچھنا ہے۔''

''اس کو خراب کرنے کے ذمے دار تم ہو؟'' وہ برہمی سے بولی۔

میں نے کہا ''اپنی اولاد کے بارے میں آپ کی رائے خراب ہے تو یہ سوال خود سے کریں کہ تربیت اور پرورش میں آپ سے کیا کوتاہی ہوئی۔ ویسے اسے سب اچھا سمجھتے ہیں..... مجھ سمیت۔''

''تم کیا سمجھتے ہو خود کو آخر..... بدمعاش! میں تمہارا دماغ درست کرادوں گی۔'' وہ چلانے لگی۔

''ناحق اپنا وقت اور انرجی ضائع کریں گے آپ۔ میرا دماغ ٹھیک نہیں ہوسکتا خاتون!'' میں نے ہنس کے کہا اور فون بند کردیا۔

لیکن اس سے عائشہ کی ماں کا غصہ کم نہیں ہوا۔ وہ ایک دن میرے آفس پہنچ گئی۔ میں اس کی زبان نہیں پکڑ سکتا تھا۔ کان میں روئی ٹھونس کے بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں واک آؤٹ کرگیا۔ اس نے سخت بے عزتی محسوس کی کیونکہ میں ''ابھی آتا ہوں ایک منٹ میں'' کہہ کے گیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد اسے بتایا گیا کہ رفیق صاحب تو چلے گئے ہیں۔

چند دن بعد وہ مارتھا کے گیسٹ ہوم میں آدھمکی۔ میں طے کرچکا تھا کہ اس کی کسی بات پر مشتعل ہو کے جواب نہیں دوں گا مگر مارتھا نے میرے منع کرنے کے باوجود اس پر چڑھائی کردی اور اس کی لیڈی شپ کی کھال کھینچ کر اس کے ہاتھ میں تھمادی۔ جب وہ شور مچا کے اور دھمکیاں دے کر چلی گئی تو مارتھا نے لارڈ ارنسٹ کو فون کیا اور اسے قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی ''تمہاری بیوی کا سارا غرور اور بدمعاشی نکال دوں گی میں۔ اس سے کہنا پھر میرے منہ نہ لگے۔''

لارڈ ارنسٹ نے مارتھا سے معافی مانگی۔ اس نے مجھ سے بھی بات کی مگر میں نے اسے مطمئن کردیا۔ وہ سمجھ دار آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ عائشہ بالغ اور خودمختار ہے۔ اس معاملے کے اچھالنے سے اس کی اپنی عزت جانے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لیکن عائشہ کی ماں کا غصہ کم نہ ہوا۔ ایک دن مجھے تین بدمعاشوں نے گھیرلیا۔ انہوں نے عائشہ کا حوالہ دیے بغیر مجھے دھمکی دی کہ اگر میں واپس پاکستان نہ گیا تو میرا سر میرے کندھوں پر نہیں رہے گا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ایک سال پہلے میں لندن پہنچا تھا تو رنگ دار ایشیائی تارکین وطن کے خلاف نسل پرست دہشت گرد گنجوں یعنی SKIN HEADS بہت ایکٹو تھے۔ ان کی غنڈا گردی کا خصوصی نشانہ پاکستانی تھے جن کو وہ بڑی نفرت اور حقارت سے پاکی کہتے تھے۔ وہ پاکستانیوں کے اسٹورز میں گھس کے توڑ پھوڑ کرتے تھے۔ انہیں اکیلا پاکے سڑک پر گھیر لیتے تھے اور بڑی بے رحمی سے مارتے تھے۔ وہ مہلک ہتھیار استعمال نہیں کرتے تھے۔ ڈنڈوں' ہاکیوں' فولادی زنجیروں اور تاروں سے حملہ کرتے تھے اور اتنی بے رحمی سے مارتے تھے کہ زخمی کا چہرہ بگڑ جاتا تھا اور وہ مہینوں بستر پر پڑا رہتا تھا۔ ان کی پرتشدد کارروائی کے نتیجے میں کچھ اموات بھی واقع ہوئی تھیں۔ بعد میں انہوں نے

عورتوں کو بھی نشانہ بنالیا تو پاکستانی کمیونٹی میں سراسیمگی پھیل گئی۔ پولیس الرٹ ہوگئی۔ بہت سے گنجے گرفتار بھی ہوئے مگر پاکستانیوں میں ایک ردِعمل کے طور پر خود حفاظتی کی تدابیر اختیار کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ لاہور کے ڈاکٹر بشیر نے ایک دن مجھے مطلع کیا کہ قریب ہی ایک مارشل آرٹ اکیڈیمی ہے جہاں جاپان کا ایک جینوئن بلیک بیلٹ جوڈو کراٹے کی تربیت دیتا ہے اور ویسے تو جاپان سے بلیک بیلٹ کے لیے کوالی فائی کرنے میں کئی برس لگ جاتے ہیں مگر اس کا خود حفاظتی کا شارٹ کورس چھ مہینے کا ہے اور یہ کریش پروگرام مکمل کرنے کے بعد بندہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ان بدمعاش گنجوں کو لنگڑا لولا بھی کر سکے۔ ہم نے ایک ساتھ اکیڈیمی جوائن کی مگر صرف دو ہفتے بعد ڈاکٹر بشیر کو احساس ہوا کہ اس کی رنگین شاموں کا خود فراموشی پروگرام چوپٹ ہو رہا ہے تو خود حفاظتی پروگرام غیر اہم ہوگیا۔ میں نے ٹریننگ جاری رکھی اور چھ مہینے میں اپنی لگن سے اتنا سیکھ لیا جو بقول استادِ محترم لوگ ایک سال میں نہیں سیکھ پاتے۔

جب ان تین گنجوں نے مجھے دھمکی دی تو میں نے کہا ''اپنے ہیلمٹ اتار دو۔ پھر دیکھتے ہیں کس کا سر کہاں رہتا ہے؟''

ایک نے غرا کے کہا ''کون سے ہیلمٹ؟''

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ''اوہ..... معاف کرنا' یہ تو تمہارا اور جنرل سر ہے' کسی بدشکل آلو جیسا ہے۔''

پھر اس سے پہلے کہ وہ مشتعل ہو کے اپنی جارحانہ کارروائی کا آغاز کرتے' میں نے غوطہ مار کے سرغنہ کے پیٹ میں ٹکر ماری اور اسے سر کے اوپر سے پیچھے اچھال دیا۔ دوسرے کو ایک ایڑھی پر گھوم کے لات رسید کی جو اس کے سینے پر لگی تو اس کا سانس رک گیا اور وہ لڑکھڑا کے گرا تو تیسرے کی زد میں آ گیا جو مرکھنے بیل کی طرح میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ منہ کے بل گیا تو میں نے اس کی پسلیوں میں پے در پے ٹھوکریں ماریں۔ اتنی دیر میں پہلا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ مجھ پر حملہ کرنے لپکا تو میں نے پیر پیچھے اٹھا کے اس کی ٹانگوں کے درمیان کک ماری اور پھر خود بھاگ کھڑا ہوا۔ میں پولیس کی کسی کارروائی سے دور رہنا چاہتا تھا۔ انہوں نے میرا تعاقب نہیں کیا کیونکہ انہیں اپنے حریف کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہوگیا تھا۔

مجھے شک تھا کہ ان حملہ آوروں کو عائشہ کی ماں نے میری گوشمالی پر مامور کیا تھا۔ تصدیق کے لیے میں نے ایک قریبی پبلک کال آفس سے اسے فون کیا اور آواز بدل کے کہا ''لیڈی' آپ کا کام تو ہوگیا..... مگر ایک گڑبڑ ہوگئی۔''

اس نے کہا ''وہی..... اس پاکستانی کو واپس بھیجنے کا۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا ''گڑبڑ کیا ہوگئی؟''

''وہ مر گیا۔ ہم نے زیادتی نہیں کی' وہ کمزور تھا۔''

''او مائی گاڈ!'' اس نے سخت پریشانی میں کہا ''ایک منٹ رکو۔''

میں نے اپنا لہجہ اور آواز بدل کے بات کی تھی' پھر بھی اسے کچھ شک ہوگیا تھا۔ چند منٹ بعد کسی نے غرا کے کہا ''کون ہو تم؟ یہاں فون کیوں کیا ہے؟''

میں نے ہکلا کے کہا ''وہ..... دراصل..... وہ خود بھاگ گیا۔''

''جونی بھاگ گیا۔ بھاگ کے کہاں جائے گا وہ۔ میں نے اسے منع کیا تھا کہ فون پر بات نہ کرے۔ تم جونی کو کیسے جانتے ہو' یہ نمبر تم نے کہاں سے حاصل کیا؟''

میں نے فون رکھ دیا۔ میرے خدشات کی تصدیق ہوگئی تھی۔ لیڈی ارنسٹ نے غالباً اپنے کسی ملازم یا گارڈ سے کہا ہوگا کہ اس پاکستانی کا لندن میں رہنا مشکل کر دو۔ اس نے جونی نام کے کسی بدمعاش کو اس کارِ خیر کا ٹھیکا دیا ہوگا مگر یہ کام آنے والے براہِ راست لیڈی ارنسٹ سے فون پر بات کیسے کر سکتے تھے۔ گھبراہٹ میں اس کے منہ سے جو بات نکل گئی' اس سے بھانڈا پھوٹ گیا۔ پھر اس کے معتمد نے جونی کا نام لے کر میرے شبہات کی تصدیق کر دی۔ اگر میں چاہتا تو پولیس کے پاس جا سکتا تھا مگر میں نے انتظار کیا۔ ایک دن میں اچانک لیڈی ارنسٹ کے سامنے چلا گیا۔ وہ بدحواس ہوگئی۔

میں نے کہا ''مائی ڈیئر لیڈی! میں ابھی پاکستان واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔''

اس نے بوکھلا کے کہا ''یہ..... یہ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟''

میں نے کہا ''اس کے علاوہ..... اب میں اپنے ساتھ بھرا ہوا ریوالور بھی رکھتا ہوں۔ جونی کو کتے کی طرح شوٹ کر دوں گا۔''

''تم نشے میں بے سروپا بول رہے ہو'' اس نے کہا اور میرے سامنے سے ہٹ گئی مگر مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ڈر گئی ہے۔

آج فون پر مجھے پھر وہی دھمکی دی گئی تھی جو ایک سال پہلے تین گنجے حملہ آوروں نے دی تھی۔ پارٹی کے دوران مجھے بار بار انہی کا خیال آتا رہا۔ خود مارتھا اپنی پریشانی کو ظاہری

خوش اخلاقی کے پردے میں چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔ صرف میں اس فرق کو محسوس کررہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ عائشہ کو شک نہ ہو۔ ابھی تک میں نے اسے نہ خود پر ہونے والے حملے کے بارے میں بتایا تھا اور نہ اس کی ماں کے مشکوک رویے کے حوالے سے کوئی بات کی تھی۔

الوداعی دعوت میں شریک ہونے والے سب مہمان میرے لیے تحائف لے کر آئے تھے۔ سوائے عائشہ کے، وہ صرف پھول لائی تھی۔ سب مہمان آدھی رات کے بعد باری باری رخصت ہونے لگے۔ انہیں معلوم تھا کہ میرا فیصلہ کتنا اٹل ہے اس کے باوجود انہوں نے کہا کہ مجھے لوٹ کر لندن آنے کے بارے میں ضرور سوچنا چاہیے اور اپنے والدین کو بھی قائل کرنا چاہیے کہ ایسا کرنا ہی بہتر ہوگا۔

آخر میں صرف عائشہ رہ گئی۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ میری فلائٹ میں چار گھنٹے باقی تھے۔ میں نے اپنے سامان کو کم سے کم رکھا تھا۔ میرے کمرے میں ذاتی استعمال کی جتنی چیزیں تھیں، وہ میں مارتھا کے لیے چھوڑ کے جارہا تھا۔ ان میں میرا ٹی وی اور کمپیوٹر بھی شامل تھے۔ یہ میرے کمرے میں آنے والے کے لیے ایک نادیدہ پاکستانی دوست کا تحفہ ہوتا۔

مارتھا اتنی تھک گئی تھی کہ اس میں لباس تبدیل کرنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ وہ بید کی آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ اچانک اس نے عائشہ کو مخاطب کیا ''کیا بات ہے عائشہ! تم صرف پھول لائیں؟''

میں نے جلدی سے کہا ''حقیقی جذبات کی ترجمانی پھولوں سے بہتر کون کرسکتا ہے؟''

عائشہ مسکرائی ''میں نے ایک خاص تحفے کا انتظام کیا تھا مگر معلوم نہیں کیوں وہ تم کو نہیں ملا۔ خیر کل مل جائے گا۔''

مارتھا نے دلچسپی سے پوچھا ''ایسی کیا چیز تھی؟''

''ایک وکٹورین اسٹائل ڈائننگ سیٹ تھا۔ برتنوں کا نہیں، ایک گلاس ٹاپ ٹیبل اور آٹھ کرسیاں۔''

مارتھا کا منہ حیرانی اور خوشی سے کھلا رہ گیا ''اتنا مہنگا تحفہ..... میرے لیے؟''

''وہ تمہیں ہمیشہ رفیق کی یاد دلائے گا اور اس تعلق کی جو تمہارے درمیان رہا'' عائشہ نے کہا۔

مارتھا اتنی جذباتی ہوئی کہ عائشہ کے گلے لگ کر رونے لگی۔ ''یہ بہت پتھر دل لڑکا ہے۔''

میں نے اسے ٹوکا ''مارتھا۔ ہم نے کس بات پر اتفاق کیا تھا؟ کوئی الوداعی ڈائیلاگ نہیں بولے گا۔ ڈرامائی سین نہیں ہوگا۔ رونا دھونا نہیں ہوگا..... رائٹ!''

''میں کیا کروں..... میں خود پر قابو نہیں رکھ سکتی۔''

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے پھر صوفے پر بٹھادیا ''میں آتا جاتا رہوں گا مارتھا۔ ہوسکتا ہے وہاں جاکے مجھے اپنا فیصلہ بدلنا پڑے۔ ابھی کچھ دن میرا کمرا خالی رکھنا۔ اب میں عائشہ کو چھوڑ آؤں۔''

اس نے آنسو پونچھ کے سر ہلایا ''عائشہ آج خود ہی گاڑی چلا کے لائی تھی ورنہ رات کو کہیں دیر تک رکنا ہو تو شوفر اس کے ساتھ آتا تھا جو اس کا پرسنل باڈی گارڈ بھی تھا۔''

باہر آکے عائشہ نے کہا ''جو تحفہ میں تمہارے لیے لائی تھی وہ سب کے سامنے دینا نہیں چاہتی تھی۔''

میں نے کہا ''کسی تحفے میں چھپانے والی کیا بات ہوسکتی ہے؟''

اس نے اپنے بیگ میں سے سرخ مخمل کی ایک چھوٹی سی ڈبیا برآمد کی ''بس..... میں خود کو مزید تماشا بنانا نہیں چاہتی تھی۔''

میں نے کہا ''یہ کیا ہے؟''

اس نے ڈبیا سے ایک ہیرے کی انگوٹھی نکالی ''یہ منگنی کی انگوٹھی ہے۔ اسے پہن لو، اپنا ہاتھ لاؤ..... میں پہنادوں۔''

میں بھونچکا رہ گیا ''عائشہ!'' میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

''یہ کوئی شادی کا بندھن تو نہیں۔ نہ کوئی قانونی حیثیت رکھنے والا حلف نامہ ہے۔ صرف ایک انگوٹھی ہے جسے تم جب چاہو اتار کے پھینک سکتے ہو۔''

میں نے کہا ''یہ کیسا پاگل پن ہے؟''

''میں نے سوچا تھا..... کہ تم مان جاؤ گے تو سب کے سامنے کسی تقریب میں پہناؤں گی'' اس نے ایک قطرۂ اشک کو انگلی سے جھٹک دیا۔

''مگر یہ تو لڑکا کہلاتا ہے۔''

وہ اداسی سے مسکرائی ''کیا فرق پڑتا ہے اگر لڑکی پرپوز کرے اور لڑکا ہاں کہہ دے۔ کیا تم نے مجھے حضرت خدیجہؓ کی مثال نہیں بتائی تھی۔''

''لیکن..... کیا فائدہ اس کا..... جب شادی کا نہ ارادہ ہے نہ کوئی امکان۔'' میں نے بہتر سمجھا کہ اس کے دل میں باقی رہ جانے والی امید کی آخری کرن کو بھی بجھادوں۔

یہ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ فریال کے بارے میں بے یقینی کی کیفیت بالآخر باقی نہیں رہی تھی۔ میں فیصلہ کرچکا تھا کہ چار مہینے کے اندر اندر وہ زنجیر توڑ دوں گا جو برسوں سے اس کے

پیروں میں پڑی ہوئی تھی۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ''ہر بات میں فائدہ نہیں دیکھنا چاہیے رفیق! بس میرا دل رکھنے کے لیے اسے پہن لو۔ نہ جانے کیوں میرا یہ اعتماد اور یقین مرتا نہیں کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور واپس آؤ گے' تمہیں آنا پڑے گا..... صرف میرے لیے۔''

میں نے بڑے افسوس سے سر ہلایا ''عائشہ! یہ ظلم مت کرو اپنے ساتھ۔ خدا نے کتنی خوبصورت زندگی دی ہے تمہیں۔ صورت کی اور سیرت کی۔ شرافت اور نجابت کی۔ یہ خوشحالی اور کامیاب زندگی جو قدرت کا تحفہ ہے' اسے ایسے مت ٹھکراؤ۔ ایک آدمی ہوں میں' ایک اجنبی مسافر۔ مجھ سے لاکھ درجہ بہتر تمہاری ایک نظر کرم کے لیے چشم براہ ہیں۔''

''چھوڑو۔ یہ باتیں تو ہم کئی بار کر چکے ہیں۔'' اس نے کہا اور انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی۔ ''دیکھتے ہیں کس کا یقین درست ثابت ہوتا ہے۔''

میں نے کہا ''بے وقوف لڑکی! میں نہیں آ سکتا۔ یہاں سے جانے کے چار مہینے بعد میں فریال سے شادی کر رہا ہوں۔''

''میں تمہاری شادی میں ضرور آؤں گی۔ تم بلاؤ یا نہ بلاؤ..... لیکن ابھی یہ انگوٹھی تمہیں یاد دلاتی رہے گی کہ تم میرے ہو۔ میں کوئی زبردستی نہیں کر سکتی تھی تمہارے ساتھ لیکن تقدیر بعض اوقات زبردستی کرتی ہے۔ دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر تم آؤ گے تو مجھے یہ انگوٹھی دیکھ کر خوشی ہوگی کہ ایک مرحلہ تو میں نے طے کر لیا تھا۔ شادی سے پہلے ہی۔ دوسرا تم کو کرنا پڑا۔ انگوٹھی کی طلسماتی قوت تم کو واپس کھینچ لائی۔''

میں نے ایک گہری سانس لی ''او کے۔ لیکن فرض کرو' ایک لمحے کے لیے مان لو..... کہ میں نہ آ سکا..... پھر.....؟''

''پھر یہ فریال کو پہنا دینا۔ اگر وہ برا نہ مانے..... اور چاہو تو میرے جانے کے بعد اتار دینا۔ پھینک دینا کہیں۔'' وہ ایک دم پلٹی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں بے بسی سے دیکھتا رہا پھر میں آگے بڑھا۔

میں نے کہا ''عائشہ! ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

اس نے اپنے آنسو پونچھے ''سوری! میں نے وعدہ کیا تھا تم سے نہ رونے کا۔''

میں نے کہا ''ایئرپورٹ پر مجھے اپنی وہ مسکراہٹ دینا جو میرے ساتھ رہے۔''

''کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟''

میں نے کہا ''کاش یہ ممکن ہوتا۔''

''ممکن تو ہے۔ میری سیٹ محفوظ ہے۔ میرے پاسپورٹ پر ویزا لگ چکا ہے۔''

میں بھونچکا رہ گیا ''کیا.....؟''

''ہاں۔ اگر آخری لمحے میں تمہارا فیصلہ میرے حق میں ہو جاتا۔ تو میں تمہارے ساتھ بیٹھ جاتی۔ میں نے کوئی چانس نہیں لیا تھا۔''

''تم واقعی پاگل ہو۔''

''ایئرپورٹ میں صرف تمہارے ساتھ جانے کے لیے آ سکتی ہوں۔ تمہیں سی آف کرنے کے لیے نہیں۔ میں معجزات پر بڑا یقین رکھتی ہوں حالانکہ یہ معجزوں کی صدی نہیں ہے۔ اگر تم چاہو تو مجھے پک کر لینا جاتے ہوئے' میں تمہیں تیار ملوں گی'' اس نے کار کو ایک دم آگے بڑھا دیا۔

جب اس کی گاڑی کی ٹیل لائٹس بھی غائب ہو گئیں تو میں پلٹا۔ وہاں مارتھا دروازے میں کھڑی پھس پھس رو رہی تھی۔

میں نے کہا ''او گاڈ! اب تمہیں کیا ہوا ہے؟''

''کتنی پیاری لڑکی ہے۔ افسوس کہ یہ زندہ نہیں رہے گی۔''

میں اسے اندر لے گیا ''کیوں زندہ نہیں رہے گی؟ کوئی غیب کا فرشتہ بتا گیا ہے تمہارے کان میں؟''

''مجھے پتا ہے' وہ خودکشی کر لے گی۔''

میں نے دل پر جبر کر کے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا ''مارتھا۔ یہ سب ایک رومانٹک ڈرامے کے کلائمکس میں ہوتا ہے۔ میرے جانے کے صرف دو دن بعد تم اسے دیکھنا۔ وہ نارمل ہوگی۔ صرف ایک مہینے بعد وہ مجھے بھول چکی ہوگی۔ چھ مہینے بعد وہ ایک نئے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈانس کر رہی ہوگی اور یہی ڈائیلاگ پھر بول رہی ہوگی۔''

مارتھا نے مجھے سخت ملامت بھری نظروں سے گھورا مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھے شرمندہ کرنے والے الفاظ کے تیروں کا نشانہ بناتی' کال بیل بجی۔

میں نے گھڑی دیکھی ''اس وقت کون آ گیا؟''

''شاید کسی کو اب فرصت ملی ہو تم سے آخری ملاقات کی۔''

میں نے کہا ''آخری ملاقات ہوتی ہے ان کی جن کو صبح پھانسی دی جا رہی ہو'' اور دروازے کی طرف بڑھا۔

مارتھا نے جوتا اٹھا کے میری طرف پھینکا مگر میں بچ گیا۔ دروازہ کھولتے ہی میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔

''تم.....؟'' میں نے کہا۔

''ہاں.....میں'' وہ پورے اعتماد کے ساتھ مسکراتا ہوا اندر آ گیا ''مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں تم پہچاننے ہی سے انکار نہ کر دو۔''

میں نے برہمی سے کہا ''کیوں آئے ہو تم یہاں؟''

وہ مجھے ایک طرف ہٹا کے آگے بڑھا اور لاؤنج میں اسی کرسی پر بیٹھ گیا جس پر مارتھا بیٹھتی تھی ''مجھے تم سے بات کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔''

میں نے کہا ''مگر مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔''

اس نے بے نیازی سے اپنی سگریٹ جلائی ''ٹائم بہت ہے دوست!''

''میں تمہارا دوست بھی نہیں ہوں'' میں نے غصے سے کہا۔

مارتھا چلائی ''بدتمیز آدمی! سگریٹ بجھا دو۔ میں کسی کو اپنے گھر میں سگریٹ نہیں پینے دیتی۔''

''سوری میڈم!'' اس نے شائستگی سے کہا اور سگریٹ کو نیچے رکھ کے جوتے سے مسل دیا۔

''اور مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ مجھے چیف نے بھیجا ہے۔ ہمیں ذرا دیر سے پتا چلا کہ تم لندن میں ہو۔''

''تین گھنٹے بعد میری واپسی کی فلائٹ ہے۔''

''ہاں.....یہ بھی معلوم ہوا تھا.....لیکن فی الحال تم واپس نہیں جا رہے ہو۔'' اس نے قطعیت سے کہا۔

''کیا مطلب ہے آخر اس فضول بات کا؟''

''میں نے فارسی تو نہیں بولی۔'' اس نے اپنی کرخت اور بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ چھ فٹ لمبا اور کریہہ صورت شخص تھا۔ چھ سال میں اس کا وزن بڑھ گیا تھا چنانچہ وہ دیوزاد نظر آتا تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ پہلے اس کی مصنوعی آنکھ کے نیچے زخم کا ایک نشان تھا' اب دوسرا زیادہ گہرا نشان اس کے ماتھے پر کراس کی صورت میں نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا ''میرا تم سے اور تمہارے معاملات سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ پھر چیف نے تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا ہے؟''

''تم تو اچھی طرح جانتے ہو۔ تعلق محض کہنے سے ختم نہیں ہو سکتا۔ ہم سب کے پاس ون وے ٹکٹ ہوتا ہے۔ ریٹرن ٹکٹ صرف ایک جگہ کے لیے ملتا ہے۔''

میرا حوصلہ جواب دینے لگا ''کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''ایک سچائی بتا رہا ہوں۔''

''تم مجھے جانے سے نہیں روک سکتے۔ میرے والدین میرا انتظار کر رہے ہیں۔''

''تمہیں اپنے والدین کے بارے میں ضرور سوچنا چاہیے۔ آخر تم اکلوتے بیٹے ہو ان کے۔ اس عمر میں اگر ان کو پریشانی کا سامنا ہو تو کیا تمہیں افسوس نہیں ہوگا کہ تمہاری بے وفائی کا سامنا ہوا۔''

اس کی دھمکی اب بہت واضح تھی۔ اگر میں اپنے انکار پر قائم رہا تو میرے ماں باپ کو اٹھا لیا جائے گا۔ کسی کیس یا واردات میں ملوث کر دیا جائے۔ تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا یا مار دیا جائے گا۔

میری نظروں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا۔ ''دیکھو مجھے یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ میں فوراً لندن سے چلا جاؤں ورنہ مجھے تابوت میں روانہ کر دیا جائے گا۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا ''کس نے دی ہے یہ دھمکی؟''

میں نے کہا ''مجھے نہیں معلوم۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا جیسے یہ جتانا چاہتا ہو کہ ایسے جھوٹ سے وہ متاثر نہیں ہو سکتا۔ ''اس کی فکر مت کرو۔ ہم کر دیں گے کوئی بندوبست۔ ابھی میری بات سنو۔''

میں نے چلا کے کہا ''میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتا۔ میری فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔''

''فلائٹ تم کیسے پکڑو گے؟''

میں نے مارتھا سے کہا ''مارتھا۔ پولیس کو فون کرو۔''

مارتھا بڑے عزم کے ساتھ اٹھی۔ وہ زیر لب مسکراتا رہا اور دیکھتا رہا۔ مارتھا نے ریسیور اٹھایا اور میری طرف دیکھا ''یہ تو ڈیڈ ہے۔''

''تت.....تت.....'' اس نے افسوس سے سر ہلایا ''فون بھی مر جاتے ہیں۔ انسان بھی مر جاتے ہیں' دنیا فانی ہے۔''

مجھ میں کھڑا رہنے کی ہمت نہ رہی۔ میں صوفے پر گر گیا۔

''آنٹی! کیا مجھے ایک کپ کافی مل سکتی ہے؟'' اس نے کہا اور ایک ریوالور نکال کے اپنی گود میں رکھ لیا۔

ریوالور پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔

جاری ہے

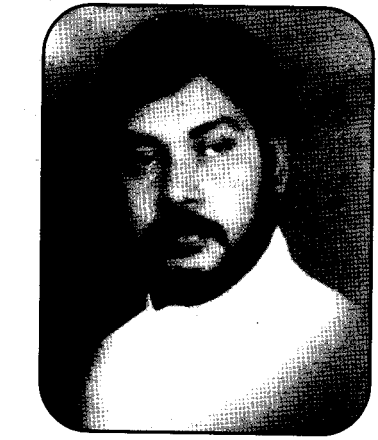

اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ

دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

ایس۔ ایم۔ قادری

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ وحق سبحانہٗ کو زیبا ہیں۔ کہ جس نے کن فیکون سے اس عالم فانی کو کمال مہربانی سے تخلیق کیا۔ اور اس کو اپنی ذات کے نور سے منور کیا ہے۔ اس نے بہترین مذہب اور بہترین رسولؐ عطا کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مقدس نے انسانی شعور کو ہدایت کی ان بلندیوں کی جانب گامزن کیا کہ جہاں ذات باری تعالیٰ کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ انسان کیلئے آج بھی راہ ہدایت موجود ہے۔ کتاب الٰہی ابد تک ہمارے روشن مستقبل کی جانب رہنمائی کرتی رہے گی۔ اور اسی طرح سنت رسول کریم ﷺ آج بھی قائم و دائم ہے۔ اور تا قیامت عالم انسانیت کے لئے روشنی کا مینار رہے گی۔ تو پھر آیئے ہم اپنی کوتاہ نظری اور بیماری، تفکرات کو اسماء الحسنٰی اور اسوۂ حسنہ سے تر و تازگی بخشیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام سے اپنی عقل وقلوب کو روشن کریں۔ دکھوں پریشانیوں اور مشکلات کے حل کے لئے اس معبود برحق کی جانب رجوع کریں۔ جو کل عالمین کا رب ہے۔ جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں جو ملکیت، اقتدار، ترقی، آسائش، شعور و آگاہی اور انسانی ضروریات کے تمام وسائل کا خالق و مالک ہے۔

جناب محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب معروف روحانی سکالر، اسماء الحسنٰی کے محقق و دیگر دینی اور روحانی علوم پر گہری نظر رکھنے والے عرصہ بارہ سال سے اندرون اور بیرون ملک عوام کو اپنے مشوروں سے مستفید فرما رہے ہیں۔ انتہائی قابل قدر کتب کے مصنف ہیں۔ ان کے کالم ملک کے تمام قومی اخبارات، جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے مداحوں میں ملکی و غیر ملکی معروف اہل علم، دانشور، بیوروکریٹس اور اہم سیاسی شخصیات شامل ہیں۔ اندرون اور بیرون ملک ایک وسیع تر حلقہ محترم ایس، ایم، قادری صاحب کے مشوروں سے فیضیاب ہو کر سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہر سال بارہ سے پندرہ ہزار افراد بذریعہ خط و کتابت روحانی تسکین اور جسمانی امراض میں شفا کے حصول کے لئے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ یہ طرۂ امتیاز بھی محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کو ہی حاصل ہے کہ وسطی ایشیا، عرب ممالک، کینیڈا، امریکہ اور یورپ میں بسنے والے ہزاروں افراد بھی آپ سے بذریعہ خط و کتابت فیض حاصل کر رہے ہیں۔

ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے بھی ممتاز و منفرد ہے۔ کہ ان کے پروگرام بعنوان اسماء الحسنٰی 1998ء سے پی ٹی وی ورلڈ پر ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوئے۔ ان پروگرام کی مقبولیت اور افادیت کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف یہ کہ پاکستان میں "ARY ڈیجیٹل" سے آپ کے پروگرام اسماء الحسنٰی بعنوان "کامیابی کا راستہ" ہر جمعۃ المبارک کو نشر ہوتا رہا تھا۔ یہ ہی نہیں بلکہ روزانہ دنیا میں کسی نہ کسی چینل کے حوالے سے پروگرام اسماء الحسنٰی ٹیلی کاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔

☆☆----------☆☆

مسز الیاس۔ لندن

O محترم! میں لندن میں مقیم ہوں کچھ عرصہ سے کیلئے لاہور آئی ہوں اور بالکل بے یار و مددگار ہوں اپنی تھوڑی مجبوری تھی وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے حل ہو گئی ہے۔ اب مسئلہ بچوں کی شادیوں کا ہے اس وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ خدا کے کلام کے سوا اور کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ آپ کے قرآنی حل نے مجھے بہت متاثر کیا۔ آپ مجھے کوئی قرآنی حل بتائیں جس سے میرے بچوں کی شادیوں کے مسئلے حل ہو جائیں۔

☆ "یالطیف یافتاح" بکثرت پڑھیں۔ جتنا ہو سکے تکبر سے بچیں۔ لوح سبع ستارگان ارسال ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

سائرہ حنیف۔ گجرات

O محترم! میری شادی کو 4 سال ہو گئے ہیں جب سے شادی ہوئی ہے کوئی خوشی نہیں دیکھی پریشانی میں زندگی گزر رہی ہے کاروبار کی وجہ سے جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے پہلے جب میری شادی ہوئی تو میرے میاں نے مرغی کی دکان کی لیکن نقصان ہوا اور اس کو بند کر دیا۔ میرے میاں مایوسی میں چرس کے عادی ہو گئے اب حالات ایسے ہیں کہ میں 2 کلو آٹے پر آ گئی ہوں میں بہت پریشان ہوں میرے شوہر صرف اتنا کماتے ہیں کہ دو وقت کی

روٹی چل سکے میرے پاس کوئی اولاد نہیں ہے میں اس وجہ سے بھی پریشان ہوں خدا کیلئے مجھے کوئی وظیفہ بتائیں۔

☆ ''یا کریم یا غنی'' بکثرت پڑھیں۔نماز کی پابندی فرمائیں۔

سدرہ۔لاہور

O محترم او ویسے تو اللہ کی ذات سب سے بڑی ہے وہی سب کچھ کرنیوالا ہے لیکن پھر بھی کوئی وسیلہ ہو تو کام آسان ہو جاتے ہیں ویسے اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے لیکن پھر بھی کچھ پریشانیاں ہیں میرے خاوند جنرل سٹور کا کام کرتے ہیں اپنی دکان ہے رشتے داروں کی نظر ہماری دوکان پر ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمارا بھی حصہ دکان میں ہے اصل میں دکان میرے سسر نے بنائی تھی اپنے بیٹوں کیلئے لیکن ان کے تین بیٹوں نے کام چھوڑ دیا اور بیرون ملک چلے گئے اور چوتھے بیٹے نے یعنی میرے خاوند نے دکان چلائی اب جبکہ دکان چل گئی ہے۔تو اب کہتے ہیں کہ ہمیں بھی حصہ دو۔میرا بڑا بیٹا وسیم جس کو ہم نے تو لیے سینے والی مشین لگا کر دی ہے کام تو بہت ہے پیسے ہمیں نہیں دیتا نیت صاف نہیں لگتی اور وہ نماز بھی نہیں پڑھتا جتنا مرضی اسے کہیں نہیں پڑھتا لیکن وہ ہم سے جھوٹ بہت بولتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیں جو کرتا ہوں کرتے رہنے دیں۔برائے مہربانی آپ ہماری پریشانیوں کا حل ضرور بتائیں۔

☆ ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ سورۂ نصر پڑھیں۔اول آخر 3 مرتبہ درود شریف،لوح تسخیر ارسال ہے۔نماز کی پابندی فرمائیں۔

مریم سلطان۔پشاور

O محترم امیرے شوہر انجینئر ہیں لیکن نوکری نہیں ملتی آٹھ سال ہو چکے ہیں انٹرویو اور ٹیسٹ دے،دے کر تھک گئے ہیں ٹیسٹ انٹرویو اچھا ہوتا ہے مگر سب ناامید کر دیتے ہیں کافی قرضہ چڑھ چکا ہے جسے اتارنا مشکل ہو گیا ہے ایک دکان ہے مگر کچھ برکت نہیں پڑتی جس کی وجہ سے ہم کافی پریشان ہیں مہربانی کر کے ہمیں جلد از جلد اسماء الحسنیٰ سے کوئی وظیفہ بتائیں۔

☆ ''یا رحمٰن یا رحیم یا فتاح'' 313 مرتبہ بعد نماز عشاء اول آخر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھ کر دعا کر لیا کریں۔لوح ارسال ہے۔

سعادت سلیم۔سرگودھا

O محترم امیری شادی کو پانچواں سال شروع ہو چکا ہے میرے پاس اولاد جیسی نعمت نہیں ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ جب میری شادی ہوئی تو اس میں میرے بڑے بھائی کی بیوی خوش نہ تھی وہ کہتی تھی کہ تم میری بھولی بہن کے ساتھ شادی کرو لیکن میرے مقدر میں ایک اور جگہ شادی تھی میں نے اس جگہ شادی کر لی تو میرے بھائی کی بیوی نے کہا کہ آپ نے اچھا نہیں کیا میری مرضی کے خلاف شادی کی ہے ہر وقت پریشان رہتا ہوں لیکن پھر کہتا ہوں کہ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کی اسی میں بہتری ہو۔میرے اس مسئلے پر غور کریں۔اور اس کا کوئی قرآنی حل بتائیں۔

☆ کسی مسلمان بہن، بھائی سے بدگمان ہونا بہتر نہیں ہے۔ ''یا وارث یا باقی'' بکثرت پڑھیں۔علاج درعقیم ارسال ہے۔

زیبا خالد۔گوجرانوالہ

O محترم اعرصہ ڈیڑھ سال سے میں اپنے میکے میں ہوں شادی کو چوتھا سال شروع ہو گیا ہے میرے میاں صاحب بہت شکی اور سخت آدمی ہیں وہ بے انصافی اور ظلم کا پیکر ہیں جب سے شادی ہوئی ہے مجھے بلاوجہ ہزار دفعہ ڈنڈے سے مار چکے ہیں جھوٹے الزاموں اور لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے مجھے انہوں نے چھوڑا ہے اور وہ خود اٹلی چلے گئے ہیں آپ کے پاس حاضر ہوئی تھی آپ نے وظیفہ دیا تھا اب کبھی کبھی فون کر لیتے ہیں۔لیکن وہ میری طرف رجوع نہیں کر رہے میرے ماں باپ اور میں خود اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں۔مجھے ان کا دل موم کرنے کیلئے لوح بنا دیجئے۔

☆ ''یا عزیز یا حمید یا جامع'' بکثرت پڑھیں۔زبان پر قابو رکھیں۔لوح تسخیر خاص ارسال ہے۔نماز کی پابندی فرمائیں۔

سرور خان۔پشاور

O محترم امیں کافی سال سے بے روزگار تھا آخر سخت کوشش کرنے کے بعد مجھے تین ہزار کی نوکری ملی لیکن اب مجھے اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے دماغ پر کسی نے چادر ڈال دی ہو سمجھ میں ہی کچھ نہیں آتا اور بڑے عجیب عجیب اور خوف ناک اور غلط قسم کے خیال دل اور دماغ میں آتے ہیں اور رات کو ناک قسم کے خواب آتے ہیں پہلے تو جیسے ہی آنکھ لگتی ہے ایک عجیب قسم کی آواز مجھے بیدار کر دیتی ہے۔مجھے ایسا لگتا ہے کسی نے کوئی جادو وغیرہ کروایا ہے۔میری شادی کو چار سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔مجھے کوئی حل بتائیں۔

☆ آپ مسلسل ناکامیوں کے باعث ڈپریشن میں مبتلا ہو گئے ہیں۔اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ رکھیں۔''یا رافع یا قائم'' بکثرت پڑھیں۔علاج درعقیم ارسال کیا جا رہا ہے

ذوالفقار۔لاہور

O محترم امیں جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا ہوں یا نوکری کے لئے درخواست دیتا ہوں تو اس کام کے ہونے کے آثار نظر آتے ہیں لیکن کام جب اپنے آخری مراحل تک پہنچتا ہے تو وہ رک

جاتا ہے کسی نہ کسی طریقے سے کام میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے میں گھر کا واحد سربراہ ہوں والد صاحب ریٹائرڈ ملازم ہیں اور گھر کی تمام تر ذمہ داری میرے کندھوں پر آن پڑی ہے میرے اس مسئلے کا کوئی حل ضرور بتائیں۔

☆ "یارؤف یافتاح" خوب پڑھا کریں۔ عصر کی نماز بمعہ سنتوں کے پڑھا کریں۔ انشاءاللہ تمام کام بن جائیں گے۔ لوح مشتری ارسال ہے۔

عدنان۔ راولپنڈی

O محترم! مجھے میٹرک کا امتحان دینا ہے میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے امتحانوں سے پہلے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میرے پیپر اچھے ہو گئے ہیں لیکن اب لگتا ہے کہ ریاضی اور مطالعہ پاکستان کے پیپر اچھے نہیں ہوئے ہیں اب پریشانی یہ ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ جیسے میرا رزلٹ اچھا نہیں ہوگا مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے میں مستقبل میں انجینئر بننا چاہتا ہوں گھر کوئی بھی ایسا فرد نہیں جو مجھے حوصلہ دے برائے مہربانی مجھے کوئی روحانی علاج بتائیں جس سے میں اپنی تعلیم مکمل کر سکوں۔

☆ "یاعلیم یاقوی" بکثرت پڑھیں۔ جھوٹ کی عادت ترک کر دیں۔

عذرا شمسی۔ اسلام آباد

O محترم! میں ایک لڑکے کو پسند کرتی ہوں لیکن اس کے گھر والے نہیں مان رہے وہی ذات برادری کا چکر، لڑکا بھی مجھے بہت پیار کرتا ہے میرے گھر والے تھوڑے سے راضی ہیں لیکن مکمل ہاں نہیں کرتے آپ سے التماس ہے۔ کہ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کے کرنے سے میرے اور اس کے گھر والے بخوشی یہ رشتہ کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

☆ "یاعزیز یاجامع" بکثرت پڑھیں۔ لوح زہرہ ارسال ہے۔

جمیلہ۔ وزیر آباد

O محترم! میں اپنے والدین اور بہت سے لوگوں کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں اور میری والدہ کی ہمیشہ یہی دعا رہتی ہے کہ اللہ میاں ہمیں استادے کہ ہم تیرے بندوں کی مدد کیا کریں۔ ہم لوگ حج کرنا چاہتے اس کے علاوہ میں قرآن پاک حفظ کرنا چاہتی ہوں۔ میرا حافظہ بہت کمزور ہے جو یاد کرتی ہوں بھول جاتی ہوں۔ کوئی ایسا وظیفہ عنایت فرمائیں کہ ہمارے جملہ مسائل حل ہو جائیں۔

☆ چند پیسوں سے، چند جملوں سے، ایک مسکراہٹ سے، اپنے دکھی بہن بھائیوں کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ اس کیلئے انعامی ہانڈ، کروڑوں کی لاٹری کا انتظار فضول ہے "یارحیم" بکثرت پڑھیں۔ لوح قمر ارسال ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

عمران۔ لاہور

جناب ایس۔ ایم۔ قادری صاحب کی تصانیف

اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ

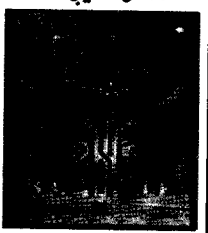

عملیات اسماء الحسنیٰ

اللہ تعالیٰ کے ناموں کی انتہائی خوبصورت تفسیر

اللہ تعالیٰ کے ناموں کے وظائف

ہاتھوں میں تقدیر

خوب صورت نام

دست شناسی پر ایک خوبصورت کتاب

اپنے بچوں کے خوبصورت نام خود تجویز کیجئے

سید ناغوث اعظمؒ

جادو اور جنات

دنیائے تصوف کے سب سے بڑے ولی کا تذکرہ

جنات کی حقیقت اور اس کا علاج

خواب اور تعبیر

دعائیں

دُعائیں

قرآنی دعاؤں کا حسین گلدستہ

زیر طبع

خوابوں کے ذریعے راہنمائی حاصل کیجئے

تمام مسائل اور مواقع کی دعائیں

ہر اچھے بکسٹال پر دستیاب ہیں، نہ ملنے کیصورت میں فی کتاب بذریعہ منی آرڈر 175 روپے ارسال کر کے منگوائیں۔ (کتاب V.P نہیں کی جاتی) B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ فون 5167842

خواب حقیقت: محترم جناب ایس ایم قادری صاحب کا پروگرام ہر جمعے کے شب 9 بجے رنگ ٹی وی سے ملاحظہ فرمایئے

O محترم! میں کامرس گریجویٹ ہوں اور آج کل جاب کے بارے میں بہت پریشان ہوں میں جس فیلڈ میں جانا چاہتا ہوں اس فیلڈ میں چانس نہیں ملتا اور جہاں چانس ملتا ہے وہاں فیوچر نظر نہیں آتا مجھے گریجویشن کیے ہوئے تین سال ہوگئے ہیں لیکن ابھی تک مجھے میری پسند کی جاب نہیں ملی میں اپنے فیوچر کے بارے میں بہت پریشان ہوں علاوہ ازیں میں ایم بی اے کا سٹوڈنٹ ہوں جو بھی سبق یاد کرتا ہوں وہ جلد ہی بھول جاتا ہوں یہی وجہ ہے کہ امتحان میں میرے مارکس تیاری کے مقابلے میں بہت کم آتے ہیں۔ مہربانی فرما کر ایسا وظیفہ بتائیں کہ مجھے میری پسند کی جاب بھی مل جائے اور میری یادداشت بھی درست ہوجائے۔

☆ آپ ''یاحفیظ یاماحفظ'' بکثرت پڑھیں۔ نماز پنجگانہ کی پابندی فرمائیں۔ نقش فتح نامہ ارسال ہے۔

کوثر سہیل۔ سرگودھا

O محترم! میں ایک بیوہ خاتون ہوں میرے شوہر کی وفات کو 7 سال کا عرصہ ہوچکا ہے اور مسائل میں بری طرح گھری ہوئی ہوں میرا سب سے بڑا مسئلہ بیٹیوں کی شادی کا ہے میری 4 بیٹیاں اور 2 بیٹے کنوارے ہیں میرے ایک بیٹی کی منگنی غیروں میں ہوئی تھی جو چند ماہ میں ٹوٹ گئی ہے میرے دونوں بڑے داماد جو کہ کبھی بھی یہ نہیں چاہتے کہ میرے آنے والا داماد ان سے بڑھ کر ہو۔ اس لئے وہ لوگ رکاوٹ کھڑی کرتے ہیں میری بیٹیاں پڑھ لکھی ہیں خوبصورت اور سلیقہ شعار ہیں میں چاہتی ہوں کہ میری بیٹیوں کی شادی اچھے گھروں میں ہوجائیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ کوئی حل تجویز کریں۔

☆ ''یالطیف یافتاح'' بکثرت پڑھا کریں۔ حسب توفیق صدقہ دیا کریں۔ لوح سبع ستارگان ارسال ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

آمنہ شہزادی۔ قصور

O محترم! میرے پہلے حالات بہت اچھے تھے لیکن اب کچھ سال سے خراب سے خراب تر ہوتے جارہے ہیں قرض بہت ہوگیا ہے اور قرض اتارنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی کیونکہ نہ ہماری کوئی جائیداد ہے اور نہ ہی کوئی بزنس صرف بیٹے کی تنخواہ ہے جو بجلی گیس کے بلوں میں چلی جاتی ہے کچھ ہزار تنخواہ میں سے جو باقی بچتا ہے وہ دال روٹی میں چلے جاتے ہیں ان حالات کی وجہ سے انہوں نے منہ موڑ لیا ہے انہی پریشانیوں کی وجہ سے ہارٹ کی مریضہ بن گئی ہوں دو دفعہ اٹیک ہوچکا ہے مجھے لگتا ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی چیزیں ہیں جو ہمارا کوئی کام نہیں ہونے دیتی ہر روز کوئی نہ کوئی ایسی پریشانی آتی ہے جو کبھی سوچی بھی نہیں ہوتیں۔ آپ مجھے ایسا روحانی حل بتائیں جس سے میرے مالی حالات ٹھیک ہوجائیں اور قرض بھی اتر جائے۔

☆ اخراجات اور آمدنی میں توازن پیدا کریں۔ ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ سورۂ نصر پڑھ کر دعا کرلیا کریں۔ لوح مشتری ارسال ہے۔

احمد دین۔ لاہور

O محترم! میں ایک غریب بوڑھا 64 برس کا ہوں بے روزگار بھی ہوں اور تین بیٹیاں بھی ہیں حالات اچھے نہیں اور باقاعدگی سے نماز اور تسبیح قرآن پڑھتا ہوں کچھ عرصہ سے کچھ ذرات ہیں جو کہ میری ناک کان اور سر پر رینگتے ہیں اور جسم میں سوئی کی طرح چبھتے ہیں اگر میں الائچی یا لہسن اپنے منہ پر لگا لوں تو پھر کم تکلیف ہوتی ہے۔ اور نماز میں بہت تنگ کرتے ہیں خدا کا واسطے اس کا کوئی قرآنی حل بتائیں۔

☆ ''یامانع یارقیب'' بکثرت پڑھیں۔ کھانے میں نمک کی مقدار کم کرلیں۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

امین۔ چوکی

O محترم! میں ایک غریب آدمی ہوں پچھلے سال گرمیوں کے موسم میں اپنی جمع شدہ پونجی اور لوگوں سے قرض لیکر لیمن سوڈا کا کاروبار کیا تھا ایک ماہ تو میرا کام بہت اچھا چلا۔ اور مجھے منافع بھی ہوا مگر دوسرے ماہ میرا ایک قریبی دوست جو کہ عملیات وغیرہ جانتا ہے وہ میرا مخالف ہوگیا اور اس نے میرے کاروبار پر جادو کردیا جادو بھی اتنا زبردست کہ میں جیسے ہی دکان پر جاتا بیمار ہوجاتا قصہ مختصر یہ کہ مجھے کاروبار سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا جبکہ میں مقروض ہوگیا اب اس سیزن پر میں کام بھی شروع نہیں کر پارہا روز کوئی نہ کوئی رکاوٹ آڑے آجاتی ہے۔ کوئی ایسا وظیفہ دیں جس کے کرنے سے میرا کاروبار کا مسئلہ حل ہوجائے۔

☆ ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ سورۂ القریش پڑھ کر دعا کیا کریں۔ لوح ذوالجلال ارسال ہے۔ نماز پنجگانہ پابندی سے ادا کریں۔

نعیم لودھی۔ سندر

O محترم! ہم دیہی علاقے میں رہائش پذیر ہیں آج سے تقریباً 3 سال قبل ہم نہایت خوش وخرم تھے 2000ء میں میری شادی ہوئی اور شادی کے فوراً بعد ہی ہمارے حالات خراب ہونے شروع ہوگئے آج نہ

صرف میں بلکہ میری پوری فیملی نہایت پریشانی کا شکار ہے میں نے ایف اے کیا ہوا ہے مگر ہزار بار کوشش کے باوجود کہیں ملازمت نہیں ملتی والدین نہایت پریشان ہیں۔ ہم نے اپنا مکان اور زمین جو کہ بیچنے کی بہت کوشش کی مگر کوشش بیکار رہا، اس وقت میں نے پولیس کانسٹیبل کی بھرتی کیلئے درخواست دی ہوئی ہے۔ میری آپ سے گذارش ہے کہ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کے کرنے سے میں بھرتی ہو جاؤں۔ اور روزگار کا مسئلہ حل ہو جائے۔

☆ سورۂ طارق ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ پڑھیں۔ زبان پر قابو پائیں۔ لوح تسخیر ارسال ہے۔ نماز پابندی سے ادا کریں۔

سہیل رانا۔ کراچی

○ محترم! ہماری پانچ بیٹیاں ہیں ایک کی شادی ہو گئی ہے مگر ابھی تک سسرال میں پریشان ہی ہے اس کی وجہ خاوند ہے جو کہ اپنے دماغ سے کم کام لیتا ہے باقی لوگوں کے کہنے پر آمین کرتا ہے۔ اتنی خدمت کے بعد بھی ساس کوئی نہ کوئی مسئلہ نکالے رکھتی ہے اب اس نے جاب کر لی ہے وہ بھی ساس کو گوارا نہیں کہ یہ اب اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائیگی آپ دعا کریں کہ خدا بیٹی کو سکھ اور سکون دے۔ دوسرا مسئلہ معاش کا ہے فیکٹری میں جاب کرتا ہوں گھر کرائے کا ہے۔ اس کیلئے کوئی وظیفہ عنایت فرمائیں۔

☆ تمام مسائل کیلئے ”یا نور یا کریم“ بکثرت پڑھیں۔ لوح تسخیر خاص ارسال ہے۔ نماز پنجگانہ پابندی سے ادا کریں۔

حاجرہ۔ سیالکوٹ

○ محترم! میرے شوہر پہلے مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ لیکن شادی کے چند سال بعد ہی وہ اجنبی سے ہو گئے ہیں۔ بات بات پر غصہ کرتے ہیں اور ہر وقت مجھ پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ پہلے دفتر سے سیدھے گھر آیا کرتے تھے، اب رات کو دیر سے گھر لوٹتے ہیں۔ خرچ کیلئے میں ترستی رہتی ہوں۔ وہ میرے علاوہ سب لوگوں سے اچھی طرح ملتے ہیں۔ میرے لئے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے مجھے اسم اعظم دیجئے جس کے پڑھنے سے میرے شوہر کے دل میں میری محبت جاگ اٹھے۔

☆ آپ پریشان نہ ہوں اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ بھروسہ رکھیں۔ نماز پنجگانہ باقاعدگی سے جاری رکھیں۔ نماز عشاء کے بعد ”یا شہید“ پڑھ کر شوہر کا تصور کر کے دم کیا کریں۔ لوح تسخیر خاص ارسال ہے۔

اپنے قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں۔

پروین۔ گجرات

○ محترم! میری شادی گیارہ سال پہلے ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ آپ کے اولاد نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ اب اللہ ہی مدد کر سکتا ہے۔ میری دوسری بہن کی شادی کو پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ بھی اولاد سے محروم ہے۔ ڈاکٹر کوئی خرابی نہیں بتاتے۔ خدا کے واسطے میرے لئے دعا یا کوئی وظیفہ تجویز کیجئے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھیں۔ ”یا مصور“ بکثرت پڑھیں۔ نقش علاج در عقیم ارسال ہے۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

محمد حفیظ۔ کوئٹہ

○ محترم! میرے بیٹے کو اٹلی گئے ہوئے تین سال کا عرصہ ہو گیا ہے اور ایک سال ہو گیا ہے پیپر جمع کروائے ہوئے۔ لیکن جب بھی کوئی امید ہوتی ہے پیپر ملنے کی تو کوئی نہ کوئی رکاوٹ کھڑی ہو جاتی ہے پیپروں کے بغیر نوکری بھی نہیں ملتی بہت پریشانی ہے اُدھر بیٹا پریشان ہے اِدھر میں پریشان ہوں کچھ سمجھ نہیں آتا کیا کروں۔ میری مدد کریں۔ کوئی وظیفہ بتائیں۔

☆ ”یا قائم یا رقیب یا رحمٰن“ بکثرت پڑھیں۔ نقش فتح نامہ ارسال ہے۔

شازیہ صدیق۔ اٹک

○ محترم! ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خوش حال زندگی گزار رہے تھے مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ میری ساس تعویز گنڈے کروا کر بیٹے کے گھر میں لڑائی ڈلوا رہی ہے بغیر کسی وجہ کے میرا خاوند آگ بگولا ہو جاتا تھا میں نے لاپرواہی کا اظہار کیا جیسے تیسے دس سال گزار لیے۔ لیکن اس اثنا میں میرا میاں بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر چل پڑا کہ اتنی زیادتیاں کرنے کے باوجود یہ گھر نہیں چھوڑ رہی تھی تو اس نے بھی تعویز گنڈوں کے ذریعے مجھے پاگل کرنے کی کوشش کی میری اللہ نے مدد کی بروقت مجھے پتہ چل گیا میں نے چائے سے تعویز نکال لیا اور چائے نہ پی۔ اب میری حالت یہ کہ رات کو دروازے کھلتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ دیکھتی ہوں تو سامنے کچھ نہیں ہوتا کبھی ٹیلی فون کا مائیک اپنے آپ آن ہو جاتا ہے۔ اس کا کوئی روحانی حل بتائیں۔

☆ ”یا سلام یا رافع یا حفیظ“ بکثرت پڑھیں۔ غذا میں نمک کی مقدار کم کر دیں۔ بدگمانیاں ترک کر دیں۔ لوح عطار دارسال ہے۔

ملاقات: روزانہ صبح 9 تا مغرب ”جمعتہ المبارک تعطیل“ (براہِ راست جواب کیلئے جوابی لفافہ بھیجئے۔)
ایس۔ ایم۔ قادری B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ فون نمبر: 042-5167842,5168036
ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا ہر انگریزی مہینے کی پہلی جمعرات کو بعد نمازِ عصر تا مغرب منعقد ہوتی ہے۔

شرف ستار گان کی الواح

اپنے نام اور ستارے کے مطابق لوح بنوا کر کامیاب زندگی بسر کریں۔

لوح شرفِ مریخ

دل کی گھبراہٹ، ڈپریشن، مردانہ امراض، خواتین کے امراض، خون کی کمی، آسیب سے نجات، افسرانِ بالا کی توجہ اور رجوع خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ زہرہ

تسخیر خلق، پسند کی شادی، ڈاکٹر و حکیم، سیاستدان، عورتوں کے امراض، انیٹریئر ڈیکوریشن، مصوروں، خطاطوں اور ادیبوں کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ عطارد

علمی ترقی، حافظے میں اضافہ، تعلیم میں کامیابی، یادداشت میں اضافہ، بچوں کا خواب میں ڈرنا، ٹرانسپورٹ تجارت اور کمیونیکیشن سے منسلک افراد کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ قمر

پرانی جسمانی بیماریاں، نسوانی امراض، تسخیر، ترقی، زراعت اور باغبانی کے لئے مفید ہے۔ دماغی قوتوں میں اضافہ، روحانی علوم میں کامیابی، تسخیر خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ شمس

ترقی، عروج، سحر، جادو سے حفاظت، روپے پیسے کی آمد، سماجی مرتبے میں اضافے کے لئے تیار کی جاتی ہے۔ جن کے زائچے میں شمس کمزور ہے ان کیلئے مفید ہے۔

لوح شرفِ مشتری

مالی خوش بختی، حصول دولت، آمدنی کے مختلف ذرائع کو ترقی دینا، انعامی اسکیموں میں فائدہ، مستقبل کی بہتری، کیریئر اور ترقی کے استحکام کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ زحل

کاموں میں رکاوٹ، جائیداد کے تنازعات، پرانے امراض، ضدی امراض، نحوست، جادو، آسیب سے نجات کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ سبع ستارگان

(ساتوں ستاروں کا یکجا نقش)

خیر و برکت، مالی خوش بختی، تسخیر خلق، مرد اور عورتوں کے پرانے امراض، شادی میں تاخیر اور رکاوٹ، علمی ترقی، تعلیم میں کامیابی، گھریلو پریشانیاں، جادو و آسیب سے نجات کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

اپنی پسند کی لوح بنوانے کیلئے رابطہ کیجئے۔ B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان۔ فون نمبر: 5168036-5167842

ارشد۔ گجرات

O محترم! میرا مسئلہ کچھ یوں ہے۔ میرے ابو انگلینڈ میں ہوتے ہیں وہاں ان کا اپنا ہوٹل ہے ہوٹل بہت بڑا ہے لیکن چلتا نہیں کبھی اچھا کام ہوتا ہے کبھی کچھ کام نہیں ہوتا ابو کو تین سال ہو گئے ہیں وہاں گئے ہوئے۔ یہ سارا خرچہ میرے چاچو کے کاروبار سے چل رہا ہے میرے ابو کے دو بھائی اور ہیں یعنی کل ملا کر تینوں بھائی اکٹھے رہتے ہیں۔ ہم سب بہن بھائی باہر جانا چاہتے ہیں کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ جس سے ہمارا کاروبار بھی چل پڑے اور ہم سب بہن بھائی باہر چلے جائیں۔

☆ آپ ہر جمعرات کو حسب توفیق صدقہ دیا کریں۔ اور ''یا وہاب'' کا ورد کثرت سے کریں۔ لوح مشتری ارسال ہے۔

ضروری گزارش

☆☆ خط لکھتے وقت اپنا نام اور پتہ معہ شہر کے مکمل لکھئے۔ مخفف نام والے خطوط قابل جواب نہ ہوں گے۔ براہ راست جواب کیلئے پتا لکھا ہوا جوابی لفافہ ارسال کیجئے اور ف، ک، ٹائپ کے نام لکھنے سے گریز کیجئے۔ اگر آپ اپنا نام نہ شائع کروانا چاہیں تو فرضی نام لکھ کر واضح ہدایت کر دیجئے۔ فون پر مسئلہ ڈسکس نہیں کیا جاتا جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھ دیں۔ بیرون ملک بہن، بھائی جوابی لفافہ نہ ارسال کریں اپنا مکمل نام و پتہ ارسال کریں۔

O آمنہ حق، حاجرہ بی بی، بتول بیگم، کوثر پروین، اختر بانو، بابر علی، محمد شعیب، یعقوب، سردار خان، متفرق شہر

☆ آپ سب نے ختم شریف میں قرآن حکیم، کلمہ شریف، سورۂ ملک، سورۂ یٰسین، آیت کریمہ کی جو پڑھائیاں ایصال ثواب کے لئے تحریر کئے تھے۔ وہ سب محفل ختم شریف میں حضور اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انبیاء علیہ السلام صحابۂ اجمعین، سیدنا غوث الاعظمؒ جملہ مسلمین و مسلمات کیلئے ہدیہ کر دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری کاوشوں کو قبول و مقبول فرمائے۔ جو بہن بھائی ایصال ثواب حصول خیر و برکت کیلئے قرآن حکیم، مختلف سورتیں۔ کلمہ شریف، درود شریف شریف پڑھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کی طرف سے ہادی عالمؐ کی بارگاہ میں، بزرگان دین کے لئے پڑھائیوں کے ہدیئے بھیجنا چاہیں وہ بذریعہ خط، ٹیلی فون مطلع فرما دیا کریں۔

☆☆☆

اس مرتبہ ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا انشاء اللہ 4 مئی کو ہوگی۔ تمام بہن اور بھائیوں اور مریدین سے شرکت کی استدعا ہے۔